تاریخ تحریک آزادی ہند

جلد چہارم

تارا چند

ترجمہ

ڈاکٹر ایم۔ ہاشم قدوائی۔ علی گڑھ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

Tarikh Tehreek Azadi Hind-IV
By: Tara Chand

سنہ اشاعت : اپریل، جون 2002 شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/358

سلسلہ مطبوعات : 987

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک۔ I، آر۔کے۔ پورم،
نئی دہلی۔ 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

دیباچہ

ہندوستان میں آزادی کی تحریک ایک عجیب اور نادر واقعہ ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا کوئی ملک ہو جو اتنا وسیع ہو اور جہاں اتنی قسم کی نسلیں آباد ہوں جو مختلف مذاہب رکھتی ہوں، مختلف زبانیں بولتی ہوں، مختلف رسم ورواج کی پابند ہوں اور پھر صرف ایک سو سال کے عرصے میں ان میں قومی وحدت کا ایسا شعور پیدا ہو گیا ہو جو آزادی کی بنیاد بن گیا ہو۔

ہندوستانیوں میں سیاسی اتحاد کا جذبہ انیسویں صدی کے وسط سے قبل پیدا نہ ہوسکا۔ پھر بھی یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اس سیاسی اتحاد کے قائم کرنے کی قوتیں ہندوستان کی تاریخ میں انگریزوں کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے سرگرم عمل تھیں۔

زمانہ قدیم میں ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کا تہذیبی مسلک اور نقطۂ نظر یکساں تھا جس کا اثر عوام پر بھی مرتب ہوتا تھا اور اس طرح ان کے طریق فکر اور انداز احساس میں یکسانیت پیدا کرتا تھا۔

مسلمانوں کی فتوحات سے ہندوستانی معاشرت ایک 'بیگانہ عنصر' سے متعارف ہوئی۔ ایک ایسا مذہب جو یہاں جذب نہ ہوسکا اور ایک غیر ملکی زبان۔ لیکن مسلمان فاتحین مذہب کے معاملے میں متعصب نہ تھے اور انھوں نے اپنے کو یہاں کے حالات اور زندگی کے طور طریقوں سے پوری طرح ہم آہنگ کرلیا۔ ان کی سرکاری سطح پر فارسی زبان استعمال کرنے کی پالیسی بھی نرم پڑتی گئی کیونکہ وہ حکمراں ہندوستانی زبانوں کی بھی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتے تھے اور اسی طرح اردو زبان معرض وجود میں آئی جو ادبی

صلاحیتوں کے اظہار اور روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہونے لگی۔

اس طرح ہندوستان میں دو ثقافتی روایتیں وجود میں آگئیں جن کی بنیادیں دو مختلف مذاہب پر تھیں۔ ایک کو ہندو جن کی ملک میں اکثریت تھی، ترقی دیتے رہے اور دوسری کو مسلمان، لیکن یہ دونوں کلچر یا تہذیبیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی اور ایک دوسرے کے قریب آتی رہیں۔

ان دونوں کلچروں کا جغرافیائی ماحول اور طبعی حالات جن میں یہ پروان چڑھ رہے تھے دونوں کے لیے یکساں نہ تھا اور چونکہ یہ ملک دوسرے ممالک سے الگ تھلگ سا تھا اس لیے ان دونوں میں نقاط نظر کی یکسانیت بڑھتی ہی رہی۔ حکمرانوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں اور رہن سہن کے طور طریقے اختیار کر لیے جو مشترک تھے۔

انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کی یہ کثیر آبادی قرون وسطیٰ کے عقاید و طرز معاشرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جدید طرز کی سیاست کا علم صرف ان چند منتخب اور معدودے چند لوگوں تک محدود تھا جو مغرب سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ اس لیے انیسویں صدی کے نصف اول میں جو انقلابی تحریکیں اٹھیں وہ جاگیردارانہ نظام کے انداز کی تھیں۔ وہ لوگ نظام حکومت یا سماجی نظام میں تغیر پیدا کرنے کی بات سوچ ہی نہ سکتے تھے۔

1858ء کے بعد ہندوستانی ذہن 'سیاست زدہ' ہونے لگا لیکن اس سیاست زدگی میں غالب عنصر مذہبی نعروں کا تھا اور فرقہ وارانہ عقاید، رسوم و رواج کے محرکات پیش پیش تھے۔

برطانوی حکمرانوں کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اپنی رعایا کے اختلافات کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرتے رہیں۔ دراصل انہوں نے اسی نظریے پر عمل کیا کہ ان کا سامراجی مفاد اسی میں ہے کہ ہندوستانی لوگ ایک قوم کی صورت میں متحد نہ ہونے پائیں۔ اسی لیے ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ مختلف گروہوں کے اختلافات کو بڑھنے دیا جائے تاکہ ایک کو دوسرے کے خلاف لڑایا جا سکے۔ ملک کے مختلف طبقوں میں جو اختلافات تھے ان کو

اہمیت دی جاتی تھی اوران کی جا و بے جا شکایتیں مختلف فرقوں میں شکوک اور عدم اعتماد پیدا کرتی رہتی تھیں۔

1857-58 ء کی بغاوت میں مسلمان برطانوی راج کے دشمن سمجھے جانے لگے تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ اس الزام سے بری کر دیے گئے اور تب ہندوؤں پر شک کی نظریں پڑنے لگیں۔

1858ء میں مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے نے یہ محسوس کیا کہ ان کا برطانیہ مخالف رویہّ اختیار کرنا ایک غلطی ہے اوران کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ مغربی طریق اختیار کریں اور برطانوی اقتدار کے وفادار رہیں۔ لیکن مسلمانوں کے غریب طبقے نے اپنے علماء کی قیادت میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف معاندانہ رویہّ برقرار رکھا۔ مگر مسلمانوں کا یہ غریب طبقہ اتنا بااثر نہ تھا جیسا کہ مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ اس لیے اعلیٰ طبقہ برطانوی حکومت سے مستفیض ہوتا رہا۔

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ان میں بڑھتا ہوا اتحاد برطانوی اقتدار کے لیے ایک خطرہ سمجھا گیا۔ برہمن اور غیر برہمن، اونچی ذات اور نیچی ذات کے اختلافات نیز ہندو مسلم رقابت کو خوب خوب بھڑکایا گیا اوران سے فائدے اٹھائے گئے۔

ان حالات میں حکومت خود اختیاری کی تجویز اس کی کوشش تھی کہ مختلف قومیتوں اور ذاتوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو پاٹا جائے کیونکہ متحدہ ہندوستان ہی خود ارادیت کے حق کا مطالبہ کرسکتا تھا۔

کیونکہ یہ اچھی طرح محسوس کرلیا گیا تھا کہ ایک متحد ہندوستان ہی حق خود اختیاری طلب کرسکتا تھا، چنانچہ انیسویں صدی کے وسط سے ہندوستان کی تاریخ ان کوششوں کی حکایت ہے جو ہندوستان کے مختلف فرقوں، ہندو مسلمانوں نیز اونچی اور نیچی ذات والوں کو متحد کرنے کے لیے کی گئیں۔ ان کوششوں میں جن سازگار حالات سے مدد ملی

ان میں ایک فعال اقتصادی نظام کی ترقی بھی ہے جس نے پرانی اور جامد طبقاتی درجہ بندی کی سختیاں کم کردیں اور سماجی حالات میں ایک معقول تنظیم پیدا کردی۔ ہندوستان کے وسائل اور اس کی دولت جدید حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں صرف ہونے لگی اور اس طرح لامحالہ طور پر اقتصادی اور سیاسی سطح پر قومیت کا نشو ونما ہونے لگا۔

دیگر سازگار حالات میں جدید تنظیم حکومت کا قیام اور جدید تعلیم کا نفاذ بھی شامل ہے۔

ناسازگار حالات یہ تھے کہ مذہب، سماجی نظام اور رسوم ورواج کے متعلق تصورات وہی برقرار رہے جو قرون وسطیٰ میں تھے اور برطانوی حکومت اپنے خود غرضانہ مفاد کی خاطر ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ سازگار اور ناسازگار حالات کی یہ کشمکش انیسویں اور بیسویں صدی میں برابر برقرار رہی۔

ناسازگار حالات دراصل بہت قدیمی ہیں اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان کے مقابلے میں سازگار حالات ابھی زمانۂ حال کی پیداوار ہیں۔ قومیت کا جذبہ بھی اسی نئے زمانے کا ہے۔ راجہ رام موہن رائے پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے اس جذبہ سے سماجی اور سیاسی اداروں میں کام لینا شروع کیا۔ سیاسیات میں یہ جذبہ ایک قومی پیمانے پر 1885ء میں نمودار ہوا اور جب انیسویں صدی نے کروٹ لی اور بیسوی صدی شروع ہوئی تو اس نے بڑے ہاتھ پاؤں نکالے اور 1919ء سے تو یہ سارے ملک پر چھا گیا۔

حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کی تحریک باقاعدہ طور پر 1905ء میں تقسیم بنگال کے موقع پر شروع ہوئی۔ اس کا پہلا صلہ مارلے منٹو اصلاحات کی اسکیم کی صورت میں 1909ء میں ملا۔ ان اصلاحات میں اس تحریک کو ناکام بنانے کی ایک چال پنہاں تھی یعنی ان اصلاحات کی بنیاد مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم ماننے کی نظریے پر رکھی گئی تھی اور اس طرح ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مذہبی تفریق کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ دس برس بعد یعنی 1919ء میں یہی علاحدگی کا اصول مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات میں پھر پیش

نظر رکھا گیا۔ ان ہر دو قوانین نے مذموم دو قومی نظریے کو مستحکم کر دیا جو برطانوی ذہنیت کا بنیادی تصور تھا۔ اس کی مزید توسیع دوسری گول میز کانفرنس کے بعد میکڈ انلڈ ایوارڈ میں کی گئی۔ خاص اطلاعات کے لیے کئی نئے مدعیوں کو بھی ان دو گروہوں (ہندو اور مسلم) میں شامل کر لیا گیا مثلاً پست طبقے کا گروہ، سکھ اور ہندوستانی جاگیردارانہ ریاستیں۔ حق خود ارادیت کے حصول کا سوال مخالف پارٹیوں کے متحد ہونے کے ناممکن یا محال کام پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس عرصے میں دوسری جنگ عظیم درپیش ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں برطانوی سلطنت کا زوال واضح طور پر سامنے آ گیا اور دو سر برآوردہ ریاستیں یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور ریاست ہائے متحدہ سوویٹ ری پبلک سب سے بڑی طاقتوں کی صورت میں ابھریں۔ برطانیہ عظمیٰ نے اپنی برتری کھودی اور مجبور ہوگئی کہ اپنی سامراجی نو آبادیوں سے کنارہ کش ہو جائے اور خود اپنی تباہ شدہ معیشت کی شیرازہ بندی میں اپنی قوتوں کو صرف کرے۔

لیکن ہندوستان چھوڑنے سے پیشتر اس نے مسلم لیگ کا علاحدگی کا مطالبہ بالآخر مکمل طور پر مان لیا اور ملک کو دو ریاستوں ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔ انگریز خود اپنی برطانوی سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنے میں تو ناکام رہے لیکن ہندوستان میں اپنا یہ نظریہ عائد کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ یہاں قوموں کی کثرت ہے کوئی ایک قوم نہیں۔

''تاریخ تحریک آزادی ہند'' میں برطانیہ کے اسی نظریہ عدم اتحاد اور ہندوستانیوں کے دعوائے اتحاد کی کشمکش کو قلمبند کیا گیا ہے۔

اس تاریخ کی تیاری میں مجھ کو اپنے رفیق ڈاکٹر وی جی ڈیگھ سے قابل قدر اعانت ملی ہے۔ وہ اس تاریخ کے تکملہ تک برابر میرے شریک رہے۔ اس تحقیقی کام میں انہوں نے انتھک محنت سے کام کیا۔ نیشنل آرکائیوز کی سینکڑوں فائلوں کی ورق گردانی کی۔ سرکاری اور غیر سرکاری مطبوعات، پرانے اخبارات ورسائل اور پارلیمنٹ کی بحثوں وغیرہ

کو کھنگالا اور اس تاریخ کے لیے مفید مطلب مواد اکٹھا کیا۔ آخر میں پھر انہوں نے پریس کاپی بھی جانچ کر مکمل کی۔ پروف پڑھے اور اشاریہ ترتیب دیا۔ ڈاکٹر آر کے پرمو بھی اسی طرح میرے مددگار رہے لیکن جب تیسری جلد تیار کی جارہی تھی ان کو یہ کام چھوڑ دینا پڑا۔

میں نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری کے شری وی سی جوشی کا بھی شکرگزار ہوں کہ ان کے ذریعے مجھے ضروری مدد ملتی رہی۔ ڈاکٹر شری نندن پرشاد کی عنایت سے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے وسیع ذخیرہ سے مستفید ہوا۔ ڈاکٹر بشیشور پرشاد کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا، مشورے دیے اور آخری پروفوں کی جانچ پڑتال کی۔

میرے ذاتی مددگار اور اسٹینو، بی آر، اجمانی نے پوری کتاب ٹائپ کرنے کے علاوہ بلا عذر دیگر مختلف خدمات بھی انجام دیں۔

میں اپنے تمام مددگاروں اور شرکائے کار کا شکرگزار ہوں۔

تاراچند

15/اگست 1972ء

باب اوّل

بڑھتے ہوئے اختلافات کا درمیانی وقفہ

1- آزادی کی جدوجہد میں گاندھی جی کا نصب العین

جب مارچ 1924ء میں گاندھی جی ایک خطرناک آپریشن کے بعد صحت یابی کے لیے جیل سے باہر آئے اور بمقام جوہو، (ساحل بمبئی) قیام پذیر ہوئے تو انہوں دیکھا کہ اب ملک کے مسائل اس وقت سے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں جب کہ وہ جیل خانے گئے تھے اور پھر بہت کچھ غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر کسی دیگر متبادل پروگرام کی عدم موجودگی میں سِول نافرمانی کا پروگرام ہی برقرار رکھا جائے۔ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ جب اپریل میں سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو ان کو اس بات کی ترغیب دینے کے لیے آئے کہ وہ مجالس قانون ساز اسمبلیوں کے بائیکاٹ کا پروگرام ترک کر دیں تو گاندھی جی اس پر رضامند نہ ہوئے اور ان لوگوں کے دلائل سے وہ قائل نہ ہو سکے۔ پھر بھی وہ ان لوگوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ان کے خلاف کسی قسم کی پروپیگنڈہ مہم چلا کر اپنی مخالفت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اسی سال بعد کو جب بنگال سرکار نے سی آر داس اور سوراج پارٹی والوں کے خلاف ایک مہم شروع کی اور ایک آرڈی نینس 25/ اکتوبر 1924ء کو یہ جاری کیا کہ ان لوگوں کے گھروں کی تلاشیاں لی جائیں اور ان کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرفتار کیا جائے تو گاندھی جی فوراً کلکتہ پہنچے اور سوراجیوں کی تائید میں 6/نومبر 1924ء کو ایک بیان

جاری کیا جس پر گاندھی جی، سی آر داس اور موتی لال نہرو کے دستخط تھے۔ اس بیان میں اس امر کی سفارش کی گئی تھی کہ سوراج پارٹی اپنا کام مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز اسمبلیوں کے سلسلے میں کانگریس کی طرف سے اس کے ایک جزو کی حیثیت سے جاری رکھے۔ بعد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور اس کے بعد کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ بمقام بیلگام میں ان سفارشات کو منظور کر کے اس بیان پر اپنی پوری رضامندی کی مہر لگادی۔

گاندھی جی کی اس عالی حوصلگی نے کانگریس کے دو گروہوں میں جو مناقشے اور غلط فہمیاں چلی آرہی تھیں یکسر ختم کر دیں اور مشترکہ قومی مفاد کی خاطر آزادی کے ساتھ دونوں گروہ اپنے اپنے گروہوں کو بروئے کار لانے میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔

پچھلی تحریک کی ناکامی کی اسباب پر بھی گاندھی جی نے غور وخوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ (1) جہاں تک حصول آزادی کے ذرائع یعنی عدم تشدد اور عدم تعاون (ترک موالات) کا تعلق ہے ان میں کوئی نقص یا خامی نہیں ہے۔ (2) ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ یا تو والنٹیر وں اور ان کے نیتاؤں میں ذاتی طور پر خامیاں تھیں یا خود کانگریس کی تنظیم میں نقایص تھے۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ان میں ناہمواریاں تھیں یعنی اس کام کے لیے والنٹیر وں کی تعداد ناکافی بھی تھی اور ان کی تربیت بھی معقول طور پر نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً بہتوں نے اپنی سالانہ فیسیں نہیں ادا کی تھیں۔ کھدر کے استعمال کی عادت نہیں ڈالی تھی اور چھوت چھات نہ برتنے اور تشدد سے دور رہنے کی جو قسم ان لوگوں نے کھائی تھی اس پر عملدرآمد نہیں کرتے تھے۔

اس کے علاوہ اس وقت کانگریس کی تنظیم میں بھی بعض لوگوں کے عدم اشتراک

کے باعث رخنے پیدا ہو گئے تھے۔ بہت سے ایسے گاؤں تھے جن میں کوئی کانگریس کمیٹی نہ تھی۔ ابتدائی سطح کی کمیٹیوں کا رابطہ اونچی سطح کی کمیٹیوں سے بہت کمزور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو ہدایات اوپر سے جاری کی جاتی تھیں نچلی سطح پر باقاعدہ نہ پہنچتی تھیں اور اسی لیے ان پر ٹھیک طرح سے عملدرآمد نہ ہو پاتا تھا۔

ہندوستان کو آزادی دلانے کا جو بڑا اہم اور بھاری بھرکم کام گاندھی جی عدم تشدد اور ترک موالات کے ذریعے انجام دینا چاہتے تھے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، صرف سیاسی نوعیت نہیں رکھتا تھا بلکہ، جیسا کہ انہوں نے لارڈ ریڈنگ سے کہا تھا ''یہ ایک مذہبی تحریک تھی جس کا مقصد ہندوستان کی سیاسی زندگی کو رشوت خوری، دغابازی، ظلم اور سفید فام لوگوں سے مرعوبیت کے ہوّے کو دور کرنا تھا۔[1] یہ صرف اس لیے نہیں تھا کہ برطانوی حکمرانوں کو برطرف کر کے ان کے بجائے ہندوستانیوں کا تقرر کر دیا جائے جو اسی قسم کا نظام حکومت برقرار رکھیں۔ انہوں نے بتایا کہ '' مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان کے کاندھوں پر سے برطانوی حکومت کا جوا اتار پھینکا جائے بلکہ میں تو اس بات پر تلا ہوا ہوں کہ اس کے کاندھوں پر کسی قسم کا جوا نہ رہے۔''

گاندھی جی کا نقطۂ نظر انتہائی اصلاح پسند تھا۔ ان کے نزدیک ہر ریاست طبعاً تشدد آمیز ہوتی ہے اور کسی ایک مخصوص حق یافتہ طبقے کی آلہ کار اور اسی لیے خراب۔ وہ ان تمام استحصالات اور مظالم کو ختم کر دینا چاہتے تھے جو ایک طبقہ دوسرے طبقے پر اور اکثریت اقلیت پر روا رکھتی ہے۔ ان کا نصب العین فلاح عامہ (سرو ودیا) تھا جس کا مقصد تھا کہ گاؤں کی پنچایتوں کا ایک وفاق بنا دیا جائے۔ اس قسم کا سماج پیدا کرنا گویا کثرت کو وحدت میں سمو دینا تھا۔ اس سماج کو متحد اور استوار رکھنے والی قوت میں

---

1 گاندھی از جیفری بش، اے اسٹڈی ان ریولیوشن (ایشیا پبلشنگ ہاؤس 1968ء) ص 217

ایک دوسرے کی عزت اور تعاون کرنے کا جذبہ ہوگا غصہ اور طاقت نہیں۔ اس قسم کی سوسائٹی میں عدم مساوات، ظلم اور تصادم کے بجائے مساوات، ہم آہنگی اور معقولیت ہوگی۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری کے تعارف میں 6/نومبر 1925ء کو لکھا تھا کہ ''سیاسی میدان میں جو تجربے مجھے حاصل ہوئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں...... میرے لیے وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتے...... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آدمی اپنے نفس کو پہچان لے یعنی اسے خدا کی عینی معرفت حاصل ہو جائے'' [1] لیکن گاندھی جی کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ قومی آزادی کے بغیر روحانی آزادی یا اپنے نفس کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ قومی آزادی زور و تشدد سے حاصل کی جائے تو وہ غلامی سے بدتر ہوگی اور ان کو اس میں کوئی دلچسپی نہ رہے گی۔

یہاں گاندھی جی سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نظریات نہ پورے طور پر مشرقی تھے نہ مکمل طور پر مغربی۔ جہاں تک فرد واحد کا تعلق ہے ان کا نصب العین مشرقی ہے یعنی نجات یا مکتی کا حاصل کرنا، لیکن جہاں تک قومی یا سیاسی تنظیم کا تعلق ہے وہ مغربی مفکرین مثلاً افلاطون، روسو، کانٹ، ہیگل، مارکس اور ٹالسٹائے کے ہم نوا تھے۔

ان اصولوں کی روشنی میں آزادی کی خاطر ان کا تردد اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس میں ان کی شمولیت اور جدوجہد کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ جدوجہد کسی قسم کی ہو اس میں اپنے مخالفین کی طرف ایک خاص قسم کا ذہنی رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور خود اعتمادی، ضبط و نظم کا ایک خاص طریقہ برتا جاتا ہے خواہ وہ جہد و جہد تشدد پر مبنی ہو یا عدم تشدد پر۔ گاندھی جی کو 22-1920ء میں ترک موالات (عدم تعاون) کرنے والے

1۔ سوانح عمری از ایم کے گاندھی (دوسرا اڈیشن مطبوعہ 1948) ص 4

لوگوں میں ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوگیا تھا اسی لیے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ قبل اس کے کہ وہ دوسری تحریک شروع کریں ان لوگوں کی یہ خامیاں دور ہوجائیں۔

گاندھی جی پر یہ بات روشن تھی کہ آزادی کی جنگ ایک طرف گورنمنٹ اوراس کی مسلح فوجوں اور دوسری طرف تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے لوگوں کے درمیان نہ تھی۔ دراصل وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ "تعلیم یافتہ طبقہ سخت دل ہوجائے۔" ان کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ عہدے حاصل کرنے کا اور پارلیمنٹری طور طریقوں کا اس قدر گرویدہ ہے کہ وہ کسی ایسی جدوجہد میں اپنی جان نہیں کھپا سکتا جس میں سخت اور مسلسل ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسائل پر جس طرح گاندھی جی غور کرتے تھے وہ بنیادی طور پر تعلیم یافتہ طبقے کے انداز فکر سے مختلف تھا۔

طبعاً گاندھی جی عوام الناس کو پسند کرتے تھے جن کو وہ سپاہیوں کی سی تربیت دینا چاہتے تھے تاکہ وہ سامراجی نظام کے خلاف ہونے والی جنگ لڑسکیں۔ سپاہیوں کی اس فوج میں مختلف درجہ کے افسروں کو بھی تو متعین کرنا تھا۔ ان افسروں کو وہ کانگریس کے قومی کارکنوں ہی میں سے منتخب کرسکتے تھے اس لیے باوجود اس امر کے کہ وہ تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے مطمئن نہ تھے انہوں نے کوشش کی کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے متوسط طبقے کے لوگوں پر اپنا اثر واقتدار قائم رکھیں۔ کانگریس نے بھی محسوس کرلیا کہ گاندھی جی اور ان کے دیہاتی ساتھیوں کی مدد کے بغیر برطانوی حکومت عوام کی مرضی کے آگے سپر انداز نہ ہوسکے گی۔

غرض کہ 1924ء میں جو صورت حال گاندھی جی کے سامنے آئی وہ بہت نازک تھی۔ 1922ء کی پسپائی اور میدان عمل سے ان کی جبری غیر حاضری نے معاملات کو

ایک خطرناک حالت سے دوچار کردیا تھا۔ کانگریسیوں میں جدوجہد جاری رکھنے کا حوصلہ کمزور پڑ گیا تھا اگرچہ باتیں وہ اب بھی عدم تعاون اور بائیکاٹ کرنے کی کرتے تھے۔ بہت سے کانگریسی لیڈر اس خیال سے کہ کہیں وہ ناکارہ اور مجہول ہوکر نہ رہ جائیں آسان تر طریقے یعنی مجالس قانون ساز میں داخل ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ مدافعت کا جذبہ برقرار رہ سکے۔

بائیکاٹ کا پروگرام اب خطاب یافتہ لوگوں کے لیے باعث کشش نہیں رہا تھا۔ عدم تعاون کے عروج کے زمانے میں اپنے خطابات واپس کرنے پر وہ جس قدر تیار نظر آتے تھے اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ وکیلوں نے عدالتوں میں اپنی پریکٹس پھر شروع کردی تھی۔ طلبہ سرکاری اسکولوں یا سرکار سے مالی امداد پانے والی درس گاہوں میں پھر جوق درجوق داخلہ لینے لگے تھے۔ پانچ طرح کے بائیکاٹ کے پروگراموں میں سے صرف سودیشی مال کے استعمال کرنے اور بدیسی مال کا بائیکاٹ کرنے کا جذبہ تھوڑا بہت ضرور باقی تھا لیکن اس جذبے میں اب وہ گرمی نہ تھی۔

کانگریس اس وقت دو گروپوں میں منقسم تھی۔ ایک گروپ کے لیڈر سی آر داس اور موتی لال نہرو تھے۔ یہ گروہ 'تبدیلی موافق' گروپ کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ سِول نافرمانی کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بھی پرکشش تھی کہ اصلاح شدہ کونسلوں میں پہنچ کر ان کو ایسے مواقع مل سکیں گے جن سے وہ اپنا پروپیگنڈہ جاری رکھ سکیں گے۔

دوسرا گروپ جو کسی تبدیلی کے موافق نہ تھا یہ بحث کرتا تھا کہ سول نافرمانی ہی واحد طریقہ تھا جس کے ذریعے گورنمنٹ کو مفلوج کر کے سوراج حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ان کے نزدیک کونسلوں کے پروگرام کی ذمہ داری لینے کا کام اپنی قوت کو ضائع کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس اقدام سے ناگپور میں 1920 میں جو پلان (منصوبہ) بنایا گیا

تھا اس کو منسوخ کرنا پڑتا۔

تبدیلی چاہنے والے گروپ نے گاندھی کی جیل سے رہائی کے پیشتر ہی کونسل میں شریک ہونے کا اپنا ارادہ مصمم کر لیا تھا۔ لیکن دسمبر 1922ء میں گیا میں جو کانگریس کا اجلاس ہوا اس میں یہ گروپ دیگر تمام کانگریسیوں سے کونسل میں شریک ہونے کی اجازت حاصل نہ کر سکا۔ اس نامنظوری کے باوجود بھی انہوں نے سوراج پارٹی کی طرف سے یکم جنوری 1923ء کو کونسلوں کی ممبری کے لیے الیکشن لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ناموافق گروپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اب کانگریس میں افتراق پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ کانگریس کا ایک خاص اجلاس ستمبر 1923ء میں دہلی میں منعقد کیا گیا جس میں سوراج پارٹی والوں کو اس بات کی اجازت دیدی گئی کہ وہ اپنے پروگرام پر عملدرآمد کریں اور پھر جب کانگریس کا باضابطہ اجلاس دسمبر میں کوکناڈا کے مقام پر ہوا تو وہاں دہلی میں طے شدہ اس تجویز کی توثیق کر دی گئی۔

2- تحریک خلافت کا انتشار

دوسرا مسئلہ اس سے خراب تر یہ تھا کہ قومی اتحاد کی وہ عمارت جو بڑے صبر وضبط اور مسلسل محنت سے تیار کی گئی تھی اس میں شگاف پڑ گیا یعنی مارچ 1924ء میں خلافت کی تحریک کی علت نمائی ترکی نیشنل اسمبلی کے عمل سے حیرت انگیز طور پر ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک یعنی 1922ء اور 1924ء کے درمیان تو ہندوستان میں تحریک خلافت کے ممبروں نے مصطفےٰ کمال کی فتوحات سے خوش ہو کر ان کے اس اقدام کو بہت سراہا کہ انہوں نے سلطان کے منصب سے خلافت کا منصب جدا کر کے خلافت کو دنیوی اقتدار سے مبرا قرار دے دیا لیکن جب خلافت کا منصب ہی وہاں ختم کر دیا گیا تو ہندوستان میں تحریک خلافت سے وابستہ ممبران بہت مایوس اور ہراساں ہو گئے۔ ان

میں کچھ تو اس صورت حال میں کانگریس سے وابستہ ہو گئے۔ دیگر حضرات مختلف جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔'' ان میں سے ایک نے سرکار برطانیہ سے وابستگی اختیار کرنے کی پرانی روایت کو تازہ کرنے میں سکون واطمینان محسوس کیا۔'' دوسروں نے کانگریس پر مختلف قسم کی تنقیدیں کرنے کا رویہ اپنایا۔ بعض نے ناراض ہو کر ایسے راستے اختیار کیے جو قومی اتحاد کے سراسر خلاف تھے۔ تبھی مسلم لیگ میں جو 1918ء میں جاں بلب ہو چکی تھی بیداری کی ایک لہر پیدا ہو گئی اور 24 رمئی 1924ء کو محمد علی جناح کی صدارت میں لاہور میں مسلم لیگ کی ایک میٹنگ ہوئی۔

سیاست کی اس میں افراتفری میں برطانوی حکومت کو مسلمانوں سے اپنے پرانے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کا موقع ملا تا کہ ان کو پھر حلقۂ اختیار میں لایا جا سکے۔ جو ذرائع حکومت نے اس تحریک کے خلاف اختیار کیے وہ یہ تھے کہ حکومت نے اپنے وفاداروں کے توسط سے کانگریس کے خلاف جوابی پروپیگنڈہ کرانے شروع کیے اور امن سبھائیں قایم کیں۔ اوائل مارچ 1922ء میں لارڈ ریڈنگ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک تار کی اشاعت جس میں ترکوں کی ہم نوائی کی گئی تھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ مسٹر مانٹیگو (سکریٹری آف اسٹیٹ) کے نام تار میں اس کی اشاعت کی اہمیت کی تشریح اس طرح کی گئی تھی:

> '' حکومت ہند کے لیے علی الاعلان ہندستانی مسلمانوں کی طرف داری کرنا اتنا زیادہ اہم ہے کہ ہم اس تار (مذکورہ) کی فوری اشاعت کی اجازت کے لیے زور دیتے ہیں۔'' [1]

مانٹیگو نے اس کی اشاعت اجازت دے دی لیکن اس کی پاداش میں ان کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کی امید تھی۔ حکومت ہند کی

---

[1] لارڈ ریڈنگ از مانٹ گری ہائڈ۔ ص-372

سالانہ رپورٹ 22-1921ء میں درج ہے:

''اس دستاویز (تار) کی اشاعت سے مسلم رائے عامہ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ تحریک ترک موالات اس کے نتیجے کے طور پر بہت کمزور پڑ گئی۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کو جن میں بہت سے پرجوش خلافت تحریک کے حامی بھی شامل تھے یہ یقین ہو چلا کہ گاندھی جی کی لاطائل اسکیموں سے وابستہ رہنے کے بجائے حکومت کی پرخلوص کارروائیوں کی اگر پشت پناہی کی جائے تو بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔''

اور ''لیکن لارڈ ریڈنگ کی سرکار کی اس کھلی خواہش نے کہ مسلم رائے عامہ کو مطمئن رکھا جائے تمام حلقوں میں ایک جوش پیدا کر دیا تھا اور وہ ابھی تک مسٹر گاندھی کی تردید کے لیے برقرار تھا۔'' [1]

نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی خلشیں پھر ابھرنے لگیں۔ پرانی خصومتوں اور ایک دوسرے سے حسد اور خوف کے جذبات نے دونوں فرقوں کے تعلقات کو پھر زہر آلود کرنا شروع کر دیا۔ پرانے قضیے مثلاً گاؤکشی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ کرید کر کے نکالے گئے اور نئے اختلافات مثلاً شدھی یا تبلیغ اور سنگھٹن یا تنظیم کا مزید اضافہ ہوا۔

جواہر لال اپنی سوانح عمری میں رقم طراز ہیں کہ ''بہت ممکن ہے کہ ملک میں ایک بڑی تحریک کے یکا یک رک جانے کے باعث ملک میں یہ افسوس ناک صورت حال پیدا ہو گئی ہو............ دبے ہوئے شدید جوش کو کسی طرف باہر تو نکلنا ہی تھا۔ بعد کے برسوں میں شاید اسی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات بڑھ گئے۔'' [2]

خلیق الزماں نے اس رائے کی تائید کی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ''یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ اس جبریہ قائم کردہ سکونی حالات اور جبریہ عاید کردہ ضبط کی فضا

1۔ انڈیا 22-1921، ص 4-103 2۔ ایک سوانح عمری از جواہر لال نہرو، ص 81

میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف اور انتشار کو پنپنے کا موقع مل گیا اور ان کو شکوک اور اندیشے پیدا ہو گئے کہ ہندوستان اس قابل نہیں ہے کہ وہ سول نافرمانی کے ذریعے آزادی حاصل کر سکے۔'' [1]

3- گاندھی جی کا سہ نکاتی پروگرام

جب گاندھی جی نے اس انتشاری منظر کو دیکھا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ فوری طور پر سول نافرمانی کا اعادہ ناممکن ہے بلکہ اس وقت خاموش رہنا لیکن ساتھ ہی ساتھ سعی بلیغ کے ساتھ تیاری کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے بعد کئی سال تک وہ خاموشی کے ساتھ اپنے سہ نکاتی پروگرام یعنی کھادی، ہندو مسلم اتحاد اور چھوت چھات کے مٹانے کے کام میں لگے رہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کی تعداد بڑھائی جائے، کانگریس کی تنظیم کو اتنا وسیع کی جائے کہ ملک کے تمام قصبات و دیہات بھی اس کے حلقہ اثر میں آ جائیں، رضا کاروں کی فوج کو باقاعدہ نظم وضبط کے ساتھ تربیت دی جائے اور ان سب کاموں کے لیے روپیہ بھی فراہم کیا جائے۔ پڑھے لکھے شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کی غرض سے انہوں نے کانگریس کی ممبری کے قواعد میں ترمیم کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے اور کچلے ہوئے مظلوم اچھوت ذات کے لوگوں کو سربلند کرنے کے لیے سعی بلیغ فرمائی۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ چرخا کاتنا سارے منصوبے کی جان ہے اور سوراج کے دروازے کا قفل اسی کنجی سے کھل سکتا ہے۔ چرخہ پر ان کا اعتقاد اس قدر پکا تھا کہ کسی

---

1. پاتھ دے ٹو پاکستان از چودھری خلیق الزماں 21-1462

قسم کا تمسخر، مغالطہ یا اختلاف اسے متزلزل نہ کرسکتا تھا۔ انہوں نے اسے رائج اور مقبول بنانے کے لیے اپنی ساری قوتیں وقف کردیں اور اس کی خوبیوں اور برکتوں کی تشریح اپنے قول وعمل سے کرتے رہے۔

کھادی کا پرچار گاندھی جی نے دسمبر 1924ء کے کانگریس سیشن منعقدہ بلگام میں شروع کیا جس کی صدارت انہوں نے کی تھی۔ بحثیت صدر کے انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں دو ہی نکتوں پر خاص زور دیا (1) کانگریس میں اتحاد اور التوائے تحریک ترک موالات (2) کھدر اور اس غرض سے کہ ہر ایک کانگریسی اپنے مقصد اصلی سے وابستہ رہے۔ انہوں نے حق رائے دہندگی کی یہ شرط رکھی کہ وہ بجائے چار آنے سالانہ چندہ دینے کے ہر مہینے میں دو ہزار گز سوت کاتے۔

اپنی آخری تقریر میں انہوں نے پرزور الفاظ میں ممبروں کو یہ تلقین کی کہ "اپنے سارے ضلع کا دورہ کرو اور کھدر کا پرچار کرکے اس کا پیغام سمجھاؤ، ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرو اور چھوت چھات کے خلاف آواز بلند کرو اور ملک کے نوجوانوں کے دل اپنی مٹھی میں لے کر ان کو سوراج کا پکا سپاہی بنادو۔"[1]

حق رائے دہی کی شرط میں اس تبدیلی کو انہوں نے ایک زبردست اقدام سے تعبیر کیا اور کہا کہ "اب کانگریس اپنے ہر ایک ممبر سے دو ہزار گز سوت ہر مہینے کاتنے کی یا اتنا ہی سوت اپنے لیے دوسروں سے کتوانے کی توقع رکھتی ہے۔ اس طرح رضا کار سوت کاتنے والوں سے برابر رابطہ بنائے رکھیں گے۔ میری رائے میں حق رائے دہی کی مضبوطی اسی میں ہے۔ اس سے لوگوں کو ایک اعلیٰ درجے کی سیاسی تعلیم بھی ملے گی۔"[2] ان کو امید تھی کہ کم از کم پچاس لاکھ چرخا کاتنے والے آسانی سے اس طرح

1۔ مہاتما از ڈی جی تندولکر۔ جلد دوم ص 228

2۔ مہاتما از ڈی جی تندولکر۔ جلد دوم ص 232

کانگریس میں شامل ہو جائیں گے اور وہ لوگ جو قوم کی خاطر آدھا گھنٹہ ہی دے سکتے ہیں مع اپنے احباب اور پڑوسیوں کے اس تعداد میں مزید اضافہ کر سکیں گے۔ اس طرح کانگریس کے اثر واقتدار میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

ملک کے ہر حصے نے اس اپیل کا خیر مقدم کیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ اس اپیل کو جاری کرنے کے علاوہ گاندھی جی نے اپنے خیالات کا زیادہ پرچار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں سفر اس لیے کرتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں لوگ مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہیں اور میں بھی یقیناً ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا سیدھا سادا پیغام چند لفظوں میں ان کے سامنے پیش کر دیتا ہوں جس سے وہ اور میں دونوں مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ پیغام عوام کے دلوں میں آہستہ سہی مگر پورے طور پر جاگزیں ہو جاتا ہے۔"[1]

انہوں نے گجرات، مدراس (اب یہ صوبہ تامل ناڈو کہلاتا ہے)، بنگال، یو پی (اتر پردیش) کے کچھ صوبوں کا دورہ کیا۔ جون کے مہینے میں وہ بنگال میں تھے۔ جب سی آر داس کا 18/ جون کو انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی نے ان کے سوگ کے ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے سی آر داس کو "ایک عظیم المرتبت" شخص قرار دیا اور اس کے بعد وفور غم سے رو پڑے۔

بنگال سے گاندھی جی بہت متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں یہ صوبہ کئی لحاظ سے بڑی ترقیوں کے امکانات رکھتا تھا۔ انہوں نے بنگالیوں کی سوت کاتنے کی صلاحیت کی بہت تعریف کی اور سارے ہندوستانیوں سے سفارش کی کہ وہ بنگال کے کھادی پرتشٹھان کی مثال سامنے رکھیں۔

جب وہ بہار آئے تو انہوں نے کل ہند کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ طلب کیا جس کا

---

1. مہاتما از ڈی جی تندولکر۔ جلد دوم ص 231

اجلاس 24 رستمبر کو پٹنہ میں ہوا۔ اس میں بعض بہت اہم فیصلے کیے گئے۔ پہلا یہ کہ سوراج پارٹی کا اپنا الگ وجود باقی نہ رہا۔ وہ کانگریس ہی میں مدغم ہوگئی۔ اس طرح کانگریس کا سیاسی کام سوراجیوں یا تبدیلی موافق لوگوں کے سپرد ہوگیا اور تعمیری کام جس میں چرخا بنیادی حیثیت سے شامل تھا سوت کاتنے والوں کی کل ہند ایسوسی ایشن (All India Spinners' Association) کو سونپا گیا۔ یہ انجمن یا ایسوسی ایشن کانگریس کے ایک جز ولاینفک کے طور پر قایم کی گئی تھی لیکن اس کا وجود ایک آزاد اور با اختیار جزو کی حیثیت سے تھا۔ اس کے اپنے ممبر تھے، اپنے اہلکار اور اپنی مجلس عاملہ۔

اس لحاظ سے کانگریس کے دستور کے دو خاص کام ہوگئے۔ ایک وہ جو خود کانگریس کو انجام دینا تھے دوسرا کام ایک آزاد جماعت کو انجام دینا تھا جس کو کانگریس کی حمایت تو حاصل تھی لیکن اس کا فنڈ اور اثاثہ سب الگ تھا۔ کل ہند کھدر بورڈ اور تمام صوبے جاتی کھدر بورڈ اسی ایسوسی ایشن سے ملحق کر دیے گئے۔ تمام کانگریسیوں کے لیے کھدر پہننا لازمی قرار دیا گیا۔

بہار سے گاندھی جی دو دن کے دورے پر اتر پردیش آئے اور وہاں سے کچھ چلے گئے جہاں ان کا قیام پندرہ دن رہا۔ اور پھر 15 رنومبر کو تقریباً پورا سال دورہ کرنے کے بعد وہ سابرمتی واپس پہنچ گئے۔

گاندھی جی کے چرخے کی سخت اور مسلسل پرچار کی کڑی تنقیدیں کی گئیں لیکن سب سے زیادہ شدید حملہ شاعر ٹیگور نے کیا جن کو گاندھی جی 'نگہبان اعظم' کہا کرتے تھے۔ گاندھی جی نے جو اس کا جواب دیا وہ اخلاق، شرافت اور وقار کا ایک نمونہ ہے۔ یہ جواب پر تعظیم ہے، مستحکم، مؤدب ہے لیکن بے باک۔ گاندھی جی نے شاعر کی بڑائی تسلیم کی لیکن ان کے نزدیک ٹیگور کے دلائل میں جو کمزوریاں تھیں انہیں ظاہر کرنے میں کوئی رعایت نہیں کی۔ چرخے کے مسلک کی تبلیغ اس میں نہایت شاندار طریقے پر

کی گئی ہے۔اس کی بنیاد اوّل تو ان کے اس بے پناہ جذبہ ٔہمدردی پر ہے جو انہیں ان مفلس اور نادار مردوں اور عورتوں کے ساتھ تھا جو کام نہ ہونے کے باعث بیکار رہتے ہیں۔ اور ان فاقہ زدہ کسانوں کے ساتھ جن کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافہ کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ دوسرے اس خیال پر کہ دیہات کے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کا یہ ایک اچھا وسیلہ تھا۔ تیسرے یہ کہ گاندھی جی کو پکا یقین تھا کہ اس مسلک سے ہندوستان کے لاکھوں باشندوں کی معیشت اور معاشرت میں یکسانیت پیدا ہونے میں مدد ملے گی۔

سال کے آخر میں گاندھی جی سیاست سے دست بردار ہو گئے اور تقریباً پورا سال 1926ء انہوں نے اپنے آشرم میں کھدر تحریک کی تنظیم میں گزارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کل ہند کتائی انجمن (اسپننگ ایسوسی ایشن) کا کام تیزی سے بڑھا۔ اس کے ڈیڑھ سو مرکز قائم ہو گئے جو پندرہ سو گاؤں کی ضروریات کو پورا کرنے لگے۔ اس قومی ہفتہ کے دوران جو 6/اپریل کو شروع کیا گیا تھا اور جس میں 1919ء کی ستیا گرہ تحریک اور جلیان والا باغ کے قتل عام کی یادگاریں منائی گئی تھیں، انہوں نے اپنے پروپیگنڈہ کی رفتار تیز کر دی۔ انہوں نے لکھا کہ "ایسی کیا چیز ہے جسے ہر شخص بغیر زیادہ محنت کیے کر سکتا ہے اور جس سے ہندوستان کی دولت بڑھ سکتی ہے اور جس سے تنظیم کی قوت بڑھ سکتی ہے اور ہم میں بھائی چارہ پیدا کر سکتی ہے؟ اس کا جواب بلا تامل یہ ہے کہ چرخے کا پہیہ"۔[1]

کامیابی غیر معمولی ہوئی۔ سوراج پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو نے الہ آباد کی سڑکوں پر کھدر پکار پکار کر بیچا، اسکولوں کے بچے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ "گجرات ودیا پیٹھ کے طلبہ کو بتایا گیا کہ خدمت کا بہترین بندھن جو کہ دیہاتوں

---

[1] ایضاً ص 294

کو ہم سے متحد رکھ سکتا ہے وہ چرخے کا پہیہ ہے۔'' 1

اپنی خاموشی کے اس سال کے اختتام پر گاندھی جی نے اعلان کیا کہ '' میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم کو سوراج مل سکتا ہے بلکہ رام راج بھی، اگر ہم سہ نکاتی پروگرام کو مکمل کرلیں...... مجھے اب پہلے سے زیادہ پکا یقین ہوگیا ہے کہ سوراج کا حصول ناممکن ہے جب تک ہندو مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہوتا، جب تک چھوت چھات کی لعنت سے ہم چھٹکارا نہیں پاتے اور جب تک ہمارا متوسط طبقہ سودیشی کے پیغام کو سمجھنے سے انکار کرتا رہے گا۔'' مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ '' جہاں کہیں میں جاؤں گا اپنے مسلک کے ان تین نکات کا جو میرے لیے کلمہ اور گیاتری منتر کی حیثیت رکھتے ہیں اعلان کرتا رہوں گا تاکہ میں اپنے ضمیر اور اپنے مالک (خدا) کا وفادار ثابت ہوسکوں۔'' 2

1927ء میں گوہاٹی (آسام) کانگریس کے بعد گاندھی جی نے دوبارہ کل ہند دورہ شروع کیا۔ جنوری میں وہاں بنگال میں تھے جہاں سے وہاں تھوڑی مدت کے لیے بنارس بھی گئے تھے۔ وسط جنوری میں وہ بہار پہنچے۔ اس کے بعد ممالک متوسط (مدھیہ پردیش) گئے۔ ناگپور میں انہوں نے مسٹر سکلات والا سے ملاقات کی جو برطانوی پارلیمنٹ کے ایک کمیونسٹ ممبر تھے اور دوسری باتوں کے ساتھ انہوں نے کھدر کے متعلق بھی اپنے نظریات کی ان سے تشریح کی۔ گاندھی جی نے اپنے رسالہ ''ینگ انڈیا'' میں لکھا کہ '' کھدر غریبوں کو دولت مندوں کی غلامی سے نجات دلاتا ہے اور اونچے طبقہ اور عوام الناس کے درمیان ایک اخلاقی اور روحانی رشتہ قائم کرتا ہے۔'' مزید یہ کہ '' کھدر میں ایک تنظیمی قوت ہے اس کی خود کی تنظیم اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ یہ سارے ہندوستان پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔'' آخر میں یہ لکھا کہ '' میں اسی لیے

---

1 ایضاً ص 300 2 ایضاً ص-312

دولت کی مساوی تقسیم کے لیے کام کرتا ہوں اور اس مقصد کو میں کھدر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ اس کے حصول سے برطانوی استحصال کا مرکز مفلوج ہوجائے گا اور برطانیہ سے ہمارا رشتہ پاک وصاف ہوجائے گا۔ انہیں معنوں میں کھدر سوراج کے حصول کا ذریعہ ہے۔"[1] فروری کے دوسرے ہفتہ میں ممالک متوسط (مدھیہ پردیش) سے وہ مہاراشٹر چلے گئے اور پھر مارچ کے وسط میں انہوں نے اپنا دورہ صوبہ بمبئی (جواب مہاراشٹر پردیش کہلاتا ہے) کے شہر پونا میں ختم کردیا۔ مہینہ کے آخر میں وہ کرناٹک گئے لیکن وہ مسلسل محنت کرنے کے باعث اتنے کمزور پڑ گئے کہ صاحب فراش ہوگئے۔ لیکن اپریل کے آخر تک وہ ٹھیک ہوگئے اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ جون سے آخر اگست تک وہ میسور میں رہے اور اکتوبر کے آخری ہفتہ تک ان کا قیام صوبہ مدراس میں (جواب تامل ناڈ پردیش کہلاتا ہے) رہا۔

مدراس سے وہ وائسرائے کی دعوت پر دہلی آئے۔ وائسرائے نے ایک رائل کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا جس کے چیرمین جان سائمن تھے تاکہ یہ دستوری اصلاحات کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرے۔ دہلی سے گاندھی جی اڑیسہ چلے گئے اور پھر وہاں سے لنکا روانہ ہوگئے۔ دسمبر میں انہوں نے مدراس میں کانگریس کے جلسے میں شرکت کی۔

مارچ 1928ء میں ان کی چھ سالہ قید کی مدت ختم ہوگئی۔ اگرچہ 1924ء میں بلا شرط رہا کردیے گئے تھے تاہم انہوں نے سیاست میں حصہ لینا پسند نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے خیال کیا کہ اگر وہ علیل نہ ہوجاتے تو وہ قید خانے میں ہوتے۔ 1924ء میں انہوں نے کانگریس کی صدارت البتہ قبول کرلی تھی کیونکہ اس وقت حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ کانگریس کی تنظیم میں انتشار پیدا ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔

---

1. ایضاً ص 40-338

انہوں نے یہ چھ سال کچھ تو اس کوشش میں صرف کیے کانگریس کے ان دو گروپوں میں ایک وہ جو تبدیلی کے موافق تھے دوسرا وہ جو کوئی تبدیلی نہیں چاہتا تھا، مصالحت کرا دیں لیکن زیادہ تر وقت انہوں نے کھدر کے کام میں صرف کیا۔ کل ہند پیمانے پر اس کی تنظیم کی۔ سوت کاتنے کے مرکز ہر صوبے میں کھولے گئے۔ کچے مال کی فراہمی، سوت اور کپڑے کی پیداوار بڑھانے اور اس کی نکاسی کا انتظام کیا گیا اور ایک خطیر رقم اس تنظیم کو چلانے کے لیے جمع کر لی گئی۔

اس تنظیم کی پوری اور واقعی طاقت کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی تنظیم جو حکومت کی سرپرستی سے مبرا ہو اور ساری کی ساری کانگریس کے قابو اور اختیار میں ہو، جس کا منشا لوگوں کی معاشی زندگی کے ایک جزو کو اپنے انتظام میں لانا ہو، وجود میں لے آئی گئی تھی۔ خود کفالتی اور خود اعتمادی کی راہ میں یہ ایک چھوٹا لیکن اہم قدم تھا۔ سارا ہندوستان اور اس کا ہر فرقہ اس میں شامل تھا۔

4- بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ اختلافات

اس عظیم تغیر یا انقلاب کے بعد جو 1918ء میں ہوا تھا، ہندوستان کی تمام پارٹیوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان سب کا اصلی مقصود حصول سوراج ہے یعنی اقتدار کا برطانوی حکومت کے ہاتھ سے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہو جانا۔ اب وہ سب اس خیال کے حامی نہیں رہ گئے تھے کہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے ہم سوراج حاصل کریں اور اس رفتار ترقی کے وقفے نامعلوم مدت تک دراز ہوتے رہیں۔ اس معاملہ میں قوم پرستوں یا فرقہ پرستوں میں ذرا بھی اختلاف رائے نہ تھا۔

ساتھ ہی تمام پارٹیوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ حصول سوراج کی کنجی ہندو مسلم اتحاد ہی ہے۔ اس معاملہ میں گاندھی جی اور جناح کے خیالات بھی یکساں تھے۔ گاندھی جی نے

کہا کہ "میں اس بات پر مسٹر جناح سے متفق ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد ہی کے معنی سوراج ہیں۔"[1] ینگ انڈیا کے ایک مضمون میں انہوں نے تحریر کیا" ہندوستان میں سوراج کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا جب تک ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں پختہ اتحاد و اتفاق نہ ہو جائے۔"[2]

1924ء میں لاہور میں منعقد مسلم لیگ کے جلسے میں جناح نے کہا تھا کہ "ہم کو نہ بھولنا چاہیئے کہ حصول سوراج کی لازمی شرط ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد و اتفاق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں صاف اور کھل کر کہوں کہ ہندوستان کو نوآبادیاتی ذمہ دار حکومت (Dominion Responsible Govt) کا درجہ اسی دن مل جائیگا جس دن ہندو اور مسلمان متحد ہو گئے۔"[3] دوسرے رہنمایان قوم بھی انہیں الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے رہے۔

گاندھی جی نے ان الفاظ میں خلافت کے معاملے میں مسلمانوں کی تائید کرنے کو درست قرار دیا۔" خلافت اب دوبارہ سو سال تک قایم نہ ہو سکے گی۔ اگر ہندو مسلمانوں سے ابدی دوستی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں تو اسلام کی عزت کی لاج رکھنے کے لیے انہیں چاہیئے کہ اپنی جانیں لڑا دیں۔"[4] ان کے نزدیک "گئو رکشا کا آخری اور واحد طریقہ یہی ہے کہ خلافت کو بچالیا جائے"[5] ان کی اس جذباتی شدت کا باعث یہ احساس تھا کہ" دونوں (فرقوں) کو مضبوط اور متحد کرنے والی سیمنٹ ابھی کمزور اور گیلی ہے۔ اب بھی دونوں کو ایک دوسرے پر پورا اعتبار نہیں ہے۔ مسلم عوام

---

1. ینگ انڈیا۔ 29/مئی 1920ء۔ ہندو مسلم کشمکش، اس کے اسباب اور اس کا علاج از تندولکر، بحوالہ گزشتہ، جلد دوم ص-174

2. ینگ انڈیا۔ 6/اکتوبر 1920ء ص-404

3. جناح از ایچ، ایم سید۔ ص-305

4. ینگ انڈیا۔ 11/مئی 1921ء ص-408

5. ایضاً۔ 21/مئی 1921ء ص-411

اب بھی حصول سوراج کی ضرورت کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی کہ ہندو...... مسلمانوں میں قومی جذبے کی بیداری کو ابھی بذرہ عرصہ بھی نہیں گزرا ہے۔"[1] دونوں فرقوں میں عدم اعتماد کے وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ" میں جانتا ہوں کہ ان دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید بلکہ بہت شدید عدم اعتمادی ہے...... وہ (ہندو) یہ سمجھتے ہیں کہ سوراج کے معنی مسلم راج کے ہیں...... دوسری طرف مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ ہندو بیحد اکثریت میں ہونے کے باعث انہیں پیس کر رکھ دیں گے۔"[2]

ہندو اکثریت کا ہوا سب سے پہلے سر سید کے برطانوی مشیروں نے کھڑا کیا تھا اور جس کا اعادہ مسلم لیڈروں نے متعدد موقعوں پر کیا تھا۔ اس خوف کو دور کرنے کے لیے ہندستانی دستور کی اسکیموں میں جسے کانگریس اور مسلم لیگ نے مل کر تیار کیا تھا مختلف قسم کی ضمانتیں تحفظ اور بچاؤ کے خیال سے رکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ آزادی اور اتحاد ہندو اور مسلمان دونوں چاہتے تھے۔ بہرحال عام طور سے یہ مان لیا گیا تھا کہ جہاں تک ہندوستان کے باشندوں کے مذہب کا تعلق ہے ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں۔ رفتہ رفتہ برطانوی دایہ کی مدد سے اس تصور نے جنم لیا کہ مذہب کی بنا پر یہ دو مختلف فرقے ہیں۔ فطری طور پر اقلیت کو اپنی علاحدہ شخصیت کا احساس پیدا ہوگیا۔ 1906ء تک اس احساس نے ایک سیاسی شکل اختیار کرلی۔ انہوں نے علاحدہ انتخاب کا مطالبہ شروع کردیا۔ تقسیم بنگال کے ہنگامے نے فرقہ واریت کی جڑوں کو مضبوط کردیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے حریف کی صورت میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑگئی۔ 1909ء میں منٹو مارلے اصلاحات نے اس پر سرکاری مہر لگادی اور فرقہ واریت کے قالب میں جان ڈال دی۔

1۔ ینگ انڈیا۔ 28/ جولائی 1921 ص 14-413

2۔ ایضاً 11/ مئی 1921 ص 7-406

اس صورت حال کو بڑھاوا دینے میں برطانوی حکمرانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کا تفصیلی بیان اس کتاب کی دوسری جلد کے ابواب میں ملے گا اور بعد کی دو جلدوں میں بھی۔

بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری افسران کانگریس کی کارکردگیوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حصول آزادی کے سلسلے میں اس کو یکسر ایک ہندو تحریک سمجھتے تھے۔لارڈ اروِن نے اپنے مضمون "ہندوستان میں سیاسی زندگی کا ارتقا" میں تحریر کیا ہے کہ "یہ اپنے ابتدائی زمانے ہی سے ہندو جماعت رہی ہے۔"[1]

برطانوی راج کی برقراری کے لیے یہ ضروری تھا کہ کانگریس کے اثرات کو کم کیا جائے اور ہندو فرقے کے حریف اور مد مقابل پیدا کیے جائیں۔ ہندوؤں کی عزت وقدر گھٹانے کی واضح چال کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں پر عنایتیں کی جائیں۔ اس کی متعدد مثالیں شروع ہی سے ملتی ہیں۔ بیسویں صدی میں 1905ء ہی میں لاڈ کرزن کی تقسیم بنگالہ، یکم اکتوبر 1906ء کو لارڈ منٹو کی مسلمانوں کو یہ یقین دہانی کہ ان کو علاحدہ نمائندگی اور علاحدہ ووٹ دینے کا حق مل سکے گا اور پھر مانٹیگو چیمسفورڈ کا 1919ء کی اصلاحات میں ان کارپردازیوں کی تصدیق کرنا، اس پالیسی کی نمایاں مثالیں ہیں۔

سابق سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند مسٹر اولیور نے برطانیہ کی اس جانب داری کے متعلق یہ الفاظ کہے: "میرا قطعی خیال یہ ہے کہ یہ بات صفائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ زیادہ تر انگریز جو ہندوستان میں ملازمت کرتے ہیں وہ مسلم فرقے کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان کو ہندوؤں خاص کر بنگالیوں کے مقابلے میں حکومت کرنے کا زیادہ اہل سمجھتے ہیں۔"[2] اس سے پیشتر انہوں نے 'ٹائمس' اخبار میں لکھا تھا

---

[1] سرجے کننگ۔ پولیٹیکل انڈیا، ص 18 [2] لارڈ اولیور کی اسپیچ 28 جولائی 1926ء ہاؤس آف لارڈز کے مذاکرے۔ پانچواں سلسلہ، جلد 65 کالم 316

کہ "کوئی شخص جسے ہندوستانی معاملات سے پوری واقفیت ہوگی اس بات کی تردید کرنے پر تیار نہ ہوگا کہ جو افسران برطانیہ نے ہندوستان میں متعین کیے ہیں ان میں بہ صورت مجموعی مسلمانوں کی طرف داری غالب ہے۔"[1]

لارڈ ریڈنگ نے جو اسی زمانے میں اپنے وایسرائے کے عہدے سے سبک دوش ہوکر انگلستان واپس ہوئے تھے، غالباً رسمی اور دستوری طریق کار کے بموجب اس الزام کی شدت سے تردید کی۔

اس طرح وہ دورنگی جو محض سماجی اور مذہبی حیثیت رکھتی تھی سیاست نے اسے کئی رنگوں میں تبدیل کردیا۔ اور اس صورت حال کی 1909ء اور 1919ء کے حکومت ہند کے قوانین نے تصدیق بھی کردی۔

اگر حکومت کے اس طرز عمل سے اقلیت اکثریت کی طرف سے ایک خوف زدہ اور ہراساں سیاسی جماعت نہ بن گئی ہوتی تو اس وقت اس مسئلہ کا حل ضرور نکال لیا جاتا۔ اقلیتی فرقے کے مذہب، کلچر، تعلیم، ملازمتوں اور ان کی نمایندگیوں کے معاملات دستور ہند میں کس طرح فراہم کردیے جائیں۔

لیکن 1909ء اور 1919ء کے قوانین کے اعلان ونفاذ کے بعد یہ آسان اور معمولی حل بھی ناممکن ہوگیا۔ مسئلہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ فرقے کا شعور قومیت کے جذبے سے تیزی سے معمور ہونے لگا تھا۔ لیکن اس جذبے کے واضح اظہار میں کچھ وقت لگ گیا۔

1913-22ء کی دہائی میں یہ امید پیدا ہوچلی تھی کہ ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کا وفاقی اتحاد طے ہوجائے گا۔ گاندھی جی نے اس خیال کی پرزور تائید کی لیکن وہ اس مسئلے کے نفسیاتی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس قدر الجھ گئے تھے کہ وہ اس کے سیاسی پہلو

1۔ لارڈ ریڈنگ کی تقریر میں ایک لارڈ اولیور کا حوالہ جو متذکرہ بالا مضمون مطبوعہ ٹائمس کالم 317 سے لیا گیا تھا۔

پر کما حقہ توجہ نہ دے سکے۔ دراصل اتحاد یا اختلاف کا سوال اس قدر مذہبی نہ تھا جتنا کہ سیاسی۔ ظاہر ہے کہ یہ اگر خالص مذہبی ہوتا تو اس کا حل ناممکن ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے مذہبی اتحاد کی کوششیں ناکام رہی ہیں۔ کبیر، نانک، اکبر اور اسی طرح کے دیگر متعدد لوگوں کی کوششیں اسلام اور ہندومت کو ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہی ہیں اور یہی ناکامی ان تمام کوششوں میں بھی ہوئی ہے جن کے ذریعے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یا شیعہ اور سنی فرقوں کو متحد کرنے کے لیے کی گئیں۔

گاندھی جی سیاسی آدمی نہ تھے اور اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے معمولی واقعات جیسے مسجدوں کے سامنے باجا بجانا یا بقرعید کے موقع پر گاؤکشی صرف سوسائٹی کے اعضائے رئیسہ کی اندرونی علالت کی ظاہری علامت ہیں۔ لیکن انہوں نے تسلیم کرلیا کہ وہ ان چیزوں کو مٹانے کی اہلیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کا 1924ء میں اکیس دن کا برت بھی ان مسائل کو حل کرنے میں بے اثر ثابت ہو چکا تھا۔

1919ء سے 1922ء تک ترک موالات کے زمانے میں اتحاد ہو جانے کی بہت امیدیں تھیں لیکن وہ محض عارضی اور وقتی ثابت ہوئیں۔

جب خلافت کے لیڈروں نے گاندھی جی کو اپنے ساتھ تعاون کرنے کی دعوت دی تھی تو ان کے پیروؤں نے چاہا تھا کہ پہلے چند فقہی شکوک رفع کر لیے جائیں۔ ان لیڈروں سے پوچھا گیا کہ کیا اس جدوجہد میں مسلمان غیر مسلموں سے مدد قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں علماء نے یہ جواب دے کر ان کے شکوک رفع کیے کہ اس قسم کی امداد سنت رسول کے مطابق ہے۔ پیغمبر صاحب نے کفار عرب سے لڑنے کے لیے یہودیوں سے معاہدہ کیا تھا اس لیے ہمارے لیے کوئی رکاوٹ اپنے دشمنوں یعنی انگریزوں سے لڑنے کے لیے ہندوؤں سے تعاون کرنے میں نہیں ہے۔

اس طرح گاندھی جی جب کہ اپنے دل میں قومی اتحاد کو ترقی دینے کے خیالات

بسائے ہوئے تھے مذہبی تحریک کے علم بردار دوسرے معروف فرقے سے صرف ایک مخصوص مقصد کے لیے مدد لینے کو تیار تھے۔ ہندوؤں کو خلافت کی تحریک میں شامل کرنے کے لیے خلافت والوں نے خلافت تحریک کے مقاصد میں توسیع کر دی اور دو نئی شقوں کا اضافہ کر دیا یعنی پنجاب میں جو غلطیاں انگریزوں نے کی ہیں ان کی درستی کی جائے اور دوسرے حصول سوراج۔ لیکن جیسا کہ خالد بن سعید نے لکھا ہے:

"مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے بلکہ ترکی میں قیام خلافت کے لیے لڑ رہے تھے جبکہ گاندھی خلافت کو ایک ایسا ہتھیار سمجھتے تھے جسے وہ ہندوستان کے لیے جلد تر حصول سوراج لیے استعمال کر سکتے تھے۔"[1]

مقاصد میں اس قدر اختلاف کے باعث اتحاد قائم رکھنا دشوار تھا خصوصاً جب کہ خلافت کے عارضی سوال کا حل فوری طور پر درکار تھا اور اس میں تاخیر مسلمانوں کے لیے بے صبری کا باعث تھی۔

اس بے صبری کے اثرات مسلمان رہنماؤں کی تقریروں اور تحریروں اور پھر ان کے ردعمل سے بھی متعصب ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ اپریل 1919ء میں امیر افغانستان نے ہندوستانی سرحدوں پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے سرحدی قبائل میں کافی بے چینی پھیل گئی۔ سرحد پر بے چینی بڑھ جانے کے علاوہ چند خلافت کے لیڈران بھی اس سے مشتعل ہو گئے اور انہوں نے غیر ذمہ دارانہ بیانات دینا شروع کر دیے۔ مثال کے طور پر محمد علی پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ جذبہ اسلامی کی خاطر امیر افغانستان کی مدد کریں اگر وہ انگریزوں پر حملہ کر دے۔ تب بعد کو کراچی کی عدالت میں انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ مسلمان پہلے ہیں، کچھ اور بعد کو۔

---

1. پاکستان: ابتدائی تعمیری حالات۔ ص58 (1990) بزبان انگریزی از خالد بن سعید

ان دونوں بیانات سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ گاندھی جی نے ان بیانات کی تصریح اس طرح کی کہ ہر اس شخص پر جو ترک موالات کر رہا ہو یہ فرض ہے کہ اس حکومت کی مدد نہ کرے جس کی وہ مخالفت کر رہا ہے۔ اور جہاں تک وفاداری ملک کا تعلق ہے خود ان کا خیال ہے کہ ضمیر کو ملک پر اولیت حاصل ہے۔

ابوالکلام آزاد کتاب وسنت کے حوالے سے ایک واضح اور مستند رائے پہلے ہی دے چکے تھے۔ (29/فروری 1920ء) کہ ہندوستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ حملہ آوروں سے اپنے ملک کی حفاظت کریں خواہ یہ حملہ آور مسلمان ہی کیوں نہ ہوں یا خود خلیفہ کی فوج ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن یہ کہنا کہ ان دونوں تشریحات سے آپس کی غلط فہمیاں کی دور ہو گئیں، غالباً صحیح نہ ہوگا۔

دوسری طرف انتہا پسند مسلمان آہنسا کے سخت آداب (ڈسپلن) سے جو اس نے 'افکار، اقول اور اعمال، پر عاید کر رکھے تھے مطمئن نہ تھے۔ وہ دوسری صورتیں اختیار کرنے کی بات کر رہے تھے اگر ترک موالات کا گاندھیائی منصوبہ ناکام ہو جائے۔ ان کے شک اور شبہے اس وقت اور بھی بڑھ گئے جب گاندھی جی 1921ء میں ریڈنگ سے ملے اور جس کے نتیجے میں انہوں نے مولانا محمد علی کو سمجھایا کہ وہ اپنی تقریروں کے سلسلے میں معافی مانگ لیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں ریڈنگ کی چال یہ تھی کہ گاندھی جی مولانا محمد علی کی تذلیل کریں اور ہندو مسلم اتحاد کو ختم کر دیں۔

بہرحال جب یہ دونوں فریق ایک تذبذب اور گومگو کی حالت میں تھے ہندو مسلم فسادات نے مختلف مقامات مثلاً بنگال پنجاب اور دیگر صوبوں میں سر اٹھانا شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ خراب صورت حال کیرالا میں پیدا ہوئی جہاں

اگست 1921ء میں موپلوں نے فساد برپا کردیا۔ موپلوں نے ہندوؤں پر بہت سخت بہیمانہ مظالم کیے اور بعض ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کرلیا۔ ان کے ان مذموم افعال کی خبروں نے سارے ہندوستان میں ایک سراسیمگی پھیلا دی۔ خوش قسمتی سے کانگریس کی تنظیم اس کے اثرات کو بہت کچھ کم کردینے میں کامیاب ہوگئی اس لیے ترک موالات کی تحریک پر اس کا کوئی خاص اثر نہ پڑا پھر بھی ہندو مسلم اتحاد کو اس سے بڑا سخت دھکا پہنچ گیا۔

ترک موالات کی تحریک کے التوا اور گاندھی جی کی اسیری نے کام کو بہت سست کردیا۔ میدان سے وہ شخص ہٹادیا گیا جو ہندو مسلم اتحاد کے رشتے کو جو اگرچہ کمزور تھا مگر بالکل ٹوٹ جانے سے بچا سکتا تھا۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث انتشاری رجحانات نے تیزی سے زور پکڑنا شروع کردیا۔ دو باتوں سے ان رجحانات کو اور تقویت پہنچی۔ اول تو یہ کہ گورنمنٹ نے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمان اور سرکار کی دوستی میں جو رخنہ پڑ گیا تھا اسے ترکی کی علی الاعلان حمایت سے پر کیا جائے۔ دوسرے ترکی کے ان لیڈروں کو سراہا جائے جو خلافت پھر سے قائم کرانے کی موافقت میں تھے۔ کچھ مسلمانوں نے اس لیے اب یہ سوچنا شروع کردیا کہ بجائے کانگریس اور خلافت کانفرنس کی پکار پر ایثار و قربانی دینے کے اگر حکومت کو خوش رکھا جائے تو بہت کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

ان تمام حالات اور واقعات کا ایک نتیجہ تو یہی نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ شعور اور سیاسی اندیشے بیدار ہوگئے۔ دونوں فرقوں نے سیاسی طور پر اپنے کو الگ تھلگ سمجھنا شروع کردیا۔ ان کے سیاسی مقاصد بھی الگ الگ ہوگئے۔ فرقہ وارانہ فسادات شدت اور کثرت کے ساتھ سال بہ سال ہونے لگے جس سے منافرت اور دشمنی بڑھتی رہی۔ گاندھی جی نے دونوں کے شکوک وشبہات کے نتائج کا جو اندازہ

لگایا تھا وہ صحیح نکلا۔ وہ لوگ جانوں کی تلافی اور اموال کی تباہی کا سخت خمیازہ بھگت رہے تھے اور دونوں میں نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

1921 اور 1929 کے عرصہ میں جو وحشیانہ بربریت کے مظاہرے ہوئے ان سے اس زمانے کی تاریخ داغدار ہے اور وہ نا قابل بیان ہیں۔ لیکن تاریخ خیر و شر کے مجموعے کا نام ہے، پرامن ترقیوں کے ساتھ خونیں جنگ آزمائیوں کا بھی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ شدید فرقہ وارانہ فسادات کہنے کو تو بظاہر مذہبی تھے لیکن دراصل ان کی بنیاد سیاسی تھی۔ ایک طرف تو فرقے کے مستقبل کے متعلق پریشانیاں تھیں، اس کے مرتبے کے متعلق تردداد تھے اور اس کی معیشت کے متعلق شک و شبہے تھے تو دوسری طرف اکثریت والے فرقے کو اندیشے تھے کہ دوسرے فرقہ کی وفاداریاں بیرون ہند ممالک سے نہ بڑھ جائیں اور ان کی اتحاد ممالک اسلامی سے وابستگی نہ بڑھ جائے جو ہندوستان کی آزادی اور سالمیت کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔

ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لیڈروں کے شکوک اور اندیشے دور کرنے کے لیے لیے انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے مخلصانہ کوششیں کیں۔ بدقسمتی سے دونوں ناکام رہے۔ اس ناکامیابی کی ذمہ دار دونوں پارٹیاں تھیں اور جیسا کہ گاندھی جی نے بعد کو محسوس کیا کہ تیسری پارٹی کی موجودگی نے اس کام کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔

ہندوستانی پڑھے لکھے طبقے نے جو برطانوی اثرات کے تحت پروان چڑھا تھا، برطانیہ ہی کے سیاسی تصورات سے متاثر تھا اور برطانوی سیاسی تجربات ہی کو مانتا تھا۔ برطانوی قوم مقابلتاً ایک ہم جنس قوم تھی اور ان کا نظام حکومت یک مرکزی تھا۔ برطانیہ کے سیاسی مفکرین نے پارلیمانی طرز کی نمائندہ حکومت کے نظریات ایک ہم جنس، متحد

الخیال اور متحد العمل برطانوی سماج کے ڈھانچے کی بنیاد پر قائم کیے تھے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے الیکشن کے لیے انہوں نے جو عام ووٹروں کے انتخابی حلقے بنائے تھے وہ علاقائی یعنی محال، قصبہ یا ضلع وغیرہ تھے۔ مخصوص انتخابی حلقے (مثلاً یونیورسٹیاں) ان کے وہاں شاذ ہی ہوتے تھے۔ برطانوی سماج، ہمارے ملک کی طرح، مختلف سماجوں کا مجموعہ نہ تھا بلکہ صرف افراد کی جماعت کا نام تھا۔

ہمارے قومی رہنماؤں نے یہی تصورات ہندوستان میں بھی تجویز کیے لیکن اقلیتی فرقے نے اس کے نتائج کا اندازہ لگالیا اور رفتہ رفتہ وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اس سے ان کو بڑے نقصان پہنچیں گے۔ چنانچہ انہوں نے، اپنے برطانوی رہبروں کی ترغیب پر، پہلے تو علاحدہ نمائندگی کا مطالبہ کیا، پھر اس مطالبہ کو اور وسعت دے کر مسلم اکثریت کے صوبوں میں اضافے کی مانگ کی۔ سندھ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب، بنگال اور آسام۔ اور آخر میں اس پر اصرار کرنے لگے صوبوں کو اختیارات خصوصی (Residuary Powers) حاصل ہوں، مرکز کے اختیارات محدود کر دیے جائیں اور مذہبی اور ثقافتی آزادی کی دستوری ضمانتیں ہوں اور ملازمتوں میں حصہ داری متعین ہو جائے۔

دوسری باتیں جن سے اختلافات بڑھے مسلم مصنفوں نے بھی قلم بند کی ہیں۔ مثلاً خالد بن سعید لکھتے ہیں: "اس بات کو زور دے کر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں علاحدہ ملت ہونے کا احساس بھی (اور اس موضوع پر قرآن شریف میں بار بار تاکید کی گئی ہے) ایک قومی سبب تھا جو ایک مشترکہ ہندوستانی قومیت کے نشوونما میں مانع رہا۔ مزید برآں مسلمانوں میں ہندوستان پر حکم رانی کرنے کی یادیں بالخصوص مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے میں اب بھی تازہ تھیں اور ان باتوں کو یہ اعلیٰ طبقہ عام مسلمانوں کو یاد دلاتا بھی رہتا تھا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں کو جنہوں نے ہندوستان پر حکومت

کی ہے ہندو اکثریت کو اپنے اوپر حکمراں نہ بننے دینا چاہیے۔"[1]

عزیز صاحب لکھتے ہیں: "غیر ملکی حکمراں عام طور پر سرکش رعایا سے خوش نہیں رہتے...... ان کو اس بات سے خوشی ہوتی ہے اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی محکوم رعایا کا ایک طبقہ ان کا طرف دار ہے یا کم از کم رعایا کا طرف دار نہیں ہے۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور اقلیتیں حکمراں طاقتوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنا ایک دانش مندانہ فعل سمجھتی ہیں۔ اسی لیے مسلمانوں نے حالات سے مجبور ہو کر انگریزوں کے دامن میں پناہ لی اور ہندوؤں نے اس بات کو پسند نہیں کیا"۔[2]

مسلمانوں کے جس طبقے نے انگریزوں کے دامن میں پناہ ڈھونڈی انہوں نے یہ اس لیے کیا کہ غدر 1857ء کے عبرت ناک نتائج کی یادوں نے انہیں خوف زدہ کر دیا تھا اور اس لیے اب جو ان کو انگریزوں کی پشت پناہی ملی اس کے وہ انتہائی شکر گزار ہوئے۔

5-فرقہ وارانہ فسادات

علاحدگی کے یہ میلانات کچھ تو حقیقی یا فرضی دعووں پر مبنی تھے اور کچھ بنیادی سیاسی مسائل پر صحیح یا مبالغہ آمیز اختلاف رائے پر۔ نتیجہ دونوں کا ایک طرف تو جھگڑوں اور فسادات کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسری طرف مخلصانہ طور پر کوششیں بھی کی گئیں کہ ان اختلافات کا کوئی حل نکل آئے۔

فرقہ وارانہ فسادات جو بدقسمتی سے 1921ء میں شروع ہو گئے تھے زیادہ تر شہروں تک محدود رہے۔ وہ اس وقت واقع ہوئے تھے جب تیوہار منائے جاتے تھے

1۔ خالد بن سعید Pakistan: The Formating Phase (1960) ص-7

2۔ کے۔ کے عزیز: دی میکنگ آف پاکستان (The Making of Pakistan) ص 94

مثلاً جب دسہرے کے موقع پر ہندوؤں کے جلوس گاتے بجاتے ہوئے مسجدوں کے سامنے سے اس وقت نکلتے تھے جب نماز کا وقت ہوتا تھا یا جب مسلمان محرم اور بقرعید مناتے تھے۔ لیکن ان مذہبی فسادات کے پردے کے پیچھے دونوں فرقوں کے اپنے حقوق کا ادعا پوشیدہ تھا اور اس کو شہ ملتی تھی ان رقابتوں سے جو میونسپل الیکشن میں پیدا ہو جاتی تھیں اور جن کا رشتہ صوبائی اور مرکزی سیاست سے جڑا ہوا ہوتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان فسادات کا سدباب ہوسکتا ہے اگر ضلع کے افسران یعنی ضلع مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ پولیس انہیں روکنا چاہیں۔ جناح نے پارلیمنٹ کی مشترکہ منتخب کمیٹی (Joint Select Committee of Parliament) کے سامنے جو گورنمنٹ آف انڈیا ریفارم بل 1919ء کو جانچنے کے لیے مقرر کی گئی تھی، اپنی شہادت میں یہ کہا تھا "اگر مجھ سے آپ پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ فسادات زیادہ تر کسی غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں اور پھر پولیس کسی ایک فریق کی طرف داری کرنے لگتی ہے۔"

1922-1923ء میں پشتے ٹوٹ گئے اور ظلم و تعدی کا سیلاب آ گیا۔ پنجاب، راجستھان، اتر پردیش، بہار، بنگال، بمبئی، حیدرآباد دکن اور آندھرا، ان سب مقامات پر فسادات ہوئے۔ چونکہ یہ فسادات موپلا بغاوت کے بعد ہوئے تھے اس لیے ان میں شدت اور کشاکش اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔

1923ء میں آسمان پر اور زیادہ گہرے بادل چھا گئے۔ انڈین نیشنل کانگریس دو گروہوں میں بٹ گئی ایک گروہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ دوسرا تبدیلی کی موافقت میں تھا۔ سوراجیوں کی پارٹی جس کے لیڈر سی آر داس اور موتی لال نہرو تھے مرکزی اور صوبائی الیکشن لڑنے کی تیاری میں لگ گئی۔ خلافت کمیٹی بڑی پریشانی کی حالت میں تھی اور اس کے بعض لیڈر یہ مشورہ دے رہے تھے کہ سرکار ہند سے پھر

اشتراک واتحاد کرلیا جائے۔

ہندومہا سبھا کی مقبولیت بڑھتی جاری تھی۔ مدن موہن مالویہ اس خستہ تنظیم کو از سرنو جان دار بنا رہے تھے اور کئی بڑے کانگریسی رہنما مثلاً لاجپت رائے، شردھانند اور جیکار اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لاجپت رائے ہندو مسلم اتحاد کے حصول سے ناامید ہوگئے تھے اور پھر بعد میں ٹیگور نے بھی ان کے خیالات کی تائید کی۔[1] 1923ء میں بنارس میں ہندومہا سبھا کا سالانہ اجلاس ہوا اس میں مالویہ جی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوؤں کی ایک تنظیم (سنگھٹن) قایم کی جائے تا کہ وہ ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔ شردھانند نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی اسکیم (شدھی) شروع کردی۔

مسلم لیگ تعطل کی حالت میں تھی لیکن جب 1923ء میں ہندومہا سبھا کا احیا کیا گیا تو نتیجہ کے طور پر اس میں بھی حرکت پیدا ہوگئی۔ کئی برسوں کے بعد اس کا اجلاس پہلی مرتبہ ایک ایسے مقام پر یعنی لکھنؤ میں کیا گیا جو کانگریس کے جلسہ کے مقام انعقاد سے دوسری جگہ پر تھا۔ اس کے صدر غلام محمد بھرگری نے ہندو مسلم مفاہمت کی ایک زوردار اپیل کی۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ اختلافات کا جاری رہنا سوراج کے حصول کو صرف ایک خیال وخواب اور دور کے ڈھول کی سہانی آواز بنادے گا۔ اسی اجلاس میں (ڈاکٹر) انصاری نے زور دیا کہ ایک قومی معاہدہ کی تشکیل کی جائے تا کہ مختلف فرقوں میں اتحاد اور ہم آہنگی کی ضمانت ہو جائے۔

لیکن فضا خراب ہو چکی تھی۔ کچلو نے ردعمل کے طور پر تبلیغ اور تنظیم کی تحریکات شروع کردی تھیں۔ فضل حسین اس بات کی وکالت کر رہے تھے کہ ہندوؤں کی پست اقوام

1۔ رابندرناتھ ٹیگور: تھرو انڈین آئیز (ٹائمس آف انڈیا مورخہ 18 اپریل 1924ء) دیکھو رام گوپال: انڈین مسلمس۔ ص 165

کو اسلام کے دائرہ میں لایا جائے۔ مسلم لیگیوں اور خلافت والوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ اس کے نتیجے میں جو فسادات ہوئے ان سے جذبات اور مشتعل ہو گئے اور دشمنی اور بڑھ گئی۔

بہرحال دونوں پارٹیوں نے اس صورت حال کے خراب نتائج کو محسوس کیا۔ بھرگری اور انصاری نے مسلمانوں میں اس جوش کو روکنے کی کوشش کی۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسی قسم کی کوششیں کیں۔ کانگریس نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ممبر لاجپت رائے، انصاری اور ایک سکھ صاحب[1] تھے، کہ وہ ایک مسودہ تیار کرے جسے سولن معاہدہ (Solan Pact) کہا جاتا ہے۔ سی آر داس نے بنگال معاہدہ (Bengal Pact) کے نام سے ایک مسودہ تیار کیا جسے کانگریس نے کوکناڈا میں نامنظور کر دیا۔

مصالحت کی ان کوششوں کی ناکامی سے ان رجعت پسندانہ عناصر کو جو ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات میں بنیادی تبدیلیوں کے خلاف تھے ایک موقع مل گیا کہ وہ اپنی بات تسلیم کرا سکیں۔ مسلم انتہا پسندوں نے کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ اور نامذہبی کردار کے متعلق شکوک ظاہر کرنا شروع کیے۔ ہندو انتہا پسندوں نے پان اسلامیت کا ہوا کھڑا کر دیا کہ اس سے ہندوستان میں پھر مسلمانوں کا غلبہ قایم ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی طرف سے علاحدگی کے پرجوش نعروں اور ہندوؤں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت سے فضا گونجنے لگی۔

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ریڈنگ ایک طرف تو اس کوشش میں لگا تھا کہ مسلمانوں کو خوش کر لے اور انہیں منا لے کہ وہ کانگریس کو چھوڑ دیں۔ دوسری طرف سوراج پارٹی والوں کی ہمت افزائی کر رہا تھا کہ وہ کانگریس میں دراڑ ڈالیں۔ 28/فروری 1922ء

---

1. سردار مہتاب سنگھ سکھ ممبر تھے۔ جب وہ جیل بھیج دیے گئے تو جسوال کے سردار امر سنگھ مقرر کیے گئے۔

کے ترکوں کی موافقت میں اپنا خط شایع کرا کے اس نے مسلمانوں کو تو خوش کر ہی دیا۔اس نے افغانستان کے امیر امان اللہ سے ایک صلح نامہ کرلیا جس کے باعث اس ملک سے بھی تعلقات قایم ہو گئے۔اس صلح نامے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مطالبات کی تائید کی جو امیدیں امیر (امان اللہ) سے تھیں وہ ٹوٹ جائیں کیونکہ بقول اس کے بیٹے کے ''افغانوں کے ساتھ یہ معاہدہ پان اسلامی تصور کی خام خیالی کو باطل کر دے گا''[1]

1924ء میں ریڈنگ بڑی بدنیتی کے ساتھ جناح اور موتی لال نہرو کے درمیان جھگڑے میں دلچسپی لے رہا تھا۔وہ یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ جناح وائسرائے کی مدد کے خواستگار ہوں گے تا کہ وہ اپنا وقار کھوئے بغیر سوراج پسندوں اور آزاد خیالوں کے معاہدے سے گلوخلاصی حاصل کرسکیں۔[2]

جہاں تک سوراج پسندوں کا تعلق ہے ان کو طرح طرح کے سبز باغ دکھائے گئے۔ان کو دعوت دی گئی کہ وہ مزاحمت کرنے کا طریقہ چھوڑ دیں اور اس کے صلے کے طور پر ان کو مختلف کمیٹیوں مثلاً ریفارمس انکوائری کمیٹی،اسکین کمیٹی وغیرہ کی ممبری پیش کی گئی۔آخر کار گورنمنٹ کامیاب ہوئی۔پٹیل کو مجلس قانون ساز کا صدر چنا گیا اور موتی لال نہرو کو اسکین کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ممالک متوسط (Central Provirees) میں ایک سوراجی لیڈر کو اس صوبے کے گورنر کی مجلس عاملہ کا ایک ممبر بنا دیا گیا۔تب (سوراج پارٹی میں) میں انتشار پیدا ہو گیا۔جیکار،کیلکر اور مونجے (Responsive Cooperation) (ہمدردی کے ساتھ اتحاد) کی ایک الگ پارٹی بنا کر سوراجیوں سے الگ ہو گئے۔

1۔ مارکوئس آف ریڈنگ از روفس آئزک: جلد دوم (1914-35)۔ص 225

2۔ ایضاً۔ص 29

جواہر لال اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ گورنمنٹ کی حکمت عملی کی بنیاد اس پر ہے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ گورنمنٹ ہمیشہ سے قوم پرستوں کی مساعی کو نا کامیاب بنانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ پھر بھی وہ یہ کہتے تھے کہ گورنمنٹ کی شکایت کرنا بیکار ہے کیونکہ " بدقسمتی یہ تھی کہ بہت سے کانگریسی بھی اوڑھے تو قومی لبادہ تھے لیکن دراصل فرقہ پرست تھے۔" 1

اس فضا میں فرقہ پرستی کو فروغ ہوا اور بعض بڑے کٹر کانگریسی بھی فرقہ پرستی والی سیاست کی طرف مائل ہوگئے۔ یہ (بھی) کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے قوم پرست مسلمان بھی اس ڈھلوان وادی کی طرف پھسل گئے۔ جناح کا معاملہ دردانگیز ہے۔ 1906ء میں جب دادا بھائی نوروجی کانگریس کے صدر تھے وہ ان کے اعزازی سکریٹری کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ مارلے اور منٹو نے ہندوستان پر جب علاحدہ نمائندگی کا اصول لادنا چاہا تو (جناح نے) اسکی بڑی مذمت کی تھی۔ 1913ء وہ مسلم لیگ میں شریک ہوگئے اور اس کو سرکار کے وفاداروں کے اثرات سے پاک کر کے اسی پلیٹ فارم پر لے آئے جو کانگریس کا تھا۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی پرزور وکالت کی تھی اور لکھنؤ پیکٹ (معاہدہ) کے اصلی معمار وہی تھے۔ گوکھلے ان کو ہندو مسلم اتحاد کا ایلچی کہا کرتے تھے۔ وہ نامذہبیت یعنی سیاست کی مذہب سے علاحدگی کے مضبوط اور راسخ حمایتی تھے اور (اسی لیے) مذہبی خلافت کی تحریک میں کسی قسم کی دلچسپی لینے سے انکار کردیا تھا۔ یہاں تک کہ جب ان کی مخالفت کے باوجود 1920ء میں کانگریس نے گاندھی جی کی یہ تجویز منظور کرلی تھی۔ دسمبر 1921ء کی تحریک کی موافقت میں کہ (گورنمنٹ سے) ترک موالات کیا جائے تو انہوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی تھی۔ دسمبر 1921ء اور جنوری 1922ء میں انہوں

---

1 جواہر لال نہرو (بحوالہ سابقہ) ص 13

نے مالویہ (جی) سے متفق ہو کر اس بات کی کوشش کی تھی کہ وائسرائے اور گاندھی جی کے درمیان ایک گول میز کانفرنس ہوتا کہ ان دونوں کے اختلافات دور ہو جائیں۔ آخر میں وہ مایوس ہو گئے اور جھنجھلا کر لیگ میں شامل ہو گئے اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ کانگریس اور لیگ کا اتحاد اب ختم ہو گیا۔ لیگ اس کے بعد خود اپنی پالیسیوں پر عمل کرنے لگی جس سے دونوں فرقوں کے درمیان رخنہ بڑھتا ہی گیا۔ پھر جون 1925ء ہی میں سی، آر، داس جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بڑے پکے اور نمایاں حامیوں میں سے تھے وفات پا گئے۔ ان کی شاید وفات سے فرقہ وارانہ اختلافات اور فسادات بدقسمتی سے اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔

6- گاندھی جی کا برت

1924ء کا سال بڑا تاریک سال تھا۔ بنگال میں دہشت پسندی کا پھوٹ پڑنا، کمیونزم کا (چوری چھپے) سرایت کرنا، کانپور کی سازش، خلافت تحریک کی منسوخی، قانون ساز مجلسوں میں گرما گرم بحثیں، سرکاری اداکین اور قوم پرستوں کے درمیان کھینچا تانی، فرقہ وارانہ تناؤ میں شدت اور متعدد فسادات کا ہندوستان بھر میں پھوٹ پڑنا۔

5 رفروری کو گاندھی جی اپنڈکس کے آپریشن کے بعد یرودا جیل سے رہا کر دیے گئے۔ ملک کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے۔ ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے جو لگن تھی وہ یاس میں تبدیل ہو چکی تھی اور اتحاد عمل کی جگہ فرقہ واریت اور عدم اعتماد نے لے لی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد جس کے لیے انہوں نے بڑی سرگرم کوششیں کی تھیں ختم ہو چکا تھا اور آپس میں میل اور محبت کی جگہ نفرت اور خوف پیدا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ واریت نے سارے ہندوستان کو اپنے شیطانی چنگل میں پھانس لیا ہے۔ اس

کا بدترین مظاہرہ کوہاٹ (شمالی مغرب سرحدی صوبہ) میں 9/اور 10/دسمبر 1924ء کو ہوا۔ ناقابل ذکر ظلم توڑے گئے۔ بڑے پیمانے پر لوٹ مار، قتل و غارت گری کی گئی اور قصبہ کی تمام ہندو آبادی کو وہاں سے منتقل کرنا پڑا۔

بدبختی اور پریشانی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ گاندھی جی نے بہت دل گرفتہ ہو کر یہ طے کیا کہ وہ اپنے غلط کار ہم وطنوں کے گناہوں کے کفارے کے لیے 18/ستمبر سے لے کر 8/اکتوبر تک یعنی اکیس دن کا برت رکھیں۔ فرقہ وارانہ گتھی کو سلجھانے کے لیے یہ ان کی دوسری کوشش تھی جو لاچار ہو کر اختیار کی گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں سے یہ ایک بڑی سنجیدہ اور دردمندانہ گزارش تھی کہ وہ خودکشی کے اس راستے سے کنارہ کش ہو جائیں جس پر وہ دونوں چل رہے تھے۔

اس برت نے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کے ضمیر ہلا دیے اور وہ سب 24/دسمبر کو دہلی میں مجتمع ہوئے تاکہ کسی طرح کوئی حل نکل آئے۔ موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں تین سو نمایندوں نے شرکت کی جن میں مختلف فرقوں اور جماعتوں کی بعض بہت ممتاز ہستیاں شامل تھیں۔ ان لوگوں نے جو تجویز منظور کی اس سے کانفرنس کی رائے واضح ہوتی ہے کہ ضمیر و مذہب کی انتہائی آزادی ضروری ہے۔ عبادت گاہوں کو ناپاک کرنا، تبدیل مذہب کرنے والوں کو ستانا اور مذہب تبدیل کرنے کے لیے جبر کرنا، ان سب باتوں کی مذمت کی گئی۔ کانفرنس کے ممبروں نے عہد کیا کہ وہ ان اصولوں کے نفاذ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور پھر یکساں رائے ہو کر ان سب لوگوں نے گاندھی جی سے فوراً برت توڑ دینے کی استدعا کی۔

بدقسمتی سے اس کوشش کے اثرات عارضی ثابت ہوئے۔ گاندھی جی نے لوگوں کے ضمیر اور جذبات سے بار بار اپیل کی۔ اس مسئلہ کا تجزیہ انہوں نے نفسیات اور

اخلاقیات کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔ حالانکہ فرقہ وارانہ اختلافات تمام تر مادی مفادات پر مبنی تھے۔ یعنی معاشی اور سیاسی حقوق اور مراعات پر اس لیے محض زبانی وعدوں اور یقین دہانیوں کے بجائے وہ چاہے جتنے خلوص کے ساتھ کیے گئے ہوں، لکھنؤ معاہدہ کی طرح ایک باہمی راضی نامہ ہونا چاہئے تھا اسی سے لوگوں کا خوف وانتشار کم ہوسکتا تھا۔

ایسے سمجھوتہ کی عدم موجودگی کے باعث گاندھی جی کی اکیس دن کی سخت ریاضت ناکام رہی اور گاندھی جی نے اسے محسوس بھی کیا۔ چنانچہ بعد کے کئی برسوں تک انہوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ ایک دوسری مہم کی تیاری میں لگے رہے۔ غالباً یہ سمجھ کر کہ جب گورنمنٹ کے خلاف عملی جدوجہد شروع ہوجائیگی تو ایسی فضا خود بخود بن جائے گی جس میں لوگوں کے دل ایک دوسرے قریب آجائیں گے اور رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔

7- اتحاد کی کوششیں

کچھ ہی دنوں بعد فرقہ وارانہ سیاست پھر نمودار ہوگئی اور اسی کے ساتھ ساتھ مفاہمت کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ 21 ر نومبر 1924ء کو مولانا محمد علی صدر کانگریس کے ایما پر تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی۔ جناح نے مجمع کو خطاب کیا اور لکھنؤ معاہدہ (پیکٹ) کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات منظور کرلیں یعنی بنگال اور پنجاب کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی نمایندگی اقلیت میں نہ ہونا چاہئے اور ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ کس قدر ہو اس کا سوال کا تصفیہ علاحدہ ہونا چاہئے۔ لیکن کانفرنس کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی اور گاندھی جی جو اس کانفرنس میں شریک تھے اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ

حالات میں کوئی متفقہ اسکیم نہیں بنائی جا سکتی۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں کانگریس، خلافت کمیٹی اور ہندو مہا سبھا کی میٹنگ بلگام میں ہوئی۔ گاندھی جی نے جو کانگریس کے سیشن کی صدارت کر رہے تھے اپنے خطبے میں کہا کہ ''اقلیتوں کو جو کہ اکثریت کی نیتوں پر شک وشبہات رکھتی ہیں اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کی ضرور اجازت دینا چاہیے۔ اکثریت کو خود ایثار کر کے ایک مثال قایم کر دینا چاہیے۔''[1] جواہر لال نے اس کی وضاحت کی کہ گاندھی جی کے نزدیک فرقہ وارانہ مسئلہ ''اکثریتی فرقے کی مہربانی اور فیاضانہ رویے ہی سے حل ہو سکتا ہے اس لیے وہ ہر اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں جو مسلمان طلب کریں۔ دور اندیشی اور اقدار کے صحیح اندازے کی بدولت وہ اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں جو مفید طلب ہو سکتی ہے لیکن دوسرے لوگ جو سمجھتے ہیں کہ وہ بازار کی ہر شے کی قیمت جانتے ہیں لیکن دراصل ہر شے کی اصلی قدر و قیمت سے نا آشنا محض ہیں وہی سودے بازی پر تلے ہوئے ہیں۔''[2]

انہیں دنوں میں جب کہ بلگام میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا جناح نے بمبئی میں مسلم لیگ کی میٹنگ کی۔ اس سے پیشتر لاہور میں ایک پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے اور مولانا محمد علی کے ایک سخت اور معاندانہ بیان کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے ہندوؤں سے ایک اپیل کی تھی اور اس میں اپنا موقف پوری طرح واضح کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پبلک پختگی کے ساتھ یک رائے ہو جائے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ایک دوستانہ سمجھوتا (اکثریت سے) ہو جائے خصوصاً پنجاب میں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مکمل معاہدہ ہو جائے جیسا کہ 1914ء میں ہوا تھا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ''لیگ کوئی ایسی پالیسی یا پروگرام اختیار نہیں

---

1. تندولکر: ایم۔ کے۔ گاندھی۔ بلگام میں خطبہ۔ جلد دوم، ص 227

2. جواہر لال نہرو (بحوالہ سابق) ص 131

کرے گی جو کسی طرح بھی، جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت میں ہو بلکہ اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں راستوں پر چلے گی جن سے عام قومی مفاد وابستہ ہیں اور مسلمانوں کے مفادات کو جن میں فراموش نہ کیا جائے گا۔"[1]

انہوں نے اقرار کیا کہ "میں اب بھی ایک آزمودہ کار قوم پرست کی حیثیت سے قایم ہوں اور اگر مسلمانوں کی تنظیم کی جاتی ہے تو یہ قومی مفاد کے خلاف نہ ہوگی بلکہ اس کے برعکس یہ ان کو باقی ہندوستانیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دے گی"[2] لیکن بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ جب وہ اپنی قوم پرستی کا اعتراف اور اقرار کر رہے تھے۔ سوراج پارٹی اپیریل قانون اسمبلی میں ان کی نامزدگی کی مخالفت کر رہی تھی۔ بعد میں بہرحال بہتر صلاح و مشورہ سے کام لیا گیا اور سوراجی امیدوار کی درخواست نامزدگی واپس لے لی گئی۔

بمبئی میں لیگ کی جو میٹنگ ہوئی اس کی صدارت سید رضا علی نے کی۔ ہندو مسلم اختلافات کے بارے میں ان کے رائے یہ تھی کہ "یہ اختلافات با اثر لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں جو دور بیٹھے مخاصمت کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کی خاطر دوسروں کو غلط راستوں پر چلاتے رہتے ہیں۔"[3]

جناح نے جو استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین تھے، دوبارہ کہا کہ "دنیا کی کوئی طاقت ہمارے مطالبہ سُوراج کو روک نہیں سکتی بشرطیکہ ہندو اور مسلمان خلوص دل کے ساتھ متحد ہو جائیں۔"[4] ان کے خیال میں علاحدہ نمایندگی کا سوال ہی اختلافات کی بنیاد

---

1. ایم۔ایچ سید (بحوالہ سابق) ص 305   2. ایم۔ایچ سید (بحوالہ سابق) ص 312

3. اختر حسین، مرزا : تاریخ مسلم لیگ (اردو) سید رضا علی کا خطبہ مسلم لیگ منعقدہ بمبئی کے اجلاس میں۔ 1924ء۔ ص 296   4. ایضاً: ص 305

تھا۔ انہوں نے کناڈا کی مثال پیش کی جہاں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے جھگڑے نے ایسی صورت حال پیدا کردی کہ وہ ملک ہی تباہ ہوجاتا لیکن پٹ نے دو الگ صوبے قایم کردیے اور اس طرح آخر کار 1867ء میں اتفاق واتحاد پیدا ہوگیا۔ غلط فہمیاں بہرحال بڑھتی ہی رہیں اور غصہ کو بھڑکاتی رہیں۔ مظالم اور خوں ریزی کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ فرقہ وارانہ فسادات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ صوبائی مجالس قانون ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز میں سوراجیوں کی رکاوٹ ڈالنے والی پالیسیوں کے باعث عام انتشار اور بھی بڑھ گیا۔ پھر خود سوراج پارٹی میں اختلافات پیدا ہوگئے اور تلک کے گروہ نے بھی جو جوابی پارٹی کہلاتے تھے، بغاوت کردی وہ لوگ سوراج پارٹی کے بجائے مہاسبھا سے تعاون کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

بدقسمتی سے گاندھی جی اور خلافت کے لیڈروں یعنی علی برادران کے درمیان کوہاٹ کے فساد کی ذمہ داری کے متعلق اختلافات پیدا ہوگئے۔[1] گاندھی جی اور شوکت علی نے فسادات کے متعلق راولپنڈی میں تحقیقات کیں اور الگ الگ بیانات جاری کیے۔ دونوں میں فسادات کے اسباب کی تشخیص کے متعلق اختلاف تھا۔ افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایک رخنہ پیدا کردیا اور یہ رخنہ چوڑا ہوتا ہی گیا جس سے اتحاد کے مقصد کو سخت نقصان پہنچا۔

23/جنوری 1925ء کو جو تمام پارٹیوں کی کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی اس کی کارروائی میں ان فرقوں کے اختلافات نمودار ہوگئے۔ گاندھی جی کی تجویز پر ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ وہ ایسی سفارشات پیش کرے جن سے تمام سیاسی پارٹیوں میں اتحاد قایم ہوسکے نیز ایسی اسکیم مرتب کرے جس سے مجالس قانون ساز میں ہر فرقے کی نمایندگی ہوسکے۔ اس کمیٹی کی میٹنگ یکم مارچ کو طے ہوئی مگر ملتوی کردی گئی اور پھر کبھی

---

1. ینگ انڈیا: 26/مارچ 1925ء

نہ ہوئی۔کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا کیوں کہ بقول گاندھی جی ایسے شک وشبہ سے بھرے ماحول میں کسی ایسی اسکیم کا تیار کرنا ناممکن تھا جسے متحدہ منصوبہ کہا جا سکے۔آل انڈیا ہندو مہا سبھا نے دو اجلاس کلکتے اور کانپور میں 11/اپریل1925ءکو اور دسمبر1925ءکو منعقد کیے۔لاجپت رائے پہلے اجلاس کے صدر تھے۔انہوں نے معاہدہ لکھنؤ (لکھنؤ پیکٹ) کی مذمت کی اور اسے غلط قرار دیا۔ساتھ ہی انہوں نے فرقہ وارانہ نمایندگی پر مبنی ہر اسکیم کی مخالفت کی اور سفارش کی'' ایسے جمہوری راج کی جس میں ہندو مسلمان اور دوسرے فرقے بہ حیثیت ہندوستانیوں کے شامل ہوں،کسی مذہب کے ماننے والوں کی حیثیت سے نہیں''[1] انہوں نے ہندو مہا سبھا کے جھنڈے کے تلے ہندوؤں کے سنگھٹن (تنظیم) پر زور دیا۔کانپور میں کیلکر نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات کی تشریح کی کہ فرقہ واریت کیسے پھیلی۔انہوں نے کہا کہ'' کسی مذہبی خیال کے آدمی کی دل آزاری یا اس کی ہتک میرا مقصد نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آج کل جس مذہبی تحریک کا بہت زیادہ پرچار کیا جارہا ہے اس کا مقصد روحانی فوائد یعنی دوسری دنیا میں مکتی حاصل کرنا نہیں بلکہ اسی مادی دنیا میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر نعمتوں کا حاصل کرنا ہے''[2] انہوں نے بہر حال ہندوؤں کو متنبہ کیا کہ'' مسلمانوں کا منشا یہ ہے کہ انگورہ سے لے کر سہارن پور تک اسلامی طاقت اور اثر کا ایک مربوط سلسلہ قایم ہو جائے''[3] اور اسی لیے انہوں نے ہندو دھرم کی حفاظت کے لیے سنگھٹن اور شدھی تحریکوں کو جائز قرار دیا۔

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر(Indian Annual Register)1925ءجلد اول ص378

2۔ ایضاً۔جلد دوم ص35 3۔ایضاً ص251

30 / دسمبر 1925ء کو علی گڑھ میں مسلم لیگ کا اجلاس مدراس ہائی کورٹ کے ایک سابق جج عبدالرحمٰن کی صدارت میں ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ خلفشار کا تمام الزام ہندوؤں کے سر تھوپا اور ہندوؤں کے حملوں سے مسلم مفادات کو محفوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ بقول ان کے بعض ہندو لیڈروں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے اسی طرح باہر نکال دیں گے جس طرح اسپین والوں نے موروں کو نکال باہر کیا تھا۔[1] جو تجاویز اس میٹنگ میں منظور ہوئیں ان میں یہ بھی تھیں (1) ایک شاہی کمیشن کا فوری تقرر ہو جو ایک ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی اسکیم تیار کرے (2) تمام مجالس قانون ساز میں اقلیتوں کی مناسب نمایندگی، اور (3) اقلیتی فرقوں کے حلقہ ہائے نمایندگی کا علاحدہ قیام۔

حالات میں کوئی سدھار نہیں ہوا اور نہ فسادات میں کمی آئی۔ اس سال کا سب سے زیادہ سنگین فساد کلکتے میں ہوا۔ یہ اپریل اور مئی 1926 کے چھ ہفتوں تک ہوتا رہا۔ دیگر ہولناک جرائم کے ساتھ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ متعدد عبادت گاہوں کو بے حرمتی کی گئی۔ وسط جون 1925ء میں سی، آر، داس کی وفات اور جنوری 1926ء میں گاندھی جی کے سیاست سے علاحدگی اختیار کرنے کے باعث اتحاد کی طاقتیں بہت کمزور ہو گئیں۔ فرقہ وارانہ جماعتیں: ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ فرقہ وارانہ مسائل پر اپنے بندھے ٹکے نظریات کا اعادہ کرتی رہیں۔

3 / دسمبر کو ایک جنونی اور جوشیلے نوجوان نے شردھانند کو مار ڈالا۔ جنوری 1927ء میں دشنام آمیز کتاب 'رنگیلا رسول' کے مصنف کو جسے ماتحت عدالت سے 18 مہینے کی قید کی سزا ہوئی تھی ہائی کورٹ نے بری کر دیا۔ پھر امرتسر کے ایک رسالہ 'ورتمان' میں ایک مضمون شائع ہوا۔ مسلمان اس سے بہت برافروختہ ہوئے اور کئی مقامات پر فسادات

---

1 مرزا اختر حسین (بحوالہ سابق) ص 349

پھوٹ پڑے۔ سرحدی صوبے میں ملاؤں نے قبائل کو ہندوؤں کے خلاف اُکسایا جس کے باعث انہیں تکلیفیں دی گئیں اور انہیں پیشاور بھیج دیا گیا۔ 1927ء کے پورے سال میں اس تناؤ اور کشیدگی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن اپریل 1928ء سے صورت حال میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ سیاسی حالات میں تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ سائمن کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا گیا۔ یہ اس نظریے کا مزید ثبوت تھا کہ ہندو مسلم اختلافات سیاسی جذبات کے تحت ہوئے تھے مذہبی نہیں تھے۔ مذہب صرف ظاہری پوشش تھی بنیاد نہیں تھی۔

رنج تو اس بات کا تھا کہ باوجودیکہ ہندو اور مسلمان دونوں اس بات کے لیے بے چین تھے کہ جلد از جلد اقتدار حکومت انگریزوں سے ان کے ہاتھ میں آجائے۔ اور دونوں یہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ ان کی کامیابی کا راز اتحاد میں ہے۔ لیکن اتحاد کا یہ معمہ کس طرح حل ہو یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتحاد کے متعلق ایک خیال تھا کہ فرقہ دارانہ عناصر سے صرف نظر کر کے یکسانیت قائم کی جائے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ ایک ایسا وفاق بنایا جائے جس میں ہر جماعت کی انفرادیت برقرار رہے۔

1924ء سے لے کر 1929ء تک مستحکم اتحاد کے لیے جو متعدد کوششیں کی گئیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خلوص کے ساتھ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جارہا تھا۔

1923ء میں قومی معاہدہ، پھر اسی سال بنگال معاہدہ، ستمبر 1924ء میں اتحاد کانفرنس اور ایک اتحادی پنچایت کا قیام، نومبر 1924ء میں بمبئی کل جماعتی (آل پارٹیز) کانفرنس، ستمبر 1927ء میں شملہ میں اتحاد کانفرنس جس کی صدارت لارڈ اروِن نے کی، 1927ء میں کانگریس کے زیر اہتمام ایک اتحاد کانفرنس، پھر مارچ اور مئی 1927ء میں دہلی میں منعقدہ کل جماعتی کانفرنس جس نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنادی تھی کہ وہ ہندوستان کے لیے ایک آئین تیار کرے۔ یہ

سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اتحاد کے لیے کتنی کاوشیں کی گئی تھیں۔

اس کے علاوہ یہ کوششیں صرف مخصوص کانفرنسوں تک محدود نہ تھیں، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ جیسی مستقل تنظیموں نے اس عنقا کی تلاش میں بڑی سرگرمیاں دکھائیں لیکن افسوس کہ ناکامیابی ہی ہاتھ لگی۔ کئی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوا کہ اب کے کامیابی ضرور ہو جائے گی لیکن ہر مرتبہ امیدیں خاک میں مل گئیں۔

1916ء کا لکھنؤ کا معاہدہ دراصل دس سال کے بحث و مباحثہ کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک ایسا سمجھوتہ تھا جو آپس کے پاس و لحاظ کی نازک بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ اس میں علاحدہ حلقۂ نمائندگی کے زوردار اور آتش انگیز مسئلے کو نمایندگی کی ایک اسکیم کے تحت لاکر متوازن رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ 1919ء کے مانٹیگو چیمس فورڈ ریفارم ایکٹ کے نفاذ نے اس توازن کو درہم برہم کر دیا۔ اس ایکٹ نے نہ صرف علاحدہ نمایندگی کے طریقے کو تسلیم کر لیا بلکہ علاحدگی پسندی کے جذبے کو صرف مسلم اکثریت والے صوبوں ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں بھڑکا دیا۔

اس ایکٹ کے بنانے والوں نے قوم پرستوں کے عذرات ہی کو نہیں ٹھکرایا بلکہ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے بے تعلق اور غیر جانب دار طبقوں کے باوزن مشوروں کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی مثلاً گول میز کانفرنس والوں کے مشورے اور سب سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ سیکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو جنہوں نے 3/دسمبر 1919ء کو اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: ''مجھ سے زیادہ کوئی شخص فرقہ وارانہ نمایندگی پر اعتراض کرنے والا نہ ہوگا۔ میں اس کو ایک بہت بڑی غلطی سمجھتا ہوں۔''[1] کرتس کے انتباہ کو نظر انداز کر دیا اور خود اپنی رائے کے بالکل

[1] ہندوستانی سالانہ رجسٹر (Indian Annual Register) 1924- جلد اول شمارہ نمبر 2، ص 771
3/جون 1924ء کو ہاؤس آف لارڈس میں مباحثے کے دوران اولیور، سکریٹری آف اسٹیٹ نے ہاؤس آف کامنس کی 3/دسمبر 1919ء کی ماٹیگو کی تقریر کا حوالہ دیا تھا۔

برخلاف اس شرانگیز اصول کو 1919ء کے ایکٹ میں شامل کرلیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ معاہدہ (پیکٹ) رد کردیا گیا اور علاحدہ نمایندگی اور مسلمانوں کے مطالبات کا از سر نو جھگڑا پھر شروع ہوگیا۔ یہی انجام داس کے بنگال معاہدے کا ہوا جس کو کانگریس کے اس اجلاس نے جس کی صدارت مولانا محمد علی کررہے تھے نامنظور کردیا۔ بنگال میں اس قسم کا معاہدہ کرنے کے دوبارہ کوششیں کی گئیں مگر ناکام رہیں۔ 1927ء میں جناح نے ایک دوسرا بہت امید افزا قدم اٹھایا۔ اور یہ واقعی ان کی بڑی ہمت کا کام تھا کہ مسلم لیگ کے ایک طبقے کی مخالفت کے باوجود جس کے سربراہ محمد شفیع تھے اور باوجود ایک مایوس سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر برکن ہیڈ کی نارضامندی کے جنھوں نے ریڈنگ اور سائمن کو مشورہ دیا تھا کہ جناح کو بالکل الگ تھلگ چھوڑ دو، جناح نے ان مسلمان لیڈروں کو جو مارچ 1927ء کو دہلی میں اکٹھا ہوئے تھے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کریں۔ چنانچہ دسمبر میں لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ کانگریس کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کے مشوروں سے ہندوستان کے لیے دستور کا ایک مسودہ تیار کرے اور اس کے لیے کچھ ہدایتیں بھی دیدیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی اس رضامندی کی توثیق کردی کہ وہ علاحدہ حق رائے دہی کے مطالبے کو ترک کر کے مشترکہ رائے دہی کو منظور کرلیں گے اس شرط کے ساتھ کہ آبادی کے تناسب سے مختلف فرقوں کی نشستیں مقرر کرلی جائیں اور سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ قرار دیا جائے اور شمالی مغربی سرحدی صوبے نیز بلوچستان میں اصلاحات کیے جائیں۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں ہندو اقلیت کے لیے بھی ایسی ہی مراعات کا وعدہ کیا گیا یعنی آبادی کے لحاظ سے ان کی نشستوں کا اسی طرح تقرر جیسا کہ مسلمانوں کے لیے ہندو اکثریت والے صوبوں میں ہو۔ [1]

1 مرزا اختر حسین (بحوالہ سابق) ص 349

نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے کل ہند نیشنل کونشن کا جلسہ کلکتہ میں ہوا۔ اس میں تیج بہادر سپرو نے ایک مؤثر اپیل کی کہ جناح کے شرایط منظور کر لیے جائیں۔ جناح نے تمام ممبروں کو یقین دلایا کہ مسلم لیگ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعاون سے سوراج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جیکار نے سختی سے اس تجویز سے اختلاف کیا اور جناح کے اس دعوے کو کہ وہ تمام مسلمانوں کی نمایندگی کر رہے ہیں تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے آگاہ کیا کہ اگر جناح کے شرایط منظور کر لیے گئے تو مہا سبھا بغاوت کر دیگی اور نہرو رپورٹ کی ساری اسکیم کو درہم برہم کر دے گی۔ جناح نے کہا ”میں (یہاں) بحیثیت ایک مسلمان کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک ہندوستانی کے بول رہا ہوں اور میری آرزو یہ ہے کہ میں سات کروڑ مسلمانوں کو حصول آزادی کی جدوجہد میں اپنے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے دیکھوں۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ آپ لوگ تدبر اور سیاست دانی کی ان بلندی پر پہنچ جائیں جن کو تیج بہادر سپرو نے پیش نظر رکھا ہے۔“[1]

جناح کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اور انھیں وہاں سے حد درجہ مایوس اور دل برداشتہ ہو کر چلا آنا پڑا۔ (مولانا) محمد علی بھی جو ابھی تک کانگریس سے بڑی وابستگی رکھتے تھے بہت جز بز ہوئے اور یہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ کانگریس پر مہا سبھائی ذہنیت اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اس سے صاف معاملات کی کوئی امید نہ رکھنا چاہئے۔ انجام کار، صحیح یا غلط اس کے نتائج بہت افسوس ناک ہوئے۔

8-سوراج پارٹی اور اندرونی اختلافات

1920ء کے موسم سرما میں 1919ء کے ایکٹ کے تحت قانون ساز مجلسوں کی تشکیل کے لیے انتخابات کیے گئے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے تو ان انتخابات کا

---

1 سید ایم، ایچ، (بحوالہ سابق) ص 35-434

بائیکاٹ طے کر رکھا تھا اس لیے اعتدال پسند (سیاست دانوں) اور دوسرے لوگوں کے لیے میدان خالی ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسند پارٹی کے کئی نمایاں لیڈر انتخابات میں کامیاب ہوگئے جن میں دو خاص طور سے ممتاز اشخاص تھے یعنی سری نو اس شاستری (کونسل آف اسٹیٹ میں) اور سیو سوامی ایر (لیجسلیٹو اسمبلی میں)

ان اعتدال پسند یا لبرل لوگوں نے (مجالس قانون ساز میں) جو مخالف گروپ بنایا اس میں بہت قابل اور واقف کار لوگ شامل تھے اور ان لوگوں نے اس پہلی پارلیمنٹ میں اپنی صلاحیتوں اور لیاقت کا اچھا مظاہرہ کیا۔ جہاں تک سیاسی مقاصد کا تعلق ہے ان لوگوں اور قوم پرستوں یا انتہا پسندوں میں بہت کم فرق تھا۔ لبرل پارٹی والے سیاسی پیش رفت کے معاملے میں تدریج کے قائل تھے اور قوم پرست حکومت کی فوری تبدیلی کی اشد ضروری سمجھتے تھے۔ یعنی ان دونوں میں حصول مقاصد کے لیے طریق کار کا صرف اختلاف تھا۔ لبرل لوگ صرف دستوری طریقوں سے کام لینے کے قایل تھے یعنی تمام ممکن قانونی ذرایع ، مجالس قانون ساز ، پبلک پلیٹ فارم ، پریس ، ہندوستان اور انگلستان کی سرکاروں کے پاس وفود بھیجنا وغیرہ کی وساطت سے اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔

قوم پرستوں کو اس کے برخلاف یہ یقین تھا کہ بحث ومباحثہ سے کچھ کام نہ چلے گا صرف براہ راست اقدام کرنے سے جس کی پشت پناہی عوام کر رہے ہوں ان اقتدار کے مالکوں کو جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں بیرونی حکم رانوں نے بغیر جنگ یا سختی کے اپنا قبضہ واقتدار کسی ملک سے اٹھالیا ہو۔ چونکہ ہندوستان میں جنگ ناممکن تھی اس لیے عدم تشدد، ترک موالات اور سول نافرمانی ہی کا طریق کار اختیار کرنا باقی رہ گیا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک عدم تشدد اور ترک موالات ضمیر اور دھرم کا معاملہ تھا، دوسرے لوگ اسے مصلحت وقت کا

تقاضا سمجھتے تھے۔

اپنی ممبری کی مدت کے دوران لبرل لوگوں نے مجالس قانون ساز میں بڑی کوششیں کیں کہ جلد از جلد حکومت کرنے کی ذمہ داری سونپنے کی طرف قدم اٹھائے جائیں۔

نئی اصلاح شدہ پارلیمنٹ کا افتتاح ڈیوک آف کناٹ کے ہاتھوں ہوا جن کو بادشاہ انگلستان نے خاص طور پر بھیجا تھا تا کہ اس موقع کی اہمیت غیر معمولی سمجھی جائے۔ اس نے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ غلط فہمیوں کو فراموش کر دیں، گزشتہ کو بھول جائیں اور نئے دستور پر عملدر آمد میں تعاون کریں۔ چیمسفورڈ نے پارلیمنٹ کو یقین دلایا کہ مطلق العنانی جسے ماضی میں پورے طور پر ترک نہیں کیا جا سکا تھا، اب قطعی طور پر نظر انداز کر دی گئی ہے۔ مخیر خود مختار حکومت کا نظریہ بھی اب بالکل ترک کر دیا گیا ہے، اور اس کے بجائے رہنمائی کرنے والی حکومت پیش کی گئی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کو ہر ہر قدم پر امداد دے تا کہ وہ ایسے راستے پر چل سکے جو وقت آنے پر مملکت برطانیہ کے اندر مکمل خود مختار حکومت بنا سکے۔[1]

چیمسفورڈ نے بڑی غلطی کی اگر انہوں نے کہا کہ ان کے لچھے دار فقروں میں آ کر جن میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مطلق العنان حکومت کے بجائے حکومت خود اختیاری کے قیام سے ایک غیر متعین مستقبل بعد میں دینے کے وعدے سے ہندوستان کے مضطرب اور بے قرار لوگ دھوکا کھا جائیں گے۔ اس کے (چیمسفورڈ کے) جانشین نے جلد ہی اس غلطی کو محسوس کر لیا کیونکہ ان الفاظ کی گونج مشکل ہی سے کونسل ہال کے برآمدوں میں مٹی ہوگی کہ حزب مخالف نے بہت جوش کے ساتھ حملے کرنا شروع کر دیے۔ یکے بعد دیگرے تجویزیں پیش ہونا شروع ہو گئیں۔ ان افسروں کو سزائیں

1۔ ولیم رش بروک: آئی، ایف، انڈیا 22-1921، ص 47

دینے کے لیے کہا گیا جنہوں نے پنجاب خصوصاً امرتسر میں وحشیانہ مظالم اور جبر کیے تھے۔ وہاں کے مظلوموں کو معاوضے دیے جانے نیز ایک محصول کمیشن مقرر کیے جانے کا مطالبہ کیا تاکہ ہندوستانی صنعتوں کا تحفظ ہو سکے۔

حزب مخالف کے یہ حملے بعد کے اجلاسوں میں بھی برابر جاری وساری رکھے گئے۔ 1921ء کے شملہ اجلاس میں ترقی پسند ممبروں نے ایک جمہوری پارٹی (Democratic Party) بنائی۔ بار بار تجویزیں پیش کی گئیں تاکہ حصول سوراج کے کام میں عجلت ہو اور فوجی اور سول ملازمتوں میں ہندستانی رکھے جائیں۔ اور جب 1922-23ء کے مالی سال کے مطالبات پر مباحثہ ہوا اور اسمبلی نے حکومت کی تمام مانگیں نامنظور کردیں، کٹوتیاں کیں اور نمک نیز روئی پر ٹیکس بڑھانے کے مجوزہ اضافے کو مسترد کردیا یعنی گورنمنٹ کی شکست ہوگئی تو ایک سنسنی پھیل گئی۔ پریس ایکٹ بھی ان لوگوں کے کہنے کے مطابق کالعدم کردیا گیا۔

لیکن جمہوری پارٹی کی بعض کامیابیاں گورنمنٹ نے ناکام بنادیں۔ وایسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے نمک کے محصول کو بحال رکھا۔ ملازمتوں کو جلد تر ہندوستانیوں کو سونپے جانے کی تجویز کو کھٹائی میں ڈال دیا اور شاستری وسپرو کی ان کوششوں کہ ہندوستان اور دوسری نوآبادیات کو مساوی رکھا جائے ناکام بنادیا۔

پھر بھی ہندوستان کی رائے عامہ نے اپنے اثرات دکھائے کیونکہ اس کو بعض مقاصد میں کامیابی ہوئی مثلاً صیغۂ مال میں اس کو کچھ اختیارات مل گئے۔ فوج میں زیادہ ہندوستانی بھرتی کیے جانے لگے، بعض ریلوں کا انتظام صوبوں کو منتقل کردیا گیا، فوجداری کے مقدمات میں نسلی امتیازات کی تفریق کو دور کیا جانے لگا۔ بعض جابرانہ قوانین منسوخ کیے گئے اور بعض رفاہ عامہ (سماجی فلاح) کے ذرایع حاصل کیے گئے۔

پہلی پارلیمنٹ کا یہ اجلاس حصول خود مختاری کے اس دعوے کی تجدید پر ختم ہوگیا جسے نہ دینے کی چیمسفرڈ نے قسم کھا رکھی تھی۔ دوسری پارلیمنٹ کا اجلاس 31/جنوری 1924ء کو شروع ہوا۔ بعض صوبائی کونسلوں کے جلسے پہلے ہی شروع ہوچکے تھے۔ مثلاً یوپی کی کونسل 7/جنوری سے، ممالک متوسط اور بہار اور اڑیسہ کی کونسلیں 15/جنوری سے، بنگال کی 22/جنوری سے شروع ہوچکی تھیں۔ مدراس کونسل 5/فروری سے اور بمبئی کونسل 18/فروری سے شروع ہوئیں۔

چونکہ 1923ء میں سوراج پارٹی بھی سیاسی میدان میں اتر آئی تھی اس لیے اب قانون ساز اسمبلیوں کی ساخت پہلی سے مختلف ہوگئی تھی۔ اس پارٹی کی تنظیم سی آر داس اور نہرو نے یکم جنوری 1923ء کو کی تھی کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ کانگریس نے دوسال تک جو غیر معمولی سخت جدوجہد کی اور جوش وخروش دکھایا اس جارحانہ جوش کو اب مزید قایم نہیں رکھا جاسکتا ہے اور وہ پارٹی جو انقلاب لانے کی مخالف تھی اس قابل نہ تھی کہ وہ لوگوں میں جوش برقرار رکھ سکتی۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ کونسلوں میں کام کرنا مختلف صورتوں سے کارآمد ہوسکتا ہے۔ داس یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ حکومت کی مشینری خصوصاً اس کا قانون سازی کا شعبہ اپنی پارٹی کا پروپیگنڈہ کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر قبضہ کرلیا جائے تاکہ یہ شعبہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

(واقعی) کونسلوں نے قومی پروپیگنڈہ یا پرچار کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم مہیا کردیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اس میں ایک کشش تھی اور ان کی قوت مدافعت بھی برقرار رہ سکتی تھی۔ کونسلوں کے قیام سے ایک وسیع میدان مل گیا جہاں گورنمنٹ کی پالیسیوں اور کارگزاریوں پر کھلا حملہ کیا جاسکتا تھا اور دنیا کے تمام لوگوں کو ہندوستانیوں کی تکالیف سے باخبر رکھا جاسکتا تھا اور اس کے حاکموں نے جو غلط طرز عمل اختیار

کر رکھا تھا اس کا پول کھولا جا سکتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اب اپنی پالیسیوں پر حکومت کو ایک مدلل اور معقول تنقید اور ذمہ دار حکومت کے اصولوں پر سخت نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑنے لگا جن کو اگرچہ گورنمنٹ اپنے مصالح کے پیش نظر نامنظور کر دیتی تھی لیکن اس سے حکمرانوں کا سکون تو ضرور درہم برہم ہو جاتا تھا اور ان کو اپنے معاملے کی کمزوری کا احساس دلاتا تھا۔ انگریز لوگ پارلیمانی طرز حکومت کی روایتوں کے اس قدر پابند تھے کہ وہ مجبور تھے کہ حزب مخالف کے پارلیمانی طریقوں پر توجہ مبذول کریں۔

نومبر 1923ء میں انتخابات ہوئے اور سوراج پارٹی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے 105 منتخب ممبروں میں سے 47 سوراجی تھی جو قوم پرستوں کی مدد سے جن کے لیڈر مالویہ جی تھے اور آزاد ممبروں مثلاً جناح کے تعاون سے حکومت کے افسران اور نامزد ممبروں کے بلاک کے مقابلے میں اکثریت میں ہو گئے۔

دو صوبوں یعنی بنگال اور ممالک متوسط میں بھی یہ لوگ اکثریت میں تھے۔ ان صوبوں میں ان کے لیے ممکن تھا وہ کونسل کی کارگزاریوں کو معطل بنا دیں بلکہ اسمبلی میں بھی گورنمنٹ پر وہ زوردار فتوحات حاصل کر سکتے تھے۔ بمبئی اور ممالک متحدہ (یوپی) کے صوبوں میں بھی سوراجیوں کو مضبوط نمایندگی حاصل تھی۔

بنگال کے گورنر نے داس کو یہ پیشکش کی کہ وہ حکومت کے منتقل کردہ اجزا کی ذمہ داری سنبھال لیں لیکن سوراج پارٹی نے چونکہ شمولیت کے باوجود ترک موالات کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس لیے داس نے اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ کونسل نے زوردار طریقے پر اپنا غلبہ دکھایا اور سیاسی قیدیوں کی رہائی نیز انسدادی قوانین کی منسوخی کے سلسلے میں کئی تجاویز پاس کیں۔ اس کے بعد کئی منظور کردہ رقموں کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے اور وزرا کی تنخواہوں کے مطالبے کو نامنظور کرنے کے باعث ایک تعطل اور رکاوٹ کی صورت حال پیدا ہو گئی اور گورنر کو اپنے اختیارات توثیقی استعمال کر کے اس

تعطل کو دور کرنا پڑا۔ یہ دراصل اصلاحات کی ناکامی کا بین اقرار تھا۔

اسی طرح کے واقعات ممالک متوسط میں بھی رونما ہوئے۔ اجلاس کے شروع ہی میں کونسل نے وزراء کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ ایک بڑی اکثریت سے منظور کر لیا اور پھر تو پورا بجٹ درہم برہم ہو گیا۔ اس ہنگامی صورت حال کے پیدا ہو جانے پر گورنر نے اپنے دستوری اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے خاص خاص مدات کے لیے قریب قریب پورے اخراجات منظور کر دیے اور مستقل مدّات میں کم سے کم اتنی رقوم تو ضرور منظور کر دیں جو ہر شعبہ کی کارروائی کے لیے کافی ہو سکیں۔ چونکہ ان کو وزراء کی تنخواہوں کو بحال کرنے کا اختیار نہ تھا اس لیے وہ مجبور ہو گئے کہ مختلف شعبوں کے انتظام کو وزراء کے دائرہ اختیار سے نکال کونسلرس کی عاملہ کے سپرد کر دیں۔ غرضیکہ یہاں بھی سوراجیوں کو اپنے اختیارات کی طاقت دکھا کر اس دستور کو تعطل میں ڈالنے کا موقع مل گیا جسے وہ ناقابل اطمینان سمجھتے تھے۔

9- بمبئی میں بھی عدم اعتماد کا ووٹ منظور ہو گیا

سوراج پارٹی کے اندرونی طور پر عدم تعاون کے منصوبے پر ان تمام کونسلوں میں پورے طور پر عمل ہوا جہاں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل تھی۔ لیکن مرکزی اسمبلی میں صورت حال مختلف تھی۔ وہاں 145 ممبروں میں سوراجیوں کی تعداد تقریباً 47 تھی۔ لیکن جب کبھی دوسروں سے تعاون حاصل ہو جاتا تھا وہ حکومت کو شکست دیدیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔ پارٹی کو یہاں بہت احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ یہ لوگ حکومت کی مخالفت صرف اسی وقت کرتے تھے جب ان کو یقین ہو جاتا تھا کہ دوسرے ممبروں کی کافی تعداد ان سے تعاون کرے گی۔ لیکن بعض اوقات یہ پارٹی تنہا بھی مخالفت کرنے لگتی تھی خصوصاً جب اپنے اصول کی بات درمیان میں آ جاتی۔

اسمبلی میں سوراج پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو تھے اور ان کے رفقاء میں ایسے

لوگ تھے جیسے وٹھل بھائی پٹیل، راما سوامی آئینگر، مدن موہن مالویہ، بپن چندر پال وغیرہ۔ ممبروں کی ایک جماعت نے جو جناح کو اپنا لیڈر مانتی تھی اسمبلی میں ساتھ ساتھ مل کر کام کرنے کی غرض سے سوراجیوں سے مل کر ایک نیشنلسٹ پارٹی بنالی تھی۔

کونسل آف اسٹیٹ میں سری نواس شاستری، راما سوامی آئینگر نے کئی لبرل اور آزاد ممبروں کے ساتھ مل کر قومی معاملات میں تعاون کیا اور تائید کی۔

سوراج پارٹی نے اپنے منشور میں جن نظریات کا اظہار کیا تھا اس سے (سرکاری حلقوں میں) بہت خوف پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ بہت سے حلقوں مثلاً سکریٹری آف اسٹیٹ، وایسرائے، لبرل ممبران وغیرہ نے مشورے بھی دیے اور متنبہ بھی کیا کہ سوراج پارٹی اپنے اعلان کردہ منفی کارگذاریوں سے باز رہے۔ اس کے جواب میں موتی لال نہرو نے وعدہ کیا کہ اگر گورنمنٹ ان کے مطالبات پورا کرنے میں خلوص دکھائے گی تو وہ حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے۔

حکومت کے ارادوں کے اظہار کا موقع جلد ہی آ گیا۔ 5/فروری کو ایک تجویز پیش کی گئی کہ حکومت ہند کے ایکٹ 1919ء پر نظر ثانی کی جائے تاکہ ہندوستان کو مکمل خود اختیاری حکومت کا درجہ مل سکے۔ جواب میں حکومت نے وہی پرانے دلائل دوہرائے کہ ہندوستان ابھی حکومت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہی نہیں ہے نہ کہ اسے خود مختار قسم کی حکومت سونپ دی جائے۔ حکومت کے لیے یہ اندیشے خاص اہمیت رکھتے تھے کہ اس سے ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی سرمایہ داروں کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ برطانوی شہری اور فوجی ملازمین کا کیا حشر ہوگا اور ملک کا دفاع کیونکر ہو سکے گا۔ اور سب سے زیادہ لحاظ اس امر کا تھا، جیسا کہ ایک سرکاری ترجمان نے بتایا کہ ''اقلیتی فرقے بھی ہیں اور پوری ذمہ دار حکومت دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ اقلیتوں کے مفادات بھی اکثریت کے سپرد

کر دیے گئے۔ [1]

گورنمنٹ کے پاس یہی آخری ترپ کا پتہ تھا جس سے وہ قوم پرستوں کو روک سکتی تھی اور مسلمانوں کو خوف زدہ کر سکتی تھی اور پھر ہندوؤں کے بھی ذہنی سکون کو درہم برہم کرنے کی غرض سے اس نے یہ بھی کہا" جب پڑوسی ملک طاقتور ہو تو ملک کے دفاع کا مسئلہ اہم ہو جاتا ہے۔اور اگر حملہ ہو جائے تو ملک کی ایک بڑی جماعت کا کیا حال ہوگا؟" اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں دہشت کی ایک لہر دوڑ جائے۔ یہ شاطرانہ چال کہ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف سچ کو چھپا کر اور جھوٹ کو سامنے لا کر اکسایا جاتا رہے ناکام ہو گئی اور 18 رفروری کو اسمبلی نے موتی لال نہرو کی ترمیم 76 ووٹ سے بمقابلہ 48 ووٹوں کے مان لی۔ موتی لال نہرو کی ترمیم یہ تھی۔

" یہ اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے یہ سفارش کرتی ہے کہ وہ ہندوستان میں پوری ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے اقدام کریں اور اس مقصد کے لیے:

(الف) جلد سے جلد ایک نمائندہ گول میز کانفرنس طلب کریں جو تمام اہم اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے مناسب تحفظات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے لیے ایک دستور کی سفارش کرے۔

(ب) مرکزی مجلس قانون ساز کو برخواست کرنے کے بعد اس اسکیم کو منظوری کے لیے پیش کریں اور پھر اسے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کریں تا کہ وہاں اسے ایک ایکٹ کی صورت دیدی جائے" [2]

مالکم ہیلی نے گورنمنٹ کے رویے کی پوری طرح وضاحت بلاشبہ کر دی تھی۔

---

1. ذمہ دار حکومت کے مطالبے کے لیے امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں مباحثہ بتاریخ 8 رفروری 1924؛ حکومت ہند کے ممبر داخلہ مالکم ہیلی کی تقریر۔ 2. ایضاً

سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کے مشوروں کا پول کھل چکا تھا یعنی وہ تعاون نہیں فرماں برداری چاہتے تھے۔ گورنمنٹ حامیوں نے جو تقریریں کیں وہ حزب مخالف کے لیے گویا ایک للکار تھی۔ قوم پرستوں نے فطری طور پر اپنے ردعمل ویسے ہی ظاہر کیے جو قومی مفاد اور قومی وقار کے مناسب تھے۔

کونسل کے دوسرے اجلاس میں فریقین یعنی حکومت کی صفوں اور قوم پرستوں کے دستوں کے درمیان ایک طویل آویزش رہی۔ حکومت نے قوم پرستوں کو شکست دینے کے لیے تمام ذرائع اختیار کیے۔ فرقہ پرستی کو ہوا دی اور پارٹی کے ممبروں کو توڑ لینے کی کوششیں کیں کہ قوم پرستوں کی جماعت تتر بتر ہو جائے۔ قوم پرستوں نے اپنی تمام قانونی مہارت اور پارلیمانی فنکاری حکومت کے وقار کو ختم کر دینے اور حکومت کے اس دعوے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے میں صرف کی کہ 'اصلاحات' نے مطلق العنانی ختم کر دی ہے۔

اس جنگ نے اس وقت بہت زور دکھایا جب کہ 29 رفروری کو حکومت کے وزیر مالیات نے 25-1924 کا بجٹ پیش کیا۔ 10 / مارچ کو سپلائیز پر ووٹنگ ہوئی۔ مطالبہ (مانگ) پر مطالبے پیش ہوئے لیکن یا تو ان کو مسترد کر دیا گیا یا بہت کم رقم ان کے لیے منظور کی گئی۔ اور 17 / مارچ کو تو حکومت کو شکست فاش ہو گئی جب مالیاتی بل مسترد کر دیا گیا باوجودیکہ وزیر داخلہ کی اس آگاہی کہ اگر رد کیا گیا تو ہندوستان کو ذمہ دار حکومت کے قیام میں کوئی مدد نہ مل سکے گی۔

ان حالات کے پیش نظر حکومت نے مصلحت اس میں سمجھی کہ قوم پرست پارٹی کو رام کرنے کے لیے ایک لقمہ تر پیش کیا جائے۔ چنانچہ 4 / جون کو یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہ دریافت کرے کہ 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کیا ایسی بنیادی خامیاں ہیں جن سے

مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان خامیوں کو دور کرنے کی تدابیر بتائے۔ اس کمیٹی میں تین سرکاری عہدے دار تھے اور چھ غیر سرکاری۔ سر الیکزنڈر موڈی مین (Sir Alexander Muddiman) اس کے چیرمین تھے۔

مارچ 1924ء میں اسمبلی کے سامنے ایک اور اہم معاملہ آیا تھا۔ یہ محصول بورڈ (Tariff Board) کی رپورٹ تھی۔ یہ بورڈ اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اس بات کی جانچ کرے کہ ہندوستان میں فولاد سازی کی صنعت کو جو تحفظ مل رہا ہے اس میں توسیع کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

یہ محصول بورڈ اس محصول کمیشن (Tariff Commission) کی سفارش پر قایم کیا گیا تھا جس نے حکومت کی محصول کی پالیسی کی جانچ اس سے پیشتر کر کے ایک رپوٹ پیش کی تھی۔ محصول بورڈ نے حکومت کو یہ مشورے دیے:

1- فولاد کی بنیادی صنعت کے تحفظ کے لیے موٴثر اقدامات کیے جائیں۔

2- محاصل میں باقاعدگی لانے کے لیے پورے اختیارات بغیر کسی روک ٹوک کے استعمال میں لئے جائیں۔ چونکہ یہ سفارشات قوم پرستوں کے مطالبوں سے ہم آہنگی رکھتی تھیں اور آزاد تجارت کی جگہ اس اصول کو اختیار کر کے ایک عرصہ دراز کی شکایت کو دور کرنا اس کا مقصد تھا اس لیے یہ بل 5/جون کی اسمبلی میں کچھ ترمیمات کے ساتھ منظور ہو گیا اور 9/جون کو کونسل آف اسٹیٹ نے بھی اس کی منظوری دیدی۔

ستمبر 1924ء میں لی کمیشن کی رپورٹ اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش ہوئی۔ اس کمیشن کا تقرر اس لیے عمل میں آیا تھا کہ مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات سے عمال حکومت کے دلوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں جو شکوک پیدا ہو گئے تھے وہ دور کردیے جائیں۔ اس تحفظ کی ضمانت کے سلسلے میں دو طریقے تجویز کیے گئے تھے (1) آل انڈیا آسامیوں یا مرکزی آسامیوں کو حکومت ہند کے اختیار سے نکال

کر سکریٹری آف اسٹیٹ کے اختیار میں دے دینا (2) ہندوستان میں ایک پبلک سروس کمیشن کا قیام جو ملازمتوں پر تقرریاں کرے اور ان ملازمتوں یا اسامیوں میں جو اس کے ذمہ منتقل کر دیے جائیں ضبط و نظم قائم کرے اور ان کا تحفظ کرے۔

جہاں تک ملازمین کے الاؤنسوں کا تعلق تھا، متعدد رعایتوں کی سفارشیں کی گئیں خصوصاً برطانوی ملازمین کے لیے مثلاً سمندر پار جانے کی تنخواہ، زرمبادلہ کی تلافی کا الاؤنس، انگلستان آنے جانے والے خاندانوں کی آمد و رفت کا کرایہ، ممبران کونسل کے لیے پنشن میں اضافہ۔

رپورٹ میں ہندوستانیوں کے لیے یہ تجاویز بھی پیش کی گئی کہ سول سروس میں ان کی تعداد پچاس فی صدی کر دی جائے۔ ان سفارشوں میں چونکہ یورپین ملازمین کے لیے بہت فیاضانہ رعایتیں رکھی گئی تھیں اور ملازمتوں کو ہندوستانیوں کو دیے جانے میں بخل سے کام لیا گیا تھا اس لیے قوم پرست پارٹی (نیشنلسٹ پارٹی) کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ ان سفارشات کو منظور کر لیتی۔ چنانچہ پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو کے اشارے پر اس رپورٹ کو نامنظور کر دیا گیا۔

لیکن کونسل آف اسٹیٹ نے بہرحال حکومت کی اس تجویز کو بغیر کسی ترمیم کے منظور کر لیا۔

شروع 1925ء میں قوم پرستوں اور حکومت کے درمیان ایک اور بڑی لڑائی ہوئی۔ 20/جنوری کو وائسرائے نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اعلان کیا کہ حکومت ہند اور سکریٹری آف اسٹیٹ دونوں اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ بنگال آرڈیننس نمبر 1 کا نفاذ کر دیا جائے اور اس میں 25/اکتوبر 1924ء کے بنگال کے فوجداری قانون کا اضافہ مجلس قانون ساز کے مشورے کے بغیر کر دیا جائے۔ ان کا عذر یہ تھا کہ "یہ ذمہ داری اس قسم کی ہے کہ اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ اور میرے لیے یہ امر نہ

درست ہوگا نہ مناسب کہ میں اس میں آپ لوگوں کو شریک کروں یا اس ذمہ داری کا بار آپ کے کاندھوں پر ڈالوں"[1]

8/جنوری کو یہ تجویز پیش کی گئی جس میں حکومت سے اصرار کیا گیا کہ وہ " ایسے فوری اقدام کرے کہ جس سے قانون فوجداری ترمیمی آرڈیننس 1924ء ہندوستانی مجلس قانون ساز کے ایکٹ کے ذریعے منسوخ ہو سکے"۔5/فروری کو اس پر بحث ختم ہوئی اور ووٹ لیے گئے۔ تجویز کی موافقت میں 58 اور مخالفت میں 45 ووٹ آئے آرڈیننس کالعدم ہو گیا۔

لیکن 23/مارچ کو آرڈیننس کی چند دفعات کے تتمے کے طور پر حکومت نے ایک بل (مسودۂ قانون) پیش کیا جو کہ صوبۂ بنگال کی حکومت کے اختیارات سے باہر تھا۔ اگرچہ اس مسودہ میں کئی تبدیلیاں کردی گئیں تھیں لیکن اس کے ضرر رساں دفعات خارج نہیں کیے گئے تھے۔ یہ بل ایوان زیریں میں نامنظور ہو گیا۔ تب یہ ایوان بالا میں گورنر جنرل کے اس پیغام کے ساتھ پیش کیا گیا کہ وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بنگال میں امن و امان قایم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور سفارش کرتے ہیں کہ اس بل کو جو پہلے اسمبلی میں پیش ہو چکا ہے منظور کرلیا جائے۔ ایوان بالا کے لیے کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ اس نے مصدقہ بل کو منظور کرلیا۔

1925-26ء کا بجٹ اسی اجلاس میں زیرغور آیا۔ بدقسمتی سے قوم پرست اس کے متعلق ہم رائے نہ تھے۔ سوراجی چاہتے تھے کہ گذشتہ سال کی طرح عمل کیا جائے یعنی مطالبات کو کلی طور پر نامنظور کردیا جائے اور مالی بل رد کردیا جائے۔ انہوں نے اس نظریے کے تحت اپنا عمل جائز قرار دیا کہ جب تک ہماری شکایتیں رفع نہ کی جائیں

1۔ لارڈ ریڈنگ کی افتتاحیہ تقریر قانون ساز اسمبلی میں مورخہ 20/جنوری 1925، قانون ساز اسمبلی کے مباحث (سرکاری رپورٹ) جلد پنجم، نمبر 17 ص 9

ہم حکومت کے مطالبات منظور نہ کریں گے۔ بہر حال وہ اپنی پارٹی کی اس ہدایت کے پابند تھے کہ عدم تعاون اندرونی طور پر کیا جائے۔ قوم پرست اور اعتدال پسند ممبران اس بات سے متفق نہ تھے کہ حکومت کو اس کے مطالبات کے یکسر رد کر دینے سے مفلوج کیا جاسکتا ہے یا کر دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ طریق کار اختیار کرنے سے گورنر جنرل لامحالہ اپنے اختیارات خصوصی کو عمل میں لا کر منظوری دے دے گا۔ ان طریقوں سے نہ تو حکومت کے اختیارات ان کو مل سکتے تھے اور نہ فوری طور پر تمام حکومتی اختیارات حاصل کرنا ممکن تھا۔ اس طرح پر دو متضاد سیاسی نظریے کام کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرست دو بجٹوں سے چند مطالبات کٹوا سکے اور حکومت کو اس کے سہو اور غلطیوں پر ملامت ہی کر سکے۔

دوسرے وجوہ سے بھی یہ آپس کے اختلافات اور سنگین ہو گئے۔ کونسل کی ممبری نے حوصلہ مند لوگوں کو لبھانے والے مواقع فراہم کیے تا کہ وہ مقتدر ایکزیکٹیو اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکیں اور آئندہ وزارتیں حاصل کر سکیں یا صوبائی ایکزیکیٹو کونسل کے ممبر بن سکیں۔

دوسرا سبب شخصیتوں کا تصادم تھا۔ سوراج پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو حاکمانہ ذہنیت کے مالک تھے اور اختلافات رائے کو آسانی سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جناح خود نگر، الگ تھلگ رہنے والے اور رئیسانہ شان کے مالک تھے۔ وہ جلد ناراض ہو جانے اور دوسروں کو ناراض کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس لیے ان دونوں کا ہم رائے ہونا مشکل تھا اور آپس کا نباہ بھی آسان نہ تھا۔ جہاں بنیادی طور پر ذہنی کیفیات مختلف ہوں غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔

قوم پرستوں میں اس قسم کے اندرونی اختلافات ہونے کے باوجود جب 7/ ستمبر 1925ء کو اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی تو حکومت کو شکست فاش اٹھانا پڑی۔

یہ قابل ذکر ہے کہ موتی لال نہرو نے اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے تا کہ وہ 1919ء کے قانون پر نظر ثانی کر سکے تو حکومت نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا تھا البتہ اس کے لیے تیار ہوگئی تھی کہ وہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردے گی کہ وہ اس قانون کے عملدرآمد میں جو خامیاں ہیں ان کی نشان دہی کرے اور اس قانون کے حدود میں رہتے ہوئے ان خامیوں کو دور کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی تدبیریں بتائے۔

کمیٹی کے آٹھ ممبروں نے الیکزنڈر موڈی مین کی صدارت میں مارچ 1925ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ ممبروں کی رایوں میں اختلاف تھا اس لیے ایک اکثریت کی اور ایک اقلیت کی رپورٹ پیش ہوئی۔ اکثریت میں موڈی مین، حکومت کے وزیر داخلہ، محمد شفیع، گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے ممبر قانون، مہاراجہ ہردوان اور دو یورپی ممبر یعنی آرتھر فروم اور ہنری مانکریف اسمتھ تھے۔ اقلیت میں چار ہندوستانی تھے۔ تیج بہادر سپرو، سیوسوامی ایر، محمد علی جناح اور آر، پی، پرانجپے۔

ان دونوں رپورٹوں میں خاص اختلاف اس اہم سوال سے متعلق تھا کہ آیا قانون میں پائی جانے والی خامیاں 1919ء کے قانون کو پورے طور پر تبدیل کیے بغیر دور کی جاسکتی ہیں یا نہیں۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اس کو یکسر تبدیل کردینا قبل از وقت ہوگا۔ اس پر عملدرآمد میں اصلاح اسے یکسر تبدیل کیے بغیر ہوسکتی ہے۔ اقلیت اس کے برخلاف حکومت اتر پردیش (یو پی) کی اس رائے سے موافقت کرتی تھی "ایکٹ ایک الجھا اور بے ترتیب طریق کار تھا جس کی کوئی منطقی بنیاد نہ تھی بلکہ مصلحتوں اور مصالحتوں پر مبنی تھا اور اسے صرف وقتی اور عارضی طور پر کار برآری کے طور پر مانا جاسکتا تھا"[1] اس لیے اقلیت اس نتیجے پر پہنچی کہ اصلاحات کا تو خاصا تجربہ کرلیا گیا ہے

1۔ اصلاحی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ: اقلیت کی رپورٹ۔ انڈین سالانہ رجسٹر 1925، جلد اول ص 38

اور سوائے اس کے کہ پورے ایکٹ کو بنیادی طور پر از سر نو ترتیب دیا جائے معمولی تدبیروں اور ترمیموں سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اسمبلی میں بحث کا آغاز موڈی مین کی اس تحریک پر ہوا کہ اکثریت کی رپورٹ کے بنیادی اصول مان لیے جائیں اور اس کی تفصیلی سفارشات پر غور کر لیا جائے۔ موتی لال نہرو نے ایک ترمیم پیش کی کہ پارلیمنٹ کو ہندوستان کا یہ حق مان لینا چاہیے کہ وہ ایک ذمہ دار حکومت قایم کرے اور اس کے لیے تمام ہندوستانی پارٹیوں کی ایک گول میز کانفرنس فوراً طلب کرے تاکہ وہ ہندوستان کا دستور بنا کر اس کو ایک ایکٹ کی صورت میں پیش کرے۔

دو دن کی بحث و مباحثہ کے بعد ترمیم پر ووٹ لے گئے اور 45 ووٹوں سے 14 کے مقابلہ میں ترمیم منظور ہوگئی۔

10-سوراج پارٹی میں تفرقہ

اسی دوران مجلس قانون ساز کے باہر ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جنہوں نے سوراج پارٹی کے مستقبل کو بری طرح متاثر کیا۔ 16/جون 1925ء کو ملک کی بدقسمتی سے سی۔ آر۔ سی داس دفعتاً وفات پا گئے۔ اس مختصر عرصہ ہی میں جب سے انہوں نے سوراج پارٹی قایم کی تھی ان کی قیادت کی غیر معمولی استعداد ظاہر ہوگئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے کانگریسی ساتھیوں (جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے) کی مخالفت کے باوجود کل ہند پیمانے پر سوراج پارٹی کی تنظیم کی تھی بلکہ گاندھی جی کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور کانگریس کو راغب کر لیا تھا کہ وہ سوراج پارٹی کو اپنا لے۔ بنگال میں عہدوں کے حصول کی ترغیبات اور بنگال آرڈیننس 1924ء کی دھمکیوں کی پروا کیے بغیر انہوں نے مانٹیگو چیمسفورڈ دستور کو معطل کر دیا تھا۔ وہ سیاسی تدبر کی اعلیٰ بلندیوں پر اسی وقت

پہنچ گئے تھے جب پہلے پہل انہوں نے بنگال پیکٹ مرتب کیا تھا جو ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کا ایک منشور بن سکتا تھا اگر اس تنگ نظری نے اس کی جڑ نہ کاٹ دی ہوتی جو بے بنیاد وہمی خطرات کے باعث پیدا ہوگئی تھی اور دوسری بار اس وقت جب انہوں نے اپنے فرید پور کانفرنس کے خطبے میں برطانیہ کی طرف اعانت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اسے ہندوستان کے حکمران قبول نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات بہت زیادہ خراب ہو گئے۔

داس کی موت سے سوراج پارٹی کو سخت دھچکا پہنچا۔ حکومت کے خلاف معرکہ آرائی میں جو پارٹیاں اب تک اس کے ساتھ تعاون کر رہی تھیں اب اس سے ناموافقت اور بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگیں جلد ہی یہ اختلاف کھل کر سامنے آ گئے جس سے پارٹی میں آخر کار پھوٹ پڑ گئی۔ اس پھوٹ یا تفرقے کا آغاز اس وقت ہوا جب 8 ر اکتوبر کو یہ اعلان کیا گیا کہ تامبے نے جو کہ ممالک متوسط میں سوراجیوں کے ایک ممتاز لیڈر تھے، صوبے کی ایکزیکٹیو کونسل کی ممبری قبول کر لی ہے۔

اس واقعے سے شدید اور تلخ اختلافات پیدا ہو گئے۔ پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو نے تامبے سے جواب طلب کیا اور سوراج پارٹی کی میٹنگ ناگپور میں بلائی تا کہ اس معاملے پر غور و خوض کیا جا سکے۔ قبل اس کے میٹنگ منعقد ہو، بمبئی کی مجلس قانون ساز میں سوراج پارٹی کی لیڈر رجے کار نے ایک بیان جاری کیا کہ تامبے کا یہ فعل وی جی پٹیل کے اس فعل کی طرح ہے جو انہوں نے قانون ساز اسمبلی کے صدر کے تنخواہ دار عہدے کو قبول کر کے انجام دیا ہے۔ انہوں نے یہ رائے بھی دی کہ عہدوں سے انکار کرنے کی حکمت عملی کی دوبارہ جانچ کی جائے اور پوچھا کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ با اثر، با اختیار اور ذمہ دار عہدوں کو بلا تامل قبول کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں بے شمار بیانات اور ان کے جوابات اخباروں میں شایع ہوئے جن سے ظاہر ہو گیا۔ کہ

سوراج پارٹی میں اختلافات کی خلیج اور گہری ہوگئی ہے۔

2 رنومبر کو ناگپور میں پارٹی کی مجلس عاملہ نے ایک تجویز تامبے کی فعل کی مذمت کرتے ہوئے یہ جتا کر پاس کی کہ ان کی یہ حرکت پارٹی کے دستور کی سخت خلاف ورزی بھی ہے اور ضبط و نظم (ڈسپلن) سے سرتابی بھی لیکن بدقسمتی سے اس تجویز کا ردعمل یہ ہوا کہ مہاراشٹر کی مجلس قانون کے بہت سے ممبر سوراج پارٹی کی مجلس عاملہ کے خلاف متحد ہوگئے۔ مسٹر جے کار اور مسٹر کیلکر نے مجلس عاملہ سے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی پارٹی جوابی تعاون کرنے والی(Responsive cooperation) اس غرض سے بنائی تا کہ کونسل میں دخل اندازی کے پروگرام کو آگے بڑھایا جاسکے اور اس کے لیے تمام بااختیار کلیدی اور ذمہ دار جگہوں کو حاصل کرلیا جائے تا کہ بیوروکریٹس کے لیے کوئی جگہ نہ رہے۔[1]

سوراجیوں اور جوابی تعاون کرنے والی پارٹی لیڈروں کے میل ملاپ کی اور پارٹی کے اتحاد کو پھر سے استوار کرنے کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ جنوری 1926ء میں جب دہلی میں قانون ساز اسمبلی کا موسم سرما کا اجلاس ہوا، سوراج پارٹی کے افق پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ایک طرف وہ تھے جو کہ تھکا دینے والے داؤں گھات کی بدولت مسلسل رکاوٹوں سے اکتا چکے تھے دوسری طرف وہ ممبران تھے جو کونسل کے ہر کام کو فضول اور لایعنی سمجھ چکے تھے خواہ حزب مخالف کی حیثیت سے خواہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے۔ ان دونوں قسم کے ممبروں میں رسہ کشی شروع ہوگئی۔

جوابی تعان کرنے والوں نے اس بحران کو ذمہ داری کے عہدوں کو قبول کر کے ختم کرنا چاہا حالانکہ اصلاحات کا میدان بہت محدود تھا۔ اس کے برخلاف آل انڈیا

1۔ انڈین سالانہ رجسٹر، 1925ء جلد دوم ص 336 انڈین نیشنل کانگریس 1925ء موتی لال نہرو کی تجویز سیاسی پروگرام کے متعلق اور اس پر مباحثہ۔ جے کار کی تقریر۔

کانگریس کمیٹی کی دہلی کی میٹنگ (7 / مارچ) میں یہ طے کیا گیا کہ حکومت نے چونکہ سوراج پارٹی کے وہ مطالبات جو اس نے فرید پور میں اپنے بیان میں پیش کیے تھے اور ان تجاویز وترمیمات کو جو سوراج پارٹی نے اسمبلی میں پیش کی تھیں رد کردی ہیں اس لیے پارٹی کے ممبروں کو چاہئے کہ وہ مجلس قانون ساز سے اٹھ کر چلے آئیں اور اس طرح اپنی نارضامندی کا اظہار کردیں۔

وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ 20 / جنوری 1926ء کو اسمبلی میں اس نے اپنے افتتاحی خطبے میں مصالحت ساز اشارے کیے تاکہ وہ لوگ جو سوراج پارٹی کے سخت ڈسپلن (نظم وضبط) سے برگشتہ خاطر ہورہے تھے اس کی طرف آئیں۔ ان ہندوستانیوں کے لیے جو برطانوی نوآبادیات میں سخت برتاؤ اور ملکی تفریق کا شکار ہیں بڑی ہمدردی جتائی۔ اس کا بھی اعلان کیا گیا کہ ایک کمیشن کا تقرر کردیا گیا ہے جو اس بات کی تحقیق کرے گا کہ ملک زراعت میں کیوں پیچھے ہے اور ان خامیوں کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کرنے کے لیے سفارشیں پیش کرے گا۔ جہاں تک سیاسی اصلاح کے اہم سوال کا تعلق ہے انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ہندوستانی لیڈروں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کردیا جو انہیں 1919ء کے ایکٹ میں دیے گئے تھے اور فرمایا کہ ”مجھے یقین کامل ہے کہ اگر ہندوستانیوں کا ردعمل زیادہ فیاضانہ ہوا ہوتا تو اس کا اثر بھی فیاضانہ ہوتا۔ برطانیہ نے جو پیش قدمی کی ہے اس کو فوراً اور ہمدردی سے قبول کرلینے پر برطانیہ کا دل بھی جیتا جاسکتا تھا اور پھر ایک نئی صورت حال پیدا ہوجاتی جس کی بنیادیں آپس میں اعتماد اور نیک نیتی پر مبنی ہوتیں۔[1]

---

1. انڈین سالانہ رجسٹر 1926ء جلد 1 ص 16 وائسرائے کا افتتاحیہ خطبہ۔ قانون ساز اسمبلی دہلی، 20 / جنوری 1926ء

موتی لال نہرو نے اس تقریر کو سوراج پارٹی کے لیے ایک چیلنج (للکار) سمجھا جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرلیا جائے تا کہ وہ قومی تحریک میں حصہ لینے سے باز رہیں۔

حکومت کی نیک نیتی کو جانچنے کے لیے تجاویز پیش کی گئیں کہ بنگال میں جو قیدی بنا لیے گئے ہیں ان پر یا تو مروجہ قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے یا انھیں رہا کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ 1818ء کا ضابطہ نمبر 3 منسوخ کر دیا جائے۔ ان دونوں تجاویز کی حکومت نے مخالفت کی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ وایسرائے کے خطبے کے باوجود حکومت کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ دستور میں اصلاح کی بھی حکومت کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ اس کا ردعمل قوم پرستوں پر یہ ہوا کہ انہوں نے ریلوے بجٹ کے مطالبات میں نامنظوری اور کمی اخراجات کی تحریکیں پیش کرنا شروع کر دیں۔ 27-1926ء کا عام بجٹ اسمبلی میں یکم مارچ کو پیش کیا گیا۔ سوراج پارٹی کے لیڈر نے 8 مارچ کو قبل اس کے کہ مطالبات پر بحث شروع ہوا ایک بیان دیا جس میں انہوں نے یاد دلایا کہ کیونکر اہانت آمیز تجربے کے بعد بھی تعاون اور دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا گیا تھا اسے حکومت نے کس حقارت سے جھٹک دیا ہے۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ حکومت کو ان الفاظ میں متنبہ کیا:

"ہمارے لیے اب یہاں رہنا بالکل بیکار ہے۔ ہم ملک میں دوبارہ پھر جائیں گے اور لوگوں کے ووٹ ایک مرتبہ پھر حاصل کریں گے۔ ہم اس جدوجہد کو چھوڑ نہیں سکتے ....ہم کو اپنی صلاحیتوں یا اپنی قسمتوں کے متعلق کسی قسم کے شبہات نہیں ہیں۔ ہم ملک میں جائیں گے اور آزمائش کریں گے۔ یا تو پوری طرح ہار جائیں گے یا کامیاب ہوں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ مصنوعی ادارے ہمارے لیے بالکل بے مصرف ہیں اور کم سے کم ہم لوگ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے ملک کی شان اور عزت کو

برقرار رکھنے کی خاطر ان اداروں سے باہر نکل جائیں اور ملک میں کچھ کام کرنے کے لیے واپس جائیں اور کوشش کرکے کچھ ایسے مطالبات تیار کریں جو خود کسی حکومت کو لوگوں کے مطالبات ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"[1]

اس بیان کے فوراً ہی بعد سوراج پارٹی کی ساری جماعت اسمبلی کے ہال سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس پر پریسیڈنٹ وی جے پٹیل نے ایک غیر معمولی قدم یہ اٹھایا کہ اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کر دیا۔ دوبارہ اس کا اجلاس جب 11 / مارچ کو ہوا جناح نے ایک تجویز پیش کی کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کو جو الاؤنس دیا جاتا ہے وہ بند کر دیا جائے۔ اصلاحات سے متعلق حکومت کی جو پالیسی تھی اس کے لیے یہ تجویز گویا ایک ملامتی ووٹ تھا۔ اس تجویز پر ووٹ ڈالے گئے اور شکست ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ سوراجیوں کے بغیر حزب مخالف جن میں زیادہ تر قوم پرست ہی تھے مؤثر نہ تھی۔

سوراج پارٹی کے اسمبلی سے کنارہ کش ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ کونسل کے اندر رہ کر سوراج حاصل کر لینے کی جدوجہد کا خاتمہ اب دور نہ تھا۔ لیکن شملہ کے آخری اجلاس میں سوراج پارٹی نے اسمبلی میں جب کبھی ضرورت ہوئی شرکت کی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کرنسی بل (Currency Bill) جس میں روپیہ اور پونڈ کا تناسب طے کیا جانے والا تھا اگست کے آخری ہفتے میں پیش ہوا۔

نئے انتخابات اب قریب آرہے تھے اس لیے کوششیں کی گئیں کہ حزب مخالف میں اتحاد پھر سے پختہ کر لیا جائے۔ بدقسمتی سے گاندھی جی اور 1926ء کی کانگریس کی پریسڈنٹ مسز نائیڈو اور دیگر لوگوں کو اس معاملہ میں ناکامی رہی۔ جے کار، کیلکر،

1۔ مجلس قانون ساز کے مباحثے (سرکاری رپورٹ) جلد ہفتم حصہ سوم۔ ص 2143۔ موتی لال نہرو مجلس قانون ساز، 8/ مارچ 1926ء

مونجے اور دوسرے لوگوں نے ایک علاحدہ پارٹی بنالی جس کا نام جوابی تعاون کرنے والی(Responsrive Cooperation) رکھا گیا۔

مالویہ نے جو کہ اس تعاونی پارٹی کے خیالات سے اتفاق رکھتے تھے ایک بے ضابطہ میٹنگ 11 / اور 12 / ستمبر کو صوبہ دہلی کے لیڈروں اور ممتاز کانگریسیوں کی طلب کی تاکہ کانگریسیوں کی ایک متحد پارٹی بن سکے۔ اس میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ الیکشن لڑنے کے لیے تعاونی پارٹی کے ساتھ شریک ہو کر ایک آزاد کانگریس پارٹی بنائی جائے جو کانگریس کے اندر ہی ایک علاحدہ جماعت کی حیثیت سے کام کرے۔ اس طرح سوراج پارٹی تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ (1) وہ پارٹی جس کے لیڈر موتی لال نہرو تھے (2) جوابی تعاون کرنے والی پارٹی جس کے لیڈر جے کار، کیلکر اور مونجے تھے اور (3) آزاد کانگریس پارٹی جو مالویہ اور لاجپت رائے کی قائم کردہ تھی۔

نومبر اور دسمبر 1926ء میں جو انتخابات ہوئے اس سے ان سیاسی قوتوں کا انتشار بالکل واضح ہوگیا۔ سوراج پارٹی کو نمایاں کامیابی صرف صوبہ مدراس میں حاصل ہوئی جہاں انہوں نے برہمنوں کے خلاف پارٹی کو شکست فاش دیدی۔ بنگال میں اس کی جیسی پوزیشن تھی وہی بحال رہ سکی۔ بہار اور اڑیسہ میں جو ممبران کامیاب ہوئے وہ کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیکن رویہ کے اعتبار سے جوابی تعاون کرنے والے تھے۔ صوبہ جات بمبئی، ممالک متوسط، یوپی اور پنجاب میں انہیں شکست فاش ہوئی۔

امپیریل قانون ساز اسمبلی میں سوراجی برے نہیں رہے۔ انھوں نے 104 جیتی ہوئی نشستوں میں سے 40 حاصل کرلیں۔ لیکن پچھلی اسمبلی کے مقابلے میں اس نئی اسمبلی کی شکل بالکل مختلف تھی۔ سوراجیوں کی تعداد ان کے مخالفین یعنی تعاونی پارٹی کے برابر تھی۔ جناح کی آزاد پارٹی غائب ہوچکی تھی اور وہ تنہا الگ بیٹھے تھے۔

منتخبہ مسلمان ممبروں میں زیادہ تر فرقہ پرست تھے اور وہ کسی قوم پرست پارٹی میں شریک نہ تھے۔

جب اس نئی اسمبلی کا اجلاس 24/جنوری 1927ء کو ہوا تو وایسرائے لارڈ اروِن نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا۔ دستوری پیش رفت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے تہدید آمیز (دھمکی کا) لہجہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''جو لوگ دستوری پیش رفت دیکھنے کے لیے بے چین ہیں انہیں پارلیمنٹ کو یا تو مجبور کرنا ہوگا یا قائل کرنا ہوگا۔ میں اس سے زیادہ پرزور طریقے پر تاکید نہیں کرسکتا کہ وہ پارلیمنٹ پر جبر کرنے میں قطعی کامیاب نہ ہوں گے اور پارلیمنٹ اس قسم کی ہر کوشش کو سخت ناپسند کرے گی خواہ وہ کوشش کسی شکل میں کی جائے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ اس قسم کی زبان سے ضرور اپنی سخت بے چینی اور بے اطمینانی ظاہر کرے گی جس کے استعمال سے نہ صرف برطانوی مفاد بلکہ برطانوی تعلقات سے دشمنی ٹپکتی معلوم ہوتی ہے۔''[1]

انہوں نے سوراج پارٹی کو ان الفاظ میں دھمکی دی: ''اگر اس نے (پارلیمنٹ نے) ہندوستانی رائے عامہ کی کسی بڑی جماعت کو دیکھا کہ وہ ہندوستان میں خودمختار حکومت قایم کرنے کے مسئلہ میں اپنی خواہشات کا بہت بلند آہنگی سے اظہار کررہی ہے اور مستقل طور پر کچھ نہ کرنے بلکہ ہندوستان کی حکومت کے طریقۂ کار میں جو اسے تفویض ہوا ہے رکاوٹیں ڈالنے پر مصر ہے تو اغلب ہے کہ پارلیمنٹ کو اس امر کا ثبوت مل جائے کہ مغربی دستوری طریق کو ہندوستان میں نافذ کرنا غلطی ہوگی نہ کہ عقلمندی کہ ہندوستان کو اس کی حکومت کی ذمہ داریاں فوراً سونپ دی جائیں''[2]

حکومت کی ناراضگی اور غصہ کے باوجود اسمبلی کے ممبران نے اپنا غلبہ دکھایا اور

1۔ قانون ساز اسمبلی کے مباحثے (سرکاری رپورٹ) 19/جنوری تا 21 فروری 1927ء جلد اول، ص 47 وایسرائے کا افتتاحی خطبہ۔ 2۔ بحوالہ سابقہ۔ ص 48

متعدد تجاویز پاس کیں جن میں بنگال کے ان لوگوں کو جنہیں بغیر مقدمہ چلائے قید و بند میں ڈال دیا گیا تھا مذمت کی۔ اگر چہ اسمبلی میں اب معذور ہندوستانیوں کی نمایندگی کرنے والے نمایندے بے دست و پا تھے پھر بھی وہ ایگزیکیٹو کونسل کے مطالبات میں بقدر ایک روپیہ کمی کرا دینے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کمی یا کٹوتی کرانے کے سلسلے میں جو مباحثہ ہوا اس سے ممبروں کو دستوری اصلاح کے معاملے میں اظہار خیال کرنے کا موقع مل گیا۔ ہندستانی ممبروں یعنی سوراجیوں اور جوابی تعاون کرنے والی پارٹی دونوں نے دستوری اصلاح لانے میں عجلت کرنے پر زور دیا۔ حکومت نے اس کی مخالفت کی لیکن 65 کے مقابلہ میں 56 ووٹوں سے ہار گئی۔

سالانہ بجٹ پر بحث کے دوران حکومت اور حزب مخالف کے درمیان پر جوش تبادلہ خیالات ہوا جس کے باعث نمک پر ٹیکس بڑھانے کی تجویز نامنظور ہوگئی۔ لیکن کونسل آف اسٹیٹ نے اسے بعد میں منظور کر دیا۔

اسمبلی کے التوا کے بعد کئی مہینوں تک اس قسم کی افواہیں بہت اڑتی رہیں کہ ایک کمیشن مقرر کیا جانے والا ہے جو اصلاحات کے متعلق جانچ پڑتال کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ جب 8/نومبر 1927ء کو وایسرائے نے یہ اعلان کیا کہ حکومت نے طے کیا ہے کہ پارلیمنٹ کے سات ممبروں پر مشتمل ایک پارلیمانی کمیشن مقرر کیا جائے جس کے سربراہ سر جان سائمن ہوں گے تب ان افواہوں کا زور ختم ہوا۔

اس تقرری کا ہندوستانیوں پر جو ردعمل ہوا وہ یکسر معاندانہ اور مخالفانہ تھا اور یہ بات پہلے ہی سوچی جا سکتی تھی لیکن برطانوی حکمرانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے یہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انگلستان میں برطانوی ارباب حل وعقد اور ان کے وہ ایجنٹ جو ہندوستان میں تھے ہندوستانیوں کے خیالات اور جذبات سے اس قدر لاعلم اور ناواقف تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔ چونکہ سائمن کمیشن پر

بحث بعد کے باب میں کی جائے گی اس وقت ضروری یہ ہے کہ اس مباحثے کی طرف توجہ دی جائے جو اسمبلی میں 26رفروری 1928ء کو ہوا تھا۔

لاجپت رائے نے ذیل کی تجویز پیش کرتے ہوئے بحث کا آغاز کیا:

''یہ اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ملک معظم کی حکومت کو پارلیمانی کمیشن میں جو کہ ہندوستان کے دستور پر نظر ثانی کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اسمبلی کے کامل عدم اعتماد سے مطلع کر دیں۔''

اس پر بحث کے سلسلے میں لاجپت رائے نے اعلان کیا کہ وہ کمیشن کی نیز ان ذمہ دار لوگوں کی نیک نیتی پر جنہوں نے اس کا تقرر کیا ہے اعتماد نہیں رکھتے اور نہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ لوگ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کریں گے یا ہندوستان کے مفادات پیش نظر رکھیں گے۔ انہوں نے اس شک کا بھی اظہار کیا کہ یہ لوگ ہندوستان کے پیچیدہ معاملات کو صحیح طور پر سلجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ انہیں ایسا کرنے کا کوئی اخلاقی حق پہنچتا ہے کیونکہ کمیشن کے سب ہی ممبران سفید فام کے لیے یہ بات انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔

جے کار نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ آئینی طور پر سب سفید فام لوگ ہی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے ثالث بنائے جاسکتے ہیں۔ جناح چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو بھی اصلاحات سے متعلق تحقیقات کرنے نیز سفارشات پیش کرنے کا برابر کا درجہ اور برابر کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ بعض مسلمان ممبروں نے کمیشن کو خوش آمدید کہا تھا، انہوں نے اسمبلی سے کہا: '' یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو مسلمانوں کے لیے ایک بہت ہی حیرت انگیز اچھی فصل کاٹنا چاہتے ہیں۔ میں اس پر یہ کہتا ہوں کہ '' آپ کو بے وقوف بنایا جاچکا ہے اور آپ پھر بے وقوف بننا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے تسلیم نہیں کہ

میں بے وقوف بنایا جاؤں۔"[1]

مالویہ نے تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ اگر انہوں کمیشن کی موافقت میں ووٹ دیے تو قوم کی عزت داؤ پر لگ جائے گی۔

جب تجویز پر ووٹ لیے گئے تو سائمن کمیشن کی موافقت میں 62 اور اس سے تعاون کی مخالفت میں 68 ووٹ آئے۔ اس طرح اسمبلی نے زوردار طریقے پر کمیشن کو نامنظور کر دیا۔

اب چونکہ کمیشن کی تحقیقات اور روئداد والا معاملہ دیگر کارروائیوں پر چھایا ہوا تھا، مجلس کی دوسری کارروائیوں کی طرف ممبروں کی دلچسپی بہت کم رہ گئی۔ عام بجٹ، ریلوے بجٹ اور حکومت کو چھوڑ کر دیگر کسی کام میں کوئی غیر معمولی گرمجوشی کا اظہار نہیں ہوا۔

چند دوسرے حالات بھی درپیش ہونے لگے کیونکہ مجالس قانون ساز کے باہر سیاسی پارہ کا درجہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ حکومت پر عدم اعتماد بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور ممبران پارلیمنٹ کے بیانات سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ وایسرائے کی بظاہر صلح آمیز یقین دہانیوں اور برطانوی حکمراں پارٹیوں کے واقعی ارادوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور گروہوں میں اتفاق رائے کا نہ ہونا اور اس نااتفاقی سے فائدہ اٹھانے کے لیے حکومت کا مختلف چالوں سے کام لینا تاکہ خودمختار حکومت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ ان سب باتوں سے لوگوں کے شکوک بھی بڑھ گئے اور مستقبل کے بارے میں عدم اعتماد بھی۔

یہ صورت حال اپنے انتہائی عروج پر اس وقت پہنچ گئی جب ارون نے 31/ اکتوبر 1929ء کو یہ اعلان کیا کہ (1) ہندوستان کی درجہ ترقی کا مقصد یہ

---

[1] مجلس قانون ساز کے مباحثے (سرکاری رپورٹ) (یکم فروری تا 7/ مارچ 1928ء) جلد اول-ص 425۔
ایم، اے جناح، مجلس قانون ساز میں تقریر 16/ فروری 1928ء

ہے کہ اسے نوآبادیات (Dominion status) حاصل ہو جائے۔

(2) حکومت کا ارادہ ہے کہ وہ ایک کانفرنس کا انعقاد کرے جس میں برطانوی ہندوستان اور ریاستوں، دونوں کے نمائندے شامل ہو کر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے سے فیصلہ کن تجاویز پاس کرلیں۔ پھر بعد میں ہز مجسٹی کی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان تجاویز کو پارلیمنٹ میں پیش کرے۔

اس اعلان پر ہندوستان کے لیڈروں اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے غور وخوض کرکے یہ وعدہ کیا کہ ہندوستان اس معاملے میں تعاون کرے گا اگر چند شرایط پورے کردیے جائیں اور چند باتوں کی وضاحت کردی جائے۔ اپنے چند انگریز دوستوں کے فوری اصرار پر گاندھی جی نے بیان دیا کہ وہ تو خود ''تعاون کے لیے مر رہے ہیں۔'' لیکن وایسرائے کے اس اعلان کی پارلیمنٹ میں مخالفت کی گئی۔ لیبر حکومت (Labour Government) کی طرف سے یہ کہا گیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو مملکت کا درجہ فوراً بیک جنبش قلم دیدینے کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔ اروِن کے اکتوبر کے اعلان سے بڑی امیدیں بندھ گئی تھیں سب یکسر ٹوٹ گئیں جب انہوں نے 23 ردسمبر کو گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کے دوران ملاقات اس بات کا اظہار کیا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ ہندوستان کو مملکت کا درجہ دینے کے قطعی وعدے کے ساتھ کسی گول میز کانفرنس کے لیے دعوت دے سکیں۔ بلبلا پھوٹ گیا اور حکومت کی دورخی پالیسی کا پول کھل گیا اور حکومت کی نیک نیتی کے متعلق جو شکوک وشبہات تھے راسخ ہو گئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا۔ دسمبر کے آخری دنوں میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا۔ اس میں گاندھی جی کی پیش کردہ ایک قرارداد منظور کرلی گئی جس میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ سوراج یعنی مکمل آزادی

ہندوستان کی منزل مقصود ہے اور اس منزل کو سر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے۔ کانگریس (اب) کسی گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوگی اور سوراج پارٹی کے وہ ممبر جو کونسل میں ہیں انہیں چاہئے کہ فوراً استعفیٰ داخل کردیں۔

جنوری 1930ء میں اس تجویز پر قانون ساز مجلس کے ممبروں نے عملدرآمد کیا۔ اس طرح اندرونی عدم تعاون کا باب ختم ہوگیا۔ کیا چھ سال کا یہ تجربہ محض فضول کارروائیاں کرتے رہنے کی مشق کرنا نہ تھا؟ وہ لوگ تو ایسا ہی سمجھتے تھے جو (اپنی پالیسی میں) کسی قسم کی تبدیلی کے موافق نہ تھے۔ اس بات کا صحیح جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے حصول کے پیچیدہ مسئلہ کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

11-تحریک آزادی کے مضمرات

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے آزادی کی تحریک کا مسئلہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا کہ صرف سیاسی طاقت برطانیہ ہندوستان کو منتقل کردے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ سیاسی مزاج میں ایسے تغیرات کا پیدا ہوجانا جن کی بنیاد ان سماجی ترقیوں پر ہو جو جدید اقتصادی طریق کار اختیار کرلینے سے حاصل ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ غور وفکر کرنے کے طریقوں میں تبدیلی اور مختلف قدروں کو پرکھنے کے انداز میں تبدیلی بھی ان تغیرات میں شامل تھے۔

اس لیے دو متضاد رجحانات برسرعمل تھے۔ ایک طرف تو مغرب کے سیاسی غلبہ سے نجات پانے کی خواہش تھی دوسری طرف مغرب کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، سائنسی اور تکنیکی تصورات اپنی کشش دکھارہے تھے۔

اس دوئی اور تصادم کی کیفیت نے آزادی کی جدوجہد کو متاثر کیا۔ ترک موالات اور سول نافرمانی اس کا ایک رخ تھا اور عدم تشدد دوسرا۔ اگر عدم تشدد کے ساتھ مزاحمت کی پالیسی جارحانہ اور جنگ کا رخ پیش کرتی تھی تو مختلف درجے کے عدم تشدد کے دوسرے طریقے، مثلاً مزاحمت، ہمدردی کے ساتھ تعاون، آئینی طور پر ناراضگی کا اظہار اور اختلاف وغیرہ دوسرا رخ ظاہر کرتے تھے۔

اب ان پچھلی باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں طریقوں نے مشترکہ مقصود یعنی حکومت خود اختیاری حاصل کر لینے میں مدد کی۔

گاندھی جی کی عدم تعاون کی کارروائی نے حرکت میں لانے والی طاقت کے لیے بھاپ پیدا کی جس نے قوم کو آگے بڑھانے کی سکت پیدا کر دی۔ سوراجیوں کی مزاحمت کی کارروائیوں نے اس راستے کا تعین کر دیا جس پر قوم کو چلنا تھا۔ جوابی تعاون گروپ اور لبرل لوگوں نے (ان دونوں میں بہت کم فرق تھا) پرکار اور نقشہ فراہم کر دیا جس سے راستہ اور آگے بڑھنے کی منزلیں معلوم ہوتی رہیں۔

1921ء سے 1930ء تک لبرل اور سوراجی اپنے اوپر خود عائد کردہ کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مورچہ بند سامراجی طاقتیں ان کے مقابل تھیں۔ یہ طاقتیں بظاہر تو ناقابل تسخیر تھیں کیونکہ ایک عظیم الشان سلطنت کے لامحدود وسائل ان کے قبضے میں تھے لیکن ان وسائل کو کسی مقصد کے لیے استعمال کرنے کا انحصار تو ان لوگوں کی مرضی اور عقل پر تھا جو انہیں استعمال میں لا سکتے تھے اور جن کو سامنا ایسے لوگوں کا کرنا تھا جو مخالفت کے لیے اپنے کو وقف کر چکے تھے۔

ان حکمرانوں نے ایک طویل مدت تک ہندوستان پر بلا کسی مزاحمت کے حکومت کی تھی لیکن جب بیسویں صدی کے شروع میں ان کے سامنے خم ٹھونکا گیا تو ان کا اطمینان قلب درہم برہم ہو گیا اور ان کو بڑی فکر لاحق ہو گئی کہ کس طرح اس خطرے پر

غلبہ پایا جائے۔ مارلے منٹو اسکیم وضع کی گئی تا کہ ان مخالفین کو جو زیادہ کٹر نہیں تھے رام کرلیا جائے اور جو سخت دشمن تھے ان کو دبا دیا جائے اور اسی طرح ان للکارنے والوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں تتر بتر کر دیا جائے۔ مارلے منٹو کی سہ نکاتی پالیسی کا خاص مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے شاہی مفادات برقرار رہیں اور اسی لیے یہ برطانوی پالیسی ہندوستان کے لیے ایک نمونہ قرار پائی۔ برطانیہ کی تمام سیاسی پارٹیاں یعنی قدامت پرست (Conservative)، آزاد خیال (Libral) اور مزدور جماعت (Labour) ہندوستان کے مسئلے کو کسی پارٹی کا سوال نہیں سمجھتی تھیں بلکہ اسے اپنے قوم کے مفاد کا ایک معاملہ سمجھتی تھیں۔

تاہم اپنے سیاسی تجربے، جمہوری ماحول اور پارلیمانی تربیت کے باعث برطانیہ کا حکمراں طبقہ اپنے مقاصد کو اپنے مخصوص انداز میں برقرار رکھنے کا عادی ہو چکا تھا جیسا کہ ان کے طریقہ حکومت سے ظاہر تھا اور اسی لیے برطانوی سامراج گذشتہ اور حال کے سامراجوں سے مختلف تھا۔ یہ سامراج اس بات کی بڑی کوشش کرتا تھا کہ اپنے مفادات کے حصول کے سلسلے میں ظاہری طور پر اپنی رعایا پر سختی نہ کرے۔ اس لیے حکومت اپنی حرکتوں پر فریب کا ایک نقاب ڈال دیتی تھی جس سے نہ صرف اس کی اصلی فطرت اس کی رعایا کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی بلکہ خود اس کے جو ایجنٹ تھے انہیں اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ وہ واقعی ان کی بھلائی کے لیے کوشاں ہے۔

اس لیے اگر ایک طرف ہندوستانی قوم پرستوں کا ذہن دو تدبیروں (تشدد اور عدم تشدد) کے درمیان تذبذب میں تھا کہ کسے اختیار کیا جائے اور انہوں نے بالآخر سرکشی اور بغاوت کر کے بدیسی حکومت کا تختہ الٹ دینے کے عام طریقے کو رد کر دیا تو دوسری طرف برطانوی حکمراں بھی یکسو ہو کر اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے وہ طریقہ کار استعمال نہ کر سکے جو عموماً حکمراں طبقہ ایسے موقعوں پر کیا کرتا ہے یعنی اپنی

رعایا کو سختی اور شدت سے دبا دیتے۔

ان دونوں (قوم پرستوں اور حکومت) کی حکمت عملیوں کے ٹکراؤ سے اس زمانے کی تاریخ مرتب ہوئی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے ساتھ ساتھ رولٹ ایکٹ کے قوانین بھی ظاہر ہوئے۔ اسی طرح عدم تعاون اور خلافت تحریک اور کونسلوں میں لبرل اور سوراجیوں کا اتحاد ظہور پذیر ہوا۔ اس موقع پر یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ سوراجیوں کی مزاحمت کی پالیسی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جائے اور ان اسباب کا بھی جن کے باعث انہوں نے کونسل میں اپنا کام روک دیا۔ 1921ء میں چیمسفورڈ سبکدوش ہوگئے اور ریڈنگ نے جو انگلستان کے عوام میں صف اول کے آدمی شمار کیے جاتے تھے دفتر سنبھالا۔ یہ بہت ذہین، چالاک اور مستعد آدمی تھا اور شاطرانہ چالوں میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس میں خود اعتمادی تھی اور وہ متوازن ذہن کا مالک تھا۔ جب اسے کسی راہ عمل کی صحت کا یقین ہوجاتا تھا تو وہ بڑی ہمت کے ساتھ اپنے فیصلے پر اٹل ہوجاتا تھا۔ اگرچہ وہ لائڈ جارج کی قسم کا لبرل تھا لیکن ہندوستان میں آئینی ترقی کے معاملے میں وہ کٹر قدامت پرست تھا۔ اس کا مقصد سیاسی یہ تھا کہ اعتدال پسندوں (Moderates) کو جو کہ لبرل پارٹی کے اور ان کے حریت پسندانہ اصولوں کے مداح تھے خوش رکھ سکے اور ان کی مدد سے قوم پرستوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر ان کے مقاصد کو ناکام بنا دے۔

جس دستور پر اسے عملدرآمد کرنے کے لیے کہا گیا تھا اس نے وایسرائے کی ذمہ داریوں اور مشکلات کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اس کو کئی معاملات کے متعلق اپنی ہی رائے سے فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ ان معاملات میں قانونی طور پر وہ بااختیار تھا۔ اس کو سکریٹری آف اسٹیٹ کی ہدایات، احکامات یا نگرانی کی ضرورت نہ تھی۔ ایک ایسے طرز حکومت کی ذمہ داریوں اور پیچیدگیوں نے جو دو عملی قسم کی تھیں یہ اثر کیا کہ سکریٹری آف

اسٹیٹ اور گورنر جنرل کے کار منصبی کو تقریباً منقلب کر دیا جیسا کہ مارلے، کریو، چیمبرلین اور مانٹیگو کے عمل سے ظاہر ہے۔ انہیں لوگوں نے آئینی اصلاحات مرتب کیے تھے اور یہی لوگ گورنر جنرل منٹو، ہارڈنگ اور چیمسفورڈ کو ہدایات دیتے تھے۔ اب ادھر ریڈنگ تو ہندوستان آ گیا۔ مانٹیگو، پیل، اولیور اور برکن ہیڈ انگلستان میں تھے لیکن پلڑا ہندوستان کی جانب جھکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ اب وایسرائے صاحبان کا براہ راست تعلق ہندوستانی قوم پرست سیاست دانوں سے ہو گیا تھا۔ فطری طور پر وہ ہندوستانی عوام کی انقلابی ذہنیت سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اس لیے وہ اپنے انگلستان کے افسران بالا پر زور ڈالنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ یہاں مناسب حال درروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ یہاں سے چھ ہزار میل دور رہتے تھے۔ ہندوستانی سیاست دانوں اور ہندوستانی احساسات کے زور و قوت سے وہ نہ براہ راست واقف تھے نہ ذاتی طور پر، اس لیے لازمی طور پر وہ کسی قسم کی پیش قدمی نہیں دکھا سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے فیصلہ دینے کا اپنا قانونی حق برقرار رکھا۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی اہمیت باوجود اپنی خامیوں کے یہ تھی کہ ہندوستانی سیاسی لیڈروں کو ان کے باعث یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے افسران شاہی کو مجبور کر سکیں کہ وہ جو فیصلے کرتے ہیں ان کی تشریح کریں اور بتائیں کہ وہ کیوں صحیح ہیں نیز ان کی پالیسیوں اور تدابیر پر جو مدلل تنقیدیں کی جائیں وہ انہیں سنیں اور مباحثوں اور اس پر رائے شماری میں شکستیں ان لوگوں سے کھائیں جن کی عزت ان کے دلوں میں نام کو بھی نہ تھی۔

تقریباً دس سال تک (1921ء تا 1930ء) ہندوستانی اور برطانوی ذہن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ ہندوستانی ممبران خواہ وہ آزاد خیال (لبرل) ہوں سوراجی، سب حکومت پر یکساں مقاصد کے لیے زور ڈالتے رہے یعنی حکومت کے

اخراجات میں کفایت شعاری ہو، ٹیکسوں کا بار کم کیا جائے خصوصاً زراعتی حلقوں میں، ہندوستانی صنعت کاری کا تحفظ بھی کیا جائے اور اس کو ترقی بھی دی جائے، تعلیم کو وسعت دی جائے، شہری اور فوجی ملازمتوں پر ہندوستانی رکھے جائیں، جابرانہ قوانین منسوخ کیے جائیں، سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت کے اختیارات جلد از جلد ہندوستانیوں کو دیدیے جائیں۔

یہ لوگ بعض معاملات میں کامیاب بھی ہوئے۔ مثلاً ایک محصول بورڈ (Tariff Board) قایم کیا گیا جس کا مقصد (صنعتوں) کی تحفظ کی پالیسی پر عملدرآمد کرنا تھا۔ چند ایسے اقدامات کی ابتداء ہوئی جن کے تحت ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا اضافہ ہو سکے، بعض جبری قوانین مثلاً 1910ء کا پریس ایکٹ، منسوخ کردیے گئے اور اگرچہ موڈی مین کمیٹی نے 1919ء کے ایکٹ کے عملدرآمد میں جو خامیاں تھیں ان کا جائزہ لیا تھا لیکن اس ایکٹ پر نظر ثانی کر لینے کی تاریخ نہیں بتائی گئی حالانکہ برکن ھیڈ نے یہ کہہ کر یقین دلایا تھا کہ عقلمند لوگ تاریخوں کے غلام نہیں ہوتے۔

لیکن دیگر معاملات میں قوم پرستوں کی مخالفت کے باوجود رجعت پسندانہ قدم اٹھائے گئے۔ انڈین سول سروس کے ممبروں نے ہندوستانی افسروں کی ماتحتی میں کام کرنا اپنے لیے باعث توہین سمجھا اور اس سے زیادہ بر اان کے لیے یہ ہوا کہ ان کا مستقبل غیر یقینی ہو گیا۔ عدم تعاون کی تحریک نے ان کا خوف اور بڑھا دیا۔ اس کے بعد جب جنگ (عظیم) نے اقتصادی حالت خراب کر دی تو وہ اپنی ملازمت کے شرائط سے زیادہ غیر مطمئن ہو گئے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر محسوس کیا گیا کہ صحیح قابلیت کے برطانوی نوجوان کافی تعداد میں اس سول سروس کی ملازمت حاصل کرنے کے لیے پیش قدمی نہیں کر رہے ہیں۔ اس کی خاطر ایسی صورتیں پیدا کی گئیں جن سے برطانوی یونیورسٹیوں کے طلبہ میں انڈین سول سروس کے مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھنے کا شوق

پیدا ہو۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے انڈیا کونسل کے ایک ممبر مسٹر میکڈانلڈ کی صدارت میں ایک کمیٹی پہلے ہی قایم کر دی تھی تا کہ وہ ان ملازمتوں کے متعلق شکایات کی جانچ پڑتال کرے۔ گورنر جنرل نے محکمہ امور داخلہ کے مسٹر اوڈونیل کے دستخط سے ایک گشتی چٹھی جاری کیے جانے کی اجازت دیدی تھی تا کہ اس چٹھی کے ذریعہ ملازمتوں کو ہندوستانی بنائے جانے کے متعلق صوبائی حکومتوں کی رائے معلوم ہوسکے۔

اس مرحلے پر لائڈ جارج نے جو اس زمانے میں وزیراعظم تھا ان ملازمین کی ہمت افزائی کی خاطر 14 / اگست 1922ء کو دارلعوام (ہاؤس آف کامنس) میں ایک بیان دیا جس میں انہوں نے برطانوی افسران کی پریشانی اور اس لیے ان کو مطمئن کرانے کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے بتایا کہ حالیہ اصلاحات تو ایک تجربے کے طور پر کیے گئے ہیں اور ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ اصلاحات ہندوستانی حالات کے لیے مناسب ٹھہرتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ '' ایک بات ہمیں صاف کر دینی چاہئے وہ یہ کہ برطانیہ کسی حالت میں بھی ہندوستان میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہ ہوگا...... ہم اپنی ذمہ داریاں ثابت قدمی سے پوری کرتے رہیں گے اور انہیں پورا کرنے کے سلسلے میں یا ان کو نافذ کرنے کے لیے ضروری قدم اٹھائیں گے۔'' انہوں نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا کہ '' ہم نے اس عہد کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کے لوگوں سے تعاون کی درخواست کی ہے ...... اس بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی سول ملازمین، ہندوستانی سپاہیوں، ہندوستانی ججوں اور ہندوستانی قانون ساز ممبروں سے مدد لی جائے۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ ہم کو برطانوی عہدے داروں سے مسلسل امداد ملتی رہے۔'' انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ '' میں جو بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انہیں (ہندوستانیوں کو) کسی طرح کی بھی کامیابی

حاصل ہو، خواہ پارلیمانی ممبر کی حیثیت سے خواہ منتظمین کی حیثیت سے میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی وقت بھی ان قلیل تعداد برطانوی سول ملازمین یا برطانوی افسروں کی ہدایات اور مدد کے بغیر ہندستان میں کوئی کام چلاسکیں گے ...... وہ (برطانوی افسران) سارے ڈھانچے کے لیے فولادی فریم ہیں......اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم ملازمت کے اس عہدے (سول سروس) کو برقرار رکھیں"۔

لائڈ جارج کی ان یقین دہانیوں کو عملی جامہ اس طرح پہنایا گیا کہ ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس کے صدر روائی کاؤنٹ لی تھے۔ اس کمیشن نے اپنی سفارشات میں اس ملازمت کے عہدیداروں کو یقین دہانی کرائی کہ وہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہی کے تحت رکھے جائیں گے اور ان کے شرائط ملازمت ایک معاہدے کی شکل میں مرتب کیے جائیں گے جس کی پابندی ان پر اور گورنمنٹ دونوں پر لازمی ہوگی اور ایک پبلک سروس کمیشن قایم کیا جائے گا جس کو بھرتی کرنے اور حکومت کے فیصلوں کے خلاف ملازمین کی اپیلیں سننے اور فیصلے کرنے کے اختیارات ہوں گے۔ لی کمیشن نے فراخ دلی کے ساتھ ان کی تنخواہوں، الاؤنسوں، پنشنوں، خاندانی پنشنوں، کرایہ آمد و رفت اور پراویڈنٹ فنڈ کے لیے سفارشات کیں۔

لی کمیشن کی رعایتوں نے انجام کار ہندوستانی خزانے پر کم از کم سوا کروڑ روپے سالانہ کا بارڈال دیا۔ ہندوستانی ممبروں نے لائڈ جارج کی فولادی فریم والی بات اور لی کمیشن کی فضول خرچیوں کے خلاف احتجاج کیے لیکن وہ بے اثر رہے۔

ملازمتوں میں ہندستانی عنصر زیادہ کیے جانے کے سلسلے میں لی کمیشن نے سفارش کی کہ انڈین سول سروس میں زیادہ سے زیادہ پچاس فی صدی ہندوستانی اور پچاس فی صدی انگریز ہوں گے اور یہ تناسب تقریباً پندرہ سال میں پورا ہو سکے گا۔

رجعت پسندانہ تدابیر کرنے اور اختیارات کی منتقلی نہ ہونے کے باعث ریڈنگ کا

یہ فیصلہ کن ارشاد کہ ''ہندوستان میں اب اصلی سیاسی اکھاڑہ جلسہ گاہوں اور مجمع سے بھرے میدانوں سے ہٹ کر 1919ء کے ایکٹ کی رو سے قایم کردہ مجالس قانون ساز میں منتقل ہوگیا ہے'' آنے والے واقعات سے صحیح ثابت نہ ہوسکا۔

شاہی مجلس قانون ساز سے سوراجیوں کے مستعفی ہوجانے کے باعث اس تجربے کا خاتمہ ہوگیا جس کے تحت مجلس قانون ساز کے ذریعہ ہندستان کو جلد از جلد خود مختار حکومت بنایا جانا تجویز کیا گیا تھا۔ انہوں نے شروع ہی سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ (سوراجی) مسلسل طور پر اور کسی قسم کی کمی کیے بغیر اندرونی طور پر عدم تعاون کی پالیسی برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ جیسا کہ ان کے منشور میں اعلان کیا گیا تھا کیونکہ وہ اکثریت میں نہ تھے۔ لیکن جو تدابیر ان لوگوں نے اختیار کیں وہ رائیگاں نہیں گئیں۔ سب سے زیادہ اہم نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے حکومت ہند کو یہ باور کرادیا کہ اختیارات حکومت کی منتقلی جو نوآبادیاتی حکومت کی ہو ایسا مسئلہ نہ تھا جسے ایک مقررہ مدت میں ناقابل عمل اور ناقابل حصول کہہ کر نظر انداز کردیا جائے۔ جیسا کہ ممبر داخلہ مالکم ہیلی نے مجبوراً اقرار کیا کہ درجۂ نوآبادیات کے حصول کے لیے سوال اٹھایا گیا ہے اور یہ بہت جاندار مسئلہ ہے۔ اس لیے مستقبل کے تمام اصلاحی منصوبوں میں درجہ مملکت کے حصول کو بطور مقدمہ کبریٰ پیش نظر رکھنا ہوگا۔

دوسرا قابل قدر نتیجہ یہ نکلا کہ اب حکمرانوں پر بخوبی واضح ہوگیا کہ قوم پرست لیڈران بہت بڑی پارلیمانی قابلیت رکھتے ہیں نیز انتخابات لڑانے اور پارلیمنٹ میں مخالفت کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت ہے۔ حزب اختلاف کی قوتوں کو یکجا کرکے سوراجیوں نے جو کامیابی حاصل کی اس سے 1919ء کے دستور کی بنیادی کمزوری ظاہر ہوگئی کیونکہ اس نے ایک ایسی عاملہ پیدا کردی تھی جس کو مستقل طور پر مجلس قانون ساز میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ نہ تو ممالک متحدہ امریکہ کے صدارتی نظام کا

طریقہ تھا جہاں صدر عاملہ کی حکومت کا دار و مدار براہ راست ووٹ دہندگان کی مرضی پر ہوتا ہے اور نہ یہ پارلیمانی طریقہ تھا جہاں کہ پارلیمنٹ میں اکثریت والی پارٹی کی مدد سے وزیر اعظم حکومت کرتا ہے۔ اس لیے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اس غیر منطقی ہندوستانی طرز حکومت سے رکاوٹیں ہی پیدا ہونگی اور جس کا انجام بالآخر ناکامی ہوگا۔ انگریز حکومت نے اس طریقہ کار کو جاری رکھا۔ مگر اسے بہت تھوڑی ہی مدت تک اور وہ بھی بڑی ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ برقرار رکھا جاسکا۔

وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے درمیان جو مراسلت (اس عرصے میں) ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس طریقہ ٔ کار پر عمل درآمد کس قدر مشکل تھا۔ ابتدا ہی میں جو مشکلات پیدا ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک اہم مسئلہ پر دونوں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ مسئلہ فوجی اخراجات میں کفایت شعاری اور فوجی ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا تھا یعنی فوجی ملازمتوں اور کفایت شعاری کے متعلق حکومت نے جو تجاویز بھیجی تھیں وہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری حاصل نہ کرسکیں۔ ریڈنگ نے مانٹیگو سے شکایت کی کہ اس سے صورت حال واقعی بہت زیادہ دشوار ہو جاتی ہے اور میرا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ میں چیزوں کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتا رہوں...... اب جو صورت حال ہے اس کا مجھے ہمیشہ سے اندیشہ رہا اور اس سے ڈرتا بھی رہا یعنی آپ میں (جو اپنے ملک میں ہیں) اور مجھ میں (جو ملک سے باہر ہوں) شاید اختلاف رائے کا واقعہ ہونا.......... ہمارے کونسل کے ممبروں (عاملہ) کو اسمبلی میں بحث کرنا پڑتی ہے اور اپنے معاملہ کو پیش کر کے کوشش کرنا پڑتی ہے کہ مجلس قانون ساز کے ممبران ہمارے فیصلوں کو مان لیں اور ٹیکس لگانے کی منظوری دیدیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ ممبر مالیات یا ممبر افواج کے لیے کس قدر دشوار ہے کہ وہ کھڑے ہو جائیں اور صرف اپنی حکومت (ہوم گورنمنٹ) کے فیصلوں کو یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ہم

صرف انہیں فیصلوں پر پہنچے ہیں، عمل کریں۔ کیا وہ صرف اتنا کہہ خاموش ہو جائیں کہ ان کو کچھ اور کہنے کا حق نہیں ہے جس سے کم از کم ان کا ضمیر مطمئن ہو سکے اور وہ ممبران مجلس قانون ساز کو بھی مطمئن کرا سکیں؟ میں اصلاحات کے ضمن میں کسی ایسے بیان کو بہت خطرناک سمجھتا ہوں جس سے ظاہر ہو کہ میری حکومت اور انگلستان کی حکومت متضاد رائیں رکھتی ہیں'' [1]

سوراج پارٹی والوں نے حکومت ہند پر کیا اثرات چھوڑے ان کا ذکر کرتے ہوئے ریڈنگ اپنے ایک خط میں جو اولیور کے نام فروری 1924ء کو لکھا گیا تھا، قلمبند کرتا ہے۔

''فی الحال سوراجی من مانی کر رہا ہے۔ کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے، نہ کوئی اس کا مقابل ہے اور نہ کوئی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ فتح مندی کے ساتھ اپنے راستے پر بڑھتا چلا جا رہا ہے زیادہ تر اس لیے کہ اس نے ووٹ دہندگان کے سامنے ایک ایسا پر جوش پروگرام پیش کیا ہے جو ان کے تمام مصائب اور دکھوں کا صرف مداوا ہی ثابت نہ ہو گا بلکہ ایک ظالمانہ حکومت کا تختہ بھی الٹ دے گا۔ اعتدال پسند، سوراجی کے مقابلے میں بہت ہی سست اور سپاٹ نظر آتا ہے۔ ووٹ دہندگان جب سوراجیوں کی نہایت رنگ آمیز اور شعلہ بار تقریریں سن لیتے ہیں تو اس کے بعد اعتدال پسندوں کا پروگرام انہیں بہت خشک بے لطف اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔'' [2]

---

[1] ریڈنگ پیپرس: ریڈنگ بنام مانٹیگو 16 / فروری 1922ء

[2] مارکوئس آف ریڈنگ: ص 283

اپریل 1924ء میں اس نے اپنے بیٹے کو اپنی پریشانیاں سنائیں۔ جب انہیں نمک پر ٹیکس لگانے کی تجویز جسے اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا، اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لا کر بحال کرنے کے لیے کہا گیا تھا تو اس نے یہ لکھا:

''مجھے ایسا فیصلہ کرنا پڑا جو واقعی ہندوستانیوں میں بہت نامقبول ہے اور اس کی وجہ سے مجھ پر بڑے اعتراضات ہو رہے ہیں بلکہ حملہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس ایکٹ کے باعث عجیب صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس بات کے فیصلے کی ذمہ داری یا بارکہ واقعی ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے یا نہیں کہ اختیارات خصوصی کو تمام ممبروں کے ووٹوں کے خلاف کام میں لایا جائے حکومت پر نہیں بلکہ وایسرائے پر پڑتا ہے...... دیگر مشکلات کے علاوہ میرا کام یہ رہ گیا ہے۔ کہ ایسی پارلیمنٹ پر حکومت کیسے کروں جس میں اکثریت ہمیشہ حکومت کے خلاف رہتی ہے''1

1923ء کے الیکشن میں سوراج پارٹی والوں کی کامیابی سے حکومت بظاہر بڑی الجھن میں پڑ گئی تھی۔ ریڈنگ نے اولیور کے نام ایک خط میں اس کامیابی کے اسباب کی تشریح کی ہے۔ اس کی نزدیک خاص سبب یہ تھا کہ حکومت کسی قسم کا دفاع نہ کر سکتی تھی اور ''سوراج پارٹی والے اپنی تنظیم کی باقاعدگی، فنڈ کی فراوانی اور مؤثر پروپیگنڈہ کی وجہ سے اپنے حریفوں سے بازی لے گئے۔''2

ستمبر 1925ء میں اسمبلی کے دوسرے اجلاس کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے ریڈنگ نے برکن ہیڈ کو بتایا تھا کہ ایک طرف سوراجیوں اور دوسری طرف قوم پرستوں و آزاد ممبروں کے درمیان سرد مہری بڑھ گئی ہے۔ اگر وہ لوگ متحدہ محاذ قائم رکھتے تو یقیناً اس کے لیے شاہی کمیشن کے جلد تر تقرر کے مطالبے کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔

---

1. مارکوئس ریڈنگ: ص294

2. ریڈنگ پیپرس: ریڈنگ بنام اولیور، 7 فروری 1924ء

12-آئین پر نظر ثانی کا مطالبہ

ہندوستان سے تعلقات کے سلسلے میں برطانیہ کے ضمیر کو جس چیز نے سب سے زیادہ جھنجھوڑا وہ تھی جنگ۔ امریکہ کی آزادی کی جنگ سے لے کر دوسری عالمی جنگ تک تقریباً ہر لڑائی ''مستقبل کا دروازہ پر اسرار طریقے'' پر کھولتی رہی اور برطانیہ جھٹکے کھا کر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے فرائض کو پہچانے اور ہندوستان سے جس قسم کے تعلقات اس نے اپنے کارندوں کی معرفت قایم کیے تھے ان کا جائزہ لے۔ دوسری چیز جس نے ان کی فراخ دلی کے جذبات کو اُبھارا وہ ہندوستانیوں کی بے چینی تھی جو کہیں ابتدائی حالت میں تھی کہیں ظاہر تھی۔ کہیں تحمل کے ساتھ تھی کہیں جارحانہ شکل میں۔ مثال کے طور پر 1857ء کا انقلاب جس کے باعث 1861ء کا ایکٹ بنایا گیا تھا یا وہ اندرونی اضطراب جس نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی اور جس نے اپنے مطالبات ایسی ضد کے ساتھ پیش کیے تھے کہ بالآخر 1892ء کا بہت محتاط ایکٹ بنایا گیا تھا۔ پھر تقسیم بنگال کے موقع پر 1905ء میں جو شرر افشانیاں ہوئیں انہیں منٹو اور مارلے نے 1909ء کے ایکٹ سے بجھانا چاہا اور پھر آخر میں 1914ء میں لکھنؤ معاہدہ ہو جانے کے بعد برطانوی حکومت کو بہت زوردار اور پر جوش قومی تحریک کا سامنا کرنا پڑا اور جس کا نتیجہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات 1919ء کی صورت میں ظاہر ہوا۔

بدقسمتی سے فراخ دلی کا وہ جذبہ جو جنگ کی بدولت پیدا ہوا تھا زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا اور مطالبات کے جوابات بہت تاخیر سے اور بہت تشنہ ملنے لگے۔ یہی صورت حال 1919ء کے اصلاحات کے معاملہ میں درپیش ہوئی۔ ان اصلاحات کے خلاف تمام ہندوستانی سیاسی پارٹیوں آزاد خیال، قوم پرست اور مسلم لیگ نے سخت بیزاری کا اظہار کیا اور انہیں ناقص، مایوس کن اور غیر اطمینان بخش قرار دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان اصلاحات کی جنم کنڈلی کی مالک کوئی بداندیش کنیا تھی کیونکہ

ساتھ ہی تکلیف دہ واقعات بھی ظہور میں آئے مثلاً رولٹ ایکٹ جس سے تمام سیاسی کارگذاریوں کے کچل دیے جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، یا ہندوستانی رائے عامہ کی تحقیر کے باعث پنجاب کا زبردست ہنگامہ ہوا جس نے برطانوی لوگوں میں پورے صوبے کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکا دی اور پھر ترکوں کی ہزیمت اور وہاں خلافت کا خاتمہ جس سے ہندوستانی مسلمانوں میں سخت انتشار پیدا ہو گیا۔ اس طرح جنگ کے زمانے میں برطانیہ کے عہد و پیان سے (دلوں میں) امیدوں کا جو نرم و نازک پودا اُگ چلا تھا اس پر جلتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دیے گئے۔

1921ء میں جب مجلس قانون ساز کا پہلا اجلاس چیمسفورڈ ایکٹ کے تحت منعقد ہوا تو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ با اثر سیاسی پارٹی یعنی کانگریس غیر حاضر تھی جس کی وجہ سے کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمایندگی خاصی کم ہوگئی۔ آزاد خیال پارٹی کے لوگ اس ایکٹ کی مخالفت میں کانگریس کے ہم نوا تھے۔ لیکن انہوں نے الیکشن لڑنے کے حق میں فیصلہ کیا اور اس پارٹی کے کئی سرکردہ ممبروں نے مجلس قانون ساز میں نشستیں حاصل کرلیں جیسی کہ ان سے امید تھی اور جیسا کہ انہوں نے اپنے انتخابی حلقوں سے عہد و پیان کیا تھا انہوں نے مجلس قانون ساز کے ممبروں نیز وزرا کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی ہمت اور قابلیت کے ساتھ ادا کیے۔

اس طرح 1921 میں صورت حال یہ تھی کہ اعتدال پسند ممبران مجالس قانون ساز میں حکومت پر زور ڈالتے تھے کہ وہ سوراج کی طرف قدم بڑھائے۔ کانگریس، مجالس قانون ساز کے باہر ایسی فضا پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھی جس سے حکومت اختیارات دینے پر مجبور ہو جائے اور طاقت کا استعمال نہ کر سکے۔ اس کے اس قسم کی عمل سے اعتدال پسندوں کے تقاضوں کو تقویت اور تائید ملتی تھی اور حکومت ہند کو راغب کرتی تھی کہ وہ انگلستان کی حکومت (ہوم گورنمنٹ) کی توجہ مناسب کارروائی

کرنے کی طرف مبذول کرائے۔

1921ء سے لے کر 1930ء میں گول میز کانفرنس کے انعقاد تک یہ دوہرا حملہ صرف اس فرق کے ساتھ برابر جاری رہا کہ 1923ء میں سوراجیوں نے اعتدال پسندوں کی جگہیں مجالس قانون ساز میں لے لی تھیں۔

- اس دوہری کارروائی کی پیش رفت پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

دسمبر 1919ء میں گاندھی جی اصلاحات پر عملدرآمد کرنے پر مائل تھے۔ مارچ 1920ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ انہوں نے آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت قبول کر لی ہے۔ تلک بھی اس لیگ کی تائید میں تھے اگرچہ اینی بیسنٹ اسے چھوڑ چکی تھیں۔ تلک کا رویہ اصلاحات کے متعلق کیا تھا اسے انہوں نے اپریل 1920ء میں شایع کردہ منشور میں بیان کر دیا تھا۔ وہ یہ تھا:

"تلک کی قایم کردہ پارٹی (کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی) مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات ایکٹ پر جیسا بھی کچھ ہو، عمل درآمد کرنا چاہتی ہے تاکہ مکمل خودمختار حکومت جلد تر مل سکے اور اسی مقصد کی خاطر وہ بلا کسی تذبذب کے اس کے ساتھ تعاون کرے گی یا پھر حزب مخالف کے طور پر کام کرے گی۔ ان دونوں میں سے جو بھی مناسب طریقہ کار ہوگا یا رائے عامہ کا جس بہتر طریقے سے اظہار کیا جا سکے گا۔"[1]

لیکن جولائی 1920ء سے کانگریس نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی جس کے خاص مقاصد تین تھے — پنجاب میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ ترکی خلافت کی تحریک کی تجدید اور حصول سوراج۔ سوراج کے متعلق کانگریس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حکومت کا اصلی اقتدار فوراً منتقل کیا جانا ضروری تھا اور مرحلہ وار اختیارات دینے کا خیال منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی لوگوں کو ہی

1۔ ہسٹری آف کانگریس از پٹابی سیتارمیا۔ جلد اول ص 328

جو اختیارات کی ذمہ داری لیں گے اس بات کا حق ہوگا کہ وہ سوراج کا طریقہ طے کریں نہ کہ برطانوی پارلیمنٹ۔ مجلس قانون ساز میں جو اعتدال پسند گروپ تھا کانگریس سے ان دونوں معاملوں میں متفق تھا لیکن سخت کلامی اور تند لہجہ اختیار کرنے کے وہ خلاف تھے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ حکومت برطانیہ سے تعلقات برقرار رکھنے چاہئیں اسی طرح کے جیسے دوسری نوآبادیوں کے ہیں۔

شملہ میں جب اسمبلی کا اجلاس ہوا تو 24 ستمبر 1921ء کو ایک تجویز پیش کی گئی۔ اور جسے حکومت نے منظور کرلیا وہ یہ تھی کہ گورنر جنرل ان کونسل، سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ان کونسل سے تحریک کریں کہ وہ صوبوں کو مکمل خود مختار اختیارات تفویض کیے جانے کے لیے ضروری اقدامات کریں سوائے دفاع اور امور خارجہ کے اور سیاسی شعبہ کے تمام کام مرکزی مجلس قانون ساز کے سپرد کردیں۔

وائسرائے کے زور دینے پر مانٹیگو نے اس معاملہ کو 13 فروری 1922 کو کابینہ کے سامنے رکھا اور اس پر مباحثہ ہوا۔ وزیراعظم لائیڈ جارج اور سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مانٹیگو دونوں نے 1919ء کے ایکٹ پر نظر ثانی یا اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے انکار کردیا۔ دوسرے دن دار العوام میں انہوں نے اپنی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی۔ مانٹیگو نے کہا کہ ہندوستان کو خود مختاری کی پہلی قسط پیش کردی گئی ہے۔ جب پارلیمنٹ اس پر عملدر آمد سے مطمئن ہو جائے تبھی وہ اس سلسلے میں مزید قدم اٹھا سکتی ہے۔ اس کے بعد ترک موالات کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”لیکن ہماری سلطنت کے وجود کو چیلنج کیا گیا یا ہندوستان میں ہماری حکومتی ذمہ داریوں سے اگر ہمیں روکا گیا یا مطالبات اس غلط فہمی میں پیش کیے جانے لگے کہ ہم تو ہندوستان چھوڑ دینے کی سوچ رہے ہیں تو ہندوستان ایسا چیلنج ان لوگوں کو دے کر کبھی کامیاب نہ ہوسکے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ ثابت قدم قسم کے لوگ ہیں اور

وہ ایک مرتبہ پھر اپنی تمام قوت اور ممکنہ ثابت قدمی کے ساتھ اس چیلنج کا جواب دیں گے جیسا کہ وہ ابھی کچھ عرصہ ہوا دے چکے ہیں۔"[1] لائیڈ جارج نے اس پر مزید اضافہ یہ کیا کہ" ہم کسی صورت یا کسی حالت میں بھی ہندوستان سے دست کش نہیں ہو سکتے نہ بادشاہ سلامت کی شہنشاہیت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"[2]

تقریباً ایک ماہ بعد مانٹیگو نے استعفیٰ دے دیا، دراصل وہ برطرف کر دیے گئے تھے، اور پیل نے ان کی جگہ سنبھالی۔ 10/مارچ 1922ء کو گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور آٹھ دن کے بعد ان کو چھ سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدم تعاون کی تحریک مفلوج ہو گئی اور خلافت تحریک بھی مردہ ہو کر رہ گئی۔ جب یہ چیلنج ناکام ہو گئے تو حکومت نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ 4/اگست 1922ء کو لائیڈ جارج نے دارالعوام میں اپنی مشہور تقریر کی جس کا مقصد ہندوستان میں افسر شاہی اور برطانیہ کے عام لوگوں میں متزلزل اعتماد کو بحال کرنا تھا۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں کہا کہ لبرل نیز دوسری حکومتوں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ" برطانیہ کسی حال میں بھی ہندوستان میں اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہ ہوگا .... ہم وہ تمام اقدامات کریں گے جو ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے یا انہیں نافذ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔"[3]

انہوں نے اپنے موقف کو ان الفاظ میں حق بجانب قرار دیا:" ہندوستان میں مختلف نسلوں اور مسلکوں کی بڑی بہتات ہے، غالباً سارے یورپ سے کہیں زیادہ۔ وہاں لاتعداد تقسیم کرنے والی طاقتیں ہیں اگر برطانیہ اپنا طاقتور پنجہ وہاں سے اٹھا لے تو پھر سوائے تقسیم، لڑائی جھگڑے اور نزاج کے وہاں اور کچھ نہ ہوگا"[4]

---

1. ای ایس مانٹیگو دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) کے مباحثے۔ پانچواں سلسلہ۔ جلد 150، کالم 904، 14/فروری 1922ء ڈی لائیڈ جارج۔ 2. ایضاً ص 620

3. ایضاً جلد 15، کالم 10-9،2/اگست 1922ء 4. ایضاً ص 1510

اس تقریر سے ہندوستان میں ہنگامہ برپا ہوگیا اور یہ کہا گیا کہ وزیراعظم نے اپنی اس پالیسی کے خلاف باتیں کہی ہیں جس کا اعلان 20/اگست 1917ء کو اور 1919ء کے ایکٹ کے مقدمے میں کیا گیا تھا اور اس طرح برطانوی وعدوں کے خلاف عدم اعتمادی کا کافی جواز پیدا ہوگیا ہے۔

ریڈنگ سکریٹری آف اسٹیٹ کو یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ" آپ نے سول سروس کے ملازمین اور ان کے مستقبل کے تحفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو جملے استعمال کیے ہیں اگر ان کے لغوی معنی لیے جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کو ان اعلانات سے مطابق کرنا مشکل ہوگا جو ابھی حال میں کیے گئے ہیں...... اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ واقعی آپ کی تقریر میں بعض جملے اور بیانات ایسے ضرور ہیں جن پر اسی قسم کی حرف گیری کی جاسکتی ہے جیسی کہ آج کل کی جارہی ہے"[1]

یہاں ایک دلچسپ بات قابل فکر یہ ہے کہ لائیڈ جارج اور مانٹیگو تو اپنے آزادخیالی کے اصولوں کے باوجود ہندوستان کو مزید ترقیاں دینے کی مخالفت کررہے تھے لیکن صوبہ مدراس کا گورنر ولنگڈن وایسرائے کو برابر لکھ رہا تھا کہ اس کے صوبے کو مکمل صوبائی خود مختاری دے دی جائے۔ ریڈنگ نے پیل کو لکھا کہ ابھی اس قسم کا اقدام بے موقع ہے اگرچہ" جب سے میں یہاں آیا ہوں مصلحین قوم برابر یہی آواز اٹھاتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میرے یہاں آنے کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی سب معاملات میں یہی بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکی کہ نئی مجلس قانون ساز کے پہلے اجلاس کے تقریباً ابتدا ہی میں اس قدر زیادہ وسیع اختیارات دیے جانے کی مانگ کی جانے لگی۔"[2]

پیل نے اپنے مراسلہ مورخہ 29/اگست 1922ء میں حکومت ہند کو مخاطب

---

1. ریڈنگ پیپرس: ریڈنگ سے پیل تک 31 اگست۔

2. ایضاً: ریڈنگ بنام پیل 13/جولائی 1922ء

کرتے ہوئے اس تجویز کا جواب دیا جو کہ مجلس قانون ساز نے کوئی ایک سال قبل 22 ر
ستمبر 1921ء منظور کیا تھا۔ اس نے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ ممبران اسمبلی نے صرف چھ
ماہ کے تجربے کی بنا پر 1919ء کے اصلاحات میں اس قدر زیادہ توسیع کا مطالبہ کیوں کر
دیا۔ اس نے تین وجوہ پیش کیے جن کی بنا پر وہ اس مطالبے پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں
تھا اور پارلیمنٹ میں تو اسے پیش کرنے کے قابل ہی نہ سمجھتا تھا۔

13-لیبر پارٹی اور اصلاحات

جنوری 1924ء میں لیبر پارٹی نے (انگلستان میں) حکومت کی باگ ڈور
سنبھالی لیکن چونکہ دارالعوام (پارلیمنٹ) میں اسے اکثریت حاصل نہ تھی اس کو
حکومت چلانے کے لیے لبرل پارٹی کا سہارا لینا پڑا۔ ریزے میکڈ انلڈ وزیراعظم ہو گیا
اور لارڈ اولیور ہندوستان کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ۔ ہندوستان کے سیاسی
حلقوں میں لیبر حکومت کے قایم ہو جانے پر خوشیاں منائی گئیں۔ بڑی بڑی امیدیں
بندھ گئیں اس لیے کہ لیبر پارٹی ہندوستان کو خودمختاری دینے کا گویا وعدہ ہی کر چکی تھی۔

(ہوا یوں کہ جب 1918ء میں انگلستان میں عام انتخابات ہوئے تھے تو لیبر
پارٹی نے اپنی پالیسی کا اظہار "لیبر اور نیا سماجی نظم و نسق" (Labour and New
Social Order) میں یوں کیا تھا: آئرلینڈ اور ہندوستان میں آزادی کے مطالبے
کو پارٹی ان کا جائز جمہوری حق تسلیم کرتی ہے اور آزاد قوموں کی برطانوی دولت
مشترکہ (British Common Wealth of Free Nations) میں
رہتے ہوئے تمام محکوم رعایا کو خودمختار حکومت بنانے کے حق کو صحیح سمجھتی ہے۔"

پارٹی کے سالانہ اجلاس میں حکومت خوداختیاری کا اصول دہرایا گیا۔ 1920ء
میں ایک تجویز پیش کی گئی اور جسے مجلس کے تمام ممبران نے کھڑے ہو کر منظور کیا تھا۔

تجویز یہ تھی کہ حق خود اختیاری کے اصول کو ہندوستان میں خاص طور سے برتا جائے۔1920ء میں لیبر کانفرنس نے اپنی پارٹی کے ان ممبران پر جو پارلیمنٹ میں تھے زور دیا کہ اگر کوئی قانون" باشندگان ہند کے لیے اسی قسم کی خود مختار حکومت بنانے کے سلسلے میں بنایا جائے جیسا کہ کناڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں رائج ہے تو اس کی ضرور حمایت کی جائے"1923ء میں عام انتخابات کے موقع پر پارٹی کے پروگرام میں" مصر کی مکمل آزادی کو تسلیم کیا جانا اور ہندوستان کو خود مختار بنا دینا" شامل تھا۔

انفرادی طور پر لیبر پارٹی کے کئی ممبروں مثلاً لانسبری، براک وے، بین اسپور، وتیج ووڈ نے ہندوستان کے مطالبہ 'حکومت خود اختیاری کی پارلیمنٹ کے اندر اور باہر دونوں جگہ حمایت کی تھی۔27/جون1923ء کو ایک میٹنگ میں جو کوئنس ہال لندن میں ہوئی تھی صدارت کرتے ہوئے ریمزے میکڈانلڈ نے کہا تھا:

"میرے خیال میں ہم میں سے بہت لوگ جو کہ آزاد خیال ہیں شہنشاہی وحدت کی خاطر اس بات کو لازمی قرار دیں گے کہ ہماری سلطنت میں جو بڑے قوموں کے عناصر ہیں ان کو نوآبادیات کا درجہ دے دیا جائے۔" اس نے یہ بھی اضافہ کیا کہ" ہم ہندوستانیوں سے کہیں گے کہ تمہارا ملک تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری حکومت تمہاری اپنی ہے۔ اور اس کا جواز ہم اس میں نہ تلاش کریں گے تم مسلسل ہمارے محکوم رہے بلکہ اس بات میں کہ تم میں خود ہی اپنے ملک پر حکمرانی کرنے اور خود مختار حکومت قایم کرنے کی صلاحیت ہے۔" جو لوگ ذرا پس وپیش میں تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے صاف صاف کہا کہ" میں جانتا ہوں کہ ہم میں سے بعض لوگ پورے یقین کے ساتھ اپنی رائے قائم نہیں کر سکے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت زیادہ مراعات دیدی ہیں۔ بعض لوگ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو وعدہ کیا تھا وہ غلط تھا، ٹھیک ہے۔ اگر

یہ غلط تھا تو آپ اس سے مکر سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ اگر ہم اپنے وعدے سے مکر گئے تو ہم اپنی نیک نامی پر بٹہ لگا لیں گے۔"[1]

لیکن حصول وزارت کے بعد لہجہ بدل گیا۔ برطانوی سیاست کا مسلمہ نقطۂ نظر کہ ہندوستان کا معاملہ کسی ایک پارٹی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ قومی پالیسی کا ایک جزو ہے، لیبر حکومت کی رہنمائی کرنے لگا جیسا کہ ریڈنگ نے 31 جنوری 1924ء کو اسمبلی میں خود کہا کہ "یہ برطانوی قوم کی پالیسی ہے کسی پارٹی کی پالیسی نہیں۔" لیبر پارٹی کے ترجمان پارلیمنٹ میں پرانی گھسی پٹی دلیلیں پھر پیش کرنے لگے۔ کانگریس کے اس دعوے کو نہیں مانا گیا کہ اس کے مطالبے میں پوری ہندوستانی قوم کی مرضی شامل ہے۔ کانگریس کو ایک ہندو تنظیم قرار دیا گیا۔ حکومت ہند کے سرکاری اخبار "انڈیا" کے سالانہ شمارے میں اس کے ایڈیٹر کوٹ مین نے لکھا:

"کانگریس پارٹی دراصل تمام تر ایک ہندو پارٹی ہے۔ یہ اپنی ابتدا ہی سے، جو پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی کے وسط میں ہوئی تھی۔ سوائے ہندو اکثریت کی پارٹی کے اور کچھ نہیں رہی ہے...... ہندوستان کے باہر عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانگریس ایک جمہوری پارٹی ہے۔ دراصل بات اس حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ کانگریس پارٹی زیادہ تر بارسوخ و مفاد پرست لوگوں کی پارٹی ہے۔ کانگریس پارٹی کی تحریک کی کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانوی راج کو ہٹا کر چند مذہب پرستوں اور دولت مندوں کا راج قایم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کانگریس پارٹی نے فاشزم کے کچھ طریقوں کو اختیار کر لیا ہے اور کچھ اختیار کر لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔"[2]

1۔ انڈین کوارٹرلی رجسٹر جنوری، مارچ 1924ء جلد اول، ص 69-268، ریمزے میکڈانلڈ کی تقریر کونسل ہال میں

2۔ انڈیا 32-1926، ص 87-86 جے کوٹ مین: ایئرس آف ڈیسٹنی (Years of Destiny)

بقول اَرون، گاندھی جی صرف ہندو بھارت کی نمایندگی کرتے تھے۔ 1932ء میں ٹورنٹو یونیورسٹی میں میسے سے لیکچر کے سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ "ہندو بھارت کے لیے اگر کوئی شخصیت ہمہ جہت کہی جا سکتی ہے تو وہ مسٹر گاندھی کی ہے۔ وہ صوفیت اور سیاست کا امتزاج ہیں اور وہ اپنی قوم کے لیے حکومت خود اختیاری کے حصول میں مدتوں جدوجہد کرنے کی ایک علامت بن گئے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی ان گہری ذہنی قوتوں کو متاثر کر لیتے ہیں جن کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔"[1]

اولیور نے دارالامرا میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی حیثیت سے اپنے پہلے بیان میں اسی قسم کے دلائل دوہرائے۔ ان کے نزدیک حکومت خود اختیاری (ہوم رول) کے حصول کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی تھی جب تک پارلیمانی طرز حکومت عوام الناس کے مشترکہ مفادات سے ایسا ربط نہ رکھتا ہو جو بنیادی انتخابی حلقوں سے لے کر اوپر تک برقرار ہے[2] اور ان کو "کوئی علامت اس ربط کی دیکھنے میں نہیں آئی، بلکہ اس کے برخلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور دشمنی بڑھ رہی ہے اور ہندوؤں کا ووٹ دینے والا ایک چھوٹا طبقہ اپنی پوزیشن اور بالادستی اچھوتوں پر بنائے ہوئے ہے۔"

انہیں دلائل کو پیش کرتے ہوئے کانگریس کا مطالبہ 'حکومت خود اختیاری نامنظور کر دیا گیا کہ کانگریس نہ تو عوام کی نمائندگی کرتی ہے نہ اچھوتوں کی نہ مسلمانوں کی۔ اور یہ سب مل کر ہندوستان میں بڑی اکثریت رکھتے ہیں۔ دیگر لوگوں کے مفادات بھی پیش نظر تھے۔ مثلاً ہندوستانی ریاستوں، زمینداروں وغیرہ کے جو کانگریس کے وفادار نہ تھے۔

1۔ انڈین پرابلمس، لارڈ اَرون کی تقریریں ص 364

2۔ ایچ ایل مباحثے پانچواں سلسلہ۔ جلد 56 کالم 334-26 فروری 1924 کو دارالامرا میں لیبر حکومت کی ہندوستانی پالیسی پر لارڈ اولیور کا بیان۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے کی ایک بہت ہی مختصر لیکن شور برپا کرنے والی جماعت اپنے آپ کو تمام ہندوستان کی طرف سے بولنے کی حقدار فرض کیے ہوئے ہے۔

اس تمہیدی مفروضے سے کہ حکومت خود اختیاری دینے کے سوال پر انڈین نیشنل کانگریس کسی شمار میں نہیں ہے منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس مسئلہ پر اگر کوئی جماعت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے تو وہ صرف برطانوی پارلیمنٹ ہے۔ اور یہ فیصلہ 1919ء کے ایکٹ میں واضح طور پر خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔

اسی زمانے میں جب کہ لیبر پارٹی انگلستان میں برسر اقتدار آ گئی تھی، ہندوستان میں انتخابات کے موقع پر خوش قسمتی نے سوراج پارٹی والوں کا ساتھ دیا یعنی مجلس قانون ساز میں تنہا یہی پارٹی سب سے زیادہ مضبوط بن کر سامنے آئی۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سے صوبوں میں اور بنگال نیز ممالک متوسط میں بھی اسی کی اکثریت رہی۔

نتیجہ ان تمام باتوں کا انگلستان اور ہندوستان میں یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان بحث چھڑ گئی جو اگرچہ بڑے فاصلے سے ہو رہی تھی اور تیسری پارٹیوں کے توسط سے یعنی ادھر انگلستان میں پارلیمنٹ میں اور ادھر ہندوستان میں قانون ساز اسمبلی میں۔ حکومت برطانیہ نے اصلاحات کے نفاذ میں کانگریس سے اتحاد و اتفاق کا مطالبہ کیا اور پارلیمنٹ کے اس اختیار تمیزی کے مانے جانے پر اصرار کیا کہ وہی اختیاری حکومت دینے کی نوعیت، رفتار اور مراحل پر فیصلہ دینے کی مجاز ہے۔

ہندوستانی قوم پرست یہ بحث کرتے تھے کہ ایک مصنوعی سیاسی طریق کو بروئے کار لانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تو بس یہی کیا جا سکتا تھا کہ اس کے ناکارہ پن کو سامنے لے آیا جائے۔ چنانچہ سوراج پارٹی والے اسی لیے کونسلوں میں گئے کہ پوری طرح دکھا دیں کہ 1919ء کا ایکٹ کس قدر ناقابل عمل ہے اور اس میں صوبوں کو جو

اختیارات دینے کی بات رکھی گئی ہے وہ محض فریب اور دھوکا ہے۔

قوم پرستوں کے نزدیک یہ خیال کہ صرف پارلیمنٹ کو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے ایک جابرانہ خیال تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ سیاست دانوں کی ایک مختلف جماعت جسے خواہ اپنے ہندوستان میں فرستادہ ایجنٹوں یا تحقیقاتی کمیشنوں کی مدد کیوں نہ حاصل ہو، کس طرح ناجائز طور پر یہ ذمہ داری لے سکتی ہے کہ وہ ان ہندوستانیوں کے لیے جن کے عزائم، طرز معاشرت، طرز تفکر، رسوم ورواج، اعتقادات مذہبی وغیرہ سے وہ بالکل ناواقف ہو، ان کے لیے ایسے بنیادی قوانین وضع کرے جن کے تحت ان کو آیندہ زندہ رہنا اور کام کرنا ہے۔

مجلس قانون ساز کے پہلے ہی اجلاس میں یہ واضح ہوگیا کہ بحثیں اور تقریریں فضول ہیں اور اکثریت کے ووٹ یا ان کی رائیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ یہ جمہوری طریق کار کی سراسر نفی تھی۔ یہ صورت حال بعد کے اجلاسوں میں بار بار برسوں پیش آتی رہی۔ ایک غیر ذمہ دار انتظامیہ اور ایک جانب داری کے ساتھ منتخب کی ہوئی مجلس قانون ساز سے اس سے زیادہ کیا امید کی جاسکتی تھی۔

5 رجنوری 1924ء کو رنگا آچاریہ نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نظر ثانی کی جائے جس میں موتی لال نہرو نے ترمیم کرکے اس طرح بنادیا:

''یہ اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نظر ثانی کرنے کے اقدامات کرے تاکہ ہندوستان میں مکمل طور پر ذمہ دار حکومت قایم ہوجائے۔''

جن اقدامات کی سفارش کی گئی وہ یہ تھے: ایک نمایندہ گول میز کانفرنس بلائی جائے تاکہ وہ ہندوستان کے لیے ایک دستور کا خاکہ تیار کرے اور پھر اس خاکے کو نئی

منتخب شدہ ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں پیش کیا جائے اور پھر اسے برطانوی پارلیمنٹ میں قانون سازی کے لیے پیش کر دیا جائے۔

حکومت ہند نے ہوم ممبر (وزیر داخلہ) مالکم ہیلی کے ذریعہ اسمبلی کو مطلع کیا کہ دستور میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے تاوقتیکہ 'دفاع، ہندوستانی ریاستوں، ہندو مسلم اختلافات اور سماجی نابرابری کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ اس کے آخری فقرے یہ تھے کہ " برطانیہ کی کوئی حکومت وہ کسی قسم کی بنی ہو، برطانوی پارلیمنٹ سے فوری ذمہ داری سونپ دینے کی کوئی سفارش نہ کرے گی اور نہ برطانوی پارلیمنٹ کسی ایسی تجویز کو منظور کرے گی۔"[1]

اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت اس وقت جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک محکمہ وار تحقیقاتی کمیشن کے ذریعے حکومت کی موجودہ اسکیم سے متعلق شکایات کی جانچ کرائے اور ان دشواریوں اور خامیوں کو معلوم کرے جو اس کے عملدرآمد میں پیش آتی ہیں۔ اس ترمیم پر بحث 13 رفروری کو ختم ہوئی اور تحریک پر رائے شماری کی گئی۔ مجلس تقسیم ہو گئی۔ ترمیم 48 ووٹوں کے مقابلے میں 76 ووٹ سے منظور ہو گئی۔

قوم پرستوں میں سوراجی، آزاد اور دوسرے ہم خیال ممبران شامل تھے جنہوں نے موتی لال نہرو کی ترمیم کے حق میں ووٹ دیے تھے۔ فطری طور پر وہ اس بات سے بہت ناراض ہوئے کہ گورنمنٹ نے اسمبلی کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنا انتقام اس وقت لیا جب مالیات کا بل اور بجٹ رائے شماری کے لیے پیش ہوا۔ ہر مانگ یا مطالبہ نامنظور کیا جاتا رہا اور مالیاتی بل پر غور کرنے سے انکار کر دیا گیا اور جب بل کو چند ترمیمات کے بعد وایسرائے کی سفارشات کے ساتھ دوبارہ اسمبلی میں

1۔ ہندوستانی سہ ماہی رجسٹر، جنوری مارچ 1924، جلد اول نمبر اول، ص 133 سر مالکم ہیلی۔ مجلس قانون ساز میں خود مختار حکومت کے مطالبے پر مباحثہ مورخہ 8 رفروری 1924ء

لایا گیا تو اسے پیش کرنے کی تحریک کو پھر نامنظور کر دیا گیا۔

لیکن حکومت نے اس رائے شماری کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور مالیات بل کے تمام مطالبات اور تجاویز کو منظور قرار دیا۔ اسمبلی کے رویے کو حکومت کس نفرت اور حقارت سے دیکھتی تھی اس کا اندازہ ریڈنگ کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے جناح کے مقصد کے متعلق اس وقت قایم کی تھی جب کہ جناح نے سوراج پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔ مارچ 1924ء کو اس نے اپنے بیٹے کو لکھا:

"بظاہر جناح یہ سمجھتے تھے کہ سوراجیوں اور ان کے آزاد ممبروں کے اتحاد کے شرایط کے بموجب وہ گویا موٹر کار میں ڈرائیور کی حیثیت سے بیٹھ کر موٹر کو چلائیں گے اور موتی لال نہرو اگرچہ ان کے پہلو میں بیٹھے ہوں گے لیکن سوائے مشورہ دینے کے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔"[1]

اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جناح کی طرف سے اس طرح کے اشارے (لوگوں کی معرفت) ملے کہ انہیں اپنے قدم پیچھے ہٹانے اور اپنے وعدوں سے روگردانی کرنے پر مایل کیا جا سکتا ہے لیکن ریڈنگ نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

بہر حال، قوم پرستوں کی حکومت پر کامیابی خالی اور بے مصرف تھی۔ البتہ ان کے رنجیدہ دلوں کو اس بات سے کچھ سکون ضرور حاصل ہوا کہ قومی مطالبے کا پوری طرح اظہار ہو گیا اور اصلاحات کے تصنع کا پول کھل گیا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ عاملہ کے غیر ذمہ دارانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور مجلس قانون ساز بے بس رہے گی۔

لیکن حکومت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے منفی طریق کار پر سختی سے اڑی رہے۔ وایسرائے نے ضروری سمجھا کہ صوبوں کے گورنروں سے صلاح و مشورہ کیا جائے۔

1۔ مارکوئس آف ریڈنگ، حوالہ گذشتہ، ص 290

چنانچہ اس نے اصلاحات کے سوال پر ان کی رائیں معلوم کرنے کے لیے ایک گشتی خط سب کو بھیجا اور آخر کار موڈی مین کمیٹی بنادی کہ اصلاحات کے عملدر آمد کے معاملے پر غور کرے۔

اسی دوران انڈین نیشنل کنونشن کی جانب سے ہندوستانیوں کے وفد جن میں ایسے سرکردہ افراد مثلاً سری نواس شاستری، اینی بیسنٹ اور ممتاز سیاست داں مثلاً رنگا چاریہ اور علی امام شامل تھے انگلستان گئے اور وہاں سکریٹری آف اسٹیٹ سے ملاقات کی۔ پارلیمنٹ کے ممبروں سے بات چیت کی اور کئی جلسے کیے جن میں ہندوستان کے مطالبہ سوراج کی وضاحت کی گئی۔ لیبر پارٹی کے کچھ ممبروں نے ہندوستان کے معاملے کو پارلیمنٹ میں توضیحات اور تجاویز کی صورت میں زور دے کر پیش کیا۔

ممبروں کے سوالات اور حکومت برطانیہ کی جانب سے انڈر سکریٹری کے جوابات سے دلچسپی لیتے ہوئے 15 / اپریل 1924ء کو دارالعوام میں قدامت پسند پارٹی (کنزرویٹو) کے ایک ممبر نے ایسی بحث اٹھائی جس سے مسئلہ ہندوستان کے متعلق برطانیہ کی پارٹیوں کی پوزیشن بالکل واضح ہوگئی۔ تمام پارٹیاں اس بات پر متفق تھیں کہ ابھی کوئی فوری سیاسی پیش رفت اس معاملہ میں محال ہے۔ پارٹیوں کے درمیان اختلافات کم و بیش لفظی تھے اور کوئی خاص معنی نہ رکھتے تھے۔ وہ انتظامی پالیسیوں اور تدابیر کی بات کرتے تھے جن کا سیاسی اصلاحات کے بنیادی سوال سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ قدامت پسند پارٹی والے تو اپنی تقریروں میں انگارے برساتے تھے اور بے رحمی اور جبر کرنے کی پالیسی کی حمایت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس برطانوی سلطنت کے دشمنوں کی ایک جماعت تھی ۔ سوراجی حکومت ہند کے خلاف دنگا مچانے والے حریف تھے اور

گاندھی بانی تھے۔ لبرل پارٹی والے دوعملی حکومت کی ناکامی پر افسوس ظاہر کرتے تھے اور اس کے اسباب کی تحقیق چاہتے تھے۔ لیبر گورنمنٹ کا ترجمان خوش اخلاق اور شائستہ تھا لیکن 1919ء کے ایکٹ کی نظر ثانی کرانے کے معاملے کے خلاف اٹل تھا۔

لیبر پارٹی کی حکومت کے زمانے میں اصلاحات پر بحث آخری بار 31 رجولائی 1924ء کو دارالامرا میں ہوئی۔ وہاں اس بات پر بڑی منطق بگھاری گئی کہ آیا 1919ء کا ایکٹ کامیاب رہا یا ناکام۔ قدامت پسند ممبران کرزن کی سرکردگی میں گلے پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ مرکزی حکومت، صوبہ جات متحدہ اور بنگال میں انتشار اس بات کے ثبوت ہیں کہ اصلاحات ناکام رہی ہیں۔ اولیور اور چیمسفورڈ نے لیبر پارٹی کی طرف سے یہ بحث کی کہ دوعملی پالیسی نے رکاوٹ ڈالنے والوں کے باوجود گورنمنٹ کے کاموں کو معطل کر کے نہیں رکھا۔

لیکن لیبر پارٹی کے رہنماؤں کے قول وقرار پبلک کے لیے کچھ بھی رہے ہوں وہ اپنے اس ارادے پر سختی سے قائم تھے کہ ہندوستان کے فوری مطالبہ' حکومت خود اختیاری کے آگے بالکل نہ جھکیں گے اور نہ 1919ء کے ایکٹ پر نظر ثانی کرنے کے لیے کوئی کمیشن مقرر کریں گے جب تک کہ دس سال نہ گزر جائیں۔ اس طرح بنیادی طور پر وہ لبرل (آزاد خیال) اور کنزرویٹو (قدامت پسند) لوگوں کے ہم نوا تھے۔ ریڈنگ، بہر حال، سوراجیوں کے مسلسل مطالبوں سے بہت تنگ آ گیا۔ اس لیے اس نے اولیور کو مطلع کیا کہ حکومت ہند اصلاحی تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کے لیے رضامند ہے۔ بشرطیکہ اس کے نتیجے میں انگلستان سے ایک قانونی کمیشن بھیجا جا سکے جو دستور پر نظر ثانی کے معاملے پر غور کرے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس قسم کی بات ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ انگلستان کی حکومت ہندوستان میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کے

حق میں نہ تھی۔

ریڈنگ نے محسوس کر لیا تھا کہ چند لوگوں کو چھوڑ کر ہندوستان میں ہر قسم کی رائے رکھنے والے لوگ برطانوی ارادوں کی طرف سے مشکوک ہو چکے ہیں اور ان کو حکومت کی طرف سے قطعی بے اعتمادی ہے اس لیے اس نے پھر ایک قانونی کمیشن جلد از جلد مقرر کیے جانے کے متعلق پر زور طریقے پر لکھا۔ وہ یہ نہیں مانتا تھا کہ ایسا کرنے سے اس بات کا اعتراف سمجھا جائے گا کہ 1919ء کا ایکٹ نا قابل عمل ہے۔ اس کے خیال میں یہی موقع تھا کہ آزاد ممبروں (جناح گروپ) اور اعتدال پسند ممبروں کو متحد کر کے اور سوراجیوں کو شکست دے کر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ حکومت اس بات پر بضد نہیں ہے کہ 1929ء تک حالات جوں کے توں رکھے جائیں۔

15 رمئی 1924ء کو اولیور نے ذرا درشتی سے صاف صاف وایسرائے سے کہہ دیا کہ وہ کسی قسم کے کمیشن کی تقرری کے لیے تیار نہیں ہے خواہ وہ قانونی ہو یا پارلیمانی۔

14-قدامت پسند پارٹی اور اصلاحات

نومبر میں لیبر حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد جو انتخابات ہوئے اس میں ان کا تختہ الٹ گیا اور قدامت پسند بڑی کثیر تعداد میں پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہو گئے۔ بالڈون وزیر اعظم ہو گیا اور برکن ہیڈ ہندوستان کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ مقرر ہوا۔ یہ ایک قابل مگر رجعت پسند مدبر تھا۔ اس نے آئر لینڈ کی حکومت خود اختیاری تحریک میں کچھ صلح جوئی کا طریقہ اپنایا تھا اور چونکہ اس نے السٹر (آئر لینڈ کا ایک صوبہ) کے پروٹسٹنٹ لوگوں کی تائید اور امداد میں بڑی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے اس کی عرفیت ''سرپٹ اسمتھ'' قرار دی گئی تھی۔

ہندوستانی اصلاحات کے متعلق برکن ہیڈ کی رائے ریڈنگ کے نام ایک خط

مورخہ 4/دسمبر 1924ء میں دی گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ " میں سمجھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ کابینہ میں تنہا میں ہی مانٹگو چیمسفورڈ رپورٹ پر اعتماد نہ رکھتا تھا اور کچھ حد تک میں نے اس کی مخالفت بھی کی تھی۔ نہیں سمجھتا کہ ہندستان کبھی اس قابل ہو سکے گا کہ اس کو خود اختیاری مملکتی درجہ دیا جا سکے۔ فی الحال میری رائے ہے کہ حالات پر از نو رغور کرنے کی جو تاریخیں طے کر دی گئی ہیں ان پر ہم کو سختی کیساتھ قائم رہنا چاہئے۔"[1]

جنوری 1925ء میں سابق سکریٹری آف اسٹیٹ اولیور نے اخبار اسٹیٹسمین (انگلستان) میں چار مضامین لکھے۔ انہوں نے اپنی پچھلی رائے کا اعادہ کیا تھا جو انہوں نے پارلیمنٹ میں ظاہر کی تھی یعنی " طبعی طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ سفارش کرنے کو تیاری بھی ہوں (جیسا کہ آپ نہیں ہیں) کہ دفعتاً اور فوراً ایک خود مختار مملکت کے لیے جو دستور مناسب ہو اس کے بجائے مکمل طور پر وہاں جمہوری دستور نافذ کر دیا جائے۔"[2]

جولائی 1925ء میں برکن ہیڈ نے دار الامرا میں ہندستان کے متعلق اپنی گورنمنٹ کی پالیسی کی وضاحت کی۔ اس نے اعلان کیا کہ " ہم اس سن 1919ء ایکٹ کی بڑی ذمہ داریوں سے مضطربانہ شورشوں اور چالوں کے باوجود روگردانی نہیں کریں گے۔ ڈرانے دھمکانے سے عجلت کا دروازہ نہ کھل سکے گا اور تشدد کا طریقہ اپنانے سے تو اور بھی مضبوط بند ہو جائے گا۔" اس طرح متنبہ کرنے کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ نے یہ بھی کہا " عقل مند لوگ تاریخوں کے غلام نہیں ہوتے بلکہ تاریخیں ان کی غلام ہوتی ہیں۔"

1۔ ارل آف برکن ہیڈ از ہیلی فکس ص 201

2۔ انڈین کوارٹرلی رجسٹر جنوری تا جون 1925ء، جلد اول ص 298

اس کے بعد اس بات کو جائز بتانے کے لیے کہ وہ کوئی پیش رفت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں فرسودہ اور معروف دلائل اڑانے لگے: "ہندوستان کو ایک واحد وجود مان کر بات کرنا ایسا ہی لغو ہوگا جیسا کہ یورپ کو ایک واحد وجود ماننا۔...... ایسی کوئی قوم کبھی نہیں ہوئی اور مستقبل ہی بتا سکے گا کہ ایسی کوئی قوم آئندہ پیدا ہوگی یا نہیں۔"[1]

سکریٹری آف اسٹیٹ ایک طرف تو کونسل کے اندر بھی اور باہر بھی گورنمنٹ کے اس عزم بالجزم کو ظاہر کر رہے تھے کہ وہ ہندوستانی قوم پرستوں کی چالوں میں کبھی نہ آئیں گے اور دوسری طرف وہ بڑی چالاکی سے کانگریس کو کبھی بہلا پھسلا کر کبھی ڈرا دھمکا کر اس بات پر راغب کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کانگریس عدم تعاون کے رویے کو ترک کر دے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کو منظور کر لے اور برطانوی پارلیمنٹ کے فیصلے کو قبول کر لینے پر آمادگی ظاہر کرے۔ 31 / مارچ کو بنگال آرڈی ننس پر بحث کے وقت برکن ہیڈ نے سی آر داس کو دعوت دی کہ "وہ آگے بڑھیں اور اس تشدد کو ختم کر دینے میں گورنمنٹ سے تعاون کریں جس کو وہ خود ناپسند کرتے ہیں" داس نے اس دعوت کا جواب ان الفاظ میں دیا:

"میں ان سے (برکن ہیڈ سے) اس بات پر پوری طرح متفق ہوں کہ آزادی کبھی تشدد سے حاصل نہیں کی جا سکتی...... لیکن میں گورنمنٹ کو دعوت دینا چاہتا ہوں کہ وہ خود اپنے سے یہ سوال پوچھے کہ بنگال میں لاقانونیت کا جوش وخروش کن اسباب کی بنا پر پیدا ہوا؟" اس کے بعد انہوں نے برکن ہیڈ سے کہا کہ ہندوستان میں انقلابی تحریک کن وجوہ کے باعث پیدا ہوئی اس کی وہ تحقیقات کریں اور پھر اس کا صحیح اور

---

1. ایچ، ایل (دارالامرا) مباحثے۔ سلسلہ پنجم، جلد 61، کالم 1088، دارالامرا برطانوی حکومت کی ہندوستانی پالیسی پر مباحثہ، 7 / جولائی 1925ء

مستقل علاج کریں۔ انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو یقین دلایا کہ جوں ہی "گورنمنٹ ہماری آزادی کی بنیاد رکھ دے گی، ہندوستان میں انقلابی تحریک اسی وقت ختم ہو جائے گی۔" انہوں نے یہ رائے بھی دی کہ "گورنمنٹ کی طرف سے ایک واضح اور ذمہ دارانہ اعلان جلد سے جلد اس کے متعلق ہو جانا چاہیے"[1]

فرید پور میں صوبائی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے صاف صاف کہا کہ "اگر مجھے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ موجودہ ایکٹ نے کسی طرح کی واقعی ذمہ داری عوام کے سپرد کر دی ہے یعنی اپنی قوتوں کو نشو ونما کرنے یا انہیں ترقی دینے یا انہیں مکمل کرنے کا کوئی موقع اس ایکٹ کے تحت مل گیا ہے تو میں بلا کسی جھجک کے گورنمنٹ کے ساتھ تعاون کروں گا اور کونسل چیمبر کے اندر رہ کر تندہی سے کام شروع کر دوں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے یہ رائے پیش کی کہ "گورنمنٹ کو اپنی ان تمام وسیع طاقتوں کا استعمال ترک کر دینا چاہیے جن کے تحت وہ قید و بند میں (لوگوں کو) ڈالتی ہے۔ اس کو تمام سیاسی قیدیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرنا چاہیے اس کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ گورنمنٹ اس بات کی ضمانت دے کہ وہ مستقبل قریب میں دولت مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے حصول سوراج سے متعلق ہمارے کل حقوق کو پوری طرح تسلیم کر لے گی اور اس عرصے میں کہ جب تک سوراج ملے، ایسے سوراج کی قطعی اور کافی بنیاد ابھی فوراً ڈال دی جائے گی .... مجھے یقین کامل ہے کہ اگر گورنمنٹ نے اپنی نیت میں تبدیلی کر لی تو انقلابیوں کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔"

اور اس کے بعد حسب ذیل اپیل کی:

---

1. انڈین کوارٹرلی رجسٹر، جنوری تا جون 1925، ص 188 الف و 88 ب

''کیا برطانوی مدبرین اس مناسب وقت ہمت سے کام لیں گے؟ ان سے میرا کہنا یہ ہے کہ ان شرائط پر جو آپ کے اور ہمارے دونوں کے لیے باعث عزت ہوں تو ہم آہنگی ہوسکتی ہے''۔[1]

مارچ سے اگست 1925ء تک ریڈنگ انگلستان میں رہا تاکہ وہاں کی (ہوم) گورنمنٹ سے ہندوستان کے مسئلہ کے متعلق تبادلہ خیال کر لے۔ جولائی 1925ء میں برکن ہیڈ نے جو تقریر دارالامرا میں کی وہ ریڈنگ سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد کی۔

ریڈنگ نے انگلستان سے اپنی واپسی پر 20/اگست 1925ء کو اسمبلی کے شملہ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے برکن ہیڈ کی اپیل کی تائید کی۔ گورنمنٹ سے ہمدردی رکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اس نے یقین دلایا کہ ''ہم خیرسگالی چاہتے ہیں اور اسی کی درخواست کرتے ہیں۔ اگر اس فیاضانہ دوستی کا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا گیا جو ہم کو دل سے عزیز ہے تو ہم لوگ کنجوسی کے ساتھ سودا کرنے والوں میں نہ ہوں گے''[2]

لیکن اسی کے ساتھ اس نے قوم پرستوں کو متنبہ کیا کہ ''میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں بعض اس خیال کے لوگ موجود ہیں جو مسلسل اس بات کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ زور اور زبردستی کے بغیر انگلستان سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یقین مانیے کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے اور اگر برقرار رکھی گئی تو دونوں ملکوں کے تعلقات کو سخت کشیدہ کردے گی۔''

ریڈنگ کے بیٹے نے لکھا ہے کہ ''یقیناً کانگریس میں ایسے رخنے پڑنے لگے جیسے

1۔ ایضاً ص 95-387

2۔ مارکوئس آف ریڈنگ۔ بحوالہ گذشتہ ص 541

پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔"[1]

ریڈنگ نے خود برکن ہیڈ کو لکھا کہ" اب تعاون کی خواہش زیادہ ہوگئی ہے۔ صرف خواہش ہی نہیں بلکہ اسمبلی کے تمام اجلاس میں عملاً پورا تعاون کیا گیا ہے"[2]

اسی دوران میں موڈی مین کمیٹی نے اپنی تحقیقات پوری کر لی تھی اور اس کے نتائج اور اپنی سفارشیں پیش کر دی تھیں۔

اس اندیشے سے کہ کہیں کانگریس اپنے اثرات نہ بڑھا لے ریڈنگ نے ایک جوابی تدبیر سوچی جس سے ملک کے تمام کانگریس کے مخالف عناصر متحد اور مضبوط ہو جائیں اور 1929ء کے الیکشن سے پہلے تمام سوراجی توپوں کے منہ بند کر دیں یعنی اس نے اعلان کیا کہ 1929ء کے بجائے وہ دستوری کمیشن 1927ء ہی میں مقرر کر دے گا۔ اس نے لکھا:

"اس قسم کے اعلان سے آزاد خیال (لبرل) اور آزاد ممبران کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ ان کی پالیسیاں کافی حد تک سیاسی مفاد حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں گی.......... جس سے سوراجی پریشان ہو جائیں گے.......... اور اس سے میرے جانشین کے لیے زیادہ سازگار فضا پیدا ہو جائے گی۔"[3]

اس نے اصرار کیا کہ یہ فیصلہ فوراً کر ڈالنا چاہئے" ورنہ سوراجی ممبران (1926ء کے موسم بہار میں) گزشتہ ستمبر کی تجویز کی بنیاد پر ایک دوسری تجویز پیش کر دیں گے اور جب یہ اجلاس میں پیش ہوگئی اور گورنمنٹ نے اس کے بعد اپنی پالیسی کا اعلان کیا تو سوراجی خوشی کے نعرے لگائیں گے کہ یہ جیت ان کی تدبیروں کی ہے اور پھر وہ انتخابی حلقوں میں اس دعوے کے ساتھ جائیں گے کہ انہوں نے گورنمنٹ کو ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا"[4]

1۔ د 2 ایضاً 3 ایضاً ص542 4 ایضاً

برکن ہیڈ نے 10 ر ستمبر کو جواب میں لکھا: ''یہ ممکن ہے کہ کمیشن کے تقرر میں عجلت کردی جائے کیونکہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ کمیشن کی تقرری کا کام لیبر گورنمنٹ کے لیے اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔'' اس نے کہا کہ '' ابتدائی مصلحت اندیشی کے طور پر بھی یہ ضروری ہے کہ کمیشن کا تقرر 1927ء کی گرمیوں تک کر دیا جائے۔''[1] اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ایسا کرنا ہندستانی رائے عامہ کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہ ہوگی۔ '' لیکن اس کو اس طرح ضرور کام میں لانا چاہیے تاکہ اس سے بہتر سے بہتر نتائج نکل سکیں۔ وہ اسے سودا بازی کے طور پر استعمال کرے گا تاکہ سوراج پارٹی کو جس میں اختلافات پیدا ہی ہو چکے ہیں بالکل تتر بتر اور منتشر ہو جائے'' [2]

لیکن وہ اس بات کے خلاف تھا کہ فوراً اعلان کر دیا جائے جیسی کہ ریڈنگ نے خواہش ظاہر کی تھی کیونکہ اس وقت انگلستان میں رائے عامہ کی صورت حال ایسی تھی کہ فوراً ایسا اعلان کر دینا وہاں کی گورنمنٹ کے خیر خواہوں کو بھی بہت شاق گزرتا اور دوسرے لوگوں کو بھی۔[3]

برکن ہیڈ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ 1919ء کی دستوری اصلاحات میں قانون کمیشن مقرر کرنے کی جو تاریخ رکھی گئی ہے اس سے پیشتر اس کمیشن کا تقرر کر دینا ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کب اس کا اعلان کرے۔ ایک طرف تو اس میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لیبر پارٹی موجودہ پارلیمنٹ کی مدت کے خاتمے پر برسر اقتدار آ کر (جو متوقع تھی) ایسے ممبروں کو منتخب نہ کرلے جو ہندستانی لیڈروں کے مطالبات کی ہمنوائی کریں اور بنیادی تبدیلیاں کر دینے والی رپورٹ پیش کر دیں۔ دوسری طرف اس کو انڈین نیشنل کانگریس سے

---

1. ایضاً 2. ریڈنگ پیپرس: برکن ہیڈ بنام ریڈنگ 10 ر دسمبر 1925ء

3. ایضاً 20 ر جنوری 1926ء

انتہائی نفرت تھی اور وہ اس کو کسی طور پر ہندستان کے عوام کی نمایندہ کانگریس نہ مانتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے اثرات کو تباہ و برباد کر دے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کمیشن کی قبل از وقت تقرری کرا دینے کا سہرا قوم پرستوں کے سر بندھے۔

☆..................☆..................☆

باب دوم

اروِن اور مسئلہ ہندوستان

ریڈنگ کی سبک دوشی پر جب عالی نسب ٹوری (فرقے کے) اَروِن وائسرائے کے تخت پر متمکن ہوا، حالات بہتر ہو گئے۔ اِروِن کی یہ شہرت تھی کہ وہ بہت پرخلوص، دین دار اور واقعی ایمان دار آدمی ہے۔ وہ راست گو، صاف گو اور خوش اخلاق تھا۔ گاندھی جی کا جب کچھ عرصے بعد اس سے سابقہ پڑا تو وہ اس کی بڑی عزت کرنے لگے تھے۔

لیکن اس کی ذاتی خوبیاں تسلیم اور یہ بھی مان لیا جائے کہ جیسی صفات اس کی تھیں سیاست دانوں میں عام طور سے نہیں پائی جاتی تھیں پھر بھی یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ اَروِن اپنے طبقے کے اعتقادات اور میلانات سے جو اس کے ضمیر میں رچ بس گئے تھے اوپر نہ اٹھ سکتا تھا۔ ہندو مسلم اختلافات کے باعث ہندوستان خودمختار حکومت چلانے کے قابل نہیں ہے، ہندوستان کو سیاسی ترقیاں حاصل کرنے کے لیے پوری طرح اور بلاشرط برطانوی اسکیموں کو مان لینا چاہئے اور گورنمنٹ کی شرایط سے پورا تعاون کرنا چاہئے، برطانوی پارلیمنٹ کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ جس رفتار، جن مرحلوں سے اور جس طرح کی ترقیاں اسے دے گی وہ یہاں مان لی جائیں گی اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہی ہندوستان کی صلاحیت کی ہر دفعہ جانچ کروانے کے بعد قسط وار اصلاحات تجویز کرے گی۔ ان تمام امور کے متعلق اَروِن کے نظریات برطانوی سیاسی پارٹیوں کے سربرآوردہ رہنماؤں سے مختلف نہ تھے۔

وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ہندوستان کے حوصلوں اور برطانیہ کی ان حوصلوں کو جلد پورا کرنے کی نارضامندی کے درمیان توازن قایم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس نے برکن ہیڈ کو لکھا کہ ''کسی نہ کسی موقع پر صرف معتدل مزاج ہندوستانی سیاسی لیڈروں اور برطانیہ کی اکثریت کی رائے کے درمیان بھی تصادم ناگزیر ہے۔ جب اوّل الذکر کوئی مطالبہ پیش کرنا ضروری سمجھیں اور مؤخر الذکر اسے یا اتنا مطالبہ نہ دے سکیں.......... بنیادی طور پر، میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ہر قسم کے سیاسی خیالات رکھنے والے لوگ شدت پسند عناصر کے تحت زیادہ سے زیادہ اس بات پر مائل ہو رہے ہیں کہ وہ برطانوی لوگوں کے اس دعوے کے خلاف بغاوت کر دیں کہ صرف انہیں کو ہندوستان کی رفتار ترقی طے کرنے کا حق ہے۔''[1]

وایسرائے کا یہ فرض تھا کہ وہ برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ چونکہ اَرون اہل الرائے طبقے کو نمایندہ نہ مانتا تھا اور انہیں سیاسی تدبر سے عاری، نامعقول اور غیر ذمہ دار[2] سمجھتا تھا اس لیے اعتماد کے قابل پہلے تو اس نے مسلم اقلیت کو سمجھا جس کے ننانوے فی صدی لوگ نہرو کے بنائے ہوئے حکومت خود اختیاری کے منصوبے کے خلاف تھے، دوسرے نمبر پر غیر برہمن طبقوں کو لیا جنہوں نے مدراس میں جسٹس پارٹی بنالی تھی۔ اس کے بعد اچھوتوں کو لیا اور آخر میں ہندوستانی ریاستوں کو جو کسی طرح کم وقعت نہ رکھتی تھیں۔

1919ء کے قانون کے تحت وایسرائے کی ذاتی ذمہ داریوں میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا کیونکہ اس کو سکریٹری آف اسٹیٹ سے استمزاج کیے بغیر فوری فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا مثلاً مجلس قانون ساز میں جو سرکاری تجاویز رد کر دی جائیں ان کی

---

1. اروِن پیپرس: اروِن بنام برکن ہیڈ، 14 نومبر 1927ء

2. ایضاً، اروِن بنام بادشاہ جارج پنجم، جلد اول مورخہ 29 نومبر 1927ء اور مورخہ 29 فروری 1928ء وغیرہ

بحالی کی سند دینا۔ مجلس قانون ساز میں ایک بہت منظم حزب مخالف سے مقابلہ اور ملک میں تیزی سے بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کے باعث مرکز ثقل کا اب ہندوستان کی طرف منتقل ہونا۔

یہ اروِن کی قسمت میں تھا کہ اسے ایسی ٹیم کی کپتانی کرنا پڑی جو مخالف پارٹی سے رسہ کشی میں مصروف تھی۔ وہ ہندوستان میں ایسے وقت وارد ہوا جب یہاں کی فضا مکدر تھی۔ لوگ بے قرار تھے۔ ملک بے چین ہو رہا تھا۔ دہشت انگیزی اپنا ڈراؤنا چہرہ پھر دکھانے لگی تھی اور حکومت نے انتظامیہ کو بنگال فوجداری قانون ترمیمی آرڈیننس 1925ء کے تحت وسیع اختیارات تفویض کردیے تھے جس کے باعث بے گناہ لوگوں کو قانونی حفاظت نہ ملنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اقتصادی مسائل الگ درپیش تھے۔ ان کا حل ضروری تھا لیکن حل گورنمنٹ کے اختیار سے باہر تھا مثلاً قیمتوں میں اضافہ، ہندوستان کے خام مال اور باہر سے درآمد کی ہوئی صنعتی چیزوں کی قیمتوں میں بہت ہی زیادہ فرق تھا۔ 1921ء اور 1931ء کے درمیان آبادی میں یکدم بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ بے زمین مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ان دقتوں میں یہ بھی شامل کرلیجئے کہ صنعت کی ترقی رک جانے کے باعث زمین (یعنی زراعت) پر بار بہت زیادہ ہو گیا تھا اور دیہات کے لوگ قرض کے بار سے زیادہ سے زیادہ دبتے چلے جارہے تھے۔

ہندو اور مسلمان فرقوں کے درمیان تعلقات کا خراب سے خراب تر ہوتے جانا ایسا عجیب واقعہ تھا کہ اسے برطانوی حکم رانوں نے بھی تسلیم کیا کہ یہ مذہبی سے زیادہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ ہندوستانیوں کو کامل یقین تھا کہ یہ نتیجہ تھا گورنمنٹ کی غلط کاریوں اور غفلت شعاریوں کا۔ گورنمنٹ کے ترجمان سختی سے اس بات کا انکار کرتے تھے۔ بہرحال ان سب باتوں سے ہندوستانی عوام کے دل میں ہراس اور پریشانی بڑھتی ہی

رہی۔ مجالس قانون ساز میں نیشنلسٹ (قوم پرست) پارٹی اس بات سے بہت زیادہ فکر مند تھی کہ اس کے اندر جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان سے اس کے اپنے استحکام کو بھی خطرہ لاحق تھا اور یہ بھی اندیشہ تھا اس سے افسر شاہی کے خلاف حزب مخالف کمزور پڑ جائے گی۔

انہیں تمام وجوہ کے باعث اسمبلی میں سوراج پارٹی بڑی مایوسی محسوس کر رہی تھی حالانکہ وہ تو مجلس قانون ساز میں اس خیال سے شریک ہوئی تھی کہ سوراج کو قریب تر لے آئے گی۔ لیکن اس کی تمام کوششوں کو گورنمنٹ نے ناکام بنا دیا تھا۔ اسمبلی میں 1924ء میں دستور پر نظر ثانی بہ عجلت تمام کیے جانے کی تجویز منظور ہو چکی تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے یہ مطالبہ بالکل ٹال دیا۔ ستمبر 1925ء میں موتی لال نہرو نے موڈی مین کمیٹی کی اکثریت کی رپورٹ نامنظور کیے جانے کی تحریک پیش کی تھی اور گورنر جنرل اِن کونسل سے یہ سفارش کی تھی کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں تاکہ یہ کانفرنس خود اختیاری حکومت کی ایک اسکیم ترتیب دے سکے۔ اسمبلی نے سوراج پارٹی کے لیڈر کی اس تحریک کو منظور کر لیا تھا لیکن گورنمنٹ نے اسے نامنظور کر دیا۔ سوراجیوں کے لیے یہ بات واضح بھی تھی اور مایوس کن بھی کہ گورنمنٹ اسمبلی کا کوئی احترام نہ کرتی تھی۔

اس مایوسی کا اظہار اس طرح ہو سکا کہ مارچ 1926ء میں سوراج پارٹی اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئی۔ اروِن نے اس مقاطعے کے فوراً بعد اپریل میں چارج لیا تھا یعنی ان کا یہ کوئی مبارک آغاز نہ تھا۔ سیاسی منظر تاریک نظر آ رہا تھا اس کے علاوہ ملک فرقہ وارانہ نفرت اور تشدد کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ کلکتے کے فسادات میں جانی نقصان بہت زیادہ ہوا تھا اور بڑی وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوئی تھیں۔ عبادت گاہوں کی تخریب، آتش زنی اور لوٹ مار۔

ان حالات میں وائسرائے نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ وہ ان فرقوں سے اپیل کرے کہ مذہب اور ملک کے نام پر جو یہ برادر کشی کی جارہی ہے بند کردی جائے۔[1] اس نے متنبہ کیا کہ ملک کی سیاسی ترقی کے حق میں ان اختلافات کے نتیجے افسوس ناک ہوں گے۔ ایک مہینہ بعد اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اس نے پھر ان لوگوں کو یاد دلایا کہ ''مختلف فرقے جو ایک دوسرے سے مخالفت دکھا رہے ہیں، وہ ان کے اپنے مذاہب کی روایتی وفاداری پر اتنی زیادہ مبنی نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ ان دعووں پر جو انہیں اپنے حقوق کے متعلق ہیں اور جن کو وہ وہی تقدس بخشنا چاہتے ہیں جو اپنے قدیم عقاید سے رکھتے ہیں''۔ [2]

برکن ہیڈ کی بھی یہی رائے تھی۔ وہ بھی اسی خیال میں تھے کہ اصلاحات کسی حد تک ان جھگڑوں کو پیدا کردینے کے ذمہ دار تھے۔ اس نے لکھا ''جس وقت یہ خیال ہندستان کے لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوجائے گا کہ ایک نہ ایک دن حکومت خوداختیاری ضرور مل جائے گی اس وقت مسلمان ضرور اپنے سے سوال کریں گے کہ ایسی صورت میں اقلیت میں ہونے کے باعث ان کی جگہ کہاں ہوگی۔ ان اندیشوں کے غلبے سے شورش پیدا ہوگی اور شورش سے تشدد ہندوستان میں بہت آسانی سے پیدا ہوجاتا ہے۔'' [3]

1- قانونی کمیشن کا تقرر

یہ ظاہر ہے کہ وہ مسئلہ جو بنیادی طور پر سیاسی تھا اس قسم کی تدبیروں سے علاج پذیر

1۔ انڈین پرابلمس (ہندوستانی مسائل) از لارڈ اروِن: چیمسفورڈ کلب میں تقریر، 17/جولائی 1926ء ص 40-230

2۔ ایضاً مجلس قانون ساز اور کونسل آف اسٹیٹ کے مشترکہ اجلاس میں تقریر، 17/اگست 1926ء ص 29

3۔ اروِن پیپرس: برکن ہیڈ بنام وائسرائے، 8/جولائی 1926ء

نہ ہوسکتا تھا جو اَرون اور گاندھی جی اپنے مذہبی اور اخلاقی وعظوں کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ نہ حبِّ وطن اور سمجھداری سے کام لینے کی اپیل سے نہ خراب نتائج کا خوف دلانے سے۔ سیاسی حقوق کے نئے مطالبات صرف صحیح قسم کے سیاسی عمل سے پورے کیے جاسکتے تھے۔ مارلے منٹو اور مانٹیگو چیمسفورڈ نے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر جو فیصلے کیے تھے ان سے فرقہ وارانہ علاحدہ نمایندگی کا زہر سیاست میں سرایت کرگیا تھا۔ اَرون اگرچہ یہ تسلیم کرچکا تھا کہ ''ایسا وقت آسکتا ہے اور مجھے قوی امید ہے کہ ضرور آئے گا جب تمام لوگوں کی رضامندی سے اس قسم کی خاص نمایندگی کی ضرورت آیندہ نہ محسوس کی جائے گی۔1 لیکن جب موقع آیا تو اس نے معاملے کو حل کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس نے گورنمنٹ کو بھی یہ عذر پیش کرکے بری الذمہ کردیا کہ ''صورت حال کا غلط مطالعہ کرکے یہ کہہ دینا خطرناک ہوگا کہ گورنمنٹ ہی پر ذمہ داری سب سے پہلے عاید ہوتی ہے۔'' اور اس ذمہ داری کو عوام کے کندھوں پر ڈال دیا کہ ''یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ ان سب چیزوں کا تدارک اندر سے ہونا چاہیے باہر سے یہ عاید نہیں کیا جاسکتا'' 2

لیکن ارون ہندستان قوم پرستی کے روز بروز بڑھتے ہوئے اور ناگزیر مطالبات، سے اغماض نہ کرسکتا تھا۔ مختلف الخیال ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کرنے کے بعد اس کو یقین ہوگیا تھا کہ ''ہندوستان کے تمام فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں میں سیاسی ادراک رکھنے والے تمام لوگوں میں ایک پرجوش عزم پیدا ہوگیا ہے کہ وہ دنیا میں ہندوستان کو اپنا جائز مقام دلانے کا مطالبہ پرزور طریقے پر پیش کریں، اور یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی اگر جغرافیائی تقسیم یا مذہب، ذات اور زبان کے الجھاوے کو

---

1 انڈین پرابلمس: چیمسفورڈ کلب میں تقریر 17/جولائی 1926ء ص 130ء

2 ارون پیپرس: ارون بنام برکن ہیڈ 9/جون 1926ء

آڑ بنا کر اس مطالبہ کی اہمیت پر پردہ ڈال دیا جائے'' 1

1926ء کے موسم سرما میں جو انتخابات ہوئے اروِن کے خیالات میں ان سے اور پختگی آ گئی کیونکہ باوجود فرقہ وارانہ اختلافات اور کانگریس میں گروپ بندی کے برکن ہیڈ اور ریڈنگ کی امیدوں کے برخلاف کانگریس پارٹی اسمبلی میں اگرچہ کسی قدر کم تعداد میں کامیاب ہو کر آئی لیکن سب سے بڑی پارٹی اسی کی تھی۔ دراصل اسمبلی کے وہ ممبران جو قوم پرست تھے اگرچہ بعض پالیسی کے سوالوں پر ہم رائے نہ تھے لیکن اس مطالبے پر سب متفق تھے کہ ہندوستان کو بہ اعتبار سیاسی درجے کے فوراً ترقی ملنا چاہئے۔ بہرحال اب گورنمنٹ اس بات کی امید نہ رکھ سکتی تھی کہ اسے (اسمبلی کی) کارروائیوں میں آسانی ہوگی۔ اس بات نے مجبور کر دیا کہ بہ عجلت تمام فیصلہ کر کے قانونی کمیشن کے کام کی ابتدا کر دی جائے۔

برکن ہیڈ اور ریڈنگ تو پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ کمیشن کی تقرری 1927ء تک کر دینا چاہئے۔ ریڈنگ کو تو اسمبلی میں اپنے تجربے اور ملک کی رائے عامہ کے میلانات کے مشاہدے کے باعث یہ فیصلہ کرنا پڑا تھا۔ برکن ہیڈ کا فیصلہ اپنی پارٹی کی مصلحت کی بنا پر تھا۔ کمیشن کی تقرری کا سال جب طے ہو گیا تو یہ بات زیرِ غور آئی کہ اسے ترتیب کیسے دیا جائے۔ ریڈنگ اس میں کسی ہندوستانی کو شریک کرنے کا سخت مخالف تھا۔ وہ عقل مندی اسی میں سمجھتا تھا کہ کمیشن غیر جانب دار بیرونی عناصر پر مشتمل ہونا چاہئے۔ 2

برکن ہیڈ نے جواب میں لکھ بھیجا ''جہاں تک قانونی کمیشن کے افراد کا تعلق ہے آپ نے اپنی رائے کی مصلحت سمجھا کر مجھے ہم رائے بنا لیا ہے۔ اب میں بھی یہ سمجھتا

---

1 لائف آف لارڈ ہالیفکس: ارل آف برکن ہیڈ، ص 219

2 اروِن پیپرس: اروِن بنام برکن ہیڈ، 19/ اگست 1926ء

ہوں کہ کمیشن میں ہندوستانیوں کی شمولیت سے فوائد سے زیادہ نقصانات ہوں گے۔''

اس کے بعد پھر اپنی رائے اس نے دہرائی کہ اب ممبران کے انتخاب میں کوئی تاخیر نہ ہونا چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ انتخابات (الیکشن) کے باعث اس منصوبے میں ہرج واقع ہو جائے یا ہمارے انتخابات میں کچھ لوگوں کو ''شرارت آمیز'' حرکتیں کرنے کا موقع مل جائے۔''[1]

تب اروِن نے مشورہ دیا کہ کمیشن کے ممبران صرف پارلیمنٹ کے ممبران ہی بنائے جائیں۔[2] وجہ یہ بتائی کہ'' اس طریقہ کار سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ کمیشن میں ہندوستانیوں کو شامل نہ کرنے کا بہترین جواز مل جائے گا جسے ہم اپنی مدافعت میں پیش کر سکیں گے۔'' [3]

20/جولائی 1927ء کو یہ معاملہ کابینہ میں پیش کیا گیا اور وہاں یہ تجویز ہوا کہ (1) کمیشن پارلیمنٹ کے سات ممبروں پر مشتمل ہو جن میں سے چار ممبران گورنمنٹ کے حامی (قدامت پسند پارٹی کے) ہوں، ایک لبرل پارٹی کا اور دو لیبر پارٹی کے۔

2- کمیشن میں کوئی ہندوستانی نمایندہ نہ شامل کیا جائے لیکن کمیشن سے ہندوستانیوں کے تعاون کے ذرایع نکالے جائیں تاکہ شہادتوں کی جانچ میں وہ بحیثیت ایک ثالث کے مدد دے سکیں اور کمیشن کے ممبروں سے تبادلۂ خیال کر سکیں لیکن کمیشن اپنی رپورٹ تیار کرنے میں ان سے کوئی مدد نہ لے گی۔

3- ہندوستان مجلس قانون ساز کی ایک منتخبہ کمیٹی کو اس کا موقع دیا جانا چاہئے کہ وہ رپورٹ تیار ہو جانے کے بعد کمیشن سے یا کمیشن کی تیار کردہ رپورٹ پر بل بننے پر

---

1. ایضاً: برکن ہیڈ بنام اروِن، 26/ستمبر 1926ء

2. ایضاً، اروِن بنام برکن ہیڈ، 17/نومبر 1926ء

3. ایضاً، اروِن بنام برکن ہیڈ، 6/جنوری 1927ء

پارلیمنٹ کی ایک منتخبہ کمیٹی سے تبادلہ خیال کرے۔

لیبر پارٹی نے تیسری شرط پر اعتراض کیا اور کابینہ اس پر راضی ہو گیا کہ وہ اس میں ترمیم کر دے گا۔ ترمیم کردہ شرط کے مطابق ہندوستانی مجلس قانو ساز کی کمیٹی کو پارلیمانی کمیٹی کے برابر درجہ دیا گیا اور یہ بھی طے ہوا کہ مناسب موقع پر اس کی رپورٹ کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائیگا۔

برکن ہیڈ نے اب کمیشن کے ممبران کا انتخاب کرنا شروع کیا۔ سر جان سائمن جو ایک ممتاز دستوری قانون کے وکیل اور دارالعوام میں لبرل پارٹی کے ایک ممبر تھے اور جنہوں نے 1926ء کے عام ہڑتال میں ایک اہم رول ادا کیا تھا اور جن کے متعلق امید تھی کہ وہ ہندوستان کے اعتدال پسند طبقے کے لیے قابل قبول ہوں گے اس کمیشن کا صدر بنا گیا۔ برنہم جن کی خاص صلاحیت یہ تھی کہ وہ سلطنت برطانیہ کے تمام مقامات کا دورہ کر چکے تھے اور اسٹراتھکونا ایک نوجوان جس کو پارٹی میں ایک مقام حاصل تھا، یہ دونوں دارالامرا سے منتخب کیے گئے۔ لین فاکس جوارون کا برادرِ نسبتی تھا اور کاڈوگن جو پہلے کسی وقت اسپیکر کا سکریٹری رہ چکا تھا اور یہ دونوں دارالعوام میں قدامت پسند پارٹی کے پیچھے بیٹھنے والے ممبروں میں سے تھے، پارٹی کے نمایندہ بنائے گئے۔ لیبر پارٹی کی طرف سے اٹیلی جو اس وقت غیر مصروف تھے اور ورنن ہارٹ شارن چنے گئے۔ پارلیمنٹ کے ان سات "غیر معمولی ذہین مشیروں" سے امید قایم کی گئی کہ وہ پارلیمنٹ کو ایک ایسے معاملہ کے متعلق مشورہ دے سکیں گے جو نہایت پیچیدہ تھا اور تاریخ عالم میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اولیور کو تو " اس فہرست سے یہ انداز ہوا کہ بہت سے ہندوستانی ان ناموں سے مایوس ہو جائیں گے اور اسے ایک کم رتبہ کا کمیشن خیال کریں گے۔" 1

ٹائمس (اخبار) ان کو" دوسرے درجے" کے لوگ کہا کرتا تھا۔ بڑے حیرت کی

---

1 انڈین سالانہ رجسٹر 1927ء جلد دوم ص 76، دارالامرا 24 نومبر 1927ء

بات ہے کہ ہندوستان کے برطانوی حکمران یہ سمجھ بیٹھے کہ سلطنت کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں بہت اطمینان سے سپرد کی جاسکتی ہے لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

برکن ہیڈ جس وقت کمیشن کے ممبران کے نام طے کررہا تھا وہ شکوک اور وسوسے جن کو برطرف کیا جاچکا تھا برکن ہیڈ اور ارون کے ذہنوں کو پریشان کرنے لگے۔ مارچ میں برکن ہیڈ اس طرح حجت پیش کررہا تھا: ''کیا ہندوستان کے لیے کوئی ایسا کمیشن مرتب کیا جاسکتا ہے جس میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ ہو اور کیا ہمارا یہ طریقہ ساری دنیا پر واضح نہ کردے گا کہ اس طرح ہم نے ہندوستانی عوام کے سر احساس کمتری کا ٹیکہ لگادیا ہے''۔[1] مئی میں اس کو اس مسئلے پر مجلس قانون ساز کے چیرمین وٹھل بھائی پٹیل سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ وہ اس وقت انگلستان کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ پٹیل نے جب سنا کہ خالص انگریز ممبروں ہی کا انتخاب کمیشن میں کیا گیا ہے تو اس بات کو انہوں نے صحیح طور پر خطرناک سمجھا۔'' انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے کہا کہ'' اس طرح کا بنایا ہوا کمیشن جب ہندوستان پہنچے گا تو بہت ممکن ہے اس کا قطعی بائیکاٹ کیا جائے''۔[2] برکن ہیڈ نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے تب اَرون سے اس کی رائے پوچھی۔ ارون اپنی اسی رائے پر قائم تھا جو اس نے اس سے پیشتر اپنے خط مورخہ 26/مئی 1927ء میں ظاہر کی تھی اور برکن ہیڈ کو یقین دلایا تھا کہ وہ 'مسلمانوں' آزادخیال (لبرل) لوگوں اور ریاستوں کی مدد سے ''ہندو کانگریس'' کے بائیکاٹ کو ختم کرادے گا۔''

اگست میں اس نے برکن ہیڈ کو مطلع کیا کہ اس کی مجلس عاملہ کے ہوم ممبر مسٹر ہیلی کو

---

1. ارون پیپرس، برکن ہیڈ بنام ارون، 43/مارچ 1927ء

2. ایضاً، برکن ہیڈ بنام ارون، 5/مئی 1927ء

اپنی ان کوششوں میں کامیابی ہو رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو پارلیمانی کمیشن منظور کر لینے پر راغب کر لیں لیکن ایس پی سنہا کو بھی جو لندن میں ہیں موافق کر لینا ضروری ہے تا کہ اعتدال پسندوں کو متفق کیا جا سکے۔[1] رہا ہندوستانی ریاستوں کا معاملہ، وہ آسانی سے قابو میں آ جائیں گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے امید وابستہ کرنے کی ایک مزید وجہ بھی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صلح صفائی کرنے کے لیے جو کانفرنس شملہ میں ستمبر میں کی گئی تھی وہ نا کامیاب ہوگئی تھی اور اَرِون کو امید ہوگئی تھی کہ مسلمان جلد ہی اپنی مقصد بر آری کے لیے اس کے پاس آئیں گے۔ اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھ دیا تھا کہ" وہ لوگ (مسلمان) بہر حال ہمارے بہترین دوست ہیں اور غیر جانب دار رہنا چاہیے جتنا بڑا ہمارا فرض کیوں نہ ہو، جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم لوگ اس بات کے لیے مجبور نہیں کیے جا سکتے کہ ہم اپنے دوستوں کو ان نئے ساتھیوں کی خاطر رد کر دیں جن کی دوستی قابل اعتماد نہیں رہی ہے"[2] اس کو تقریباً مکمل یقین تھا کہ مسلمان بائیکاٹ نہیں کریں گے اور اس کی وجہ سے لازمی طور پر ہندوؤں کا فیصلہ بھی متاثر ہوگا۔

وہ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لینا چاہتا تھا کہ کانگریس کو بھی ہموار کر لے۔ چنانچہ اس نے گاندھی جی، پٹیل، انصاری اور آئینگر سے گفت وشنید کا انتظام کیا۔ گاندھی جی کے متعلق اس نے اپنے والد کو لکھا" وہ دراصل یہ سیاسی پوزیشن لیتے ہیں کہ انگلستان اور انگریزی پارلیمنٹ کو کوئی اخلاقی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہندوستان کی ترقی کے مسئلے کو طے کرے...... جو کچھ انہیں کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ یہ تسلیم کر لیں کہ ہندوستان کو مملکتی درجہ دیدینا چاہیئے جیسا کہ انہوں نے آئرلینڈ کے ساتھ کیا ہے اور پھر ہندستانیوں سے

1۔ بحوالہ گذشتہ: اردن بنام برکن ہیڈ، 18/ اگست 1927ء

2۔ بحوالہ گذشتہ اردن بنام برکن ہیڈ، 3/ اپریل 1927ء

ملاقاتیں اور گفت وشنید کر کے صحیح طریقے اور تفصیلات طے کر لیے جائیں تاکہ ان کے مطابق اور انہیں کے ذریعے اس کام کا تکملہ کیا جا سکے۔"[1]

بقیہ تین لوگوں نے اس سے جو کچھ کہا اس کے مطابق تو اسے رک جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ اس کا سوءظن، اس کا ہندوستانی رائے عامہ سے تغافل کا انداز اور وہ غلط اعتماد جو ہندوستانی عوام کے جذبات سے ناواقفیت کی بنا پر اس میں پیدا ہو گیا تھا، یہ سب ان لوگوں کے برے صلاح کار تھے جو ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔

بہر حال، اپنی جگہ اٹل رہ کر ریڈنگ نے برکن ہیڈ کی ہچکچاہٹ کو دور کر دیا جو ویسے بھی کانگریس کے بک بک کرنے والوں کو پسند نہ کرتا تھا چنانچہ 8/نومبر 1927ء کو انگلستان میں سکریٹری آف اسٹیٹ نے اور وایسرائے نے ہندوستان میں اصلاحات کے قانونی کمیشن کی تقرری کا اعلان کر دیا۔

2- ہندوستانیوں کی برہمی

باقاعدہ اعلان سے پہلے ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات اپنی پرچھائیاں ڈالنے لگے۔ ہندوستانی لیڈر مثلاً سپرو اور موتی لال نہرو اس وقت انگلستان ہی میں تھے جب کہ کمیشن کے ممبران کے نام زیر بحث تھے یا طے ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو جو اطلاعات اس کے متعلق ملیں ان سے یہ بہت پریشان ہوئے اور جب انہوں نے اپنے اندیشوں سے اپنے رفقا کو آگاہ کیا تو ایک ہیجانی فضا پیدا ہو گئی۔ 8/نومبر کو اعلان ہونے پر طوفان پھٹ پڑا اور سارے ہندوستان پر سیاہ اور ہیبت ناک بادل چھا گئے۔ ہندوستان میں اس کا ردعمل بڑی سرعت اور شدت کے ساتھ ہوا۔

---

1. ہالیفکس۔ ص 146، راوی ارل آف برکن ہیڈ

14 ر ستمبر کو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر نے ایک بیان جاری کیا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس کی مخالفت کی جائے اس وجہ سے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی رائے اور اسمبلی میں دو مرتبہ قومی مطالبہ کیے جانے کے برخلاف قصداً ایسے کمیشن کا تقرر کیا جس میں سب انگریز ہی انگریز ہیں اور ہندوستانیوں کے اس فطری حق کو مسترد کر دیا ہے کہ وہ اپنا دستور خود بنا سکیں۔ بیان میں اس مفروضے کو بھی غلط قرار دیا گیا کہ پارلیمنٹ ہی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس بات کی جانچ کرے کہ ہندوستان سوراج حاصل کرنے کے لائق ہو گیا ہے یا نہیں۔ اس کو کس حد تک حکومت خود اختیاری سونپی جائے۔ کمیشن میں کسی ہندستانی کو شامل نہ کر کے ہندوستان کی جو ہتک کی گئی ہے مذکورہ بیان میں اس کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا۔ بہرحال کانگریس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ نہ خود کسی قسم کی شہادت (کمیشن کے سامنے) دے گی نہ کسی مرکزی یا صوبائی کمیٹی میں کوئی کام انجام دے گی نہ ایسی کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے کسی کو ووٹ دے گی۔ کانگریس نہ تو اس کمیشن کے ممبروں سے ملاقات کرے گی اور نہ ان کے اعزاز میں دی جانے والے دعوتوں میں شریک ہوگی بلکہ کانگریس خود دوسری پارٹیوں کی مدد سے ہندوستانی سوراج کا ایک دستور مرتب کرے گی۔

16 ر نومبر کو جناح نے پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ان کو بہت طاقتور اور باا ثر تائید ہندوستان کے گوشے گوشے سے ملی ہے، انڈین نیشنل کانگری کے چوٹی کے لیڈروں سے، کل ہند مسلم لیگ سے، کل ہند لبرل فیڈریشن سے، ہندوستانی چیمبر آف کامرس کی فیڈریشن سے، مل مالکان کی ایسوسی ایشن سے اور ہندو مہا سبھا سے بھی۔ ان سب نے ایسے منشور پر دستخط کرنے کی منظوری دیدی ہے جس میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ ہندوستانی ''اصولاً اس طرح کے بنائے گئے کمیشن کے کام میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔''

اس پر دستخط کرنے والوں میں تیج بہادر سپرو، سیو سوامی ایر، اینی بیسنٹ، چمن لال ستیل واد، ونشاپٹیٹ، جناح، عبدالرحیم اور علی امام تھے۔

اگرچہ بائیکاٹ کی خبر گورنمنٹ کو پہلے ہی مل چکی تھی لیکن جب واقعی اس کا اعلان کیا گیا تو گورنمنٹ حیرت زدہ رہ گئی۔ اروِن نے جھنجھلا کر برکن ہیڈ کو مطلع کیا کہ ''ہندوستانی اعتدال پسند لوگ بھی کم از کم جس مطالبے کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور برطانوی کثرت رائے جتنا کچھ دے سکتی ہے ان دونوں کے درمیان کسی نہ کسی نقطے پر تصادم ہو جانا لازمی ہے اور میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ تاخیر سے ہونے کے بجائے اگر ابھی ہو جائے تو نامناسب نہ ہوگا'' [1]

اس نے بادشاہ کے نام بھی ایک خط میں اپنی پریشانی کا اس طرح اظہار کیا'' میں سچائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں سمجھ نہیں پاتا کہ ان کا ایسی کارروائیوں سے کیا فائدہ ہے۔ میرے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ایسی پوزیشن میں ڈال دیے جانے سے بہت گھبراتے ہیں جس میں خود ان کو تعمیری جدوجہد کرنے کے لیے مجبور ہو جانا پڑے گا اور اس بدنامی سے بہت ڈرتے ہیں جو انہیں اس امتحان میں ناکامی کی بدولت حاصل ہوگی'' [2]

کچھ دنوں بعد 24 / نومبر 1927ء کو برکن ہیڈ نے دارالعوام میں اپنی پالیسی کے سلسلے میں عذرات پیش کیے۔ اس نے وہی پیشتر والے دلائل دہرائے یعنی یہ کہ پارلیمنٹ کو ہندوستان کے لیے دستور بنانے کی ذمہ داری سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستانی لوگ ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ سیاسی پارٹیاں اپنے ملک کی بڑی اکثریت اور خاص طور سے اچھوتوں کی طرف سے نہیں بول سکتیں۔

---

1. اروِن پیپرس: اروِن برکن ہیڈ، 16 / نومبر 1927ء

2. ایضاً۔ جلد اول خطوط اور تار بنام ہز میجسٹی بادشاہ۔ وائسرائے بنام بادشاہ 29 / فروری 1928ء

کوئی ایسی تنظیم نہیں ہے جو غیر ہندوؤں کے علاوہ سارے ہندوؤں ہی کی نمایندگی کر سکے۔ یہ کہ ان خامیوں کے باوجود اس نے ہندوستانی پارٹیوں کو دعوت دی کہ وہ ایک اپنا دستور خود بنائیں جس پر مناسب غور کیا جا سکے گا۔ یہ بھی کہا کہ اس کا مقصد ہندوستانیوں کی توہین کرنا نہیں تھا اور اسی لیے اس نے مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹیوں اور گورنمنٹ کے درمیان صلاح و مشورہ کی گنجایش رکھ دی ہے۔

برکن ہیڈ کی طاقت لسانی نے دارالامرا کی متفقہ تائید حاصل کر لی لیکن ہندوستان میں اس کا الٹا اثر ہوا۔ یہاں کمیشن سے عدم تعاون کا ارادہ اور مضبوط ہو گیا۔ ہندوستانیوں کو یہ بات بہت تعجب انگیز معلوم ہوئی کہ صرف برطانوی مدبروں کو یہ حق کیسے پہنچ گیا کہ وہ یہ طے کریں کہ ایک باہری حکومت ایسے دستوری قوانین کا خاکہ بنائے اور انہیں منظور کر کے نافذ کرے جن کے تحت ہندستانیوں سے امید کی جائے کہ وہ قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کے تمام امور جن کا تعلق ان کی اپنی حکومت سے ہوگا انہیں کے کہنے کے مطابق سرانجام دیں اور اپنی سوسائٹی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے تحت حکومت انہیں قوانین کو منطبق کرے، انہیں کے مطابق انتظام کرے یا انہیں میں کچھ تبدیلیاں کر لے۔ گاندھی جی نے آئرلینڈ کا ذکر کیا تھا کہ اس کی مثال سامنے رکھنی چاہیے کیونکہ ہندستان میں بھی صورت حال ویسی ہی تھی۔ آخر اَرون کی پارٹی نے جیسا کچھ آئرلینڈ کے لیے کیا وہی یہاں کیوں نہ کیا جائے؟

قدامت پسند (کنزرویٹو) پارٹی کے لیڈروں نے لیبرل آئرش ہوم رول بل 1912ء کی سخت مخالفت کی تھی اور السٹر کے پروٹسٹنٹ لوگوں کو برطانیہ کے خلاف ایک شدید جذبے کے ساتھ عدم تعاون سے مقابلہ کرنے کا سبق پڑھایا تھا۔ بونر لا نے 27/جولائی 1912ء کو ایک بہت بڑے مجمع کو بلن ہائم محل میں خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے:

''میری رائے میں اگر اس ملک کے لوگوں کی واضح رائے لیے بغیر کوئی کوشش کی گئی اور پارلیمانی سودے بازی سے کام لے کر ان لوگوں (السٹر والوں) کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کر دیا گیا تو وہ اپنی پوری طاقت سے جس میں جنگ بھی شامل ہے مقابلہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔'' 1

برکن ہیڈ جو کارسن کا پر جوش حمایتی تھا اور آرینج مین 2 لوگوں کو بغاوت پر اکسانے، ظالمانہ حکومت کرنے اور قدامت پسند پارٹی کا روشن چراغ تھا، آخر کار ان چار نمایندوں میں شامل ہو جانے پر تیار ہو گیا تھا جنھوں نے متحدہ گورنمنٹ کی طرف سے اکتوبر سے دسمبر 1921ء تک ڈی ویلرا کے نمایندوں مسٹر گریفیتھ اور مسٹر کالنس سے گفت وشنید کی تھی اور اپنے دستخط اس دستاویز پر کر دیے تھے جس کو ''شرایط راضی نامہ برائے صلح'' کہتے ہیں اور جس میں آئرلینڈ کو آزاد ملک تسلیم کر لیا گیا تھا۔

لیکن برکن ہیڈ اور ہندوستان کی گورنمنٹ ہندوستان کو ایک جداگانہ معاملہ سمجھتے تھے اور ہندوستان کے انسانوں کو آئرلینڈ کے انسانوں سے مختلف۔ گلیڈ اسٹون کی یہ ساری وکالت ان کے لیے بیکار تھی کہ'' آزادی ہی لوگوں کو آزادی کے قابل بناتی ہے۔ یہ قضیہ سیاست کے دوسرے قضیوں کی طرح اپنے حدود رکھتا ہے لیکن یہ اس قضیے سے بہتر اور مناسب تر ہے جو اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ انتظار کرو (آزادی دینے میں) تاوقتیکہ وہ لوگ آزادی کے قابل نہ ہو جائیں'' 3

لیکن ہندوستان کے حکمرانوں نے ہندوستان کے مسئلے کو مخالف رخ سے دیکھا۔

---

1 دوسرے ارل آف برکن ہیڈ نے ''سوانح حیات ایچ ای اسمتھ (پہلا ارل آف برکن ہیڈ)'' میں اس کا حوالہ دیا ہے ص 215

2 آئرلینڈ کی سیاسی انجمن جو پروٹسٹنٹ مسلک کو فروغ دینے کے لیے 1795ء میں قایم ہوئی تھی۔

3 بحوالہ آر کوپ لینڈ، انڈین پرابلم حصہ اول ص 54 (لائف آف گلیڈ اسٹون از جے مارلے) جلد سوم ص 58

وہ لے دے کے بس یہی دلیل اس سلسلے میں پیش کرتے تھے کہ ہندوستان کا موازنہ آئرلینڈ یا مصر سے نہیں کیا جاسکتا۔ ونٹرنن یہ حجت پیش کرتا تھا کہ مصر میں صرف ایک ہی مذہب کا غلبہ ہے اور جو سب لوگوں کو برابر سمجھتا ہے۔ آئرلینڈ میں دو مذہبی فرقے ہیں لیکن ان کے اختلافات میں ایسی شدت کبھی پیدا نہیں ہوتی جیسی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے۔ لیکن یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا برطانیہ واقعی ہندوستان کو خودمختاری دینا چاہتا تھا؟ مارلے اور کریوے نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ان کے جانشین مانٹیگو، پیل، اولیور اور برکن ہیڈ ایسے صاف گو اور منہ پھٹ نہیں تھے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ 20/اگست 1917ء کے اعلانیہ کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں لیکن پوری حکومت کی ذمہ داری سونپ دینا ان کے خیال میں سب سے آخری منزل تھی، بہت دور افتادہ جہاں تک "وقت آنے پر" مختلف مرحلوں میں پہنچا جاسکتا تھا اور ان مرحلوں کو برطانوی پارلیمنٹ طے کرتی جب وہ دیکھتی کہ ہندوستانی اب کچھ اور آگے بڑھنے کے قابل ہوگئے ہیں اور وفاداری کے ساتھ ان مالکوں کی ہدایات پر عمل کرر ہے ہیں جنہوں نے انسانی ہمدردی کے تحت ان کو تربیت دینے کا فرض اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

لیکن اس نام نہاد تربیت دینے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پسندیدہ کام یعنی حکومت خوداختیاری کی بنیادوں ہی کو تباہ و برباد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ اس قسم کی حکومت قایم کرنے کے لیے بنیادی شرط ہندو مسلم اتحاد ہے لیکن پبلک کے سامنے انکار کے باوجود[1] یہ حقیقت ہے کہ ان کی پالیسیوں سے ہندو اور مسلمانوں

1۔ دیکھو دارالامرا میں مباحثہ، مورخہ 28/جولائی 1926ء قدامت پسند پارٹی کے برکن ہیڈ، لبرل پارٹی کے ریڈنگ اور لیبر پارٹی کے اولیور نے گورنمنٹ کو 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'، کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا۔

کے درمیان اختلافات بڑھ رہے تھے اور برطانوی لوگ بخوبی جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کو یہ کہہ کر بدنام کرتے تھے کہ یہ ایک ہندوؤں کی تنظیم ہے اور برطانوی حکومت کی دشمن ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنی سلطنت کا پکا دوست سمجھتے تھے جن سے دوستی کر کے وہ کانگریسی منصوبوں کو ناکام بنا سکتے تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور گورنر جنرل کے درمیان مراسلت سے، جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے، اس بات کا بہت کافی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اولیور نے جو خط ٹائمس میں شایع کرایا تھا اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اگرچہ دارالامرا میں جب برکن ہیڈ اور ریڈنگ نے اس سے اس بیان کے متعلق باز پرس کی تو اس نے طرح طرح سے اپنی صفائی پیش کر کے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔[1]

اس سلسلے میں ایک مسلمان مصنف کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب سے ایک اقتباس دنیا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ کس طرح 1927ء میں وہ سہارن پور کے کلکٹر گرانٹ سے ملے اور اس سے کونسلوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ گرانٹ جداگانہ نمایندگی کا حامی تھا اور اس کا کہنا یہ تھا کہ صوبے کا لفٹننٹ گورنر، میرس بھی یہی رائے رکھتا تھا۔ جب وہ اپنی ملاقات کے بعد اپنے مسلمان دوستوں سے ملا تو ان لوگوں نے اسے بتایا کہ گرانٹ نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ جداگانہ نمایندگی کے حق میں جلسے کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے بہت جلسے کئی ضلعوں

---

1. ہندوستان کے مسئلے پر جب بحث ہو رہی تھی تو برکن ہیڈ نے اپنی تقریر میں اولیور کے اس خیال کا حوالہ دیا تھا جو ٹائمس اخبار میں ایک خط کی صورت میں شایع ہوا تھا کہ ہندوستان کی حکومت اور اس کے افسران مسلمانوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ ریڈنگ نے یہ خط پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا ''مجموعی طور ان برطانوی افسروں میں جو ہندوستان میں ہیں مسلمانوں کے حق میں وافر جانب داری کا ایک میلان پایا جاتا ہے۔'' اولیور نے صفائی دی: ''میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ میں نے لکھا اس میں کوئی ایسی بات تھی جس سے یہ مطلب نکل سکتا تھا کہ میرے نزدیک کسی برطانوی افسر نے کسی فساد کو بھڑکایا ہے۔''

میں کیے گئے۔[1]

3- ہندوستان میں کمیشن کا کام

سائمن کمیشن کو اگرچہ پہلے سے خطروں کی اطلاع مل گئی تھی لیکن ارون کی یقین دہانیوں کے پورا ہونے کی امید میں 3/فروری 1928ء میں یہ کمیشن بمبئی میں وارد ہوا۔ اس نے ہندوستان کے دو دورے کیے۔ پہلے دورے میں جو کہ 3/فروری سے 31/مارچ تک رہا، اس کا اصلی کام ان کاغذات کی جانچ پڑتال کرنا تھا جو کہ حکومت ہند نے انتظام حکومت ہند کے مختلف پہلوؤں کے متعلق تیار کیے تھے۔ اس کے علاوہ خود کمیشن نے اپنے کام کی اور اپنے طریق کار کی وضاحت کی کوشش کی تا کہ معلوم رہے کہ وہ کس طرح کام انجام دینا چاہتا ہے۔ اس وضاحت کو اس نے اس لیے ضروری سمجھا تا کہ جن غلط فہمیوں کی بنیاد پر ہندوستانی مخالفت پر آمادہ ہیں وہ دور ہو جائیں۔

گرمیوں کے مہینے انگلستان میں گزارنے کے بعد یہ کمیشن 11/اکتوبر کو پھر ہندوستان واپس آیا اور سارے ملک میں لمبے دورے شروع کیے تا کہ ان انجمنوں، افراد اور صوبائی افسروں کی شہادتیں قلم بند کرے جو اپنے خیالات پیش کرنا چاہتے تھے یا تحریری یادداشت کے نکات سے متعلق اپنی تشریحات دینا چاہتے تھے۔

یہ دورہ پونا سے شروع ہوا اور دہلی پر تمام ہوا۔ کمیشن نے مدراس، لاہور، کراچی، پیشاور، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ، شیلانگ، رنگون اور ناگ پور میں اجلاس کیے۔ آخر میں یہ دہلی واپس آیا جہاں 21/مارچ 1929ء سے 4/اپریل تک اس نے حکومت ہند سے بحث و مباحثے کیے اور 13/اپریل کو یہ انگلستان واپس ہو گیا۔ کمیشن اپنے دورے کے درمیان جہاں جہاں شہادت لینے اور گواہوں سے جرح کرنے کے لیے رکا وہاں

1۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری (اردو) ص 419

مرکزی کمیٹی اور صوبائی کمیٹی کے ان ممبران کے ساتھ ملاقاتیں کیں جنہیں صوبے کی کونسل نے مقرر کیا تھا۔ انگلستان میں مرکزی کمیٹی کے ممبران بھی پہنچ گئے اور 19 ر جون سے 30 ر جولائی تک ان لوگوں نے کمیشن سے تبادلہ خیال کیا اور غور و خوض میں حصہ لیا۔ طے شدہ قاعدے کے بموجب ہندوستانی مرکزی مجلس قانون ساز کی مرکزی کمیٹی اور قانونی کمیشن کی رپورٹیں الگ الگ تحریر کر کے پارلیمنٹ کو پیش کی گئیں۔

مرکزی کمیٹی نے اپنی رپورٹ 29 ر دسمبر 1929ء کو پیش کی اور کمیشن کی رپورٹ پر جو دو حصوں جائزہ اور سفارشات پر مشتمل تھی، 12 ر مئی اور 27 ر مئی 1930ء کو دستخط ثبت ہوئے لیکن قبل اس کے کہ رپورٹ مکمل طور پر تیار ہو، گورنمنٹ کے فیصلوں اور 31 ر اکتوبر کو وائسرائے کے اعلان نے صورت حال خاص حد تک بدل دی۔ کمیشن کی تقرری کے وقت جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا، ہندوستان کے لوگوں کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس میں ضروری ترمیم کر دی گئی۔ اس سے ان لوگوں کی رائے بہت زیادہ متاثر ہوئی جو کمیشن کی مخالفت کر رہے تھے۔

اَروِن کا بیان جس کو اس وقت تاریخی اہمیت دی جاتی تھی اس وقت تیار کیا گیا تھا جب وہ انگلستان گیا تھا اور لیبر گورنمنٹ سے جو جون 1929ء میں برسر اقتدار آچکی تھی تبادلہ خیال اور بحث و تمحیص کر لی تھی۔ اس کا خاص مقصد ان سیاسی پارٹیوں کو راضی کرنا تھا جنہوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا۔ نیز حکومت کے منصوبوں میں ان کا تعاون حاصل کرنا تھا تا کہ پارلیمنٹ میں قانون سازی کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اس بیان میں پارلیمنٹ کے اس حق کی توثیق کی گئی تھی کہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ پر وہی کسی فیصلے پر پہنچ سکتی ہے لیکن ایسے حل پر پہنچنے کی اہمیت بھی اب تسلیم کر لی گئی جس کو ہندوستان سیاسی پارٹیاں بھی منظور کر لیں۔

اس کے بعد اس میں گورنمنٹ کے دو اہم فیصلوں کا اعلان بھی تھا یعنی (1) ایک

گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ہندوستان کے نمایندے ہز میجسٹی کی حکومت سے صلاح ومشورہ کریں گے اور جتنا زیادہ سے زیادہ ممکن ہوسکے اتفاق رائے سے تجاویز کو آخری مکمل شکل دی جاسکے جنہیں گورنمنٹ پارلیمنٹ میں پیش کرے گی۔ اس کے بعد اس راضی نامے کے شرایط ایک بل کے خاکے کی صورت میں مرتب کیے جائیں گے۔ اس بل کو مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی ہندوستانی مجلس قانون ساز کے نمایندوں کے ساتھ مل کر جانچے گی اور پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش کردیا جائے گا۔(2) ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کا مطمع نظر واضح طور پر بیان کردیا جائے گا یعنی یہ کہ 1917ء کے اعلان کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان کی دستوری پیش رفت کا فطری انجام درجۂ نوآبادیات حاصل کرلینا تھا۔

یہ نیا طریقہ کار اس لیے اختیار کیا گیا کہ ہندوستانیوں کا یہ اعتراض کہ انہیں دستور ہند کے ترتیب دینے میں برطانیہ والوں کے برابر درجہ نہیں دیا گیا دور ہوجائے۔ گول میز کانفرنس کی تجویز سے جس میں ہندوستانی نمائندے اور برطانوی مندوبین پہلو بہ پہلو بیٹھیں گے یہ شکایت دور ہوجائے گی۔ درجۂ نوآبادیات کا اعلان ذرا مبہم تھا اور پارلیمنٹ میں بحث ومباحثے کے باعث اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن ہندوستان نے اس اعلان کے اپنے طور پر کچھ اور ہی معانی لیے۔ انہوں نے یہ سوچا کہ گول میز کانفرنس میں درجۂ نوآبادیاتی رپورٹ کی بنیاد پر بحث ومباحثہ ہوگا اور چند ضروری ترمیمات پر فریقین کی رضامندی کے بعد منزل مقصود جلد حاصل ہوجائے گی۔ لیکن ان کی امیدوں کا یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ جانے والا تھا۔

بہرحال گول میز کانفرنس میں جن مسائل پر بحث ہونا تھی ان میں سے سائمن کمیشن کی رپورٹ کے متعلق تو تکملے سے پیشتر ہی گویا یہ فیصلہ ہوگیا کہ اسے یکسر مسترد کردیا جائے گا۔ فطری طور پر اس سے سائمن کو بڑا دکھ پہنچا اور اس نے بہت سختی کے

ساتھ ارون پر اعتراض کیا کہ انہیں بغیر ان کی منظوری کے اس قسم کا اعلان کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ لیکن اس وقت لیبر پارٹی کی حکومت جس کا سربراہ ریمزے میکڈانلڈ تھا برسر اقتدار تھی۔ (جون 1929ء تا اگست 1931ء) اس نے ارون کے اعلان کی حمایت کی۔

اس لیے اب یہ ضروری تو نہیں ہے کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے لیکن تینوں پارلیمانی پارٹیوں کی اس یکسر انگریز جماعت کی آراء سے جو دستاویز مرتب ہوئی ہے، وہ برطانوی حکمراں طبقے کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے ایک بڑی کارآمد کلیدی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر لینا چاہئے۔

4- سائمن کمیشن کی رپورٹ

رپورٹ کی تمہید میں ممبران کمیشن بیان کرتے ہیں کہ "اس لیے ہم اس کام کو اس مفروضے کی بنیاد پر شروع کر رہے ہیں کہ وہ مقصد جس کی مسٹر مانٹیگو نے وضاحت کر دی ہے وہی تسلیم شدہ پالیسی ہے جس پر ہم کو چلنا ہے اور یہ کہ صرف وہی تجاویز قابل غور ہوں گی جو 20/اگست 1917ء کے اعلان کی اسپرٹ میں سوچی اور پیش کی گئی ہوں۔"

یہ بات طے کرنے کے لیے کہ ایک ذمہ دار حکومت قایم کرنے کے اصول کو کس حد تک بروئے کار لانا پسندیدہ ہوگا، یہ ضروری تھا کہ اس بات کی جانچ کر لی جائے کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے ضروری حالات کہاں تک موجود ہیں۔

حکومت خود اختیاری کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں ایک مشترک سیاسی نظام کے تحت مل جل کر رہنے کا ارادہ ہو اور غور و خوض کے بعد یا اسے تسلیم کرنے کے بعد اس نظام کو قایم رکھنے اور اندرونی نیز بیرونی خطرات سے اس کی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کی خواہش ہو۔ اس کے لوگوں میں ایسی

خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت ہو جن میں پورے ملک کے بجائے صرف کسی ایک خاص فرقے کو فائدے حاصل ہوتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اتحاد اور یگانگت کا شعور اتنا مضبوط اور راسخ ہو کہ جب تمام لوگوں کی فلاح و بہبود کے مقابلے میں صرف چند اجزا فائدے اٹھانا چاہتے ہوں تو اس جذبے کی روک تھام کر کے اس پر قابو پالے۔ اسی شعور کو قومیت کا صحیح جذبہ کہتے ہیں۔ نسل، مذہب، زبان، تہذیب اور روایات صرف اس کی مدد کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ قومیت کی ضروری شرطیں نہیں ہیں۔

اس بات کی تحقیقات کرنے کے لیے کہ ایسا شعور ہندوستان میں موجود تھا یا نہیں کمیشن نے ہندوستان میں چودہ ہزار میل سفر کیا اور متعدد لوگوں سے ملاقات کی۔ لیکن یہ تحقیقات کارآمد ثابت نہ ہوئی کچھ تو اس لیے کہ کمیشن کے ممبران میں ذاتی کمزوریاں تھیں اور کچھ اس لیے کہ جن لوگوں کی شہادتیں لی گئیں ان کا نقطہ نظر کچھ اور ہی تھا۔ کمیشن کے ممبران جس سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، وہ ذہنی اور ثقافتی اعتبار سے بمقابلہ ہندوستان کے ایک ہم آہنگی رکھتی تھی۔ سائز اور تعداد میں اگرچہ چھوٹی تھی لیکن تنظیم کے لحاظ سے بہت مربوط تھی۔ اس لیے فطری بات تھی کہ ان چھوٹی نظر رکھنے والے یک رنگ لوگوں کو ہندوستان کی صدرنگی دیو قامت نظر آئے۔ اس لیے ان کو ہر چیز یہاں کی بہت بڑی، وسیع اور عظیم نظر آئی۔

دوسری طرف ہندوستان میں جن لوگوں کی شہادتیں ان کے سامنے گزریں وہ خاص طبقے یا فرقے کے مفادات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مثلاً مسلمان اور فرقہ پرور ہندو، غیر برہمن، مرہٹے اور اچھوتوں کے نمایندے، یوروپین، اینگلو انڈین، عیسائیوں اور سکھوں کے وکلا یا زمیندار، مزدور اور دیگر مفاد پرست، ظاہر ہے کہ یہ مخصوص طبقات کے گروپ تنہا یا مجموعی طور پر اس اتھاہ اور مستقل، حال اور مستقبل کے ہندوستان کے سارے لوگوں کی مادی اور اخلاقی بہبود کی نمایندگی نہ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے فطرتاً

اپنے اپنے علاحدہ مطالبات پر زور دیا اور اس کا لحاظ بالکل نہ کیا کہ بحیثیت ایک کل ملک کے کیا فرائض ہیں۔ ایک موقع پر تو کمیشن کے چیرمین کو ایک فرقہ وارانہ وفد کے حد سے زیادہ اور نازیبا مطالبات پر سرزنش کرنا پڑی۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پرجوش طریقے پر پیش کی ہوئی وکالت نے کمیشن کے اپنے اصلی میلانات کو اور تقویت دی ہوگی خصوصاً جب ان یک طرفہ مطالبات کی گورنمنٹ کے بہت سے افسروں نے بھی حمایت کی تھی۔

لیکن کمیشن نے ایک سرسری کوشش اس بات کی بھی کی کہ معاملے کے دوسرے رخ کو معلوم کرے۔ اس نے نہرو رپورٹ کا مطالعہ کیا جس میں کانگریس کا نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا تو وہ دو اور مخالفین کی صفوں کو بھی نظر انداز نہ کر سکے جن کا اس معاملے سے تعلق تھا یعنی نیشنلسٹ پارٹی جو مجلس قانون ساز میں بحیثیت حزب مخالف بہت کامیاب رہی تھی اور وہ سیاسی لیڈر جن کی اپیل پر ملک بھر میں پبلک نے مظاہر کیے تھے کہ وہ کمیشن کو نہیں مانتے اور جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے اس بالادستی کے دعوے کو مسترد کرتے ہیں کہ صرف وہی ہندوستان کی صلاحیت کی جانچ کر سکتی ہے اور صرف اسی کو اختیار ہے کہ وہ ہندوستان کے مطالبۂ حکومت خود اختیاری پر فیصلہ دے۔ ایک نابینا شخص بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ جماعتوں اور فرقوں میں سب حکومت کی منتقلی کے سوال پر بے حد متفق تھے۔

ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ کمیشن ایک تذبذب اور شک وشبہہ کی حالت میں رہا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ آگے بڑھے یا پسپا ہو جائے۔ اس نے یہ تو اچھی طرح جان لیا کہ ہندوستان میں ''ایک روز افزوں ہندوستانی قومیت کا احساس تھا...... خواہ اس میں خامیاں کچھ بھی ہوں اور اس کے مظاہرے خواہ کتنے ہی ناپسندیدہ ہوں لیکن آج کے ہندوستانی معاشرہ میں یہ ایسی طاقت نظر آتی ہے جس میں شاید ایسی قوت بھی

ہو جوان تمام گہرے اور خوفناک شگافوں کو پر کر سکے جو امن کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔"[1]

لیکن شکوک اس پر بھی قایم تھے " طبقاتی مفادات، نسلی، مذہبی، ذات پات اور صوبائی، اب بھی زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کی قوتوں اور جوش کو سلب کر رہے تھے اور اب بھی بہت کم آثار پائے جاتے تھے کہ وہ لوگ رفاہ عامہ کی خاطر اپنے مفادات سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن بغیر اس دستبرداری کے کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ شہریت کا صحیح احساس پیدا ہو سکے گا۔" پھر بھی " ہندوستانی قومیت ایک ایسا مظاہرہ تھا جس کو برطانوی ہند یا ریاستوں کے حکمران نظر انداز نہیں کر سکتے تھے" [2]

ان خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کس بات کی امید کی جاسکتی تھی؟ اور ایسے مسائل جیسے حکومت کی ساخت، مجلس قانون ساز میں لوگوں کی نمایندگی، وزارت سازی اور ان کے اختیارات کو تفویض کے متعلق کیا سفارشیں کی جاسکتی تھیں؟ طبقہ واری میلانات کے دفعیہ اور ایک صحیح قومیت کے جذبے کو بیدار کرنے کے لیے کیا تجاویز پیش کی جاسکتی تھیں؟

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ تو فرقہ وارانہ نمایندگی کے سوال پر فیصلہ کن رپورٹ تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ " ہم آخر میں کسی تامل کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری کی تاریخ ان قوموں میں جنہوں نے اسے حاصل کیا اور اسے تمام دنیا میں پھیلایا حتمی طور پر اس بات کیخلاف رہی ہے کہ کوئی حکومت منقسم وفاداریوں کو برداشت کر سکے یعنی کوئی حکومت اپنے ممبروں کو اس طرح مرتب نہیں کرتی کہ کسی صورت سے ان میں یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ اپنے آپ کو بجائے کل ملک کے کسی جزو کا شہری سمجھنے لگیں" [3]

1۔ انڈین اسٹیٹوٹری کمیشن۔ جلد دوم۔ ص 12، پیرا 19

2۔ ایضاً

3۔ ہندوستانی قانون اصلاحات کی رپورٹ۔ ص 111، پیرا 228

آگے بیان جاری رکھتے ہوئے لکھا تھا" اپنے ملک سے محبت کرنے والے ہندوستانی اس بات کو سب سے پہلے مان لیں گے کہ ہندوستان میں شہریت کا جذبہ عموماً ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور ہم لوگ اگر اس کو حکومت خود اختیاری تک پہنچا دیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم ہر ممکن کوشش سے ان لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرا دیں۔ مذاہب اور طبقات کی تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے مقابل سیاسی کیمپ نصب ہو جائیں گے اور لوگوں کو شہریت کے بجائے فرقہ واریت کی تعلیم دیں گے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ طریق قومی نمایندگی کی صورت کب اور کیسے اختیار کر سکے گا"1

جب کمیشن فرقہ وارانہ نمایندگی کے موافق اور مخالف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا سابق سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر اولیور نے اپنے ایک مضمون میں جو انہوں نے رسالہ Contemporary Review میں شایع کرایا تھا اس طریقہ کار کے متعلق بہت سخت الفاظ میں متنبہ کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

" فرقہ وارانہ نمایندگی کا طریقہ کسی دستور میں شامل کرنا اسکی اچھی اور قابل اطمینان کارکردگی کے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ یہ ایک ظاہر اور مسلم حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ طریق انتخاب ان ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ رقابتوں اور جھگڑوں کو بھڑکاتا اور ہوا دیتا ہے جن کے سیاسی مفادات ان تمام معاملات میں جو گورنمنٹ کی مشینری سے متعلق ہیں فرقہ واریت سے پاک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مصلحت بذات خود بیکار رہوتی ہے۔" 2

اصولاً تو کمیشن مانٹیگو اور چیمسفورڈ سے متفق تھا۔ انہوں نے لکھا:" مشترکہ رپورٹ کے مصنفین کے قول کے مطابق فرقہ وارانہ انتخاب جماعتی امتیازات کو ہمیشہ

---

1 ہندوستانی قانون اصلاحات کی رپورٹ۔ ص 111، پیرا 228

2 انڈین سالانہ رجسٹر، 1927، جلد دوم ص 74 میں Contemporary Review مئی 1927 سے حوالہ دیا گیا۔

کے لیے قایم کر دیتا ہے اور باہمی تعلقات کو رسمی بنا دیتا ہے اور یہ بات حکومت خود اختیاری کے اصول کے نشو ونما میں بری طرح سے حارج ہوتی ہے۔ اگر ایسے خیالات رکھنا بدظنی سمجھا جائے تو ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔"[1]

فرقہ وارانہ نمایندگی کے خلاف لاجواب کرنے والے دلائل کے باوجود کمیشن اس نتیجے پر پہنچا:

"ہماری متفقہ رائے ہے کہ کسی صوبے کے مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ نمایندگی ضرور باقی رہنا چاہیے اور مسلمان ووٹروں کو اس خصوصی تحفظ سے محروم نہ کرنا چاہیے"[2]

ان کے نزدیک "فرقہ وارانہ نمایندگی کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک مسئلہ ہے جسے مخالف فرقوں کو خود آپس میں طے کرنا چاہیے"[3]

ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے جس قسم کے حق رائے دہندگی کے انتظامات نہایت ضروری تھے ان کی سفارش دیدہ ودانستہ نہیں کی گئی۔ اس کے کیا اسباب تھے؟ قبل اس کے اس سوال کا جواب دیا جائے ضروری ہے کہ کمیشن نے اس کے جو اسباب بتائے ہیں انہیں جانچ لیا جائے۔

ان کی پہلی دلیل یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے مسلمانوں سے جو عہد و پیمان کیے تھے ان سے روگردانی نہیں کی جاسکتی تھی۔ مارلے اور منٹو نے 1909ء میں اور مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے 1919ء میں ان وعدوں کو قوانین پارلیمنٹ میں شامل کر لیا تھا اور قانونی کمیشن ان باضابطہ اور اہم وعدوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور اگر کرے تو مسلمانوں کو دلی تکلیف پہنچے گی اور پھر اندیشہ ہے کہ وہ کہیں حکومت کے لیے سخت

---

1. انڈین اسٹیچوٹری کمیشن رپورٹ۔ جلد 2، ص 56، پیرا 69

2. ایضاً۔ ص 60 پیرا 72

3. ایضاً

دقتوں کی صورت حال نہ پیدا کر دیں۔

اس دلیل کا پہلا جز وقطعی فضول ہے کیونکہ ہندوستان میں برطانوی راج کی تاریخ اقرارناموں سے انحراف اور معاہدوں سے روگردانی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ وعدے، معاہدے اور اعلانات —خصوصی اور عمومی— ان حاکموں نے جب جی چاہا بھلا دیے یا جب مناسب سمجھا حرف باطل سمجھ کر مٹا دیے...... کیا اس وقت کبھی مسلمانوں کی ناراضگی کا خوف برطانوی پالیسی پر اثرانداز ہوا؟

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ حال ہی کی تاریخ کو پیش نظر رکھیے۔ تقسیم بنگال کی مثال موجود ہے جو مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود کالعدم قرار دی گئی۔ خلافت کی بحالی کے لیے اس قدر پرجوش ہنگامے ہوئے جس کی مثال نہیں ملتی اور باوجودیکہ اس میں غیر مسلم بھی شامل تھے مگر کوئی پروا نہیں کی گئی۔ ترکی کے ساتھ برطانوی پالیسی پر کوئی اثر نہ پڑا۔

اور پھر جب یہ مان لیا گیا ہے کہ فرقہ وارانہ نمایندگی خود مسلمانوں کے حق میں بالآخر مفید ثابت نہ ہوگی تو پھر اسے قبول کرنے کے لیے یہ کوئی معقول سبب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری دلیل یہ دی گئی کہ کانگریس 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ میں اسے تسلیم کر چکی ہے۔ یہ بھلا دیا گیا کہ کانگریس کا یہ وقتی سہو تھا جو اس بات سے ثابت ہے کہ 1909ء سے لے کر 1916ء تک اور اس کے بعد نہرو رپورٹ 28-1927ء میں جداگانہ فرقہ وارانہ نمایندگی کی برابر مذمت کی گئی۔ 1927ء میں مسلم لیگ کے ایک بڑے طبقے نے جس کی سربراہی جناح کر رہے تھے جداگانہ نمایندگی سے دستبرداری کے لیے تیاری کر لی تھی اگر اس کی چند شرطیں پوری کر دی جاتیں۔

کمیشن نے کئی صوبائی کمیٹیوں کے دیے ہوئے مشوروں پر بھی اعتماد کیا جنہوں

نے اس طریقے کو تسلیم کر لیا تھا۔ مرکزی کمیٹی کی رائے ان کے قطعی خلاف تھی لیکن اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

کمیشن اس بات سے متاثر تھا مسلمان اپنے مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کے متعلق خوف زدہ تھے اور فطری طور پر وہ ان کے تحفظ کے لیے بے چین تھے۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ دستور میں اس امر کی ضمانت دی جائے کہ ان کے حقوق میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

اس خوف کی وجہ کیا تھی؟ اور کیا جداگانہ انتخاب اس کا صحیح علاج تھا؟ تحفظ یا عدم تحفظ کے احساسات کا دار و مدار کچھ تو کسی ملک کے رہنے والے مختلف فرقوں کے تعلقات پر ہوتا ہے لیکن دراصل حکومت کے طریق کار اور رویّے کے بموجب یہ اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کسی طولانی بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی حکومت کے طریقۂ انتظام، اس کی پالیسیاں اور اس کے قوانین ہی رعایا کے خیالات اور طریق عمل کو متعین نہیں کرتے بلکہ حکومت کے بالواسطہ اور بلا واسطہ اثرات بھی جو بہت وسیع اور قوی ہوتے ہیں، عموماً جب رعایا کے مختلف طبقے حکومت کی خوشنودی اور نوازشات حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں تو یقیناً اس سے خوف وحسد، امیدیں اور توقعات پیدا ہو جاتی ہیں۔

تمام دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی مختلف جماعتیں اور فرقے بستے ہیں جن کے مذاہب، تہذیبی روایات اور مفادات مختلف ہیں لیکن ضروری نہیں کہ یہ اختلافات ہر ملک میں عدم اعتماد اور دشمنی ہی پیدا کریں۔ پھر ہندوستان ہی میں ایسا کیوں ہو؟

ہندوستان کے تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ زمانۂ وسطیٰ میں اس قسم کی مذہبی جنگ کوئی نہیں ہوئی جیسی کہ یوروپ میں سولھویں اور سترھویں صدی میں ہوئیں۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں بھی اگر کبھی مذہبی تعصب رونما ہوا اور کبھی ایسے جھگڑے ہوئے تو بھی اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ فرقوں کے درمیان عام طور سے بدظنی اور عدم اعتماد پھیل گیا ہو۔ سیاست میں جو کہ حکومت کے حلقۂ اعتیار کی چیز تھی کوئی گنجایش ہی کسی مقابلے یا رقابت کی نہ تھی کیونکہ عہدِ وسطیٰ میں سیاست صرف ایک تنگ حلقہ امرا تک محدود تھی۔

اُمرا کا سردار مذہبی معاملات کے بجائے دنیوی امور مثلاً وصولی لگان اور فوجی تنظیم وغیرہ سے زیادہ سروکار رکھتا تھا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ وہ ایک تنگ نظر شہنشاہ تھا جس نے سختی سے شریعت کے اصولوں کے مطابق حکومت کرنا چاہی۔ اس کے علاوہ وہ شکی مزاج کا بھی تھا لیکن اس کے افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عدم اعتمادی ہندو اور مسلمان افسران دونوں کے ساتھ برابر تھی۔ باغیوں اور حکومت کے دشمنوں کے خلاف اپنی جنگوں اور مہمات میں وہ ساتھ ساتھ ہندو اور مسلمان سپہ سالار مقرر کرتا تھا۔ شیوا جی کے خلاف جو فوج اس نے بھیجی اس کا سپہ سالار راجہ جے سنگھ راجپوت تھا اور مرہٹہ سردار بھی مرہٹوں کے خلاف لڑے تھے۔ وہ مغل، افغان، تورانی اور ایرانی فوجی افسروں کے ساتھ ساتھ، شانہ بہ شانہ دکن کی مسلمان بادشاہتوں نیز شمالی مغربی سرحدوں پر دشمن مسلمان فوجوں سے لڑے۔

چھ سو سال کی تاریخ میں جب یہاں مسلمان حاکم تھے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ ہندو اکثریت کے خیال سے مسلمان کبھی خوف زدہ ہوئے ہوں۔ صرف احمد شاہ ابدالی کی ایک تنہا مثال کو چھوڑ کر اور کوئی مثال نہیں ملتی کسی مسلمان حکمراں نے ہندوستانی لوگوں پر اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ہندوستان سے باہر کے کسی مسلمان بادشاہ سے کوئی مدد طلب کرنے یا اس کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کی ہو بلکہ اس کے

برعکس بجائے اس کے وہ ہمسایہ مسلمان ملکوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کریں وہ ایران اور وسط ایشیا کی بادشاہتوں سے مسلسل لڑائیاں ہی لڑتے رہے۔

عدم اعتمادی اور خوف کا عام احساس موجودہ دور کی پیداوار ہے اور بڑی حد تک اس کی ذمہ داری برطانوی حکومت پر ہے۔ دونوں فرقوں کے درمیان جھگڑے بہت پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی ہی نے شروع کروادیے تھے جب وہ ہندوستان میں برطانوی راج کی داغ بیل ڈال رہی تھی۔ اس پالیسی پر برابر عمل درآمد ہوتا رہا۔ صرف انیسویں صدی کے پہلے پچھتر برسوں میں برطانوی لوگ ہندوؤں کی طرف مائل رہے اور مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے رہے۔ اس کے بعد کے پچیس برسوں میں صورت حال اسکے بالکل برعکس ہوگئی۔ خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد ہندو، سلطنت برطانیہ کے حریف سمجھے جانے لگے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں ان کی پالیسی کا خاص مقصد یہ ہوگیا کہ اس مخالف تنظیم کے اثرات کو یہ کہہ کر باطل کردیں کہ یہ صرف ہندوؤں کی تنظیم ہے اور یہ جتا کر اس کی مذمت کریں کہ یہ برطانوی راج اور اس کے نئے متوسلین یعنی مسلمانوں کی دشمن ہے۔

برطانیہ کے خلاف الزام یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اختلافات پیدا کیے بلکہ یہ کہ انہوں نے اختلافات سے سیاسی فائدے اٹھائے تاکہ برطانیہ کے سامراجی مفادات بڑھتے رہیں۔ انہوں نے اختلافات کو ہوا دی خاص کر ان دانش وروں میں جو سیاسی ذہنیت رکھتے تھے اور جو عوام کو ہم رائے بنا سکتے تھے۔

جہاں تک ضرورت مند اور سادہ لوح دانش وروں کا تعلق ہے انہوں نے تنگ نظری سے کام لیا اور اعلیٰ برطانوی افسروں سے گذارش اور مراعات حاصل کر کے ان کے جال میں پھنس گئے اور ان سے ہمیشہ خائف رہے کہ کہیں وہ ان مراعات اور نوازشوں کو ختم نہ کردیں، اس لیے مناقشے اور جھگڑے پیدا کرنے کی ذمہ داری ان پر

بھی برابر آتی ہے۔

لیکن وجوہ کچھ بھی ہوں اور فرقوں اور حکومت کی ذمہ داری خواہ کچھ بھی ہو کمیشن اس بات پر اڑ گیا کہ خوف وہراس اور بغض وکینہ کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کا فرض تھا کہ وہ انہیں دور کرنے کی تدبیریں کریں۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قانون میں اس کی گنجایش رکھی جائے کہ مسلمانوں اور بعض دوسری اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخابات اور نمایندگی برقرار رہے۔

گو یہ ماننا ضروری ہے کہ مسلمان کا خوف صحیح تھا، بہت زیادہ تھا اور بہت لوگوں میں تھا پھر بھی اس کا جو علاج تجویز کیا گیا کیا وہ صحیح تھا؟ یہ بات سب جانتے ہیں کہ قوانین ہوں یا دستور ہو ان سب کا دارومدار متعلقہ لوگوں کی مرضی پر ہوتا ہے۔ جب سماج کے عناصر: جماعتوں یا فرقوں میں خلوص کے ساتھ یہ خواہش ہو کہ وہ قوانین کا احترام کریں گے تو یہ بذات خود اس بات کی ضمانت ہے کہ قوانین کا بول بالا رہے گا اور ان کی خلاف ورزی نہ ہوگی لیکن اس صورت حال کے لیے شرط یہ ہے کہ آپس میں اعتماد اور اتفاق پہلے سے موجود ہو۔ جب فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ایک دوسرے کا لحاظ نہ ہو تو یہ امید رکھنا کہ دستور میں اس کے لیے گنجایش رکھنا کارآمد ہوگا بیکار سی بات ہے۔

ایک نمایشی دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب میں جو اختلافات ہیں وہ یورپی ممالک کے رومن کیتھولک اور پروٹسنٹ فرقوں کے اختلافات کے مقابلے میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اطلاق ہندوستان کی صورت حال پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس پیچیدگی کا حل تقریباً ناممکن ہے۔ یہ دلیل یورپ کی صورت حال سے حیرت انگیز حد تک ناواقفیت ظاہر کرتی ہے۔ یہ کہنا کہ عیسائیوں کے دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ اسلام اور ہندو دھرم

کے اعتقادات اور مذہبی رسوم میں ہیں نا قابل انکار حقیقت ہے لیکن غیر متعلق ہے۔ دراصل جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس احساس کی شدت ہے جو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو حرکت میں لاتی ہے اور آپس کے تعلقات اور برتاؤ کو متعین کرتی ہے۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں اختلافات چاہے جتنے کم کیوں نہ ہوں لیکن سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان، فرانس، ندر لینڈ، جرمنی اور بوہیمیا میں جو خوفناک خوں ریزی اور قتل ہوئے انہیں وہ نہ روک سکے۔ آج ان دونوں فرقوں کے لوگ ساتھ ساتھ انہیں ملکوں میں رہتے ہیں اور اپنے اپنے اعتقادات کے مطابق عبادت کرتے ہیں اور اس سے ان کی سیاسی زندگی متاثر نہیں ہوتی۔

پھر بھی ایک چھوٹی سی ریاست السٹر (آئرلینڈ) میں 72-1970ء میں برطانوی فوج کی موجودگی ہی میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا باوجودیکہ ان دونوں میں مذہبی اختلافات بہت قلیل ہیں۔

پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک میں جتنا اختلاف ہے اس سے کہیں کم شیعوں اور سنیوں میں ہے۔ پھر بھی صدیوں تک دونوں نے ایک دوسرے کے خون کے دریا بہا کر اسلامی تاریخ کو داغ دار بنا دیا ہے۔ آج بھی ان فرقوں کے جھگڑے قتل و غارت کے ہنگامے برپا کر دیتے ہیں۔

اس لیے دو مذہبوں اور تہذیبوں کے درمیان اختلافات کی نوعیت یا کثرت اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ ان مذاہب کے معتقدین کے جذبات کی نوعیت اور شدت۔

مذہبی، لسانی اور ثقافتی اختلافات کی یہ تمام بحث صرف اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا تعلق اس سیاست سے ہوتا ہے جو کسی ملک کی حکومت اختیار کرنی ہے۔ ہر سوسائٹی میں اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ سماجی یکسانیت اور ہم رنگی ناممکن اور ناقابل تصور ہے۔ بعض حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ مخالفتیں یک سو ہو جائیں، یک جہتی

کو فروغ حاصل ہو اور اختلافات کی ہمت افزائی نہ ہو۔ آزاد اور جمہوری قوم کے سیاست دانوں کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ طاقت ہی اندرونی ترقیوں کی ضامن ہوتی ہے اور بیرونی دشمنی کے خلاف سپر کا کام کرتی ہے اور یہ طاقت بنی ہوتی ہے سماجی استحکام اور آپس کی یک جہتی پر۔ یہ لوگ اپنے ملک کے باشندوں میں اسی قسم کے ضروری اور پسندیدہ رجحانات کو ترقی دیتے ہیں لیکن کسی ملک کے بدیشی حکمراں جن کی حکمرانی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی رعایا اس قابل نہ ہو کہ ان کی بالا دستی کو چیلنج کر سکے، یا تو قطعی طور پر اتحاد کی افزائش کے خلاف ہوتے ہیں یا بالکل لاپرواہ بنے رہتے ہیں تا کہ خود اختلافات کی ذمہ داری سے انکار کر کے اسے اپنے رعایا کے سر تھوپتے رہیں۔

کمیشن کے دلائل کے علاوہ یہ مناسب ہوگا کہ مسلمانوں کے مطالبات کا بھی ایک صحیح اندازہ لگایا جائے مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ان کے فرقے کو کونسلوں میں مناسب نمایندگی ملنا چاہئے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے ان میں اور ہندو قوم پرستوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے ووٹروں کی تعداد کی بنا پر ایک قاعدہ بنایا تھا اور اسے مسلم لیگ نے 1916ء میں بمقام لکھنؤ منظور کر لیا تھا۔ نہرو کمیٹی نے یہ تبدیلی منظور کر لی تھی کہ آبادی کے تناسب سے نمایندگی دی جائے۔ مرکز میں اور صوبوں میں اقلیتوں کی تعداد کتنی ہو، اس کے متعلق بھی کوئی ایسی پیچیدگی نہ تھی جو حل نہ ہو سکے۔ 1927ء میں بمقام دہلی مسلم لیگ کانفرنس نے جو شرایط پیش کی تھیں وہ بھی بحث و مباحثے کے بعد طے ہو سکتی تھیں۔

اصلی اختلاف اس پر تھا کہ کیسے نمایندے چنے جا سکیں گے۔ مسلمان یہ کہتے تھے کہ کسی ایسے مشترکہ یا مخلوط الیکشن میں جو ایسے صوبوں میں ہوگا جہاں غیر مسلم ووٹروں

کی کثرت ہے، صرف ایسے مسلمان منتخب ہوسکیں گے جو غیر مسلموں کے لیے قابل قبول ہوں، مسلمانوں کے صحیح نمایندے کامیاب نہ ہوسکیں گے۔

جن اداروں میں ممبر منتخب ہوکر یا نامزد ہوکر آتے تھے وہیں کے تجربات کو پیش نظر رکھ کر یہ نظریہ قایم کیا گیا تھا۔ کرزن کے عہد 1905ء تک گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز میں غیر سرکاری مسلمانوں کی تعداد ناکافی تھی اور یہی صورت حال بعض صوبائی کونسلوں میں بھی تھی۔ بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی یوروپین نمایندوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس کے بعد ہندو تھے اور مسلمانوں کی تعداد صرف ہندوؤں کی چوتھائی تھی اور بعض اوقات تو اس سے بھی کم۔ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بھی مستثنیات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر صورت حال تقریباً ایسی ہی تھی۔ یونیورسٹیوں کے سینیٹ (Senates) میں بھی مسلمانوں کی تعداد برائے نام تھی۔

لیکن صورت حال تبدیل ہورہی تھی اور معاہدۂ لکھنؤ (لکھنؤ پیکٹ) نے یقیناً مسلم نمایندگی کے مسئلے کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ 1929ء میں اس شکایت کا کوئی جواز نہ تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کا اب اس پر اصرار محض گزشتہ کا خمار تھا۔ یہ نظریہ الیکشن کے طریقوں سے ناواقفیت کا اظہار بھی کرتا تھا اور حقیقت پسندانہ بھی نہ تھا اس لیے کہ یہ پہلے سے فرض کرلیا جاتا تھا کہ ان تمام معاملات میں جو کونسلوں کے سامنے آئیں گے مسلمانوں کا نقطۂ نظر غیر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر معاملات میں اختلافات سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر ہوتے ہیں اور بہت ہی کم معاملات میں مذہبی بنیاد پر۔

دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کا یہ نظریہ خود ان کے اپنے نمایندوں میں افسوس ناک حد تک عدم اعتمادی ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے یہ فرض کرلیا تھا کہ جو مسلمان الیکشن لڑے گا وہ آسانی سے خریدا جاسکے گا یا اسے ڈرا یا دبا کر اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنے

پر مجبور کیا جاسکے گا۔ فرقہ پرور مسلمانی لیڈروں کے ذہن میں یہ نہ آیا کہ جداگانہ انتخابات سے مسلمانوں کو یہ موقع نہ مل سکے گا کہ وہ ہندو منتخب ہونے والوں کو متاثر کرسکیں، اس طرح تو ہندو مسلمان ووٹروں سے بے تعلق ہوجائیں گے۔

ایک اور بنیادی اہمیت رکھنے والا انجام جو اس (جداگانہ انتخاب) کا ہوتا اس کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا۔ ایک ذمہ دار حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مربوط انجمن کی طرح کام کرے۔ اس کے پروگرام اور پالیسیاں متفقہ طور پر طے ہوتی ہوں کیونکہ ان وزرا میں جو حکومت کا کاروبار سنبھالتے ہیں اگر اتفاق رائے اور ہم آہنگی پالیسی کے معاملات میں نہ ہو تو حکومت کا عملہ متفقہ طور پر ذمہ دار نہیں رہ جاتا کسی ایسی وزارت کو بہ حیثیت ایک ٹیم کے کام کرنا مشکل ہوتا ہے اگر اس کے کچھ ممبر مجلس قانون ساز کی کسی ایک پارٹی کے وفادار ہوں اور کچھ دوسرے ممبر کسی دوسری پارٹی کے۔ ایسے وزرا کی حکومت نہ تو پائیدار ہوسکتی ہے نہ مؤثر اور نہ صحیح حکمرانی ہی ہوسکتی ہے۔

یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ کمیشن کے ممبران ان باتوں سے ناواقف تھے اور اگر ان سب باتوں سے واقفیت کے باوجود وہ فرقہ وارانہ انتخابی طریقہ کار پر زور دیتے رہے جس سے سوسائٹی منقسم ہوجاتی ہے اور اس کے بنیاد ہی کو مٹا دیتی ہے جس پر ذمہ دار حکومت کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ یعنی ووٹ دینے والوں کا حلقہ، تو ہر شخص یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کمیشن دراصل حکومت خود اختیاری کے حق کو تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے برطانیہ ہی ثالث اعلیٰ بنا رہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندوستانی لیڈر اس نتیجے پر پہنچے کہ کمیشن کا مقصد دراصل وہ نہیں تھا جس کا وہ عام پبلک میں اعلان کرتے تھے یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کو درجہ نو آبادیات کی منزل تک پہونچانے میں رہنمائی کررہے ہیں بلکہ

وہ آنے والی بلا کو ٹالنے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ وقت لگا رہے تھے۔ برکن ہیڈ کو ہندوستان کے مستقبل سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ ہندوستان کی صلاحیتوں میں یقین۔ اس کا عقیدہ تو یہ تھا کہ' ہم کو بنی نوع انسان کے سربراہ بننے کی روز افزوں قدرت حاصل ہے۔''

اس سے پہلے دو دفعہ 1909ء اور 1919ء میں ہندوستان کے ان خود ساختہ امینوں اور ضامنوں نے اپنی نام نہاد ضمانت کا فریب اس طرح دیا تھا کہ انہوں نے ہندوستان پر حکومت خود اختیاری کے بنیادی اصولوں کے بالکل برخلاف نمایندگی کے طریقہ کار کو عاید کر دیا تھا اور جس کے باعث عملی طور پر فرقہ وارانہ مفادات میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی تھی۔

تیسری دفعہ 1929ء میں موقع ملا کہ پہلے کی دونوں غلطیاں درست کر لی جائیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے حکمراں اس موقع پر بھی صحیح طریقہ اختیار کرنے سے باز رہے۔ یہ تیسری فرو گذاشت مہلک ثابت ہوئی۔ سائمن کمیشن نے ہندوستان کی تقدیر سر بہ مہر کر دی۔ یہ صحیح ہے کہ بظاہر تو ان کی رپورٹ میں جتنی سفارشیں کی گئی تھیں ان کو گول میز کانفرنس میں بحث مباحثہ اور تصفیہ کے لیے پیش کیا گیا تھا لیکن رپورٹ پر پارلیمنٹ کی تینوں سیاسی پارٹیوں کے نمایندوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس بات کو وہ متعلقہ پارٹیاں کیسے نظر انداز کر سکتی تھی؟ اس کا اثر انداز ہونا لازمی تھا نہ صرف ان لوگوں کے ذہنوں پر جو گورنمنٹ کی طرف سے (ممبران پالیمنٹ) اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے بلکہ بعض مفاد پرستوں اور اقلیتی گروہوں کے نمایندوں پر بھی۔ کانفرنس اقلیتوں کی نمایندگی کے مسئلے کو حل کرنے میں جن وجوہ سے ناکام رہی ان کا ذکر اگلے صفحات میں آتا ہے۔ اس ناکامی کی بدولت اپنے معاملات اٹھانے اور طے کرنے کا حق ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ والوں کے ہاتھوں ہی میں برقرار رہا۔

5- قانونی کمیشن کی رپورٹ پر ہندوستانی ردعمل

ہندوستانی ردعمل کے تین پہلو تھے (الف) منفی اور ناراضگی جس کے باعث کمیشن کا بائیکاٹ ہوا، احتجاجی جلسے ہوئے اور ستیاگرہ تحریک شروع ہوگئی۔ (ب) فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کرنے کی قرار واقعی کوشش (ج) ہندوستان کا دستور خود بنانے کا جو چیلنج ملا تھا اس کی طرف تعمیری قدم۔

6- بائیکاٹ کی تحریک

16 ر نومبر کو سری نواس آئینگر اور جناح کے بیانات سے ردعمل کا آغاز ہوگیا۔ 24 ر نومبر 1927ء کو دارالامرا میں برکن ہیڈ، ریڈنگ اور اولیور کی جو تقریریں ہوئیں ان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ہندوستانیوں نے مستقل طور پر طے کرلیا ہے کہ وہ کمیشن کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کررہے ہیں۔ 27 ر دسمبر کو کانگریس کا اجلاس مدراس میں ہوا، اس مسئلہ کو زیر بحث لا گیا اور یہ طے ہوا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اسی دن لبرل فیڈریشن کا جلسہ تیج بہادر سپرو کی صدارت میں ہوا۔ اس میں بھی اسی قسم کی تجویز پاس کی گئی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی جو دسمبر میں بمقام کلکتہ محمد یعقوب کی صدارت میں ہوا تھا کمیشن کا بائیکاٹ کیے جانے کی تجویز پاس ہوئی اور دوسری پارٹیوں کی مدد سے ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کردی گئی۔

ان تین خاص سیاسی پارٹیوں نے جو پیش قدمی دکھائی اس کی تقلید بہت سی دوسری پارٹیوں مثلاً ہندو مہاسبھا، خلافت کانفرنس وغیرہ نے کی۔

یہ ضروری ہے کہ پہلے عام پس منظر کو سمجھ لیا جائے جس کی وجہ سے یہ ردعمل اتنا بڑھا کہ تجاویز پر عمل درآمد کیا گیا۔ ہندوستان میں اس قانونی کمیشن کا ورود اس وقت

ہوا تھا جب کہ ملک شدید اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا۔ امن اور سکون کے جتنے برس گزرے ان میں 1926ء آخری سال تھا۔ طوفانی موسم کے شروع ہونے کی علامتیں 1927ء میں ظاہر ہونے لگیں۔ زرعی اور صنعتی دونوں حلقوں میں تباہی بڑھ رہی تھی۔ زرعی آبادی جو سارے ملک کی آبادی کا 74 فیصدی تھی سخت اور ہولناک مفلسی میں مبتلا تھی۔ لاکھوں صرف معمولی غذا پر بسر اوقات کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ (کاشتکاروں کے) پرانے دشمن یعنی قرض داری، تقسیم اراضی، کم روزگاری یا بے روزگاری، ناکافی غذا اور امراض بھی حملے کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ دیہات کے لوگوں کی زندگی اب بھی جامد، الگ تھلگ اور پرانے زمانے کی طرح تھی پھر بھی جدیدیت کی ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں۔ آمدورفت اور مراسلت کی بڑھتی ہوئی آسانیاں دیہاتیوں کو شہر والوں اور جدید زندگی کے قریب لا رہی تھیں اور دنیا کی منڈی کے اقتصادی اثرات زرعی پیداوار کے طریقہ کار اور فصلوں وغیرہ پر پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ 1919ء کے اصلاحات کے زمانے سے انتظامی امور کے اختیارات جو منتقل شدہ شعبوں — مقامی حکومت خود اختیاری (لوکل سلف گورنمنٹ) پنچایتیں، بورڈ اور دیہی یونین وغیرہ — کی بدولت حاصل ہوئے تھے ان کی پرانی عادتوں اور خیالات کو بدل رہے تھے۔

تعلیم اور صحافت خصوصاً ہندوستانی اخباروں کی ترقی نیز گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک نے عوام میں ایک نئی بیداری پیدا کر دی تھی۔

واقعی پریشانی اور پریشانی کے احساس نے مل کر ہنگاموں اور سیاسی سرگرمیوں کو لامحالہ پیدا کر دیا۔ فوری سبب اشتعال انگیزی کا یہ تھا کہ ہندوستان جو کچا مال برآمد کرتا تھا اس کی قیمت باہر کی دنیا کے بازار میں گر گئی تھی۔ 27-1926ء کے برآمدات سے 26-1925ء کے مقابلہ میں 20 فیصدی کم رقم وصول ہو پائی۔ ہندوستان مجبور ہوگیا

کہ باہر کی بنی ہوئی درآمد چیزوں کی قیمتیں وہ زیادہ ادا کرے۔ یہی صورت حال دوسرے سال بھی قایم رہی۔ 26-1925ء میں اس کے برآمدات 385 کروڑ کے تھے، 27-1926ء میں 309 کروڑ اور 30-1929ء میں 311 کروڑ کے۔ زرعی پیداوار مثلاً روئی، پٹ سن، بیج اور اناج کی قیمتوں میں کمی آجانے کے باعث دیہاتی بدحال ہوگئے۔ اس سے ان کا معیار زندگی گر گیا اور بے چینی بڑھ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بے چینی کہیں نہ کہیں پھٹ پڑے گی اور 1928ء میں بردولی میں واقعی ایسا ہوا۔

صنعتی میدان میں باہر سے درآمد کی ہوئی چیزوں (مثلاً کپڑا) کی قیمتوں میں اضافے نے محنت کش طبقے پر بوجھ ڈالا کیونکہ ان کی اجرتیں، قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے کم تھیں۔ مزدوروں کی یہ بے چینی ہندوستانی کارخانوں مثلاً سوتی اور پٹ سن کی ملوں اور ریلوے میں ہڑتال کی صورت میں نمودار ہوئی۔ صرف 1926ء میں 11 لاکھ دن اس طرح ضایع ہوئے اور ہڑتالیں پرامن رہیں۔ 28-1927ء میں تقریباً اس کے دوگنے دن ضائع گئے۔ اس کے بعد کے سال میں 316 لاکھ دن بیکار گئے۔ بمبئی پریسیڈنسی کی سوتی ملوں، ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس، بنگال کی پٹ سن کی ملوں کے مزدروں اور ایسٹ انڈین اور ساؤتھ انڈین ریلوے کے کارکنوں نے لمبی لمبی ہڑتالیں کیں۔ بنگال میں باسن گاچیا کے مقام پر گولی چلی۔

حکومت کی سرکاری رپورٹ 29-1928ء میں درج ہے۔ "ہندوستان کی صنعتی زندگی پچھلے برسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ درہم وبرہم رہی۔"[1]

30-1929ء میں عالمگیر معاشی بحران جو کہ وال اسٹریٹ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کی تباہی سے شروع ہوا تھا تیزی سے یورپ کے ممالک تک پہنچ گیا اور ہندوستان کی معاشیات پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ ہندوستان کی بیرونی ممالک سے

1۔ (انڈیا ان) ہندوستان 29-1928ء میں ص 7

تجارت اور ہندوستانی صنعتوں کو سخت دھچکا پہنچا اور بدحالی عام ہوگئی۔

یہی وجوہ تھے کہ اس وقت دہشت انگیزیاں بھی یہاں شروع ہوگئیں۔ پنجاب اور بنگال میں بم پھینکے گئے اور اسی کے ساتھ ڈکیتیاں بھی ہونے لگیں۔ سال کے آخری مہینے میں لاہور کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس مسٹر سانڈرس کو گولی ماردی گئی۔ اپریل 1929ء میں سنٹرل اسمبلی میں ایک بم پھینکا گیا۔ وایسرائے کی ٹرین کو بھی بم سے اڑادینے کی ایک کوشش کی گئی۔

ہندوستان کی پریشاں حالی کی ایک اور علامت کمیونسٹ پارٹی کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ بہت پہلے 1920ء میں روس (USSR) کی کمیونسٹ پارٹی نے طے کیا تھا کہ ''مشرق میں انقلاب برپا کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے جائیں۔'' 1924ء میں چچرین نے اعلان کیا تھا کہ ''مستقبل کے ہندوستان کو مشرق کی آزادی جمہوری ممالک میں سرفہرست ہونا چاہیے۔'' ایم، این رائے جنھوں نے کمیونسٹ مسلک اختیار کرلیا تھا اور جو کمیونسٹ انٹرنیشنل (بین الاقوامی کمیونسٹ) کی مجلس عاملہ کے ایک رکن تھے ماسکو میں اس پارٹی کو ہندوستانی معاملات میں مشورہ دیتے تھے وہی اس بات کے ذمہ دار بنے کہ ہندوستانی کمیونسٹوں کو روس میں تربیت دلوا کر ان سے ہندوستان میں کمیونسٹ عقاید کو پھیلائیں اور کمیونسٹوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ قایم کریں۔

1924ء تک کمیونسٹ پرچار نے کافی ترقی کرلی تھی، اتنی کہ حکومت خائف ہوگئی تھی اور اس نے کانپور سازش کا مقدمہ اس پارٹی کے چار اہم لیڈروں یعنی ایس اے ڈانگے، مظفر احمد، شوکت عثمانی اور نلین گپتا کے خلاف چلایا۔ ان کو سزا ہوئی اور جیل میں ڈال دیے گئے تھے۔

ان لوگوں کے ہٹ جانے سے یعنی ان کی گرفتاری سے اس تحریک کو زبردست

دھکہ لگا۔ اس تحریک میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ 1926ء میں اس پارٹی کی حالت سدھارنے کے لیے خاص کر مزدوروں کی یونینوں میں کمیونسٹ عقاید پھیلانے کے لیے کئی برطانوی کمیونسٹ ہندوستان آگئے۔ انہوں نے کانپور جیل سے رہائی یافتہ ہندوستانی کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر پارٹی کو از سرِ نو زندہ کیا۔

دسمبر 1927ء میں کلکتہ میں پارٹی کے ممبروں کی ایک کانفرنس ہوئی تا کہ پارٹی کی نئے سرے سے تنظیم کی جائے اور اس کا مقصد متعین کر دیا جائے۔ 1928ء تک ''کمیونزم کا طوفان اپنے عروج پر پہنچ گیا۔'' 29-1928ء کی ہڑتالوں میں پارٹی نے نمایاں رول ادا کیا۔ قبل اس کے کہ پارٹی کا پروگرام اور آگے بڑھے حکومت نے پھر ضرب لگائی۔ مارچ 1929ء میں بتیس سر برآوردہ ممبر جن میں کچھ انگلستانی رفقا بھی شامل تھے گرفتار کر لیے گئے اور میرٹھ میں ان کے خلاف ایک مقدمہ یہ الزام لگا کر دائر کر دیا گیا کہ یہ لوگ شہنشاہ معظم کی برطانوی شہنشاہیت ختم کر دینے کی سازش کر رہے تھے۔

اس انتشار کی فضا میں 8 رفروری 1928ء کو سائمن کمیشن بمبئی میں وارد ہوا۔ اس کا استقبال ہڑتال (دوکانوں کا بند کر دیا جانا) کالی جھنڈیوں اور سارے ہندوستان میں احتجاجی جلسوں اور جلوسوں سے کیا گیا۔ حکومت، حسب معمول، رعایا سے بے تعلق تھی اور اپنی شاندار یکتائی میں محصور تھی۔ اس کے گرد خوشامدیوں، ملازمتوں اور سرپرستی کے امیدواروں کا حلقہ تھا یا ان معززین اور صاحب ثروت اور صاحب جائداد کا جو ہر قسم کے انقلاب سے ہراساں تھے۔ بہرحال حکومت اچھنبے میں پڑ گئی۔ اروِن نے بادشاہ اور سکریٹری آف آرٹسٹ کے نام خطوں میں اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے متکبرانہ انداز اور حقارت سے مخالفت کو مسترد کر دیا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ ان شوروغوغا کرنے والا کو ٹھکانے لگا دے گا۔

لیکن اگر وہ واقعی یہ سمجھتا تھا کہ ڈرانے دھمکانے کی باتیں کر کے وہ حزب مخالف کو خوف زدہ کر دے گا تو یہ اس کی فاش غلطی تھی۔ ہندوستانی لیڈر نرم گفتار سائمن کی یقین دہانیوں کے فریب میں بھی نہ آسکے جو اس نے کمیشن کے طریقہ کار کے متعلق یہ کہہ کردی تھیں کہ کمیشن کا ارادہ ہے کہ وہ مرکزی اور صوبائی کمیٹیوں کو شہادتیں لینے کے دوران شریک کار بنالے گا۔ 16/فروری 1928ء کو اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر لاجپت رائے نے مجلس قانون ساز میں درج ذیل تجویز پیش کی:

"اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ وہ براہ مہربانی ملک معظم کو مطلع کردیں کہ اسمبلی اس پارلیمانی کمیشن پر جو ہندوستان کے دستور کو از سر نو وضع کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے قطعی اعتماد نہیں کرتی"[1]

انہوں نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت کردی کہ انگلستان سے تعلقات رکھنے کے باوصف ہندوستان کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو کسی تحقیقاتی کمیشن کا محتاج ہو۔ "یہ مسئلہ باہمی گفتگو اور اقرار نامے کا ہے" [2]

حکومت ہند کے ہوم ممبر مسٹر کریرز نے اس تجویز کی مخالفت میں یہ دلیل پیش کی کہ تحقیقات کے بالاخر نتائج کیا نکلیں اس کا آخری فیصلہ پارلیمنٹ ہی کے ذمے رہنا چاہئے۔ اس نے اصرار کیا کہ اس قسم کے مسائل جیسے کہ اقلیتوں کے حقوق، فرقہ وارانہ اختلاف اور صوبجاتی مالیہ کی تحقیقات ضروری ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کمیشن نے جو قاعدہ کونسلوں سے صلاح و مشورہ کرنے کا مقرر کردیا ہے اس سے ہندوستانیوں کا یہ اعتراض کہ انہیں دستور سازی میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا، دور ہو جاتا ہے۔

1۔ ہندوستانی قانون ساز اسمبلی میں سائمن کمیشن پر مباحثہ مورخہ 16/فروری 1928 قانون ساز اسمبلی میں مباحثہ (یکم فروری 7/مارچ 1928ء جلد اول ص 328

2۔ ایضاً۔ ص 383

جن لوگوں نے ہوم ممبر کو جواب دیا ان میں موتی لال نہرو اور جناح تھے۔ مباحثے کے بعد تجویز پر رائے شماری کی گئی اور وہ 62 کے مقابلے میں 68 ووٹوں سے کامیاب ہوگئی۔ اس قانون ساز اسمبلی نے قانونی کمیشن کے خلاف اپنی ناپسندیدگی درج رجسٹر کروادی۔ پھر بھی چند گروہ ایسے تھے جنھوں نے کمیشن سے تعاون کیا مثلاً مسلم لیگ کا وہ گروہ جس کے سربراہ محمد شفیع تھے، اچھوتوں کا گروہ جس کے لیڈر امبیڈکر تھے اور مدراس کے غیر برہمن اور چند دوسری پارٹیاں جو اپنے خاص مفادات کی نمایندگی کررہی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اہل سیاست کی بڑی کثیر تعداد کمیشن سے کسی قسم کی معاملت کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ پائنیر اخبار نے لکھا:

"سر جان سائمن کے امید افزا عام بیانات کے باوجود پائنیر اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستان میں کمیشن کا یہ پارلیمانی دورہ کامیاب رہا ہے...... اسے جو کچھ تعاون ملا ہے وہ صرف چند طبقوں کا ہے اور اضطراری ہے۔ اسے سیاسی ہندوستان کی نمایندگی حاصل نہیں ہے۔" [1]

ہندوستان میں کمیشن کے دوران قیام اور اس کے جانے کے فوراً بعد جو جو واقعات پیش آئے ان سے اس بات کی توثیق بہت واضح طور پر ہوگئی۔ کمیشن جہاں کہیں گیا اور بہت سے دیگر شہروں میں بھی اس کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ جلوس نکالے گئے جن میں کالی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ نعرے لگائے گئے کہ "سائمن، واپس جاؤ" بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں مطالبہ کیا گیا کہ کمیشن کو واپس بلا لیا جائے، تمام کاروبار روک دیا گیا اور مکمل طور پر اس کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ یہ بائیکاٹ اس قدر موثر تھا کہ کمیشن کے ممبران کو اسٹیشن سے خفیہ طور پر ان کے جائے قیام پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ پولیس ان کی حفاظت کرتی تھی کہ مجمع کہیں انھیں گھیر نہ لے اور

1۔ پائنیر، 29/ مارچ 1928ء

راستوں پر مظاہرین کو ان سے الگ رکھتی تھیں۔ پولیس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی زیادتیوں کی وجہ سے سفاکی اور بربریت کے واقعات پیش آئے۔ کیونکہ مجمعوں کو سخت دھکے دے کر پیچھے ہٹایا جاتا تھا اور ان پر لاٹھیاں برسائی جاتی تھیں۔ ان میں سے دو واقعات تو ایسے ہوئے جن کی تمام ہندوستان نے مذمت کی۔ 30 / اکتوبر 1928ء کو لاہور میں اور دوسرا 30 / نومبر کو لکھنؤ میں پیش آیا۔ پہلے میں لاجپت رائے اور پنجاب کے کئی دوسرے رہنما پولیس کے وحشیانہ حملے کا شکار ہوئے۔ اس حادثے کے فوراً بعد لاجپت رائے کی موت، کہا جاتا ہے کہ انہیں چوٹوں کے باعث ہوئی جو ان کو لگی تھیں۔ لکھنؤ میں جواہر لال نہرو اور دیگر ممتاز شہریوں سے ایسا ہی شرم ناک برتاؤ کیا گیا۔

جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے انہوں نے امن وامان قابل تعریف حد تک قائم رکھا اگر چہ جوش وخروش بہت زیادہ تھا، پولیس کا برتاؤ طیش دلانے والا تھا اور بائیکاٹ میں حصہ لینے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن بدقسمتی سے کمیشن جس دن مدراس اور کلکتہ پہنچا یہ احتجاج دو منفرد واقعات سے پرامن نہ رہ سکا اور وہاں فسادات برپا ہو گئے۔

غصہ سے بھرے ہوئے احتجاج اور طوفانی مظاہروں سے چشم پوشی کرتے ہوئے کمیشن بظاہر تو اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہا لیکن حکومت، کونسل چیمبر کے اندر اور باہر ان تند و تلخ مظاہروں کو برداشت نہ کر سکی۔ ارون مجبور ہو گیا کہ اب اس صورت حال کو واقعی محسوس کرے کیونکہ ہندستانی ردعمل کے متعلق اس کی پہلے کی پیشین گوئیاں تمام تر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ 26 / مئی 1927ء کو اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا کہ شوروغل کرنے والی سیاسی پارٹیاں ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتیں اس لیے اس کو امید ہے کہ کسی پارلیمانی کمیشن کا کوئی مؤثر بائیکاٹ نہ ہوگا۔ دراصل اس کو یقین تھا کہ ”مسلمان تو قطعی بائیکاٹ نہیں کریں گے اور اس کا ہندوؤں کے فیصلے پر

لامحالہ اثر پڑے گا"[1] اس نے برکن ہیڈ سے کہا تھا کہ وہ سنہا کے ذریعے اعتدال پسندوں کی نگرانی کرے۔ ایک دوسرے خط میں اس نے اس کو یقین دلایا تھا کہ ہندوؤں کے بائیکاٹ کا مقابلہ مسلمان، والیان ریاست اور اعتدال پسند لوگ مل جل کر کامیابی کے ساتھ کرسکیں گے۔[2]

لیکن انڈین کانگریس کے لیڈروں کو بہلانے پھسلانے یا ڈرانے کی جتنی کوششیں اس نے کیں سب بیکار گئیں اور اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ اب کانگریس اور حکومت کے درمیان تصادم ہونا ناگزیر ہوگیا ہے۔ بحیثیت ایک پریشان اور مضطرب وائسرائے کے اس نے 9 ر فروری 1928ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ سے صاف صاف اقرار کیا کہ "یہ پیش بینی کرنا ناممکن ہے کہ کس وقت ہندستانی سیاست داں کیا کر بیٹھیں گے"[3]

پھر دوسرا دھچکا اروِن کی جمعیت خاطر کو اس وقت لگا جب نوجوان کانگریسیوں کے ایک طبقے نے مکمل آزادی کی بات نکالی۔ لیکن اس نے اس خیال سے اپنے آپ کو تسکین دے لی کہ اولاً تو ہندوستانی جو کچھ کہتے ہیں اس کے مفہوم سے سروکار نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ لفظ 'آزادی' اس قدر مبہم ہے کہ اس کے معنی ہوم رول (Home Rule) بھی لیے جاسکتے ہیں، مملکتی درجہ بھی اور برطانوی حکومت سے علاحدگی بھی[4] اس کی خود اعتمادی اس وقت کسی قدر بحال ہوسکی جب نہرو رپورٹ کو مسلمانوں نے نامنظور کردیا خصوصاً جناح نے جو بڑے جوش کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی کوششیں کررہے تھے اب ناامید ہوگئے تھے۔

1۔ اروِن پیپرس: وائسرائے بنام برکن ہیڈ، 26 ر مئی 1927ء

2۔ ایضاً، 5 ر اکتوبر 1927ء 3۔ ایضاً، 9 ر فروری 1928ء

4۔ ایضاً 28 ر جون 1928ء

جب دسمبر 1928ء میں کانگریس کا اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا تو درجہ نو آبادیات کے حامیوں، مملکتی درجہ حاصل کرنے کے خواستگاروں اور مکمل آزادی کے طلب گاروں میں شدید اختلاف پیدا ہوتو اسے (ارون کو) امید ہوئی کہ اب کانگریس میں رخنہ پڑ جائے گا۔ اور '' نام نہاد قومی اعتماد رکھنے والی کانگریس کے وقار میں کمی آجائے گی۔'' 1 لیکن اس کلکتہ کانگریس میں جب بائیں بازو والوں کا پلہ بھاری پڑ گیا تب ارون پریشان ہو گیا اور اس نے سوچا کہ اب کانگریس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے اور سول نافرمانی کی دھمکی کا مقابلہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے مجلس قانون ساز کے صدر وٹھل بھائی پٹیل سے ملاقات کی۔ انہوں نے ارون کو مشورہ دیا کہ وہ گاندھی جی سے رابطہ قائم کریں کیونکہ ان کے خیال میں گاندھی جی برطانیہ سے تعلقات برقرار رکھنے کے حامی تھے اس لیے وہ درجہ نو آبادیات کو قبول کرنے میں کوئی پس وپیش نہ کریں گے جس کی رو سے امور خارجہ، امور سیاسی اور غالباً دفاع کچھ ایسے طریقے سے محفوظ رکھے جاسکیں گے جس کی بعد میں تشریح کر لی جائے گی۔ 2

بائیکاٹوں کے معرکوں، کانگریس کی للکار، کیمونزم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، مزدوروں کی بے چینی اور سائمن اور اس کے 'لا ابالی ساتھی' جو ادھر ادھر اس لیے مٹر گشتی کر رہے تھے کہ انہیں ایسے قسم کا چوکھٹا، یا سجاوٹ کا فریم یا بندشِ الفاظ مل جائے جس سے کمیشن اپنی تصویر مزین کر سکے۔ 3 یہ سب باتیں وایسرائے کی پریشانی طبع کا باعث بن گئیں۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ وہ 29/ جون 1929ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہو جائے تا کہ وہاں کی نئی لیبر حکومت سے مشورہ کر سکے۔ جون 1929ء میں

---

1 ارون پیپرس: وایسرائے بنام برکن ہیڈ، 27/دسمبر 1928ء

2 ایضاً، وایسرائے بنام پیل، 17/جنوری 1929ء

3 ایضاً وایسرائے بنام پیل 27/مارچ 1929ء

قدامت پسند پارٹی دارالعوام میں اکثریت نہ حاصل کر سکی اور ریمزے میکڈانلڈ اگر چہ اقلیت کا لیڈر تھا، وزیراعظم بنادیا گیا۔ میکڈانلڈ کی تقریروں سے، جب تک وہ کرسی وزارت پر فروکش نہ ہوئے تھے، ہندوستان میں بڑی بڑی امیدیں باندھی گئی تھیں اور اسی لیے وایسرائے فطری طور پر حکومت کا منشا دریافت کرنا چاہتا تھا تاکہ اسی کے مطابق وہ اپنی پالیسی ہندوستان میں اختیار کرے۔

سائمن سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ کمیشن کس رخ چلنے پر مائل ہے اور اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس رخ کی طرف جانے سے جھگڑا اور زیادہ بڑھے گا اور دشمنی اور زیادہ سخت ہو جائے گی۔ اس لیے ضروری ہوگیا کہ کچھ ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جن سے حکومت اور ہندوستانیوں میں تصادم نہ ہو سکے اور کانگریس اپنے اس سخت رویے سے باز رہے جو اس نے کلکتے میں اختیار کیا تھا۔

اس لیے لیبر پارٹی کے سکریٹری آف اسٹیٹ، وتیج وڈ بن اور وایسرائے اردن نے آپس میں مشورہ کر کے اپنا ایک نیا منصوبہ تیار کیا جس کی رو سے سائمن کمیشن کو الگ طاق میں بٹھادیا جاتا تھا اور نئے دستور کی دفعات کی سفارش کا کام اس کے بجائے ایک گول کانفرنس کو سونپنا تھا جس میں ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمایندے شریک ہوں۔ سائمن کے قدامت پسند اور لبرل مددگاروں کی تنقید سے بچنے کے لیے کانفرنس کا منصوبہ پیش کرنے کی ذمہ داری اس (اردن) کے سپرد کی گئی۔ اس نے دیسی ریاستوں کے مسائل اور مستقبل میں ان کے برطانوی ہند سے تعلقات کے متعلق ایک خط میکڈانلڈ کو لکھا تھا اور ایک سہ طرفہ کانفرنس کی سفارش کی تھی جو اس معاملے کو حل کر سکے۔ وتیج وڈ بن نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور اس کو اتنی اہمیت دی جسے سائمن نے پسند نہیں کیا۔

منصوبے کا دوسرا جزو یہ تھا کہ حکومت کی طرف سے ایک باضابطہ اعلان کیا جائے

کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کی منزل مقصود درجہ 'نوآبادیات کا حصول کرنا ہے۔
اروِن کو چونکہ سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کردینے کی بڑی فکر تھی اس لیے اس کو اب پکا یقین ہو گیا تھا کہ یہ منصوبہ کارآمد ہوگا کیونکہ لبرل لیڈر لائڈ جارج نے اس کو مدد دینے کا وعدہ کرلیا تھا اور قدامت پسندوں کے سربراہ مسٹر بالڈون بھی اس شرط پر کہ سائمن مطمئن رہے راضی ہو گئے تھے اور لیبر حکومت کے ممبروں کی تائید حاصل ہی تھی۔
اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اروِن ہندوستان واپس آئے اور 25/اکتوبر کو بمبئی پہونچے۔ اور ایک ہفتہ کے اندر ہی گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت مورخہ 31/اکتوبر 1929ء کے ذریعہ اپنے منصوبے کا عام اعلان کروادیا۔ اعلان میں حکومت کے اس فیصلے کا ذکر تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہوگا ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا۔ اعلان میں درج ذیل بیان شامل تھا:

> "ملک معظم (ہز میجسٹی) کی حکومت کی طرف سے مجھے اختیارات دیے گئے ہیں کہ میں یہ بات واضح کردوں کہ حکومت کے نزدیک 1917ء کے اعلان میں یہ مضمر ہے کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا فطری نتیجہ درجہ نوآبادیات کا حصول ہے اور یہی مقصد اعلان مذکور میں پیش نظر رکھا گیا تھا" 1

وایسرائے کے اس اعلان کے فوراً بعد ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس نئی دہلی میں منعقد ہوئی اور دو دن کے بحث ومباحثے کے بعد ان لوگوں نے 2/نومبر 1929ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں وایسرائے کے اعلان کو چند شرایط کے ساتھ منظور کیا گیا تھا۔ شرطیں یہ تھیں کہ گول میز کانفرنس میں جو بحثیں ہوں وہ ہندوستان کو درجہ' نوآبادیات دیے جانے کی بنیاد پر ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس

1. ہندوستان گزٹ 30-1929ء میں ضمیمہ نمبر 2 ص 468

کانفرنس میں ترقی یافتہ سیاسی تنظیموں کی نمائندگی خاصی ہو اور ان میں بھی انڈین نیشنل کانگریس کی نمایندگی سب سے زیادہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ایک پر سکون فضا برقرار رکھنے کے لیے ایک عام صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی جانا چاہیے۔ جواہر لال نہرو جو 1929ء کے لیے کانگریس کے صدر نامزد ہوئے تھے یہ کڑوی گولی حلق سے بہ مشکل نیچے اتار سکے۔ مکمل آزادی کا مطالبہ ترک کر دینا ان کے لیے بڑی ذہنی تکلیف کا باعث تھا۔ تاہم اختلافات سے بچنے کے خیال سے بالآخر وہ مان گئے کہ (اس محضر پر) اپنے دستخط کر دیں گے۔ لیکن اس محضر کی روشنائی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ارون کے اس اعلان پر دارالامرا میں ایک مباحثہ شروع ہو گیا۔ سابق وایسرائے ریڈنگ نے وایسرائے کے بیان پر توجہ دلاتے ہوئے حکومت سے باز پرس کی کہ وہ بتائے کہ ایسا اعلان کمیشن کی رپورٹ آنے سے پیشتر کیوں کیا گیا اور یہ بھی واضح کرے کہ کیا درجہ نو آبادیات کے حصول کی مدت میں سرکاری پالیسی میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس نے مملکتی درجہ کی اصطلاح کے استعمال کیے جانے پر بھی اعتراض کیا کہ اس سے ہندوستان میں غلط امیدیں پیدا ہو جائیں گی۔ برکن ہیڈ نے پرزور الفاظ میں ایک تقریر کی اور حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے سول نافرمانی کے خوف سے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور صورت حال سے نامناسب طور پر نپٹنے کی تہمت لگاتے ہوئے کہا: "کوئی بھی شخص جس کے کردار میں عقل سلیم یا ذمہ داری کا احساس ہے یا ہونا چاہیے کسی تاریخ کا تعین آپ کی طرح نہیں کر سکتا کہ فلاں وقت تک ہندوستان ایک کو درجۂ نو آبادیات حاصل ہو جائے گا۔"[1]

لبرل اور قدامت پسند دونوں پارٹیوں کے لارڈوں نے اپنی نامنظوری اور ناگواری کا اظہار کیا لیکن لارڈ پارمور اور لارڈ باس فیلڈ نے لیبر حکومت کی طرف سے

1۔ دارالامرا کے مباحثے۔ پانچویں سیریز۔ جلد 75 کالم 5-4-4 برکن ہیڈ کی تقریر 5 نومبر 1929ء

ایوان کو یقین دلایا کہ اس انتظام سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی مقررہ پالیسی سے ہٹ گئے ہیں۔ وایسرائے نے جو کچھ کیا ہے اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ 20/اگست 1917ء کے اعلان میں برطانوی پالیسی کے مقصود اصلی کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے متعلق شکوک رفع ہو جائیں۔ لارڈ پارمور نے یہ تسلیم کیا کہ "سیاسی معاملات کو ہندوستانی حالات اور معاملات سے دور رکھنا ضروری ہے۔ لارڈ ریڈنگ اور حکومت کے نقطۂ نظر میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔"[1]

دارالعوام میں قدامت پسند پارٹی کے لیڈر بالڈون، اور لبرل پارٹی کے لائڈ جارج نے اعتراضات کیے۔ دونوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ وایسرائے نے کمیشن کی رپورٹ آنے سے پیشتر یہ اعلان کیسے کر دیا۔ لائڈ جارج نے کھلے الفاظ میں کہا کہ "دونوں سیاسی پارٹیوں (لبرل اور قدامت پسند) نے اعلان کی اشاعت سے پیشتر ہی احتجاج کیا تھا............ اس کے معنی یہ تھے کہ دونوں اس کے خلاف تھے...... پہلی دفعہ ایسا عمل کیا گیا ہے جس سے ہماری قوم میں ہندوستان سے متعلق رایوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔"[2]

اس نے حکومت سے پوچھا کہ ہندوستانیوں نے اعلان کے مبہم فقروں کے جو معنی لیے ہیں ان کے متعلق حکومت اپنا خیال واضح کرے کیونکہ "ہندوستان میں اس اعلان سے یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت بلا کسی تاخیر کے بہت جلد ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دینا چاہتی ہے اور مشترکہ کانفرنس جو (ہندوستان میں) منعقد کی گئی ہے اس کا مقصد پوری اسکیم کی تیاری کرنا ہے۔"[3]

1۔ ایضاً۔ لارڈ پارمور۔ کالم 389

2۔ دارالعوام میں مباحثے۔ پانچویں سیریز۔ جلد 231، کالم 1318 - لائڈ جارج 7/نومبر 1929ء

3۔ ایضاً۔

بالڈون کا کہنا یہ تھا کہ انہوں نے ذاتی طور پر اپنی منظوری اس شرط پر دی تھی کہ سائمن کمیشن سے پہلے اجازت لے لی جائے لیکن انہوں نے بتایا کہ ایسا نہیں کیا گیا۔

لائڈ جارج اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ ''منزل مقصود کا حصول مرحلہ وار ہونا چاہئے اور ان مرحلوں کی تعداد اور مدت کا تعین رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً اس تجربے کی کامیابی کے اندازے کے مطابق مرحلہ وار کیا جانا چاہئے''[1]

ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ، وتیج وڈ بن نے اپنے جواب میں اعلان کیے جانے کے دو وجوہ بیان کیے۔ پہلی وجہ تو یہ بتائی کہ ہندوستان میں برطانوی ارادوں سے متعلق جو شکوک پیدا ہو گئے تھے ان کا ازالہ ضروری تھا اور دوسری یہ کہ'' (سائمن کمیشن کی) رپورٹ کے لیے اچھی فضا پیدا کر دینا مقصود تھا''ان کو یقین تھا کہ دونوں مقاصد پورے ہو گئے اور ہندوستانی ذہن میں بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ اس لیے حکومت کا رویہ حق بجانب تھا۔ انہوں نے لائڈ جارج کے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ وہ اس تشریح سے متفق ہیں یا نہیں جو ہندوستانی لیڈروں نے اس اعلان کی، کی ہے۔

پارلیمنٹ کے مذاکرات خصوصاً حکومت کے نمایندوں کے بیانات نے ہندوستانیوں کو بری طرح متاثر کیا۔ ان پر یہ واضح ہو گیا کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے اور انہیں غلط یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ کانفرنس ہندوستانی دستور پر درجہ نو آبادیات کی بنیاد پر بحث مباحثہ کر سکے گی۔ اروِن کے ارادے خواہ کچھ بھی رہے ہوں بہر حال حزب مخالف کے لیڈروں اور حکومت دونوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

درجہ نو آبادیات کا تصور اس سے بہت کچھ دھندلا پڑ گیا تو عمارت کے دوسرے ستون یعنی کانفرنس کے متعلق کیا کہا جائے جسے اس کے معماروں یعنی وتیج وڈ بن اور اروِن نے بڑی توجہ کے ساتھ تیار کیا تھا؟ یہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔ بن نے اُروِن کو لکھا:

1۔ دارالعلوم میں مباحثے۔ پانچویں سیریز۔ جلد 231 کالم 1318۔ لائڈ جارج 7 نومبر 1929ء

"آپ کو معلوم ہے کہ اس ملک میں ارباب حل وعقد کی کتنی بڑی تعداد سائمن رپورٹ سے تعلق خاطر رکھتی ہے اس لیے ابھی یہ خیال ظاہر کرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا کہ کانفرنس اس میں تبدیلیاں کرسکتی ہے...... میرا فرض اب یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں کو اس تصور کی طرف راغب کروں کہ کانفرنس بنیادی عنصر ہے۔"[1]

فریب خوردہ اور جھنجھلائے ہوئے ہندوستانی لیڈروں نے 18 ر نومبر کو الہ آباد میں ایک میٹنگ کی تاکہ ان کی دہلی کی میٹنگ کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی اس کا جائزہ لیا جائے۔ انہوں نے وہاں یہی طے کیا کہ فی الحال دہلی کے منشور کی پابندی کی جائے گی اور لاہور کانگریس کے اجلاس تک مزید کارروائی کا انتظار کیا جائے۔

اس کے بعد پٹیل اور سپرو اردن سے ملے اور پھر 23 ر دسمبر کو گاندھی، موتی لال، سپرو اور جناح نے وایسرائے سے ملاقات کی۔ اس نے تشریح کی کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم پارلیمنٹ کو اس کی آزادی سے روک سکیں یا پہلے سے اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ کانفرنس کیا کرے گی۔ اس طرح یہ مطالبہ کہ گول میز کانفرنس اس مقصد کے لیے منعقد کی جائے کہ درجہ نوآبادیات کی بنیاد پر ہندوستان کے لیے دستور کا ایک خاکہ تیار کرے، رد کردیا گیا۔

وایسرائے نے اس ملاقات کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا:

"ان لوگوں (کانگریس کے نیتاؤں) کا رویہ واقعی ناقابل برداشت تھا۔ مجھے (ان کی ملاقات سے) غیر معمولی مایوسی ہوئی یہ دیکھ کر کہ ان میں سیاسی شعور اس طرح کا نہیں ہے جس طرح عادتاً انتہا پسند سیاست دانوں

1۔ اردن پیپرس: ووَج وڈ بن بنام وایسرائے 5 ر دسمبر 1929ء

میں نہیں ہوتا"[1]

اس کا خیال یہ تھا کہ کانگریسی اس بات کو پوری طرح سمجھ گئے ہیں کہ ہندوستانی نمائندوں میں جو گہرے اختلافات ہیں انہیں دور نہ کرسکیں گے اور اس لیے دستور کی ایک متفقہ اسکیم پیش نہ کرسکیں گے اور اسی لیے وہ کانفرنس میں حاضر نہ ہونے کے بہانے تلاش کررہے ہیں۔

7- کانگریس کا اعلان آزادی

یہ سمجھنے کے لیے کہ دسمبر 1929ء میں کانگریس نے جو نہایت اہم قدم اٹھایا اس کے اسباب کیا تھے کچھ پچھلے واقعات کو نظر میں لانا ضروری ہے۔ فروری 1924ء میں مجلس قانون ساز نے ایک گول میز کانفرنس بلانے کا مطالبہ کیا تا کہ 1919ء کے قانون (ایکٹ) پر نظر ثانی کی جاسکے۔ حکومت نے اس قرارداد کو ماننے سے انکار کردیا تھا۔

6/مارچ 1926ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مجلس قانون ساز کے سوراج پارٹی کے ممبران سے کہا گیا تھا کہ جب 27-1924ء کے بجٹ کی منظوری کا معاملہ (مجلس قانون ساز میں) پیش ہو تو وہ اس کے پہلے ہی مطالبے کو نامنظور کرکے دستور کے معاملے کو دوبارہ اٹھائیں اور یہ تاکید بھی کی تھی کہ کسی مقررہ دن تمام ممبران اسمبلی سے اٹھ کر باہر چلے جائیں اس احتجاج کے ساتھ کہ دستور کی مانگ پوری نہیں کی گئی۔

8/مارچ کو نہرو نے اسمبلی میں کہا کہ وہ حکومت کو اس سے پیشتر دو دفعہ مطلع کرچکے ہیں کہ سوراج پارٹی ملک میں کسی ایسے انتظامیہ میں شرکت کرنا نہیں چاہتی

---

1 حوالہ ماسابق۔ وائسرائے بنام ووڈ بین 26/دسمبر 1929ء

جو ان کی مرضی کے خلاف ہو لیکن حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف ارباب حل وعقد کی باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ مجالس میں کوئی مزید کارروائی بیکار محض ہو گی۔ اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا: ''ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان مصنوعی اداروں سے ہم کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا قوم کی عزت اور خودداری برقرار رکھنے کی خاطر کم سے کم ہم یہی کر سکتے ہیں کہ ہم ان (اداروں) سے باہر نکل جائیں''۔[1]

26 دسمبر کو کانگریس کا اجلاس گوہاٹی میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی جو تمام سال خاموش رہے تھے اس اجلاس میں شریک ہوئے اور اس تحریک پر بحث ومباحثے میں حصہ لیا کہ کانگریس کے مقصود اصلی میں یہ ترمیم کر دی جائے کہ سوراج کے معنی اب مکمل آزادی کے لیے جائیں۔

ان کے اختلاف کے باعث یہ تحریک نامنظور ہو گئی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ لفظ 'سوراج' سب پر حاوی ہے اور مکمل آزادی کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ اس کی تشریح یا اس کی جگہ کسی اور لفظ کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بحث سے بہرحال یہ ظاہر ہو گیا کہ ہوا کس رخ پر چل رہی ہے۔

گورنمنٹ کا ردعمل اس رجحان کی طرف صرف یہ ہوا کہ اس نے اسے بالکل نظرانداز کر دیا۔ دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے برکن ہیڈ نے اطمینان ظاہر کیا کہ 1926ء کے انتخابات میں سوراجیوں کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور حکومت سے تعاون کرنے والے لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس صورت حال میں وہ ایک ایسی کمیٹی کے تقرر پر غور کرنے کے لیے تیار تھا جو اصلاحات پر اپنی رپورٹ دس برس کی مدت سے پیشتر ہی دیدے جیسا کہ 1919ء کے قانون میں کہا گیا تھا۔

---

1. موتی لال نہرو، مجلس قانون ساز 8 مارچ 1926ء (دہلی سیشن)۔ مجلس قانون ساز کے مباحثے (4 مارچ تا 25 مارچ 1926ء) جلد ہفتم حصہ سوم، ص 2143

چنانچہ 8 رنومبر 1927ء کولندن اور دہلی دونوں جگہ یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایک قانونی کمیشن کا تقرر اصلاحات کی خاطر منظور کیا ہے۔اس اعلان سے ملک میں ایک شوروغوغا برپا ہو گیا۔

1927ء میں کانگریس کا جو اجلاس مدراس میں ہوا اس کے سامنے ایک نئی صورت حال پیش ہو گئی۔ برکن ہیڈ نے صرف سفید فام لوگوں پر مشتمل جو کمیشن مقرر کیا تھا وہ ایک ایسا چیلنج تھا جس کا جواب دینا ضروری تھا۔صرف سفید فام لوگوں پر مشتمل ایک ایسے کمیشن کا مقرر کیا جانا کہ وہ اس بات کی جانچ کرے کہ ہندوستانی لوگ حکومت کرنے کی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہیں یا نہیں،ایک ذلت آمیز بات تھی اور اس کا جواب یہی تھا کہ ایسے کمیشن سے کسی قسم کا سروکار رکھنے سے قطعی انکار کر دینا چاہیے۔ برکن ہیڈ کے ہندوستانیوں کو اس طعن آمیز دعوت نامے کے جواب میں کہ ''وہ دستور سے متعلق خود اپنے مشورے پیش کریں'' کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ورکنگ کمیٹی کو اجازت دی گئی کہ وہ تنظیموں کی کمیٹیوں سے تبادلہ خیال کرے اور ہندوستان کے سوراج کے لیے ایک دستور تیار کر کے اسے تمام پارٹیوں کی مشترکہ کانفرنس اور مجلس قانون ساز کے ممبروں کے سامنے غور کرنے اور منظوری کے لیے پیش کرے۔اس کے علاوہ جواہر لال نہرو کی آزادی سے متعلق تجویز بھی متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

جواہر لال یورپ میں اکیس مہینے گزار کر مدراس پہنچے تھے۔انہوں نے سارے براعظم (یورپ) کا ایک طویل دورہ کیا تھا۔ بروسلس (بلجیم) میں مظلوم لوگوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں کانگریس کے ایک مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ترقی یافتہ انتہا پسند سیاسی نظریات رکھنے والوں،سوشلسٹ،کمیونسٹ اور شہنشاہی حکومتوں سے بغاوت کرنے والے،سبھی لوگوں سے ملے۔ وہ ماسکو بھی گئے اور

سوویٹ طرز حکومت کے گرویدہ ہو گئے۔ انہوں نے تحریر کیا کہ "سوویٹ روس بعض ناخوشگوار حالات کے باوجود مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے لیے امید کا ایک پیغام رکھتا ہے۔"[1] وہ ہندوستان لوٹے تو وسیع النظری اور ایک نیا زاویہ فکر لے کر لوٹے۔ اس لیے قدرتی بات تھی کہ درجہ نو آبادیات کا تصور جس میں ایک شہنشاہی نظام سے وابستگی کا مفہوم شامل ہو، ان کو قطعی ناموزوں اور نامناسب نظر آیا۔

ان کی تحریک پر اتفاق رائے سے ووٹ پاس ہونا، نوجوان طبقے کا آزادی کی منزل کے لیے برملا جوش وخروش، صنعت کاروں اور مزدور طبقے کا تال میل جس سے جواہر لال کو پوری ہمدردی تھی، کا زور پکڑنا، مدراس کانگریس میں مباحثوں کے دوران گاندھی جی کا بے تعلقی ظاہر کرنا اور بوڑھے لیڈروں کا حکومت کے غیر لچک دار رویے سے مایوس ہو کر سپر ڈال دینا، ان سب باتوں نے اس قومی تنظیم (کانگریس) کو اب ایسے اونچے نصیب العین پر پہنچا دیا جہاں سے روگردانی ممکن نہ تھی سوائے اس صورت میں کہ حکومت اپنے رویے پر نظر ثانی کرتی اور اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھاتی۔

1928ء میں پورے سال بھر سائمن کمیشن اور اس کے بائیکاٹ کے باعث ملک ایک سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہا۔ قانونی کمیشن میں صرف برطانوی لوگوں کی شمولیت کی پالیسی کے جو نتائج ہو سکتے تھے، ان سے حکومت کو متنبہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کی تجاویز، بیانات اور اعلانات کے علاوہ قانون ساز مجلس نے بھی 16 رفروری 1928ء کو لاجپت رائے کی تحریک کو منظور کر کے کھلے الفاظ میں اپنی شدید مخالفت کا اظہار کر دیا تھا۔

حکومت نے کوئی دھیان نہیں دیا اور وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ بظاہر غیر متاثر رہے۔ برکن ہیڈ کا ردعمل اس طرح ظاہر ہوا "وہ لوگ جو خود کو اور ہندوستان

---

1 بحوالہ گزشتہ، جواہر لال نہرو، ص 166

کو اس خیال سے دھوکا دیتے ہیں کہ کمیشن کا بائیکاٹ کر کے وہ اس کے مقصد کو ناکام بنادیں گے ایسی دنیا میں رہے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں...... اس میں مزید اضافہ یہ کروں گا کہ جو لوگ بائیکاٹ کا اہتمام کر رہے ہیں...... ان کو ہر ماہ یہ ظاہر ہونے لگے گا کہ ان کی نمایندگی کتنی حقیر ہے اس رنگ برنگی اور بڑی جماعت کے لیے جس کے ہم ذمہ دار متولی ہیں۔ ان کو پتہ لگ جائے گا کہ لاکھوں مسلمان، لاکھوں اچھوت، لاکھوں کاروباری لوگ اور اینگلو انڈین طبقہ اپنے معروضات کمیشن کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اور جن کے متعلق آخر کار کمیشن اپنی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کرے گا۔"[1]

اردن کو اب بھی امید تھی کہ بائیکاٹ ناکام ہو جائے گا کیونکہ تقریباً تمام مسلمان اس منصوبے کے خلاف تھے جسے نہرو کمیٹی نے دستور میں مسلمانوں کی نمایندگی کے لیے پیش کیا تھا۔ جناح نے اس خلیج کو پاٹنا چاہا تھا مگر ناکام رہے تھے اور اب کسی قسم کی مفاہمت ممکن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس لیے اس کے خیال میں سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ اپنی پالیسی پر قایم رہا جائے یہاں تک کہ کمیشن اپنی رپورٹ پیش کردے۔

حکومت کا اس قدر بے حسی کا برتاؤ اور اس کے ساتھ فرقہ وارانہ چپقلش جو نہرو رپورٹ کے باعث پیدا ہو گئی تھی اور عام لوگوں میں بے چینی اور پریشانی، یہ سب باتیں ہندستانی لیڈروں کے لیے نہایت صبر آزما تھیں۔ ان کو دلی کوفت تھی۔ اس لیے جب دسمبر 1928ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو اس کے نمائندے غصہ اور جوش میں بھرے ہوئے تھے اور حکومت سے مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے درجہ نو آبادیات کے متعلق اپنی قرارداد نہرو کمیٹی کی سفارش کے

---

1 لارڈ برکن ہیڈ کی تقریر بمقام ڈنکاسٹر مورخہ 17 فروری 1928ء ماخوذ از ہندستانی سالانہ جنتری 1928ء جلد اول ص 92-391

بموجب اور جسے ورکنگ کمیٹی نے بھی منظور کر لیا تھا، پیش کی جس میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ 31 دسمبر 1930ء تک درجہ نوآبادیات کا قیام ضرور عمل میں آ جائے تو عام طور پر اس کی مخالفت کی گئی۔ گاندھی جی کو اس شدید اختلاف کے سامنے سر جھکانا پڑا اور انہیں مدت انتظار میں تبدیلی اس طرح کرنا پڑی کہ 31 دسمبر 1930ء کے بجائے 31 دسمبر 1929ء کر دیا۔

اب بازی لگ گئی اور ہندوستان میدان میں خم ٹھونک کر آ گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ حکومت اس کا کیا جواب دیتی ہے؟ اروِن نے سوچا کہ موتی لال نہرو سے ملاقات کر کے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ کانگریس کی قرارداد نہایت احمقانہ ہے۔ اروِن کا یہ ارادہ جرأت مندانہ کہا جا سکتا ہے لیکن سوراجیوں کے اس لیڈر کا سامنا کرنا خطرناک تھا جو سخت طعن آمیز جملے کسا کرتا تھا۔ اس لیے اروِن نے بہتری اسی میں جانی کہ موافق مزاج حلقوں سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے چمن لال سیتل واد سے جو ایک بڑے پایے کے لبرل لیڈر تھے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے بشرطیکہ حکومت برطانیہ خلوص نیت کے ساتھ کوئی بات کرے مثلاً وہ واضح طور پر اعلان کر دے کہ اصلاحات کا مقصد مملکتی درجے کا عطا کر دینا ہے۔

اروِن ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا جہاں سے وہ صاف دیکھ رہا تھا کہ صورت حال اس قدر ابتر ہو گئی ہے کہ اس کی مؤثر تدبیر ضروری ہے۔ "ورنہ امکان ہے کہ یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ بے قابو ہو جائے گا جتنا کہ فی الحال ہے اور پھر اس وقت ایسی کوئی تدبیر بہ آسانی مؤثر نہ ہو سکے گی جس کی سفارش ہماری پارٹی کا انتہا پسند طبقہ کرنا چاہے گا۔"[1]

اس نئے خیال کے تحت وہ جون 1929ء میں انگلستان روانہ ہو گئے تاکہ وہاں کی نئی لیبر حکومت سے اس باب میں صلاح و مشورہ کرے۔ اس کا نتیجہ 31 اکتوبر 1929ء

1۔ ماخوذ از "ارل آف برکن ہیڈ" ص 265

کے اعلان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہ بہت دیر میں ہوا۔ دسمبر 1928ء سے کانگریسی لیڈروں کے دماغوں میں مکمل آزادی کی نئی منزل مقصود سما چکی تھی اس لیے اپنے ذہنوں کو درجہ نوآبادیات کے حصول کے لیے تیار کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس فیصلے کو نو مہینے گزر چکے تھے اور رویے سخت ہو گئے تھے۔

اور پھر اس اعلان نے فوری طور پر جو خوشگوار اثرات پیدا کر دیے تھے، پارلیمنٹ میں جس قسم کی بحث چھڑی اس کے نتیجے میں سب زائل ہو گئے۔ آخر آخر 23/ دسمبر 1929ء کو وائسرائے اور گاندھی جی، موتی لال نہرو، سپرو، جناح اور وٹھل بھائی پٹیل کے درمیان ایک میٹنگ میں نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ گاندھی جی نے جو اس گفتگو میں پیش پیش تھے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ اس بات کی یقین دہانی کی جائے کہ گول میز کانفرنس اسی بنیاد پر منعقد کی جائے گی کہ ہندوستان کو فوراً درجہ نوآبادیات مل جائے۔

مملکتی درجے سے گاندھی جی کیا مطلب لیتے تھے اس کی تشریح انہوں نے 14/ نومبر 1929ء کے "ینگ انڈیا" میں کی۔ انہوں نے لکھا:

"میں مملکتی درجے کے دستور کا انتظار کر سکتا ہوں اگر مجھے واقعی اور عملاً مملکتی درجہ مل جائے۔ یعنی اگر واقعی نیت میں تبدیلی آگئی ہے اور برطانوی لوگوں کے دلوں میں ایک پر خلوص خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ہندوستان کو ایک آزاد اور باعزت قوم دیکھنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں جو انگریز افسران ہیں ان کے دلوں میں خدمت خلق کا سچا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فولادی سنگین دکھانے کے بجائے لوگوں سے خوش اخلاقی برتی جائے۔"[1] "جب کسی ہندوستانی سے برطانوی مقررین صاف

---

[1] ایم۔ کے۔ گاندھی: ینگ انڈیا۔ 14/ نومبر 1929ء

صاف یہ کہہ دیں کہ وہ اس موجودہ صدی میں درجہ نوآبادیات حاصل نہیں کرسکتا تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا کہ برطانیہ عظمیٰ معاملت نہیں کرنا چاہتا۔"

گاندھی جی اروِن سے کہہ چکے تھے کہ "اگر برطانیہ عظمیٰ ہم کو ایک مرتبہ بھی اس امر کی آزادی دے سکتا کہ ہم اپنے مستقبل کی تشکیل خود کرلیں تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا کہ ہم ایسی ذمہ داریاں لینے میں کس قدر جھجکتے ہیں اور کس قدر اس سے مدد کے خواستگار ہیں"۔[1]

ان بیانات کی روشنی میں گاندھی جی کے مطالبے کو انتہائی شدید نہیں کہا جاسکتا پھر بھی اروِن مطلوبہ یقین دہانی نہ کرا سکے۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات جیسے بھی کچھ رہے ہوں، شکوک کو رفع کرنے کے بجائے انہوں نے انہیں اور بڑھا دیا۔ اب گفت وشنید کا دوران بند ہوگیا، گاندھی جی کے باعث نہیں بلکہ حکومت کے اس انکار کے باعث کہ انہوں نے گاندھی جی کے درجہ نوآبادیات کے ایک معتدل تصور کو بھی منظور نہ کیا۔

گاندھی جی پر یہ الزام آیا کہ گفت وشنید کے ذریعے تصفیہ ہو جانے کا جو موقع ملا تھا وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ سپرو، پٹیل اور جناح جو وائسرائے سے ملاقات کرانے والوں میں تھے مایوس ہوگئے۔ یہ الزام بے بنیاد ہے اس لیے کہ اروِن نے یہ ملاقات دل میں کچھ کھوٹ رکھ کر کی تھی۔ انہوں نے وِجّ وُڈ بین سے کہا تھا "میں ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا جو بالکل نامعقولیت کی باتیں کرتے ہیں۔" وہ سمجھتے تھے کہ کانگریسی لیڈروں سے معقولیت کی بات بالکل ناممکن ہے۔ اس ملاقات کے بعد انہوں نے کہا گاندھی جی اور اس کے درمیان بظاہر کوئی مشترک بنیاد (گفتگو کرنے کی) نہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہندوستان کی سیاسی ترقیوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ تھی۔ وہ

---

1. کیمبل، جانسن، ایلن: وائی کاونٹ ہیلی فکس، ایک سوانح عمری، ص 233

اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ اس مسئلہ پر ہندوستان کے لوگوں کی نہیں بلکہ برطانوی پارلیمنٹ ہی کی رائے کو فیصلہ کن ہونا چاہیے۔ گاندھی جی قومی عزت و وقار کے خیال سے اس بات کو منظور نہ کر سکتے تھے۔ اگر سپرو، جناح اور پٹیل گاندھی جی کی پوزیشن کو پسند نہ کر سکے تو یہ بدقسمتی کی بات ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لوگ حق پر تھے۔

گاندھی جی نے آزادی کی قرارداد منظور ہو جانے کے بعد تحریر فرمایا:

"کانگریس کے نزدیک درجہ نوآبادیات کے معنی مکمل آزادی کے ہیں جس میں رضا کارانہ طور پر برطانیہ کے ساتھ شرکت باقی رہے...... کانگریس کی مکمل آزادی کسی بیرونی جائز مفاد کے لیے کوئی خطرہ ثابت نہ ہوگی یا کسی تنہا انگریز کے لیے جو بحیثیت ایک دوست کے یہاں رہے گا اور ان تمام قوانین کی پابندی کرے گا جو سارے ہندوستان کے لیے نافذ ہوں گے۔"[1]

اس الزام کا کہ ارون سے گفت و شنید کی ناکامی کے وہ ذمہ دار ہیں انہوں نے یہ جواب دیا کہ کلکتہ کانگریس کی ہدایات اور دہلی کے منشور کی انہوں نے پابندی کی۔ دونوں میں مرکزی بات یہ تھی کہ مملکتی درجے کا قیام فوری طور پر ہو۔ اس لیے اس سے کوئی فائدہ نہ تھا کہ ایسی حکمت عملی والی زبان استعمال کی جائے جس کا مطلب ہندوستان کے لیے کچھ ہو اور انگلستان کے لیے کچھ اور۔ "برطانیہ کے لوگوں کو اس امر کا احساس ہو جانا ضروری ہے کہ ان کی سلطنت کا خاتمہ ہونے کو ہے" گاندھی جی جانتے تھے کہ "یہ احساس ان کو اس وقت تک نہ ہوگا جب تک ہم ہندوستان میں اتنی طاقت پیدا نہ کر لیں کہ اپنی من مانی کرا سکیں"۔[2]

گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں سے ملاقات کے بعد ارون نے اپنے جس قسم

---

[1] ایم۔ کے گاندھی: ینگ انڈیا۔ 9 جنوری 1930ء

[2] ایم۔ کے گاندھی، "ہندوستانی معترضوں سے" ینگ انڈیا: 23 جنوری 1930ء

کے خیال کا اظہار کیا تھا اس سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ شہنشاہی حکومت میں اندرونی طور پر کیا تضادات ہوتے ہیں کیونکہ آخری تجزیہ یہی ظاہر کرے گا کہ ایک باہری نسل والوں کے قبضہ واقتدار اور ایک محکوم قوم کی خواہش آزادی کے مابین کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ یہ تضادات جو کچھ پنہاں سے تھے لیکن کبھی کبھو ن کی جھلک نمایاں ہو جاتی تھی آخر کار اب بالکل سامنے آگئے تھے اس تاریخی ڈراے، کی گتھیاں اپنے اختتام پر پہنچنے سے پہلے کھلنے لگی تھیں۔

لاہور نے اس کا ایک یادگار منظر ایکٹ ہوتے دیکھا۔ ایک بہت بڑے پنڈال میں جہاں پندرہ ہزار سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے تھے کانگریس کا اجلاس سخت بے چینی، سنجیدگی اور بے باک حوصلہ مندی کی فضا میں شروع ہوا۔ دسمبر کی 29 ر تاریخ تھی، اتوار کا دن، سہ پہر کے پانچ بجے تھے کہ خوبصورت، نوجوان، پر جوش اور بے باک صدر جواہر لال نہرو پنڈال میں داخل ہوئے اور چبوترے پر چڑھ گئے۔ ایک مختصر لیکن پر جوش خطبے میں انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی منزل مقصود مکمل آزادی ہے، دوسرے الفاظ میں '' مکمل آزادی برطانوی اقتدار اور برطانوی سامراج سے۔'' لیکن مکمل آزادی سے ان کا مطلب سب سے علاحدہ اور جدا ہو کر رہنے کا نہیں تھا بلکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد دنیا کے تمام ملکوں کا تعاون حاصل کرنا اور ان کا ایک وفاق بنانا تھا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ '' برطانوی سلطنت سے ہم آغوشی ایک خطرناک کام ہے۔ یہ اس محبت بھری آزادانہ ہم آغوشی کی طرح نہ ہے نہ ہو سکتی ہے جو جاں بخش ہوا کرتی ہے۔ اور اگر یہ ایسی نہ ہو تو موت سے ہم آغوشی ہو گی جیسا کچھ کہ گزشتہ میں ہو چکا ہے۔''[1]

---

1. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1929ء جلد دوم ص 292 انڈین نیشنل کانگریس کے چوالیسویں اجلاس کے موقع پر جواہر لال نہرو کا صدارتی خطبہ۔ بمقام لاہور بتاریخ 23 ر جنوری 1930ء

سال کے آخری دن دسمبر 1928ء کے کلکتہ کے اجلاس کے فیصلے کی بنیاد پر گاندھی جی نے ذیل کی قرارداد پیش کی:

"کانگریس اعلان کرتی ہے کہ کانگریس کے دستور کی دفعہ (1) میں لفظ 'سوراج' کے معنی مکمل آزادی کے ہوں گے اور مزید یہ اعلان بھی کرتی ہے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ کی ساری اسکیم کالعدم ہوگئی اور امید کی جاتی ہے کہ اب سارے کانگریسی اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کے لیے مکمل آزادی حاصل کرنے میں صرف کریں گے ...... یہ کانگریس مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں اور حکومت کی بنائی ہوئی کمیٹیوں (جس میں گول میز کانفرنس بھی شامل ہے) کے مکمل بائیکاٹ کی قرارداد بھی پیش کرتی ہے...... کانگریس قوم سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کانگریس کے تعمیری پروگرام میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لے اور کل ہند کانگریس کمیٹی کو اختیار دیتی ہے کہ وہ جہاں کہیں مناسب سمجھے سول نافرمانی کا پروگرام بہ شمول عدم ادائی ٹیکس شروع کر دے"۔ 1

ٹھیک نصف شب کو جب گھڑی میں بارہ بجے یہ قرارداد ووٹوں کی بہت بڑی اکثریت کے ساتھ منظور کر لی گئی۔ پرانا سال رخصت ہوگیا اور نئے سال کو خوش آمدید کہا گیا اور جب آزاد ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لہرایا گیا تو اس کثیر مجمعے نے "انقلاب زندہ باد" کا ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔

دوسرے دن صبح کو جب خورشید درخشاں کی کرنوں سے مطلع آسمان رنگین ہوا تو گویا وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دن کا آغاز تھا۔ آخر کار اب تمام غیر یقینی اور تذبذب ختم ہوگیا۔ منزل سامنے پیش ہوگئی۔ ممکن ہے کہ راہ میں جال ملیں گڑھے ملیں

1۔ حوالۂ ماسابق ص 300 انڈین نیشنل کانگریس کا چوالیسواں اجلاس، 31 دسمبر 1929ء قرارداد نمبر 4

لیکن سفر کی سمت اختیار کرنے میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہا۔

8-دستور سازی

بہت سی پارٹیوں کے قومی لیڈروں نے جن میں سیاسی طور پر بیدار ہندوستان کی نمائندگی بہت کثیر تعداد میں شامل تھی، برطانوی پارلیمنٹ کے اس اختیار تمیزی کو رد کر دیا تھا کہ وہی ہندوستان کے مستقبل کا تصفیہ کر سکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس، لبرل فیڈریشن، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، خلافت کانفرنس اور کئی دوسری پارٹیوں نے اس قانونی کمیشن کو تسلیم کرنے اور اس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا جسے پارلیمنٹ نے ہندوستان کے سیاسی معاملات کی تحقیقات کرنے اور ملک میں دستوری تبدیلیوں سے متعلق مشورہ دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔

وہ لوگ جنہوں نے کمیشن کو خوش آمدید کہنے کا فیصلہ کیا یا تو کسی پارٹی کے منحرف گروپ سے تعلق رکھتے تھے مثلاً مسلم لیگ کا وہ گروپ جس کے لیڈر محمد شفیع تھے یا فرقہ واری مفاد رکھنے والوں کے نمائندے تھے...... یوروپین، اینگلو انڈین، غیر برہمن، اچھوتوں کے طبقے وغیرہ۔

لیگ کے اس گروپ کے متعلق جس کی تنظیم محمد شفیع نے کی تھی اور دسمبر 1928ء میں بمقام لاہور ایک جلسہ طلب کیا تھا ایک مسلمان مصنف لکھتا ہے:

"بہت جلد واضح ہو گیا کہ لاہور میں ایک علاحدہ اجلاس بلانے کا مقصد یہ تھا کہ سائمن کمیشن کو اعانت دی جائے اور ہندوستان میں سامراج کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں کیونکہ اس کے بغیر برطانیہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت ثابت کرنے کا کوئی موقع ہی ان لوگوں کو نہ تھا۔"[1]

---

1 محمد نعمان: مسلم انڈیا (آل انڈیا مسلم لیگ کا عروج وارتقا) ص 264

قانونی کمیشن کی مخالفت نے ہندوستانی لیڈروں پر یہ لازم کر دیا تھا کہ وہ اس بات کے مظاہرے کا فرض بھی انجام دیں کہ ہندوستان نے جس بات کو نامنظور کر دیا ہے اس سے انکار کرنے ہی میں وہ متحد نہیں بلکہ خاص خاص فرقوں کی منظوری سے وہ ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کرنے میں بھی متحد ہے۔

یہ واقعی ایسا جرأت مندانہ اقدام تھا جس میں طرح طرح کی عجیب پیچیدگیاں تھیں۔ 1927ء تک تو یہ بات واضح تھی کہ جہاں تک برطانیہ سے ہندوستان کو اختیارات تفویض کرنے کا سوال تھا ہندوستانی لوگ ہم خیال نہ تھے کیونکہ خواہ اسے مملکتی درجے کا نام دیا جائے خواہ آزادی یا سوراج کہا جائے سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ اس بات پر بھی عام رضامندی تھی کہ اختیارات کو منتقل کرنے کا یہ کام، چند ضروری حدود کے ساتھ، جلد از جلد انجام پا جانا چاہیے۔

برطانوی حکومت کی رائے یہ تھی کہ سیاسی ترقیوں کی منزل مقصود درجہ نوآبادیات کا حاصل کرنا ضرور ہے لیکن اس منزل تک فوراً نہیں پہنچا جا سکتا اس میں خاصا وقت لگے گا اور پہلے سے یہ بتانا ممکن نہیں کہ رفتار ترقی کیا ہوگی۔ اس سفر پر مرحلوں کی تعداد اور اختیارات کی منتقلی کی مقدار کا تعین پارلیمنٹ کے فیصلے پر چھوڑنا ضروری ہے۔ قوم پرست ہندو اور مسلمانوں کے مقاصد کو ناکام بنانے کی کوشش میں ٘مت مسلمان، والیان ریاست اور اچھوتوں پر بھروسہ کرتی تھی۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ان لوگوں کو حکومت کا طرف دار بنا لیا جائے اور قوم پرستی کے مفاد سے ان کو علاحدہ رکھا جائے۔

اس وقت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ایک خود مختار ہندوستان کا متحد اور متفق اکائی ہونا ضروری ہے۔ برطانوی حکمراں قومی یک جہتی کو خود مختاری کے لیے پہلی شرط قرار دیتے تھے اور اس پر بڑا زور دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو پورا یقین تھا کہ مکمل یک جہتی، ناممکن ہے اس لیے خود مختاری کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

مارلے سے لے کر برکن ہیڈ اور پیل تک برطانیہ کے تمام سیکریٹری آف اسٹیٹ ہندو مسلم اختلافات کا رونا روتے رہے اور اس قضیے کو ذمہ دار حکومت کی راہ میں ایک سنگ راہ بنائے رکھا۔ اس زمانے کے تمام وایسرائے بھی یہی کہانی طوطے کی طرح رٹتے رہے۔ مانٹیگو نے فرقہ وارانہ اختلاف کو یوں بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ "یہی مشکل سب باتوں پر حاوی ہے۔" [1] لائڈ جارج نے ارشاد فرمایا کہ "ہندوستان کو ایک اکائی مان کر یعنی وہاں کے لوگوں کو ایک مان کر گفتگو کرنا مقدمے کے ابتدائی واقعات سے ناواقفیت کا اظہار ہے" اس کے نزدیک "ہندوستان میں کم از کم تیس یا چالیس قومیں آباد ہیں۔" [2]

برکن ہیڈ جس نے 4/نومبر 1927ء کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا تھا کہ وہ اپنے دستور کا خاکہ خود بنا کر دکھلائیں، وایسرائے کے نام اپنے خط مرقومہ 5/جنوری 1928ء میں لکھتا ہے:

"جیسا کہ شاید آپ نے میری تقریروں سے اندازہ لگا لیا ہو کہ میں اس بات سے قطعی متفق ہوں کہ ان شورش پسندوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ لوگ خود اپنی تجاویز پیش کریں۔ کیونکہ اول تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ لوگ قطعی اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ اس میں جو دستوری اور تعمیری مشکلات ہیں ان سے عہدہ برآ ہو سکیں اور دوسرے یہ کہ اگر وہ عہدہ برآ ہو بھی سکے تو بھی مجھے یقین ہے کہ وہ اتحاد جو ایک عمومی فضا میں پیدا ہو جاتا ہے اس وقت فوراً نیست و نابود ہو جائے گا۔" [3]

تھیوڈور ماریسن جو ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل رہ چکے تھے اور اب

---

1. ماخوذ از آر، کوپ لینڈ: دی انڈین پرابلم، جلد اول، ص 56
2. دارالعوام کے مباحثے۔ پانچویں سیریز، جلد 321، کالم 1315، لائڈ جارج کی تقریر مورخہ 7/نومبر 1929ء
3. اروِن پیپرس: ارل آف برکن ہیڈ بنام وایسرائے، 5/جنوری 1928ء

سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ایک ممبر تھے ان کی رائے یہ تھی: "ہندو اور مسلمان جو کسی ایک گاؤں، کسی ایک شہر یا ضلع میں بستے ہیں مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں میں اتنا زیادہ فرق اور روحانی علاحدگی ہے کہ ویسی ہم کو یورپ کی کسی دو قومیتوں میں نہیں ملتی۔" 1

اردن نے اپنی تقریروں میں جو اس نے چمپسفورڈ کلب میں 17 / جولائی 1926ء کو اور مجلس قانون ساز میں ستمبر 1927ء میں کیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا پسند کیا کہ وہ اپنے جھگڑے طے کرلیں۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ حکومت کی سب سے بلند مرتبت شخصیت کی طرف سے اس قسم کا وعظ اور پند مسئلے کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دے گا خصوصاً اس وقت جب کہ حکومت اس مسئلے کا حل خود انہیں فرقوں پر چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ اپنی دوسری تقریر کے بارے میں اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا:

"مجھے امید نہیں ہے کہ اس کا براہ راست کوئی فائدہ ہوگا لیکن مجھے خاصا یقین ہے کہ بلاواسطہ یہ لوگوں کو اس بات پر قائل کرسکے گی کہ آج کل جس سب سے مشکل مسئلے سے وہ دوچار ہیں اسے خلوص کے ساتھ حل کرنے میں ہم ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اس خواہش کو کامیاب دیکھنے کے لیے خطرات مول لینے کو بھی تیار ہیں۔ اگر (چونکہ یہ پیش بینی قرین قیاس ہے) کمیشن آخرکار یہ کہتا ہے کہ موجودہ فرقہ وارانہ مناقشات کے باعث حکومت خود اختیاری میں زیادہ توسیع ناممکن ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس تلخ حقیقت بیانی کا ناخوشگوار اثر ان معقول لوگوں کے ذہنوں پر کچھ

---

1. پولیٹیکل انڈیا مرتبہ سرجان کمنگ، باب پنجم، مسلمانوں کی تحریکات از تھیوڈور ماریسن (مطبوعہ ایس چاند اینڈ کمپنی، دوسرا ایڈیشن 1968ء)

کم ہی ہوگا جن کو پہلے سے یہ یقین دلایا جا چکا ہے کہ حکومت خلوص سے ساتھ ان کی اس معاملے میں مدد کرنا چاہتی ہے۔" 1

انہوں نے برکن ہیڈ کو دوسرے خط میں مطلع کیا" یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں باوجود اپنی عادتاً چیخ پکار کے ہندوستان کی نمایندگی نہیں کرتیں" 2 زمیندار پیشہ اور اچھوت لوگ خاموش رہتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے بتایا" وہ لوگ بہرحال ہمارے بہترین دوست ہیں اور چاہے جتنا غیر جانب دار رہنا ہمارا فرض کیوں نہ ہو ہم کو اپنے دوستوں سے بے وفائی ان نئے ساتھیوں کے مقابلے میں نہ کرنا چاہئے جن کی دوستی بہت ناقابل اعتبار رہی ہے۔" 3

مسلمان برطانوی حکومت کے دوست تھے اور دوسرے فرقے ناقابل اعتبار یعنی دوسرے الفاظ میں دشمن: اتنا کہنے کے بعد اس کے لیے یہ لکھنا ضروری ہوگیا:" اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات واضح ہے کہ اگر مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا ہے تو موجودہ نظام میں فی الحال کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔" 4

وایسرائے نے جو پالیسی اختیار کی اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے برکن ہیڈ نے لکھا:

"میں سائمن کو مشورہ دوں گا کہ ہر موقع پر ان اہم لوگوں سے ضرور ملاقات کریں جو کمیشن کا بائیکاٹ نہیں کر رہے ہیں خصوصاً مسلمانوں اور اچھوتوں سے۔ ان کی نمائندہ مسلمانوں سے جو ملاقاتیں ہوں گی انہیں وسیع پیمانے پر شایع بھی کراتا رہوں گا

---

1 اروِن پیپرس۔ وایسرائے بنام برکن ہیڈ 3/اگست 1927ء

2 حوالہ گزشتہ 26/مئی 1927ء

3 حوالہ گزشتہ 3/اپریل 1927ء

4 حوالہ گزشتہ 11/مئی 1927ء

پوری پالیسی اب صاف ہے۔ دراصل کثیر ہندو آبادی کو یہ خوف دلانے کے لیے ہے تا کہ وہ یہ سمجھیں کہ مسلمان کمیشن والوں سے مل گئے ہیں اور اس لیے ممکن ہے کہ کمیشن ایسی رپورٹ دے جو ہندوؤں کے لیے تباہ کن ہو اور اس طرح جناح کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کی پوری مدد حاصل کر لے۔"[1]

مسلمانوں کی اکثریت مکڑی کے اس جال میں پھنسی یا نہیں جیسا کہ اروِن کو دعوا تھا، لیکن جناح کا یہ فعل بہت قابل تعریف تھا کہ انہوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ "سائمن کمیشن ہماری روحوں کو ذبح کرنے کے لیے ہے۔"[2]

سوراج کے لیے دستور سازی کے کام کو شدید برطانوی انکار بلکہ دشمنی کے پس منظر میں رکھ کر جانچنا ضروری ہے۔ یہ امر تو طے شدہ تھا کہ آزادی کی بنیاد کو ہندو مسلم یک جہتی پر قایم ہونا تھا۔ گاندھی جی اور جناح دونوں اتحاد اور آزادی کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے تھے۔

ہندو مسلم مسئلے کی دو خاص صورتیں تھیں ایک صورت تو مذہبی اور سماجی یا ثقافتی تھی اور دوسری سیاسی۔ مذہبی سماجی اختلافات تو بنیادی تھے لیکن مدتوں ایک ساتھ رہنے کے باعث ایک رواداری پیدا ہو گئی تھی اور دونوں فرقوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا سیکھ لیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا تھا اور دونوں نے ایک دوسرے سے بہت سے ثقافتی عناصر بلکہ مذہبی اثرات بھی قبول کر لیے تھے۔ پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ ان میں سماجی اتحاد نہ تھا۔ دونوں کسی ایک سماجی تنظیم کے ممبر نہ تھے۔ تاریخ یہ حقیقت بھی بتاتی ہے کہ کبھی کبھی بعض مقامی اسباب کے باعث ان

1۔ حوالہ گزشتہ: برکن ہیڈ بنام وایسرائے 9 فروری 1928ء

2۔ محمد نعمان (حوالہ گزشتہ) ص 265

کے اختلافات شدید ہنگاموں کی شکل اختیار کر لیتے تھے لیکن بیک وقت سارے ملک میں ایسے مناقشے اور جھگڑے پیدا ہو گئے ہوں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سیاسی اختلافات کا جہاں تک تعلق ہے ان کو تو برطانوی افسروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے پیدا کردہ تھے کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور حکومت کے اعلیٰ ترین افسروں کے بیانات سے ثابت ہے۔

دارالامرا میں اولیور نے جب یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے معاملات کے متعلق انہیں مطلع کیا جائے تو برکن ہیڈ نے اپنی تقریر کے دوران بتایا تھا کہ "اس لیے میری رائے میں ان وجوہات کی بنا پر جو میں نے پیش کیے ہیں اس بات سے انکار کرنا غلط ہوگا کہ اصلاحات اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان موجودہ کشمکش میں کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔" 1

اس مسئلے کا تجزیہ اروِن یوں کرتے تھے: "جس مخالفت کا مظاہرہ فرقوں کے بعض افراد یا ان کے بعض گروہوں نے حال ہی میں کیا ہے وہ کچھ حد تک کسی مذہب سے روایتی وفاداری پر مبنی نہیں معلوم ہوتی بلکہ نئے خیالی حقوق کی طلب ہے جسے اقتصادات سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ یہ رجحان موجودہ مناقشات میں اتنا نمایاں رہا ہے جتنا کہ برطانوی دورِ حکومت میں کبھی پہلے نہیں ہوا۔" 2

یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ برطانوی لوگ کھلم کھلا اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے لیے کیوں عذرات پیش کر رہے تھے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہم جس طرح کی حکومت کر رہے ہیں وہ کسی خود غرضانہ ذاتی مفاد کی بنا پر نہیں بلکہ شریفانہ

---

1 دارالامرا کے مباحثے۔ پانچویں سیریز، جلد 65 کالم 306 برکن ہیڈ کی تقریر مورخہ 28 جولائی 1926ء

2 ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1926ء جلد دوم ص 223۔ 17 اگست 1926ء کو شملہ میں وائسرائے کی تقریر مجلس قانون ساز میں۔

اخلاقی محرکات کی بنا پر ہے یعنی ہم ایسے لوگوں کو جو نہایت بے ایمان، ناتواں اور غیر منظم ہیں ایک طاقتور، روشن خیال اور ایمان دار نظام حکومت کے ذریعے مہذب اور ترقی یافتہ بنا کر اوپر اٹھانا اور اس طرح ایک پسماندہ ملک کو ایک اعلیٰ تہذیب سے متعارف کرانا چاہتے ہیں۔

برطانوی لوگوں کو اس قسم کا کوئی اعتذار پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ہر حکومت کی بنیاد دو ستونوں پر قایم ہوتی ہے۔ مادی طاقت اور اخلاقی وقار --- طاقت ضرورت سے مناسبت رکھتی ہے یعنی اس کی مقدار مخالف کی طاقت کو دیکھ کر متعین ومقرر کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں ہر حکومت یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسری طاقت مقابل میں ایسی نہ پیدا ہو جائے جو اس پر غلبہ حاصل کرلے۔ طاقت کا توازن قایم رکھنے کا یہی اصول ہے۔ موجودہ یورپ کی پوری تاریخ قوت کے توازن کے لیے برطانیہ کی تدابیر کے اردگرد چکر لگاتی رہی ہے یعنی اس کی کوشش یہی رہی ہے کہ یورپ کی کوئی طاقت (حکومت) یا طاقتوں کا گٹھ جوڑ مقابل میں آکر اس کے لیے خطرہ نہ بن جائے جیسا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں فرانس تھا اور بیسویں صدی میں روس اور جرمنی ہو گئے تھے۔

یہی حکمت عملی یعنی ہندوؤں کو مسلمانوں کا مدمقابل بنا دینا یہاں کی سامراجی حکومت نے فطرتاً اختیار کی تاکہ دونوں میں سے کوئی فرقہ اتنا با اثر نہ ہو جائے کہ وہ برطانوی راج کے لیے ایک خطرہ بن جائے۔

لیکن محض طاقت استقلال کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ اس کو آخری اختیار کے طور پر پس پشت رکھنا پڑتا ہے۔ حکومت کو عام طور پر اپنے اخلاقی وقار کے بل بوتے چلانا ہوتا ہے اور اپنی رعایا میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تابعداری حاصل کرنا پڑتی ہے اور جتنے زیادہ سے زیادہ گروہوں کی منظوری ممکن ہو خصوصاً سر برآوردہ لوگوں کی، حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ناگزیر چپقلش پیدا ہوگئی۔ اپنی سلطنت کی سالمیت برقرار رکھنے اور

اپنے اقتصادی اور سیاسی مفادات کا تحفظ کرنے والے حکمرانوں سے ان محکوموں کی جو اختیارات کی منتقلی کے لیے کوشاں تھے۔ ملک کی مادی اور اخلاقی تعمیر نو اور ترقی نیز قومی عزت ووقار کے اظہار واثبات کے لیے آزادی ضروری تھی۔

بدقسمتی سے اتحاد اور آزادی کے مسائل پر واضح غور وخوض مفقود تھا۔ ہندو اور مسلمان جھگڑوں میں مصروف تھے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ یہ جھگڑے شروع میں تو مذہبی اور سماجی نوعیت کے تھے لیکن انیسویں صدی کے آخری ربع میں ان پر سیاسی رنگ چڑھ گیا تھا۔ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں فرقے سماجی رنگارنگی سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی طرف مائل تھے جس میں قومی بیداری شامل تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں فرقہ وارانہ اور قومی بیداریاں دونوں گہری بھی ہوگئی تھیں اور وسیع بھی۔ اس موقعے پر ملکی معاشرے کا تخیل جو کہ قومیت کی بنیاد ہوتا ہے، مذہبی فرقہ واریت کے ساتھ الجھ گیا۔ لائڈ جارج کا خیال تھا کہ ہندوستان تیس یا چالیس فرقوں میں منقسم ہے لیکن اب یہ صورت بالکل نہ تھی۔ اب تو یہ صرف دو فرقوں یا قومیتوں میں منقسم تھا اور دونوں میں ایک متعین جغرافیائی خطے سے وابستگی کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ ہندوؤں کے لیے تو یہ خطہ پورا برصغیر ہندوستان تھا۔ ہندوستان کی سرحدوں سے باہر ان کو کسی ملک سے کوئی دلچسپی نہ روایتاً تھی نہ پسند خاطر کی وجہ سے۔ ان کی قوم پرستی اور وطنیت ہندوستان تک محدود تھی۔ اس لیے ان کے لیے حب الوطنی کے معنی تھے اس ملک سے محبت جس میں ہندو رہتے تھے۔ اس طرح ہندویت اور قومیت کے تصورات گڈمڈ ہوگئے تھے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے مذہبی تعلقات دنیا بھر سے تھے۔ ملت اسلامیہ (مذہبی سوسائٹی) بہت سے ملکوں میں عیسائی معاشرے کی طرح پھیلی ہوئی ہے لیکن مسلمانوں میں تمام دنیا میں مخصوص جغرافیائی خطوں میں بسنے کے باجود فی زمانہ ملکی

قومیت ترقی کر رہی ہے اس لیے اب بھی عالمگیر معاشرے سے ان کے تعلقات برقرار ہیں۔ان کے واسطے سردست اسلام کی محبت اولین شے ہے حب الوطنی اس کے بعد۔

تقسیم کے دنوں سے ہندوستانی مسلمان بھی ایک ایسے ملکی وطن کے تصور سے آشنا ہو گئے جہاں کہ آبادی خاص طور سے مسلمانوں پر مشتمل ہو۔اس کے کچھ عرصہ بعد شمال مغربی حصوں اسی قسم کا جذبہ وہاں کے مسلمانوں میں پیدا ہو گیا انہوں نے دیکھا کہ پنجاب،شمالی مغربی صوبہ،سندھ اور بلوچستان اپنے فرقے کے لیے ایک ملک کی بنیاد بن سکتے ہیں لیکن اس مغربی علاقے میں سوائے مذہب کے اور کسی قسم کا اتحاد نہ تھا۔قومیت کا ایک جذبہ تو ضرور پیدا ہوا لیکن ایک مذہبی معاشرہ کا تصور اس پر غالب آ گیا۔سیاسی اور مذہبی احساسات گڈ مڈ ہو گئے۔شمال مغربی اور مشرقی معاشرہ کے لیے جو بات فطری طور پر جائز اور صحیح ہوتی اسے غلط طور پر اس تمام اقلیت میں پھیلا دیا گیا جو سارے ہندوستان میں مل جل کر رہ رہے تھے۔مشرقی علاقے کے باشندے تو جائز طور پر ایک قوم کہلانے کے حقدار تھے لیکن مغربی علاقے کا معاملہ اتنا قابل قبول نہ تھا۔اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے کہ وہ آزاد خود مختار صوبوں کی صورت میں رہتے یا ایک وفاقی تنظیم کے جز و بن کر رہتے۔بقیہ ہندوستان میں اسلام،عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو قومیت کا درجہ طلب کرنے کا استحقاق نہ تھا۔ان کو اقلیت کا درجہ قبول کرنا پڑتا۔وہ جو کچھ جائز طور پر طلب کر سکتے تھے وہ صرف یہ حق تھا کہ ان کے مذہب،ان کے کلچر اور زبان کی حفاظت کی جائے۔دیگر سیاسی اور اقتصادی امور میں بلا کسی قانونی اور انتظامی تفریق کے وہ دوسروں کے برابر تھے کسی جداگانہ یا خاص برتاؤ کے حقدار نہ ہو سکتے تھے۔

حالات کی رفتار کا یہ مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ کس طرح سیاسی مفادات مذہبی فرائض اور روایات میں دخیل ہو گئے اور بالآخر ان پر حاوی ہو گئے۔1857ء

کے انقلاب کے زمانے میں عہد وسطیٰ کے جاگیرداری کے تصورات جب ختم ہو گئے اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی سے جدید وضع کے سیاسی خیالات نے مختلف گروہوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ حکومت کی کارگزاریوں کا عوام کے معاملات سے کیا اور کس قدر تعلق ہے اس کی اہمیت کا اندازہ بنگال میں تو بہت پہلے یعنی رام موہن رائے کے زمانے میں لگا لیا گیا تھا لیکن دراصل جب سیاسی تنظیموں مثلاً زمینداروں کی سوسائٹی (جس کی بنیاد، دوار کا ناتھ ٹیگور نے 1838ء میں رکھی تھی) برٹش انڈین ایسوسی ایشن (1851ء) سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن (1877ء میں سید امیر علی نے قایم کی) محمڈن لٹریری سوسائٹی (1863ء، قائم کردہ نواب عبداللطیف) انڈین ایسوسی ایشن (1875ء، قایم کردہ سریندر ناتھ بنرجی) وغیرہ کی تشکیل ہوئی تب ہی سیاست کا رواج کل ہند پیمانے پر ہوا۔ یہ اپنے انتہا پر اس وقت پہنچا جب 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔

کانگریس کا وجود میں آنا تھا کہ وطنیت کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کے محاذ بھی قایم ہونے لگے کیونکہ تقریباً اسی زمانے میں آریہ سماج اور تھیوسوفیکل سوسائٹی ہندوؤں میں مذہبی جذبات کا احیاء کر رہی تھیں اور چند افراد مثلاً سید احمد خاں اور سید امیر علی اور چند دیگر تنظیمیں مثلاً فرنگی محل، ندوۃ العماء (لکھنؤ) مدرسہ دیو بند اور مسلمان علماء اور مصلحین مسلمانوں کے مذہبی جذبات ابھار رہے تھے۔

اس کے سیاسی نتائج جلد ہی ظاہر ہو گئے۔ 1893ء میں گؤ کشا کے سوال پر جھگڑا شروع ہو گیا اور بلوے ہونے لگے۔ تلک کو ان میں حکومت کی پالیسی کا خبیث ہاتھ نظر آیا۔ اس کے بعد گاؤ کشی کے لیے جھگڑے اور لڑائیاں اور مسجدوں کے سامنے گانا بجانا جو زیادہ شہروں کے عوامی طبقے تک محدود تھا ملک کے تقریباً ہر حصے تک پھیل گیا۔ فرقہ وارانہ پارٹیوں کے سیاست دانوں کو اپنے ذاتی مفادات کو ترقی دینے

کے مواقع نظر آئے۔

تقسیم بنگال اور اس کے خلاف احتجاجی ہنگاموں نے سلگتی ہوئی آگ پر تیل ڈال دیا جو 1906ء میں بھڑک اٹھی۔ برطانوی لوگوں نے اس کو اور ہوا دی۔ 1909ء اور 1919ء کے قوانین نے علاحدگی کو قانونی شکل دے دی۔

اس آگ کو بجھانے کے لیے بہت سی کوششیں کی گئیں کیونکہ ہندو اور مسمان دونوں کو اندازہ ہوگیا کہ اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی اور بربادی ہوسکتا ہے۔ ان کوششوں کی تاریخ پچھلے ابواب میں لکھی جا چکی ہے۔ 1919ء میں گاندھی جی نے ہر قسم کی کوششیں شروع کردی تھیں کہ دونوں فرقے متحد ہوجائیں۔ مسلمانوں کی خلافت تحریک میں ان کی مدد خاص اسی مقصد کے لیے تھی کہ دونوں میں مستقل طور سے اتحاد کرادیں۔

1924ء میں انہوں نے اپنی آخری اور سب سے بڑی کوشش کی جب کہ انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اکیس دن کا برت رکھا۔ ان کی یہ کوشش رائگاں گئی اس لیے کہ ان کا طریقہ کار غلط تھا۔ اپنی افتادِ طبع کے بموجب انہوں نے مسئلے کے مذہبی اور اخلاقی پہلو پر زور دیا۔ بنیادی طور پر ان کو عوام سے دلچسپی تھی اور ان فسادات میں انہیں عام آدمی کی ضد اور جہالت نظر آئی۔ پڑھے لکھے دانش وروں کی طرف ان کی توجہ سرسری تھی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کے سیاسی خدشات اور رقابتیں اتنی گہری یا اتنی قدیم نہیں ہیں جتنے کہ مذہبی اختلافات۔ آخر الذکر معقول تدابیر سے قابل اصلاح تھے۔ برخلاف اس کے اول الذکر کی اصلاح کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کی عادتوں اور رویوں میں انقلاب لانا ضروری تھا۔

مئی 1926ء میں انہوں نے اپنی ناامیدی ان الفاظ میں ظاہر کی:

میں نے اپنی ناقابلیت کا اقرار کرلیا ہے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ مجھے ایسا

طبیب نہیں سمجھا گیا جو اس مرض کا علاج کر سکے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہندو یا مسلمان میرے طریقہ علاج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس لیے آج کل اس مسئلے کا میں صرف سرسری طور پر ذکر کرتا ہوں۔[1]

گاندھی جی پورے طور پر اس معاملے میں دانش وروں کی شرکت سے ناواقف نہ تھے جیسا کہ ذیل کی تحریر سے ظاہر ہے:

"یہ ہندوستان کا خواندہ طبقہ ہی ہے جو پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ مجھے اقرار ہے کہ مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں ان سب کو متفق کر سکوں۔ ان کا طریقہ کار میرا طریقہ کار نہیں ہے۔ میں بنیاد سے اوپر کی طرف کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھنے والے کو یہ طریقہ پہلے طریقے کے مقابلے میں بہت صبر آزما، مشکل اور پیچیدہ نظر آئے گا"۔ [2]

1926ء میں گاندھی جی تمام سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ 1927ء میں انہوں نے اپنے تعمیری پروگرام کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی سوت کاتنے والی تنظیموں کو دیکھا۔ 1928ء میں انہوں نے اپنے آپ کو سابرمتی آشرم کی چہار دیواری میں محدود کر لیا۔ صرف کبھی کبھی ینگ انڈیا میں سیاسیات پر روشنی ڈالتے تھے۔

ان برسوں میں ملک سخت تکلیف کے دور سے گذر رہا تھا اور لیڈران اپنی پوری طاقت فرقہ وارانہ یک جہتی کا حل تلاش کرنے میں صرف کر رہے تھے۔

1926ء میں فرقہ وارانہ تشدد کے باعث خوں ریزیاں سارے ملک میں ہوئی تھیں۔ پورے سال میں پینتیس فسادات ہوئے تھے۔ سب سے بڑا فساد کلکتہ میں

---

1 ایضاً (بحوالہ گزشتہ) راوی: کیمپل جانسن ص 156

2 مہاتما از ڈی۔ جی تنڈولکر، جلد دوم، ص 309

اپریل، مئی اور جولائی میں ہوا جس نے کلکتے کو رسوا کر دیا۔ اور یہ قصہ 23/ دسمبر کو سوامی شردھانند کے قتل سے اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

1927ء بھی کچھ بہتر سال ثابت نہ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی، فسادات اور دونہایت دل آزار کتابوں ، رنگیلا رسول اور رسالہ ورتمان کی اشاعت کے باعث اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ 1928ء میں اس بربریت میں کمی ہوئی کیونکہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہو گئے تھے۔

سوامی شردھانند کے قتل کے بعد گاندھی جی نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ: " میں بے بس ہوں اور سب باتوں سے بری الذمہ ہوتا ہوں لیکن مجھے خدا پر یقین کامل ہے...... میرے اندر کوئی چیز مجھے بتاتی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہماری امیدوں سے پیشتر ہی ہو جائے گا اور یہ کہ خدا ایک دن اس اتحاد کو ہم پر مسلط کر دے گا۔ ہم خواہ اسے نہ چاہیں اسی لیے میں نے کہا ہے کہ اب یہ معاملہ خدا کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ "[1]

افسوس کی بات ہے کہ ان تکلیف دہ برسوں میں گاندھی جی کے مشورے اس اہم مسئلے کے متعلق حاصل نہ ہو سکے جو ان کو اتنا عزیز تھا۔ لیکن کام کسی کا انتظار تو کر نہیں سکتا تھا۔ واقعات کے ناقابل برداشت دباؤ سے مفر ناممکن تھا۔

جو کانفرنس فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے طلب کی گئی اس نے اپنی توجہ زیادہ تر مذہبی اور سماجی اسباب مثلاً گاؤ کشی، مسجدوں کے سامنے گانا بجانا، تبدیلی مذہب، فرقہ وارانہ تنظیم وغیرہ پر مرکوز کی۔ لیکن جہاں تک سیاسی سوالات کا تعلق تھا1914ء کے بعد سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ انتخابی اداروں، اسمبلی، صوبائی کونسلوں، مقامی گورنمنٹ بورڈوں، یونیورسٹی کے سینیٹوں وغیرہ اور سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا مسئلہ حل کیا جائے۔

1۔ لوئی فشر: دی لائف آف مہاتما گاندھی۔ ص270

ان مسائل پر کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے فیصلے الگ کیے بغیر ایک دوسرے سے مل کر کرنے کے جیسے کہ پہلے لکھنؤ میں کیے تھے۔ کہیں کہیں وقتاً فوقتاً اس قسم کی کوششیں ضرور کی گئیں۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ ان میں سے وہ معاہدہ تھا جسے سی، آر، داس نے تیار کیا تھا لیکن اسے کانگریس نے کوکناڈا میں نامنظور کر دیا تھا۔

9-فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے جدوجہد

ایک طرف تو فسادات کے باعث صورت حال بہت خطرناک ہوگئی تھی اور دوسری طرف قوم پرستوں کو بڑی عجلت تھی کہ اختیارات کی منتقلی ہو جائے۔ ان دونوں باتوں نے سیاسی پارٹیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور وخوض کریں۔ برکن ہیڈ نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے چیلنج دیا تھا کہ ہندوستانی لیڈر اپنا دستور خود بنا کر دکھائیں اور یہ بھی ارشاد کیا تھا کہ عقلمند لوگ تاریخوں کے غلام نہیں ہوتے۔ یہ فوری طور پر عمل کرنے کے لیے ایک کھلی دعوت تھی۔ ارون کی واعظانہ تقریروں نے اس معاملے کو فوری تعمیل طلب بنا دیا۔

دسمبر 1926ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ گوہاٹی میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اس کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) سے کہا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے مشورے سے فوری اقدامات کیے جائیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود افسوس ناک اختلافات کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

سری نواس آئینگر نے جو 1927ء کے لیے کانگریس کے صدر بنائے گئے تھے کانگریس کے اجلاس کے فوراً بعد مختلف پارٹیوں کی ایک کانفرنس منعقد کرانے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مجلس قانون ساز کے دہلی میں اجلاس کے دوران

وہ علاحدہ علاحدہ ہندو اور مسلمان لیڈروں سے مشورے کرتے رہے لیکن فضا سازگار ہوتی نظر نہ آئی۔ بعض لوگوں کے نزدیک تو صورت حال نا قابل علاج تھی۔ یہ معاملہ کس قدر بے قابو ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 16/ مارچ 1927ء کو سنکرن نائر نے کونسل آف اسٹیٹ میں ایک تجویز پیش کی جس میں گورنمنٹ سے سفارش کی گئی تھی کہ ہندوستان کو ذمہ دار حکومت بنانے کے سلسلے میں کوئی مزید قدم نہ اٹھایا جائے تاوقتیکہ ہندو اور مسلمان علاحدہ نمائندگی ترک کرنے پر راضی نہ ہو جائیں۔

اس تجویز سے کل پارٹیوں اور قوم پرستوں کے دلوں پر چوٹ لگی اور ہندو اور مسلمان فرقہ پرست بھی فوری عمل کے لیے تیار ہو گئے۔ جناح نے مسلمان لیڈروں کو جمع کیا اور 18/ مارچ کو ان سے صلاح ومشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ مسلمان لیڈروں کی ایک میٹنگ طلب کی جائے۔

یہ میٹنگ 4/ مارچ کو دہلی میں ہوئی۔ اس میں تقریباً تیس مختلف الخیال سرکردہ مسلم نمائندے مثلاً ترقی پسند لیڈر جیسے جناح، راجہ محمود آباد، انصاری، محمد علی، محمد یعقوب اور قدامت پسند جیسے محمد شفیع، عبدالقیوم، غضنفر علی خاں شریک ہوئے۔ جناح نے صدارت کی۔

طویل بحث ومباحثے کے بعد اس میٹنگ میں یہ قرارداد منظور کی گئی:

''جہاں تک مختلف مجالس قانون ساز میں نمائندگی کا تعلق ہے جو آئندہ کسی دستور کی اسکیم کے تحت ہو، مسلمانوں کو ذیل کی تجاویز کی بنیاد پر کوئی تصفیہ قبول کر لینا چاہیے۔''

1- سندھ کو بمبئی سے علاحدہ کر کے ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔

2-شمال مغربی سرحدی صوبے میں اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ اسی طرح

کیا جائے جس طرح کہ کسی دوسرے صوبے میں ہو۔

اس صورت میں مسلمان مشترکہ نمایندگی ان تمام صوبوں میں منظور کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس کے لیے بھی راضی ہیں کہ وہ سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اقلیت کو وہی سہولتیں دیں گے جو ہندو اکثریت دوسرے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو دینے کو تیار ہے۔

پنجاب اور بنگال میں نمایندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوگا۔

مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمایندگی 1/3 سے کم نہ ہوگی اور وہ بھی مشترکہ انتخاب سے۔''

جناح نے جس جرأت اور وطن دوستی کے ساتھ یہ پہلا قدم اٹھایا اس سے گھٹی ہوئی تاریک فضا میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوگئی۔ فرقہ وارانہ اتحاد اور سوراج کے لیے راستہ کھلتا نظر آیا۔ اس کے دوسرے ہی دن (21/ مارچ) کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں دہلی کی تجاویز پر اطمینان ظاہر کیا گیا اور ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ تفصیلات پر گفتگو کرلے۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے ہندو ممبران نے مالویہ کی صدارت میں مشترکہ نمایندگی اور آبادی کی بنیاد پر نشستوں کے تحفظ کے اصول اور مذہبی حقوق کے حفاظت کی ذمہ داری پر منظوری دیدی لیکن صوبوں کے مسئلے پر غور وخوض ملتوی کر دیا۔

ہندوستان ٹائمس کا تبصرہ جو مالویہ اور لاجپت رائے نے لکھا تھا۔ تمام تر معاندانہ تھا اور یکسر نکتہ چینی کا، اس لیے جناح نے ایک بیان جاری کیا جس میں تجویز کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کی گئی تھی اور بتایا تھا کہ تجویز کے تمام اجزا ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ البتہ اقلیتوں کو جو رعایتیں دینا ہیں ان پر بحث ہو سکتی ہے۔ اسکیم کا مقصد فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے اقلیتوں میں اعتماد اور تحفظ کا صحیح احساس پیدا کرنا ہے۔

ان تجاویز کا دونوں فرقوں پر مختلف قسم کا رد عمل ہوا۔ لیکن کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جس کا جلسہ بمبئی میں 15 ر مئی کو ہوا دہلی کی تجاویز کو تمام تر منظور کر لیا اور آل انڈیا کانگریس نے ورکنگ کمیٹی کی سفارشات کو تسلیم کر لیا۔

اس عرصے میں دوسری پارٹیوں نے بھی دہلی کی مسلم اسکیم کی طرف توجہ کی۔ شوکت علی نے خلافت کمیٹی کی جانب سے ہندو مہاسبھا کے لیڈر، مونجے کو دعوت دی کہ وہ ایک ایسی کانفرنس میں شریک ہوں جس میں دونوں فرقوں کے نمایندے موجود ہوں تاکہ فرقہ واریت کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال ہو سکے۔ 30 ر اگست کو شملہ میں ایک اتحاد کانفرنس ہوئی لیکن 16 ر ستمبر تک اس میں صرف گاؤ کشی اور مسجد کے سامنے گانے بجانے کی بابت تلخ مذاکرات ہوتے رہے۔ چنانچہ یہ کانفرنس ملتوی ہوگئی اور پھر کبھی اس کا کوئی جلسہ نہ ہوا۔

ایک دوسری کوشش سری نواس آئینگر نے کی۔ انہوں ایک اتحادی کانفرنس 27 ر اور 28 ر اکتوبر کو کلکتے میں طلب کی۔ اس کانفرنس کے نتائج حوصلہ افزا رہے۔ اس میں تبدیل مذاہب، گاؤ کشی اور مسجد کے سامنے گانے بجانے کے متعلق متفقہ قراردادوں کو منظور کیا گیا۔ اس کانفرنس نے ثابت کر دیا کہ مذہبی اور سماجی اختلافات رواداری سے حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو شملہ میں نہ کلکتے کی کانفرنس میں کسی نے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ امر کانگریس اور لیگ کے سالانہ کانفرنسوں میں جو دسمبر میں ہوئیں، پیش ہوا۔ دونوں کو ایک اطمینان بخش حل تلاش کرنے کے فکر تھی کیونکہ 8 ر نومبر کو ایک قانونی کمیشن کی تقرری کے اعلان نے اس سیاسی سوال کو اہمیت دیدی تھی۔

کانگریس کا اجلاس 26 ر دسمبر 1926ء کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ گاندھی جی کی حاضری اس میں آخر وقت تک مشکوک رہی۔ بالآخر وہ شریک

ہو گئے اگرچہ انہوں نے جلسہ کی کارروائیوں میں سرگرمی سے حصہ نہیں لیا۔ صدر نے دونوں فرقوں کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کی طرف توجہ دلائی اور ان تمام کوششوں کی تاریخ بیان کی جو ان کو حل کرنے کے لیے کی جا چکی تھیں۔

منجملہ دیگر تجاویز کے کانگریس نے تین اہم تجاویز منظور کیں۔ ایک تو سوراج کے دستور کے متعلق، دوسری قانون کمیشن کے بائیکاٹ کے متعلق اور تیسری ہندو مسلم اتحاد کے متعلق۔ تیسری تجویز سروجنی نائیڈو نے پیش کی تھی جن کی اتحاد کے سلسلے میں خدمات سے سبھی واقف تھے۔ اس کی تائید ابوالکلام آزاد نے کی تھی جو فرقہ وارانہ یک جہتی کے اتنے ہی بڑے علم بردار تھے۔ مباحثے میں مالویہ، محمد علی اور سری نواس آینگر نے نمایاں حصہ لیا۔ موتی لال نہرو اس وقت ملک میں نہ تھے اور جواہر لال نے بحث میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ طویل مباحثے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تجویز کو منظور کرنے کی تحریک چند جزوی ترمیمات کے ساتھ اتفاق رائے سے منظور ہوگئی۔ جلسے نے اپنی پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کھڑے ہو کر کیا اور اس فیصلہ پر دیر تک جوش و خروش سے لوگ تالیاں بجاتے رہے اور تحسین و آفریں کے نعرے بلند کرتے رہے۔

سوراج کے دستور کی قرارداد میں ورکنگ کمیٹی کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ دوسری سیاسی تنظیموں کے مشورے سے سوراج کے دستور کا ایک مسودہ تیار کرے۔

مسلمان سیاست دانوں میں دہلی کی میٹنگ کی تجاویز پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ لیگ پر کنٹرول حاصل کرنے کے سلسلے میں ان میں رسہ کشی شروع ہوگئی۔ لیگ کی کونسل کی ایک میٹنگ میں (20 رنومبر) یہ طے کیا گیا کہ لیگ کا جلسہ لاہور میں ہونا چاہئے لیکن دوسری میٹنگ میں (11 ردسمبر) یہ تجویز مسترد ہوگئی اور طے ہوا کہ لیگ کا اجلاس کلکتے میں کیا جائے۔ کونسل کے وہ ممبران جو لاہور کے حامی تھے کونسل کی میٹنگ سے باہر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے نام پر دو جلسے دو مختلف جگہوں پر منعقد

کیے گئے۔ کلکتے کے اجلاس کی صدارت محمد یعقوب نے کی کیونکہ محمد شفیع نے جن کو لیگ کونسل نے نامزد کیا تھا، انکار کر دیا تھا۔ میٹنگ کی اہم تجاویز میں ایک تو سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے متعلق تھی جسے علی امام نے پیش کیا تھا اور دوسری دہلی کی میٹنگ کی تجویز کی توثیق کے متعلق تھی جسے برکت علی نے پیش کیا اور جناح نے اس کی تائید تھی۔ مسز اینی بیسنٹ، ابوالکلام آزاد اور مسز نائیڈو نے جو لیگ کے اس اجلاس میں موجود تھے۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مالویہ نے اتحاد کے لیے ایک پرجوش اپیل کی۔ لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے دستور سازی کے متعلق صلاح ومشورہ کرے۔

لاہور کی میٹنگ نے دہلی کی تجاویز کو نا قابل قبول قرار دیا اور طے کیا کہ سائمن کمیشن سے تعاون کیا جائے۔ آل انڈیا لبرل فیڈریشن نے 27 / اور 28 / دسمبر کو اپنا سالانہ اجلاس بمبئی میں تیج بہادر سپرو کی صدارت میں کیا۔ اس نے یہ تجاویز منظور کیں: (1) قانونی کمیشن کا بائیکاٹ (2) سپرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جائے جو ایک ذمہ دار حکومت کی اسکیم دوسری سیاسی پارٹیوں کی کمیٹیوں کے تعاون سے تیار کرے (3) فرقہ وارانہ مصالحت کے لیے مسلمانوں کی تجاویز کو عام طور پر منظور کر لیا جائے۔

ہندو مہا سبھا کا جلسہ 29 / دسمبر کو مدراس میں مالویہ کی صدارت میں ہوا۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے لیے دستور کا ایک مسودہ تیار کیا جائے اور اس کے لیے چند خاص اصول متعین کر دیے۔

ہندوستان کی ان تمام سیاسی پارٹیوں نے اپنی قراردادوں کے ذریعہ واضح طور پر خودمختار حکومت کا دستور خود تیار کر لینے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جو سب سے زیادہ بااثر سیاسی تنظیم تھی قدرتاً اس میں پیش قدمی کی کیونکہ

27/مارچ 1927ء میں دہلی کی مسلم میٹنگ نے راستہ صاف کردیا تھا۔

مسلم لیگ نے صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز میں مشترکہ انتخابات کے اصول کو مان کر راستہ سے ایک بڑی رکاوٹ دو کردی تھی۔ لیکن مسلم فرقے کی یہ منظوری اتفاق رائے سے نہ تھی اور اس میں کچھ شرطیں ایسی رکھ دی گئیں تھیں جو ہندو فرقہ وارانہ پارٹیوں کے لیے نا قابل قبول ٹھہریں۔ ہندومہا سبھا اس بات کو مانتی تھی کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم ہے جس میں وحدانی طرز کی حکومت ہو اور اکثریت کی حکومت ہونا چاہئے۔ اس کے خیال میں اقلیتوں کے صرف مذہبی گروہ تھے اس لیے ان کے مذہبی حقوق کا تحفظ تو کیا جاسکتا ہے لیکن سیاسی یا انتظامی حقوق کی ضمانت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان اپنے کو ایک قوم سمجھتے تھے جن کا مذہب، کلچر اور روایات جداگانہ تھیں اس لیے ان کا ایک مخصوص وجود تھا جس کا دستوری اور انتظامی معاملات میں تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کی حکومت ہونا چاہئے اور حکومت کے قانون سازی، عاملہ اور انتظامیہ شعبوں میں ان کا حصہ کتنا ہو اس کی وضاحت صاف طور سے دستور میں کردی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کا تحفظ ہو۔

اپنی اپنی بات پر ضد اور اصرار دونوں کو اس لیے تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے اور اعتماد نہ کرتے تھے۔ ہندو لیڈروں کی تقریروں اور تحریروں میں خوف کا اظہار کیا جاتا تھا مثلاً لاجپت رائے جو کہ بڑے روشن دماغ، جہاں دیدہ، وسیع الخیال اور جری لیڈر تھے اور جو ہندو مسلم اتحاد کے بڑے خواہش مند تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بغیر اتحاد کے سوراج ناممکن ہے فرقہ وارانہ فسادات سے اس قدر بددل ہوئے اور چند مسلمان لیڈروں کے احمقانہ اعلانات سے اس قدر ڈر گئے کہ نہ صرف انہوں نے سوراج پارٹی کو خیر باد کہا اور گاندھی جی کی تحریکات کو ناپسند کرنے لگے بلکہ مکمل

طور پر ہندو مہا سبھا کے ہم خیال ہو گئے اور اس کے شدھی اور سنگھٹن کے جارحانہ پروگرام کو ترقی دینے میں لگ گئے۔ایک خط میں جو انہوں نے سی، آر، داس کو 1925ء میں لکھا تھا اپنے خیالات اس طرح ظاہر کیے تھے:

" پچھلے چھ مہینوں میں میں نے اپنا بیشتر وقت مسلم تاریخ اور مسلم قانون کے مطالعے میں صرف کیا ہے اور میری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ (ہندو مسلم اتحاد) شاید ممکن نہ ہو سکے گا نہ قابل عمل — یہ مانتے ہوئے کہ عدم تعاون کی تحریک میں مسلمان لیڈر بہت پر خلوص رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب اس قسم کی چیز (اتحاد) کے لیے ایک مؤثر سدراہ ہے ......تو اب علاج کیا ہے؟ میں ہندوستان کے سات کروڑ، مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ سات کروڑ کے ساتھ ساتھ ترکی، عراق، عرب، وسط ایشیا اور افغانستان کی مسلح افواج کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور حاجت میں یقین رکھتا ہوں۔ میں مسلمان لیڈروں پر پورا اعتماد کرنے کے لیے بھی تیار ہوں لیکن قرآن اور حدیث کے جو احکامات ہیں ان کے متعلق کیا کیا جائے؟"[1]

لاجپت رائے نے اپنا حل ان الفاظ میں پیش کیا "میری تجویز یہ ہے کہ پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔مغربی پنجاب جس میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت ہے ایسا صوبہ ہو جس میں مسلمانوں کی حکومت ہو اور مشرقی پنجاب میں جہاں ہندو اور سکھ لوگوں کی بڑی اکثریت ہے غیر مسلموں کی حکومت ہو............میں یہی مشورہ ان لوگوں (بنگالیوں کے معاملے میں نہ دوں گا لیکن اگر بنگالی مسٹر داس کا معاہدہ ماننے کو تیار ہیں تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے)...........میری اسکیم کے تحت مسلمانوں کو چار ریاستیں

---

1 دی پیوپل (لاجپت رائے نمبر) 13/اپریل 1939ء گیا کانگریس 1925ء سے کچھ پہلے لکھا ہوا خط سی آر داس کے نام (نہرو، میوزیم اور لائبریری نئی دہلی کے مسٹر ڈی سی جوشی کی عنایت سے حاصل ہوا)

مل جائیں گی: (1) پٹھانوں کا صوبہ یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ (2) مغربی پنجاب (3) سندھ اور (4) مشرقی بنگال۔" 1

ہندوستان کی تقسیم کیمبرج یونیورسٹی کے نوجوان مسلمان طلبہ کے زرخیز تخیل کی پیداوار نہیں تھی نہ اقبال کے تصور کی بلکہ ایک غیر معمولی طور پر حساس زبردست ہندو فرد کے ذہن کی اُپج تھی۔

مسلمان ہندوؤں سے اس معاملے میں پیچھے نہ تھے کہ وہ اپنے ذہنوں میں خیالی ہوّے پیدا کریں اور ان سے خوف زدہ ہوں۔ ان میں سے بیشتر کو تو یقین تھا کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں کا ہر بات میں غلبہ ہو جائے گا یعنی آبادی، کلچر، مذہب اور عہدوں پر اس قدر چھا جائیں گے کہ اس ملک میں اسلام کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا۔ بعض دیگر لوگوں کو پختہ یقین تھا کہ ہندو لوگ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔ مسلم لیگ کے صدر، عبدالرحیم نے کہا تھا:

"بعض ہندو لیڈروں نے عام پبلک میں کہا کہ وہ ہندوستان سے مسلمانوں کو اسی طرح باہر نکال دیں گے جس طرح اسپین کے لوگوں نے مور لوگوں کو اسپین سے نکال باہر کیا تھا۔" 2

ظاہر ہے کہ دونوں وسوسوں اور توہمات میں گرفتار تھے۔ اس مرض کا علاج تو کوئی ماہر نفسیات تدبیروں سے کرسکتا تھا۔ گاندھی جی ارواح انسانی کے نفسیاتی معالج تھے۔ انہوں نے اس خوف زدگی کو دور کرنے کے لیے پرزور تدبیریں بھی بتائیں لیکن ان

---

1 لالہ لاجپت رائے، تقاریر و تحریریں۔ جلد دوم مرتبہ وی سی جوشی، ص 13-212

2 دی انڈین اینول رجسٹر، 1925، جلد دوم ص 356 مسٹر عبدالرحیم کا صدارتی خطبہ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمقام علی گڑھ بتاریخ 31 دسمبر 1925 دیا گیا۔

کی فرقہ واریت کے مرض کی تشخیص ناقص تھی اور اس لیے جب ان کا علاج کارگر ثابت نہ ہوا تو وہ بددل ہو گئے اور اپنی ہار مان لی۔

10-نہرو کمیٹی رپورٹ

شروع 1928ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ مرض روبہ زوال ہے۔ مدراس کانگریس کی قرارداد پر تعمیل کے طور پر ورکنگ کمیٹی نے 14 رفروری 1928ء کو مختلف سیاسی پارٹیوں کی ایک میٹنگ دہلی میں طلب کی۔ کانفرنس نے دستور کا مقصد یہ بتایا کہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت کا قیام عمل میں لانا ہے اور ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ وہ دستور کی بعض اہم تفصیلات متعین کرلے۔

یہ کانفرنس دوبارہ پھر بمبئی میں 19 رمئی کو منعقد ہوئی۔ وہاں یہ طے کیا گیا کہ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کے درمیان اختلافات ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ قبل اس کے کہ دستور کا اصل مسودہ تیار کیا جائے دستور کے خاص خاص اصول مقرر کر لیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کے صدر موتی لال نہرو تھے۔ دیگر ممبران تیج بہادر سپرو، علی امام، شعیب قریشی، سبھاش چندر بوس، اینی، جیکار، این ایم جوشی اور منگل سنگھ تھے۔ جیکار نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کمیٹی نے بہت سے ممتاز لوگوں اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے نمائندوں سے مشورہ کر کے اور جون اور جولائی کے مہینوں میں 25 نشستیں کرنے کے بعد اپنی رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس میں جو لکھنؤ میں 28 راگست کو ہوئی پیش کر دی۔ اس کانفرنس نے رپورٹ پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد یہ رپورٹ چند ترمیموں کے ساتھ 4 راور 5 رنومبر کو کل ہند کانگریس کمیٹی کے زیر غور آئی اور منظور کر لی گئی۔

رپورٹ کی سفارشات کو قومی مطالبے کا درجہ دینے کے لیے ضروری تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس، مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی توثیق و تصدیق بھی حاصل کر لی جائے۔

آل پارٹیز کنونشن 22/دسمبر 1928ء کو کلکتے میں منعقد ہوا اور یکم جنوری 1929ء تک اس کی نشستیں ہوتی رہیں۔ یہ کنونشن (مجلس) چھوٹے پیمانے پر سیاسی ہندوستان کی نمایندگی کر رہا تھا۔ اس میں پارٹیوں کے بڑے نمایاں لیڈر اور پبلک کے بہت ممتاز لوگ جمع ہو گئے تھے۔ گاندھی، جناح، موتی لال نہرو، مالویہ، تیج بہادر سپرو، ابوالکلام آزاد، مسز اینی بیسنٹ اور علی امام وغیرہ۔ میٹنگ پر اُمید کی فضا طاری تھی اگرچہ اس میں کچھ خوف بھی ملا ہوا تھا کیونکہ تیس کروڑ انسانوں کی قسمت کا فیصلہ ترازو میں تل رہا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے صدارت کی۔ موتی لال نہرو نے اس کمیٹی کی جسے آل پارٹیز کانفرنس نے بمبئی میں مقرر کیا تھا رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کی خاص خاص سفارشات یہ تھیں:[1]

(الف) ہندوستان کی سیاسی حیثیت ویسی ہی ہوگی جیسی کہ برطانوی مملکتوں مثلاً کناڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور آزاد ریاست آئرلینڈ کی ہے۔

(ب) بنیادی حقوق دستور میں منضبط کیے جائیں گے۔ ان میں ضمیر، پیشہ اور مذہب کے فرایض کی آزادی شامل ہوگی۔

(ج) مرکزی قانون ساز مجلس کے ایوان زیریں اور صوبائی مجالس قانون ساز میں مشترکہ اور ملے جلے انتخابات سے منتخب شدہ ممبران شامل ہوں گے لیکن مرکزی مجلس قانون ساز میں اور جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کی صوبائی مجالس قانون ساز میں ان کے لیے نشستوں کی تعداد محفوظ رہے گی اور اسی طرح شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندوؤں کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں گی۔

(د) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے کوئی تحفظ نشستوں کا نہ ہوگا۔

(ذ) نشستوں کا تحفظ آبادی کے لحاظ سے ہوگا اور ایک مقررہ عرصہ کے لیے ان فرقوں کو جن کی نشستیں محفوظ ہیں۔ مزید نشستوں کے لیے انتخابی مقابلہ کرنے کا حق حاصل رہے گا۔

(ر) ہر مرد اور عورت کو جو اکیس سال کا ہو چکا ہو اور قانوناً نااہل نہ قرار دیا گیا ہو مرکزی اور صوبائی دونوں کی مجالس قانون ساز میں رہے رائے دینے کا حق حاصل رہے گا۔

(ز) سندھ اور کرناٹک کے صوبے علاحدہ ہوں گے۔ صوبوں کی مزید تنظیم لسانی بنیادوں پر ہوگی۔

(ح) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں جو شعبے ہوں گے منسلکہ گوشواروں میں مندرج ہوں گے۔

اس دستور کے خاکے کی بہت سی اہم باتیں چار دن تک معرض بحث میں رہیں اور اس کے بعد 28 دسمبر کو جناح نے ایک بیان دیا جس میں انہوں نے کلکتے میں منعقدہ اس مسلم لیگ کے جلسے کا رویہ بیان کیا جس نے کمیٹی میں شرکت کے لیے نمایندے مقرر کیے تھے۔ انہوں نے بہت سے نکتے دوبارہ غور و خوض اور ترمیم کے لیے پیش کیے۔ وہ حسب ذیل تھے:

1- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعداد مجموعی نشستوں کی 1/3 ہوگی۔

2- اگر بالغ رائے دہندگی کا نفاذ نہ ہو سکا تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے محفوظ کی جائیں۔

3-Residnal باقی اختیارات صوبوں کو تفویض کیے جائیں۔

4- سندھ کی علاحدگی نئے دستور کے رائج ہونے تک ملتوی نہ رکھی جائے۔

5- دستور میں کوئی ترمیم اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک ہر ایوان میں الگ الگ اور دونوں ایوانوں میں مشترکہ رائے دہندوں کی تعداد کل ممبران کی تعداد کا 4/5 نہ ہو۔

سپرو نے اس تجویز کی منظوری کی زوردار سفارش کی کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نشستیں 1/3 33 فی صد ہونا چاہئیں۔ ان کے نزدیک یہ بڑا اہم معاملہ تھا اور انہوں نے کنونشن سے گزارش کی کہ مکمل فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر جناح کی اس استدعا کو اصولاً مان لیا جائے ورنہ ہندوستان کے لیے آزادی تو کیا درجۂ نوآبادیات بھی حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ جیکار نے ہندو مہا سبھا کے نمائندے کی حیثیت سے جناح کی تجاویز کی بہت شدت سے مخالفت کی۔ انہوں نے سوال کیا کہ جناح (تمام) مسلمانوں کی نمایندگی کس حیثیت سے کر سکتے ہیں اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس کنونشن نے رپورٹ کے خلاف کیا تو ان کی پارٹی (ہندو مہا سبھا) معاہدہ سے برگشتہ ہو جائے گی۔

جناح کی ترمیم پر رائے شماری کی گئی اور وہ ناکام رہی۔

گاندھی جی نے جنہوں نے کنونشن کی بحثوں میں کوئی حصہ نہ لیا تھا جلسے کی کارروائی کو ایک غیر معینہ مدت تک ملتوی کیے جانے کی تحریک پیش کر کے اسے ختم کرا دیا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کل ہند اتحاد کانفرنس (آل انڈیا یونٹی کانفرنس) کے اصل مقصد کی ناکامی کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ نہرو کمیٹی رپورٹ کی سفارشات کی منظوری پر اپنا اطمینان ظاہر کیا جن سے بقول ان کے دستور کے اصولوں کے متعلق قوم کی مرضی واضح ہو گئی تھی۔

فوراً ہی بعد انڈین نیشنل کانگریس کی میٹنگ میں گاندھی جی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں نہرو کمیٹی کی سفارشات کا یہ کہہ کر خیر مقدم کیا گیا کہ یہ ہندوستان کے

سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک بڑا عطیہ ہے اور تجویز کیا کہ اسے کانگریس منظور کر لے کیونکہ اس نے ملک کی اہم پارٹیوں کی زیادہ سے زیادہ رضامندی حاصل کر لی ہے۔

اس تجویز کے سلسلے میں اس بات پر خاصی بحث رہی کہ ہندوستان کی منزل مقصود کیا ہے۔ آزادی یا درجۂ نوآبادیات؟ لیکن مسلم لیگ نے کنونشن میں جو مطالبہ کیا تھا اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ تعجب اس پر ہے کہ گاندھی جی نے مسلم لیگ کے اختلاف کو جسے جناح اور محمد علی نے پیش کیا تھا کوئی اہمیت نہ دی حالانکہ اس سے یہ دعویٰ مجروح ہوتا تھا کہ تمام اہم پارٹیوں کی رضامندی حاصل ہو گئی ہے۔

چونکہ رپورٹ پر کانگریس کے فیصلے سے سنگین نتائج پیدا ہوئے جن کا پیش بینی کے طور پر پہلے ہی سے اندازہ کر لینا چاہیے تھا اس لیے ضروری ہے کہ مختلف پارٹیوں کے رویے کے اسباب اور نتائج پر نظر ڈال لی جائے۔

آل پارٹیز کانفرنس تمام سیاسی پارٹیوں کی خواہش پر منعقد کی گئی تھی۔ ان میں کانگریس اور مسلم لیگ پیش پیش تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ سیکریٹری آف اسٹیٹ، برکن ہیڈ نے جو چیلنج دیا تھا اس کا مقابلہ کیا جائے اور قانون کمیشن کی تحقیقات کی پیش بندی کر لی جائے۔ کانفرنس کا انعقاد لیڈروں کی ان تجاویز کی بنا پر ممکن ہو سکا جو انہوں نے دہلی میں پیش کی تھیں اور جس میں انہوں نے چند خاص شرائط کے ساتھ علاحدہ نمایندگی کے مطالبے سے دست کشی اختیار کی تھی۔ جناح جو کہ ہندو مسلم اتحاد کی زوردار اور مستحکم وکالت کرتے رہے تھے اس فرقے کے رویے میں اس تبدیلی کے تمام تر ذمہ دار تھے جو پچھلے 23 سال سے علاحدہ نمایندگی بڑے جوش کے ساتھ طلب کرتا رہا تھا اور اسے مسلمانوں کے لیے ایک یقینی تحفظ سمجھتا تھا ش۔ انہوں نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی ناراضگی بھی مول لی جس کے سربراہ محمد شفیع اور آغا خان تھے اور مسلم لیگ کو منقسم

کردینے کا الزام بھی اپنے سر لیا۔ برکن ہیڈ اور ارون بھی ان سے ناخوش ہو گئے۔ نازیبا اغراض سے ان کو مطعون کیا اور طے کیا کہ اب ان سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔

ایک بڑی بدقسمتی کی بات یہ ہوئی تھی کہ آل پارٹیز کانفرنس میں جب سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل زیرغور تھے گاندھی جی اور جناح دونوں اپنا تعاون اسے نہ دے سکے۔ گاندھی جی عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے اور جناح 5 ر مئی تا 26 ر اکتوبر 1928ء ملک سے باہر رہے۔ نہرو کمیٹی میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنے کی ذمہ داری علی امام اور شعیب قریشی کے سپرد ہوئی تھی۔ اول الذکر اپنی علالت کے باعث غیر حاضر رہے اس لیے فیصلوں پر یہ کچھ زیادہ اثر نہ ڈال سکے انہوں نے رپورٹ پر دستخط کر دیے کیونکہ اس موقع پر وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ شعیب قریشی کم عمر تھے۔ اور اتنا اثر نہ رکھتے تھے جو ممبروں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ انہوں نے مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کے لیے 1/3 نشستیں محفوظ کرانے کے بڑی جدوجہد کی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

کنونشن میں جن نکات پر جناح نے ترمیمات پیش کی تھیں ان میں یہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اس ترمیم کو رد کرنے کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے گئے تھے ان کو سراہنا مشکل ہے۔ دو خاص دلیلیں تھیں اول تو یہ کہ کسی ذمہ دار قسم کی حکومت میں مجالس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر نشستوں کا محفوظ کرنا خالص جمہوریت کے اصول کے منافی ہے۔ اس دلیل کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ نہرو کمیٹی نے خود اس اصول سے انحراف کیا تھا جب کہ اس نے مسلمانوں کے لیے غیر مسلم اکثریت والے صوبوں میں اور ہندوؤں کے لیے مسلم اکثریت والے صوبوں یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ میں نشستیں محفوظ قرار دے دی تھیں۔ دوسری یہ کہ اقلیتوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کر سکتی ہیں اور انہیں

حاصل کرسکتی ہیں۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر نشستوں کے تحفظ کا اصول تسلیم کرلیا گیا تھا۔ یہ مراعات خالص جمہوریت کے تصور کی خلاف ورزی تھیں۔

دوسری دلیل جو بنیادی حیثیت رکھتی تھی اس سوال کے متعلق تھی کہ ہندوستان میں جمہوریت کس نوعیت کی ہو؟

ہندوستان کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ ہندوستان کا نظام حیات اس ملک میں ایک ہی قسم یا یکساں لوگوں کی جائے رہائش ہونے کا پکار پکار کر انکار کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کا دستور حقایق سے وابستہ ہونا چاہئے نہ کہ تخیلی حالات سے۔

آل پارٹیز کانفرنس، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ آزادی کا حصول تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر دونوں فرقوں کا اتحاد لازمی تھا۔ علم سیاسیات کے اصول اس مقصد کے حصول کے لیے ضمنی ذرایع تھے۔ جناح کی تجاویز کو ناکام بنانے میں مقصد کے بجائے ذرایع کو زیادہ اہمیت دیدی گئی۔

بہرحال، بقول سپرو، اگر چھ یا سات فی صدی نشستیں اور منظور کرلی جاتیں تو آسمان نہ پھٹ پڑتا۔ ان کا واقعی اوسط 27 فی صد تھا اور وہ $33^1/_3$ فی صد طلب کررہے تھے ان میں فرق اس قدر کم تھا کہ سوائے غیر معمولی طور پر استثنائی حالات کے اس کا کوئی خاص اثر عام معاملات پر نہ پڑسکتا تھا۔

بظاہر (اس وقت) کسی نے یہ محسوس نہ کیا کہ خود اختیاری حکومت رکھنے والے ہندوستان میں فرقہ وارانہ خطوط پر کوئی ایسی تنظیم قایم نہیں کی جاسکتی تھی جس کے سارے ممبر ایک ہی مستحکم بلاک سے متعلق ہوں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت قانون ساز مجلسوں میں تجربے نے بتادیا تھا کہ یہ ناقابل عمل ہے۔ اس طرح مسلم لیگ کا 1/3 کے لیے اصرار اور کانگریس کا اسے قبول کرنے سے انکار دونوں ہی بے معنی تھے۔ چونکہ

ہر ملک میں اقلیت صحیح یا غلط طور پر اکثریت کی طرف سے مشکوک رہتی ہے۔ اس اقلیت کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے اگر کانگریس جو کہ اکثریت کی نمائندگی کر رہی تھی مان گئی ہوتی تو اس سے مسلمانوں کے اس طبقے کی خوشنودی حاصل ہو جاتی جو جناح کی روشن خیال رہبری میں گام زن تھا۔

کانگریس کی قرارداد کا فوری اثر یہ ہوا کہ دو اہم مسلمان لیڈروں کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ مایوس ہو گئے ایک تو محمد علی جنہوں نے عدم تعاون کی تحریک میں گاندھی جی کی بڑے خلوص کے ساتھ پیروی کی تھی اور جن کا علماء پر اثر تھا، دوسرے جناح جو گاندھی جی کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پروگرام کے پرجوش تائید کرنے والوں میں تھے اور ایک قابل، آزاد طبع اور حکومت پر بے باک تنقید کرنے والے تھے اور جو ترقی پسند مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے ممدوح تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب کنونشن میں جناح کی ترمیمات نامنظور ہو گئیں تو وہ سخت برہم اور ناراض ہوئے انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ "اب ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔" محمد علی نے کہا" اب ہمارے (مسلمانوں کے) اور ان کے (کانگریس کے) درمیان ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جو پاٹی نہیں جا سکتی۔"

یہ شگاف جو 1928ء میں پڑا بڑھتا ہی رہا۔ ہندوستان کے حکمراں اس صورت حال سے بہت مطمئن ہو گئے۔ اکتوبر 1928ء میں اروِن نے برکن ہیڈ کو لکھا:

"مسلمان جو نہرو رپورٹ کے خلاف ہیں ایک بڑی میٹنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔ مجھے برابر اطلاعیں مل رہی ہیں کہ کثیر تعداد میں لوگ اس نقطہ نظر کے شدت سے حامی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ آل پارٹیز رپورٹ والے لوگوں نے دراصل اپنی بازی اس طرح کھیلی ہے کہ ان کو دوہری جیت حاصل ہو جائے جس کی ان کو سخت ضرورت ہے یعنی ایک تو مسلمانوں کو

اپنی طرف کرلیں دوسرے والیان ریاست کو لیکن انہوں نے یہ بازی ناقابل اعتبار بے تکے پن سے کھیلی۔"[1]

پیل کو جو ویج وڈ بین کے بعد ہندوستان کے وزیر ریاست (سیکریٹری آف اسٹیٹ) مقرر ہوئے تھے مسلمانوں کو رام کرنے کی بڑی فکر تھی۔ اس نے ارون کو مشورہ دیا: "مسلم پارٹی کو ذرا اور خوش رکھنے سے، امید کی جاتی ہے کہ اسمبلی میں حکومت کو بہت زیادہ مستحکم مدد حاصل ہو جائے گی۔"[2]

ارون نے اپنے جواب میں پیل کو یقین دلایا کہ "یہ خیال کہ مسلمان لوگ عام طور پر کسی قسم کے بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کے ذہن سے دور کیا جا سکتا ہے.......... جب مسلمانوں کا کسی معاملے میں مقابلہ درپیش ہوتا ہے تو ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ توازن برقرار رہے۔"[3]

گاندھی جی کے اطمینان کے باوجود نہرو رپورٹ ایک مردہ نوزائیدہ بچہ ثابت ہوئی اور ایک سال کی عرصہ کے بعد ہی اسے دریائے راوی میں غرقاب کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں کلکتہ کانگریس کی قرارداد کے بموجب گاندھی جی اس جدوجہد کی تیاری میں لگے رہے جو انہیں کرنا پڑے گی اگر برطانوی لوگوں نے 31/دسمبر 1929ء تک نہرو رپورٹ منظور نہ کر لی۔

1928ء کی ہیجانی سرگرمیوں کے بعد 1929ء کے آخر میں آنے والے طوفان سے پیشتر فضا ساکت رہی۔ وہ پورا سال گاندھی نے شمالی ہند اور برما کے سفر میں گزارا۔ ہر جگہ وہ برطانوی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے کا پروپیگنڈہ کرتے رہے، لاجپت رائے

---

1. ارون پیپرز: وائسرائے بنام لارڈ برکن ہیڈ 3/اکتوبر 1928ء
2. ایضاً : سکریٹری آف اسٹیٹ بنام گورنر جنرل 7/مارچ 1929ء
3. ایضاً : ارون بنام سکریٹری آف اسٹیٹ 27/مارچ 1929ء

میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کرتے رہے، چھوت چھات کو دور کرنے اور کھادی کے کام کو منظم کرنے میں لگے رہے۔ انہوں نے دستور سازی کے کام سے یا ان زخموں کو جو (کانگریس کے) فیصلہ کے باعث پیدا ہو گئے تھے مندمل کرنے سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ اگرچہ اروِن کے 31/اکتوبر 1929ء والے اعلان سے وقتی طور پر دلچسپی پیدا ہوئی تھی لیکن پارلیمنٹ کے اندر اور باہر برطانوی سیاست دانوں کی تقریروں سے وہ دلچسپی بھی جلد ہی جاتی رہی۔

کانگریس کی طرف سے بھی ہندو مسلم مسئلے پر دوبارہ مذاکرات شروع کرنے کے لیے کوشش نہیں کی گئی۔ 1929ء مجلس قانون ساز میں انتخابات کا سال تھا اور کانگریس کے پیروکار آپس میں الجھ رہے تھے۔ سوراجی اور حکومت کے طرف دار ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں دلچسپی لے رہے تھے یہاں تک کہ اروِن نے انتخابات ملتوی کیے جانے کا اعلان کر دیا اور اس جھگڑے کی جڑ اکھاڑ پھینکی۔

مسلمان بھی اپنے اندرونی جھگڑوں کے باعث مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ جناح نے مسلم لیگ کونسل کے صدر ہونے کی حیثیت سے کوشش کی تھی کہ کانگریس سے مفاہمت ہو جائے لیکن کلکتہ میں ان کی کانگریس اور مسلم لیگ کے ایک گروپ کی طرف سے جس پر پنجاب کا غلبہ تھا، دونوں کی طرف سے سخت مزاحمت ہوئی۔ مارچ 1929ء میں جناح نے کوشش کی کہ مسلمانوں کے گروپوں کو متفق کر دیا جائے تا کہ حکومت اور کانگریس دونوں کے خلاف متحدہ محاذ پیش کیا جا سکے لیکن ان کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور مسلمان کئی گروپوں میں منقسم ہو گئے۔

1- شفیع کا گروہ تھا جو حکومت سے روایتی وفاداری برقرار رکھنا چاہتا تھا اور مسلمانوں کے لیے علاحدہ نمایندگی کا طالب تھا۔

2- مسلم کانفرنس آغا خان کی سربراہی میں علاحدہ نمایندگی چاہتی تھی لیکن

مسلمانوں کے مفادات کے کافی تحفظ کے ساتھ حکومت خود اختیاری کے حصول کی خواہاں تھی۔

3- جناح کا گروپ تھا جس کے نزدیک درجہ نو آبادیات حاصل کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس نے کانگریس سے تعاون کے لیے چودہ شرطیں مقرر کر دی تھیں جو قوم پرور مسلمانوں کے چودہ نکات کہے جاتے تھے۔

4- جو کانگریس کے تصورات اور طریق کار کو مانتے تھے۔ ان لوگوں نے جولائی 1929ء میں ایک پارٹی بنائی جس کے اہم ممبران تھے آزاد، انصاری، تصدق احمد خاں شیروانی اور چودھری خلیق الزماں۔

ان کے علاوہ بھی کئی اور تنظیمیں تھیں مثلاً جمیعت العلماء جو چند سالوں تک تو مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی سیاست رجعت پسندانہ ہے تو اسے چھوڑ دیا اور کانگریس کے ساتھ حکومت کے خلاف جدوجہد میں برابر کام کرتی رہی۔

جناح نے بہر حال ایک تجویز گشت کرائی جو انہوں نے مسلم لیگ کی منظوری کے لیے تیار کی تھی۔ اس کی چودہ دفعات میں وہ شرطیں تھیں جن کی بنیاد پر مسلمان چاہتے تھے کہ ہندوستان کا دستور تیار کیا جائے۔ اہم نکات یہ تھے:

1- دستور کی شکل وفاقی ہونی چاہیے جس میں صوبوں کو ماقبی اختیارات حاصل ہوں۔

2- تمام انتخابی حلقوں کی ساخت ایسی ہونا چاہیے جس میں اقلیت کو مناسب اور مؤثر نمایندگی یقینی طور پر مل سکے۔

3- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمایندگی 1/3 سے کم نہ ہو۔

4- کوئی بل یا تجویز منظور نہ کی جائے اگر مجلس قانون ساز میں کسی فرقہ کے ممبران کی

3/4 تعداد اس پر اعتراض کرتی ہے اس بنا پر کہ وہ ان کے مفادات کے لیے مضر ہوگی۔

5- سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ ہونا چاہیے۔

6- شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

7- وزارتوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ ملنے کی بات دستور میں مندرج کردی جائے۔ اس تجویز میں یہ بھی درج تھا کہ سردست جداگانہ انتخابات قایم رہیں اور جب سندھ کو جداگانہ صوبہ بنادیا جائے گا اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاح شدہ دستور نافذ کردیا جائے گا اور دیگر صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ان کی نشستیں محفوظ کردی جائیں گی تو مسلمان مشترکہ انتخابات تسلیم کرلیں گے۔[1]

بدقسمتی کی بات تھی کہ جناح کی اس دوسری کوشش کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مسلم لیگ کے جس اجلاس میں اس پر غور کیا جانے والا تھا وہ ہنگامے کے ساتھ درہم برہم ہوگیا اور کوئی کارروائی نہ ہوسکی جب تک اس تنظیم کی دفتری باقاعدہ تائید اس تجویز کو حاصل نہ ہوتی تو دوسری سیاسی تنظیمیں اس پر کیونکر غور و فکر کرسکتی تھیں۔

اس طرح پورا سال ختم ہوگیا اور اس سوال کے حل میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی جسے آزادی کے لیے لازمی سمجھا جاتا تھا۔

11- ارون حل کی تلاش میں

سائمن اور اس کے رفقا اس قسم کے برتاؤ کے لیے تیار نہ تھے جیسا کہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کیا گیا۔ سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ بااثر تمام پارٹیوں نے سماجی طور پر اور ان کے سیاسی مشن میں دونوں طرح انہیں نظر انداز کیا۔ اس سے ان کو بہت

1۔ ایم۔ایچ۔سید بحوالہ گزشتہ: ص 43-439

مایوسی ہوئی اس لیے کہ وہ اسی کام کے لیے آئے تھے کہ ضروری معلومات فراہم کر کے ہندوستان کے مختلف فکری دبستانوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ مخاصمانہ مظاہرے جو انہیں سیاہ جھنڈے ہلا کر ہلا کر کیے گئے نیز "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں سے وہ برافروختہ ہو گئے۔ سائمن تو بعض وقت یہ محسوس کرتے تھے کہ انہوں نے بیکار کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور اس سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

اس کے دل میں قوم پرست لیڈروں سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ اپریل 1928ء میں جب وہ انگلستان واپس آئے تو برکن ہیڈ نے اس سے ملاقات کرنے کے بعد اروِن کو لکھا کہ سائمن کے "دل میں سوراجیوں کے برتاؤ اور ان کی شعبدہ بازیوں سے سخت نفرت پیدا ہوگئی ہے اور وہ ان کی سیاسی صلاحیتوں کو نہایت حقیر سمجھتے تھے۔" [1]

برکن ہیڈ اس کا ہم خیال تھا اور سمجھنے لگا تھا کہ "کسی ہندوستانی سیاست داں سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔" [2]

چھ مہینے کے بعد انھوں نے اس خیال کا اعادہ توہین آمیز الفاظ میں کیا۔ اس نے اروِن کو اپنے خط میں لکھا "میرے خیال میں سوراجیوں کے متعلق اس کی (سائمن کی) رائے اتنی ہی ناموافق رائے ہے جتنی کہ میری یا تمہاری اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ہندوستانی ساتھیوں سے روز مرہ کی ملاقات کے باوجود اس کو ان سے کوئی خاص انسیت نہ پیدا ہوگی۔ ہندوستان کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے میرے تصور میں اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات دنیا میں اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں ایسے ناکارہ اور باتیں بنانے والے ساتھیوں سے مل کر ہندوستان کے لیے ایک نیا دستور تراش

---

1. ارل آف برکن ہیڈ۔ فریڈرک ایڈون ارل آف برکن ہیڈ، دی لاسٹ فیز۔ ص 257

2. ارل آف برکن ہیڈ۔ فریڈرک ایڈون ارل آف برکن ہیڈ، دی لاسٹ فیز۔ ص 259

3. بحوالہ گذشتہ ص 260

کر بنانے کی کوشش کروں۔'' 3

ارون بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور قانونی کمیشن کا چیرمین دونوں کو ہندوستانیوں کی تمناؤں سے کوئی دوستانہ ہمدردی نہ تھی۔ ان کی سفارشوں پر ہندوستان میں دشمنی کی آگ اور زیادہ بھڑک سکتی تھی۔ ارون نے محسوس کیا کہ انہوں نے غلطی کی جو انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو جو مذبذب تھے یہ ترغیب دی کہ تمام سفید فام لوگوں پر مشتمل کمیشن مقرر کیا جائے اور ہندوستان کو ایک ایسا فریق مقدمہ سمجھا جائے جو ایک بہت اعلیٰ اور طاقت ور جج کے سامنے اپنی پیروی خود کر رہا ہو۔ اس لیے اب جس جہاز کو اس نے ڈبو دیا تھا اب اس کا سامان بچانے کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ اس کا یہ فرض تھا کہ اس اعتماد کو بحال کرے جو حکومت نے اپنی حماقت سے کھو دیا تھا۔

وہ اس وقت سے پریشان تھے جب سے کلکتے میں کانگریس نے اپنی قرارداد منظور کی تھی (دسمبر 1928ء) اور پھر اس کے بعد 1929ء میں دہلی میں مجلس قانون ساز میں جو واقعات ہوئے تھے ان سے اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اس مجلس (اسمبلی) میں پبلک کی حفاظت کے بل (Public Safety Bill) اور تجارتی جھگڑوں کے بل (Trade Disputes Bill) کی سختی سے مخالفت کی گئی تھی کیونکہ ان بلوں کے ذریعے حکومت چاہتی تھی کہ اسے سیاسی سرگرمی کی روک تھام کے لیے مزید اختیارات مل جائیں۔ پہلے بل پر تو پریسیڈنٹ سے جھگڑا ہو گیا کیونکہ اسے بے ضابطہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد موتی لال نہرو کی تحریک منظور کر لی گئی جس میں قومی مطالبے کو دہرایا گیا تھا اور ایگزیکیٹو کونسل کے واسطے جس رقم کی بجٹ (میزانیہ) میں سفارش کی گئی تھی اسے نامنظور کر دیا گیا۔ یہ نامنظوری حکومت کے خلاف گویا سخت اظہار ناراضی تھا۔

اس ذہنی انتشار میں انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو رازدارانہ طور پر لکھا:

'' مجھے یقین ہو چلا ہے کہ یہ مسئلہ اس سے زیادہ بے قابو ہو جائے گا جتنا کہ آج کل

ہے۔'' اس نے اپنے اعتدال پسند (Moderates) دوستوں سے بھی مشورہ کیا اور طے کرلیا کہ اب ایک ایسا نیا قدم اٹھانے کی ضرورت ہے جس سے وہ ان دل خراش باتوں کی طرف سے اطمینان حاصل ہو سکے: (1) ہندوستان کی ترقی کی منزل سے متعلق یقین دہانی (2) ہندوستانی سے نابرابری کا برتاؤ کر کے جو ہتک عزت کی گئی تھی اسے دور کرنا۔

اس کے علاج کی تدبیریں سوچ کر وہ انگلستان روانہ ہوئے جہاں خوش فہمی سے اس کو نئی حکومت برسر اقتدار ملی۔ رجعت پسندوں کا تختہ الٹ گیا تھا۔ برکن ہیڈ کے بجائے ویج وڈ بین آ گئے تھے۔ یہ لیبر پارٹی کے ممبر تھے اور اولیور سے زیادہ ترقی پسند۔

ان سے صلاح و مشورہ کے نتیجے میں ایک اعلان تیار کیا گیا جسے اروِن کو ہندوستان واپس ہو کر شایع کرنا تھا اور جس کا مقصد قوم پرستوں کو مطمئن کرنا تھا۔ 31 / اکتوبر 1929ء کو یہ اعلان گورنمنٹ گزٹ میں شایع کیا گیا۔ اس اعلان کا فوری اثر خاطر خواہ ہوا۔ ہندوستانی لیڈروں نے اسے پسند کیا۔ لیکن بہت جلد ہی ان پر فریب ظاہر ہو گیا۔ پارلیمنٹ میں جو مباحثے ہوئے ان سے ظاہر ہو گیا کہ حکومت کے اصلی ارادے کیا ہیں۔ اس کی صدارت وہ شخص کر رہا تھا جس کا نام تھا ریمزے میکڈانلڈ اور جو بقول چرچل ''عجوبۂ بلا استخوان'' (Boneless wonder) تھا اور جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آفس (دفتر) کے باہر جو باتیں کرتا اور اپنے آفس کے اندر جو کام کرتا، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔

سڈنی ویب، موجودہ لارڈ پاس فیلڈ نے، جو پرانے سامراجی اور لیبر پارٹی کے سوشلسٹ ممبر تھے، ریڈنگ (لبرل) اور برکن ہیڈ (رجعت پسند) کے سخت حملوں سے تنگ آکر انھوں نے لیبر حکومت کی طرف سے 5 / نومبر کو افسوس کے لہجے میں (پارلیمنٹ میں) اقبال کیا کہ درجۂ نوآبادیات کی جو اصطلاح وائسرائے کے اعلان میں استعمال

کی گئی ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مانٹیگو کے 1917ء کے اعلان یا حکومت کے انڈیا ایکٹ 1919ء میں جس پالیسی کا خاکہ پیش نظر رکھا گیا تھا اس سے انحراف کیا جارہا ہے۔ اس نے مزید یہ بھی بتایا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کی پالیسی کو ایک قومی پالیسی سمجھتی ہے اپنی پارٹی کی پالیسی نہیں۔ ہندوستان کی منزل درجۂ نوآبادیات کا حصول ضرور ہے لیکن وہ وقت آنے پر دیا جائے گا مستقبل قریب میں نہیں۔

7 رنومبر کو دارالعوام میں بالڈون اور لائڈ جارج نے لیبر حکومت پر بے حد زور ڈالا کہ وہ صاف صاف بتائے کہ آخر اس اعلان کے پیچھے اس کی پالیسی کیا ہے۔ وتج وڈ بین نے اپنے طولانی جواب میں بتایا کہ "اعلان مانٹیگو کی پالیسی کا صرف اعادہ تھا اور اس کی تشریح اور اس سے کوئی الگ نئی بات نہیں" اور پھر جب لائڈ جارج نے تکلیف دہ اصرار کے ساتھ اس سوال کا جواب لینا چاہا کہ سوراجی درجۂ نوآبادیات کے جو معنے لیتے ہیں کیا حکومت ان سے متفق ہے یا نہیں تو وتج وڈ بین نے خاموش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

جب گاندھی جی اور دوسرے لیڈر ارون سے 23 / دسمبر کو صحیح صورت حال دریافت کرنے کے لیے ملے تو اس وقت گاندھی جی کے ذہن میں پارلیمنٹ کی ان خاص خاص پارٹیوں کے بیانات موجود تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ حکومت کے ارادوں سے صحیح صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنا طریق عمل متعین کرسکیں۔ وہ اس وقت حکومت کی اندھا دھند جبر کرنے کی پالیسی اور بعض بے صبر نوجوانوں کے شدید تشدد پر اتر آنے نیز صنعتی مزدوروں کی کثرت سے ہڑتال کرنے کے باعث بہت ہی پریشان تھے۔

گاندھی جی کی اس ملاقات کے وقت فضا تکدر آلود تھی کیونکہ کچھ دنوں پیشتر ہی ارون کی جان لینے کی بزدلانہ کوشش کی جا چکی تھی۔ بہرحال گاندھی جی نے وایسرائے سے صاف صاف وضاحت چاہی کہ کیا وہ یقین دلا سکتے ہیں کہ گول میز کانفرنس میں

مکمل درجۂ نوآبادیات کی بنیاد پر مذاکرات ہوں گے۔ کیونکہ کانگریس کلکتہ میں طے کر چکی تھی کہ برطانوی لوگوں سے اسی شرط پر تعاون کیا جائے جب وہ مکمل درجۂ نوآبادیات دینا مان لیتے ہیں۔ وائسرائے اس یقین سے دہانی قاصر رہے اور گفت وشنید ختم ہوگئی۔ اروِن ایک دفعہ نادانی کر چکے تھے دوبارہ کرنے کے لیے اب وہ تیار نہ تھے۔

اس ملاقات میں گاندھی جی کے ساتھ جو رفقاء تھے ان پر اس کا ردعمل دوسرے طریقوں پر ہوا۔ تیج بہادر سپرو جو ایک دستوری وکیل تھے راست اقدام کو کیونکر منظور کر سکتے تھے۔ جناح تو 1920ء سے عدم تعاون کی برابر مخالفت کرتے رہے تھے بلکہ کلکتہ میں کانگریس کے فیصلے سے ان کو بڑی پریشانی لاحق تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کا اس بات پر اصرار کرنا کہ درجہ نوآبادیات کی یقین دہانی کرادی جائے ایک ایسا یک طرفہ مطالبہ تھا جس میں مسلمانوں کی نہ رائے لی گئی نہ ان کے مفاد کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

اروِن نے ایک عجیب رویہ اختیار کیا۔ دوسری مرتبہ پھر ان کی بڑی مرتب اسکیم نے ناکامی کا منہ دیکھا۔ پہلی مرتبہ تو خود ان کی اپنی غلطیوں کے باعث ایسا ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ برطانیہ کے سیاسی لیڈروں کی ڈرانے دھمکانے والی حجتوں سے۔ اس نے اپنے آپ کو فلسفیانہ انداز میں تسلی دینے کے لیے ایک یادداشت لکھی جس میں انہوں نے یہ ثابت کر کے اپنا اطمینان کرلیا کہ برطانیہ جو کچھ عطا کر رہی ہے وہ ہندوستان کے مطالبے سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ ان کی فکر کا انداز یہ تھا: ”میں سمجھتا ہوں کہ درجۂ نوآبادیات کا مطالبہ کرتے وقت ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ ہے کہ اس درجے کے مکمل حقوق اگرچہ ان کو فوراً نہ ملیں تو بھی خاندان کا فرد ہونے یا کاروبار میں شریک ہونے کے درجے کی ضمانت انہیں مل جائے۔ اور شاید یہ بات انگریزوں کے ذہن میں جو کچھ ہے اس سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔“[1]

1۔ ایلن، کیمبل، جانسن، بحوالہ گزشتہ، ص 233

معلوم ہوتا ہے کہ وہ امکانی درجہٗ نوآبادیات کو واقعی ثابت کرنا چاہتے تھے اور یہ ہندوستانیوں کی رائے میں بالکل ناقابل قبول تھا۔ ہندوستان اختیارات کی منتقلی اور اپنی پالیسی متعین کرنے کی صلاحیت فوراً حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر اصولاً یہ بات مان لی جاتی تو اس کی تفصیلات طے ہوسکتی تھیں۔

ظاہر ہے کہ برطانیہ اس قدر آزادی دینے کے لیے تیار نہ تھا وہ اختیارات اپنے ہاتھ ہی میں رکھنا چاہتا تھا وہ ایک دور دراز منزل متعین کرکے اس کی طرف رفتہ رفتہ مرحلہ وار روانہ ہونا چاہتا تھا کس رفتار سے اور کتنے وقفے کے بعد اختیارات کی کتنی مقدار ہندوستان کو سونپے یہ سب باتیں وہ خود ہی طے کرنا چاہتا تھا۔ برکن ہیڈ نے صاف صاف اروِن سے کہہ دیا تھا:

''ملک معظم کی حکومت'' درجہٗ نوآبادیات'' کی اصطلاح استعمال کرنے کے سخت خلاف ہے خواہ اس سے ہندوستانی کی سیاسی ترقیوں کی ایک دور دراز اور آخری منزل ہی کیوں نہ مراد لی جائے کیونکہ'' درجہ نوآبادیات'' کے معنی مقرر کیے جاچکے ہیں۔'' اپنی قسمتوں کا خود فیصلہ کرنے کا حق'' اور یہ حق سردست ہم ہندوستان کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ اس سوال پر پہلے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ حق کبھی دیا جاسکے گا یا نہیں۔''

اروِن کا یہ خیال بالکل غلط تھا کہ دونوں کے نظریات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ اگر ایسا واقعی تھا تو اروِن نے اپنے حاکموں پر زور کیوں نہیں دیا کہ وہ گاندھی جی کے مطالبے کو مان لیں؟ ان کے انکار کے صورت میں وہ اسی اہم سوال پر استعفیٰ دے سکتے تھے جیسا کہ ان سے پیشتر اس سے کم اہم معاملات پر نارتھ بروک اور کرزن نے استعفیٰ داخل کردیے تھے۔ بلکہ جیسا کہ خود انہوں نے ارادہ ظاہر کیا تھا جب ان کے اعلان کی بالڈون اور دوسرے لوگوں نے مخالفت کی تھی۔

گاندھی جی نے وایسرائے سے گفتگو اس لیے کی تھی کہ وہ کوئی ایسا موقع ضائع نہ

کرنا چاہتے تھے جس سے پرامن مذاکرات کے ذریعے مسئلہ حل ہو سکے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ "انگلستان ذرا بھی پیش قدمی نہ کرے گا جب تک ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ برطانوی حکمرانی کوئی انسان دوستی کا کام نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت ہی پکے قسم کا کاروبار ہے جس کا حساب کتاب روزمرہ نہایت سختی کے ساتھ صحیح اور درست رکھا جاتا ہے۔ مہربانی کا غلاف جو اس پر وقتاً فوقتاً چڑھا دیا جاتا ہے، وہ صرف جان کنی کی مدت کو اور طویل کر دیتا ہے۔" 1

اس وقت تو پرامن سمجھوتے کے لیے کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی۔ گاندھی جی اور موتی لال نہرو اپنی ذمہ داریوں کا ایک بڑا بوجھ لیے اور آنے والی لازمی جدوجہد کے خوفناک نتائج کے خیال سے پریشان گورنر جنرل کے لیے نئے شاندار محل سے رخصت ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے جہاں انہیں کانگریس کے فیصلہ کن اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔

12-سول نافرمانی.....نمک ستیہ گرہ

29/دسمبر کو جب کانگریس کا اجلاس شروع ہوا تو فضا سخت ہیجانی تھی۔ وسیع کنویس کے پنڈال کی چھت کے نیچے پندرہ ہزار سے زیادہ لوگ جمع تھے۔ وہ لوگ امید و بیم سے دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اور ایک غیر مرئی لیکن اہم نتائج سے پر مستقبل کی طرف امیدیں لگائے کارروائیاں دیکھ رہے تھے۔ اس خبر سے کہ کانگریسی لیڈروں نے وائسرائے کو الٹی میٹم دیدیا ہے تمام ملک میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ترنگے جھنڈے کی سرسراہٹ اور 'بندے ماترم' کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ صدر منتخب جواہر لال نہرو پنڈال میں داخل ہوئے اور ڈائس پر چڑھ گئے۔ ابتدائی کارروائیوں کے بعد انہوں نے اپنا خطبہ صدارت دیا جس میں جرأت، مضبوطی اور ضبط سے کام لیا گیا تھا۔ انہوں نے

1 لوئی فشر: بحوالہ گزشتہ: ص 282

تین مباحث لیے تھے۔ آزادی، سوشلزم (اشتراکیت) اور ہندو مسلم مسئلہ۔

ہندوستان کی منزل مقصود سے متعلق انہوں نے درجۂ نوآبادیات کے تصور کو یکسر رد کر دیا کیونکہ اس میں ایک سامراجی نظام سے وابستہ رہنے کا مفہوم پنہاں رہتا تھا اور اس سے ان کو سخت نفرت تھی۔ اشتراکیت کی بات کر کے انہوں نے آزادی کی جدوجہد کو ایک نیا راستہ دکھایا جو مستقبل کے ہندوستانی معاشرے کے لیے ایک انقلابی شکل تھی۔

ان کے خطبے کا تیسرا موضوع فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ ان کے تجزیے کے بموجب فرقوں کے اختلافات کی بنیاد غیر معقول عقاید اور جذبات پر تھی۔ جدید صنعتی معاشرے میں یہ سب غائب ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا:

"واقعہ تو یوں ہے کہ اختلافات زیادہ تر ختم ہو چکے ہیں لیکن ایک دوسرے سے خوف، بے اعتمادی اور شکوک باقی ہیں جو نااتفاقی کے بیج بوتے رہتے ہیں۔ ہمارے سامنے مسئلہ اختلافات کو دور کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو ساتھ ساتھ برقرار رہیں گے اور ہمارے رنگ برنگے کلچر کو مزین کرتے رہیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ خوف اور شک کس طرح دور کیا جائے اور چونکہ یہ باتیں غیر مرئی ہیں اس لیے ان کو قابو میں کرنا مشکل ہے .... صرف اعتماد اور فیاضی سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے .... میں جانتا ہوں کہ وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے جب ان نشانات اور امتیازات (ہندو مسلم) کے کوئی معنی نہ رہیں گے اور ہماری جدوجہد صرف معاشی بنیاد پر ہوا کرے گی۔ اس دوران میں ہم آپس میں چاہے جس قسم کے انتظامات کر لیں ان سے کوئی حرج نہ ہوگا بشرطیکہ ہم ایسی رکاوٹیں نہ کھڑی کر دیں جو ہمارے مستقبل کی رفتار ترقی میں روڑے لگا دیں۔" [1]

1۔ جواہر لال نہرو، انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ لاہور، خطبۂ صدارت مورخہ 29 دسمبر 1929ء دی انڈین اینول رجسٹر 1929ء

یہ بڑے اچھے الفاظ تھے لیکن بدقسمتی یہ کہ حقیقت سے دور تھے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کا خوف کسی واقعی تجربے کی بنا پر تھا یا نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کو خوف تھا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ خوف کو اعتماد اور فیاضی کا واسطہ دے کر بہلایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس کی بنیاد غربت اور معاشرت پر اتنی نہ تھی جتنی کہ سیاست پر۔ جواہر لال نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک اقتصادی عنصر ہی سب سے زیادہ اہم تھا۔

ہماری سوسائٹی پر جب جدیدیت کا رنگ چڑھ جائے گا تو مذہبیت کے وہ جذبات جو قرونِ وسطیٰ میں پیدا ہو گئے تھے خود بخود غائب ہو جائیں گے۔ اسی لیے وہ فرقہ وارانہ اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

فرقہ واریت کے مرض کا علاج گاندھی جی کے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں میں اخلاقی قلب ماہیت کرنا تھا۔

جواہر لال کا نسخہ معاشی انقلاب کا تھا۔ دونوں صحیح تھے لیکن ان کی دوائیں اس وقت کے ہندوستان کی بیماریوں کو فوری طور پر درست نہ کر سکتی تھیں کیونکہ ایسے بنیادی انقلابات لانے کی بات اس وقت کے ہندوستان کے حالات میں سوچی نہ جا سکتی تھی۔ ایسے انقلابات کے لیے نو آزاد ممالک کو بھی صدیاں نہیں تو عشرے ضرور درکار تھے۔

دسمبر 1928ء میں کلکتہ کی قرارداد میں ایک سال کی جو مہلت دی گئی تھی، وہ 31/دسمبر 1929ء کو ختم ہو گئی۔ حکومت نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا تھا جن پر کانگریس اپنی منزل آزادی کے مطالبے سے دستبردار ہو سکتی تھی۔ ان حالات میں صرف ایک ہی راستہ کھلا تھا۔ اس کے لیے گاندھی جی نے یہ تاریخی قرارداد پیش کی:

"اس لیے کانگریس اپنی اس قرارداد کے بموجب جو اس نے پچھلے سال کلکتے میں منظور کی تھی یہ اعلان کرتی ہے کہ لفظ 'سوراج' مندرجہ دستور کانگریس دفعہ 1 کے معنی

مکمل سوراج کے لیے جائیں گے۔" [1]

قرارداد میں اس کا بھی اظہار کیا گیا کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمایندگی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور یہ کہ نہرو رپورٹ کی اسکیم اب ختم سمجھی جائے۔ تمام کانگریسیوں سے یہ استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ مکمل آزادی کے حصول کے لیے وقف کر دیں اور مرکزی نیز صوبائی مجالس قانون ساز کا بائیکاٹ کریں۔ اس (قرارداد) نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اختیار دیا کہ وہ جس وقت مناسب سمجھے سول نافرمانی اور ٹیکسوں کو نہ ادا کرنے کا پروگرام شروع کر دے۔

ٹھیک نصف شب کو اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی اور یہ منظور کر لی گئی۔ ایک سو سال (1857-1757ء) تک ہندوستانیوں نے اپنے ذاتی مخصوص مفادات کی خاطر نادانی سے غیر ملکیوں کی مدد کی تھی کہ وہ ان کی گردنوں پر محکومیت کا جوا رکھے رہے۔ اس کے بعد تقریباً تین چوتھائی صدی تک وہ اپنی زبوں حالی پر روز افزوں عذاب کا کرب محسوس کر کے اس سے رہائی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ 1930ء میں انہوں نے اپنے کو آزاد قرار دیا۔

سرد ماہ دسمبر کی ایک کہر آلود شام جب دھیرے دھیرے تاروں بھری رات میں تبدیل ہوگئی اور دریا بہتے بہتے میدان میں پہنچ گیا تو کانگریسی لوگوں کا سارا مجمع دریائے راوی کے کنارے اکٹھا ہو گیا۔ آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرایا گیا۔

ان کے دلوں میں جو ایک ناقابل جوش سے دھڑک رہے تھے قربانیاں دینے کا ایک مصمم جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ آخر کار دماغ پر مسلط ڈراونے خواب رخصت ہو گئے تھے۔ بس یہ باقی رہ گیا تھا کہ عمل میں بھی ان کا اثر غائب ہو جائے۔

اس معجزے کے لیے سب کی نگاہیں بڑی امیدوں کے ساتھ سابرمتی آشرم کی

1۔ پٹابھی سیتارمیا: بحوالہ گزشتہ، جلد اول، ص 357

طرف اٹھنے لگیں۔ ٹیگور نے 18 رجنوری کو گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گاندھی جی نے ان سے کہا" میں سخت غور وفکر کر رہا ہوں لیکن چاروں طرف جو اندھیرا چھایا ہوا ہے اس کے اندر سے کوئی روشنی نکلتی ابھی تک مجھے دکھائی نہیں دیتی"

25 رجنوری کو وائسرائے نے مجلس قانون ساز کے سامنے اپنے خطبے میں اپنا پسندیدہ نظریہ دہرایا۔ "کسی منزل کی طلب لازماً اس کے حصول سے مختلف چیز ہے اور کوئی معتدل مسافر یہ نہ سمجھے گا کہ اس کی منزل کی صحیح تعریف کر دینے سے وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ گیا اور اس کا سفر ختم ہو گیا۔"

گاندھی جی نے اس کی یہ بات پکڑ لی اور بجائے درجۂ نوآبادیات کے مطالبے کے انہوں نے وائسرائے سے کہا کہ وہ ان کے گیارہ نکات مان لے۔ (گاندھی جی کے) احباب تعجب میں پڑ گئے اور گھبراہٹ کے ساتھ احتجاج کرنے لگے۔ برطانوی حکومت کا ان (نکات) کے خلاف سخت ردعمل ہوا اور مالکم ہیلی نے نہایت غصہ کے ساتھ انہیں نامنظور کر دیا۔ قصہ ختم ہوا۔

گاندھی جی کے سخت غور وفکر کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے 26 رجنوری کو' آزادی کا دن' منانے کے لیے مقرر کر دیا کہ اس دن ملک اس بات کے عہد کرنے کا اعلان کر دے گا کہ ہندوستان نے مکمل آزادی حاصل کر لینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ اس عہد میں اعلان کیا گیا:

"ہم اسے خدا اور انسان کے خلاف ایک جرم سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت کے تابعدار رہیں جس نے ہمارے ملک کو چار طریقوں سے تباہ کیا ہے (اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور روحانی) لیکن ہم بہر حال یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ تشدد نہیں ہے اس لیے ہم اپنے کو اس طرح تیار کریں گے کہ حتی الوسع اپنے تمام تعلقات برطانوی راج سے منقطع کر لیں گے اور سول نافرمانی نیز عدم

ادائیگی ٹیکس کے لیے تیاری کریں گے ......اس لیے ہم پختہ ارادے کے ساتھ طے کرتے ہیں کہ کانگریس کی ان تمام ہدایات پر عمل کریں گے جو مکمل سوراج کے قیام کے لیے ہم کو وقتاً فوقتاً ملتی رہیں گی''۔

26 رجنوری کو تمام ملک نے اس عہد کا اعادہ کیا۔ ہندوستان کے ہزاروں گاؤں اور شہروں میں لوگوں کے بڑے مجمعے اکٹھا ہوئے اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ عہد لیا۔ انہوں نے بہت واضح ثبوت پیش کر دیا کہ ہندوستانی لوگوں کی کثیر تعداد کانگریس کے احکامات کی پابند ہے۔

فروری میں بھی گاندھی جی کسی قطعی راہ عمل کی تلاش میں تھے۔ یکایک ان پر منکشف ہوا کہ نمک ستیہ گرہ اس مسئلہ کا حل ہے اور اسے ضرور کرنا چاہئے۔

گاندھی جی کا حل ان کی زیرکی کا ایک کرشمہ تھا۔ فوجی نقل وحرکت کا منصوبہ بنانے والا کوئی کمانڈر اس سے بہتر نہ سوچ سکتا تھا۔ نمک ستیہ گرہ میں اعلیٰ جنگی حکمت عملی کے تمام عناصر موجود تھے۔ اچانک حملہ کر دینا، ہر مورچے پر فوجوں کو پہنچا دینا، فوجی قسم کی تربیت اور تنظیم، آسان داؤں پیچ، آلات جنگ اور سامان جنگ کی ہر جگہ فراہمی، دشمن کی فوجوں کو ہر طرف سے للکارنے اور گھیر لینے کی آسانی نیز ڈراما۔ یہ عجیب قسم کی جنگ تھی جس میں نقصانات، مقتولین اور اذیتیں سب ایک ہی فریق کے لیے تھیں۔

اپنے معمول کے مطابق 4 رمارچ کو گاندھی جی نے ایک خط وایسرائے کو لکھا جس میں اپنی ستیہ گرہ شروع کرنے کے ارادہ کا اظہار کیا اور وجوہات بھی لکھ دیں جن کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ وایسرائے کا جواب مختصر اور دوٹوک تھا۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ گاندھی جی ایسا طریق عمل اختیار کر رہے ہیں جو قانون کے منافی اور امن عامہ کے لیے خطرہ ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا'' میں نے گھٹنے ٹیک کر روٹی مانگی تھی اور اس کے بدلے مجھے پتھر ملا ہے۔'' مزید یہ بھی لکھا'' ہندوستان ایک بہت بڑا

قید خانہ ہے۔ میں اس قانون کو رد کرتا ہوں اور اپنا مقدس فرض سمجھتا ہوں کہ اس غمگین یکسانیت والے جبری امن کے پردے کو چاک کر ڈالوں جس کے باعث قوم کا دل اتنا گھٹا جا رہا ہے کہ وہ منہ سے فریاد بھی نہیں کر سکتی۔"[1]

14/ مارچ 1930ء کو ساڑھے چھ بجے صبح گاندھی جی 61 سال کی عمر میں اس مارچ پر روانہ ہو گئے جس کی مثال انسانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آشرم کے 78 لوگ ان کے ساتھ تھے۔ لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ سڑک پر پانی چھڑک رہے تھے۔ اس پر ہری پتیاں بکھیر رہے تھے اور اسے جھنڈوں اور ہاروں سے مزین کر رہے تھے۔ وفادار قافلے نے مع اپنے روحانی میر کارواں ایک ساحلی مقام ڈانڈی کا لمبا راستہ اختیار کیا جہاں نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا تھی۔

دشمنوں نے آواز کسے۔ بہت سے دوست مشکوک تھے۔ لیکن لوگوں کا تمسخر خوف اور غصے میں تبدیل ہو گیا اور وہ لوگ جو مضحکہ اڑانے کے لیے آئے تھے، دعاؤں میں شرکت کرنے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔ سب سے آخر میں موتی لال نہرو آئے۔ ان کے متعلق جیکار نے اطلاع دی تھی کہ وہ مارچ اور نمک بنانے کے کام کے متعلق علانیہ اظہار کر رہے ہیں کہ اس کا کچھ اثر نہ ہو گا۔

فتح مندانہ مارچ جاری رہا۔ ہندوستان ایک عبادت کی کیفیت میں تھا اور دنیا اسے دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ روز بہ روز جوش و خروش بڑھتا ہی گیا۔ جواہر لال نے لکھا: "ان کے دل میں ایک بڑے مقصد کی آگ بھڑک رہی ہے اور اپنے مصیبت زدہ ہم وطنوں کے لیے ایک بے پناہ محبت اور حق کی محبت بھی ہے جو سب کچھ جلا دیتی ہے اور آزادی کی محبت بھی جو جذب کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔"[2] اور انہوں نے ہندوستانی نوجوانوں کو ابھارنے کے لیے یوں مخاطب کیا: "میدان جنگ تمہارے

---

1. ڈی جی تندولکر: بحوالہ گزشتہ۔ جلد سوم، ص 31 2. ایضاً، ص 34

سامنے ہے۔ ہندوستان کا جھنڈا تمہیں بلا رہا ہے اور آزادی خود تمہاری آمد کی منتظر ہے۔ کیا تم کو کچھ تامل ہے؟ تم جو کل ہی تو اس کی طرف داری میں بڑا جوش وخروش دکھا رہے تھے، کیا اس شاندار جدوجہد کے موقع پر تم صرف تماشائی بنے رہو گے اور دیکھتے رہو گے کہ تمہارے بہترین اور بہادر لوگ ایک ایسی بڑی سلطنت کا مقابلہ کر رہے ہیں جس نے تمہارے ملک اور اس کے بچوں کو کچل کے رکھ دیا ہے؟ کون زندہ رہے گا اگر ہندوستان مر گیا؟ اور کون مر سکے گا اگر ہندوستان زندہ رہا؟"[1]

5/اپریل کو سرشام گاندھی جی 241 میل کا مارچ کر کے ڈانڈی پہنچ گئے۔ دوسرے دن صبح کے وقت وہ سمندر کے پانی میں اترے، غسل کیا، واپس ہوئے اور نمک کا ایک ڈھیلا اٹھا لیا اور اس طرح قانون شکنی کی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جوان کے ایک طرف کھڑی ہوئی تھیں اور اس غیر معمولی کام کا مشاہدہ کر رہی تھیں، بول اٹھیں۔ "زندہ باد، قانون شکن!"

اس خبر سے تمام ملک میں بجلی کی ایک رو دوڑ گئی۔ قانون شکنی کی تحریک سارے ملک میں پھیل گئی۔ حکومت کا ردعمل سخت ہوا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں، غیر قانونی طور پر بنائے ہوئے نمک کی جبریہ ضبطی، پردہ نشین عورتوں کی بھی تلاشی، جلوسوں اور جلسوں پر پابندیاں، لاٹھی چارج اور گولیاں، جواہر لال 14/اپریل کو گرفتار کر لیے گئے۔ وٹھل بھائی پٹیل، اسمبلی کے صدر اور نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر، مالویہ نے 25/اپریل کو اپنے استعفیٰ داخل کر دیے۔ خان عبدالغفار خاں کو پیشاور میں گرفتار کر لیا گیا۔ مظاہرے ہوئے، گولیاں چلیں جن سے سینکڑوں آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ گڑھوالی رائفلز نے گولی مار دینے کے حکم کی خلاف ورزی کی اور ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ پیشاور دس دن تک (25/اپریل تا 4/مئی) وہاں کے لوگوں کے قبضے میں رہا۔

---

1. ڈی جی تندولکر: بحوالہ گزشتہ۔ جلد سوم، ص 34

جبر میں شدت برتی جانے لگی۔ 1910ء کے پریس ایکٹ کا دوبارہ نفاذ کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے تبصرہ کیا: "ڈائر کا ظلم بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔" انہوں نے طے کیا کہ اس تحریک کو تیز تر کر دیں چنانچہ اپنے اس ارادے سے وائسرائے کو مطلع کر دیا کہ وہ دھرسنا نمک کے کارخانے پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے رضا کاروں کو اس کارخانے تک لیجائیں، 4رمئی کی رات کو جب وہ اپنی جھونپڑی میں پڑے سو رہے تھے پولیس اور مجسٹریٹ نے ان کو بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر جگا دیا، قید کیا اور فوراً یرودا جیل میں پہنچا دیا۔ ملک میں جو جوش و خروش پھیلا ہوا تھا اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نمک بنانا، نمک کی خوردہ فروشی کرنا، اپنے کو گرفتار کروانا، پولیس کے ظالمانہ حملوں کو سہنا، ہتھکڑیاں پہنے یا رسیوں سے بندھے ہوئے جیل جانا، جلسوں کا زبردستی درہم برہم کیا جانا۔ یہ سب باتیں آئے دن ہونے لگیں۔ اندازہ لگایا گیا کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی جیل میں بھر دیے گئے تھے۔

سب سے زیادہ خراب حادثہ دھرسنا (ضلع سورت) میں 21رمئی کو پیش آیا جہاں ستیہ گرہیوں کی ایک بڑی تعداد (2500) نے سروجنی نائیڈو اور امام صاحب (گاندھی جی کے افریقہ کے ایک پرانے ساتھی) کی قیادت میں حملہ کر دیا تھا۔ پیارے لال (گاندھی جی کے سکریٹری) اور منی لال گاندھی (گاندھی جی کے بیٹے) رضا کاروں کے ساتھ تھے۔

یونائیٹڈ پریس کے امریکی نامہ نگار ویب ملر نے اس حادثے کا آنکھوں دیکھا حال نیو فری مین اخبار کے لیے لکھ بھیجا۔ منی لال مارچ کرنے والے لوگوں کے آگے نمک کے کھیتوں کی طرف بڑھے جن کی حفاظت کے لیے خندقیں بنی ہوئی تھیں اور خار دار تار لگے تھے اور پولیس کا ایک بڑا دستہ اپنے برطانوی افسروں کے ساتھ موجود تھا۔ جیسے ہی رضا کار خندقوں سے گزر کر خاردار تاروں کے جنگلے تک پہنچے پولیس نے ان کو

حکم دیا کہ واپس جائیں۔لیکن انہوں نے حکم ماننے سے انکار کردیا۔ویب ملر لکھتا ہے کہ ”یکا یک حکم ملنے پر بیسیوں دیسی پولیس والے بڑھتے ہوئے مارچ کرنے والوں پر پل پڑے اوران کے سروں پر اپنی لوہے کے خول چڑھی ہوئی لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ مارچ کرنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی لاٹھیوں کی ضرب سے بچنے کے لیے ہاتھ تک نہ اٹھایا اور ڈھیر ہو گئے۔ میں نے غیر محفوظ سروں پر ڈنڈے پڑنے کی تکلیف دہ کھٹا کھٹ سنی۔ جن پر ڈنڈے پڑے وہ گر گئے، بیہوش ہو گئے یا اپنے پھوٹے ہوئے سروں اور ٹوٹے ہوئے بازوؤں کی اذیت سے کراہ رہے تھے...... جو بچ گئے وہ اپنی صفیں قایم رکھتے ہوئے خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ان کو بھی لاٹھیاں مار کر گرا دیا گیا۔“ 1 ملر نے مزید لکھا ہے کہ ”اگر چہ ہر شخص جانتا تھا کہ چند منٹوں میں وہ مار کر گرا دیا جائے گا یا شاید مار ڈالا جائے لیکن میں نے کسی کو ہچکچاتے یا خوف زدہ نہیں پایا۔وہ لوگ اپنا سر بلند کیے ہوئے استقلال کے ساتھ بڑھتے رہے۔وہاں نہ کوئی موسیقی تھی جو ان کا جوش بڑھا رہی ہو، نہ لوگ تھے جو تالیاں پیٹ کر ان کی ہمت افزائی کر رہے ہوں۔ نہ اس کا کوئی امکان تھا کہ وہ ضرب شدید یا موت سے بچ سکیں گے۔ پولیس جھپٹی اور بڑے قاعدے سے میکانکی طریقے سے رضا کاروں کے دوسرے دستے کو بھی گرا دیا۔ نہ کوئی لڑائی ہوئی نہ جھگڑا۔ مارچ کرنے والے صرف آگے بڑھتے رہتے تھے یہاں تک کہ مار کر گرا دیے جاتے تھے۔“ 2

320 آدمی زخمی ہوئے۔ بہت سے لوگ ایک عارضی اسپتال میں بے ہوش پڑے تھے۔دوسرے لوگ لاٹھی کی ضربات سے سخت اذیت میں تھے۔دو آدمی مر گئے تھے۔

---

1 لوئی فشر: بحوالہ گزشتہ۔ص 99-298

2 بحوالہ گزشتہ: ص 299

ایسے تکلیف دہ مناظر کئی دنوں تک پیش آتے رہے۔

گاندھی جی کا بول بالا ہو گیا۔ حق اور عدم تشدد کا بہت تکلیف دہ امتحان ہوا اور اس میں وہ کامیاب رہا۔ لوئی فشر کا قول ہے: ''برطانوی لوگوں نے ہندوستانیوں کو ڈنڈوں اور رائفل کے کندوں سے پیٹا۔ ہندوستانی اس سے نہ جھکے نہ پیچھے ہٹے۔ انہوں نے انگلستان کو بے بس اور ہندوستان کو نا قابل تسخیر بنا دیا۔'' 1

گاندھی جی جیل میں تھے لیکن یہ تحریک برابر زوروں سے چلتی رہی۔ ستیہ گرہ والوں کے نشانے نمک کے ڈپو (ذخائر) تھے۔ تب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بائیکاٹ کی کارروائیوں کو تیز کر دیا۔ بدیسی کپڑا، برطانوی بینک، برطانوی بیمہ، برطانوی جہاز اور دوسرے برطانوی اداروں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بعض مقامات پر ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہمات چلائی گئیں۔ شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ کی گئی اور ہندوستانی فوجیوں اور پولیس سے اپیل کی گئی کہ وہ عدم تعاون کرنے والوں کو اپنا بھائی سمجھیں۔ یوم گاندھی منایا گیا۔ پولیس کی مزاحمت نہ مانی گئی اور لاٹھیوں کی مار صبر کے ساتھ برداشت کی گئی۔ رضا کار خواتین نے پکٹنگ اور دوسرے کام بڑی بہادری سے انجام دیے۔

حکومت تو آگ بگولا ہو رہی تھی۔ آرڈی نس پر آرڈیننس نکل رہے تھے۔ 1910ء کا پریس ایکٹ دوبارہ نافذ کیا گیا۔ جیل کانگریس مردوں اور عورتوں سے پاٹ دیے گئے۔ مظاہرین پر لاٹھیاں برسائی جاتی تھیں۔ دراصل کوئی ظلم اٹھا نہ رکھا گیا۔ 67 اخبار اور 55 پریس بند کر دیے گئے۔ اس ظلم و جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین ماہ کے اندر کانگریس کے تمام خاص خاص لیڈر جیل میں پہنچ گئے اور یہ تنظیم (کانگریس) خلاف قانون قرار دیدی گئی۔ ستیا گرہی قوانین کے تحت جس مہم کو کھلے عام چلانا تھا

1۔ بحوالہ گزشتہ: ص 300

رفتہ رفتہ خفیہ ہوگئی۔

لیکن سول نافرمانی کے اثرات بہت کافی ہوئے۔ تقریباً ایک لاکھ آدمی جیل گئے۔ تیس کروڑ کا بدیسی مال بمبئی شہر اور بندرگاہ میں بند پڑا رہا۔ عام درآمدات کی تعداد گھٹ کر 1/3 یا 1/4 رہ گئی اور سگریٹ معمول سے 1/6 درآمد ہوئی۔ ہندوستان میں برطانوی سکہ کی قیمت گرنے لگی۔ بمبئی میں برطانوی سرمایہ داروں کی سولہ کپڑے کی ملیں بند ہوگئیں۔ کھادی کی پیداوار اور فروخت بڑھ گئی۔ اون اور کپاس کاتنے والوں کے ادارے (Spinners Association) نے تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار کاتنے والے، ساڑھے گیارہ ہزار بنکر اور ایک ہزار نداف ملازم رکھے۔ حکومت کے محاصل اور جنگلات کی آمدنی کم ہوگئی۔

نمک ستیہ گرہ کے باعث تمام دنیا کی توجہ ہندوستان کی جدوجہد کی طرف منعطف ہوگئی اور مختلف گروہوں اور مختلف مذاق کے لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی کہ وہ جانیں کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں تو کوئی بھی اس زبردست انسانی زلزلے کے جھٹکوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خواہ وہ قوم پرست ہوں یا کمیونسٹ، سرکاری افسران ہوں یا غیر سرکاری لوگ۔ ہندوستان کی منزل مقصود سے متعلق جتنے شکوک وشبہات تھے وہ ہوا ہو گئے تھے۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند لوگ، مسلم، ہندو مہا سبھائی غرضیکہ ہر قسم کا سیاست داں حکومت خود اختیاری کے مطالبے میں ہم آہنگ تھا۔ سوراج، ہوم رول، مملکتی درجہ، آزادی سب کا مفہوم یہی ہو گیا تھا کہ بدیسیوں کی حکومت سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ جناح نے جو کانگریس کے مخالف ہو گئے تھے گاندھی جی اور ان کے طریق کار پر سخت اعتراضات کیے تھے اور اپنا سارا زور مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دلانے پر صرف کیا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کو خوش آمدید کہیں اور وہ ایک ایسی ذمہ دار حکومت کے مطالبے کی تائید کرنے لگے جس قسم کی

مملکتوں میں پائی جاتی ہے۔

قومی بیداری کے دو مقاصد آزادی اور اتحاد میں سے اول الذکر تو ہندوستانی ذہن پر پوری طرح مسلط ہوگیا تھا اور اسے سیاسی طور پر عملی جامہ پہنانے میں زیادہ عرصہ نہ لگتا لیکن اتحاد کے مسئلہ پر اہم سوالات درپیش ہوگئے۔ یہ اتحاد ہم آہنگی کا ہو یا وفاقی یعنی اکائیوں کی اکائی۔ 1930ء میں کانگریس اس وقت بھی ہم آہنگی یکسانیت کے موافق تھی۔ مسلم لیگ وفاق کی حامی تھی اس لیے اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ جناح یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمان فرقے کانگریس کے اعلان آزادی کو ناپسند کرتے ہیں اس لیے وہ ستیہ گرہ تحریک میں شامل ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ ستیہ گرہی یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے ساتھ ہے۔ ایسے بلند مرتبہ لیڈر مثلاً عباس طیب جی، ابوالکلام آزاد، انصاری، سید محمود، اخلاق احمد خاں شروانی، رفیع احمد قدوائی، عبدالغفار خاں اور دیگر حضرات ذاتی طور پر اور جمعیۃ العلماء، احرارالاسلام، خدائی خدمت گار اور نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی تنظیموں نے اجتماعی طور پر اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے بھی جو آزادی کی جنگ کو ایک فاحش غلطی کہا کرتے تھے 1930ء کے آخری مہینوں میں کانگریس کے ایک ڈکٹیٹر (آمر) کی حیثیت سے کام کیا۔ [1]

دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ اس کی صدارت کرتے ہوئے اقبالؔ نے ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کثرت سے تھی ہندوستانی فیڈریشن کے اندر رہ کر ایک خودمختار مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ پیش کیا۔

1۔ وائسرائے نے نواب بھوپال کے ذریعے یہ کوشش کی کہ وہ خلیق الزماں کو کانگریس سے بالاعلان علاحدہ ہوجانے پر آمادہ کریں یا پھر قید ہونے کے لیے تیار ہوجائیں.......اروِن پیپرس

لیکن مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی اس بات کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ دیوبند کے علماء نے ایک علاحدہ مسلم مملکت کے خیال کی مخالفت کی۔ ایک نامور اور ممتاز عالم دین حسین احمد مدنی نے شریعت کی رو سے اقبال پر اعتراضات کیے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت غلط کرتے ہیں۔

بعض حسابات کی رو سے کوئی بارہ ہزار مسلمان نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں جیل گئے۔ اس فرقے کی قسمت ترازو میں تل رہی تھی۔ بعد کو بعض وجوہ کے باعث جن کا ذکر آگے آئے گا، اتحاد کی مخالفت والا پلڑا جھک گیا۔

کانگریس کے اس فیصلے نے کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوگی اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کردے گی حکومت کو سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ اروِن کو پختہ یقین تھا کانگریس کا تعاون انہیں اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے میں حاصل ہو جائے گا جس کا اظہار انہوں نے 31/ اکتوبر 1929ء والے اعلان میں کیا تھا۔ خود جواہر لال اس اعلان سے بہت متاثر ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں تسلیم کیا تھا کہ "وایسرائے بہی خواہ ہے اور اس کی زبان امن وصلح کی زبان ہے"۔ بدقسمتی سے اروِن کی دو بنیادی باتوں میں حکومت اور کانگریس کے نقطۂ نظر میں جو فرق تھا انہیں نہ سمجھ سکے۔

(1) چند عارضی حد بندیوں کے ساتھ درجہ ٔنوآبادیات کا فوراً عمل میں آنا اور درجۂ نوآبادیات کو ایک دور کی منزل سمجھنا (2) پارلیمنٹ کا صرف اتنا اختیار سمجھنا کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو راضی نامہ ہو اس کو قانونی شکل دے کر اپنی مہر ثبت کرسکتی ہے اور پارلیمنٹ کو بحیثیت جج کے سمجھنا جو منزل مقصود کی طرف ہندوستان کی پیش رفت کا فیصلہ کرے۔

نمک ستیہ گرہ اور ڈانڈی مارچ کو شروع میں حکومت نے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

ان کے خیال میں یہ تحریک ایک سنکی اور وہمی آدمی کی صرف جرأت مجنونانہ تھی۔ ان کو خوش فہمی تھی کہ یہ تحریک قطعی طور پر ناکام ہو جائیگی اور پھر گاندھی جی کو یا تو اسے واپس لینا پڑے گا یا یہ کمزور ہو کر ختم ہو جائے گی۔ اروِن کو امید تھی کہ" مارچ جو نا مبارک طور پر شروع کیا گیا ہے، ناکامی اور تمسخر کا منہ دیکھے گا اور اس لیے گاندھی جی کو قبل از وقت شہادت کا درجہ نہ دینا چاہتے تھے۔"[1]

بہر حال ان کو پورا اعتماد تھا کہ وہ اس تحریک کو کچل دیں گے اور ضرورت ہوئی تو گاندھی جی کو جیل میں ڈال دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ ان کو اپنی خوب آزمائی ہوئی سہ رخی پالیسی پر پورا اعتماد تھا یعنی شورش کرنے والوں پر جبر وتشدد، حکومت کے بہی خواہوں، اعتدال پسندوں، مسلمانوں، ہندوستانی جاگیرداروں پر بھروسہ کہ یہ لوگ قوم پرست طاقتوں میں پھوٹ ڈلوادیں گے۔

اروِن کی نظر میں لاہور کی قرارداد شر انگیز اور خطرناک تھی۔ افتراق پسندی کی تحریک تھی، حکومت کو تہ وبالا کر دینے والی اور جس سے انقلابی تشدد پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔[2] سکریٹری آف اسٹیٹ کا مشورہ یہ تھا:

"کوشش کر کے ایسے فعل سے احتراز کیجئے جس سے آپ کو عوام الناس سے ٹکر لینا پڑے بلکہ ذمہ دار لیڈروں کو چن لیجئے اور ان سے نپٹ لیجئے، وہ کوئی بھی ہوں اور کچھ بھی ہوں۔ حکومت کے اخلاقی اقتدار کو برقرار رکھیے اور ان لوگوں کو ملا لیجئے جو قاعدوں اور قوانین کا احترام کرتے ہیں اور جن کی سیاسی سوجھ بوجھ ہندوستانی سیاست کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو انقلابی تحریکوں سے محفوظ رکھے گی۔ انقلابی لیڈروں سے سختی سے نپٹنے کے ساتھ ساتھ اصلاح کی

1۔ ہیلی فکس، ارل آف برکن ہیڈ، ص 281۔

2۔ اروِن پیپرس: وائسرائے بنام ووڈ جبن، 9 رجنوری 1930ء

پالیسی بھی برقرار رکھے۔''[1]

جس دن ڈانڈی مارچ شروع ہوا اس کے دوسرے دن وائسرائے الجھن میں تھے۔ انہوں نے وتیج وڈ بین کو لکھا:

''اس وقت میری توجہ زیادہ تر گاندھی پر مرکوز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ ان سے نپٹنے کا صحیح طریقہ کون سا ہے۔''[2]

لیکن مارچ کے خاتمے پر اور نمک کے قانون کی خلاف ورزی پر بھی اروِن کا خیال یہ تھا کہ'' ان کی تحریک ابھی تک اتنی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہے جتنی کہ ان کو امید تھی۔ اسی کے ساتھ گاندھی کے ساتھ ایک معمولی قانون شکن کا سا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اس بات کو روکنا ضروری تھا تاکہ لوگوں میں یہ غلط تاثر قائم نہ ہو جائے کہ '' گاندھی گرفتاری سے بالاتر ہیں۔'' اس کا خیال تھا کہ اس معمے کا بہترین حل یہ ہوگا کہ'' وہ اس سال مر جائیں گے'' جیسا کہ نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی۔[3]

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لہجہ بدلنے لگا۔ ہفتہ وار رپورٹوں سے جو حکومت ہند، سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجتی تھی انتشار اور گڑبڑ کی وسعت اور شدت کا پتہ چلنے لگا۔ یہ رپورٹیں 17 رمئی 1903ء سے شروع ہوئیں اور پورے سال ہفتہ وار واقعات کی تفصیل اور ان پر تبصرہ فراہم کرتی رہیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں بہت سے قبیلوں نے حاجی ترنگ زئی اور اس کے بیٹے جیسے ملاؤں کے اکسانے پر بغاوت کر دی۔ وزیرستان کی ٹوچی وادی اور دیگر مقامات پر حکومت نے ہوائی جہاز سے بم باری کر کے اس بغاوت کی تحریک کو

1۔ ایضاً، تار از طرف سکریٹری آف اسٹیٹ بنام وائسرائے، 17 رجنوری 1930ء

2۔ ایضاً: از طرف وائسرائے بنام وتیج وڈ بین، 13 مارچ 1930ء

3۔ بحوالہ گزشتہ: وائسرائے بنام ڈبلیو بین 7 راپریل 1930ء

دبانے کی کوشش کی۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں عبدالغفار خاں نے جو 'سرحدی گاندھی' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے ' خدائی خدمت گار' کے نام سے رضا کاروں کی ایک فوج تیار کی تاکہ وہ لوگ کانگریس کے پروگرام کی تبلیغ کریں۔ جب 23/اپریل کو حکومت نے کانگریس کے لیڈروں اور رضا کاروں کو گرفتار کر لیا تو انہیں چھڑانے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں سخت بلوہ ہوا۔ بکتر بند گاڑیاں لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے استعمال کی گئیں اور گولیاں بھی چلانا پڑیں۔

کئی مہینوں تک سارے ہندوستان میں حالات خلاف معمول رہے۔ نمک کے کارخانوں پر حملے، بدیسی کپڑوں اور بدیسی شراب کی دکانوں پر دھرنا دینا، بڑے بڑے مجمعوں کا مظاہرے کرنا۔ افسروں سے حکم عدولی کے مظاہروں کے باعث فضا میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

12/مئی کو اروِن نے ایک بیان جاری کیا تھا جس میں حسب ذیل باتیں درج تھیں:

''گزشتہ تین ہفتوں کے واقعات سے میری وہ افسوس ناک پیش گوئیاں جو میں نے مسٹر گاندھی کے خط کے جواب میں لکھی تھیں پوری ہو گئیں۔ دور دراز مقامات مثلاً پیشاور اور مدراس، بمبئی اور کلکتہ، چٹاگانگ اور کراچی، دہلی اور شولاپور سے عوام الناس کے تشدد، مسلح قاتلانہ حملوں اور عام طور سے قانونی طور پر با اختیار افسروں کی خلاف ورزی کی اندوہناک داستانیں معلوم ہوئی ہیں۔'' [1]

24/اپریل کو اروِن نے بین کو لکھا تھا: '' ان کا (کانگریس کا) خاص مقصد یہ تھا کہ ملک کو عام طور پر قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے تیار کیا جائے اور ایک

1۔ گول میز کانفرنس پر وائسرائے کا اعلان، 12/مئی 1930، دی اینول انڈین رجسٹر، 1930، جلد اول، ص 110

مقررہ تاریخ کو وسیع پیمانے پر مظاہرے کر کے حکومت مجاز کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا جائے۔ اس مقصد میں انہیں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوگئی۔" 1

لیکن ان کو اطمینان تھا تو اس بات سے کہ "مسلمانوں کا فرقہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہا ہے" اور مظاہروں میں مزدوروں نے کوئی زیادہ حصہ نہیں لیا ہے۔ ان کا ردعمل یہ تھا کہ "ابھی تک کوئی مایوسی کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوئی اور خطرے کی تو اس سے بھی کم۔" 2

پانچ دن کے بعد وہ بین کو "میرے خیال میں صورت حال اب ایسی ہوگئی کہ حکومت کسی قسم کے لوگوں کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دے سکتی کہ ہم لوگ ایسا کرنے سے (گاندھی جی کو گرفتار کرنے سے) ڈرتے ہیں۔" 3

5/ مئی کو گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے اور یرودا جیل پونا میں نظر بند کر دیے گئے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے وایسرائے کے اس فعل کی تحسین کی اور اس کو یقین دلایا کہ برطانیہ کی تمام پارٹیوں کو ان پر پورا اعتماد ہے اور کابینہ ان کے خیالات سے متفق ہے۔

یہ امید کہ گاندھی جی کو منظر سے ہٹا دینے پر یہ تحریک دم توڑ دیگی موہوم ثابت ہوئی اور 22/ مئی کو وایسرائے نے اطلاع بھیجی: "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گاندھی نے ہندوؤں میں اس قدر وسیع پیمانے پر قوم پرستی کی تحریک پھیلا دی ہے کہ اس کا اندازہ، جہاں تک میرا خیال ہے، کوئی برطانوی یا ہندوستانی مبصر نہیں لگا سکا تھا۔ اس کے علاوہ لمبے لمبے درختوں کے سر قلم کر دینے کی ہماری پالیسی بھی ہماری امیدوں کے برخلاف کامیاب نہیں ہوئی۔" 4

---

1. اروِن پیپرس: وایسرائے بنام ڈبلیو بین، 24/ اپریل 1930ء
2. ایضاً
3. ایضاً۔ وایسرائے کا تار بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، 29/ اپریل 1930ء
4. بحوالہ گزشتہ: وایسرائے بنام وِنج وڈ بین، 22/ مئی 1930ء

دراصل وہ اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ اس نے سوچنا شروع کیا۔ ''اس لیے اب ان دو باتوں میں سے ایک منتخب کر لینا ہمارے لیے کارآمد نظر آتا ہے یعنی یہ کہ گاندھی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جائیں یا احتجاج کو روکا جائے۔''[1]

وہ پہلے تو یہ ڈینگ مارا کرتے تھے کہ اسے بھوت پریت آسانی سے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔ اب ان کو یقین ہوگیا کہ "یہ ایک غلطی ہوگی اگر ہم اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں کہ ہماری بنی بنائی حکومت خطرناک مرحلے سے دوچار ہے جس کے مقابلے کے لیے ہم کو اپنے تمام ذرائع یکجا کر کے استعمال کرنا ضروری ہے۔''[2]

انہوں نے آخرکار یہ بھی مان لیا کہ '' مسلمان اور دوسری اقلیتیں بھی سیاسی ترقی کی خواہاں ہیں۔ اور ہندوستان کے باشعور لوگو کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو ساکت اور خاموش رہنا چاہتا ہے۔''[3]

2/جون تک وایسرائے کا اندازہ ان الفاظ میں ظاہر ہوا: '' یہ تحریک بہت سنگین ہے اور ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقے میں پھیل گئی ہے۔ یہ ان کے ذہنوں پر چھا گئی ہے اور انہیں بہائے لیے جارہی ہے جس سے ان کے پیر اکھڑ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بہت خطرناک صورت حال ہے۔ اس بات کی طرف سے تو اطمینان ہوگیا کہ ہم اصل مسئلے کو جبری تدبیروں سے نہیں حل کر سکتے اور اس لیے اب ضروری ہوگیا کہ مستقبل کی مختلف ممکنہ ترقیات کی روشنی میں تعمیری کاموں کے امکانات کا جائزہ

1۔ ایضاً

2۔ ایضاً، 14/مئی 1930ء

3۔ ایضاً

لیا جائے۔"[1]

13-گول میز کانفرنس کی فوری ضرورت

سول نافرمانی کی تحریک میں جو پیش رفت ہوئی اس نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سوچے۔ فوری فیصلہ تو یہی کیا گیا کہ انسدادی تدابیر اختیار کی جائیں جن کا خاص مقصد یہ تھا کہ کانگریس کی کارگزاریوں کی روک تھام ہو جائے۔ اس کی کمیٹیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ بڑے پیمانے پر اس کے لیڈروں کو گرفتار کیا گیا اور ہر قسم کے سیاسی عمل جیسے جلسے، جلوس، دھرنا دینا، پروپیگنڈہ کرنا وغیرہ سب کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس بات پر بھی خاص توجہ دی گئی کہ بقیہ ہندوستان کے تمام مسلمان سول نافرمانی تحریک میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے مسلمانوں کی تقلید نہ کر سکیں۔

13 رمئی کو اروِن نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ سیاسی مسئلے کا کوئی حل اطمینان بخش نہ سمجھا جائے گا تاوقتیکہ اہم اقلیتوں کی رضامندی اس میں شامل نہ ہو اور ان کو اس سے اپنے تحفظ کا احساس نہ پیدا ہو۔[2]

مسلمانوں کو وفاداری کے صلے کے طور پر جو یہ حق نامنظوری (ویٹو) دیا گیا اس سے مسلمان فرقہ پرستوں نے خوب فائدہ اٹھایا جیسا کہ ابھی بیان کیا جائے گا۔ ان ذرائع سے مخالفانہ اور انتشاری کارروائیاں بظاہر روکی جا سکتی تھیں لیکن بے اطمینانی کے بنیادی اسباب دفع نہ ہو سکے۔ یہ خطرہ کہ کسی وقت بڑے پیمانے پر فساد برپا ہو جائے جس سے نظم و نسق درہم برہم ہو جائے دور نہ ہو سکا۔

1۔ ایضاً: 2 رجون 1930ء

2۔ دی انڈین اینول رجسٹر، 17 رمئی 1930ء جلد دوم ص 107

وائسرائے نے موقع پر موجود نگہبان کی طرح روز بروز بگڑتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کیا۔ اس تحریک نے ہندوستانیوں کے خون میں بہت ہی جوش پیدا کر دیا تھا۔ وائسرائے کو جس بات کا اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے بہت سے ان لوگوں کو جو سیاست میں اعتدال پسند تھے، سول نافرمانی کے خلاف اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے، برگشتہ خاطر کر دیا تھا۔ قانون اور حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ، جبر و تشدد سے ٹھنڈا نہ کیا جا سکا۔ سرحد پر خطرہ الگ منڈلا رہا تھا۔ وہاں کمیونسٹ اثرات کی توسیع کے لیے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔

قانون کمیشن کی جو رپورٹ 13/ اور 24/ جون 1930ء کو شایع ہوئی اس نے قوم پرستوں کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ اس میں قصداً مملکتی درجہ دیے جانے کا ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اتنا بھی نہیں کہا گیا کہ ہندوستان کو اس کی سیاسی ترقیوں کے نتیجے میں اس دور دراز منزل پر پہنچا دیا جائے گا۔ اس میں اختیارات کی منتقلی کی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی بلکہ تمام اختیارات غیر ذمہ دار مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں رکھے گئے تھے۔ صوبوں میں دو عملی حکومت ختم کر دینے کی سفارش تھی لیکن صوبوں کی خود مختاری میں ایک روک لگا دی گئی تھی وہ یہ کہ صوبوں کے مالی معاملات میں حکومت ہند کو دخل دینے کے خاص اختیارات دیدیئے گئے تھے۔ کمیشن نے اگرچہ علاحدہ نمایندگی کے مذموم اصول کے خلاف معقول دلائل دیے تھے لیکن بجائے اس اصول کو رد کرنے کے اس کو مستقل قرار دیدیا تھا اور اس طرح فرقہ پرست انتہا پسندوں کو مزید قوت دیدی تھی۔

کمیشن کی سفارشات کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیے قطعی ناقابل قبول تھیں۔ مسلم لیگ نے بھی ان کو غیر اطمینان بخش قرار دیا۔ خود وائسرائے کو بہت سخت ناگواری محسوس ہوئی۔ انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا: " میں نے جیسے

ہی ان کی رپورٹ کو پڑھا تو اس میں بنیادی غلطی جو بہت نمایاں اور عمداً کی گئی ہے یہی نظر آئی کہ انہوں (سائمن) نے اپنی آنکھوں سے پٹی نہیں کھولی اور درجہ نوآبادیات کے مطالبے کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تصور کا فقدان ہے۔"[1]

ان سب باتوں کا مجموعی اثر وائسرائے پر یہ ہوا کہ وہ اصلاحات پر غور وخوض کیے جانے کی فوری ضرورت محسوس کرنے لگا۔ انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ پر تین باتوں کے لیے زور دینا شروع کیا (1) کانفرنس کو بلانے کے لیے کوئی تاریخ جلد مقرر کر دی جائے تاکہ ہندوستانیوں کے ذہن جو اس وقت ہنگامہ آرائی کی طرف مائل ہیں تعمیری کام کی طرف متوجہ ہو جائیں (2) ان مندوبین کا انتخاب کر لیا جائے جو کانفرنس میں شریک ہوں گے (3) کانفرنس کا ایجنڈا اور بحث کے لیے بنیادی اصول طے کر لیے جائیں۔

اروِن کی کوشش یہ تھی کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ سے جو صدمہ پہنچا ہے اسے اس طرح کم کر دیا جائے کہ گول میز کانفرنس کے آزادانہ رول کی اہمیت بڑھا کر رپورٹ کی اہمیت کا پلہ ہلکا کر دیا جائے۔

وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانے سے لے کر اب تک ہندوستان نے کافی ترقی کر لی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ دو ایک برسوں میں تو ہندوستان کے سیاسی ادراک نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مالکم ہیلی جو اپنے زمانے کے بہترین منتظمین میں سے سمجھا جاتا تھا اور جنہوں نے اپنی ساری کارکردگی کی زندگی ہندوستان ہی میں گزاری تھی اروِن کی رایوں کی تائید میں تھے انہوں نے بتایا: "آپ پوچھتے ہیں کہ کیا ہندوستانیوں کی رائیں نومبر 1929ء تک یا

1۔ ہیلی فیکس، ارل آف برکن ہیڈ، خط لارڈ اروِن بنام سکریٹری آف اسٹیٹ مورخہ 20 / جون 1930ء

جنوری 1930ء تک اتنی تیزی سے آگے بڑھ گئیں کہ انہوں نے سائمن رپورٹ کی تجاویز کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے: میں سمجھتا ہوں کہ نہرو رپورٹ میں جو تجاویز شامل کی گئی تھیں وہی اتنی زیادہ ترقی یافتہ تھیں اور پبلک کی تائید انہیں اتنی زیادہ حاصل ہو گئی تھی کہ اس کا ہم میں سے بہتوں کو گمان بھی نہ تھا۔"[1]

اس میں وتیج وڈ بین کی گواہی بھی شامل کی جا سکتی ہے جنہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ سائمن کمیشن نے اس بات (ہندوستان کی سیاسی ترقی) کو نظر انداز کیا کہ "کمیشن کے کام کے اختتام کے بعد قوم پرستی کا جذبہ ہندوستان میں اتنی تیزی سے بڑھا ہے اور اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ اس نے تجربہ کار مشاہدین کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے۔"[2]

انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اگر ہندستان کو برطانوی سلطنت میں اس کے ایک جزو کی حیثیت سے قائم رہنا ہے تو وہ دیگر مملکتوں کے ساتھ برابری کے درجے ہی پر قائم رہ سکتا ہے۔

اپنی پہلی بات کے متعلق وایسرائے نے کہا کہ "دستور کے مباحث کے سلسلے میں ہندوستانی سیاسی نظریے اور برطانوی سیاسی نقطۂ نظر میں بہت بڑی خلیج ہے۔ ہندوستان (گول میز) کانفرنس کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے برخلاف برطانوی ذہن کمیشن کی رپورٹ سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ ان حالات میں اس نے لیبر حکومت کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو مشورہ دیا کہ کانفرنس میں سرکاری مندوبین کے علاوہ دوسری پارٹیوں کے ممبر بھی شامل کر لیے جائیں۔"[3]

26/ مارچ کو انہوں نے وتیج وڈ بین کو تار بھیجا: "یہاں تمام پارٹیوں میں یہ

1۔ بحوالہ کتاب ہیلی فکس، ارل آف برکن ہیڈ ص 290

2۔ اروِن پیپرس۔ سکریٹری آف اسٹیٹ بنام وایسرائے 20/ جون 1930ء

3۔ ایضاً: وایسرائے بنام وتیج وڈ بین 6/ مارچ 1930ء

احساس شدت سے بڑھ رہا ہے کہ اس سال لندن میں کانفرنس منعقد کی جائے اور جس قدر جلد ہو بہتر.......... ہمارے دوست چاہتے ہیں کہ کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جائے تا کہ جو طوفان ان کے خلاف اٹھ رہا ہے روکا جا سکے...... میں سمجھتا ہوں کہ اس جذبے کی شدت اور عمومیت کو دیکھتے ہوئے کہ کانفرنس اسی سال بلائی جائے ہم کو جس قدر جلد ممکن ہو اس کانفرنس کو منعقد کرانے کی اپنی رضامندی کا اعلان کر دینا چاہئے۔"[1]

یکم مئی کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے وزیر اعظم اور کابینہ سے مشورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ کانفرنس اکتوبر میں ہو لیکن بعد میں اس کی تاریخ بدل کر 14 /نومبر کر دی۔

اروِن دستوری معاملات کے متعلق متفکر نہ تھے لیکن وہ یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ غیر سرکاری ہندوستانیوں میں حکومت کی طرف سے اعتماد کی بحالی ضروری ہے تا کہ ان سے معاملات کے سلجھانے میں مدد مل سکے۔ اس نے اس مسئلے پر سپرو سے مشورہ کیا کیونکہ وہ دستوری قانون کے ماہر تھے اور اعتدال پسند لوگوں میں ان کی شخصیت بہت نمایاں تھی ساتھ ہی کانگریس کے لیڈر، گاندھی جی، موتی لال نہرو وغیرہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ "ہندوستانیوں کا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے کے لے ایک فیاضانہ لیکن محفوظ اور خوش کن پالیسی پیش کرنا چاہئے تا کہ وہ لوگ جو تصفیہ چاہتے ہیں یہ کہہ سکیں کہ ہم کو وہ چیز جسے وہ درجہ نو آبادیات کہتے ہیں تحفظات کے ساتھ مل گئی ہے۔"[2]

سکریٹری آف اسٹیٹ نے وائسرائے کے نام ایک خط میں حکومت کی پالیسی واضح کر دی۔ انہوں نے لکھا "درجہ نو آبادیات کا یہ مطالبہ (تحفظات کے ساتھ) مجھ کو

---

1. ایضاً: وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، 26 /مارچ 1930ء
2. وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، سپرو سے صلاح ومشورہ کے متعلق، 8 /مئی 1930ء

نہ صرف متناقض بلکہ خطرناک بھی معلوم ہوتا ہے۔" اس سوال کا کہ" کیا برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کے لیے قوانین سازی کا اپنا واضح حق پیشتر ہی سے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے گی اور ایک عام یقین دہانی کرا دے گی کہ اگر ہندوستان اپنے معاملات خود طے کر لیتا ہے تو برطانوی پارلیمنٹ اسے منظور کر لے گی"؟ اس کا جواب یہ تھا" اس قسم کی واضح اور قطعی یقین دہانی نہیں کرائی جا سکتی۔"[1]

اروِن نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے اصرار کے ساتھ تقاضا کیا کہ قوم پرستوں کی رائے کو ہموار کرنے کے لیے ایک نیا سمجھوتہ ضروری ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وزیر اعظم یا سکریٹری آف اسٹیٹ کو گول میز کانفرنس کے مقاصد کے متعلق ایک بیان دینا چاہئے اور اس کی بھی وضاحت کر دینی چاہئے کہ دستوری مسئلے کے سلسلے میں حکومت کا رویہ کیا رہے گا۔ بلکہ اروِن نے خود اس اعلان کا مسودہ بنا کر بین کو بھیجد یا جس میں پانچ اہم نکات تھے:

(1) گول میز کانفرنس کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جس تجویز پر چاہے بحث کرے۔" اس کی (کانفرنس کی) کارگزاری پر کسی قسم کی حد بندی عاید کرنا مناسب نہ ہوگا۔"

(2) حکومت ہندوستان کو اس مملکتی درجے کے حصول پر ہر قسم کی مدد دے گی جس کو وایسرائے نے اپنے 31 اکتوبر 1929 کے اعلان میں واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کا فطری صلہ یہی ہے۔

(3) یہ کہ حکومت امید کرتی ہے کہ کانگریس اس میں شرکت کے متعلق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے گی۔

(4) یہ کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے متضاد مفادات کو ہم آہنگ کرانے کی

---

1. ایضاً ویج وڈ بین بنام وایسرائے 5 جون 1930ء

کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی۔

(5) کانفرنس میں جو سمجھوتے ہوں گے انہیں کی بنیاد پر حکومت اپنی تجاویز پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے گی۔ 1

اس مسودے کو میکڈانلڈ نے بالڈون اور لائڈ جارج کو دیا تا کہ دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کی رائیں معلوم ہو جائیں اور ان کی رضامندی حاصل ہو جائے۔ تینوں پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ چیمبرلین نے اس کی کارروائی تحریر کی۔ اس کے مطابق ویج وڈ بین نے ان لوگوں نے کہا کہ '' ہم ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جیسی کہ سن فیان آئرلینڈ میں تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے حالات میں جس قسم کی انسدادی قوانین نافذ کیے گئے ہیں ان سے زیادہ اور سخت تدبیریں ہم اختیار کر چکے ہیں بلکہ اور بھی زیادہ سخت انسدادی تدبیریں کانگریس کے خلاف زیر غور ہیں۔'' لیکن اس نے بتایا '' کہ ان تدابیر کی کامیابی کا اسے کوئی بھروسہ نہیں ہے۔'' 2

آسٹن چیمبرلین کا کہنا یہ تھا کہ مملکتی درجے کا اعلان کیا جانا ایک خطرناک بات ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے گاندھی کے مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کو جو کہ تمام پارٹیوں کی متفقہ رپورٹ ہے گول میز کانفرنس میں بحث و مباحثہ کی بنیاد بنانا چاہئے۔ اس نے پوچھا کہ حکومت اپنے منشا کی وضاحت کرے۔ میکڈانلڈ نے جواب دیا کہ اگر اعلان وائسرائے کے پیش کردہ نکات کے مطابق نہ کیا گیا تو وہ استعفیٰ دیدیں گے۔

---

1 چیمبرلین پیپرس: چیمبرلین کی فرد یادداشت حصہ اول، 27/جون 1930ء

2 ایضاً

اس ابتدائی گفتگو کے بعد حکومت کے ترجمانوں اور دیگر پارٹیوں کے لیڈروں کے درمیان کئی نشستیں ہوئیں۔ان پارٹیوں نے اپنی الگ الگ نشستیں بھی کیں اور ان لوگوں نے وایسرائے سے خط وکتابت بھی بہت کی تاکہ صورت حال ان پر واضح ہو جائے۔مزاجوں میں جھنجھلاہٹ اور غصہ تھا کیونکہ قدامت پسند اور لبرل پارٹیوں کے لیڈر اس مجوزہ اعلان کے باعث بہت برافروختہ ہو گئے تھے۔وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ کمیشن کی رپورٹ کو پس پشت ڈال دیا جائے اور مملکتی درجہ کے تصور کو اہمیت دی جائے۔

وایسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ ایک ایسا اعلان ضرور کیا جائے جس سے (ہندوستان کا) اعتدال پسند اور مصالحت پسند طبقہ حکومت کا طرفدار ہو جائے اور بغاوت پسند لوگ تنہا رہ جائیں۔

بین نے بحث یہ کی کہ 1919ء میں تو یہ ممکن تھا کہ اس وقت کے ایکٹ کے مقدمے میں ہندوستانیوں کو سیاست سکھانے کے سلسلے میں اتالیقی اصطلاحیں استعمال کی جاسکتی تھیں لیکن اب ہندوستان اس وقت کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ہندوستانیوں کو حکومت کا کام چلانے کا تجربہ بہت سے شعبوں میں بہت کافی ہو گیا ہے۔جنگ عظیم نے حکومت خود اختیاری کے خیالات کو دور دور پھیلا دیا ہے۔تیسری افغانی جنگ، ترکی میں انقلاب، چین میں قومی حکومت کا قیام، برطانوی مملکتوں میں آزادی کا فروغ ان سب نے مل کر ہندوستانیوں میں بھی یہ خواہش پیدا کر دی ہے کہ ان کی محکومیت کی وہ صورت ختم ہو جائے جو حکومت ہند کے 1919ء کے ایکٹ نے ان پر عاید کر دی ہے۔اب کسی ''معروضی حل'' کو سوچنا ناممکن ہے''برطانیہ عظمیٰ ناقابل تلافی غلطی کرے گا اگر اس نے پورے

مسئلے کے داخلی اور نفسیاتی رخ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔"[1]

سائمن کمیشن رپورٹ میں نہ تو کسی طرح بات بنانے کی رنگ آمیزی کی گئی تھی نہ دوراندیشی سے کام لیا گیا تھا۔ اس میں حالات کا جائزہ صرف برطانوی نقطۂ نظر سے پیش کر دیا گیا تھا۔ ضروری تھا کہ اس میں ہندوستانی نقطۂ نظر بھی پیش کیا جاتا اور یہ ایک گول میز کانفرنس کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ "یہ بھی ہو سکتا تھا کہ گاندھی کی مدد ان کے اصول یا عدم تشدد کے باوجود بھی مفید طلب ہو سکتی۔"[2]

اس تعاون کو حاصل کرنے کی خاطر وہ اور آگے جانے کے لیے بھی تیار تھا۔ "ہم مملکتی درجہ دینا چاہتے ہیں اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک نارضامند ہندوستان کی قوت کو طاقت کے بل پر اپنی سلطنت میں شامل رکھا جا سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کس قدر سخت عملی دشواریاں درپیش ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان دقتوں اور دشواریوں کو حل کرنے کی تدبیروں کو جو ظاہر ہیں اور ضروری ہیں ہندوستانی بھی خوش آمدید نہیں گے۔ ہم کسی قسم کے تحفظات کی ضرورت کو براہ راست یا بالواسطہ بہانہ بنا کر اپنی حکومت چلاتے رہنا نہیں چاہتے۔ ہم حکومت ان لوگوں کے مفاد ہی کے لیے چاہتے ہیں ہندوستان جن کا وطن ہے۔

"ہم مانتے ہیں کہ اقلیت کے ہم پر فرائض ہیں لیکن اس تولیت کو کسی طور پر اکثریت کے مفاد کے خلاف استعمال نہ کرنا چاہئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف ہم اقلیت سے جا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم جاتے ہیں تم ایک طاقتور اکثریت سے جتنے بہتر شرایط ممکن ہوں خود طے کر لو، دوسری طرف ہم وہاں رہ کر کسی ایک یا زیادہ اقلیتوں پر بھروسہ کر کے اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم

---

1. اروِن پیپرس: وایسرائے بنام ویج وڈ بین، 3 رجولائی 1930ء

2. ویج وڈ بین بنام وایسرائے، 20 رجون 1930ء

بھی نہیں کرنا چاہتے۔" 1

اروِن نے پوری طرح اس سے اتفاق کیا۔ انہوں نے وتج وڈ بین سے کہا" مجھے واقعی یہ سوچ کر رونا آتا ہے کہ اس قسم کے معاملے میں اسٹینلی بالڈون اپنی قوت فیصلہ آسٹن (چیمبرلین) کو سپرد کردیں جن کا تعلق ہندوستانی سے دور کا ہے اور جن کا دماغ ہمیشہ ایک لکڑی کے لٹھے کی مانند سخت رہتا ہے۔" 2

انہوں نے سائمن کمیشن رپورٹ کو معروضی طریقہ کار کی ایک نہایت افسوس ناک مثال قرار دیا۔" یہ سوچ کر واقعی میرا خون ابلنے لگتا ہے کہ ایسی ذہنیت کے ان لوگوں نے جو اصل مسئلہ کی اس ابجد سے بھی ناواقف ہیں جس سے ہمارا آپ کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، شرارت پیدا کرنے کی ایسی صلاحیت دکھائی ہے۔" 3

ان کے تعمیری مشورے یہ تھے کہ صوبوں کو مکمل خودمختاری دی جائے، لوگوں کے نمائندوں کو کچھ اختیارات تفویض کردیے جائیں یعنی مرکز پر ایک قسم کی دوعملی حکومت ہو، اور بعض شعبے محفوظ رکھے جائیں مثلاً دفاع، امور خارجہ اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، جہاں تک مرکزی حکومت کا تعلق ہے اس نے لکھا" جس مشکل میں ہمیں سائمن نے لا ڈالا ہے کہ ایک منتخبہ اسمبلی ہو اور اس کے ساتھ ایک غیر ذمہ دار عاملہ اور پھر اس عاملہ کا سابقہ جب لوگوں سے پڑے گا تو ہمارے لیے مفر کا کوئی راستے نہ رہ جائے گا سوائے اس کے جس کا میں نے مشورہ دیا ہے۔" 4

لیکن دوسری پارٹیوں کے سخت تکلیف دہ اختلافات کے باعث ان کو اپنے

---

1 بحوالہ گزشتہ:

2 اروِن پیپرس، وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، 3/ جولائی 1930ء

3 ایضاً

4 ایضاً

مشورے میں چند مصالحت آمیز درج ذیل تبدیلیاں کرنی پڑیں:

(1) درجہ نوآبادیات کا اعلان برقرار رہے۔

(2) سائمن کی رپورٹ کو حرف آخر نہ سمجھا جائے۔

(3) کانفرنس کو ایک معتبر اور مستند درجہ دیے جانے کا اعلان (سکریٹری آف اسٹیٹ) مجلس قانون ساز میں اپنی تقریر میں کردیں۔ 1

بالڈون نے دوسرے ہی دن ارون کو تار دیا: "اگر اس خیال کی تصدیق کی گئی کہ برطانوی یا ہندوستانی حکومت یہ مشورہ دینے والی ہے کہ مرکزی حکومت ایک ہندوستانی مجلس قانون ساز کے سامنے ہر معاملے میں جواب دہ ہوگی تو اس سے فریب دہی کا احساس اور مایوسی ضرور پیدا ہوگی.........اور اس کے نتائج بہت سخت ہوں گے کیونکہ اس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی جو سائمن کمیشن نے تمام پارٹیوں کی رضامندی سے قایم کی ہے۔" 2

ارون نے اپنے جواب میں اپنی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے بتایا کہ سائمن کی سفارشات ناکافی ہیں اور ضرورت ہے کہ اس رپورٹ میں کچھ ایسے اضافے کیے جائیں جن سے کم از کم ہندوستانی سیاست دانوں کا اعتدال پسند طبقہ تو مطمئن ہو سکے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اگر اس کا 31/اکتوبر 1929ء والا اعلان باقی نہ رکھا گیا تو وہ استعفا دے دیگا۔ اس نے بالڈون سے یہ بھی درخواست کی کہ اس معاملے کو پارٹی کا [illegible]لہ بنانے میں احتراز کریں۔

لیکن بالڈون کے تار کے جواب میں ارون نے 9/جولائی کو جو کچھ لکھا اس سے قدامت پسند اور لبرل پارٹی والوں کے خدشات دور نہ ہو سکے۔ آسٹن چیمبرلین نے

---

1 ایضاً بحوالہ گزشتہ

2 ایضاً، بالڈون کا تار مورخہ 4/جولائی 1930ء جو سکریٹری آف اسٹیٹ کے تار کے ساتھ ملفوف تھا۔

اپنی پارٹی کی طرف سے میکڈانلڈ اور وتیج وڈ بین سے ناشایستہ صاف گوئی کے ساتھ کہہ دیا کہ اگر وہ لوگ رپورٹ کو مسئلے کا واقعی تصفیہ نہ مانیں گے تو انہیں نتائج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ مطلب یہ کہ ان کی پارٹی لیبر پارٹی کے اس اعلان کی مخالفت کرے گی اور اس کے ساتھ اپنا تعاون ختم کردے گی۔

اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لیبر پارٹی کے لیڈروں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان (گویا) ایک دام چکانے والی شے تھی۔ اس کے حکمرانوں کو ہندوستان کی خوشنودی کے مقابلے میں اپنا اقتدار زیادہ عزیز تھا۔ وتیج وڈ بین نے ارون کو قدامت پسند اور لبرل پارٹیوں کے خیالات اور حکومت کی لاچاری سے آگاہ کردیا۔ بالڈون نے پہلے ہی ارون کو اس کی تجویز کے سنگین نتائج سے متنبہ کردیا تھا۔ چنانچہ وتیج وڈ بین اور ارون نے سر تسلیم خم کردیا اور انہیں گول میز کانفرنس کے طریقہ کار اور دستوری پیش رفت کے متعلق اپنے ترقی پسندانہ خیالات سے دستبردار ہونا پڑا۔

9ر جولائی کو گورنر جنرل نے مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک بیان دیا جس میں حکومت کے نیک اور مخلصانہ ارادوں کو بہت دل خوش کن مگر مبہم انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ پارلیمنٹ کی پارٹیوں کے رویوں سے اچھی طرح واقف تھا، اس نے ایسے فقرے استعمال کیے جن سے اس پر کوئی گرفت نہ ہو سکے۔ صرف اتنا یقین دلایا کہ کانفرنس پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے دستوری بل کے متعلق جو تجاویز اتفاق رائے سے تیار کرے گی حکومت ان پر غور کرے گی۔ اس نے سول نافرمانی شروع کرنے پر کانگریس کی مذمت کی اور اسے دعوت دی کہ وہ احتجاج کے طریقوں کو ترک کرے اور کانفرنس کے مباحثوں میں حصہ لے۔

☆.......................☆.......................☆

تیسرا باب

گول میز کانفرنس

1- پہلا اجلاس

ارون نے وجِ وڈ بین کے نام ایک خط میں مجوزہ گول میز کانفرنس کے نتائج کے متعلق رائے ظاہر کی کہ ایسی کانفرنس منعقد کرنے کا بہترین موقع 1924ء میں تھا جب کہ قانون ساز اسمبلی نے موتی لال نہرو کی یہ تحریک منظور کرلی تھی کہ گورنر جنرل سے ایک ایسی کانفرنس بلانے کی سفارش کی جائے جو دستور کے مسئلے کو طے کردے۔ ارون کا یہ خیال صحیح تھا۔ 1924ء میں کانگریس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ملک عدم تعاون کی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے اب تیار نہیں تھا۔ اس کے دائیں بازو یعنی سوراجی پارٹی نے کونسلوں کے اندر رہ کر سیاسی کام کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرلیا تھا اور یہ پارٹی اس بات کی خواہش مند تھی کہ سیاسی اصلاحات پر تبادلہ خیال کرنے میں حکومت کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اعتدال پسند لوگوں کی لبرل فیڈریشن ترقی کی خاطر کسی بھی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھی۔ مسلمانوں کی تنظیمیں جمود کی حالت میں تھیں۔ مسلم لیگ اگرچہ اس وقت مجہول تھی لیکن اس نے حکومت خود اختیاری کی منزل تسلیم کرلی تھی اور اس سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس وقت وہ خوف و دہشت پیدا نہیں ہوئی جس کا شکار وہ دسمبر 1928ء میں آل پارٹیز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہوگئے تھے۔ جناح اگرچہ کانگریس سے علاحدہ ہوچکے تھے لیکن اس وقت تک وہ دل سے اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار تھے۔ 24-1921ء کے فرقہ

وارانہ فسادات نے فضا کو مکدر ضرور کر دیا تھا لیکن دونوں فرقے صلح وآشتی کی تدبیریں تلاش کر رہے تھے۔

اس لیے جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے ان کو تو دو بنیادی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنا تھا یعنی (1) ملک کی سیاسی ترقی کے سلسلے میں دوسرا قدم یہ ہو کہ مرکز پر ذمہ دار حکومت ضروری تحفظات کے ساتھ قایم کی جائے۔ (2) مختلف فرقوں کو ایک ایسے راضی نامہ پر آمادہ کرلیا جائے جس میں اقلیتوں کے تحفظات کا خیال رکھا جائے۔ اور ان دونوں کا حل نکال لینا کوئی مشکل امر نہ تھا۔

لیکن بدقسمتی سے تمام تر رکاوٹیں برطانیہ کی جانب سے پیش ہوتی رہیں۔ 1922ء میں مانٹیگو نے، 1923ء میں پیل نے اور 1924ء میں اولیور نے سمجھوتے کے لیے تمام دروازے بند رکھے یہ کہہ کر کہ دستور سازی کے مسئلے کو از سر نو اس وقت تک نہیں اٹھایا جاسکتا تاوقتیکہ دس سال کی قانونی مدت نہ پوری ہوجائے۔ انسانی معاملات میں کسی میکانکی ضابطے پر اس قدر سختی سے عملدر آمد کرنا حماقت کی انتہا تھی۔ 19-1914ء کی جنگ عظیم اتحادی طاقتوں کے سیاسی مدبرین۔ وڈ رو ولسن، ایس کوئتھ، لائڈ جارج کے اعلانات، جنگ میں امداد کے لیے اپیلیں اور ہندوستانی عوام کا فراخ دلی سے اس اپیل پر لبیک کہنا، اقتصادی پریشانیوں کو بغیر کسی شکایت کے برداشت کرنا، خلافت کا مسئلہ اور مسلمانوں کے شکوک اور ان کی مایوسی، جلیان والا باغ میں قتل عام اور عدم تعاون کی تحریک، ان سب باتوں نے ہندوستان میں صورت حال بالکل بدل دی تھی۔ وہ دوستون جن پر برطانوی سلطنت کی عمارت قائم تھی متزلزل ہورہے تھے۔ ہندوستانیوں کا وہ پرانا خوف جو ایک وسعت پذیر انتہائی طاقت ور سلطنت کی طرف سے قایم تھا مرکزی طاقتوں (Central Powers) کی تباہ کن فتوحات کی خبریں سن کر کم ہونا شروع ہوگیا تھا۔ جرمن آبدوز کشتیوں کے ہاتھوں

برطانوی بحری جہازوں کی سخت تباہ کاری اور ممالک متحدہ امریکہ (U.S.A) کی فوجوں اور بے شمار صنعتی سامان رسد کی امداد کے باعث مغربی یورپ کے اتحادیوں کا یقینی شکست سے بچ جانا، یہ دونوں ایسے واقع تھے جن سے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کی نظروں کے سامنے برطانیہ کی پرفریب طاقت کا جو پردہ پڑا ہوا تھا چاک ہوگیا۔ اب برطانیہ کی کمزوریاں سب پر ظاہر ہوگئیں۔ اپنے حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کا جذبہ بھی غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ خودشناسی اور خوداعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا جس سے حصول آزادی ومساوات کی خواہش تیزتر ہورہی تھی۔

لارڈ ریڈنگ جو لبرل پارٹی کا ایک روشن چراغ تھا اور جو اس وقت ہندوستان میں وایسرائے کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا، ایک لبرل سامراجی نقطۂ خیال کا آدمی تھا اور باوجود اس کے اور برطانوی سیاست دانوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی رائے عامہ کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھا۔ اس کو ہندوستان کے لوگوں کی تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کانگریس ووٹ دہندگان پر کتنا اثر رکھتی تھی اس سے وہ اسی وقت واقف ہوسکا جب 1923ء میں انتخابات ہوئے اور جب قانون ساز اسمبلی اور صوبائی کونسلوں میں نیشنلسٹ پارٹی نے اپنی قوت دکھائی تو اس سے وہ پریشان ہوگیا لیکن اس پر بھی اس نے کچھ پروا نہ کی۔ وہ اسی خوش فہمی میں مگن رہا کہ یہ مظاہرہ محض عارضی ہے۔

1924ء سے 1931ء تک قوم پرستوں کے مطالبۂ آزادی میں پیشتر سے بھی زیادہ شدت پیدا ہوگئی تھی۔ بےحس حکومت ہند نے بھی اس بات کو تسلیم کیا جس کی تصدیق اروِن اور ویج وڈ بین کی خط وکتابت سے بخوبی ہوتی ہے۔ دراصل ان سخت گیر افسروں کا جو گورنر جنرل کو گھیرے رہتے تھے یہ وثوق کہ ''سختی سے حکومت کرو تو حماقت کا ڈھیر کہیں نہ ہوسکے گا'' اب متزلزل ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سے حکومت ہند کی

طرف سے جو خطوط برطانیہ بھیجے جاتے تھے ان میں رعایتیں دیے جانے کی سفارش ہونے لگی تھی اور اس بات سے انکار کیا جانے لگا تھا کہ صرف زبردستی اور جبر سے کام بن سکتا ہے۔

لیکن انگلستان میں یہ زمانہ (35-1924ء) بالڈون کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس نے 1924ء میں ''کمزور طبع'' میکڈانلڈ کے بعد کرسی وزارت سنبھالی تھی اور اس کی کابینہ میں آسٹن چیمبرلین، برکن ہیڈ، بالفور اور ونسٹن چرچل جیسے روشن دماغ لیکن کٹر قدامت پسند شامل تھے۔ ان لوگوں کو دفعتاً اقتدار اس لیے حاصل ہو گیا تھا کہ انہوں نے ''زینوویو کے خط'' سے فائدہ اٹھایا جس نے برطانوی ووٹ دہندگان کو لیبر پارٹی کے خلاف کر دیا تھا کیونکہ اس خط کی اشاعت سے یہ سمجھا گیا کہ لیبر پارٹی کمیونسٹ رجحانات کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ لیبر پارٹی کی شکست اور اس کے انتشار کے بعد اور انتخابات میں قدامت پسند لوگوں کی بھاری اکثریت سے پارلیمنٹ اقتدار میں آجانے کے باعث، قدامت پسندوں نے طے کر لیا وہ حکومت ہند کی معروضات کو نظر انداز کر دیں گے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی سیاست دانوں کے مطالبے حد سے زیادہ تھے۔

جون 1929ء سے اگست 1931ء تک مختصر عرصے میں لیبر پارٹی کی حکومت ایک اقلیتی حکومت تھی جو حزب مخالف کے رحم و کرم پر قائم تھی۔

جب ارون منظر پر آئے تو اپنی قدامت پسندانہ جبلت نیز ہندوستان کے بدنما فرقہ وارانہ مناقشات کے تجربے کے باعث وہ اس بات پر اڑے تھے کہ وہ خود اختیاری کے مطالبوں کو رد کر دے گا۔ بہرحال اپنی پارٹی کی بعض مصلحتوں کی بنا پر قانون کمیشن کی تقرری کی تاریخ آگے بڑھا دینا پڑی اور پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے، اور نتائج کا اندازہ لگائے بغیر اس بات پر اصرار کیا کہ کمیشن میں سب برطانوی سفید فام ممبران ہی رکھے

جائیں۔اس سے حالات سے بدتر ہونا شروع ہوگئے۔

ان ناخوشگوار حالات کو رفع دفع کرنے کے لے اس نے 31/اکتوبر 1929ء کو اپنا اعلان شایع کرایا۔لیکن اس کا یہ علاج اس لیے ناکامیاب رہا کہ پارلیمنٹ میں مخالف پارٹیوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ہندوستان میں اس پر ردعمل اسی شدت کے ساتھ ہونا لازمی تھا۔

پہلے تو اروِن اس ردعمل کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کرسکا لیکن جب سول نافرمانی کی تحریک بہت زور پکڑ گئی تو وہ چکرا گیا اور اس کے تمام اندازے کہ یہ تحریک بہت جلد ختم ہوجائیگی غلط ثابت ہوئے۔اب وہ نئے خلفشار سے دوچار تھا۔اس نے اپنی پہلی غلط اسکیم یعنی سائمن کمیشن کی تقرری سے جو نقصانات پہنچائے تھے ان کی درستی کے لیے اس نے ایک ایسی گول میز کانفرنس کا منصوبہ بنایا جس میں برطانوی اور ہندوستانی نمایندے برابر سے شریک ہوں گے اور اس کانفرنس کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ آزادانہ بحث ومباحثے کے بعد متفقہ فیصلوں پر پہنچے اور یہ فیصلے حکومت اور پارلیمنٹ کے لیے رہبری کا کام دیں۔لیکن اب اس مجوزہ کانفرنس کی کشتی بھی ڈوبتی نظر آنے لگی۔

دراصل اب وہ دوطرفہ ناخوشگوار حالات سے دوچار تھا اگر ایک طرف وہ کانفرنس پر اس بات کے لیے زور دیتا ہے کہ کانگریس کی شرکت کے بغیر وہ اپنا کام جاری رکھے گا تو اس پر یہ الزام ہوگا کہ وہ ہیملٹ کا ڈراما بغیر شہزادہ ڈنمارک کے کھیلنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اگر وہ کانگریس کو تعاون پر آمادہ کرلیتا ہے تو پھر اس کو کانگریس کی شرایط ماننا پڑیں گی یعنی گاندھی جی کے آگے ہتھیار ڈال دینے ہوں گے۔

اس نے اس عقیدے کو حل کرنے کی ایک نئی اسکیم سوچی جس کی خاص خاص باتیں یہ تھیں:

(الف) کانفرنس کے کارواں کو ضرور آگے بڑھنا چاہئے کانگریس خواہ کچھ فیصلہ

کیوں نہ کرے۔

(ب) ہندوستان کے نمایندے ایسے منتخب کیے جائیں کہ معلوم ہو کہ تمام ہندوستان کی نمایندگی ہوگئی ہے اور اگر کانگریس کے نمایندے اس میں نہ شریک ہوں تو صرف یہ ظاہر کیا جائے کہ ہندوستان کی بہت سی جماعتوں اور پارٹیوں میں سے صرف ایک غیر حاضر ہے اس لیے اس سے کوئی جرح نہیں۔

(ج) اس عرصے میں کوششیں جاری رہیں گی کہ کانگریس کانفرنس میں شریک ہو جائے۔ نمایندوں کا انتخاب کرتے وقت یہ خیال پیش نظر رکھا گیا جس سے ظاہر ہو کہ کانگریس ایک انتہا پسند پارٹی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی تمام دیگر پارٹیاں اور جماعتیں اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ گورنر جنرل نے درج نے ذیل اقسام کے ممبر کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے منتخب کیے:

(1) وہ سیاست داں جو کل ہند پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہوں، اعتدال پسند ہوں، بائیکاٹ کرنے والوں کے خلاف ہوں اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا حلقہ بگوش بنائے رکھنے کے خواہش مند ہوں۔

(2) فرقہ وارانہ تنظیموں مثلاً مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، سکھ، عیسائی، غیر برہمن اور اچھوتوں کے نمایندے۔

(3) اقتصادی مفادات رکھنے والوں کے نمایندے مثلاً زمیندار اور کارخانوں کے مالک۔

(4) غیر ہندوستانی گروہوں کے نمایندے جن کے مفادات خصوصی تھے مثلاً یورپین، اینگلو انڈین۔

(5) ہندوستان کی اور برمی لیگ کی ریاستوں کے نمایندے

(6) برطانیہ کے وہ مندوبین جو وہاں کی پارلیمنٹ کی تینوں پارٹیوں کی نمایندگی کریں۔

جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا وایسرائے نے سپرو اور جیکار کو اجازت دیدی کہ وہ اس معاملے میں مدد دیں۔ گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے جیل میں ملیں اور جو رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے اسے دور کر کے کوئی راستہ نکالیں۔ ان دونوں صلح جو سفیروں نے گاندھی جی سے یرودا جیل میں ملاقات کی، موتی لال اور جواہر لال سے نینی جیل میں اور پھر دونوں کو ساتھ ساتھ یرودا لے آئے۔ مسز سروجنی نائیڈو اور ولبھ بھائی پٹیل بھی آ گئے۔ گاندھی جی نے ان لوگوں سے کہا کہ کانگریس پارٹی لندن جانے کے لیے تیار نہیں ہے جب تک اس بات کا یقین نہ دلا دیا جائے کہ وہاں مذاکرات مکمل خود اختیاری حکومت (پورن سوراج) کی بنیاد ہوں گے۔ چونکہ حکومت اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوسکی، مصالحت کی یہ کوشش ناکام ہوگئی اور پہلی گول میز کانفرنس کا اجلاس ایک غیر حقیقی فضا میں منعقد ہوا۔

ایک عام اندازہ یہ ہے کہ پہلے قسم کے مندوبین کی تعداد بیس تھی، سولہ مسلمان تھے، تین مہا سبھائی، دو سکھ، ایک عیسائی، چار غیر برہمن، دو ممبر پست اقوام (اچھوتوں) کے، چار زمیندار، چار یوروپین، ایک اینگلو انڈین، ایک ہندوستانی تاجر اور تین برمی لوگ۔ ہندوستانی ریاستوں کی نمایندگی سولہ ممبر کر رہے تھے اور برطانوی مندوبین کی تعداد بھی سولہ تھی۔ آٹھ لیبر پارٹی سے چنے گئے تھے اور قدامت پسند اور لبرل پارٹیوں سے چار چار، کل ممبروں کی تعداد نواسی تھی۔

مسلمان مندوبین کے انتخاب میں ارون کی رہنمائی مجلس عاملہ (اگزیکیٹو کونسل) کے ممبر فضل حسین نے کی، جو ہر ایسے مسلمان کو الگ ہی رکھنا چاہتے تھے، جو کانگریس کی طرف مائل ہو یا جس پر وتیج وڈ بین کے دباؤ سے مشترکہ انتخابات کی تائید کرنے کا شبہ کیا جا سکے۔ فضل حسین کی سوانح عمری میں ان کے بیٹے نے لکھا ہے: ''چنانچہ وہ اپنے تمام اثرات اور ترغیب دینے کی قوت کو کام میں لائے تاکہ مسلمانوں کا ایسا وفد

منتخب کر سکیں جس میں ایسے ممبر ہوں جو نہ صرف ان کے نقطۂ نظر کی تائید کریں بلکہ پر جوش اور پر اثر تائید کریں۔" [1]

کوٹ مین نے (J.Coatman) جو ارون کے صلاح کار تھے، ان مندوبین کے متعلق یوں تحریر کیا:

" یہ بات واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ گول میز کانفرنس میں مندوبین اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ تمام ہندوستان کی طرف سے ہم آہنگ ہو کر آواز اٹھائیں گے۔ اس میں یا تو ہندوستانی ریاستوں کی نمایندگی کرنے والے لوگ تھے یا کسی نہ کسی فرقہ کے مفاد میں بولنے والے لوگ وغیرہ وغیرہ...... مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر مثلاً ہز ہائی نس آغا خان اور مرحوم سر محمد شفیع اپنے فرقے کے تمام جائز مفادات کا تحفظ چاہتے تھے اور یہ اس لیے چاہتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ جب تک کوئی ایسا حل سامنے نہ آئے گا جس کو مسلمان اور دوسری اقلیتیں منصفانہ سمجھتی ہوں اس وقت تک کوئی پائیدار امن قایم نہیں ہو سکتا اور نہ ہندوستان کوئی بڑی سیاسی ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر مندوبین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اپنے خاص مفادات کی نمایندگی کر رہے تھے۔" [2]

کوپ لینڈ نے، جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں نو آبادیاتی تاریخ کا پروفیسر تھا اور جس نے ہندوستان کے دستوری مسئلہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: " اب ہندوستان کے مسئلے کی تمام پیچیدگیاں گویا جاندار ہو کر لندن کے اسٹیج پر لوگوں کی نظروں کے سامنے آگئی تھیں۔ لیکن یہ ساری کی ساری نہ تھیں۔ اس کمپنی میں ایک بڑا خلا تھا۔ ہندوستان کی سیاست میں جو سب سے بڑی اور سب سے

---

1 فضل حسین از عظیم حسین ص 25

2 ایرس آف ڈیسٹنی، انڈیا: 32-1926 ، صفحات 6-305، از جے کوٹ مین

زیادہ پرجوش تنظیم تھی اور جسے ہندوستان کے نوجوان بیحد پسند کرتے تھے اس کی نمائندگی نہ تھی۔ کانگریس کا رویہ اب بھی سختی کے ساتھ مخاصمانہ تھا۔" [1]

2-اقلیت کے متعلق غلط فہمی

یہ رنگ برنگا مجمع لندن میں سینٹ جیمس کے شاہی محل میں اکٹھا کیا گیا تا کہ یہ لوگ ہندوستان کی مستقل تقدیر کی تشکیل کریں اور وہ مندوبین جو خود اپنے حقوق اور رعایات کے لیے نبرد آزما تھے ہندوستان کے تمام فرقوں اور مفاد پرستوں میں سیاسی ہم آہنگی پیدا کرنے کا معجزہ بھی دکھائیں حالانکہ وہ پارٹی جو دراصل ہم آہنگی اور سوراج کے لیے جدوجہد کر رہی تھی نظر انداز کر دی گئی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ گول میز کانفرنس ہندوستان کے اختلافات کی نمایش کرنے کے لیے منعقد کی گئی تھی نہ کہ ہم آہنگی اور اتحاد کو ترقی دینے کے لیے۔ خود فضل حسین شروع شروع میں "گول میز کانفرنس بلائے جانے کے مخالف تھے کیونکہ اس سے ہندوستانیوں میں آپس کے اختلافات یقینی طور پر منظر عام پر آجاتے اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل کیے جانے والا اصل معاملہ پس پشت ڈالا جا سکتا تھا۔" [2] مثلاً یہ کون سی منطق تھی کہ ہندو مہاسبھا، زمینداروں، غیر برہمنوں اور اچھوتوں کو ہندوستان کی عام آبادی سے الگ جماعتیں قرار دیا جائے؟ اگر غیر برہمن اور اچھوت لوگ سماجی اور اقتصادی طور پر پست تھے تو دستوری یا قانونی تحفظات سے ان کی حالت کیونکر بہتر ہو سکتی تھی۔ ان کے حالات تو اسی وقت بہتر ہو سکتے تھے جب برسر اقتدار حکومت خود کوئی ایسی پالیسی اختیار کرے جس سے ان کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ برطانوی

1۔ دی انڈین پرابلم، حصہ اول ص 113، از آر، کوپ لینڈ

2۔ عظیم حسین۔ بحوالہ سابق، ص 230

حکومت نے اپنے ڈیڑھ سوسالہ مدت حکومت میں ملک کی اقتصادی حالت کوترقی دینے کے لیے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس سے ان بے سہارا لوگوں کوکوئی کام مل سکتا اور جس سے ان کی غریبی اور پستی دور ہوسکتی۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی ملک میں اور ارتقا کے کسی مرحلے پر ایسا نہیں ہوا ہے کہ سماج کے تمام طبقوں کا مالی اور سماجی مرتبہ برابر رہا ہو۔خود آج کے بہت زیادہ ترقی پذیر جمہوری ملکوں میں تمام شہریوں کے سیاسی حقوق کا برابر سمجھا جانا ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ممکن ہوسکا ہے اور اقتصادی مساوات کا خواب تو، کیمونسٹ معاشروں کو چھوڑ کر، ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔مثلاً یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سیاہ فام نیگروجن کے ساتھ 1861ء تک غلاموں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور جو قانون کی نظر میں ہندوستان کے اچھوتوں سے بدتر تھے کیا اب 1971ء میں بھی ان کو سماجی اور اقتصادی رتبہ وہی حاصل ہوگیا ہے جو سفید فام لوگوں کا ہے؟

مزید یہ، کہ انگلستان میں شروع انیسویں صدی میں مزدور طبقوں کی کیا حالت تھی؟ اقتصادیات کے مؤرخین مثلاً کول اور ناول نگار مثلاً ڈکنس اس سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں۔لندن، مانچسٹر اور انگلستان کے دوسرے شہروں میں انیسویں صدی کی تیسری چوتھائی میں جب سالویشن آرمی(Salvation Army) کے جنرل بوتھ نے اپنی تحقیقات شروع کی تھی اور ایک صحافی مسٹر بلیچ فورڈ نے مزدور طبقوں کے حالات کو اخبارات میں پیش کیا تھا تو ایسی گندہ غربت اور نکبت سامنے آئی تھی جو ناقابل یقین ہے۔اس سلسلے میں بوتھ کی تصنیف کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر باہری لوگوں کی ان ملکوں پر حکومت ہوتی تو وہ ان سماجی خرابیوں سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور انہیں کو دلیل بنا کر وہ لوگ ان ملکوں کو کبھی اپنے ملکوں پر حکومت خود

کرنے کا اختیار نہ دیتے۔

سماجی خرابیوں کے واقعات کو بڑے اہتمام اور زور وشور سے پیش کرنا تا کہ حکومت خود اختیاری نہ دینے کا ایک بہانہ یا ایک جواز بن سکے قطعی ایک مکاری کی بات تھی۔

یہ صحیح ہے کہ مختلف فرقوں مثلاً مسلمان، سکھ اور عیسائیوں کا یہ مطالبہ جائز تھا کہ ان کو اپنی مذہبی اور ثقافتی آزادی کی طرف سے پورا اطمینان دلایا جاتا لیکن کانگریس، لبرل فیڈریشن حتیٰ کہ ہندومہاسبھا جیسی جماعتیں بھی ایسے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت دینے کی مخالف نہیں تھیں۔ کسی فرقے کی مذہبی اور ثقافتی آزادی کا مطالبہ معرض بحث میں نہ تھا۔ دراصل اقلیتوں کو غیر معمولی سیاسی استحقاق اور مراعات دینے کی بات تھی جس پر اختلاف تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا معاملہ خاص توجہ چاہتا تھا۔ ملک میں ان کی ایک مخصوص پوزیشن تھی۔ مردم شماری کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں ان کی تعداد ایک چوتھائی کے قریب تھی۔ بعض خطوں میں ان کی بہت زیادہ اکثریت تھی۔ مثلاً شمال مغربی سرحدی صوبے، بلوچستان، سندھ اور مغربی پنجاب میں اور کشمیر میں بھی۔ بنگال کے مشرقی حصے میں بھی ان کی بہت بڑی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ انہیں علاقوں میں تھا اور ان کو ملا کر مسلمانوں کے لیے ایک اپنے وطن کی ضرورت پوری ہوسکتی تھی۔

لیکن ہندوستان کے دیگر علاقوں میں وہ اقلیت میں تھے یعنی کسی صوبے میں ان کی آبادی پندرہ فی صدی سے زاید نہ تھی اور 1921ء کی مردم شماری کے مطابق صوبجات متوسط اوراڑیسہ میں تو چار فی صدی سے بھی کم تھی۔

اگر ہندوستان کی اس طرح تقسیم ہوتی کہ ایک تو وہ ہندوستان جس میں ہندوؤں

کی اکثریت تھی اور دوسرا وہ ہندوستان جس میں ان کی اکثریت نہ تھی، کیسے ایک وفاق کے اندر رہ کر ہوتا یا اس کے باہر گویا اس حقیقت کو تسلیم کر لینا ہوتا کہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات دونوں حصوں میں یکساں نہ تھے۔

لیکن بدقسمتی سے نہ تو مسلمانوں نے خود نہ دیگر ہندوستانیوں اور برطانوی لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کا معاملہ دو بالکل الگ حیثیتیں رکھتا ہے ایک تو یہ کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، دوسری وہ مسلم اقلیت جو بقیہ تمام ہندوستان میں منتشر تھی۔ پہلی جگہ جو بات قانونی طور پر جائز اور صحیح قرار دی جا سکتی تھی دوسری جگہ صحیح نہ ہو سکتی تھی۔ پہلی صورت میں قومیت کے دو بنیادی عناصر واضح طور پر موجود تھے۔ یعنی ایک تو متعین خطہ زمین دوسرے ایک با اختیار اور ہم آہنگ سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کی بڑھتی ہوئی آرزو۔ دوسری صورت میں جغرافیائی طور پر کوئی ایک جگہ ایسا خطہ نہ تھا جہاں ان کی اکثریت ہو۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دوسری صورت میں (جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو) مسلمانوں کو چارو ناچار گزر بسر کرنا تھا اور وہ اس ریاست میں سوائے اقلیتی حیثیت کے اور کوئی دوسری حیثیت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے البتہ ان کے مذہب اور کلچر کا تحفظ ضروری تھا اور وہ سیاست وقانون کی نظر میں دوسرے شہریوں کی طرح بلا لحاظ نسل ومسلک وذات برابر تصور کیے جاتے۔

بدقسمتی سے ''اقلیت'' کی اصطلاح کا مفہوم بہت غلط سمجھا گیا۔ آج اس کا اطلاق جماعتوں کی دو مختلف قسم کی قلت تعداد پر ہوتا ہے۔ ایک قسم کی کمی تو مستقل ہوتی ہے مثلاً وہ جو کسی جماعت کے افراد کی نسل، کلچر یا مذہب پر مبنی ہو۔ اس قسم کا اختلاف تاریخ کے معمولی تغیرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ ان اختلافات کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں اور لوگ ان سے بڑے جوش وجذبے کے ساتھ اور مستقلاً وابستہ رہتے ہیں۔

دوسری قسم کی قلت عارضی اور وقتی ہوتی ہے اور لوگوں کی رایوں کی فضا کے اتار

چڑھاؤ کے ساتھ موسم کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ جن ملکوں میں جمہوری قسم کی حکومت ہے وہاں اسی قسم کی سیاسی اقلیتیں پائی جاتی ہیں مثلاً انگلستان میں ہوسکتا ہے کہ اگر آج لیبر پارٹی کی اکثریت ہے تو کل قدامت پسند پارٹی کی اکثریت ہو جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی وقتاً فوقتاً ایک دوسرے پر اکثریت حاصل کرتی رہتی ہیں۔

غیر جمہوری ممالک میں یہ سوال بھی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ جمہوریت کا دور آنے سے پیشتر قومیت کے ارتقا میں ایک مرحلہ وہ بھی تھا جب اقلیتوں کو مستقل طور پر سیاسی طاقت کے حصول سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا مثلاً ان ممالک میں جہاں پروٹسٹنٹ فرقہ اکثریت میں ہوتا رومن کیتھلک فرقے کو سیاست سے دور رکھتا اور اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا تھا یا جس طرح یوروپی ممالک میں یہودیوں کی حیثیت ہے۔ لیکن جمہوریت کا دور آجانے کے بعد سے بلا استثنا نسل، کلچر اور مذہب کے، مساوات سب کے لیے قایم ہوگئی ہے۔

بہرحال، مسلمانوں کے مقدمے میں کچھ جان تھی۔ بیسویں صدی کا ہندوستان سماجی ترقی کے اس مرحلے پر نہیں پہنچ سکا تھا جہاں تک کہ انیسویں صدی کا یورپ پہنچ گیا تھا۔ زیادہ تر لوگ قرون وسطیٰ کی سی زندگی اب تک بسر کررہے تھے۔ لوگوں کی حیثیت سے سماج کا ڈھانچہ تشکیل پاتا تھا اور اسی کے مطابق سماجی کام ہوتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں پیشے اب بھی وراثتی ہوتے تھے۔ پیشوں کی تبدیلی شاذ تھی۔ مزدور طبقہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پسند نہ کرتا تھا۔ اونچی ذات کے لوگ حکومت کی نظر التفات کے طالب رہتے تھے۔ پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان سرکاری ملازمتوں کے گرویدہ رہتے تھے لیکن یہ ملازمتیں باعزت بھی سمجھی جاتی تھیں اور فائدہ مند بھی ہوتی تھیں۔ ان کے حصول کے لیے

سخت مقابلہ ہوتا تھا۔

کاروبار یعنی دولت پیدا کرنے والے اداروں، صنعت، تجارت، بینک وغیرہ کے کاموں میں غیر مسلموں یعنی ہندوؤں اور پارسیوں کی تقریباً اجارہ داری تھی۔ مسلمان ابھی تک عہد گزشتہ کے خواب دیکھ رہے تھے جب اثرات اور فوائد کا حصول بذریعہ ملازمت سرکاری ہوا کرتا تھا اور جب مسلمان حکمراں تھے تو مسلمانوں کو ملازمتیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔

زراعت کے معاملے میں صورت حال مختلف صوبوں میں مختلف قسم کی تھی۔ بنگال میں ہندو زمینداروں کی کثرت تھی۔ مسلمان زیادہ تر یا تو کاشتکار تھے یا اہل حرفہ۔ اتر پردیش میں مسلمان زمینداروں کی تعداد خاصی تھی اور شہروں میں مختلف قسم کے پیشے بھی کرتے تھے۔ دیہات میں مسلمان کاشتکار نسبتاً کم تھے۔ پنجاب میں بھی مسلمان زمینداروں کی کثرت تھی خصوصاً مغربی اضلاع میں لیکن شہروں میں کاروبار زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ زمیندار طبقہ اگرچہ قلیل تعداد میں تھا لیکن طاقت ور تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب صرف سماجی طبقاتی تقسیم ہی پر نہیں، اقتصادی حد بندی اور کاروباری امتیازات پر بھی اثر انداز تھا۔ اس لیے تعجب کی بات نہیں ہے کہ سیاست نے جس کا تعلق اقتصادی معاملات، صنعت و حرفت پیشوں وغیرہ سے ہوتا ہے اور جو کاروباریوں کو مختلف کاموں میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دیتی رہتی ہے مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا۔

حکومت کی معاشی پالیسیاں ایسی ہوتی تھیں جن سے کسی قسم کی سماجی تبدیلی آنے میں طویل مدت لگ جائے کیونکہ حکومت تو قرون وسطیٰ والا طبقاتی سماجی نظام برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

ہندوستان میں جو اس وقت برطانیہ کی مملکت ہائے مشترکہ (Commonwealth)
ے ... نے پر ایک جمہوری ذمہ دار حکومت کی مانگ کر رہا تھا اقلیتوں کے بارے میں
... یہ پیدا ہوئی کہ دو قسم کی اقلیتوں کو گڈمڈ کر دیا گیا اور یہ یقین کر لیا گیا کہ مستقل قسم
ں مذہبی اور ثقافتی اقلیت اور عارضی سیاسی قسم کی اقلیت جو سیاسی اور اقتصادی معاملات
پر رایوں کی تبدیلی کے باعث برابر تغیر پذیر رہتی تھی ایک ہی چیز ہیں۔ یہ امر بھلا دیا گیا
کہ ہندو فرقے یا کسی چھوٹے بڑے فرقے کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ سارے کا سارا
فرقہ کسی اقتصادی یا سیاسی پالیسی پر (مثلاً ٹیکس، محصول، آزاد تجارت کی حفاظت،
زراعت یا صنعتی ترقی، تعلیم، زبان، اجتماعیت، انفرادیت وغیرہ کے لیے ہم رائے
ہو جاتا۔ اسی لیے سارے ہندو یا سارے مسلمان کسی ایک سیاسی پارٹی کے ممبر نہیں
ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی ساری مسلم آبادی کو صرف ایک سیاسی اقلیت سمجھ لینا بڑا غلط تصور تھا
اور اسی غلط تصور کے باعث گول میز کانفرنس ناکامیاب ہوگئی اور پھر اس کے بعد
ناقابل ذکر ہنگامے اور فسادات تاریخ کا جزو بن کر رہ گئے۔ اقلیت کے متعلق یہ غلط فہمی
اب بھی دونوں فرقوں کو پریشان کئے رہتی ہے اور آپس کے تعلقات پر برا اثر ڈالتی
رہتی ہے۔

گول میز کانفرنس کی ناکامیابی مندوبین کے غلط انتخاب اور زیر بحث مسائل میں غلط
فہمیوں کے علاوہ دوسری باتوں کے باعث بھی ہوئی۔ 1929ء سے دنیا عالمی معاشی کساد
بازاری کی وجہ سے جاں کنی میں مبتلا تھی اور اس کا بہت برا اثر ہندوستان کی معاشیات پر
بھی پڑا تھا۔ سماجی تعلقات میں کشیدگی آ گئی تھی اور لوگوں کے مزاج میں تلخی پیدا ہوگئی تھی۔
اس معاشی بحران کا اثر برطانوی سیاست پر بھی پڑا اور جیسے جیسے اس کی شدت بڑھتی گئی
وہاں کے لوگوں کی توجہ ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کی طرف سے ہٹتی گئی یہاں تک

کہ وہاں کی برسراقتدار پارٹی کا جورویہ گول میز کانفرنس کی طرف تھا اس میں تبدیلی آگئی۔

3-وفاق (فیڈریشن) کا عظیم الشان تصور:

12 رنومبر 1930ء کو بادشاہ جارج پنجم نے پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا۔ حاضرین میں برطانوی پارلیمنٹ کے نمائندے، ہندوستانی مندوبین اور والیان ریاست ہائے ہند تھے اور برطانوی Commonwealth کے ہائی کمشنر بطور مشاہدین شریک تھے۔ بادشاہ سلامت نے اپنے خطبے میں کامن ویلتھ کی حکومتوں کے نمائندوں کی موجودگی پر خاص توجہ صرف کی اور ان کی حاضری کو حق بجانب قرار دیا۔ وہ اس احساس کو شدت کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ''آپ کے مذاکرات کے مسئلہ کا تعلق ساری برطانوی سلطنت سے کس قدر زیادہ ہے۔''

خطبے میں دو باتیں خاص طور سے کہی گئی تھیں۔ پہلی یہ تھی: ''کسی قوم کی زندگی میں دس برس کی مدت بہت قلیل ہوتی ہے لیکن اس دس برس میں قومیت کی امنگوں اور اس کے تصورات میں جس تیزی سے ترقی ہوئی ہے اسے وقت کی رواجی پیمائش سے ناپا نہیں جاسکتا۔'' دوسری بات یہ تھی کہ ''اکثریت اور اقلیت میں قبیلوں، ذاتوں اور مختلف عقیدے رکھنے والوں کے، یعنی جن سے مملکت کی تشکیل ہوتی ہے تمام جائز مطالبات توجہ طلب ہیں۔''[1]

پہلی بات سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ کانگریس کی تنظیم جو دراصل ''ہندوستان میں قومیت کی امنگوں اور اس کے تصورات میں تیزی سے ترقی'' لانے کی ذمہ دار تھی اگرچہ اصالتاً کانفرنس میں موجود نہ تھی اس کی روح نے غیر مرئی طور پر کانفرنس میں شریک ہونے والے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر ضرور کیا کیونکہ بادشاہ سلامت کے خطبے کے بعد

1۔ انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس 12 رنومبر 1930 - 19 رجنوری 1931 - کارروائی ص 12-11

تقریباً ہر مقرر نے اس بات پر زور دیا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے تا کہ مضطرب اور بے قرار ہندستان کو سکون مل جائے اور اس طرح پیش بینی کر کے اس آنے والی آفت سے محفوظ رہا جا سکے جس کا خوف سول نافرمانی کی تحریک کے باعث دلوں پر چھایا ہوا تھا۔

ہر شخص نے ان بڑی تبدیلیوں کا حوالہ دیا جو ہندستان میں رونما ہو چکی تھیں۔ محمد علی کے دلچسپ الفاظ میں گویا ہندستان" لمبے جوتے پہن کر ترقی کی راہ پر میلوں آگے نکل چکا تھا۔"

تاہم اس غرض سے کہ تیزی کے ساتھ ترقی کرنے کی وجہ سے جو نتیجہ اخذ کیا جائے گا اس پر روک لگا دی جائے بادشاہ سلامت نے کانفرنس کو یاد دلایا کہ چند ایسی رکاوٹیں ہیں جن کے باعث رفتار ترقی کے باوجود منزل پر پہنچنے کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ کانفرنس کی کارروائی میں یہی دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں جو 17 رنومبر سے 21 رنومبر تک ہوئے ایک عام بحث اس سوال پر ہوئی کہ" ہندوستان کا دستور آئندہ وفاقی (Federal) ہو یا وحدانی (Unitary)۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب سے مقدم اور بنیادی سوال تھا کیونکہ اسی کے حل پر سارے دستوری مسئلے پر بحث کا انحصار تھا۔

تیج بہادر سپرو نے 17 رنومبر کو بحث کا آغاز کیا اور اپنی غیر معمولی تقریر سے ایک سنسنی پھیلا دی اور جس نے کانفرنس کی ساری فضا بدل دی۔ انہوں نے ایک ہندوستانی وفاق کا تصور پیش کیا جس میں ہندوستانی ریاستیں بھی شامل ہونگی اور وہ صوبے بھی جو برطانوی حکومت کے زیر انتظام تھے جنہیں پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے ہندوستانی دستور کے اندر جلد ہی شامل کیا جا سکتا تھا۔" یہ وسیع اور عظیم تصور" (ریڈنگ) جس کی طرف سائمن کمیشن نے صرف اشارہ ہی کیا تھا اور جس کو حکومت ہند نے مستقبل کا ایک امکانی دور بتایا تھا دفعتاً ایک فوری اقدام کی صورت میں سامنے آ گیا کہ اس پر دستور کی بنیاد قائم کی جا سکتی تھی۔ ایک متحدہ اور واحد ہندوستان کے

تصور نے کانفرنس والوں کو دم بخود کر دیا۔

سپرو نے والیان ریاست سے جذبہ وطن پرستی کا واسطہ دے کر اپیل کی کہ وہ اس وقت ہمت کا مظاہرہ کریں اور وفاق میں شامل ہونا منظور کرلیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے مندوبین اور خاص کر سرکاری نمایندوں پر انہوں نے واضح کیا کہ وفاق لازمی طور پر ایک ذمہ دار حکومت ہوگی اور (ظاہر ہے) کہ والیان ریاست جن کو اندرون ریاست خود مختاری حاصل ہے اور اپنی اپنی ریاستوں کے وہ ذمہ دار ہیں کسی ایسے سیاسی نظام کے جزو بن کر نہیں رہ سکتے جس کی کوئی ذمہ داری نہ ہو۔

والیان ریاست کی طرف سے مہاراجہ بیکانیر نے وفاق اور خود اختیاری حکومت کی تجاویز پر رضامندی ظاہر کی۔ دیگر والیان ریاست نے بھی اپنی منظوری دیدی۔ نواب بھوپال نے اختیارات کی منتقلی کے مطالبے کی تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ ”ہم ایک خود مختار اور وفاقی برطانوی ہندوستان کے ساتھ ہی وفاق میں شامل ہو سکتے ہیں۔“

مسلمانوں کا نقطہ نظر جناح اور شفیع نے پیش کیا دونوں نے وفاق کو خوش آمدید کہا لیکن جناح نے ایک پخ بھی لگا دی۔ ان کے الفاظ یہ تھے: ”جب تک اقلیتوں میں ان کے تحفظ کا ایسا احساس نہیں پیدا کر دیتے جس کے تحت وہ بہ رضا و رغبت حکومت کے وفادار اور مددگار بن سکیں اس وقت تک آپ کسی قسم کا دستور بنائیں کامیاب نہ رہے گا۔“ [1]

پہلی گول میز کانفرنس نے اس بات کو نہایت واضح کر دیا کہ تمام ہندوستانی بلا استثنائے ذات پات، پارٹی، فرقہ یا مفاد کے اس مطالبے کے لیے ہم زبان تھے کہ ایک ایسے ہندوستانی کابینہ کو اختیارات منتقل کر دیے جائیں جو ایک منتخب شدہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہو۔ بہت سے لوگ اس پر بھی راضی تھے کہ عبوری دور کے لیے چند تحفظات کا قائم رکھنا اور چند اختیارات کو محفوظ

1۔ بحوالہ گزشتہ ص 139

رکھنا ضروری ہے۔

برطانوی مندوبین میں سے قدامت پسند پارٹی کے ایک ممبر پیل نے سائمن کمیشن کی سفارشات کو انقلابی قرار دیا اور کہا کہ مرکزی حکومت کے اختیارات ہندوستانیوں کو سونپ دینا ابھی قبل از وقت بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ لبرل پارٹی کے ممبر ریڈنگ کو اس بات سے دکھ ہوا کیونکہ ایک یہودی ہونے کے باعث اس کا مشرقی مزاج بھڑک اٹھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس خیال کا حامی رہا کہ ہندوستان کو مملکتی درجہ دیدینا صحیح عملی سیاست نہ ہوگی کیونکہ قانونی کمیشن اور حکومت ہند دونوں نے اس بات پر اختلاف رائے ظاہر کیا ہے اس کے علاوہ دیگر مشکلات بھی ہیں جو لاینحل ہیں۔ میکڈانلڈ نے اپنی تقریر میں جلسے کی کارروائی کا مختصر طور پر جائزہ لیا۔ ان عملی مسائل کو پیش کیا جن سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ ایک اچھا دستور کیا ہونا چاہئے اس کی جانچ کے طریقے بتائے لیکن جو تنقیحیں زیر بحث تھیں ان کے متعلق اس نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

4-اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی

اس ابتدائی اجلاس کے بعد مختلف کمیٹیوں کی نشستیں ہوئیں۔ یہ کمیٹیاں آزمائشی طور پر مجوزہ وفاقِ ہند کے مختلف پہلوؤں پر بحث ومباحثہ کرنے کے لیے بنادی گئی تھیں۔ ان میں سے وہ کمیٹی جس کا تعلق وفاق (فیڈریشن) کی تشکیل اور اس کے طریق عمل سے تھا، اس نظام حکومت کی بہت سی بنیادی باتوں پر متفق الرائے ہوگئی اور تفصیلات پر آئندہ غور کرنا طے کیا۔ اس نئی ریاست کے جسم کا ڈھانچہ تقریباً اس کے لیے بالکل تیار ہوگیا کہ اس میں جان ڈال دی جائے اور وہ خود اپنے قدم آگے بڑھانے کے قابل ہوجائے۔ لیکن بدقسمتی سے اس جاں بخش معاملے پر وفاق کمیٹی

ناکام ہوگئی کیونکہ یہ اکثریت اور اقلیت کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا نہ کرسکی۔ مسلمانوں کے نمائندوں آغا خاں، جناح، شفیع اور فضل الحق اور سکھ فرقے کے سردار اجل سنگھ نے بار بار متنبہ کیا کہ جب تک کسی دستور میں اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ نہ ہوگا اور ان میں اپنی سلامتی کا احساس پیدا نہ کرایا گیا ہوگا وہ دستور انہیں منظور نہ ہوگا۔ ہندوستان کی تمام سیاست کا مستقبل اسی بنیادی سوال کے حل پر موقوف تھا یا موقوف معلوم ہوتا تھا۔ کانفرنس کے پیش نظر ایک متحد ہندوستان کا جو اعلیٰ تصور تھا صرف اسی وقت کوئی واقعی شکل اختیار کرسکتا تھا جب ہندوستان کے مختلف فرقے برضا ورغبت وفاق کے لیے رضامند ہو جائیں۔

محمد علی نے جو پہلے 22-1920ء میں عدم تعاون کے زمانے میں گاندھی جی کے ساتھی اور پیرو تھے اور 1928ء میں مسلمانوں کے حقوق کے پرجوش حامی بننے کے لیے کانگریس سے علاحدہ ہو گئے تھے، ہندو مسلم اختلافات کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی:

> "آج کل ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف ایک ہی جھگڑا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ہندوؤں کے غلبہ سے خوف زدہ ہیں اور ہندو میرے خیال میں مسلمانوں کے غلبہ سے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس خوف سے چھٹکارا مل جائے۔"

وہ زور دے کر کہا کرتے تھے "جہاں خدا کی حکومت ہے وہاں میں مسلمان پہلے ہوں، مسلمان دوسرے نمبر پر بھی اور مسلمان آخری نمبر پر بھی، یعنی سوائے مسلمان کے اور کچھ نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھ سے اپنی مملکت میں یا اپنی قوم میں اس عقیدے، اس معاشرت، اس کلچر اور اس اخلاق کو جس کا نام اسلام ہے چھوڑ کر آنے کو کہیں گے تو میں نہیں آؤنگا۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ہندوستان کی آزادی کا یا ہندوستان کی بھلائی کا تعلق ہے میں

ہندوستانی پہلے، ہندوستانی دوسرے نمبر پر بھی اور ہندوستانی آخری نمبر پر بھی ہوں یعنی سوائے ہندوستانی کے اور کچھ نہیں ہوں۔ میں دو دائروں سے وابستہ ہوں جن کے سائز تو برابر کے ہیں لیکن جن کے مراکز ایک نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک دائرہ ہندوستان ہے اور دوسرا دائرہ اسلامی دنیا کا ہے۔'' 1

کانفرنس میں مسلمان مندوبین کا جس قسم کا رویہ رہا اس کی ذمہ داری زیادہ تر فضل حسین کے سر ہے۔ لندن میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر سیتل واد نے اس طرح کیا ہے:

'' ہم لوگ گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ سے بہت پہلے لندن پہنچ گئے تو یہ طے ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے چند نمائندے آپس میں ملیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مسئلے پر غور وخوض کر لیں۔ سپرو، شاستری، میں، جیکار، مونجے اور امبیڈکر اس میٹنگ کے لیے متعین کیے گئے اور آغا خاں، جناح اور ایک اور صاحب نے مسلمانوں کی نمایندگی کی۔ یہ ملاقاتیں ہز ہائی نس نواب بھوپال کے مکان پر ہوئیں۔ کئی دنوں تک ہر رات کو یہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اعلیٰ حضرت نواب بھوپال سے اس میں بہت مدد ملی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ جب ہم پہلے پہل ملے تو میں نے آغا خاں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ '' اگر ہم دیگر معاملات میں ایک اطمینان کے سمجھوتے پر پہنچ سکے تو کیا وہ مشترکہ انتخابات کو منظور کر لیں گے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ '' اگر آپ کو ہم کو تمام دیگر معاملات میں مطمئن کر دیں گے تو ہم مشترکہ انتخابات کے لیے تیار ہو جائیں گے بشرطیکہ آپ مسلمانوں کے لیے نشستیں محفوظ کر دیں گے۔'' میں نے دوسرا سوال کیا: '' اگر ہم تمام دیگر امور پر بشمول مشترکہ انتخابات

1۔ یادگاریں اور یادداشتیں (Recollections and Reflections) از چمن لال سیتل واد (1946) ص 95-96

راضی ہو گئے تو کیا مسلمان مندوبین کانفرنس میں قومی مطالبے کی تائید کریں گے؟" اس کا جواب خاص انداز میں انہوں نے یہ کہہ کر دیا کہ" اس صورت میں آپ رہ نمائی کریں اور ہم اس کی پیروی کریں گے۔"

"تب ہم نے ان سے پوچھا کہ ان کے مطالبات کیا ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہمارے خاص مطالبے یہ ہیں کہ سندھ اور شمال مشرقی سرحدی صوبہ علاحدہ علاحدہ صوبے بنا دیے جائیں۔ دوسرا مطالبہ یہ کہ صوبائی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کو معقول نمایندگی دی جائے۔ تیسرا یہ کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں کل نشستوں میں سے ایک تہائی مسلمانوں کو ملنا چاہئیں۔ اس وقت یہ خیال کہ ایک فیڈریشن ہو اور جس میں تمام صوبے اپنے نمائندے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بھیجیں، سامنے نہیں آیا تھا۔ بہر حال سپرو، شاستری اور میں تو ان مطالبوں کو فوراً مان لیتے اور مشترکہ انتخاب کو حاصل کر لیتے لیکن جیکار اور مونجے نے جو رویہ اختیار کیا اس سے ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ ہم نے سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ بنانے کے سوال کو پہلے لیا۔ جیکار اور مونجے نے چند مختلف قسم کی شرایط پیش کیں کہ یہ جب پوری کر دی جائیں تب سندھ کے صوبے کو علاحدہ صوبہ بنایا جا سکے گا۔ ہماری کئی شام کی ملاقاتیں اسی ایک سندھ کے سوال کی نذر ہو گئیں۔

"دیگر معاملات پر مذاکروں نے کئی راتیں لے لیں۔ اس درمیان میں مسلمان نمائندوں میں وہ رجعت پسند عناصر جو لندن میں تھے اور وہ رجعت پسند مسلمان جو ہندوستان میں تھے اس بات کی بھنک پا گئے تھے کہ ہماری ملاقاتوں میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ ان مسلمان نمائندوں پر جن کے ساتھ ہماری چھوٹی کانفرنس ہو رہی تھی دباؤ ڈالنے لگے۔ آخر کار ایک رات کو آغا خاں نے کہا کہ اب معاملہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمان نمایندوں کو کسی ایسے راضی نامہ کا پابند نہیں

بنا سکتے جس کو وہ خود پسند کرتے ہوں۔''

اس طرح ایک بڑا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر سپرو، شاستری اور میں نے اتنا کرلیا ہوتا کہ آغا خاں کے مطالبات فوراً منظور کر لیتے تو ہم مشترکہ انتخاب کے مسئلے پر ان کے اور دیگر مسلمانوں کے دستخط حاصل کر سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اس کے بعد ہندوستان کی سیاسی تاریخ ہی دوسرے نہج کی ہوتی۔'' 1

جب فضل حسین کو یہ خبر ملی کہ بعض مسلمان نمایندے ایسی شرطیں سوچ رہے ہیں جن کے تحت مشترکہ انتخاب مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو سکے تو انہوں نے سختی کے ساتھ ان کی سرزنش کی اور درشتی کے ساتھ پوچھا'' ترک قوم اپنے پاشاؤں کے باعث بار بار تباہ ہوتی رہی۔ کیا ہندوستان کی مسلم قوم بھی گول میز کانفرنس میں آئے ہوئے اپنے مسلم نمایندوں کے ہاتھوں تباہ ہونے جا رہی ہے؟'' 2

ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ'' اگر جداگانہ انتخابات کالعدم کر دیے گئے، اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے تحفظات نہ رکھے گئے اور پنجاب و بنگال میں ذراسی اکثریت بھی مسلمانوں کو نہ دی گئی تو میں بہت سے مسلمانوں کے ساتھ مجبور ہوں گا کہ ہندوستان کی سیاسی تعمیر نو میں کانگریس کے ساتھ مل کر قسمت آزمائی کی جائے بجائے اس کے کہ مجوزہ اصلاح کردہ دستور کے تحت ہم رفتہ رفتہ فنا ہو جانے کو منظور کر لیں'' 3

جب ایک طرف ایسا سخت رویہ ہو اور دوسری اتنی ہی مضبوطی کے ساتھ یہ عقیدہ کہ ہندستان میں ثقافتی، سماجی اور قومی یک جہتی موجود ہے تو اس بات پر تعجب نہ ہونا

---

1. ایضاً ص 59-358
2. عظیم حسین (بحوالہ گزشتہ ص 256 خط بنام ڈاکٹر شفاعت احمد خاں
3. ایضاً

چاہئے کہ عقل جذبات کے آگے بے بس ہوگئی اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا راضی نامہ نہ ہونے کے باعث دیگر اہم مسئلے بھی بغیر کسی باضابطہ منظوری کے صرف ریکارڈ کر لیے گئے۔

5-مسلمان پیش رفت کو روکتے ہیں

گول میز کانفرنس کے خاتمے پر برطانیہ کے وزیراعظم ریمزے میکڈ انلڈ نے تقریر کی۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق انہوں نے یہ واضح کردیا کہ برطانوی سرکار کا رویہ اس معاملے میں اور کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کی بڑی خواہش ہے کہ چونکہ یہ آپ لوگوں کا معاملہ ہے اس لیے اس کو طے کرنا آپ ہی لوگوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اقلیتوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے وضاحت کی کہ ''ہم دستور میں اس کا لحاظ رکھ سکتے ہیں کہ آپ ایک معذوری سے محفوظ رہیں، دوسری معذوری سے محفوظ رہیں لیکن ان معاملات میں جو تھوڑا بہت تجربہ مجھے ہوا ہے اس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انجام کار اس کا انحصار آپ لوگوں کی ذہانت پر ہے، آپ لوگوں کی تنظیم پر ہے، آپ لوگوں کی قوت ارادی کی مضبوطی پر ہے اور آپ لوگوں کے رہنماؤں کی اس بات میں کامیابی پر ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل بھی ہو اور وہ جو اعلانات کرتے ہیں ان کی توثیق ہو جائے۔'' [1]

لیکن اس نے ان کو تحفظات کے بارے میں یقین دلایا ''اگر آپ اپنے تحفظات خود حاصل نہیں کر سکتے یا ان تحفظات کے بارے میں آپ سب لوگوں میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو پاتا تو سرکار کو دستور میں ایسی دفعات رکھنا پڑیں گی جن سے آپ کی مدد ہو سکے۔'' [2]

نیا دستور کس قسم کا ہوگا اس کے متعلق اس نے سرکاری فیصلے کا اعلان ان لفظوں

1۔ انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس: کارروائیاں ص 77-476، منعقدہ 11 نومبر

2۔ ایضاً۔ 79-478

میں کیا:

''ملک معظم کی حکومت کا خیال یہ ہے کہ حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے سپرد کردی جائے چند ایسی شرایط کے ساتھ جو اس عبوری دور میں بعض ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اور بعض خاص مشکلات کو حل کرنے کے لیے ضروری ہوں اور اس میں ایسی ضمانتیں بھی شامل کی جائیں گی جو اقلیتیں اپنی سیاسی آزادی اور حقوق کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھیں۔'' 1

اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ'' حکومت نے اس بات کو نوٹ کرلیا ہے اور کانفرنس میں غور وخوض اسی بنیاد پر ہوا ہے اور جس کو تمام پارٹیوں نے مان بھی لیا ہے کہ ہندوستان میں مرکزی حکومت ایک وفاق (فیڈریشن) کی صورت میں ہو جس میں ہندوستانی ریاستیں اور برطانوی ہندوستان دونوں ایک دوہری مجلس قانون ساز میں شامل ہوں''۔ 2 اس کے ذہن میں یہ تھا کہ مرکز میں ایک قسم کی دوعملی حکومت ہو اور صوبوں کو پوری ذمہ داری حاصل ہو۔

ہندوستانی مندوبین جب ہندوستان سے اپنے سفر پر چلے تھے اس وقت ہندوستان میں کانفرنس کی مخالفت میں مظاہرے ہو رہے تھے۔ یہ لوگ مستقبل کے بارے میں مشتبہ تھے۔ اپنی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا اور برطانیہ کے ارادوں کی طرف سے بھی غیر مطمئن تھے۔ ان کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں بغیر کسی تصفیہ کے نہ لوٹنا پڑے۔ خوش قسمتی سے کانفرنس کے ابتدائی جلسوں سے ان کے موڈ میں تبدیلی آ گئی۔ آسمان کھلتا نظر آیا اور وہ پرامید ہو گئے تھے۔ لیکن کانفرنس کے خاتمے کے قریب جو جلسے ہوئے ان میں ان کے اعتماد کو سخت صدمہ پہنچا اور امید مایوسی سے بدل گئی، شکوک اور شبہات پھر ان کے ذہنوں

1۔ انڈین راونڈ ٹیبل کانفرنس کی کارروائیاں ص 77-476 منعقدہ 15 نومبر 1930ء

2۔ ایضاً ص 482

پر چھاگئے کیونکہ اقلیتوں کا مسئلہ حل ہوئے بغیر [illegible] یا تھا۔ یہ سمجھنے کے لیے کانفرنس کی ابتدائی کارروائیوں اور اس کی کمیٹیوں میں جیسا کچھ ظاہر کیا گیا وہ کیوں ہوا، ضروری ہے کہ جو اثرات پس منظر میں کام کر رہے تھے ان کا جائزہ لیا جائے۔

برطانوی حکمراں طبقے میں دو مختلف قسم کے خیالات کے لوگ تھے۔ وتج وڈ بین نے اروِن کو لکھ کر بتایا تھا: ''میرے خیال میں اس امر کے متعلق کہ ہم مسلمانوں سے کس قسم کے تعلقات رکھیں دو واضح نظریے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ان کو مراعات دی جائیں تاکہ ہم ان کو اپنی طرف رکھ سکیں اور وہ ہماری سلطنت کی امداد کرتے رہیں۔''[1]

دوسرا مکتب خیال مشکل اور خطرناک راستہ اختیار کرنے میں یقین رکھتا ہے یعنی یہ کہ ''کوشش کی جائے اور اس کے لیے ہر قسم کی مدد دی جائے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصفیہ ہو جائے۔''[2]

بعد کی مراسلت میں بین نے یہ بھی اضافہ کیا کہ ''ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اقلیتوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس فرض اور سرپرستی سے کسی طریقے پر ایسا غلط فایدہ نہ اٹھایا جانا چاہیے جس سے اکثریت کے مفادات کو نقصان پہنچ جائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اقلیتوں سے کہہ دیں کہ ہم جاتے ہیں۔ آپ لوگ طاقت ور اکثریت والے فرقے سے جتنے بہتر ہو سکے اپنے شرایط طے کرلیں۔ دوسری طرف ہمارا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ ہم یہاں برقرار رہیں اور اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم رکھیں اور کسی ایک یا کئی اقلیتوں کی امداد کے سہارے قایم رہیں۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ ہم اقلیت سے جو حمایت ملتی ہے اس کی قدر و قیمت کو ہم مانتے ہیں لیکن ہم اپنے کو اس قسم کی تحریص کا

---

1. اروِن پیپرس۔ خطوط از طرف سکریٹری آف اسٹیٹ، جلد پنجم، 29 مئی 1940ء

2. ایضاً۔

شکار نہ ہونے دیں گے کہ ہم اقلیتوں کو مجبور کر کے یا انہیں کسی قسم کی رشوت دے کر ان کی حمایت حاصل کریں اور اس طرح اکثریت کو ان چیزوں سے محروم کر دیں جو انہیں ملنا چاہئیں۔" 1

دوسرا مکتب خیال جس میں بین اور ارون شامل تھے اپنی شیرینی زبان اور لطیف دلائل کے باوجود پہلے مکتب خیال سے ہار گیا۔ اس کے علم بردار تھے ونسٹن چرچل، لائڈ جارج، سیمول ہور اور ٹوری پارٹی کے سخت ممبران جیسے چیمبر لین جس کے متعلق بین کی رائے یہ تھی کہ "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے قطعی قاصر رہے کہ ہندوستان میں اس وقت صورت حال کیا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی پالیسی اختیار کرنا چاہئے۔" 2

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اقلیتوں کی کمیٹی میں جس نے ہندو مسلم تصفیہ کے مسئلے پر غور و خوض کیا تھا برطانوی ہند کے وہ تمام مسلمان نمائندے، بہ استثنائے دو ممبران جناح اور غلام حسین ہدایت اللہ شامل تھے جو کانفرنس میں آئے تھے۔ یہ سب فرقہ پرست لیڈر تھے۔ کمیٹی میں ہندوستان کی ہندو اکثریت کی نمائندے بھی، اگر اچھوت طبقے کے دو ممبران خارج کر دیے جائیں، برابر کی تعداد میں تھے۔ جناح نے چونکہ 1927ء میں مشترکہ انتخابات کی وکالت کی تھی اس لیے ان کو قابل اعتبار نہ سمجھا گیا۔

ہندو مہا سبھا کی نمایندگی دو ممبران کر رہے تھے۔ مونجے اور راجہ نریندر ناتھ۔ برطانیہ کی تینوں پارٹیوں کے دو دو ممبران نمایندگی کر رہے تھے۔ کمیٹی کی اس قسم کی تشکیل نیک شگون کی حامل نہ سمجھی جا سکتی تھی۔ اس پر بھی اگر غور کیا جائے کہ بعض طاقتور

---

1 خط از طرف ویج وڈ بین بنام وایسرائے: 20/جون 1930ء

2 ایضاً۔ 4/جولائی 1930ء

عناصر باہر سے اپنا دباؤ ڈال رہے تھے تو کانفرنس کی ناکامیابی پر تعجب نہ کرنا چاہئے۔

یہ آسانی سے سوچا جا سکتا ہے کہ یہ عناصر کون تھے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے بہت سے نوجوان طلبہ نے جو اس وقت وہاں موجود تھے اور محمد اقبال نے جنھوں نے الہ آباد میں دسمبر 1930ء میں مسلم لیگ کی صدارت کی تھی ایک مسلم ریاست کی اسکیمیں پیش کیں جو بعد میں ایک باقاعدہ پاکستان کے تصور کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔

اس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ نے وایسرائے کے نام جو خطوط لکھے وہ بدلتے ہوئے حالات کا گویا اشاریہ ہیں۔ ابتدائی خطوط میں تو مسرت بھرے استعجاب کا اظہار ہے کہ عظیم ہندوستان کے لیے آزادی کا منصوبہ ابھر رہا ہے جس کو صوبوں میں پوری خود مختاری حاصل ہوگی اور مرکز کو چند تحفظات کے ساتھ اختیارات تفویض کر دیے جائیں گے۔ 20 رنومبر کو اس نے لکھا: ''گول میز کانفرنس میں معاملات خلاف امید تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔'' 24 رنومبر کو کانفرنس کے تاثرات اس نے اس طرح تحریر کیے: ''پریس (اخبار آبزرور کے کاروِن اور اخبار ٹائمس کے ڈاسن نے ہمدردی دکھائی۔ پیِل بہت متاثر تھے اور ریڈنگ بہت پر جوش اور پرامید۔ ہندوستانی لبرل پارٹی کے لوگ تجویز کے موافق تھے۔ مسلمان لوگ بھی تائید کر رہے تھے اور ہندوستان کے والیان ریاست نے بھی فیصلوں کی پشت پناہی کی۔'' لیکن یہ اسب اطمینان بغیر کسی ممکنہ خطرے اور بے اطمینانی کے احساس کے نہ تھا کیونکہ دودھ میں مکھی پڑ گئی تھی۔

29 رنومبر کو بین نے ان دقتوں کی ایک فہرست پیش کی جو کانفرنس کو درپیش تھے۔ ان میں بعض کا تعلق برطانوی لوگوں سے تھا اور بعض کا والیان ریاست سے۔ لیکن خاص اقلیت کا مسئلہ تھا خصوصاً ہندو مسلم اختلاف کا۔ اس کے متعلق اس نے کہا ''یہ تو صاف ظاہر ہے کہ معاملہ یہیں پر آکر رک گیا ہے'' لیکن اس کو امید تھی کہ خیر سگالی

ضائع نہ جائے گی۔ ونسٹن چرچل اور لائڈ چند دنوں میں شہر میں ایک تقریر کریں گے اور کہا جاتا ہے کہ ''چبھتی ہوئی پر جوش''[1] تقریریں کریں گے۔

15/دسمبر کو مطلع تاریک ہوگیا۔ بین نے لکھا: ''اقلیتوں کا سوال حل نہ ہوسکا اور اس کے حل ہونے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ وہ یہ بہانہ پیش کررہے ہیں کہ حکومت ان پر دباؤ ڈال رہی ہے، یہ بالکل غلط ہے۔ وہ ہندو جن کی نمایندگی مونجے کررہے ہیں سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سپرو اور جناح پر یاس طاری ہے''[2]

مسلمانوں کے رویے کے متعلق اس نے یہ تشریح کی کہ ''حقیقتاً مسلمان سب سے ملتے رہے ہیں۔ مخالف پارٹیوں سے خود ملاقات کرتے رہے اور ان سے استدعا کرتے رہے کہ انہیں (مسلمانوں کو) چھوڑ نہ دیا جائے''[3]

بین کی تجویز یہ تھی: ''اب میں خود یہی سوچنے پر آمادہ ہوگیا ہوں کہ ہم کو اعلان کردینا چاہیے (حکومت کے ارادوں کا) جو کسی مذہبی تصفیہ سے الگ ہو اور جیسا کہ لوتھیان نے مجھ سے کہا تھا اور جیسا کہ میں خود آپ کو مطلع کرچکا ہوں کہ ہم اب اس قسم کا اعلان کرسکتے ہیں اور یہ اعلان ان سوالوں کا مثبت جواب بھی ہوگا جو پچھلے سال نومبر میں گاندھی نے آپ سے پوچھے تھے۔''[4]

ایڈورڈ ٹامپسن نے جو ایک تماشائی کی حیثیت سے کانفرنس کی کارروائیوں میں دلچسپی لے رہے تھے لکھا تھا:

''گول میز کانفرنس میں انتہا پسند مسلمانوں کا بعض غیر جمہوری برطانوی سیاسی

---

1. بحوالہ گزشتہ: 29/نومبر 1930ء

2. بحوالہ گزشتہ 15/دسمبر 1930ء

3. // // //

4. // // //

حلقوں سے ایک قسم کی مفاہمت اور اتحاد واضح طور پر عیاں تھا۔''[1]

مسلمان مندوبین کا کندھا دینے کا رویہ فضل حسین کی ڈائری کے اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے:

''گول میز کانفرنس سے خبر ملی ہے کہ لیبر حکومت نے مسلمانوں کو ایک قسم کے مشترکہ انتخاب پر رضامند کرنے کوششیں کی ہیں۔ شفیع، نواب بھوپال، سلطان احمد، فضل حق، ہدایت اللہ تو اس کھیل کے لیے تیار تھے۔ لیکن دوسرے لوگ اسکے مخالف تھے۔ محمد علی بھی اس کی حمایت کر رہے تھے اور بلاشبہ جناح بھی، اگرچہ وہ پس پشت رہے۔ مجھ کو سخت کارروائی کرنا پڑی تب جا کے حالت سدھری۔ ہم کو مرکز اور چھ صوبوں میں اپنی انتخابی تعداد برقرار رکھنا چاہئے اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ بھی اور جداگانہ انتخاب ہی کے ذریعے بنگال اور پنجاب میں اپنی اکثریت کو قایم رکھنا چاہئے۔ ہندو اگر عدم تعاون کرتے ہیں تو کریں ہمیں آئندہ دس سال کے اندر کافی طاقت پیدا کر لینی ہے چاہئے'' [2]

انہوں نے پھر لکھا'' گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ میں اپنی تمام زندگی کے کارنامے کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔'' [3] انہوں نے مسلمان مندوبین کو فہمائش کی کہ '' آپ سے ترقی کے نام پر ملک میں ذمہ دار حکومت اور مملکتی درجے کے حصول کی جو چلتی ہوئی باتیں کہی جاتی ہیں ان پر آپ ہاں کہہ دیتے ہیں تا کہ آپ کا انگریزی عوامی

---

[1] ای ٹامپسن: این لسٹ انڈیا فار فریڈم ص 50

[2] فضل حسین۔ ڈائری 3 دسمبر 1930ء بحوالہ عظیم حسین: بحوالہ گزشتہ نوٹ نمبر 3۔ ص 254

[3] ایضاً: 21 دسمبر 1930ء بحوالہ سابقہ ص 255

پریس میں وقار بڑھے اور خود آپ اپنے کو پروقار سمجھنے لگیں اور اپنی حب الوطنی پر غیر متعصب قرار دیے جانے پر اور لیبر سرکار کے ساتھ مروت دکھانے پر شہرت حاصل کرلیں"۔ 1

انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ "مسلمان جو سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی اعتبارات سے ملک میں کمزور ہیں آخر یہ کیوں دکھلانا چاہتے ہیں کہ برطانوی اقتدار کو ہندوستان سے برطرف کر کے اور ذمہ داری حاصل کر کے وہ اس قدر فوائد حاصل کریں گے کہ ان کی خاطر وہ اپنے فرقہ وارانہ مفادات کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں؟" 2

اس تہدید کا اثر خاطر خواہ ہوا اور مسلمان اصرار کرنے لگے کہ ان کے مطالبات پہلے تسلیم کر لیے جائیں اس کے بعد وہ صوبوں کے دستور اور وفاقی مرکز کے متعلق اپنی منظوری دیں گے۔ اس خیال سے شاید ہندو مسلم سمجھوتہ ہو جائے صرف رجعت پسند مسلمان ہی خوف زدہ نہیں تھے بلکہ ہندوستان کا دفتر شاہی کا طبقہ (بیوروکریسی) بھی خائف تھا اور برطانیہ کی قدامت پسند پارٹی بھی۔

پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر سکریٹری آف اسٹیٹ کا سوچا سمجھا اعلان وزیر اعظم نے پیش کیا۔ اس اعلانیہ میں ملک معظم کی حکومت کا وہ تصور پیش کیا گیا جو اصلاح کردہ حکومت کی ساخت اور اس کے اختیارات کی بات تھا۔ لیکن اس میں اس بات کو واضح نہیں کیا گیا کہ ان تصورات کو عملی جامہ کیونکر پہنایا جا سکے گا اگر ہندو اور مسلمان باہمی طور پر کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے۔ اس میں اس بات کا بھی کوئی وعدہ نہ تھا کہ اکثریت کے حقوق اقلیت کے حق استرداد کے باعث پامال نہ ہوں گے جیسی کہ وجے ووڈ بین کی خواہش تھی۔

---

1. بحوالہ سابق ص 255 - خط بنام ڈاکٹر شفاعت احمد خاں

2. بحوالہ سابق ص 255 - خط بنام ڈاکٹر شفاعت احمد خاں ص 56-255

ہندوستان کے لبرل مندوبین میں سے بعض لوگ اب بھی اس خوش فہمی میں تھے کہ اصل مقصد حاصل ہوگیا ہے۔ برطانیہ سرکار نے ایک ذمہ دار وفاقی حکومت جلد از جلد بنانے کا وعدہ کرلیا ہے اور صرف ایک رکاوٹ جو باقی ہے یعنی فرقہ وارانہ مصالحت کا معاملہ، وہ بھی حل ہو جائے گا۔ لیکن دوسرے لوگ مستقبل کے متعلق اس خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے۔

ان لوگوں میں مسلمان مندوبین تھے۔ ایک مسلم مؤرخ کا خیال ہے کہ "مسلمان پہلی کانفرنس سے یہ تاثر لے کر گئے کہ برطانوی حکومت مسلمانوں کے خدشات دور کرنے کے مقابلے میں ہندوؤں کی خواہشات پوری کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور اس نے مسلمانوں کی خواہشات کا نیز ان کی اس قوت کا کہ ان کی خواہشات مؤثر ہوسکتی ہیں، بہت کم لحاظ کیا۔ خصوصاً 19 / جنوری 1931ء کو کانفرنس کے آخری اجلاس میں ریمزے میکڈانلڈ نے جو تقریر کی اس سے مسلمان بہت برگشتہ خاطر ہوئے تھے کیونکہ اس فرقے کے متعلق اس نے نہایت بے تکے پن سے اپنی تقریر میں حقارت کا لہجہ اختیار کیا تھا۔" 1

یہ ناراضی یا برگشتہ خاطری اس لیے پیدا ہوگئی تھی کہ وزیراعظم نے مسلمانوں کے تحفظات کے مسئلے پر اس قسم کا اظہار خیال تھا کہ "یہ تحفظات کا مسئلہ ایسا ہے کہ بہتر یہ ہوگا کہ اسے ہندو اور مسلمان خود ہی آپس میں طے کرلیں"۔ مطلب یہ تھا کہ اس کو کوئی تیسری پارٹی یعنی برطانیہ حکومت طے نہ کرے گی۔

گول میز کانفرنس میں ایک وفاقی حکومت (فیڈریشن) کا جو منصوبہ پیش ہوا تھا اقبال اس کی مذمت پہلی کر چکے تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے: "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں کی شمولیت کا مقصد کسی ایسے فیڈریشن کے منصوبے میں جس

---

1 کے۔ کے۔ عزیز: دی میکنگ آف پاکستان۔ ص 44

میں مسلمان راجاؤں کی تعداد برائے نام ہوگی دوہرا ہوگا۔ بظاہر ہندو ہندستان اور برطانوی سامراج کے مابین یہ اسکیم ایک قسم کا سمجھوتا معلوم ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ کو ہندوستان میں قایم رکھو اور اس کے بدلے میں، میں تم کو ہندوؤں کی چند نفری حکومت دے دوں گا تا کہ تم یہاں کے دیگر فرقوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے زیر نگیں رکھ سکو۔" [1]

کانفرنس کا اختتام ہونے سے پہلے مسلمان مندوبین نے ایک بیان دیا: "ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے فرقے کی پوزیشن اس کی مخصوص ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور اس بات کا بھی لحاظ رکھتے ہوئے کہ نئے دستور پر آسانی سے عملدرآمد ہو سکے ہمارے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے مطالبے کو مکرر پیش کر دیں کہ صوبوں یا مرکزی حکومت میں جب تک ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مناسب تحفظات نہ رکھے جائیں گے کوئی پیش رفت ممکن نہ ہو سکے گی، نہ قابل عمل اور جب تک ایسے تحفظات نہ ہوں گے کوئی دستور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔" [2]

ہندوستان کے دفتر شاہی طبقے والے بھی خوش نہ تھے۔ ہیلی نے بحیثیت ایک صلاح کار کے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس نے وایسرائے کو لکھا "دراصل ایک لحاظ سے یہ کانفرنس کانفرنس ہی نہ تھی۔ مجھے اس تعلق پر جو برطانیہ کو ہندوستان سے ہے فخر رہا ہے اس لیے میری رائے میں کچھ جانب داری ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ ان تمام واقعات کا جو کانفرنس میں ہوئے اگر جائزہ لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی حکومت پر مسلسل اور مستقل طور پر یک طرفہ حملہ کرنے کا ایک افسوس ناک

---

1. محمد علی جناح از ایم۔ ایچ سید، ص 481

2. دی انڈین پرابلم (انگریزی) از آر کوپ لینڈ۔ حصہ اول ص 121

تماشا تھا۔ جب واقعات بالکل الٹے پیش کیے جائیں تو ان کا جواب دینے کا فرض کسی کے ذمے نہیں رہتا۔ گیدڑوں کو ڈھیل دے دی گئی ہے کہ وہ مسلسل چیختے رہیں اور ان کی نگرانی کرنے والا کتا ایک مرتبہ بھی ان پر نہ بھونکے۔" 1

6- کانگریس کا جواب

اُدھر لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہو رہی تھی ادھر سول نافرمانی کا جوابی حملہ زوروں پر تھا جس نے گورنمنٹ کے چھکے چھڑا دیے۔ پہلے تو اس کا مذاق اڑایا گیا، آواز کسے گئے کیونکہ یقین یہ تھا کہ یہ تحریک جلد ہی ختم ہو جائے گی اور معقول اور سنجیدہ سیاست داں ملک کو جلد ہی یہ باور کرا دیں گے کہ ترک موالات اور ٹیکس نہ ادا کرنے کی یہ تحریک بیکار محض ہے۔ لیکن جب تحریک زور پکڑ گئی تو گورنمنٹ کی امیدیں اور اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ اس تحریک کو کچل دینے کے لیے سختی پر اتر آئی۔ جور اور جبر کے تمام ذرایع اختیار کیے جانے لگے مثلاً تعزیری ٹیکس، پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں برسانا، سزا کے طور پر کوڑے لگانا، اجتماعی جرمانے کرنا، کانگریسی اداروں کو خلاف قانون قرار دینا، لیڈروں کی گرفتاری، پریس اور جائدادوں کا ضبط کیا جانا، جلسوں اور جلوسوں پر پابندی وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہر صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہندوؤں نے بڑی کثرت سے اس میں حصہ لیا اور ہزاروں ہندوؤں سے جیلیں بھر گئیں۔ بہت سے مسلمانوں نے بھی گاندھی جی کی پیروی کی مثلاً عباس طیب جی، ابوالکلام آزاد، انصاری، سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی، رفیع احمد قدوائی اور خان عبدالغفار خاں جنھوں نے خدائی خدمت گار کے نام سے رضا کاروں کا ایک دستہ تیار کر لیا تھا۔ ان کی

---

1 ہیلی فیکس۔ اول آف برکن ہیڈ۔ ص 93-292

للکار پر شمال مغربی صوبے کی مسلم اکثریت اور بہت سے پٹھان قبیلے گورنمنٹ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کی۔ بہت سی دیگر مسلم تنظیموں، مثلاً جمعیت العلماء، احرار الاسلام، قوم پرست مسلم پارٹی نے بھی بڑی قربانیاں دیں۔

شہروں اور دیہات کے لوگوں، مزدروں اور کسانوں نے بھی بڑے جوش وخروش سے اس میں حصہ لیا۔ بہت سے دولت مندوں اور صاحب جائداد لوگوں نے بھی امداد کی۔ یہاں تک کہ سرکاری افسران بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور گورنمنٹ کو انہیں تنبیہہ کرنا پڑی کہ اگر انہوں نے اس تحریک سے ہمدردی دکھائی تو اس کے نتائج خطرناک ہوں گے۔

ہندوستانی عورتوں نے بھی اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ناخواندہ عورتیں، پردہ نشین عورتیں، جوان اور بوڑھیاں سب بڑی کثرت سے گورنمنٹ کے ظلم وجور کا مقابلہ کرنے کے لیے باہر نکل آئیں۔ یہ دراصل ایک ایسی جنگ تھی جس میں ایک فریق تو ظلم برداشت کرنے پر تلا ہوا تھا اور دوسرا فریق بہیمانہ طاقت کے ساتھ اس تحریک کو کچل دینا چاہتا تھا۔ گاندھی جی کے احکامات کہ 'عدم تشدد اختیار کیے رہو، سختی برداشت کرو اور بدلہ نہ لو' بڑی حد تک تو مانے گئے لیکن جب گورنمنٹ نے بہت بیدردی سے کام لینا شروع کیا تو ضبط کرنا محال ہو گیا خصوصاً اس وقت جب کہ تمام لیڈر جیل میں ڈال دیے گئے تھے۔

بنگال میں دہشت پسندوں نے بھی سر اٹھایا۔ انہوں نے اپنی پرانی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا یعنی اسلحہ جمع کرنا، سرکاری خزانوں کو لوٹنا اور باغیانہ حرکات کا آغاز۔ انہوں نے چٹاگانگ میں پولیس اور ریلوے والنیٹرس کے اسلحہ خانوں پر حملہ کر دیا۔ دوسری طرف خاں عبدالغفار گرفتار کیے گئے تو پیشاور میں گولی چل گئی، شاہی گڑھوال

رائفلس کے فوجی دستے نے بغاوت کردی اوران باغیوں نے دس دن تک شہر پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔

اس تحریک کے افسر اعلیٰ گاندھی جی کو جیل میں ڈال کر میدان سے ہٹا دینے کے باوجود اس تحریک کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بائیکاٹ جاری رہا اور سرکاری مظالم بھی۔ لاہور، کلکتہ اور بمبئی میں ہنگاموں اور انتشار کا عالم تھا۔ شولا پور اور بمبئی میں تو مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ سرحدی صوبے میں باقاعدہ فوج بھیجی گئی اور ہوائی فوج بھی کام میں لائی گئی۔

اقتصادی بدحالی نے سیاسی آگ کو بھڑکانے میں مٹی کے تیل کا کام کیا۔ فیکٹریوں میں ہڑتالیں ہوئیں اور اتر پردیش کے دیہات میں لگان ادا نہ کرنے کی تحریک چل پڑی۔ گجرات میں بھی ٹیکس نہ دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ گورنمنٹ نے لگان کی وصولی کے لیے جبر وتعدی کے طریقے استعمال کیے۔ ہزاروں ایکڑ زمین ضبط کر لی گئی۔ ہزاروں گاؤں کے سرکاری افسران برطرف کر دیے گئے۔ صوبہ متوسط کے قدیمی باشندوں نے جنگل کے قوانین کی خلاف ورزیاں کیں اور کرناٹک اور کنارا کے کاشتکاروں نے قربانیاں دینے، مصائب اور تکالیف اٹھانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوششیں کیں۔

انگلستان کے اخبار مانچسٹر گارجین میں بریلس فورڈ نے اپنی درج ذیل رپورٹ شایع کرائی:

”ذمہ دار ہندوستانی لیڈروں نے پولیس کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں وہ اتنے زیادہ ہیں اور اتنے بڑے علاقوں پر محیط ہیں کہ ان کی تفتیش اور جانچ کرنا محال ہے۔ پولیس نے جس بیدردی سے ممنوعہ جلسوں کو درہم برہم کیا اس کی شکایتیں ہر جگہ سننے کو ملیں۔ میں نے اس قسم کے حالات ایک انگریز عینی شاہد اور کئی ہندوستانی

ڈاکٹروں سے سنے جنہوں نے زخمیوں کی دیکھ بھال کی تھی۔ میں نے پولیس افسروں سے بھی تفتیش کی۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ان تمام معاملات میں غلطی ان اعلیٰ افسروں کی ہے جنہوں نے جلسوں کو ممنوع قرار دیا تھا۔"

اس تحریک میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان کے متعلق اس نے لکھا: "پولیس کے لاٹھی چارج کا سامنا کرنا ایک عزت کی بات سمجھی جانے لگی تھی اور ہزاروں رضا کار سرفروشی کے جذبے سے سرشار مار کھانے کے لیے باہر نکل آتے تھے اور بڑے ضبط و نظم کے ساتھ اپنی ہمت اور اپنے تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے یورپین حضرات سے سنا ہے کہ کس طرح تندمند کانسٹبلوں نے کمزور اور پرامن لڑکوں اور جوانوں کو بری طرح مارا۔ ان کے بیانات سن کر دلی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے ایسے مناظر دیکھ کر جو تبصرے کیے ان کو میں یہاں نہ دہراؤں گا۔"[1]

اس نے بمبئی، کلکتہ، لاہور، کنٹے (بنگال) میرٹھ، گجرات کے دیہات (بردولی اور کھیرا کے اضلاع) میں پولیس کے مظالم کی تمام مثالیں پیش کر کے نتیجہ یہ نکالا کہ "ملک کی عام آبادی میں ایک ہیجانی کیفیت ہے اور اس ہیجان میں ایک وجد کی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے ان میں کچھ غصہ بھی پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہمارے خلوص نیت پر شک کرنے لگے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے لیڈروں سے پرجوش عقیدت رکھتے ہیں.......... جب تک کہ گاندھی جیل میں ہیں مجھے امید نہیں ہے کہ ان کی مخصوص جماعت اس تحریک کو ختم کر دے گی یا اپنی مدافعت میں نرمی کرے گی۔"[2]

اصلیت یہ ہے کہ اس تحریک نے بڑی کامیابی یہ حاصل کی تھی کہ اپنے حصول

1۔ دی ہسٹری آف کانگریس از سیتارمیا۔ جلد اول (مانچسٹر گارجین مورخہ 14 رجنوری سے اقتباسات) ص 91-627

2۔ ایضاً

مقصد کے لیے لوگوں کی اخلاقی جرأت کو بھی بہت بلند کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ کی سیاسی ساکھ کو بھی بہت کچھ ختم کر دیا۔ برطانوی اقتصادی مفادات کو سخت نقصان پہنچا وہ اس طرح کہ ہندوستان میں برطانیہ کے درآمدات بہت کم ہو گئے خصوصاً کپڑوں اور سوت کی کمی تو 31 سے 45 فی صد تک ہو گئی۔

7- گاندھی۔ اروِن معاہدہ

1930ء کے اختتام تک برطانیہ والوں کو یہ احساس پوری طرح ہو گیا کہ کانگریس کو جس کا اثر نہایت وسیع ہو گیا تھا راضی کیے بغیر کوئی مصالحت محال ہے۔ ٹائمس اخبار کے نامہ نگار نے متنبہ کر دیا تھا کہ ''اگر کبھی ہندوستانی وفد میں گاندھی، نہرو، مالویہ یا پٹیل نہ ہوں گے تو وہ وفد ہندوستان کا نمائندہ نہیں سمجھا جا سکتا۔''

وجوڈ بین نے پہلے ہی وایسرائے سے اپنا یہ ایما ظاہر کیا تھا کہ گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں لایا جائے۔ جب سپرو نے اپنی الوداعی تقریر میں وزیر اعظم برطانیہ سے یہ درخواست کی کہ قیدیوں سے نرمی برتی جائے اور انہیں چھوڑ دیا جائے تو دراصل وزیر اعظم کے دل ہی کی بات کہہ رہے تھے۔ میکڈانلڈ نے فوراً اس پر اپنا مثبت ردعمل ظاہر کیا اور وعدہ کیا اگر کانگریس اپنے قدم پیچھے ہٹا لے اور تحریک ترک کر دے تو گورنمنٹ اس کا جواب بڑی نرمی اور فیاضی کے ساتھ دے گی۔

17 رجنوری 1921ء کو وایسرائے نے ہندوستانی قانون ساز اسمبلی میں سمجھوتے کے لیے زمین تیار کرنے کی خاطر ایک بہت نرم اور لبھانے والی تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''گاندھی کو کوئی خواہ کتنا ہی غلطی پر کیوں نہ سمجھے یا ان کے نام سے جو پالیسی وابستہ ہے اس کے نتائج کتنے ہی افسوس ناک کیوں نہ معلوم ہوں لیکن کوئی شخص یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گاندھی میں ایک روحانی قوت ہے جو ان کو مجبور کرتی ہے یہ ماننے کے

لیے کہ اس مقصد کی خاطر جس پر ان کا ایمان ہے یا اس ہندوستان کی خاطر جو انہیں عزیز ہے، چاہے جتنی قربانیاں دی جائیں کم ہیں۔" [1]

اس نے دریافت کیا کہ اب جب کہ سول نافرمانی کے باعث ہندوستان میں اور گول میز کانفرنس کے باعث انگلستان میں نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں کیا کانگریس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ [2]

اس اپیل کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد 26/جنوری 1931ء کو گاندھی جی اور کانگریس کی مجلس عاملہ کے تمام ممبر یکجا ہو گئے۔ گاندھی جی جب یروَدا جیل سے نکل کر بمبئی آئے تو انہوں نے ایک جلسے میں مجمع سے یوں خطاب کیا: "میں امن کا شدت سے متمنی ہوں بشرطیکہ وہ عزت کے ساتھ حاصل ہو سکے۔" [3] اس کے بعد انہوں نے اپنے مطالبات کو دہرایا جن کو منظور کیے بغیر صلح ممکن نہ تھی یعنی آزادی کا مسئلہ اور ان گیارہ نکتوں کی منظوری جو انہوں نے نمک ستیہ گرہ شروع کرنے سے پہلے وایسرائے کو لکھ بھیجے تھے۔

کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ الہ آباد میں پہلی فروری کو ہوا اور اس میں صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ گول میز کانفرنس کے متعلق اس میں یہ رائے قایم کی گئی کہ اس سے کوئی ایسا مقصد حاصل نہیں ہوا جس کے باعث تحریک کو روک دیا جائے لیکن اس تحریک کی جدوجہد کے سلسلے میں کوئی نیا منصوبہ بھی پیش نہیں کیا گیا۔ جو قرارداد اس میں منظور کی گئی اسے شایع نہیں کیا گیا۔ کانفرنس میں گئے ہوئے نمائندوں کی واپسی کا انتظار کیا گیا۔

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1931، جلد اول، ص 127

2۔ ایضاً

3۔ مہاتما از تندولکر۔ جلد سوم (1969 طبع دوم) ص 50

کانفرنس میں جو سب سے اہم فیصلہ کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ سارے ہندوستان کا ایک وفاق بنا دیا جائے جس میں ہندوستانی ہندوستان اور برطانوی ہندوستان شامل ہوں لیکن ان دونوں کی حد بندی کیسے ہوگی، یہ بات مبہم رہی۔ مزید براں مجوزہ وفاق کا دستور اور اس کے دائرہ کار کیا ہوں گے اس کے سلسلے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ طے نہیں ہوئی تھی۔ دوسری اتنی ہی اہم یہ بات تھی کہ مرکز کے اختیارات کو کس طرح منتقل کیا جائے۔ میکڈانلڈ نے اس کی تشکیل کی جو تجویز رکھی تھی اس سے کانگریسی لیڈر مطمئن نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کے خیال میں کانگریسی مطالبے کی اس سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ جواہر لال نہرو کی یہ رائے تھی کہ ''گول میز کانفرنس کے فیصلے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔''[1] اس میں شک نہیں کہ اس رائے میں کچھ انتہا پسندی کا جذبہ شامل ہے۔

گول میز کانفرنس کے وہ ممبر جن کا انتظار کیا جا رہا تھا یعنی سپرو، جیکار اور شاستری، 8/فروری کو الہ آباد پہنچے اور گاندھی جی نیز مجلس عاملہ کے دیگر ممبران سے 14/فروری تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اگرچہ انہوں نے کوئی بات نہیں بتائی لیکن ان کے ایما پر گاندھی جی وایسرائے سے ملاقات کرنے پر تیار ہو گئے۔ بقول جواہر لال: ''وہ اس ملاقات کے لیے تیار ہو گئے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن اصولاً وہ (گاندھی جی) اپنے معمول کے خلاف اپنے مخالفین سے ہر مسئلہ پر تبادلہ خیال کے لیے تیار رہتے تھے۔ چونکہ ان کو اپنے موقف کا حق پر ہونے کا یقین کامل تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اپنے مخالف کو قائل کر سکیں گے۔ لیکن شاید ذہنی طور پر قائل کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ مخالف میں نفسیاتی طور پر تغیر پیدا ہو جائے، مغائرت سر راہ نہ رہے، غصہ اور نفرت حائل نہ رہے بلکہ مخالف کی خیر اندیشی اور ہمدردی حاصل ہو جائے۔ وہ جانتے

---

1. سوانح عمری از جواہر لال نہرو، 1953، ص 249

تھے کہ اگر اس طرح کا تغیر پیدا ہو جائے تو قائل معقول کرنا بہت آسان ہو جائے گا اور اگر حریف قائل نہ ہوا تو بھی اس کی مخالفت نرم پڑ جائیگی اور جھگڑوں میں سے (نفرت کا) ڈنک دور ہو جائے گا۔" [1]

ان خیالات کے پیش نظر گاندھی جی نے وایسرائے سے ملاقات کی درخواست کی۔ وایسرائے نے فوراً سکریٹری آف اسٹیٹ کو مطلع کر دیا کہ اس نے گاندھی جی سے ملاقات کرنا طے کر لیا ہے۔ اس نے یہ بھی انہیں بتایا کہ اس ملاقات میں اس کی پالیسی یہ ہوگی کہ گاندھی جی میں " اپنی طاقت اور شخصیت کا جو ناز بیجا ہے وہ اسے مطمئن کر کے انہیں ہموار کرنے کی کوشش کرے گا۔ شاستری نے اسے بتا دیا تھا کہ " گاندھی جی ایک عورت کی طرح ہیں اس لیے قبل اس کے آپ ان سے ملاقات کریں اچھی طرح اپنے کو پاک وصاف بنائیے، دعائیں پڑھیے اور روحانیت کے اپنے خوب دبیز لبادے اوڑھ لیجیے۔" [2]

گاندھی جی نے شاستری سے کہا تھا " میں چاہتا ہوں کہ میں مفتوح کر دیا جاؤں۔" چنانچہ وہ اروِن سے 17/فروری کو ملے اور اس سے ان کی گفتگو وقفے وقفے سے 5/مارچ 1931ء تک چلتی رہی۔ اروِن اس عجیب وغریب ملاقاتی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ملک معظم سے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی: " مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سامنے ایک بہت طاقت ور شخصیت ہے اور یہ ان کی ناخوشگوار جسمانی ہیئت سے بالکل الگ چیز ہے۔ چھوٹا جھریاں پڑا دبلا قد، سامنے کے دانت ندارد۔ ان کی شخصیت دینوی نمائشی چیزوں سے بہت کم آراستہ ہے لیکن ان کی چھوٹی گہری آنکھوں کے پیچھے کردار کی جو قوت ہے اور بے حد چست اور تیز ذہانت ہے وہ متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔" [1]

---

1. ایضاً
2. ہیلی فیکس از آرل آف برکن ہیڈ۔ ص 296

4/ مارچ کی رات کو معاہدہ تیار کیا گیا اور دوسرے دن اس پر دستخط ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ:

1- جہاں تک دستوری معاملات کا تعلق ہے وفاقی حیثیت کو بنیاد مان لیا گیا اور ضروری تحفظات کے لیے ہندوستانیوں کی ذمہ داری کو۔

2- کانگریس کو (گول میز) کانفرنس مباحثے میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا جائیگا۔

3- سول نافرمانی کی تحریک ختم کردی جائے گی یعنی قانون کی نافرمانی، لگان اور دوسرے سرکاری محصولوں کا ادا نہ کرنا، سول نافرمانی کی تائید میں چھوٹے خبر نامے شایع کرنا، سرکاری اور فوجی افسران اور دیہات کے اہل کاروں کو گورنمنٹ کے خلاف بھڑکانا ختم کردیا جائے گا۔

4- برطانوی سامان کے بائیکاٹ کا جہاں تک تعلق ہے ہندوستانی صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کرنے کی تو اجازت ہوگی لیکن بائیکاٹ کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے گا۔

5- مقررہ قانونی حدوں کے باہر بدیسی کپڑے اور شراب نوشی کے خلاف بائیکاٹ کرنے کے لیے پکٹنگ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

6- گاندھی جی کی یہ تجویز کہ پولیس کے مظالم کی جانچ کی جائے مناسب نہیں سمجھی گئی۔

7- سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں جو فرمان جاری کیے گئے تھے واپس لے لیے جائیں گے۔

8- مختلف انجمنوں کو غیر قانونی قرار دیے جانے کی بابت جو اعلانات کیے گئے تھے واپس لیے جائیں گے۔

9- جن ملزموں نے تشدد اختیار نہیں کیا تھا ان سب کے خلاف قائم شدہ مقدمات اٹھالیے جائیں گے۔

10- وہ قیدی جنہوں نے تشدد سے کام نہیں لیا رہا کر دیے جائیں گے۔

11- جرمانے معاف کر دیے جائیں گے۔

12- وہ منقولہ جائدادیں جو اس تحریک کے سلسلے میں ضبط کر لی گئی ہیں اگر گورنمنٹ کے قبضے میں ہیں یا جرمانے کے طور پر لی گئی ہیں یا لگان کی عدم ادائی کے باعث ضبط کر لی گئی ہیں سب واپس کر دی جائیں گی۔

13- غیر منقولہ جائداد واپس کر دی جائے گی لیکن اگر ایسی جائداد کسی کے ہاتھ فروخت کر دی گئی ہے تو ایسی فروخت مکمل سمجھی جائے گی۔

14- جن سرکاری افسروں نے استعفیٰ دے دیا ہے ان کے معاملات پر دوبارہ غور کیا جائے گا لیکن اگر ایسی جگہیں مستقل طور پر ختم کر دی گئی ہیں تو ان پر پہلے کے مستعفی افسران نہ رکھے جائیں گے۔

15- اگر کانگریس نے اس عہد نامہ کے شرائط پر پوری طرح عمل نہ کیا تو گورنمنٹ جو اقدام ضروری سمجھے گی ان پر عمل کرے گی۔

یہ سمجھوتا ہو جانے کے بعد گاندھی جی نے پریس کو بیان دیتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ اس میں کانگریس کی فتح ہوئی ہے بلکہ یہ کہا کہ اگر یہ فتح ہے تو گورنمنٹ اور عوام الناس دونوں کی فتح ہے۔ انہوں نے عوام الناس کی نہایت بہادری کے ساتھ جدوجہد کرنے نیز اس جہد وجہد میں سخت ایذائیں برداشت کرنے کی تعریف کی اور مشورہ دیا کہ آنے والے دنوں میں وہ نگرانی کرتے رہیں، دعائیں مانگتے رہیں اور امیدیں لگاتے رہیں۔ انہوں نے متنبہ بھی کیا کہ "تکلیفیں اٹھانے کی ایک متعین حد بھی ہوتی ہے۔ تکلیفیں اٹھانا ایک عقل مندی کا کام بھی ہو سکتا ہے اور بے عقلی کا بھی اور جب تکلیفیں اٹھانا حد تک پہنچ

جاتا ہے تو اسے جاری رکھنا عقلمندی کا نہیں بلکہ نہایت بے عقلی کا کام ہوگا'' [1]

گاندھی اردن معاہدہ کو کانگریس کی رضامندی حاصل کرنا تھی قبل اس کے اس پر پوری طرح عمل درآمد کیا جاسکتا۔ اس لیے کانگریس کا جلسہ 29/ مارچ 1931ء کو کراچی میں طلب کیا گیا۔ ولبھ بھائی پٹیل نے صدارت کی۔ مجمع میں بڑا جوش تھا اور خوشی کی لہر دوڑی ہوئی تھی لیکن کانپور میں ہندو مسلم فساد کے موقع پر گنیش شنکر ودیارتھی کی شہادت کی خبر سے غم واندوہ اور لاہور میں 1928ء میں سانڈرس کے قتل کے الزام میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دیے جانے کی خبر سے غم وغصہ کے جذبات بھی ابھر آئے۔

گاندھی اردن معاہدہ کی توثیق کے لیے جواہر لال نہرو نے قرارداد پیش کی۔ اس میں کانگریسی کی مکمل آزادی (پورن سوراج) کا مطالبہ دہرایا گیا اور معاہدہ کی یہ شق بھی کہ دونوں پارٹیوں کو یہ حق ہے کہ ان میں سے کوئی بھی پارٹی جب چاہے یہ سمجھوتہ ختم کردے۔ لیکن اس قرارداد نے کانگریس کو بھی پابند کردیا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہو۔ کانگریس نے اپنے مندوبین کو اجازت دیدی کہ ہندوستان کے مفاد کی خاطر اس سلسلے میں جو ضروری باتیں، کانگریس تجویز کرے انہیں منظور کرلیں۔ اسی قرارداد میں گاندھی جی کو کانگریس کا واحد نمایندہ منظور کرلیا گیا۔

گاندھی جی نے مباحثے کو سمیٹتے ہوئے واضح کیا کہ ستیہ گرہی (حق اور عدم تشدد کا گرویدہ) ہونے کے باعث وہ برطانوی وزیراعظم اور وایسرائے کے کانفرنس میں شریک ہونے کے دعوت نامے کو رد نہ کرسکے اگرچہ ''کبھی کبھی میرے دل میں آتا ہے کہ اس کانفرنس میں آخر ہونا کیا ہے اور اس سے کیا فائدہ ہوگا'' [2] انہوں نے یہ بھی کہا

1۔ بحوالہ گزشتہ از پٹابھی سیتارمیا۔ جلد اول ص 748

2۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1931ء جلد اول ص 73-272ء

کہ" کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے کانگریس کے وفد کا جانا بیکار ہوگا اگر ہم فرقہ وارانہ مسئلے کو صحیح طور پر حل نہیں کر سکتے۔" [1]

جواہر لال کی قرارداد تقریباً متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ اس طرح کراچی میں کانگریس نے اپنا فیصلہ اپنے سیاسی مطالبہ کے متعلق بھی دے دیا اور اس امر پر بھی کہ اس کی نمایندگی تنہا گاندھی جی کریں گے۔ گاندھی جی کو بہرحال ان ذمہ داریوں کی سخت مشکلات کا احساس تھا جو ان پر ڈالی گئیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک برطانوی اخبار کے نامہ نگار سے کہا کہ" میرا انگلستان آنا چند حالات پر منحصر ہے۔ اول تو یہ کہ معاہدے پر قابل اطمینان عملدرآمد ہو۔ دوسرے یہ کہ فرقہ واریت کا مسئلہ حل ہو جائے۔" [2]

یہ معاہدہ دراصل اعلیٰ ذہنیت رکھنے والی شخصیتوں کے درمیان ہوا تھا جن کے مزاج میں مصالحت پسندی تھی اور جو امن وصلح کے خواہش مند تھے۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کے پیروکار اور مقلدین کہاں تک اس فیصلے پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے یہ ظاہر تھا کہ دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بڑے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

بہت سے حلقوں میں کراچی میں ہونے والی کانگریس میں گاندھی ارون معاہدے کی توثیق کے فیصلے کو اور اس بات پر رضامندی کو کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی جائے، شک اور بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھا گیا۔

جواہر لال افسردہ تھے چنانچہ انہوں نے لکھا" اس مارچ کی رات کو میں لیٹا سوچتا رہا۔ میرے دل میں ایک بڑا خلا تھا جیسے کوئی بڑی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور جو اب واپس نہیں مل سکتی۔

---

1. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1931ء جلد اول ص 272-73

2. بحوالہ گزشتہ از ڈی۔ جی۔ تندولکر۔ جلد سوم۔ ص 123

دنیا اسی طرح ختم ہو جاتی ہے" ایک دھما کے ساتھ نہیں بلکہ ریں ریں کر کے"۔[1]

کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل کا خیال تھا کہ کانفرنس سے حاصل کچھ نہ ہو گا لیکن "لندن جانے سے گاندھی جی کا کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا بلکہ ان کو موقع مل سکے گا کہ وہ دشمن کو خود اس کے گھر میں جا کر للکار سکیں گے۔"[2]

دوسری طرف ہندوستان میں جو برطانوی افسران تھے انہوں نے ارون کے اس سلوک سے جو گاندھی جی کے ساتھ کیا گیا تھا بیزاری کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "ہندوستان میں برطانوی حکومت کے سب سے اعلیٰ افسر اور ملک معظم کے نمائندہ نے ایک رد کردہ جماعت کے مشہور لیڈر سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اس بات نے ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل کے تحت مخالفین میں ایک فتح مندی کا مغالطہ اور ساتھ ہی مدافعت کا ایک حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔"[3]

قبل اس کے کہ گاندھی جی (کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے) روانہ ہوں اپریل 1931ء میں ارون کے بجائے ولنگڈن وائسرائے ہو گئے اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا منصب اگست 1931ء میں سیموئیل ہور کو اس قومی حکومت میں دیا گیا جو لیبر پارٹی کی وزارت کے خاتمے پر انگلستان میں بن گئی تھی۔ ولنگڈن ایک لبرل (آزاد خیال) حاکم تھا جس کو ہندوستان اور کناڈا میں حکومت کرنے کا طویل عرصے کا تجربہ تھا۔ دوسری طرف سیموئیل ہور ایک قدامت پسند سامراجی تھا اور جسے یقین نہیں تھا کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ بہر حال ان دونوں کے اتصال نے سرکاری پالیسی کا وہ رنگ ڈھنگ بدل دیا جواب

1۔ خود نوشت سوانح عمری (انگریزی) از جواہر لال نہرو (1953 اڈیشن) ص 259

2۔ سردار پٹیل ڈی۔ وی۔ تھمنکر۔ ص 13

3۔ لارڈ ولنگڈن ان انڈیا۔ از وکٹر ٹرنچ۔ ص 185

تک بین اور اارون اختیار کیے ہوئے تھے۔

گاندھی جی کو بلانے کے لیے پہلے جو کوشش کی گئی تھی، نئے وائسرائے نے اسے ناپسند کیا۔ انہوں نے ہور کو لکھا'' میں اور میری سرکار کو اس بات سے سخت تکلیف ہے کہ آپ کے پیش رو (وتج وڈ بین) کی بڑی خواہش تھی کہ چاہے جو کچھ ہاتھ سے چلا جائے لیکن مسٹر گاندھی کو کسی طرح لندن بلا لیا جائے۔''[1]

معاہدے کے سلسلے میں انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ یقیناً اس معاہدے نے اس ملک کے باشندوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ خود وائسرائے سے شرایط طے کرنے میں گاندھی نے بطور ایک مختار عام کے کام کیا ہے اور اس طرح گویا ہندوستان میں وہ بادشاہ ہیں۔''[2]

ان حالات میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا لندن کی کانفرنس میں کانگریس کا اپنے نمائندے کو بھیجنا ایک دانش مندانہ فعل تھا؟ گاندھی جی نے پہلے ہی یہ بات صحیح کہی تھی کہ ان کو ہندوستان سے باہر نہ جانا چاہئے جب تک دو مسئلوں کا اطمینان بخش حل نہ حاصل ہو جائے یعنی کہ (1) گول میز کانفرنس واقعی درجۂ نوآبادیات دینے کی بنیاد پر ایک دستور بنانا شروع کر دے گی (2) اقلیتوں کا مسئلہ طے ہو جائے گا اور اس پر راضی نامہ ہو جائے گا۔

کانگریس کی مجلس عاملہ کو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ دونوں شرطیں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں اور اسے دیکھ لینا چاہئے تھا کہ کانفرنس کی تشکیل ایسے ممبروں سے نہ کی جائے جو برطانیہ سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ ہوا یہ کہ کانفرنس میں شریک ہونے والے گورنمنٹ نے ایسے چنے جو کانگریس کے دعووں کو رد کر سکیں۔ برطانیہ نے ان

---

1. ٹمپل ووڈ (سیموئل ہور) پیپرس: ولنگڈن بنام ایس ہور۔ مورخہ 28 راگست 1931ء

2. ایضاً

علاحدگی پسند خودغرض اور تنگ ذہنیت کے ممبروں کی اتنی اہمیت جتائی کہ ان سے موافقت رکھنا ناممکن ہوگیا۔ اگر کانفرنس کا انعقاد ہندوستان میں ہوتا تو ایسے معدودین کی تعداد کافی کم رہتی۔ اس کے علاوہ ان کو انگلستان کے طاقت ور رجعت پسندوں کی پشت پناہی بھی نہ مل سکتی۔ ہندوستان میں حد سے زیادہ وطن پرستی کی جو فضا بن گئی تھی وہ بھی انہیں مجبور کرتی کہ وہ کھل کر صرف اپنے مفادات کی پیروی نہ کریں۔

گاندھی جی کو جو بات نہیں معلوم تھی لیکن ایک واقفیت پسند سیاسی مدبر کو جسے پہلے ہی سوچ رکھنا چاہئے تھا، وہ یہ تھی کہ اگر انگلستان میں حکومت تبدیل ہوگئی تو کیا کرنا ہوگا۔ جہاں تک مرکز (مرکزی حکومت) کو ترقی دینے کا سوال ہے تو اس کا انحصار اس پر رکھا گیا تھا کہ والیان ریاست اس کے تحت ہونا منظور کرلیں گے۔ لیکن ہندوستان گورنمنٹ (یعنی گورنر جنرل اور مخالف انگریز افسروں) نے کبھی اس کام کی تن دہی سے پیروی نہیں کی۔ اختیارات کی منتقلی کی راہ میں تحفظات کی اتنی دیواریں کھڑی کردی گئیں کہ اختیارات کی منتقلی صرف نام کی رہ گئی۔ اس کو طاقت کچھ حاصل نہ ہوئی۔ مزید یہ کہ اس نام نہاد طاقت پر بھی مسلمانوں اور والیان ریاست کو حق استرداد (Veto) دے دیا گیا تھا۔ انگلستان کی قدامت پسندوں کی اکثریت رکھنے والی حکومت نے ان دونوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس کے علاوہ گاندھی جی کی صاف گوئی اور دیانت داری کے ساتھ معاملت نے ان کا پلہ کمزور رکھا اس لیے کہ مقابلہ ایسے سیاست دانوں سے تھا جو چال بازی اور مکاری کی پالیسی اختیار کرنے میں میکاولی اور ٹیلی رینڈ سے بھی بہت آگے تھے۔

جہاں تک مسلمانوں کے مسئلے کا تعلق ہے گاندھی جی نے ہندوستان سے کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے انگلستان جانے سے پیشتر آخر وقت تک کوشش کی کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہوجائے۔ وہ مئی 1931ء میں بھوپال میں مسلم کانفرنس اور مسلم قوم

پرستوں کے نمائندوں سے ملے۔ لیکن اس ملاقات سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ایک ماہ قبل اپریل میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے اپنے ان شرایط کا اظہار کیا جن کی بنا پر وہ ہندوستان کا ایک ذاتی دستور ماننے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اس کے مطالبے یہ تھے: (1) وفاق کے جتنے اجزا (صوبے) ہوں گے سب خود مختار ہوں گے۔ (2) صوبوں کو باقی اختیارات حاصل ہوں گے (3) صوبوں کو اختیارات پارلیمنٹ سے تفویض ہوں گے (4) وفاقی شعبہ جات کا انتخاب صوبوں کی مشترکہ رضامندی سے ہوگا (5) برطانوی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں میں کوئی فرق نہ ہوگا (6) وفاقی قانون ساز چیمبر میں ایک تہائی نشستیں (مسلمانوں کے لئے) ہوں گی (7) مسلم اکثریت والے صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی اکثریت کا تحفظ (8) مسلمانوں کی جماعت جداگانہ ووٹ دے گی (9) مرکزی اور صوبائی کابینوں میں مسلمان ممبر بھی ہوں گے (10) فرقہ وارانہ معاملات پر کوئی قانون نہ بنے گا اگر اس فرقے کے ایک تہائی ممبران اس قانون کے خلاف ہوں گے۔

مسلم کانفرنس کے ان مطالبات کو کم کیے جانے کی فضل حسین نے سخت مخالفت کی خصوصاً جداگانہ انتخابات کے متعلق۔ گاندھی جمیعت العلماء کے سالانہ اجلاس میں جو اپریل میں کراچی میں منعقد ہوا تھا شریک ہوئے تھے اور انہوں نے شرم ناک فسادات کی سخت مذمت کی تھی جو آگرہ، بنارس، مرزا پورا اور کانپور میں ہوئے تھے اور فاضل علماء سے درخواست کی تھی کہ وہ فرقہ واریت کے زہر کو دور کرنے میں مدد دیں۔

جولائی کے دوسرے ہفتہ میں بمبئی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مسلمانوں اور سکھوں کو یقین دہانی کرائی گئی کہ آئندہ کے دستور میں اقلیتوں کے مسئلہ کا کوئی ایسا حل کانگریس کو منظور نہ ہوگا جس سے متعلقہ فرقوں کی پوری تشفی نہ ہوگی۔ اس کے بعد اقلیتوں کے حقوق کی اسکیم کا مسودہ منظور کر لیا گیا۔ ۱۲ مسودے

میں درج ذیل باتیں تھیں:

1-بنیادی حقوق کی ضمانت

(الف) تحفظ معاشرت، زبان، رسم خط، تعلیم، پیشہ، مذہب اور مذہبی اوقاف

(ب) تحفظ احکام شرعی

(ج) سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفظ جو وفاقی سرکار کے دائرہ اختیار میں ہوگا۔

2- بالغ رائے دہندگی

3-(الف) مشترکہ انتخابات

(ب) سندھ میں ہندوؤں کے لیے، آسام میں مسلمانوں کے لیے اور پنجاب وشمالی مغربی سرحدی صوبے میں سکھوں کے لیے نشستوں کا تحفظ، نیز ان تمام صوبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نشستوں کا تحفظ جہاں ان کی آبادی 25 فی صدی سے کم ہو۔ وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر تحفظ، ساتھ ہی اس بات کا حق کہ وہ مزید نشستوں کے لیے الیکشن لڑ سکتے ہیں۔

4-سرکاری ملازمتوں پر تقرریاں ایسے پبلک سروس کمیشن کے ذریعے کرائی جائیں گی جس کے ممبران کسی سیاسی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ تقرری میں (امیدوار کی) صلاحیت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے گا لیکن ساتھ ہی فرقہ وارانہ اقلیتوں کو برابر کا موقع دیا جائے گا اور تقرریوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ ان کو بھی خاصا حصہ ملے۔

5- مرکز اور صوبوں میں جو کابینہ بنیں گے ان میں اقلیتوں کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے گا۔

6-شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کی حیثیت بڑھا کر دوسرے صوبوں کے برابر کردی جائے گی۔

7-سندھ کوعلاحدہ صوبہ بنادیا جائے گا۔

8- ہندوستانی کو ایک وفاقی ملک بنادیا جائے گا لیکن اس وفاق کے اجزا (صوبوں) کو ماقی اختیارات حاصل ہوں گے۔

کراچی میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے جو قرارداد منظور کی تھی وہ گویا جناح کے چودہ نکات کو منظور کر لینا تھا۔سوائے ایک استثنا کے۔ جو جناح کا تیسرا نکتہ کہ وفاقی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی $33\frac{1}{3}$ فی صد ہو منظور نہیں کیا گیا تھا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہے کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے دسمبر 1928ء میں جو موقف اختیار کیا تھا اب اس میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تبدیلی بہت دیر میں آئی۔ اس وقت تو جناح نے کانگریس سے صرف پانچ نکتوں کو منظور کرنے کی درخواست کی تھی لیکن کانگریس نے انہیں نامنظور کر دیا تھا تو انہوں نے جنوری 1929ء ان پانچ نکتوں کو بڑھا کر چودہ کر دیا تھا لیکن 1930ء تک صورت حال یہ ہوگئی کہ کانگریس نے مسلم لیگ سے کوئی مشورہ کیے بغیر مکمل آزادی کے حصول کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد سول نافرمانی کی تحریک چلائی تو مسلمانوں کی اکثریت کا ذہن (کانگریس سے) برگشتہ ہو چکا تھا۔

8-مسلمانوں کے مطالبات دوبارہ پیش

گول میز کانفرنس میں جو معاملات ہوئے اور وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی اس پر مسلمانوں نے اپنا سخت ردعمل ظاہر کیا۔آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے 7رفروری 1931ء کو نئی دہلی میں بیان یہ دیا کہ وہ وزیر اعظم کے اعلان (مورخہ 19رجنوری) کو منظور کرنے سے قاصر ہے۔اس نے (گول میز) کانفرنس کے مجوزہ وفاقی ہیئت کے تصور کو نامنظور کر دیا اور افسوس ظاہر کیا کہ کانفرنس ہندو مسلم

مسئلے کا کوئی منصفانہ اور عادلانہ حل تلاش نہ کرسکی۔4/دسمبر کو وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اس کو اس لیے بہت برا بھلا کہا کہ اس تقریر میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کا ذکر نہایت غیر سنجیدہ بلکہ بدتمیزی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مسلم کانفرنس نے چنانچہ مسلمانوں کو آواز دی کہ وہ ہر اس فعل کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کے جائز مطالبات منظور کروانے کے لیے ضروری سمجھا جائے۔

مسلم کانفرنس کا ایک خاص اجلاس نئی دہلی میں 5/اپریل کو منعقد ہوا۔ اجلاس کے صدر، شوکت علی نے اعلان کیا کہ مسلمان جناح کے چودہ نکات کے ہم نوا ہیں اور حاضرین کو یقین دلایا کہ ان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ برطانیہ کے لوگوں میں مسلمانوں کو عام طور پر راضی رکھنے کا ایک احساس پیدا ہوگیا ہے ۔ انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ انہوں نے ساڑھے آٹھ سو سال ہندوستان پر حکومت کی ہے اس لیے ان کو چاہئے کہ وہ اپنا مستقبل اپنے ماضی کے شایان شان دیکھیں۔

مسلم لیگ نے اپنے جلسے میں مسلم کانفرنس کی ان مطالبات کی چند ترمیمات کے ساتھ توثیق کی جو اس نے یکم جنوری 1929ء کو پیش کیے تھے۔(جناح کے چودہ نکات)

مسلمان وفاق کے مسئلہ کو جس رخ سے دیکھ رہے تھے ان اسباب کی تفتیش مانچسٹر گارجین (انگریزی اخبار) کے ایک مراسلہ نگار نے جون 1931ء کے شمارے میں اس طرح پیش کی:

''مسلمان سمجھتے ہیں کہ نئی وفاق میں اگر وہ بنتی ہے یا جب بنتی ہے تو اس میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہوگی۔ اس میں صوبوں کی شمولیت ان کی اکثریت کو بڑھادے گی کیونکہ زیادہ تر صوبے ہندو اکثریت کے ہیں۔ اس لیے مستقل طور پر قائم ہو جانے والی حکومت کا توڑ مسلمان اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ شمالی ہند کے صوبوں کا

ایک بڑا بلاک بن جائے کیونکہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور ان صوبوں میں جو ہندو ہوں گے وہ گویا یرغمال کے طور پر ہوں گے تاکہ مرکز میں اور دکن میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں.......... بہت سے مسلمان اس بات کو نہیں مانتے کہ ہندوستان مستقل طور پر وفاقی ہوکر رہ سکے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک مسلم ریاست کراچی سے لے کر شمالی بنگال تک قائم ہو جائے گی...... اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ سندھ کی علاحدگی کے لیے بضد ہیں اور جانتے ہیں شمال مغربی سرحدی صوبہ تو ایک مستقل صوبہ ہو ہی جائے گا، پنجاب میں بھی ان کو مستقل طور پر اکثریت حاصل رہے گی اور ممکن ہوا تو بنگال میں بھی۔'' [1]

برطانوی کابینہ وفاقی وحدت کے فرقہ وارانہ پہلو پر غور وخوض کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ حل طلب سوال یہ ہے کہ کیا ''مسلم صوبے یا وہ صوبے جن میں مسلمان اپنی طاقت مستحکم کر لینے کی امید رکھتے ہیں ایک ایسے مرکز کے کسی طرح کے اختیار میں رہیں جس میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہوگی۔'' [2]

1931ء میں بھی گورنمنٹ ایک اسلامی ہندوستان کی تخلیق کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی۔ کیا ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک خواہش ایک خیال کی تخلیق کا باعث ہوئی؟

15 اپریل کو لکھنؤ میں علی امام کی صدارت میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ انھوں نے جداگانہ انتخاب کو قوم پرستی کے منافی بتایا اور سمجھایا کہ خواہ کتنے ہی تحفظات کیوں نہ ہوں، تحفظ ممکن نہ ہوگا۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے مسئلے کو حل

1۔ ''دی میکنگ آف انڈیاز پیپر فیڈریشن 27-1925'' از آر۔ جے۔ مور، مطبوعہ فلپس اور روین رائٹ۔ بحوالہ گزشتہ ص 65

2۔ ایضاً

کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی جس کی بنیادی باتیں یہ تھیں: (1) مشترکہ انتخابات (2) بالغ رائے دہندگی (3) بنیادی حقوق مثلاً کلچر، زبان، رسم الخط، مذہب اور اقتصادی مفادات کی ضمانت (4) ایک وفاقی دستور جس کے وحدانی اجزا کو باقی اختیارات حاصل رہیں گے (5) ملازمتوں پر تقرریاں ایک پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوں اور نیچے درجے کی ملازمتوں میں کسی فرقے کی اجارہ داری نہ قایم کی جائے (6) سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے۔ (7) شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو وہی درجہ دیا جائے جو دیگر صوبوں کا ہے۔ (8) وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر نشستیں محفوظ کی جائیں۔

مسلمان اب اپنے کو ایک اقلیتی فرقہ نہیں بلکہ ایک قومیت سمجھنے لگے تھے۔ اقبال پہلے ہی ایک جداگانہ مسلم قومیت کا نظریہ (مسلم ملت) پیش کر چکے تھے۔

علاحدگی کے شعور کا ارتقا گویا اب تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ یہ سلسلہ سید احمد خاں سے شروع ہوا تھا جنہوں نے ہندو اور مسلمانوں میں ایک امتیاز اور فرق کا احساس پیدا کیا تھا حالانکہ انہوں نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا اس امتیاز کے منطقی نتائج کیا ہوں گے۔ دوسری منزل تب آئی جب کرزن نے بنگال کو منقسم کیا۔ اس سے یہ علاحدگی کا جذبہ قوی تر ہوا اور اس جذبے کو ایک علاقائی بنیاد فراہم ہوئی۔ تقسیم بنگال کے موقع پر جو ہنگامے ہوئے تھے ان سے مسلمانوں کے دلوں میں جو جوش بھر گیا تھا اس نے ایک ہیئت اختیار کر لی اور جو آخر کار فرقہ وارانہ بنیاد پر جداگانہ انتخابات کے مطالبے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ منٹو اور مارلے نے اپنی ریاکارانہ اور دورخی باتوں سے، یعنی ایک بات کہنا اور کرنا بالکل اس کے خلاف، برطانوی سامراج کی حکمت عملی کے لیے نشانات راہ متعین کر دیے۔ 1909ء کے ایکٹ نے فرقہ ورانہ احساسات کی منظوری پر سرکاری مہر ثبت کر دی۔ مانٹیگو اور چیمسفورڈ اگرچہ مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات

کو برا بھلا تو کہتے رہے لیکن 1919ء کا ایکٹ نافذ کر کے اس میں جداگانہ ذہنیت کی توثیق کر کے اس کو اصولاً قائم کر دیا اور اس طرح قومی یک جہتی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

دس سال بعد دستوری کمیشن کو موقع ملا کہ وہ اس مسئلے پر نظر ثانی کرے۔ اپنی رپورٹ میں کمیشن نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی:

''فرقہ وارانہ نمائندگی یعنی قانوناً اس بات کی اجازت کہ مجلس قانون ساز میں ایک مخصوص مذہبی فرقے کی نمائندگی خود اس فرقے کے ممبروں کے ووٹوں کے ذریعہ ہو اور یہ کہ مجلس میں ان کی کتنی نشستیں ہوں، ایک عام شہری کے احساس آزادی میں بلاشبہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ فرقہ وارانہ رائے دہندگی، طبقاتی امتیازات اور باہمی تعلقات کو ہمیشہ کے لیے قائم کرے گی اور حکومت خود اختیار کے اصول کو ترقی دینے میں اس سے بڑی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اگر اس قسم کے خیالات رکھنا ایک طرح کا تعصب سمجھا جائے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہم انہیں خیالات کے حامی ہیں۔'' [1]

وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے اپنی رائے اس طرح پیش کی: ''اگر رائے دہندگی کا ہر حلقہ کسی خاص فرقے یا مفاد پرست جماعت کے لیے مختص کر دیا گیا تو پھر پورے طور پر ایسی سیاسی جماعتوں کو پنپنے اور ترقی کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے گا جن میں تمام فرقوں، مذہبوں طبقوں اور ہر عقیدے کے لوگ شامل ہوں۔ اگر ہندوستان میں ایک طاقتور سیاسی زندگی قائم ہونا ہے تو اس میں ایسی قوم پرست سیاسی پارٹیوں کو جگہ دینا ہوگی جن کی بنیادیں کل ہندوستان کی بہبودی کے تصورات پر قائم ہوں، ایسے تصورات پر نہیں جن کا دائرہ اثر بہت چھوٹا ہو اور ہندوستان پر محیط نہ ہو۔'' اس نے یہ بھی سوال کیا ''اگر مجالس قانون ساز میں ایسے بندھے ٹکے شعبے قائم بھی ہو گئے تو

---

1 دی انڈین اسٹیٹیوری کمیشن رپورٹ جلد دوم ص 56

عاملہ میں تقرریاں کس طرح ہونگی؟"[1]

اگران بیانات سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ ان معقول اصولوں کے اعلانات کی تصدیق بعد میں ہونے والے فیصلوں میں لازمی طور پر ہو جائے گی تو اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ اس کے بالکل متضاد تھا جسے منطقی طور پر ہونا چاہئے تھا۔

سائمن کمیشن نے سفارش کی تھی کہ جداگانہ فرقہ وارانہ انتخابات تمام مجالس قانون ساز کے لیے برقرار رکھے جائیں اور ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے مسلمانوں کے لیے نشستیں محفوظ ہوں۔

محمد علی نے کہا تھا: "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیا تنازعہ کی بات کوئی غلط فہمی ہو اس کی بنیاد صرف اس خوف پر ہے کہ ایک دوسرے پر غلبہ نہ حاصل کر لیں گویا ہمارے مسائل قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہیں۔" [2]

وہ اکثریت کی حکومت پر اس شرط پر رضا مند ہو سکتے تھے اگر پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمایندگی کی اکثریت ہو، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کا درجہ دوسرے صوبوں کے برابر کر دیا جائے اور ساتھ ہی سندھ کو علاحدہ صوبہ بنانے کی ضمانت ہو۔

ان کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح ہندو صوبوں کے ساتھ توازن برقرار رکھ سکیں گے۔ انہوں نے کہا: "خوش قسمتی کی بات ہے کہ بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔"[3]

اندرونی فرقہ وارانہ تنازعات کو بین الاقوامی بنا دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ فرقہ

---

1. ریمزے میکڈانلڈ کی تقریر دارالعوام (پارلیمنٹ) میں تاریخ 26 رجنوری 1931ء کو دارالعوام کے مباحث۔ پانچویں سیریز، جلد 243، کالم 48-647

2. گول میز کانفرنس۔ بحوالہ گزشتہ، ص 123

3. ایضاً ص 104

وارانہ کشیدگی ہمیشہ بنی رہتی کیونکہ بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد ہی آپس کی کشیدگی اور قومی خودغرضی پر ہوتی ہے۔

9- گاندھی جی کانفرنس میں

گاندھی جی کی تمام کوششیں مسلمانوں کو راضی کرنے کے لیے ناکام ہوچکی تھی اس لیے گاندھی۔ ارون معاہدہ سے ولنگڈن اور اس کے افسروں نے جس طرح فائدہ اٹھایا اس سے گاندھی جی بہت کبیدہ خاطر تھے۔ انھوں نے بمبئی کے گورنر سے ملاقات کی اور وایسرائے کو خطوط لکھے لیکن کوئی مفید مطلب نہ نکلا۔ اپنے لندن جانے کے متعلق 8 راگست کو انہوں نے یہ بیان دیا: ''جو معاہدہ ہوا ہے اس کے تحت کانگریس کو گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا ہے تاکہ وہ وہاں اپنا نقطہ نظر پیش کر سکے۔ لیکن جب تک فضا سازگار نہ ہو میرا وہاں جانا بالکل بیکار ہوگا۔'' [1]

11 راگست کو انہوں نے ایک تار وایسرائے کو بھیجا جس میں صاف صاف لکھ دیا ''جب میں نے بمبئی کے گورنر کا خط پڑھا اور ساتھ ہی سر مالکم ہیلی کا تار جو میرے خط کے جواب میں آیا ہے اور مزید یہ کہ یوپی اور سرحدی صوبے میں مسلسل مظالم کی جو خبریں سنی ہیں ان سب سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے (لندن) نہ جانا چاہیے۔'' [2]

ولنگڈن نے جواب دیا کہ آپ کے یہ سب شبہات بے بنیاد ہیں۔ ساتھ ہی کانگریس پر معاہدہ کے الفاظ اور حقیقی مقصد کی خلاف ورزی کرنے کا الزام لگایا۔ تب

---

1. ڈی۔ جی تندولکر۔ بحوالہ گزشتہ۔ جلد سوم ص 131

2. ایضاً ص 133

گاندھی جی نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ 25 راگست کو شملہ میں یہ ملاقات ہوئی۔ اس میں جو گفتگو ہوئی اس کے متعلق ایک اعلانیہ شایع ہوا جس کا نام 'دوسرا معاہدہ' رکھا گیا۔ اس دوسرے معاہدے میں پہلے معاہدے کی توثیق کی گئی اور اصولاً یہ بات بھی منظور کر لی گئی کہ جو شکایات ہوں گی ان کی تفتیش کی جائے گی اور اگر تفتیش سے اطمینان نہ ہوسکا تو کانگریس کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ تحفظ کا خود کوئی انتظام کرے یا کوئی راست اقدام کرے۔

اس کے بعد گاندھی جی کے کہنے پر وایسرائے اس بات پر بھی رضامند ہو گئے تھے کہ مالویہ اور سروجنی نائیڈو کو بھی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کرلیا جائے۔ لیکن گاندھی جی نے انصاری کا نام بھی دیا تھا۔ وایسرائے نے اس نام کو شامل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نام پر مسلمانوں کو اعتراض ہے۔ اعتراض دراصل فضل حسین نے کیا تھا جو وایسرائے کی ایکزیکیٹو ممبر تھے۔

اگرچہ گاندھی کو قوی اندیشہ تھا کہ لندن میں معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا پھر بھی قومی جذبے سے مجبور ہو کر وہ آخر کار انگلستان جانے کے لیے اپنے بحری سفر پر ایس۔ ایس۔ راجپوتانہ نامی جہاز پر 29 راگست کو روانہ ہو گئے۔

ان کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ دوسری گول میز کانفرنس جس میں ممبروں کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ (31 نئے مندوبین تھے) ایک ایسی نئی سرکار (گورنمنٹ) کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جو سخت اقتصادی زبوں حالی کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ لیبر گورنمنٹ شکست کھا چکی تھی اور لیبر حکومت کے سکریٹری آف اسٹیٹ وتیج وڈ بن، جنہوں نے بڑی پامردی کے ساتھ ایک انقلاب آفریں پالیسی اختیار کرنے کی حمایت کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندستان کو خود مختار حکومت دیدیں گے اور ساتھ ہی اکثریت کے مفاد کو اقلیت کی خوشنودی کی خاطر قربان کر دینے کے خلاف تھے، استعفا

دے چکے تھے۔ اگرچہ ریمزے میکڈانڈ بطور وزیراعظم برقرار تھے لیکن اب ان کو قدامت پسندوں (یعنی بالڈون اور سیموئل ہور جو ہندوستان کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے) کے طریقہ کار پر عمل کرنا تھا۔

کانفرنس کے سامنے جو خاص کام تھا یا بقول میکڈانلڈ جو کلیدی مسئلہ تھا وہ ہندو مسلم اختلافات کا حل تھا۔ اقلیتی سب کمیٹی کا ایک جلسہ میکڈانلڈ کی صدارت میں ہوا لیکن وہ صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے دلچسپی لیتا رہا۔ گاندھی جی نے دونوں فرقوں سے گزارش کی کہ وہ اپنے باہمی شکوک اور اندیشے ترک کرکے مزید تاخیر کیے بغیر، متحد ہو جائیں اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ کمیٹی کے مسلمان ممبران سخت قسم کے فرقہ پرور تھے۔ شبہات کی کشمکش انہیں مخالف سمت میں کھینچ رہی تھی۔ مثلاً وہ سوچ رہے تھے کہ کیا ان کا مقدر ہندوستان کے اندر رہ کر بن سکتا ہے یا ہندوستان سے الگ رہ کر؟ ہندوستانی وفاق کے اندر خود مختار مسلم صوبوں کی حیثیت سے یا کوئی آزاد مسلم حکومت قائم کرکے؟ کیا وہ تحفظات جو دستور میں دیے جائیں گے کافی ہوں گے یا زیادہ واضح تحفظات کی ضرورت ہے؟

ہندوستانی قومیت کا تصور ان کے ذہن میں کمزور پڑ گیا اور ان کی سیاست اس رخ پر بڑھتی گئی کہ سیاسی طاقت زیادہ سے زیادہ کیسے حاصل ہو اور طاقتوں کا توازن کیسے برقرار رکھا جائے۔ اس صورت حال کا پرجوش اظہار اس وقت ہوا جب مسلمان اور یورپی لوگوں نے متحد ہو کر دوسری اقلیتوں: ہریجن، غیر برہمن، اینگلو انڈین اور عیسائیوں کو ترغیب دی کہ وہ وزیراعظم پر یہ اچھی طرح واضح کردیں کہ ہندوستان کا کوئی ایسا دستور انہیں قبول نہ ہوگا جس میں ان کے مفادات کا تحفظ نہ ہو۔

لیکن یہ نئے خیالات ابھی اندیشوں کا شکار تھے اور وہ پرانا تصور کہ ایک متحد

ہندوستان ہوا بھی ذہنوں سے بالکل نہیں گیا تھا۔ اس لیے کچھ پس و پیش کے بعد ایک موقع پر تو اقلیتیں ایک مکمل سمجھوتے کے کنارے پہنچ گئی تھیں۔ بقول میکڈانلڈ صرف اختلاف رائے اس بات پر رہ گیا تھا کہ ایک ووٹ صرف ایک ووٹ ہی سمجھا جائے۔ لیکن اس کے بعد سمجھوتہ کرانے والے ہچکچا گئے اور رکاوٹ کبھی دور نہ کی جا سکی۔ کانگریسی اصول پرست عرصہ تک تو یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ مسلمان جن اندیشوں کے شاکی ہیں وہ کوئی حقیقت بھی رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے ذہنوں پر ان کے فوری اندیشے اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے حال کو چھوڑ کر مستقبل کے ان مصائب کو دیکھنے سے انکار کر دیا جو ایک سیاہ بادل کی طرح ملک پر چھائے ہوئے تھے۔

○ ان دونوں نے مل کر کانفرنس کے وسیلے سے ہندوستان کو خودکشی والے راستہ پر لا ڈالنے کی کوشش کی۔ دونوں ہندوستانی قوم پرستی کو نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چیز نہ موجود ہے اور نہ آئندہ کبھی ممکن ہو سکتی ہے۔ نہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کرائیں بلکہ اس کے برخلاف بہت سے برطانوی سیاست داں تو ہندوستانی نیشنل کانگریس کو سلطنت برطانیہ کا دشمن سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں کانگریس کے دعووں کی مخالفت کریں۔ ان حالات میں اقلیتوں کی سب کمیٹی نے مایوس ہو کر اپنا کام ترک کر دیا۔ اس کی ناکامی سے کانفرنس کا مقصد بھی فوت ہو گیا اور گاندھی جی نے بڑے غم و اندوہ کے ساتھ ہندوستانی آزادی کی موہوم پری کی قبل از وقت تدفین پر ایک تعزیتی بیان دیا۔ انہوں نے حاضرین سے کہا: ''یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی رایوں کو پوری وقعت نہیں دیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ مروت نہیں کرتے اسی لیے کوئی اصول بن نہیں پاتا۔ اس کے

○ برطانوی حکومت سائمن جو ایک چالاک لبرل تھا اور میکڈانلڈ جو غیر مستقل مزاج اور لیبر پارٹی کا ممبر تھا،

برخلاف، انسانی عظمت یہ چاہتی ہے کہ ہم سب زندگی کے طوفانوں کا مقابلہ کریں بعض اوقات سگے بھائی بھی الگ الگ راہیں اختیار کر لیتے ہیں لیکن اپنے اختلافات کے خاتمے پر وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں کوئی کدورت نہیں ہے اور اختلافات کے باوجود انہوں نے ایک شریف آدمی، ایک ذمہ دار سپاہی کی طرح کام کیا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ہم جدا بھی ہوئے تو بہت اچھی طرح''۔ 1

وزیراعظم نے اپنی تقریر میں اعلان کیا: ''ملک معظم کی حکومت مجبوراً ایک عارضی اسکیم اختیار کرے گی کیونکہ انھوں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ اس معذوری (فرقہ وارانہ اختلافات) کو ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ بننے دیا جائے گا۔'' 2

کوئی معجزہ ہوتا تبھی ایسی صورت حال درست ہو سکتی تھی لیکن ایسا کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ ناکامی کا ایک باعث تو یہ تھا کہ کانفرنس کے ممبران کا صحیح انتخاب نہیں ہوا تھا۔ اخبار ڈیلی ہیرالڈ نے لکھا:

''گول میز کانفرنس کے پس پشت بڑی اہمیت رکھنے والی نجی مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اہم اشخاص مثلاً مسٹر گاندھی اور سر تیج بہادر سپرو سخت کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور سخت ہندو بھی کوئی ضد نہیں کر رہے ہیں لیکن مسلمان مندوبین بہت سختی دکھا رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا واقعی انہیں نمائندہ سمجھا جائے تو کامیابی کے آثار بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس امر میں بہت شک ہے کہ وہ واقعی ہندی مسلمانوں کے نمائندے ہیں کیونکہ ان مسلمان مندوبین کو برطانوی ہندوستانی حکومت نے

1۔ ہندوستانی گول میز کانفرنس (دوسرا اجلاس) 7 ردسمبر۔ یکم دسمبر کی تفصیلات ص 422

2۔ ایضاً، ریمزے میکڈانلڈ کا بیان مورخہ یکم دسمبر 1931ء ص 418

منتخب کیا ہے اور ان میں کا تقریباً ہر فرد فرقہ پرست ہے۔ یہ اپنے کو مسلمان پہلے مانتے ہیں اور ہندوستانی بعد کو۔'' [1]

ایک بات یہ بھی تھی کہ اگست 1931ء میں عالم گیر کساد بازاری کے باعث انگلستان ایک شدید مالی بحران میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ مصیبت اسی طرح رفع ہو سکتی تھی اگر سخت کفایت شعاری کی جاتی اور اس کے لیے وہاں کی لیبر گورنمنٹ تیار نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پارٹی حکومت سے دستبردار ہو گئی اور ایک مشترکہ گورنمنٹ قومی گورنمنٹ کے نام سے بنی جس کے وزیر اعظم میکڈ انلڈ ہوئے۔ اس مشترکہ گورنمنٹ نے ملک کی اجازت حاصل کرنے کے لیے اکتوبر میں الیکشن کرایا جس میں اس کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی لیکن پارلیمنٹ کے 556 ممبروں میں سے قدامت پسند پارٹی کے 504 ممبر کامیاب ہوئے اور لیبر پارٹی کے صرف 52 ممبروں کو نشستیں مل سکیں۔

لازماً ایسی حکومت کا اثر، جس میں قدامت پسندوں کی بہتات ہو، ہندوستان کے معاملات پر بھی پڑا۔ گول میز کانفرنس میں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ 1924ء میں جب قدامت پسندوں نے لیبر حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا، اس وقت سے قدامت پسندوں کی پالیسی یہ ہو گئی تھی کہ دستور سازی کے دوران برطانیہ اور ہندوستان کے مابین برابری، شرکت اور کسی قسم کے معاہدہ کی حکمت عملی نہ برتی جائے بلکہ برطانوی پارلیمنٹ کی برتری پر زور دیا جائے اور اسی کو اس بات کا مجاز گردانا جائے کہ وہی (پارلیمنٹ) یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ کتنی اور کس رفتار سے ہندوستان کو دستوری ترقی دی جائے۔

1۔ دی ڈیلی ہیرالڈ (لندن) مورخہ 24 ستمبر 1931ء

(موجودہ) برطانوی حکومت کا یہ خیال تھا کہ شاہی وسائل، وقار اور مالی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ ہندوستان کے ساتھ فیاضانہ پالیسی برتنے کی حمایت کی جائے۔"[1]

لیبر پارٹی نے اپنے نظریات کے تحت گول میز کانفرنس بلائی تھی اور گاندھی ارون معاہدہ کرایا تھا لیکن اب اسے قدامت پسندوں نے جن کی واقعی حکومت 1931ء میں قائم ہوگئی تھی، مسترد کر دیا۔ اب برکن ہیڈ کی رایوں کو بالادستی پھر حاصل ہوگئی اور گول میز کانفرنس کے معاہدوں کے بجائے اب دستوری کمیشن کی سفارشات پر گورنمنٹ کو اپنی پالیسی اختیار کرنا تھی۔

ہندوستان کی حکومت نے جس کے سربراہ لارڈ ولنگڈن نے طے کر لیا کہ اب ارون کی پالیسی جو بقول لارڈ برنھم کے کمزوریوں کا مرکب تھی نہ چلے گی اور نہ اب کسی "نیم برہنہ باغی فقیر" کو اجازت دی جائے گی کہ وہ برابری کا دعویٰ کرتے ہوئے سمجھوتہ کرنے کی غرض سے وایسرائے کے ایوان کے دروازوں کو آکر گندہ کرے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے اقتدار کو دوبارہ منوا کر رہے گا اور کانگریس کے بلند بانگ دعووں کو کچل دے گا۔

کانفرنس کے شروع ہونے کے وقت ولنگڈن کی جو رائے گاندھی جی کے متعلق تھی اب کانفرنس کے خاتمے پر اس میں مکمل تبدیلی آگئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ "ایسا (گاندھی جی) تیز سیاسی ذہن کا سیاسی سودے کرنے والا چھوٹا آدمی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"[2] لیکن کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے ہور کو لکھا: "گاندھی، جیکل اور ہائڈ کا ایک مجموعہ ہے اور ممکن ہے اس کا اپنا ایک روحانی رخ ہو لیکن دوسرا رخ وہ

---

1. فلپس اور وین رائٹ، بحوالہ گزشتہ ص 68
2. ٹمپل وڈ (سیموئل ہور) پیپرس: وایسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ۔ مورخہ 28 راگست 1931ء

میکاولی کی طرح مکارانہ رکھتا ہو۔ سیاسی سودا کرنیوالا ایسا چھوٹا ریاکار میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' [1]

قومی گورنمنٹ کا رویہ بھی کانفرنس کے متعلق بدل گیا۔ سیموئل ہوراس طریقہ کار سے کبھی متفق نہ تھے جو بین اور اروِن نے اختیار کیا تھا۔ نہ وہ ہندوستانی مندوبین کے ساتھ مشورہ اور سمجھوتہ کرنے کے حق میں تھے کیونکہ سمجھتے تھے اس طرح برطانوی پارلیمنٹ تو ریکارڈ رکھنے کا ایک دفتر ہو کر رہ جائے گا۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے وقار کو دوبارہ قائم کردے اور آخری اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں رکھے کہ وہی طے کرے کہ اصلاح شدہ دستور کس نوعیت اور کس وضع کا بنایا جائے۔

وہ جانتے تھے کہ کانفرنس سے کسی قسم کے اہم نتیجے برآمد نہ ہوں گے۔ لیکن وہ اس بات کے لیے ضرور پریشان تھے کہ کہیں ایک متحد ہندوستان برطانیہ عظمیٰ کے مقابل میں صف آرا نہ ہو جائے۔ اس نے کانفرنس کا رخ سائمن کمیشن رپورٹ کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ولنگڈن کو لکھا'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی خود یہ بات مجبور ہو کر پیش کریں گے کہ پہلے قدم کے طور پر انہیں صوبائی خودمختاری دیدی جائے۔ لیکن یہ تجویز اول اول ہماری طرف سے پیش ہونا چاہیے۔'' [2]

انہوں نے دو مسئلوں کے بارے میں دو الگ الگ قانون سوچ رکھے تھے۔ پہلا صوبائی خودمختاری کے متعلق اور دوسرا جس میں مرکزی حکومت کا دستور پیش کیا گیا ہو۔

مگر ولنگڈن نے محسوس کیا کہ ایسا قدم اٹھانا بہت تباہ کن ہوگا۔ اس لیے انہوں نے سختی کے ساتھ اور متعدد بار ہور کو اس کی بابت متنبہ کیا۔ آخر کار ان کی رائے مان لی گئی۔ دونوں قوانین کو ایک ہی قانون (ایکٹ) میں شامل کر دیا گیا۔

---

1. ایضاً مورخہ 10 رجنوری 1932

2. ایضاً۔ جلد دوم۔ مورخہ 2 راکتوبر 1931ء

گول میز کانفرنس میں مسلم مندوبین نے جو سختی کا اور بے لچک رویہ اختیار کیا تھا وہ نتیجہ تھا اس تبدیلی کا جو انگلستان کی حکومت میں آ گئی تھی۔ اس نتیجے پر اعتبار اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ گول میز کانفرنس میں برطانوی تجارتی فرقے نے بنتھل نامی ایک شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے ایک خفیہ گشتی سرکلر جاری کیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا: ''مسلمانوں کی ٹیم بہت قوی اور پر جوش ہے۔ قوم پرست مسلمانوں کے نمائندہ علی امام نے کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں پیدا کیا۔ مسلمانوں نے اپنی بازی خوب اچھی طرح کھیلی۔ اس کے بدلے میں انہوں ہم سے یہ طلب کیا کہ ہم ان کی مالی پس ماندگی کو فراموش نہ کر دیں جو بنگال میں ہے اور ہم ان کی طرف زیادہ لاڈ پیار دکھائے بغیر کوشش کریں کہ ان کو (مسلمانوں کو) یوروپی فرموں (مشترکہ کاروبار) میں اسامیاں مل جائیں تاکہ ان کی مالی حیثیت درست ہو جائے اور ان کے فرقے کی عام حیثیت بہتر ہو جائے۔''

مجموعی طور پر برطانوی قوم کی اور اس برطانوی فرقے کی جو ہندستان میں ہے ایک پالیسی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہم ایک دفعہ سب مل کر ایک قومی پالیسی مقرر کر لیں اور اس پر قائم ہو جائیں۔ لیکن عام انتخابات کے بعد گورنمنٹ کے دائیں بازو نے یہ طے کیا کہ وہ کانفرنس کو ناکام بنا دیں گے اور کانگریس سے لڑیں گے۔ وہ مسلمان جو مرکز پر اپنے اختیارات نہیں چاہتے اس بات سے خوش ہو گئے۔[1]

ہیرالڈ لاسکی نے جو گول میز کانفرنس کے تمام جلسوں میں سانکے کا مددگار رہا تھا، امریکہ کے جسٹس ہومس کو خطوط میں اپنے تمام تاثرات لکھے تھے جو فرقہ وارانہ مذاکرات کو سن کر انہوں نے قایم کیے تھے۔ 30/ اکتوبر 1931ء کو انھوں نے لکھا:

''سانکے نے مجھ سے کہا کہ میں مسلمانوں کو معقولیت کی راہ پر لانے کی کوشش

1۔ پٹابھی سیتارمیا بحوالہ گزشتہ جلد اول ص 873

کروں۔ چنانچہ یہاں میں نے ان کے لیڈر سے گھنٹوں گفتگو کر کے کوشش کی کہ کوئی ایسی بنیاد مل جائے جس پر مذاکرات ہو سکیں لیکن میں گویا ایک دیوار سے گفتگو کر رہا تھا۔اس کے لیے مذہب ہی آخری اور بنیادی حقیقت تھی اور وہ اس کے لیے تیار ہی نہ تھا کہ کوئی ایسی سطح تلاش کی جائے جو سیکولر کہی جا سکے یعنی ایسی سوسائٹی جو نا مذہبی ہو۔''

انہوں نے مزید یہ بھی لکھا: ''ایسے لوگوں سے گفتگو کرنا ناممکن ہے جو سمجھتے ہیں کہ حقیقت مطلقاً انہیں کی ملکیت میں ہے۔''[1]

ایک دوسرے خط میں اس نے افسوس کے ساتھ لکھا: ''ان لوگوں (مسلمانوں) کا مذہبی تعصب بہت شدید ہے۔اگر چہ میں اس کا کوئی ثبوت تو نہیں دے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ آج کل پان اسلامی توقعات مشرق میں ایک بڑی طاقت ہیں اور اس کی پس پشت ان لوگوں کے ناممکن مطالبات مبہم ہیں اور خوف ناک خواب۔''[2]

برطانوی حکومت کے ترجمانوں کے رویے کو دیکھ کر انہوں نے لکھا کہ کسی قسم کا فرقہ وارانہ معاہدہ ممکن نہیں ہے۔ایک طرف قدامت پسندوں کی سامراجیت ہے دوسری طرف ہندوستانیوں کی انتہا پسندی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکے گا۔''[3]

قدامت پسندوں کے رویے کی تشریح اس نے اس طرح کی: ''نئی سیاسی صورت حال نے سکریٹری آف اسٹیٹ (سیموئل ہور) کا دل سخت کر دیا ہے اور اس کے ذہن میں پس پشت یہ خبط بھی ہے کہ سفید فام لوگوں سے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ وہ سیاہ فام لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دیں''[4]

---

1. ہومس لاسکی لیٹرس۔مسٹر جسٹس ہومس اور ہیرولڈ، جے لاسکی مراسلت 16-1915ء (ہارورڈ یونیورسٹی میرلیس۔1953ء، جلد دوم۔ص 1382، 30/اگو۔ 1931ء

2. ایضاً 27/ستمبر 1931ء

3. ایضاً

4. ایضاً 30/اکتوبر 1931ء

ایک دوسرے خط میں لکھا: ”میں جزوی طور پر میکڈانلڈ کو مورد الزام قرار دیتا ہوں کیونکہ اگر وہ کمزور، اور غیر مستقل مزاج ہونے کے بجائے قوی ذہن کا مالک ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ سمجھوتے کے لیے لوگوں کو مجبور کر سکتا تھا۔“ [1]

اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی اور سانکے مل کر سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ ”لیکن وہ ملعون قدامت پسند سکریٹری آف اسٹیٹ کاندھا ڈال دیتا ہے اور اس کو ایک حماقت آمیز برتری کا خبط پیدا ہو جاتا ہے اور تمام پکے پکائے معاملات کو پھر بھٹی میں ڈال دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوبارہ پھر از سر نو معاملات اٹھانا پڑتے ہیں۔“ [2]

واقعہ یوں ہے کہ (انگلستان کی اس وقت کی) قومی گورنمنٹ کا جس کے وزیراعظم لیبر پارٹی کے لیڈر میکڈانلڈ تھے اور جن کو پارلیمنٹ میں قدامت پسند پارٹی کی حمایت حاصل تھی، کوئی ارادہ نہ تھا کہ اختیارات سے دستبردار ہوا جائے۔ سیموئل ہور نے ایک یادداشت میں اپنی کابینہ کو لکھا: ”مندوبین میں سے کوئی یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ اس وقت عقل اور تاریخ کا تقاضا کیا ہے۔ یہ کہ جب تک پارٹیاں خودمختار صوبوں کی حکومتوں کی شکل میں نہ آجائیں اور انہیں کچھ تجربہ نہ ہو جائے، ان میں کچھ صلاحیت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ یہ طے کر سکیں کہ مرکز میں حکومت کس طرح کی ہو، اس وقت تک وفاق کی بات کرنا قبل از وقت ہوگا۔ اگر یہ مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وفاق کی بات پانچ یا غالباً دس سال تک ملتوی ہو سکے۔“ [3]

قدامت پسندوں کو اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ لنکا شائر کے مفادات متاثر

1۔ ایضاً 14/نومبر 1931ء

2۔ ایضاً 7/دسمبر 1931ء

3۔ فلپس اور وین رائٹ (بحوالہ گزشتہ) ص 68 آر۔ جے مور کا مضمون ”دی میکنگ آف انڈیاز پیپرز فیڈریشن 35-1927“ اس میں وہ ہور کی کابینہ کو بھیجی ہوئی یادداشت مورخہ 9/نومبر 1931ء کا حوالہ دیتا ہے۔

ہوں گے اور چرچل کے چبھتے ہوئے فقروں کا بھی — پہلی گول میز کانفرنس میں جو ذمہ داری کے ساتھ وعدے کیے گئے تھے ان سے بچنے کے لیے صرف ایک طریقہ تھا، وہی پرانا فرسودہ طریقہ کہ جابرانہ طریقہ استعمال کیا جائے۔ (جس طرح) تاش کے کھیل میں جب کبھی شک وشبہ ہوتا ہے تو ترپ کے پتے کھیلے جاتے ہیں۔ 1931ء میں جب صورت حال مشکوک ہوگئی تھی تو، بقول ہور یہی کہا گیا تھا۔

''یہ معلوم ہے کہ 1886ء میں جب گلیڈ اسٹون نے سلطنت برطانیہ کو ایک منصوبے کے اعلان سے دہشت زدہ کر دیا تھا تاکہ آئرلینڈ والوں کو حکومت خود اختیاری (ہوم رول) مل جائے تو لارڈ رینڈلف چرچل نے السٹر (آئرلینڈ کا ایک علاقہ جس میں پروٹسٹنٹ مسلک کے لوگ رہتے ہیں) کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا تھا کہ اب تاریخی تاش کا پتہ کھیلا جا سکتا ہے۔ 1931ء میں جب گاندھی نے کانفرنس کے منصوبے کو رد کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ انگلستان میں اقتصادی بدحالی بھی پیدا ہوگئی تو انگلستان قدامت پسندوں اور متحدہ پارٹی کے لوگوں کے ہاتھ میں ہلالی کارڈ، ترپ کا پتہ بن گیا۔''[1]

اس پالیسی کے تحت کہ مسلمانوں کو خوش رکھا جائے اور کانگریس کو ٹھکرایا جائے ''اواخر 1931ء سے لے کر ایکٹ کے پاس ہونے تک کوئی ایسا کام نہیں کیا گیا جس سے برطانیہ کی بڑی سیاسی پارٹیاں فریب میں لائی جا سکتیں۔ بلکہ پالیسی کا رجحان تو یہ تھا کہ مختلف فرقوں کو متحد کرنے کے بجائے ہر ایک کو دوسرے جدا رکھو۔''

جب کانگریس والے جیل جا رہے تھے تو مسلمان فائدے اٹھا رہے تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کو پورا صوبائی درجہ مل گیا۔ سندھ کا صوبہ الگ ہوگیا۔ پنجاب میں قانونی طور پر کثیر تعداد میں نشستیں ان کے لیے مقرر ہوگئیں۔ اسی طرح بنگال میں 47.6 فی صدی

1۔ ایضاً، ص68

نشستیں ان کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ مختصر یہ کہ چار صوبوں میں وہ طاقت ور ہو گئے۔ ان کو جداگانہ انتخابات بھی مل گئے۔ [1]

10- گورنمنٹ کی جنگ کانگریس سے

کانفرنس سے مندوبین خالی ہاتھ ہندوستان واپس آئے۔ گاندھی جی کو انگلستان ہی میں خبر مل گئی تھی کہ ہندوستان میں حالات خراب ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس میں اپنی الوداعی تقریر میں واضح کر دیا کہ اب ان کے راستے الگ الگ ہو گئے ہیں اور اب ان کے راستے مختلف سمت یا بالکل مخالف سمتیں اختیار کریں گے۔

29/دسمبر کو جب گاندھی جی بمبئی وارد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندستان ہر قسم کے آرڈیننس سے گراں بار ہے یعنی غیر قانونی قوانین کا نفاذ ہے۔ 1931ء میں ایسے آرڈینس پندرہ سے کم نافذ نہیں کیے گئے مثلاً آرڈی ننس نمبر 8 جس کے تحت ملزم کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف مقدمہ چلانا تھا۔ آرڈی ننس نمبر 9 کے ذریعہ بنگال کے ترمیم شدہ تعزیری قانون 1930ء میں مزید ترمیم کی گئی۔ آرڈی ننس نمبر 11 کے تحت حکومت بنگال کو خصوصی اختیارات دیے گئے تھے تاکہ وہ دہشت پسندی کی تحریک کو دبا سکے۔ آرڈی ننس نمبر 12 کے ذریعے حکومت صوبہ متحدہ (اتر پردیش) کو خصوصی اختیارات دیے گئے تاکہ وہ نظم ونسق قائم رکھ سکے اور ان لوگوں کو سزائیں دے سکیں جو لگان وغیرہ نہ دینے کے لیے دوسروں کو اکساتے ہیں اور اسی طرح کے کئی فرمان شمال مغربی سرحدی صوبے میں نافذ کیے گئے تھے۔

گاندھی اروِن معاہدے کو گورنمنٹ نے اپنے عمل سے مسترد کر دیا تھا۔ ولنگڈن نے ہور کو مطلع کیا: ''دہلی معاہدہ اب ہر لحاظ سے مردہ اور ختم ہو چکا ہے بلکہ

---

1. ایضاً۔ ص 77

اسے جواہر لال نہرو اور عبدالغفار نے مار ڈالا ہے۔ ایڈورڈ ارون نے واقعی بڑی جرأت سے کام لیا تھا لیکن وہ بالکل ناکام ثابت ہوئے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا گورنمنٹ کو اپنے انتظامی امور میں ایک رکاوٹ محسوس ہوتی رہی اور کانگریس کو اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنے کے لیے آسانی مل گئی۔"[1]

کانگریس کو برطانوی افسروں اور ان کے وعدوں پر اب کوئی اعتماد نہیں رہا تھا۔ یہ عدم اعتماد دلوں میں اتنی شدت سے بیٹھ گیا تھا کہ گاندھی جی کی تاکید اور ارون کی ترغیب کا ذرا سا اثر بھی ہندوستانیوں پر نہ ہوا۔

کانگریسی لیڈر معاہدہ کی خلاف ورزیاں کرنے کا الزام گورنمنٹ پر لگاتے تھے اور سرکاری افسران اپنی جگہ پر کانگریسیوں کو خلاف ورزیاں کرنے کا مرتکب ٹھہراتے تھے۔

ایسے حالات میں حقیقی صلح وصفائی ناممکن تھی۔ خاص کر کانگریس والے مع گاندھی جی کے گول میز کانفرنس کی کارروائیوں سے بہت ناامید ہو گئے تھے۔ ان پر واضح ہو گیا کہ پہلی کانفرنس کے ابتدائی مرحلوں میں پر جوش اور پر امید فضا جو بن گئی تھی اب وہ تقریباً بالکل زائل ہو چکی تھی۔ (برطانیہ کی) قومی گورنمنٹ نے نومبر کے وسط ہی سے اصلاحات میں کسی قسم کی دلچسپی لینا ختم کر دی تھی کیونکہ گورنمنٹ کے مندوبین کے ذہن انگلستان کے اپنے اندرونی معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ کانفرنس کو جلد ختم کر دینے کی کارروائی نیز اس کے خاتمے پر میکڈانلڈ کی حوصلہ شکن اور مایوس کن تقریر یہ واضح طور پر اشارہ کر رہی تھیں کہ اب برطانوی گورنمنٹ کو ہندوستان کے مطالبات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

کانفرنس میں گاندھی جی کی شمولیت سے گورنمنٹ نے جو امیدیں لگا رکھی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ گورنمنٹ کا خیال تھا کہ گاندھی جی کانگریس کے مطالبات کو نرم یا کم

---

1. ٹمپل ووڈ (سیموئل ہور) پیپرس ولنگڈن بنام ایس۔ ہور، 26 دسمبر 1931ء

کر کے صلح کریں گے لیکن گاندھی جی نے کانگریس کے اس مطالبے پر اصرار کیا کہ فوراً آزادی دیدی جائے۔انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ اس تنظیم کے نمائندوں میں ہیں جو بلا لحاظ ذات پات، نسل، مذہب یا مفادات کے پورے ہندوستان کی نمایندگی کرتی ہے۔اروِن کے اعلانات پر بھروسہ کرتے ہوئے گاندھی جی یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی اور برطانوی مندوبین کے درمیان مساوی سطح پر مذاکرات ہوں گے یعنی برطانیہ ہندوستان کو اپنے برابر کے درجے کا سمجھے گا۔قدامت پسند پارٹی نے ان دعووں کو حد سے زیادہ مبالغہ آمیز اور نا قابل تسلیم قرار دے دیا۔

برطانیہ کی نیک خواہشات اور وعدوں پر اعتماد کم سے کم رہ گیا اور جب دسمبر 1931ء میں گاندھی جی ہندوستان واپس آگئے تو اس اعتماد کو از سر نو بحال کرنے کا موقع بھی جاتا رہا۔ ان کے ذہن پر یہ خیال مسلط ہو گیا تھا کہ اب دوبارہ جدوجہد شروع کرنا پڑے گی۔اپنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے ہندوستان اب برطانیہ پر کسی قسم کا بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔خود اعتمادی اختیار کرنا، تکلیفیں برداشت کرنا اور قربانیاں دینا، ہندوستان کے سامنے یہی راستہ اپنی منزل مقصود حاصل کرنے کے لیے رہ گیا تھا۔

گاندھی جی کی عدم موجودگی میں ہندوستان میں نہ صرف معاہدے کے شرایط کی خلاف ورزیاں کی گئیں بلکہ ظلم وستم کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان نفرت اور غصہ سے بھرا ہوا تھا کیونکہ گورنمنٹ نے لوگوں پر غیر قانونی قوانین اور آرڈی ننس یعنی فرمان نافذ کر رکھے تھے جن کے تحت نہایت تکلیف دہ سفا کیاں اور مظالم توڑے جا رہے تھے۔مثلاً گجرات کے کسانوں کی شکایات کی جو تحقیقات ہوئی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔یو پی کے کسانوں میں سخت بد دلی پھیلی ہوئی تھی لیکن گورنمنٹ زور ڈال رہی تھی کہ پورا لگان ادا کیا جائے۔ جب کوئی سہولت نہ ملی تو صوبائی کانگریس کمیٹی نے کانگریس

کے صدر سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ راست اقدام کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لیڈر جیل میں ڈال دیے گئے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں عبدالغفار خاں نے ایک لاکھ پٹھانوں کی رضا کارانہ فوج بنالی تھی جو خدائی خدمت گار کہلاتے تھے اور انہوں نے ان رضا کاروں کی فوج کو کانگریس سے وابستہ کر دیا تھا۔ گورنمنٹ اس نیم فوجی طاقت سے گھبرا اٹھی اور اس نے طے کیا کہ اسے دبا دیا جائے۔ عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی خاں صاحب اور ان کے بیٹے کونظر بند کر دیا گیا۔

بنگال میں دہشت پسند دوبارہ سر اٹھا رہے تھے اور گورنمنٹ نے انہیں دبانے کے لیے انتہائی سخت قدم اٹھائے۔ پریس کا منہ بند کر دیا گیا، مشکوک لوگوں کونظر بند کیا گیا اور پولیس کو آزادی دے دی کہ وہ جس طرح چاہے ان لوگوں سے نپٹے۔ سب سے زیادہ خراب حادثہ ہجلی کے نظر بندی کیمپ میں پیش آیا جہاں دو آدمی مر گئے اور کئی زخمی ہوئے۔

انڈیا لیگ نے 1936ء میں جو اپنا وفد ہندوستان بھیجا تھا اس نے درج ذیل بیان دیا:

"(1) ہندوستان میں سرکاری افسران نے ارون کے طریقہ کار اور اس کے معاہدے سے بغاوت کر دی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے گورنمنٹ کا وقار گر جائے گا اور کانگریس کو ایک برابر کے حریف کا درجہ مل جائے گا۔

"(2) یہ تاثر کہ دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمہ سے پہلے ہی گورنمنٹ نے ظلم کی پالیسی اختیار کرنا طے کر لیا تھا بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ دوسری شہادتوں کے علاوہ بمبئی پریسیڈنسی کے جنوبی اضلاع کے کمشنر نے پہلی جولائی 1931ء کو ایک خفیہ گشتی چٹھی نمبر پی۔ سی ایل 356 ان اضلاع کے افسروں کو بھیجی تھی جس میں بڑی

تفصیل سے احکامات دیے گئے کہ اگر سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ سر اٹھائے تو کیا کیا جائے۔

"(3) مقامی گورنمنٹ کے احکام، حکام کے اختیارات اور ان کے 'شکوک' کے خلاف کچھ کہنے کا اختیار ہندوستان کی رعایا کو حاصل نہیں ہے (4) اگر ہم یہ کہیں تو حق بجانب ہوں گے کہ فرامین Ordinances کے باعث بے دردی اور بے جا زیادتی کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ فرمان نافذ کرنے کی ذہنیت، برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات، نیز مستقبل کے ہندوستان کے لیے اتنا بڑا خطرہ بن گئی ہے اور ابھی تک بنی ہوئی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں اس سے بڑا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

برٹرینڈ رسل (مشہور برطانوی فلسفی) نے مجبور ہو کر اگر یہ الفاظ کہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "جرمنی میں نازیوں نے جو مظالم کیے تھے اس میں تو سب لوگ بڑی دلچسپی رکھتے تھے...... لیکن انگلستان میں اب شاید ہے کوئی ایسا شخص ہو جس کو یہ جاننے کی فکر ہو کہ برطانوی لوگ اسی طرح کے سخت مظالم ہندوستان پر کر رہے ہیں۔"[1]

بمبئی پہنچتے ہی گاندھی جی نے وایسرائے لارڈ ولنگڈن سے مراسلت شروع کردی۔ اس خط وکتابت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا لیکن یہ بات واضح ہو گئی کہ اب حاکم اور محکوم کے تعلقات کس سطح پر آ گئے ہیں۔ گاندھی جی کو یہ خوش فہمی تھی کہ پارلیمانی جمہوریت والے ملکوں میں مختلف پارٹی کے لیڈروں کیساتھ عام طور پر اخلاق برتا جاتا ہے اور ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کن بنیادوں پر اپنی پالیسیاں چلا رہی ہے۔ وہی اخلاق ان کے ساتھ بھی برتا جائے گا لیکن جب گاندھی جی نے یہ جاننا چاہا کہ گورنمنٹ

---

1 مقدمہ کتاب 'ہندوستان کی حالت (کنڈیشن آف انڈیا) از برٹرینڈ رسل۔ اس میں انڈیا لیگ نے 1932ء میں جو وفد ہندوستان بھیجا تھا اس کی رپورٹ درج ہے۔ اس وفد میں چار اشخاص تھے (1) مارلیس وھیلے (2) ایلن ولکنسن (3) لیونارڈ ڈبلیو، میٹرس اور (4) وی۔ کے۔ کرشن مینن

کن وجوہ کے تحت ظلم و جبر برت رہی ہے تو ولنگڈن نے اس درخواست کو گستاخی قرار دیا اور یہ ماننے سے قطعی انکار کر دیا کہ کانگریس کوئی بات پوچھنے یا کوئی معلومات حاصل کرنے کی حقدار ہے۔ اس نے کہا کہ گورنمنٹ اپنی حکومت چلانے میں کانگریس کے مشوروں کو قبول کرنے کی پابند نہیں ہے۔ سیموئل ہورنے وایسرائے کی پوری طرح تائید کی اور اس کو تاکید کی کہ کانگریس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے کوئی سودے بازی نہ کی جائے۔

سکریٹری آف اسٹیٹ نے صاف صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ کی کانگریس سے اب جنگ ہے کیونکہ کانگریس کا مقصود یہی ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعہ برطانیہ کی ہندوستان پر حکومت ختم کر دی جائے۔

ولنگڈن چونکہ ملک کے سب سے بڑے باغی سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جب گاندھی جی نے اس سے ملاقات کی درخواست کی تو اس نے ایک تار کے ذریعے گاندھی جی کو مطلع کر دیا کہ ہندوستان کی گورنمنٹ نے جو تدابیر بنگال، یو پی اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اختیار کی ہیں ان کے متعلق وہ کوئی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہے۔ گویا گاندھی جی کی درخواست کو بالکل مسترد کر دیا گیا اور گاندھی جی کی ان تمام التجاؤں کو جو پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لیے کی گئی تھیں، یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے یہ بھی یاد دلایا کہ اروِن نے کانگریس کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا کہ بعض صورتوں میں وہ سول نافرمانی پھر شروع کر سکتی ہے۔ اس بات پر بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

معاہدہ کے تمام دروازے اس طرح بند ہو گئے۔ اب خودداری کا تقاضا یہی تھا کہ اس چیلنج کا مناسب جواب دیا جائے تو اس میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یکم جنوری 1932ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ قرارداد منظور کی:

''مجلس عاملہ کی یہ رائے ہے کہ مختلف چھوٹے بڑے قوانین جو بعض صوبوں میں نافذ کیے گئے ہیں اور ہز ایکسی لنسی وایسرائے کا جو تار آیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کانگریس کے لیے گورنمنٹ سے تعاون قطعی ناممکن ہے تاوقتیکہ گورنمنٹ اپنی پالیسی کو یکسر تبدیل نہ کردے...... اگر گورنمنٹ کی طرف سے کوئی قابل اطمینان جواب نہیں آتا تو یہ مجلس عاملہ قوم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کردے اور ٹیکسوں کو ادا نہ کرے۔''[1]

اس کا جواب گورنمنٹ نے اس طرح دیا کہ نہایت جابرانہ قسم کے متعدد آرڈی ننس یکے بعد دیگرے نافذ کردیے۔ دو دن میں یعنی 2/جنوری اور 4/جنوری کو پانچ آرڈی ننس جاری ہوئے۔ بقیہ پانچ فروری سے لے کر جولائی تک جاری کیے گئے۔ ان آرڈی ننسوں کے ذریعہ گورنمنٹ اور اس کے افسروں کو ہر قسم کے اختیارات دیدیئے گئے تا کہ وہ نام نہاد امن وانتظام قائم رکھ سکیں۔ ٹیکسوں کی عدم ادائی کو روکیں۔ انجمنوں اور اداروں کو غیر قانونی قرار دیں خاص کر تعزیری عدالتوں سے اپیل کرنے کے حق کو محدود کردیں، دہشت پسندی کو روکیں، بعض جرائم پر سزا دینے کے لیے خاص طریقہ کار استعمال کریں، بدیسی سامان کے بائیکاٹ کو روکیں، وغیرہ وغیرہ۔

ان مؤثر حربوں سے گورنمنٹ لیس ہوگئی اور ان کا استعمال 4/جنوری 1923ء سے شروع کردیا گیا۔ ہر کانگریس ادارے، اس کی شاخوں اور حلیفوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بہت سے کانگریسی خواہ کسی قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہوں یا نہیں، قید کرلیے گئے اور ان کو سزائیں دی گئیں۔

پولیس کانگریسی لیڈروں پر ٹوٹ پڑی۔ گاندھی جی کو قید کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل کو بمبئی میں گرفتار کرلیا گیا اور راجندر پرشاد کو

1۔ پٹابھی سیتا رمیا: بحوالہ گزشتہ، جلد اول، ص 69-866

بہار میں۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری جواہر لال نہرو کو دو برس قید سخت کی سزا دی گئی اور پانچ سو روپے جرمانہ اور اگر جرمانہ نہ ادا کریں تو تین ماہ کی سزا اور تصدق احمد خاں شروانی، انصاری، راج گوپال اچاری، ستیہ مورتی، مدن موہن مالویہ، سروجنی نائیڈو، ابوالکلام آزاد، جمعیت العلماء کے مفتی کفایت اللہ اور بہت سے دوسرے لیڈر، ہر درجے کے اور ہر صوبے کے گرفتار کر کے عام قیدیوں کے ساتھ جیلوں میں بھر دیے گئے۔ تخمیناً ایک لاکھ سے زاید آدمی اس طرح سزایاب ہوئے۔

سکریٹری آف اسٹیٹ ہور نے جس دوہری پالیسی کا اعلان کیا تھا اس کا ایک جزو یہ تھا۔ بقول ان کے "ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ ہمارے اقتدار کو جو چیلنج دیا گیا ہے اسے دبانے کے لیے ہم ہر وہ طریقہ اختیار کریں گے جو ہماری طاقت میں ہے۔" [1]

پالیسی کا دوسرا جزو یہ تھا کہ اس نے خستہ ونحیف گول میز کانفرنس کو دوبارہ مجتمع کرنے اور اس کے بعد ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی بنانے کی کوشش شروع کردی تاکہ پارلیمنٹ میں (ہندوستان کے متعلق) کوئی قانون بنایا جاسکے۔

11-طریقۂ کار میں تبدیلی

اپنی ماہ جون کی تقریر میں ہور نے دستوری معاملے کے متعلق ایک نئے طریقہ کار کا اعلان کیا تھا۔ اس کے تحت ہندوستان کے دستور سے متعلق گورنمنٹ برطانیہ اپنی تجاویز ایک قرطاس ابیض (White Paper) میں درج کر کے پارلیمنٹ کے تمام ممبران کو بھیجے گی اور موجودہ دارالعوام میں اس کی مدت قیام ہی میں غور وفکر کے لیے ایک جامع قانون کی شکل میں پیش کردے گی۔

---

1 سر سیموئل ہور کی تقریر دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) میں بتاریخ 27/جون 1932ء از ہندوستانی سالانہ رجسٹر۔ 1932ء جلد اول ص 8-4

اس نئے طریقہ کار نے گول میز کانفرنس کی حیثیت بہت گھٹادی۔ بجائے اس کے کہ ایک ایسا اجتماع ہو جس میں برطانوی حکومت کے نمائندے ایک طرف ہوں اور ہندوستانی پارٹیوں اور ہندوستانی مفادات کے نمایندے دوسری طرف اور دونوں مساویانہ حیثیت سے باہم مل کر مذاکرات کے ذریعے نئے دستور کے اصول طے کریں، اب کانفرنس میں شامل ہندوستانی ممبروں کا مرتبہ صرف گورنمنٹ کو مشورہ دینے کا رہ گیا اور گورنمنٹ کو اختیار باقی رہ گیا کہ وہ ایسے مشوروں کو خواہ قبول کرے خواہ رد کردے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے سے پہلے بہت سی کمیٹیاں بنادی گئی تھیں کہ وہ ہندوستان جائیں اور حالات کی جانچ پڑتال کے بعد اپنی سفارشات پیش کریں۔ ان کمیٹیوں کے نام یہ تھے: (1) حق رائے دہندگی (Franchise) کی کمیٹی جس کے صدر لوتھیان تھے (2) وفاقی مالیاتی کمیٹی بہ صدارت ایوسٹس پرسی (3) ہندوستانی ریاستوں کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی بہ صدارت ڈیوڈسن۔ ان کے علاوہ ایک مشاورتی کمیٹی تھی جس میں گورنر جنرل کے علاوہ انیس دیگر ممبران تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ دوسری کمیٹیاں جو اپنی رپورٹیں تیار کریں ان پر غور وخوض کرنے کے بعد اپنے تبصرے کے ساتھ گورنمنٹ کو لندن بھیج دے۔ لیکن یہ کمیٹی بہت کم دنوں تک برقرار رہ سکی اس لیے کہ جب اس نئے طریقہ کار کا اعلان کیا گیا اس وقت تک کانگریس کے لیڈروں کو جیل میں بھرا جا چکا تھا بہ الفاظ دیگر وہ حاکمان ہند کی محفوظ حراست میں پہنچ چکے تھے اور ''ملک کی تنہا فعال سیاسی پارٹی کا'' [1] کا منہ بند کردیا گیا تھا۔

تاہم نیشنل لبرل فیڈریشن نے اعتراض کیا اور 27/ جولائی 1932ء کو اس نے مطالبہ کیا کہ ہمارے تعاون کی شرط یہ ہوگی کہ کانفرنس والے طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔ اگرچہ گورنمنٹ نے ان لوگوں کو راضی اور خوش رکھنے کی کوشش بعض

---

1 یورو پین ایسوسی ایشن ڈنر میں وایسرائے کی تقریر بتاریخ 30/دسمبر 1931ء

اوقات ضرور کی لیکن ان کے اسی اختلاف کو کبیدگی کی نظر سے دیکھا۔ گورنمنٹ اب اس نتیجے پر پہنچی کہ مشاورتی کمیٹی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لیے اس نے لبرل (آزاد خیال) لوگوں کے احتجاج اور اعتراض پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس پر سپرو، جیکار اور جوشی نے اس کمیٹی سے اپنے استعفے داخل کر دیئے۔

راج گوپال اچاری نے جو اس وقت قائم مقام صدر تھے یہ تبصرہ کیا: "سکریٹری آف اسٹیٹ نے اب واضح کر دیا ہے کہ ہماری خواہشات کے مطابق نہیں بلکہ کوئی برطانوی پارلیمانی کمیٹی غور وفکر کر کے جیسا کچھ طے کر دے گی اسی کے مطابق ہمارا دستور ہوگا۔" 1

ولنگڈن نے ہور کو لکھا: "مشاورتی کمیٹی بیکار چیز ہے، اس لیے اس نے اصرار کیا کہ گول میز کانفرنس کو پھر چلایا جائے تاکہ وہ تینوں کمیٹیوں کی رپورٹوں پر غور کرے اور ہندوستانی ریاستوں کے برطانوی ہند سے جو تعلقات ہیں اور خاص کران کے مالی حالات جیسے کچھ ہیں ان پر بھی غور کرے۔" 2

12-فرقہ وارانہ رعایتیں

گول میز کانفرنس کا تیسرا اجلاس بلانے سے قبل ریمزے میکڈانڈ نے 10/ اگست 1932ء کو ان فرقہ وارانہ رعایتوں کا اعلان کر دیا جس کے متعلق اس نے کانفرنس کے دوسرے اجلاس کی اپنی اختتامی تقریر میں وعدہ کیا تھا۔

رعایتوں کا یہ انعام مبنی تھا برطانیہ کے اس نظریے پر کہ ہندوستان ایک قوم نہیں بلکہ مجموعہ ہے نسلی، مذہبی، ثقافتی، ذات پات اور مفادات پر قائم گروہوں کا۔ 1909ء

1. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1942ء جلد دوم ص 33
2. ٹمپلِ۔ وڈ مراسلات (پیپرس) تار وایسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ مورخہ 28/جولائی 1932ء

میں مارلے اور منٹو نے 1919ء میں مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے اور 1930ء میں سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانی دستور کا ڈھانچہ اسی مفروضہ صدرنگی پر قایم کیا تھا۔ لیکن اگر ہندوستان کے سماجی نظام کے متعلق ان کو تشریح صحیح معلوم تھی تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے کیوں اپنا اتنا وقت اور اپنی قوت خودمختار حکومت کا منصوبہ بنانے بلکہ خودمختار اور جمہوری حکومت کے مقصود کو مان لینے میں تلف کردی۔ جو تمہیدات انہوں نے قایم کیں ان سے منطقی نتیجہ تو وہی نکل سکتا تھا جس کی چرچل نے وکالت کی تھی۔

اور اگر برطانوی لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ زندگی نری منطق نہیں ہے اور محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندوستان میں اب سماج کے ارتقا کا رجحان قومیت کی طرف ہو رہا ہے تب یہ امر اور بھی باعث حیرت ہے کہ اس رجحان کو قوی تر بنانے کے بجائے انہوں نے جداگانہ انتخاب رائے کی اسکیم کو کیوں نافذ کیا جس کی وہ خود مذمت کر چکے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قومی یک جہتی کے لیے تباہ کن ہے۔

بہرحال، خواہ برطانوی حاکموں نے دانستہ راستہ بند کردیا ہو خواہ وہ ایسے چکر میں پڑ گئے ہوں کہ کوئی صحیح حل ان کی سمجھ میں نہ آتا ہو، میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل جس طرح پیش کیا ہندوستان کی آزادی کی خواہش کے لیے اس سے زیادہ کوئی چیز ضرر رساں نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے تحت گورنمنٹ نے درج ذیل اقلیتوں کو تسلیم کرلیا۔

(1) مسلمان (2) پست ذاتیں (3) پس ماندہ طبقے (4) ہندوستانی عیسائی (5) اینگلو انڈین (6) یوروپین (7) مزدور (8) زمیندار (9) تجارتی اور صنعتی طبقہ (10) یونیورسیٹیاں (11) سکھ۔ ہر اقلیت کے لیے مقررہ تعداد میں نشستیں متعین کردی گئیں اور ہر ایک کے لیے مخصوص طور پر جداگانہ رائے دہندگی کا حق انتخابات میں دیا گیا۔

اس اسکیم نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ دیگر فرقوں کو بھی یہ سمجھنے پر مائل کردیا کہ وہ

ایسے قومی اجزا ہیں جن کے مخصوص مفادات عام ہندوستانیوں سے الگ ہیں۔ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور قومی یک جہتی کے شعور کو پنپنے سے روکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہ ہوسکتا تھا۔

جداگانہ فرقہ وارانہ انتخاب کا بنیادی اصول کیوں خراب تھا، اس کے وجوہ کو دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو نوٹ کرلیا جائے کہ اس مذموم اصول کو ہر ممکن طریقے سے پھیلایا گیا تاکہ آئندہ ایک خودمختار حکومت کا قیام ناممکن ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس اسکیم میں یہ بات مضمر تھی کہ ہندستان میں جو پروگرام یا جو پارٹیاں بنیں گی خواہ وہ مرکز میں ہوں خواہ صوبوں میں، وہ اقتصادی، سیاسی یا سماجی بنیادوں پر بننے کے بجائے مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر قایم ہوں گی۔ اس طرح بنیاد سے لے کر اوپر کی منزلوں تک پورا ڈھانچا— حلقہ جات انتخاب، انتخابات، وزارتیں۔ مذہبی بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔

لیکن نمائندوں کی تعداد مقرر کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا۔ برطانوی لوگوں کو ہندوؤں سے جو پرخاش تھی اسے بڑی چالاکی سے مخفی رکھا گیا اور مسلمانوں کی طرف جو میلان خاطر تھا اسے یوں ظاہر کیا گیا گویا ان کے ساتھ انصاف کیا جارہا ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاہی مفادات کا اس طرح تحفظ کیا گیا کہ اگر مسلمان کبھی بدل جائیں یا ہندو مخالفت پر آمادہ ہو جائیں تو ان کا کوئی نقصان نہ ہو۔ مثال کے طور پر مرکز پر جس طرح کا انتظام کیا گیا اسے دیکھیے۔ یہ طے کیا گیا کہ وفاقی مجلس قانون ساز کے ایوان زیریں میں نشستوں کی کل تعداد دوسو پچاس ہوگی۔ مسلمانوں کے لیے 33 فیصدی یعنی 85 نشستیں مقرر کی گئیں اور ہندوؤں کے لیے 105 پس ماندہ طبقے کے لیے 19 اور بقیہ فرقوں اور مفادات کے لیے 44- اس طرح ہندوؤں کی کثیر آبادی کو اقلیت بنادیا گیا (105 ہندو اور 19 پس ماندہ طبقہ 124 کل 250 میں سے)۔

مسلمانوں کو اتنا ہی حصہ مل گیا جتنا وہ چاہتے تھے لیکن نشستوں کی تقسیم اس ڈھنگ سے کی گئی کہ کوئی فرقہ اپنے بل بوتے پر طاقت نہ حاصل کر سکتا تھا۔

اس طرح سازشوں، ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری سے مل جانے اور بے قاعدہ اور بے ضابطہ گٹھ جوڑ کرنے کے لیے کھلی چھوٹ دے دی گئی۔

ان صوبوں میں بھی مسلمانوں کو رعایت دی گئی جہاں ان کی تعداد کم تھی اور ہندوؤں کی اکثریت تھی مثلاً مدراس کے صوبے میں مردم شماری کی بنیاد پر صرف 17 نشستیں ملنا چاہئے تھیں لیکن 29 دی گئیں۔ یوپی میں 35 کے بجائے 66 ملیں۔ بہار میں 20 کے بجائے 40 - مدھیہ پردیش میں 5 کے بجائے 14 - اس کے برخلاف جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں مسلمانوں کی نمایندگی تو کم رکھی گئی لیکن ہندوؤں کو اسی مناسبت سے رعایت نہیں دی گئی جس مناسبت سے مسلمانوں کو ہندو اکثریت والے صوبوں میں دی گئی تھی۔

دو اہم صوبوں، پنجاب اور بنگال میں جہاں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جہاں مسلمان بہت قوت کے ساتھ حکومت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ بڑی ہوشیاری سے مزاحمتیں کھڑی کر دی گئیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی وہاں کی کل آبادی کا 57 فی صد تھی لیکن ان کو صرف 49 فیصدی نشستیں دی گئیں یعنی کل 175 نشستوں میں سے 84، ہندوؤں کی آبادی 27 فی صد تھی ان کو 27 فیصدی نشستیں دی گئیں یعنی 42 ہندوؤں کو اور 8 اچھوتوں کو، سکھوں کی آبادی کل آبادی کا 13 فی صد تھی لیکن ان کو 18 فیصدی یعنی 31 نشستیں ملیں۔ اس طرح مسلمانوں کو روک دیا گیا کہ وہ اپنی قانونی طور پر جائز طاقت نہ حاصل کر سکیں۔

بنگال میں اس سے زیادہ عجیب صورت حال تھی۔ وہاں کل آبادی میں مسلمان 55 فی صد تھے اور ہندو 43 فی صد۔ وہاں کو نشستوں میں مسلمانوں کا حصہ صرف 47.6

فی صد رکھا گیا۔ ہندوؤں کا 32 فی صد اور یوروپین اور دیگر لوگوں کو جن کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں بہت کم تھی 20.4 فی صد۔ مسلمانوں کی نشستیں 119 تھیں۔ ہندوؤں کی 80 (مع 30 نشستیں اچھوتوں کی) یوروپین حضرات کو 11، اینگلو انڈین کو 4، عیسائیوں کو 2، اہل تجارت وصنعت کو 19، زمینداروں کو 5، یونیورسٹیوں کو 2، مزدوروں کو 8، کل تعداد 250 - بنگال کو جو رعایتیں دی گئیں، اس میں یوروپین حضرات کو خاص طور سے زیادہ مراعات دی گئیں اس کے دو اسباب ہیں: (1) پہلی وجہ تو یہ کہ اس طرح برطانوی لوگوں کی ہندوستان میں لگی پونجی کی حفاظت ہو سکتی تھی (2) دوسرے یہ کہ یوروپین لوگ دو بڑے فرقوں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں طاقت کا توازن قایم رکھ سکتے تھے۔

13 - گاندھی جی ان فرقہ وارانہ رعایتوں کا مقابلہ کرتے ہیں

ان رعایتوں سے ہندو فرقے میں بڑی بددلی پھیل گئی۔ گاندھی جی نے جیل میں ہونے کے باوجود یہ طے کرلیا کہ وہ اپنی تمام قوت سے ان مراعات کا مقابلہ کریں گے کیونکہ ان میں بڑی شرارت بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے 18 راگست کو وزیر اعظم کو ایک خط لکھا جس میں مطلع کیا کہ وہ 'مرن برت' رکھ لیں گے اگر گورنمنٹ نے پست طبقے کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول رد نہ کیا۔ ان کے نزدیک جداگانہ انتخاب کے زہر کا انجکشن لگانے کا مطلب یہ تھا کہ ہندو فرقہ منتشر ہو جائے اور پست طبقے کو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے۔

گاندھی جی کے اس احتجاج کا جواب وزیر اعظم کی طرف سے ایسا نہیں ملا جو انہیں مطمئن کرسکتا۔ چنانچہ انہوں نے 20 ستمبر کو اپنا تاریخ ساز 'برت' شروع کردیا۔ 'برت' رکھنے کی ہوش ربا خبر نے ملک میں ہیجان پیدا کردیا۔ شانتی نکیتن

میں ٹیگور نے محسوس کیا: 'ہندوستان پر آج ایک کالا سایہ ہے جو چھایا جا رہا ہے، بالکل اس طرح جیسے سورج گرہن کے موقع پر ہوتا ہے'' اور یہ بھی کہا کہ '' سارے ملک کے باشندے سخت درد انگیز پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اس درد کی ہمہ گیری میں بڑی عظمت ہے اور جو باعث تسکین ہے۔ مہاتما جی نے اپنی ساری زندگی وقف کر کے ہندوستان کو درحقیقت اپنا بنالیا ہے اب وہ اپنی انتہائی قربانی دینے کے عزم کو پورا کر رہے ہیں۔'' [1]

مالویہ نے ہندوؤں اور پست طبقے کے لیڈروں سے گزارش کی کہ ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور 'رعایتی انعام' کے بجائے ایک ایسا حل نکالیں جس پر سب متفق ہوں۔ چنانچہ لیڈران اکٹھا ہوئے اور ایک سمجھوتے پر متفق ہونے کے بعد انہوں نے وزیر اعظم کو تار بھیجا اور ان پر زور دیا کہ وہ فوری کارروائی کر کے اس 'رعایتی انعام' کو کالعدم قرار دے کر اس سمجھوتے پر عمل پیرا ہوں۔ وزیر اعظم نے مجوزہ معاہدہ (سمجھوتہ) منظور کر لیا اور حکومت ہند نے اپنے اس فیصلے کا اعلان اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں کر دیا۔ اس پر گاندھی جی نے 24 ستمبر کو اپنا 'برت' توڑ دیا۔

14- کانفرنس کا تیسرا اجلاس

جب یہ تکلیف دہ ڈراما ہندوستان کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا تھا، لندن میں ایک اور تماشے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ گول میز کانفرنس کے ایک نئے اجلاس کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن اب کے یہ پچھلے ڈھنگ کی کانفرنس نہ تھی۔ یہ تیسری کانفرنس صرف ایک قسم کی پرفریب نمائش تھی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس میں شامل ہونے والے لوگ ہمسری اور برابری کا دعویٰ کرتے ہوئے ہندوستان کے

1۔ سالانہ ہندوستانی رجسٹر 1932ء جلد دوم ص 246

آئین (دستور) کے لیے اصول طے کریں۔ اس میں مدعو کیے جانے والے لوگ تبدیل کردیے گئے۔ جناح کو نہیں بلایا گیا۔ ہندوستانی ریاستوں کو اس کی کارروائیوں میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی اس لیے والیان ریاست خود نہیں آئے بلکہ اپنے وزیروں اور دوسرے افسروں کو بھیج دیا۔ برطانوی مندوبین تو یکسر بدلے ہوئے تھے۔ لیبر پارٹی کے ممبروں نے جو وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کو غدار سمجھ کر اس سے تعاون نہیں کررہے تھے انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

سائمن کو جسے کانفرنس کے پہلے دونوں اجلاسوں میں ویج وڈ بین کے سخت اعتراض کے باعث شامل نہیں کیا گیا تھا، اب کے بلالیا گیا۔ اسی طرح ارون اور قدامت پسند پارٹی کے بہت سے لوگوں کو دعوت دی گئی۔

کانفرنس کا بہت سا ابتدائی کام تو وہ کمیٹیاں پہلے ہی کرچکی تھیں جنہیں دوسری کانفرنس میں قایم کیا گیا تھا۔ اب کانفرنس کے سامنے کوئی بنیادی مسئلہ نہ تھا اور اسے صرف تفصیلات طے کرنا تھیں۔ اگرچہ ان میں بعض تفصیلات اہم تھیں پھر بھی ان کارروائیوں میں کسی قسم کا جوش دیکھنے میں نہیں آیا۔ کانفرنس کے جلسے 17/نومبر سے 24/دسمبر تک ہوتے رہے۔ آخری جلسے میں دو اہم تقریریں ہوئیں۔ پہلی تو سپرو کی وہ تقریر تھی جس میں انہوں نے گورنمنٹ سے گزارش کی کہ دستور کا مسودہ بناتے وقت حکومت اس بات کو نہ بھولے کہ دستور ایسا ہو جو ہندوستان کے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ انہوں نے کہا: ''اگر وہ خود اور ان کے رفقا اس قابل نہ ہوں گے کہ کانگریسیوں کو مطمئن کرسکیں تو ملک کو رضامند کرنے کے امکانات بہت محدود رہیں گے۔'' انہوں نے مزید یہ بھی کہا: ''کانگریس سے اپنے اختلافات کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مسٹر گاندھی کا تعلق ہے ان کی شخصیت میں ہندوستان کی

خودداری اور حب الوطنی بدرجہ اتم موجود ہے۔"[1]

دوسری اہم تقریر، سکریٹری آف اسٹیٹ، سیموئل ہور کی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کانفرنس کے کارہائے نمایاں بتانے کے بعد سپرو کی اپیل کا جواب دیا اور انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کی گزارشات کو پوری طرح دھیان میں رکھیں گے۔

15-ایکٹ کا آخری مرحلہ

گول میز کانفرنس ختم ہوگئی۔ گورنمنٹ نے ایک قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) 15/مارچ 1933ء کو شایع کیا جس میں (رائج کیے جانے والے) دستور کا پورا خاکہ دیا ہوا تھا۔ اس تحریر (قرطاس ابیض) میں کم وبیش سائمن کمیشن کی تمام سفارشات شامل کر لی گئی تھیں لیکن اس کے دوسرے حصے میں مرکز میں ایک وفاقی ہندوستانی حکومت کی اسکیم شامل کردی گئی تھی جس پر اس وقت سے عمل ہو سکے گا جب بعض شرایط (مثلاً جب کئی ریاستیں وفاق سے اپنا الحاق منظور کرلیں) پوری ہوجائیں گی۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں تینوں پارٹیوں نے قرطاس ابیض کا خیر مقدم کیا۔ لیکن دارالعوام میں لیبر پارٹی کی طرف سے ایٹلی نے ایک بیان پڑھا جس میں "ہندستانیوں کے حق خود اختیاری اور خود مختار حکومت بنانے کے حق کو" تسلیم کیا گیا تھا۔ اس نے قرطاس پر یہ نکتہ چینی کی کہ "اس میں ہم نے جو اصول مقرر کیے تھے اور جو وعدے کیے تھے ان کی صریح خلاف ورزی ہے۔" لیبر پارٹی نے توجہ دلا کر یہ ترمیم پیش کی کہ اسمیں درجہ نوآبادیات کا جو فقرہ لکھنے میں چھوڑ دیا گیا ہے شامل کردیا جائے۔ لیکن یہ ترمیم نامنظور ہوگئی۔

ہربرٹ سیموئل نے قرطاس کا خیر مقدم کیا اور لبرل پارٹی کی طرف سے اس کی

1۔ ایضاً ص 409

تائید کی۔ لیکن قدامت پسند پارٹی کے انتہا پسندوں نے جس میں ونسٹن چرچل سب سے زیادہ زبردست تھا قرطاس ابیض کی اسکیم پر بڑے سخت لفظوں میں تنقید کی۔

27/ مارچ 1933ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے دارالعوام میں تجویز پیش کی کہ دارالعوام اور دارالامرا دونوں ایوانوں سے بعض منتخب ممبران پر مشتمل ایک مشترک کمیٹی بنادی جائے جو قرطاس ابیض میں پیش کی ہوئی اس اسکیم پر غور وخوض کرے جو ہندوستان میں دستوری اصلاحات لانے کے سلسلے میں گورنمنٹ نے بنائی ہے۔

اس نے مجوزہ اسکیم کی سفارش کرتے ہوئے گزارش کی کہ ایوان ایک مضبوط اور پختہ نظر کمیٹی کے قیام کی منظوری دیدے تاکہ یہ کمیٹی اس اسکیم کی معقولیت کی جانچ کرسکے۔ اس نے ان ممبروں کے اندیشوں کو دور کیا جو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی مجالس قانون ساز میں انتہا پسند زیادہ تعداد میں بھر جائیں گے اور دستور کو ناقابل عمل بنادیں گے۔ اس نے ان ممبروں کو بتایا کہ اسکیم کا خاکہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ انتہا پسند لوگوں کی اکثریت نہ وفاقی مرکز میں ہو سکے گی نہ صوبائی مجالس قانون ساز میں۔ مزید یہ بھی بتایا کہ اسکیم میں برطانوی مفادات کے لیے اور اقلیتوں کی حفاظت کے لیے کافی تحفظات رکھے گئے ہیں۔

یہ تجویز بڑی اکثریت سے منظور کرلی گئی۔

اپریل میں اسی طرح کی تجویز دارالامرا میں رکھی گئی اور اتفاق رائے سے منظور ہوگئی۔

دونوں ایوانوں کی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی اپریل میں تشکیل دیدی گئی اور لارڈ لن لتھ گو اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس مشترکہ کمیٹی کو مشورہ دینے کے لیے ہندوستانی مندوبین نے (جس میں 21 ممبر برطانوی ہند سے اور 7 ریاستوں سے چنے گئے تھے) مختلف شہادتوں کا بیان قلمبند کرنے اور بحث ومباحثے میں حصہ لیا۔ اس کمیٹی کی

نشستیں اٹھارہ مہینے تک ہوتی رہیں اور پھر اس کی رپورٹ پارلیمنٹ میں اکتوبر 1934ء کے آخر میں پیش کردی گئی۔

اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک مسودہ قانون (بل) تیار کیا گیا جو 19/دسمبر 1934ء کو پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ دونوں ایوانوں میں یہ بھاری اکثریت سے منظور کرلیا گیا اور ملک معظم نے 4/اگست 1935ء کو اپنی شاہی منظوری بھی دیدی۔

16- گاندھی جی اور ہریجن

پونا معاہدہ کے بعد گاندھی جی نے چھوت چھات کے خلاف اپنی مہم جاری کردی تھی۔ فروری 1933ء میں انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ہریجن نامی اپنے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے نکالا۔ پرانے راسخ العقیدہ ہندوؤں نے اس اصلاح کی مخالفت کی۔ ان سے امید بھی یہی تھی لیکن تعجب اس پر ہے کہ امبیڈکر نے بھی پونا معاہدہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیا۔ گاندھی جی نے ان حالات سے پریشان ہوکر یکبارگی طے کرلیا کہ وہ دوسرا 'برت' رکھیں گے۔ چنانچہ 8/مئی کو انھوں نے یرودا جیل میں اپنا اکیس دن کا برت شروع کردیا۔

اسی رات کو گورنمنٹ نے ایک اعلانیہ شائع کیا جس میں گاندھی جی کو رہا کردینے کا فیصلہ شائع کیا۔ برت کی حالت میں وہ یرودا سے پونا میں لیڈی تھیکر سے کے گھر لیجائے گئے۔ رہائی پاجانے پر انھوں نے پہلی بات یہ سوچی کہ ملک میں ہریجنوں کی حالت سدھارنے کے لیے پورے ملک میں ایک فضا پیدا کی جائے۔ انھوں نے کانگریس کے قائم مقام صدر، یعنی خود کو مشورہ دیا کہ سول نافرمانی کی تحریک عارضی طور پر روک دی جائے اور گورنمنٹ سے کہا کہ وہ تمام سول نافرمانی کرنے والوں کو جیل سے رہا کردے لیکن ولنگڈن نے اس رائے کو ماننے سے انکار کردیا یہ کہہ کر کہ جب تک غیرمشروط

طریقے پر سول نافرمانی کی تحریک ختم نہیں کردی جاتی رہائی نہیں دی جاسکتی۔

سول نافرمانی کی عوامی تحریک کو عارضی طور پر ملتوی کرنے کا ردعمل بعض کانگریس لیڈروں پر بہت ناموافق ہوا۔ جیسا کہ فروری 1922 میں چوراچوری کے واقعے کے بعد ہوا تھا۔ وٹھل بھائی پٹیل اور سبھاش چندر بوس نے وائنا سے جہاں وہ بحالی صحت کی خاطر قیام پذیر تھے ایک بیان اس قسم کا جاری کیا:

''مسٹر گاندھی نے ابھی حال میں سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کرنے کا کام کیا ہے۔ وہ اعتراف شکست کی حیثیت رکھتا ہے.......... ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ مسٹر گاندھی بہ حیثیت ایک لیڈر کے ناکام رہے اس لئے اب وقت آ گیا ہے کہ کانگریس کی بنیادی طور پر از سرنو تنظیم ایک نئے اصول اور قاعدے کے تحت کی جائے جس کے واسطے ایک نیا لیڈر ضروری ہوگا۔'' 1

ایسے برہم لیڈروں کی تنقید اور گورنمنٹ کے سخت رویے کے باعث لازمی ہو گیا کہ کانگریسی لوگ صورت حال کا از سرنو جائزہ لیں۔ چنانچہ 12/ جولائی کو پونا میں ایک غیر رسمی کانفرنس آئندہ کے لیے طریقہ کار سوچنے کے لیے منعقد ہوئی۔ اس میں یہ طے ہوا کہ گاندھی جی وائسرائے سے ملاقات کی کوشش کریں تاکہ کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔

گاندھی جی نے اس فیصلے کے تحت وائسرائے کو خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کی۔ لیکن یہ درخواست یہ کہہ کر نامنظور کردی گئی کہ حصول ملاقات کی شرط، یعنی سول نافرمانی کو ختم کردینے کی بات ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

اس صورت حال سے حکومت سے کسی قسم کی صلح ناممکن ہوگئی۔ اس لیے اب یہ طے کیا گیا کہ سول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کردی جائے۔ گاندھی جی نے اپنے

---

1 سیتارمیا، بحوالہ گزشتہ جلد اول، ص 942

سابرمتی آشرم کو جس میں ان کے تعمیری کام کرنے کے لیے تربیت یافتہ کارکن موجود رہتے تھے توڑ دیا اور وردھا چلے گئے۔ ہزاروں کانگریسی ضلعوں میں انفرادی طور سے ستیہ گرہ کرنے کے لیے جمع ہو گئے اور اگست 1933 سے مارچ 1934ء تک حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ گورنمنٹ ان پر چھاپہ مار کر ان کو جیلوں میں بھرتی رہی۔

یکم اگست 1933ء کو گاندھی جی پھر گرفتار کر لیے گئے اور یرودا جیل بھیج دیے گئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور انہیں ایک سال کی قید کی سزا دی گئی۔ اس مرتبہ ان کی یہ درخواست کہ ان کو جیل کے اندر اپنا سماجی اصلاح کا کام کرنے کی سہولتیں دی جائیں نامنظور کر دی گئی۔ اس پر انہوں نے طے کیا کہ 16/اگست سے وہ غذا ترک کر دیں گے۔ چنانچہ غذا ترک کر دینے کے بعد جب ان کی حالت جلد ہی بہت نازک ہو گئی تو گورنمنٹ نے فوراً 23/اگست 1933ء کو انہیں رہا کر دیا۔

اس قبل از وقت رہائی نے ان کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ ان کی شائستگی اور اخلاقی حس نے انہیں اپنی اس سیاسی تحریک کو دوبارہ جاری کرنے کی اجازت نہیں دی جس پر انھیں عدالت نے جیل میں ڈال دیا تھا جب تک کہ ایک سال کا وقفہ 3/اگست 1934ء تک پورا نہ ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے طے کیا کہ اس عرصہ میں وہ صرف اپنا ہریجن سدھار کا کام کرتے رہیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے نومبر 1933ء سے ملک بھر کا دورہ کرنا شروع کر دیا اور جنوبی صوبوں نیز بہار، بنگال، آسام اڑیسہ، مہاراشٹر، سندھ، پنجاب اور اتر پردیش کا دورہ کر کے اگست 1934ء میں واپس ہوئے۔

بہار میں انہوں نے اپنا زیادہ وقت ان برباد لوگوں کی امداد میں گزارا جو وسط جنوری 1934ء کے اس خوفناک زلزلے کی زد میں آ گئے تھے جس میں ہزاروں لوگ مر گئے تھے اور جس نے کروڑوں روپے کی املاک تباہ کر دی تھی۔ ہزاروں ایکڑ زرخیز

زمینوں کو تہس نہس کر دیا تھا اور بہت سے دریاؤں کے راستے بدل دیے تھے۔
اڑیسہ میں وہ بہت سے گاؤں میں پیدل چل کر گئے۔ اس طرح سینکڑوں میل طے کیے۔

ان کا مقصد ہریجن سدھار کا پیغام پھیلانا اور اچھوتوں میں کام کرنے کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ دس مہینے کے دورے میں انھوں نے 12300 میل کا سفر کیا اور آٹھ لاکھ روپے سے زیادہ چندہ جمع کر لیا۔ اس دورے سے اونچی ذات کے ہندوؤں کا ضمیر بیدار ہو گیا۔ وہ اس طرح معلوم ہوا کہ جب کیرالا کے گرووایور مندر میں اچھوتوں کے داخلے کی اجازت کے لیے ووٹ ڈالے گئے تو وہ داخلے کی موافقت میں آئے۔ اس قصبے کے 54 فیصدی ووٹروں نے موافقت میں ووٹ ڈالے، 9 فیصدی مخالفت میں، 8 فیصدی غیر جانب دار ہے اور 27 فی صدی نے ووٹ نہیں ڈالا۔
اس بیداری کا ایک اور ثبوت اس سے بھی ملا کہ مرکزی اور مدراس کی مجالس قانون ساز میں چھوت چھات ختم کرنے کے لیے مسودۂ قانون (بل) پیش کیے گئے۔
لیکن کٹر ہندوؤں نے اس اصلاحی تحریک کو بالکل برداشت نہیں کیا۔ بعض انتہا پسندوں نے تو گاندھی جی کو مار ڈالنے کی کوشش کی لیکن خوش قسمتی سے وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

17- سوراج پارٹی کا احیا

گاندھی جی کے دورے کے دوران بعض سیاسی مسئلے ان کی توجہ کو منتشر کرتے رہے۔ دو سوال خاص اہمیت کے تھے اور دونوں کا تعلق کانگریس کے پروگرام سے تھا۔
گاندھی جی نے تو کانگریسیوں کی غیر رسمی کانفرنس کے مشورہ کے تحت عوامی سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کر دی تھی اور انفرادی طور پر سول نافرمانی کرنے کی رائے کے

موافق ہو گئے تھے۔ لیکن کانگریس میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس فیصلے سے مطمئن نہ تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ نافرمانی ہوتو عوامی سطح پر یا ہو وہ پھر بالکل نہ ہو۔ دوسرے گروہ کی رائے یہ تھی کہ ملک اب اس موڈ میں نہیں ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے کی مہم میں حصہ لے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پرانی سوراج پارٹی کو از سر نو زندہ کیا جائے تاکہ الکشن میں حصہ لے کر مجلس قانون ساز میں داخل ہو جائے۔ لیکن گاندھی ان سوالات کا حل اس طرح سوچتے تھے کہ جہاں تک قانون کی خلاف ورزی کرنے کا سوال ہے تو کانگریس کی سرپرستی میں لوگ انفرادی طور پر یہ تحریک جاری رکھیں۔ جہاں تک سوراج پارٹی کو از سر نو زندہ کرنے کا سوال ہے اس کی انہوں نے کھلے دل سے تائید کی اگرچہ وہ ذاتی طور پر اس بات پر عقیدہ رکھتے تھے کہ کونسلوں میں جا کر کام کرنا کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

19 رمئی 1934ء کو گاندھی جی نے پٹنہ میں کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی کہ ایک بورڈ بنایا جائے جس میں انصاری اور مالویہ ہوں اور یہ دونوں دیگر ممبران کو منتخب کریں جو تعداد میں پچیس سے زاید نہ ہوں۔ یہ بورڈ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی زیر نگرانی انتخابات (الیکشن) کرائے۔ جب کانگریس کی مجلس عاملہ سے کہا گیا کہ وہ پارلیمنٹری بورڈ کو ضروری ہدایتیں دے تو اس نے قرطاس ابیض کی تجاویز اور فرقہ وارانہ مراعات کے متعلق کانگریس کی پالیسی کی وضاحت کر دی۔ اس نے اپنی پیشتر کی رائے کو مکرر پیش کرتے ہوئے 'قرطاس' کی مذمت کی، اس لیے کہ وہ کانگریس کے نصب العین سے بہت کم تر درجے کی چیز تھی۔ اس نے پھر کہا کہ قرطاس ابیض کے بجائے ہم صرف اسی آئین سے مطمئن ہو سکتے ہیں جو بالغ رائے دہندگی کی بنا پر منتخب کردہ ممبران کی دستور ساز اسمبلی نے تیار کیا ہو۔ جہاں تک فرقہ وارانہ مراعات کا سوال ہے کانگریس کی پوزیشن یہ ہے کہ چونکہ کانگریس ہندوستان

کے تمام فرقوں کی نمایندگی کرتی ہے اور اس میں فرقہ وارانہ مراعات کے متعلق اختلاف رائے ہے اس لیے جب تک اختلاف رائے ہے وہ فرقہ وارانہ مراعات کو نہ رد کرتی ہے نہ قبول کرتی ہے۔

مجلس عاملہ کے فرقہ وارانہ مراعات کے متعلق اس فیصلے کے نتائج افسوس ناک ہوئے۔ پارلیمنٹری بورڈ کے دو ممبران مالویہ اور اینے نے استعفا دے دیا۔ ان دونوں نے کلکتہ میں ایک کانفرنس کی اور ایک نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے ایک نئی پارٹی قایم کی جس کا مقصد فرقہ وارانہ مراعات اور قرطاس ابیض کی اسکیم دونوں کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔

26/ اکتوبر تا 28/ اکتوبر 1934ء تک نیشنل کانگریس کا باضابطہ اجلاس دو سال کے بعد پہلی مرتبہ راجندر پرشاد کی صدارت میں بمبئی میں ہوا۔ کانگریس نے فرقہ وارانہ مراعات پر مجلس عاملہ کی قرارداد کی توثیق کی اور گاندھی جی نے اس قومی جماعت سے جو استعفیٰ دے دیا تھا اسے اظہار افسوس کے ساتھ منظور کر لیا۔

کانگریس کا اجلاس ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ الیکشن کی مہم شروع ہوگئی۔ یہ الیکشن گورنمنٹ کے دو پسندیدہ مفروضات کے لیے ایک چیلنج تھا: (1) پہلا یہ کہ گورنمنٹ سمجھتی تھی کہ قرطاس ابیض میں مندرج دستوری تجاویز ہندوستانیوں کے لیے عام طور سے قابل قبول ہیں اور کانگریس کا مطالبہ قبول نہیں (2) یہ دوسرے یہ کہ گورنمنٹ نے کانگریس سے جو معرکہ آرائی کر رکھی تھی اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کو دبانے کے سلسلے میں جو سخت اقدام اٹھائے ہیں اس فعل سے ہندوستانیوں کی کثیر تعداد رضامند ہے۔

لیکن لوگوں نے ان دونوں مفروضات کا جواب اس طرح دیا کہ گورنمنٹ کو الیکشن میں مکمل اور زوردار شکست ہوگئی۔ انتخابات سے بلاشک وشبہ واضح ہوگیا کہ کانگریس کو لوگوں کا مکمل اعتماد حاصل ہے اور وہ سب کانگریس کی اس بات کی تائید

کرتے ہیں کہ برطانوی پارلیمنٹ کو ہندوستان کے لیے کوئی دستور بنانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

1935ء میں جو اسمبلی قایم ہوئی وہ 1919ء کے ایکٹ کے تحت مرکزی مجلس قانون ساز تھی۔ اس میں 145 ممبر تھے جن میں 40 نامزد تھے (26 سرکاری افسران، 26 غیر سرکاری، ایک نمائندہ برار) اور 104 منتخب شدہ نمائندے دو قسم کے تھے (1) جنھیں عام رائے دہندگی سے چنا گیا تھا (2) وہ جنہیں مخصوص رائے دہندگی سے منتخب کیا گیا تھا۔ اول الذکر کے لیے 49 نشستیں مقرر کی گئی تھیں اور بقیہ نشستوں کو فرقہ وار اور خاص مفادات میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ کانگریس جو غیر فرقہ وارانہ تھی۔ صرف عام نشستوں یعنی 49 کے لیے الیکشن لڑسکتی تھی۔ ان میں سے اس نے 44 نشستیں جیت لیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ملک میں اس کی کتنی مقبولیت ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ دستوری تبدیلیوں کے متعلق برطانوی تجاویز پر کانگریس کا جو موقف ہے وہ عام طور پر کتنا پسندیدہ ہے۔

44 کانگریسی ممبروں کو اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی کے ان گیارہ ممبروں کی حمایت عام طور پر ملتی رہی۔ جن کے لیڈر مالویہ اور اینے تھے اور اکثر ان 22 آزاد ممبروں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی تھی جو جناح کو اپنا لیڈر مانتے تھے۔ یہ سب مل کر گورنمنٹ کو اکثر شکست دیدیتے تھے اور اس طرح ثابت کر دیتے تھے کہ ملک حزب مخالف کے ساتھ ہے۔

سال کے اختتام پر جب جناح ہندوستان واپس آئے تو وہ مجلس قانون ساز کے الیکشن میں امیدوار بنے اور منتخب کر لیے گئے۔ کانگریس اور کانگریسی نیشنلسٹوں نے بھی انتخابات میں حصہ لیا اور جیت گئے۔ اس لیے اب نئی اسمبلی میں 55 کانگریسی اور نیشنلسٹ ہو گئے، 40 سرکاری افسران اور نامزد کیے ہوئے ممبر جو گورنمنٹ کے معین

رہتے تھے۔ اور 22 آزاد امیدوار (جن میں سے 18 مسلمان تھے) جناح کے پیرو تھے۔ جناح کی پارٹی قوم پرست (نیشنلسٹ) اور گورنمنٹ دونوں کے درمیان ایک توازن قائم کرتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کا اثر اور ان کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنی اس بااثر پوزیشن سے ایک یا دوسری پارٹی کی طرف داری کر کے خوب فائدہ اٹھایا۔

اسمبلی میں سرگرمیوں کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کی گتھی سلجھانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ اس دفعہ مسلم لیگ کی طرف سے جناح اور کانگریس کے صدر کی حیثیت سے راجندر پرشاد کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ کے بحث ومباحثے کے بعد یکم مئی 1935ء کو ان لوگوں نے درج ذیل بیان جاری کیا:

''ہم نے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایسا حل نکالنے کی بڑی سنجیدگی سے کوشش کی جو تمام متعلقہ پارٹیوں کو قبول ہو سکے۔ ہم کو افسوس ہے کہ اپنی بہترین کوششوں کے باوجود ہم ایسا حل نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔'' [1]

18-فرقہ وارانہ مراعات پر مسلمانوں کا اصرار

مسلمانوں کی خاص جماعتیں کل ہند مسلم کانفرنس اور کل ہند مسلم لیگ تھیں۔ ان کے علاوہ جمعیت العلماء، احرار، خلافت کمیٹی اور کچھ اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں۔

مسلم لیگ کے سیاست دانوں میں باہمی اختلافات 1927ء میں نمودار ہو گئے تھے جب برکن ہیڈ نے ایک قانون کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا تھا۔ بعض لیگی لیڈروں کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ جداگانہ طریقہ انتخاب کے بجائے کہیں مشترکہ طریقہ انتخاب نہ رائج کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ کے اندر دو گروہ پیدا ہو گئے اور ہر ایک

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1935ء جلد اول ص295

مدعی تھا کہ لیگ کا اجلاس وہی طلب کرسکتا ہے۔ جناح والی پارٹی نے 30 / اور 31 دسمبر 1927ء کو محمد یعقوب کی صدارت میں کلکتہ میں لیگ کا سالانہ جلسہ طلب کیا۔ اس اجلاس میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں جن کے تحت مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ قانونی کمیشن کا بائیکاٹ کریں۔ ایک کمیٹی بھی مقرر کی گئی کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں کے صلاح ومشورہ سے ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کرے اور مشترکہ طریقہ انتخاب کو منظور کرے بشرطیکہ مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لیے جائیں۔

دوسری پارٹی نے محمد شفیع کی سربراہی میں پنجاب مسلم لیگ کا اجلاس 31 / دسمبر کو لاہور میں منعقد کیا۔ صدارت بھی محمد شفیع نے کی۔ اس اجلاس میں کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کی موافقت کی گئی اور مسلمانوں کے جداگانہ طریقہ انتخاب کے مطالبہ کو دوہرایا گیا۔

دسمبر 1928ء میں مسلم لیگ کا ایک اجتماع کلکتہ میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کرنے کے لیے ہوا۔ شفیع کی پارٹی نے بھی ایک جلسہ دہلی میں 31 / دسمبر 1928ء اور یکم جنوری کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے منعقد کیا جس کے صدر آغا خاں تھے۔

اس جلسے میں ایک خاص بات یہ کہی گئی کہ کلکتہ کانفرنس دراصل مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی کیونکہ اس میں صرف 49 مندوبین نے شرکت کی۔ برخلاف اس کے آل پارٹیز مسلم کانفرنس مکمل طور پر نمایندگی کرتی ہے کیونکہ اس میں مجالس قانون ساز کے تمام مسلم ممبران، خلافت کمیٹی والے، جمعیت العلماء والے اور بہت سے مسلم لیگیوں نے شرکت کی ہے۔ اس کانفرنس میں ایک طویل قرارداد منظور کی گئی جس میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے جانے کے علاوہ جداگانہ نمایندگی کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ یہی قرارداد آئندہ جناح کے چودہ نکات والی قرارداد کی بنیاد بنی۔

چونکہ کلکتہ میں لیگ کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا تھا اس لیے اس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں مارچ 1929ء کے اواخر میں طلب کیا گیا۔ اس موقع پر جناح نے اپنی وہ قرارداد پیش کی جس میں معروف و مشہور 14 نکات تھے اور جن میں مسلم کانفرنس کی قرارداد کی شقوں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

بدقسمتی سے یہ اجلاس ہنگامے کے باعث غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اب ایک تیسری پارٹی وجود میں آئی جس میں تمام ممبر مسلمان تھے اور جو نہرو کمیٹی کی اسکیم کو منظور کر لینے کی موافقت میں تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تین جماعتیں ہوگئیں۔ مسلم لیگ عرصہ طویل کے لیے گہنا گئی اور مسلم سیاست کی باگ ڈور فضل حسین کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

فضل حسین جو اب تک صرف پنجاب کے مسلمانوں کے ایک صوبائی لیڈر رہتے، اب گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک ممبر بھی ہو گئے تھے، اور انہوں نے مسلم سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ اپنی سرکاری پوزیشن سے ان کو ایک بااثر رول ادا کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ایک اور بات ان کی موافقت میں ہوئی وہ یہ کہ جناح ہندوستان کی جولان گاہ سے ہٹ کر لندن چلے گئے تھے جہاں سے وہ 1934ء میں واپس آسکے۔ اس طرح فضل حسین کو اپنی کارروائیوں کے لیے کھلا میدان مل گیا۔

لیکن ان کا سب سے بڑا سرمایہ گورنمنٹ کا دوستانہ رویہ تھا۔ سرکار مسلمان فرقے کی وفاداری اور تعاون پر کانگریس کے خلاف اپنی لڑائی میں، بڑا بھروسہ رکھتی تھی۔ اروِن نے بار بار سکریٹری آف اسٹیٹ پر مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے لیے زور دیا تھا۔ ایک خط میں اس نے لکھا تھا: "اس موقع پر یہ بات بہت ہی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم حتی الامکان ایسے الزامات لگانے سے احتراز کریں جس سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ سائمن کو اس سے احتراز کرنے کی اہم ضرورت بتا دینی چاہیے......

وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے مسلمانوں میں بددلی پیدا ہو، خواہ وہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے متعلق ہو یا عام پر طور۔"[1] اس نے مزید یہ بھی لکھا کہ "صورت حال بگڑ جائے گی اگر آئندہ دو تین مہینوں کے اندر مسلمان کانگریس کی طرف مائل ہو گئے۔"[2]

دس دن کے بعد اس نے ویج وڈ بین کو پھر یاد دہانی کرائی۔ "اس وقت مسلمان ہماری اعانت کر رہے ہیں...... کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہئے جس کا یہ مطلب ہو کہ ہندو قوم پرستوں کے آگے ہتھیار ڈال دینے ہی سے صلح ممکن ہے۔ اس سے مسلمان محسوس کریں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ غداری کی ہے .... یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت گاندھی ہمارا دشمن ہے اور مسلمان ہمارے دوست ہیں۔"[3]

پہلی گول میز کانفرنس کے آخری مرحلوں میں فضل حسین کو یہ خبر سن کر سخت تشویش ہوئی تھی کہ بعض مسلمان ویج وڈ بین کے اشارے پر مشترکہ انتخابات پر رضامند ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ارون نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو متنبہ کیا: "مسلمانوں کا رویہ سخت ہو رہا ہے۔ اگر ان کو یہ یقین ہو گیا کہ گورنمنٹ ان کے مفادات کا تحفظ نہیں کرے گی تو یہاں نہایت سنجیدہ صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ یہ یقین ہو جانے پر ہم مسلمانوں کی اعانت سے فوراً محروم ہو جائیں گے۔"[4]

مارچ 1931ء تک مسلمانوں نے علانیہ پبلک میں اپنے اندیشوں اور خطرات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ارون نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بین کو اطلاع دی: "اس وقت مسلمانوں میں دو قسم کے نظریات متصادم ہیں۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ

1۔ ارون پیپرس مراسلہ گورنر جنرل بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، مورخہ 13 مئی 1930ء

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً 24 مئی 1930ء

4۔ ایضاً، 15 جنوری 1931ء

خود اپنے فرقے کا وفادار رہنا چاہئے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ کانگریس سے سمجھوتہ کرلیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پہلے خیال کے لوگوں کی مدد کروں گا تاکہ وہ اپنی رائے پر قائم رہیں۔"[1]

شاید لیبر پارٹی کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو اِروِن کی ترغیب وتنبیہ کی ضرور پڑتی ہو لیکن جہاں تک قدامت پسند (کنزرویٹو) سکریٹریوں کا تعلق ہے وہ پوپ سے زیادہ وسیع المشرب (کیتھولک) تھے۔ پیل، برکن ہیڈ اور ہور وایسرائے سے زیادہ مسلمانوں کے موافق تھے اس لیے ان کو ترغیب دینے کی ضرورت نہ تھی۔

فضل حسین کے لیے یہ صورت حال بہت منفعت بخش ثابت ہوئی۔

فضل حسین ایک سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی تھے اور ہندوستانی سیاست کے متعلق وہ اپنی حتمی رائیں رکھتے تھے۔ ان کی بنیادی خیالات یہ تھے:

(1) ہندوستان کے معاملات میں برطانوی لوگوں کا غلبہ کم ہوجانا چاہئے۔

(2) ہندوستان میں مسلمان ہندوؤں کے ساتھ برابر کا اقتدار حاصل کریں۔

(3) ہندوستان کے آئین میں واضح طور سے اس مساوی اقتدار کی گارنٹی اس طرح دی جائے کہ صوبوں کو مکمل طور پر آزادی دی جائے اور اس کا اختیار بھی کہ وہ اپنی علاقائی فوجیں رکھیں۔ اس کے علاوہ سرحد کے مسلم اکثریت والے علاقے، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور بنگال مسلمانوں کی مساوی پوزیشن کے تحفظ کے لیے مکمل طور پر صوبے بنادیے جائیں اور مرکزی حکومت کے اختیارات کم سے کم ہوں۔

وہ جداگانہ انتخابات کے بہت سرگرم حامی تھے اور عام رائے کے برخلاف اسے ہندو مسلم رقابت وعداوت ختم کردینے کے لیے ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ اس کے لیے

1۔ ایضاً: 4/ مارچ 1931ء

تیار تھے کہ جب مسلمان تعلیم و دولت ہندوؤں کے برابر حاصل کر لیں تو وہ یہ جداگانہ انتخابات ترک کر دیں گے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ قانون ساز پارٹیاں محض فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم ہوں۔ انہوں نے پنجاب میں ایک متحدہ پارٹی (Unionist Party) قائم کی تھی جس میں ہندو، سکھ، مسلمان بھی ممبر تھے اور اس میں شہر کے پیشہ ور طبقے سے زیادہ دیہات کے مزارعین تھے۔ انہوں نے دوسرے صوبوں میں بھی اسی قسم کی پارٹیاں بنائی جانے کی ہمت افزائی کی۔ یو پی میں زمینداروں کی پارٹی اور بنگال میں کرشک پرجا پارٹی۔

انہوں نے اپنے مقاصد کو مستحکم طور پر لوگوں میں رائج کرنے کے لیے دل و جان سے کوشش کرنی شروع کر دی۔ اپنے اثرات کو کام میں لا کر پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں شامل مسلمان ممبران کو اپنے کام کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کے علاوہ دہلی میں رہ کر وہ اس بات کی بھی نگرانی کرتے رہے کہ ان کے ممبران ان کی پالیسیوں سے روگردانی نہ کر سکیں۔

انہوں نے محسوس کر لیا کہ کانگریس نے مکمل آزادی کے حق میں جو قرارداد منظور کر لی ہے اس نے مسلمانوں کے لیے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ سیاسی طریقوں اور گاندھی جی کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے لیکن یہ مانتے تھے کہ لوگوں کو بیدار کرنے میں گاندھی جی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ان خیالات کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں کو منظم کرنا اور ان کو متحرک بنانے کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کا احیاء کیا اور اسے "مسلمانوں کی رائے عامہ کا سب سے زیادہ طاقت ور وسیلہ بنا دیا۔" انہوں نے فنڈ جمع کیے، پریس کے ذریعہ پروپیگنڈہ شروع کیا، کانفرنس کی کئی شاخیں قائم کر دیں اور پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے اتحاد کو مستحکم بنایا۔

گول میز کانفرنس میں جانے سے پہلے 1931ء میں بھوپال اور شملہ میں گاندھی جی نے جو سمجھوتے کی کوششیں کی تھیں ان کی مخالفت کی اور مسلمان لیڈروں سے اصرار کیا کہ وہ مسلم کانفرنس کے مطالبات سے نہ ہٹیں۔ اور جب 1932ء میں میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ مراعات کا اعلان کیا تو گویا ان کی جدوجہد بارآور ہوگئی۔

لیکن فرقہ وارانہ مراعات سے ہندو سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے مہم شروع کر دی۔ جہاں تک دلتوں کی نمائندگی کا تعلق ہے گاندھی جی اس پر نظر ثانی کرا لینے میں ضرور کامیاب ہو گئے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال مسلمانوں کی نمایندگی کا تھا وہ حل نہ ہو سکا۔

ابوالکلام آزاد نے مختلف فرقوں میں ایک سمجھوتہ کرانے کی کوشش شروع کی تا کہ وہ سمجھوتہ میکڈانلڈ کی مراعات کی جگہ لے سکے۔ مالویہ، سید محمود اور شوکت علی نے بھی اس کام میں حصہ لیا۔ انہوں نے مسلمانوں لیڈروں کو اس بات پر راغب کرنے کی کوشش کی کہ جناح کے چودہ نکات میں سے تیرہ شقی بنیاد پر اور محمد علی کے مشترکہ انتخابات کے فارمولے کے ساتھ ایک عہد نامہ منظور کر لیا جائے۔

شوکت علی نے کوشش کی کہ گاندھی جی کو رہائی مل جائے تا کہ وہ یہ سمجھوتہ یا عہد نامہ مکمل کرانے میں مدد دے سکیں لیکن وایسرائے نے شوکت علی کی درخواست کو نامنظور کر دیا بلکہ انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ وہ جیل میں گاندھی جی سے مل سکیں۔ تب شوکت علی نے بمبئی کی مجلس قانون ساز کے لیڈروں اور صوبے کے دیگر ممتاز سے رابطہ قائم کیا اور خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء کے تعاون کی بنا پر یہ طے کیا کہ 16/اکتوبر 1932ء کو لکھنؤ میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی جائے۔ چنانچہ یہ کانفرنس مقررتاریخ پر منعقد ہوئی اور اس میں جناح کے 13 نکات کے فارمولے کو منظور کر لیا گیا لیکن مشترکہ انتخابات کے مسئلے پر اگرچہ محمد علی کے حل کو پسند

کیا گیا لیکن اسے ایک مقرر کردہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا کہ یہ کمیٹی دوسرے فرقوں سے بھی گفتگو کر کے اس مسئلے پر ان کی رائے حاصل کرے۔

بہت سے مسلمان لیڈروں اور سرحدی صوبے کے افغان جرگے نے لکھنؤ کی اس آل پارٹیز کانفرنس کے اقدام کا خیر مقدم کیا۔ ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے نے بھی اسے منظور کیا اور اپنے تعاون کا وعدہ کیا۔

لیکن کئی مسلم جماعتوں نے ان قوم پرست مسلمانوں کی اس کوشش کی سخت مخالفت کی۔کل ہند مسلم کانفرنس (جس کی از سر نو تنظیم ابھی حال ہی فضل حسین نے کی تھی) کے صدر اقبال اور کئی ممتاز مسلمانوں نے ایک دستخطی بیان اس طرح کا جاری کیا:

''ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت مشترکہ اور جداگانہ انتخابات کے سوال کو دوبارہ اٹھانا انتہائی نامناسب ہوگا۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری قوم (مسلمان) اس موقع پر اس تحفظ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔''[1]

کل ہند مسلم لیگ کے سکریٹری، مرکزی محمڈن ایسوسی ایشن، کلکتہ مسلمس، اور مدراس پریسیڈنسی مسلم کانفرنس ان سب نے بھی قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلمانوں کی مندرجہ بالا تجاویز کے خلاف نارضامندی کی آوازیں اٹھانا شروع کر دیں۔

یکم نومبر 1932ء کو لکھنؤ کانفرنس کمیٹی اور کئی ہندو اور سکھ لیڈروں نے الہ آباد میں آپس میں ابتدائی صلاح و مشورہ کے بعد طے کیا کہ تمام فرقوں کی ایک متحدہ (یونیٹی) کانفرنس الہ آباد میں طلب کی جائے۔ اس کا پہلا جلسہ 3رنومبر کو منعقد ہوا۔ اس میں ایک کمیٹی بنادی گئی کہ وہ کمیٹی سمجھوتے کی شرایط پر غور وخوض کرے۔

یہ کمیٹی 3رنومبر سے 17رنومبر تک اپنی نشستیں کرتی رہی اور تب معاہدے کا ایک خاکہ تیار کیا۔ اس خاکے پر متحدہ (یونیٹی) کانفرنس نے اپنے 16ر23ر اور 24ر دسمبر

---

[1] ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1932ء جلد دوم ص284

کے اجلاس میں غور وخوض کیا۔

اس معاہدے میں 1929ء کی دہلی مسلم کانفرنس کے تمام نکات (جناح کے 14 نکات) شامل تھے۔ اس میں ان تمام نکتوں کو منظور کرلیا گیا تھا—— مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کی تشکیل، پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کا قانونی تحفظ، کابینہ (مجلس وزرا) میں اقلیتوں کے نمائندوں کی شمولیت، اقلیتوں کے لیے سندھ کی علاحدگی، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اصلاحات، شہری اور فوجی ملازمتوں میں کافی نمایندگی کی یقین دہانی، مذہب اور مذہبی قوانین کا تحفظ اور تمام باشندوں کو بنیادی حقوق کی گارنٹی۔

الیکشن کے طریقہ کار کے متعلق یہ طے ہوا کہ تمام الیکشن مشترکہ طریق انتخاب پر ہوں گے لیکن دس سال تک محمد علی کے فارمولے کے ترمیم کردہ طریق پر عمل ہوگا۔ بدقسمتی سے 1932ء اور 1933ء میں کانگریس خلاف قانون قرار دے دی گئی اس لیے اس کا کوئی جلسہ اس مسئلے کو طے کردینے کے لیے نہ ہوسکا۔ کانگریس نے اس قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنا ایک غیر قانونی جلسہ دہلی میں کیا تو ضرور لیکن اس میں کوئی کام کی بات نہ ہوسکی۔

بنگال کی حکومت نے بھی کانگریس کے جلسوں پر پابندی لگادی تھی اور پولیس کا زبردست انتظام کیا تھا کہ وہاں اس کے جلسے نہ ہوسکیں۔ کانگریسی لوگ بڑی تعداد میں گرفتار کرلیے گئے جن میں مالویہ، موتی لال نہرو، اَینے، سید محمود اور تقریباً ایک ہزار دیگر افراد شامل تھے۔ حکومت کے تمام امتناعی انتظامات کے باوجود بہت سے کانگریسیوں نے یکم اپریل 1933ء کو ایک جلسہ کیا اور اس میں کئی قرار دادیں منظور کیں۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ اس وقت الہ آباد والی متحدہ کانفرنس منعقدہ دسمبر 1932ء پر بحث وتمحیص نہ ہوسکتی تھی۔

بہت افسوس کی بات یہ ہوئی کہ کل ہند مسلم کانفرنس کے منتظمین نے متحدہ کانفرنس الہ آباد کی کمیٹی کی قراردادیں نامنظور کر دیں۔

فضل حسین نے 20/نومبر 1932ء کو دہلی میں ایک مشترکہ جلسہ طلب کیا جس میں کل ہند مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ممبروں نیز مسلم لیگ کی کونسل اور جمعیت العلماء (کانپور) کے ممبروں نے شرکت کی۔ اس جلسے میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

"تمام ممکنہ غلط نمایندگیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے یہ جلسہ اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کسی قسم کا فرقہ وارانہ معاہدہ خواہ وہ کوئی کرے یا کوئی منظور کرے عام طور سے مسلمان فرقے کو منظور نہ ہوگا جب تک وہ تمام مطالبات، جو مسلم کانفرنس نے یکم جنوری 1929ء کو اپنی قرارداد میں منظور کیے تھے اور جنہیں اپریل 1931ء کی قرارداد میں وسیع تر کیا گیا تھا، مکمل طور پر مان نہیں لیے جاتے"[1]

تنگ نظر فرقہ واریت نے اپنی نامنظوری کا اتنا ہنگامہ مچایا کہ سمجھوتے کی تمام امیدیں اس لیے اور بھی ختم ہوگئیں کہ حکومت ان کو شہ دے رہی تھی اور ناجائز طور پر ان سے تعاون کر رہی تھی۔ ظاہرا مسلم کانفرنس اور لیگ کے پاس کوئی ایسا تعمیری کام نہ تھا جو ہندوستان کے اور اہم طور پر بنیادی مسائل کو حل کرنے میں مدد دے سکتا۔ ان لوگوں نے سول نافرمانی کی تحریک اور گورنمنٹ کی عائد کردہ دہشت ناک طریق فرماں روائی پر بھی کوئی توجہ نہ کی۔ متحدہ کانفرنس کی قراردادوں کی نفی کرنے کے بعد ان کے پاس کچھ اور کرنے کو نہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قرطاس ابیض (White Paper) 15/مارچ 1933ء کو شایع کیا گیا تو ان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے معمولی اندرونی جھگڑوں میں دلچسپی لیتے رہے جس سے مختلف چھوٹے گروہوں کی

1۔ ایضاً ص 299

تعداد بڑھ گئی اور بڑی جماعتیں کمزور پڑ گئیں۔

گاندھی جی کا برت، پونا کا معاہدہ، گاندھی جی کی رہائی اور سول نافرمانی کا عوامی سطح پر ملتوی کیا جانا، گورنمنٹ کا پکڑ دھکڑ کا کھیل جس کا خاص نشانہ گاندھی جی ہوتے تھے ان سب واقعات میں مسلم فرقہ وارانہ جماعتوں کے ممبروں نے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہ لی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ایسے سنسنی خیز واقعات یہاں ہوتے یا کسی دوسرے سیارے میں، ان کو کوئی پرواہ نہ تھی۔

فضل حسین نے جو وایسرائے کی کابینہ کے ایک اہم ممبر تھے اور مسلم مفادات کے زبردست مجاہد، لوتھیان سے بڑی فلسفہ آرائی کی کہ گورنمنٹ نے جو ظالمانہ طریقے کانگریس کو نیست و نابود کرنے کے لیے اٹھائے ہیں وہ گویا حق بجانب ہیں۔ سارا الزام گاندھی جی کے سر تھوپا جن کے متعلق یہ بھی کہا: ''کہ وہ مردم شناس نہیں، موقع پرست ہیں، صرف باتیں بنانے والے ہیں۔ ذمہ داری سے دور بھاگتے ہیں، معلومات میں کم ہیں، نا قابل اعتبار ہیں اور ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں جو ان کی عقل سے بالا اور قابو سے باہر ہیں۔'' [1]

لیکن جب بعض کانگریسی لیڈروں نے یہ تجویز اٹھائی کہ سوراج پارٹی کو پھر زندہ کیا جائے۔ تاکہ وہ الیکشن لڑ سکے تو مسلم حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کل ہند مسلم لیگ بیدار ہو گئی اور اس کی کونسل کا جلسہ 4/ مارچ 1934ء کو ہوا۔ اس میں لیگ کے مختلف گروہوں میں جو جھگڑے تھے ختم کر دیے گئے اور اس متحدہ جماعت کا صدر جناح کو منتخب کیا گیا۔ جناح نے جو انگلستان میں کئی سال قیام کر کے شروع اپریل 1934ء میں واپس آئے تھے اس منصب کو قبول کر لیا۔ اس کے فوراً بعد وہ پھر انگلستان چلے گئے لیکن بالآخر سال کے اختتام پر قانون ساز اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے

1۔ عظیم حسین (بحوالہ گزشتہ) ص229

واپس آ گئے۔

کل ہند مسلم کانفرنس کے بگڑے معاملات آغا خاں کی مداخلت پر درست ہو گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے عہدہ داروں کو تمام تر تبدیل کر دیا جائے.......... نواب چھتاری کو اس کا نیا صدر بنایا گیا۔

مسلمانوں کی یہ دو جماعتیں اس فرقے کے آزاد خیال (لبرل) اور قدامت پرست (کنزرویٹو) بازوؤں کی نمایندگی کرتی تھیں۔ دونوں کا 1935ء کے آئین کے متعلق رویہ جداگانہ تھا لیکن فرقہ وارانہ مراعات کو برقرار رکھنے کی دونوں جماعتیں حامی تھیں۔

پنجاب اور بنگال میں صورت حال ذرا مختلف تھی۔ دونوں صوبوں کے مسلمان لیڈر مسلم کانفرنس کی موافقت میں تھے پنجاب میں فضل حسین اور بنگال میں فضل الحق کی سربراہی میں۔

فضل حسین کو اپنی متحدہ پارٹی کو مضبوط بنانے کی فکر تھی اور فضل الحق کو اپنی کرشک پارٹی کی۔ ان دونوں میں سے کوئی یہ نہ چاہتا تھا کہ سیاسی معاملات صرف فرقہ وارانہ خطوط پر حل کیے جائیں۔

فضل حسین نے اسی لیے جناح کی مسلم لیگ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا باوجود اس کے کہ لیگ سیاسی طور پر ترقی پذیر تھی لیکن بنیادی طور پر وہ صرف ایک فرقہ وارانہ جماعت تھی۔ دونوں میں ایک اور بھی خاص فرق تھا۔ فضل حسین اور ان کے حلیف جو دوسرے صوبوں میں تھے زیادہ تر دیہات کے کاشتکاروں اور مزارعین کی نمائندگی کرتے تھے۔ برخلاف اس کے مسلم لیگ کو ماننے والے شہروں کے پیشہ ور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

بہت سے مسئلوں میں مسلم لیگ کے نظریات کانگریس سے ملتے جلتے تھے لیکن

فرقہ وارانہ مسئلے پر متحدہ پارٹی، زمینداروں کی پارٹی اور کرشک پارٹی کانگریس سے اس لیے قریب تر تھیں کہ ان پارٹیوں کی سیاست غیر فرقہ وارانہ تھی مگر فضل حسین کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے خلاف تھے۔

19- روانگی، آزادی کی طرف

1924-35ء کا زمانہ وہ تھا جس میں آزادی کی منزل کی طرف بڑی پیش قدمی ہوئی۔ 1924ء میں جب مجلس قانون ساز نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ایک گول میز کانفرنس کا تقرر 1919ء کے دستور پر نظر ثانی کرنے کے لیے کیا جائے تو گورنمنٹ نے فوراً اس قرارداد کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے بجائے ایک ڈیپارٹمنٹل کمیٹی بنا دی تھی کہ وہ دستور کی کارکردگی کا جائزہ لے اور اس کے عملدر آمد میں گزشتہ تین سال میں جتنے نقص نظر پڑیں تو انہیں درست کر دے۔

1935ء گورنمنٹ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دی گئی کہ اب ہندوستان کو درجہ نوآبادیات چند تحفظات کے ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اعتراف بادل ناخواستہ تھا اور حکمراں پارٹی کو بڑی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ ہندوستانی رعایا پر اپنی مرضی چلانے کے بجائے اب مساویانہ سطح پر ان سے صلح و مشورہ کرنے کا طریقہ کیسے اختیار کر سکے گی۔ بہر حال، اب یہ تو ممکن نہ تھا کہ 1930ء والی پوزیشن کی طرف مراجعت کی جائے۔ پھر بھی 1936ء میں بھی منزل دور نظر آتی تھی اور سفر دراز۔

ہندوستان کے لوگوں کے لیے یہ زمانہ بڑی ہلچل اور اضطراب کا تھا۔ جو واقعات اس عظیم جدوجہد کے سلسلے میں پیش آئے ان سے بڑا جوش اور ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ تحریک بہت آگے بڑھی اور پھر پیچھے بھی ہٹی اور باوجودیکہ منزل تک رسائی فوراً نہ ہو سکی اس نے ہندوستان میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی۔ پہلے

گاندھی جی کی سربراہی میں مارچ کرتی ہوئی سمندر کے ساحل کے کنارے تک پہنچ گئی اور پھر تیزی سے جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ ایک چھوٹی سی اور معمولی قانون شکنی (نمک سازی کی) جو پرامن بھی تھی اور تمثیلی بھی، ایک بڑے پیمانے پر بڑھ کر سول نافرمانی کی جارحانہ تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ کاشت کاروں کا لگان دینے سے انکار کردینا اس تحریک کا صرف ایک جزو تھا۔

گورنمنٹ نے اسے ایک جنگ فرض کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ختم کردی جائے۔ قوم پرست اخبار اس زمانے کے واقعات کو اس طرح شایع کرتے تھے جیسے وہ جنگ کی خبریں ہوں۔ ہور، اور ولنگڈن قدامت پسند اور لبرل سب نے مل کر طے کیا کہ دشمن یعنی کانگریس کو کچل دیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت نے اپنی تمام طاقتیں لگادیں۔ انہوں نے بین اور ارون کی اختیار کردہ پالیسی کو رد کردیا اور کانگریس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کردیا کہ وہ گورنمنٹ کے کاموں میں کوئی مداخلت کرسکتی ہے یا اس کے اقدام کو نامناسب ٹھہرا سکتی ہے۔

ظاہرا وقتی طور پر تو اس جنگ میں فتح گورنمنٹ کی ہوئی۔ سول نافرمانی کی جارحانہ تحریک کو کچل دیا گیا۔ گاندھی جی مجبور ہوگئے کہ وہ اس تحریک کو عوامی سطح پر چلانا ملتوی کرادیں اگرچہ انہوں نے یہ نہیں مانا کہ لوگوں کو ایسے قوانین کو نہ ماننے کا کوئی حق نہیں ہے جو ایک بدیسی حکومت بہت ظالمانہ اور جابرانہ طور پر نافذ کرتی ہے۔ لیکن وقتی طور پر انہوں نے اس حق کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا۔

لیکن اس تحریک نے یہ واضح کردیا تھا کہ عارضی طور پر جو سرگرمی رک گئی تھی اسے ایک مستقل صلح کی علامت نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ مدافعت کی قوت ارادی ختم نہیں ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ دہشت پسندی کی تحریک کی افزائش، کمیونزم کی ترویج، مزدور طبقے میں بے چینی پیدا ہو کر ہڑتال کی شکل میں اکثر ظاہر ہوتی، اس زمانے کی اقتصادی بدحالی اور نوجوان پڑھے لکھے طبقوں کا حکومت کی طرف سے ناامید ہو جانا، یہ سب باتیں خطرناک صورت حال پیدا ہو جانے کی پیشین گوئی کر رہی تھیں۔

گورنمنٹ کی پالیسی نے لوگوں کی خودداری کو چیلنج دے دیا تھا۔ اس کا ردعمل ایسا ہوا کہ اس نے ہندوستانیوں کے نقطہ نظر اور کردار میں ایک مستقل تبدیلی پیدا کر دی۔ بادرفتار تحریک نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ وہ بدیسی حکمرانوں کی بات نہیں مانیں گے۔ اپنے لیڈروں کا حکم البتہ خوشی سے مانیں گے۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے خوداختیاری حکومت کے مطالبہ کو جائز قرار دیا۔

بے خوفی، خوداعتمادی اور ایثار کی خوبیاں نمودار ہونے لگیں اور یہ خوبیاں حصول آزادی کی بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ مدتوں پرانا یہ خیال کہ ہمارے ملک کی خرابیاں دوسرے درست کر دیں گے ایک مغالطہ ثابت ہوا۔ برطانوی لوگوں کی ساکھ اور ان کے وعدوں پر جو اعتماد تھا وہ بالکل جاتا رہا تھا اور ہر طبقے کے لوگ آزادی کے لیے کوشاں تھے۔

اس جدوجہد نے ملک کے سماجی حالات پر بھی حیرت انگیز اثر ڈالا۔ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو گیا کہ سب لوگ بلاتفریق ذات پات مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح سے وہ چھوت چھات کی روایت جس کی جڑیں اور شاخیں ہندوستان میں ہزاروں برسوں سے بہت گہری اور دور دور تک وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اصولاً ترک کر دی گئی اگرچہ عملاً وہ ابھی تک دور نہیں کی جا سکی ہے۔

لیکن اس ہنگامے کا سب سے زیادہ حیرت ناک اثر ہندوستانی عورتوں کی اچانک بیداری کی صورت میں رونما ہوا۔ اس تحریک میں انہوں نے بہت شاندار حصہ لیا جو

ذیل کی جدول سے ظاہر ہے:

حسب معمول قانون اور 1932ء کے آرڈی ننس نمبر 10 کی جگہ پر بنائے گئے قوانین کے تحت سزایابی [1]

سزائیں	جو فروری 1933ء تک دی گئیں	فروری 1933ء	میزان
مرد	65699	2292	67,991
عورتیں	3333	129	3,462

اس خلاف توقع صورت حال سے گورنمنٹ اتنی چکرا گئی کہ اس نے اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا کہ پست طبقے کی عورتوں کو عام شہری قانون شکن عورتوں سے نپٹنے کے لیے ملازم رکھ لیا جائے۔ یہ خیال کیا گیا کہ پست طبقہ گورنمنٹ کا وفادار ہے اور اس لیے وہ ظلم کا ہتھیار بننے پر تیار ہو جائے گا۔

☆..................☆..................☆

1۔ گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم ڈیپارٹمنٹ، پولیٹکل فائل نمبر 3/11، 1933ء

باب چهارم

نئے دستور پر عمل درآمد

1- نئے آئین کی نوعیت اور اس کی خصوصیات

ہندوستان کے نئے آئین کی تشکیل کی تیاری نے آٹھ سال کی طولانی مدت لی۔ اس کا پہلا قدم نومبر 1927ء میں اٹھایا گیا تھا جب کہ قانون کمیشن کا تقرر کیا گیا تھا اور آخری قدم اس وقت اٹھا جب 4/اگست 1935ء کو اسے شاہی منظوری حاصل ہوگئی۔ لیت و لعل کرنے والی تدبیریں دیدہ و دانستہ اختیار کی گئی تھیں۔ برکن ہیڈ نے اگرچہ اس کے لیے ابتدائی قدم اٹھائے تھے لیکن وہ اس اصلاح کے حق میں پوری طرح وہ نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ 1919ء کے ایکٹ نے پہلے ہی بہت زیادہ دے دیا اس لیے کہ اس وقت جنگ عظیم کے بعد ایک انتشاری کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ قانون کمیشن کی تقرری نہ ہو اور لیبر پارٹی کسی قسم کی تحقیقات نہ کرائے اور اس طرح ہندوستان کو امید و بیم کے خلجان میں مبتلا رکھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اصلاح کے لیے ہندوستان میں جو اتنا ہنگامہ مچایا جارہا ہے وہ خود ہی کچھ عرصے میں ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس نے ایک موقع پر اقرار بھی کیا کہ "کمیشن کی تقرری کرنے کے لیے عجلت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم وقت کے ساتھ جتنی دیر تک چاہیں کھیل سکتے ہیں۔" [1]

اس عرصے میں انگلستان میں متعدد بار حکومتیں بدلیں، اصلاح کی کارروائی کا آغاز تو قدامت پسند حکومت نے کیا تھا جب بالڈون وزیر اعظم تھے اور برکن ہیڈ

---

[1] اروِن پیپرس: برکن ہیڈ بنام اروِن، مورخہ 23/ستمبر 1926ء

سکریٹری آف اسٹیٹ۔ یہ کارروائی لیبر حکومت کے تحت بھی جاری رہی جب اس میں ریمزے میکڈانلڈ اور وجوڈ بین تھے اور آخری میں قومی حکومت (نیشنل گورنمنٹ) کے زمانے میں جبکہ ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم تھے اور انھیں بالڈون اور سیموئل ہور کی حمایت حاصل تھی، یہ اصلاح کی کارروائی مکمل ہو سکی۔

حکومت کی تبدیلیوں کا اثر لازمی طور پر نئے آئین کے متعلق غور و فکر کرنے کے طریقے، اس کے مقصد اور دستور سازی کے طریقہ کار پر بھی ہوا۔ ہندوستان میں بھی یہ زمانہ سخت کشاکش اور ہیجان کا گزرا۔ ملک کی معیشت میں تضادات بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ مل مالکوں اور اس کے حصہ داروں کے منافعے، جنگ کے بعد کی گرم بازاری کے باعث غیر معمولی تیز رفتاری سے بڑھ رہے تھے۔ مثال کے طور پر پٹ سن (جوٹ) کی صنعت میں لوگوں کو 1915ء سے لے کر 1924ء تک منافع 90 فی صدی ملتا رہا۔ ایک دوسرے بڑی مل نے 1927ء میں سو فی صدی منافع تقسیم کیا، 1928ء میں 60 فی صدی اور 1925ء میں 50 فی صدی۔ روئی کی صنعت سے حصہ داروں کو 40 فی صدی سے لے کر سو فی صدی منافع ملا۔ ناگ پور کی ایمپریس مل نے 26-1925ء میں 80.86 فی صدی 1928ء میں 28 فی صدی 1929ء میں 26 فی صدی اور 1930ء میں 24 فی صدی منافع تقسیم کیا۔ 1929ء میں کوئلہ کی بعض کمپنیاں 30 سے 40 فی صدی تک منافع تقسیم کر رہی تھیں۔ 1928ء میں دس کمپنیوں نے 1928ء میں اوسطاً منافع 23 فی صدی اور 1929ء میں 20 فی صدی تقسیم کیا۔ اس قدر زیادہ منافع ملنے کا سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہو جانے تک قائم رہا۔

اس کے برعکس مزدور طبقے کی حالت خراب وخستہ تھی۔ مزدوروں کے ایک لیڈر نے کہا تھا: ''ہوڑا اور اس کے نواح کی بستیوں (مزدوروں کی رہائش گاہوں) میں جس قدر گندگی، غلاظت اور تعفن ہے اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔'' دوسرے لیڈر نے

کہا: ''بمبئی شہر میں جو کہ ہندوستان کی صنعت وحرفت کا مرکز رہے رہائشی حالات کسی بھی مہذب قوم کے لیے باعث ذلت ہیں۔''

مزدوروں کی اجرتیں بہت ہی کم تھیں جن سے وہ اپنی ضروریات زندگی بھی پوری نہیں کر سکتے تھے۔ بمبئی میں 1935ء میں کپڑے کے کارخانوں کے مزدور ساڑھے چار روپے اور اڑتالیس روپے ماہوار کے درمیان اجرت پاتے تھے۔ بے ضابطہ صنعتی کارخانوں میں اجرتیں اس سے بھی کم تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد اجرتیں بڑھ گئی تھیں اور مزدور طبقہ اتنا بیدار ہوگیا تھا کہ اب اجرتوں میں تخفیف برداشت نہ کر سکتے تھے۔ پھر بھی منافعے جتنے زیادہ بڑھے تھے اس کی مقابلے میں اجرتوں کے نرخ میں اضافہ بہت ہی قلیل ہوا تھا۔

منافع اور اجرت کے درمیان اس قدر زیادہ فرق ہونے کی وجہ سے مزدوروں نے ہڑتال کرنا شروع کی۔ مزدوروں کی یہ تحریک تیزی سے بڑھتی رہی اور اس سے زمانے کی سیاسی تحریک کو بڑی مدد ملی اور عوام الناس میں بھی سیاسی بیداری ترقی کرگئی۔ 1924ء سے کمیونسٹ رجحانات بھی مزدور تحریک میں داخل ہونے لگے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی پہلے پہل 1926ء میں قایم ہوئی۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کی پارٹیاں بھی بنگال (1926ء)، بمبئی، یوپی اور پنجاب میں وجود میں آگئیں۔ ان سب نے متحد ہوکر 1928ء میں ایک کل ہند جماعت بنالی۔ پیشہ وروں کی انجمنیں بنانے کی تحریک Trade Uninism بھی تیزی سے ترقی کرنے لگی۔

مزدوروں کی ان جماعتوں نے بھی سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کے سلسلے میں جلوس وغیرہ نکالنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اروِن نے اپنے بیان میں اس امر کا اظہار کیا کہ ''کمیونسٹ طریقہ ہائے کار کے تشویش ناک حد تک پھیل جانے سے میری حکومت

کو کچھ عرصے سے پریشانی لاحق ہے۔"[1]

گورنمنٹ نے پبلک سلامتی بل Public Safety Bill جیسی تدبیریں اختیار کرکے اس تحریک کو ختم کردینا چاہا لیکن یہ بل 1928ء میں اسمبلی نے نامنظور کردیا۔ اس پر وائسرائے نے ایک آرڈی ننس کی صورت میں مزدوروں کی حالت پر وھٹلے کمیشن کی رپورٹ کو Trade Dispute Act کے نام سے نافذ کیا۔ مارچ 1929ء میں مزدوروں کے 32 لیڈروں کو گرفتار کرکے ان کی تحریک کو کچل دینا چاہا، اس خیال سے کہ اس طرح مزدوروں کی انجمنیں اپنے خاص رہنماؤں سے محروم ہوجائیں گی۔

زراعتی طبقے میں بھی اندرونی تضادات نے سماجی بدامنی پھیلانے میں زبردست حصہ لیا۔ ایک طرف تو گورنمنٹ کے بڑھتے ہوئے اخراجات تھے۔ ادھر زراعت سے آمدنی بندھی ٹکی تھی۔ مجبوراً گورنمنٹ چاہتی تھی کہ زرعی صنعت سے جتنا ہوسکے نچوڑ لے نتیجہ یہ کہ ایک بے چینی کی کیفیت مستقل تھی۔ اس استحصال کا شکار بے چارہ کسان ہوتا تھا جو چکی کی دو پاٹ، اوپر تو تحصیل دار تھا یا گورنمنٹ کا کوئی دوسرا ایجنٹ اور نیچے زمیندار اور مہاجن۔ کے بیچ میں دب کر رہ جاتا تھا۔

نابرابری کا یہ جھگڑا مدتوں سے چلا آرہا تھا اور اس نے زرعی سوسائٹی کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک طرف تو چند بڑے مرفع حال کسان اور زمیندار تھے دوسری طرف کاشتکاروں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد تھی اور ان جیسے لوگوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہورہا تھا جن کے پاس نہ زمین تھی، نہ کھانے کو پیٹ بھر روٹی، نہ کہیں مستقل ملازمت، روزانہ اجرت پر کام کرنے والے تھے وہ اور پھر جب اناج کی قیمتیں گر جاتیں تو ان کی حالت اور خراب وخستہ ہوکر افسوس ناک ہوجاتی۔ نتیجہ یہ ہوا

---

1 مجلس قانون ساز میں مباحثے (28 رجنوری تا 23 فروری) جلد اول، ص 75 قانون ساز مجلس کی کارروائی منعقدہ 28 رجنوری 1929ء

کہ پنجاب ، گجرات اور یو پی میں کاشتکاروں کی تحریکیں شروع ہوگئیں۔ ان سے گاندھیائی جدوجہد کو تقویت تو ملی لیکن ساتھ ہی اس کے گاندھیائی تحریک جس مقصد کے تحت چلائی گئی تھی اس کے خلاف اندیشے پیدا ہو گئے۔

اس کے علاوہ سماج میں ایسے مذہبی جھگڑے بھی تھے جن فرقہ وارانہ کہا جاتا تھا۔1924ء میں جب کہ خلافت تحریک اور ترک موالات کی جدوجہد بالکل ختم ہو چکی تھی ملک میں اندرونی مناقشے اور جھگڑے پیدا ہو گئے۔ ہندو مسلم فسادات سماج میں ابتری کا ایک اور رخ ظاہر کرنے لگے تھے۔ یہ فسادات اس بے اعتباری کو ظاہر کر رہے تھے جو مشترکہ طور پر حل نہ کر سکنے کے باعث لازمی طور پر پیدا ہوگئی تھی۔

اس کے نتائج دور رس ہوئے۔ کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک گروہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا تھا دوسرا تبدیلی موافق تھا۔ یہ لوگ سوراجی کہلائے۔ کانگریس میں راست اقدام کرنے کا عزم نہ رہا اور گاندھی جی سیاسی میدان سے ہٹ کر سماج سدھار اور اقتصادی تنظیم کے کام میں لگ گئے۔ اس کے بعد سوراجی بھی دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک طرف وہ سوراجی تھے جو عہدوں کو قبول کرنے کی موافقت میں نہ تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو وزارتوں نیز دیگر عہدوں کو قبول کرنے اور گورنمنٹ سے تعاون کرنے کی موافقت میں تھے۔

سیاسی ذہن رکھنے والے مسلمانوں میں ایک طرف روایت پسند لوگ تھے دوسری طرف جدیدیت پسند۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں اول الذکر گروہ نے اپنی پوری شدت سے ہنگامہ آرائی میں حصہ لیا۔ علماء اس تحریک کے روح رواں تھے اور ترک موالات کی تحریک کے زبردست حامی۔ بعض نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے بھی علماء کی سربراہی تسلیم کرلی تھی۔ اس تحریک کے دوران مسلم لیگ جو انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقے اور صاحب جائداد اعلیٰ طبقے والوں کی جماعت تھی پس پشت ڈال دی گئی تھی۔

لیکن 1924ء میں خلافت کے لیڈروں کا اثر مسلمانوں پر باقی نہ رہا اور مسلم لیگ جناح کی مربیانہ سربراہی میں از سرنو زندہ ہوگئی۔ اسی زمانے میں دوسری جماعتیں پیدا ہوگئیں مثلاً کل ہند مسلم کانفرنس، احرار، خاکسار، خدائی خدمت گار۔ 1919ء میں جمعیت العلماء قائم ہوئی تھی اور اگرچہ وہ خلافت کی تحریک کے زمانے میں نامقبول رہی لیکن اس کا دم خم باقی رہا۔ لیکن چند علماء انڈین نیشنل کانگریس سے بدظن ہو گئے اور پان اسلامی تصورات اور احیائے اسلام کی خاطر اس سے علاحدگی اور کنارہ کشی کے خیالات کی ترویج کرنے لگے۔

ان حالات سے ہندو فرقہ واریت کو شہ ملی۔ ہندو مہاسبھا نے ایک بڑی جماعت تیار کی جس میں کئی کانگریسی لیڈر بھی شامل ہو گئے اور اس جماعت نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کردی۔ فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے ہندو اور مسلمانوں دونوں نے ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور سارے ملک کے طول وعرض میں نفرت اور خوف کا زہر پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد بار خوں ریز تصادم، آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات ہوئے۔

ہندوستان کی اقتصادی اور سماجی کشاکش کا خاص سرچشمہ برطانوی حکمرانوں کی پالیسی تھی اپنے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سیاسی جھگڑے زیادہ تر اس قسم کی کشاکشوں سے کمک حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کی ہیئت کیسی ہو، وہ کس بات پر ہوں اور کس انداز کے ہوں اس قسم کی کشاکش انہیں متعین کرتی ہے۔

قومی زندگی میں بڑھتے ہوئے تضادات اور رعایا کی بڑھتی ہوئی تکلیفوں نے قومی لیڈروں کو مجبور کیا کہ وہ ایک خاص رویہ اور نقطۂ نظر اپنالیں۔ ان کا خودمختار حکومت کا مطالبہ اگرچہ قومی عزت اور وقار کے خیالات پر مبنی تھا لیکن اس کی فوری ضرورت یہ

یقین پیدا ہو جانے پر پیدا ہوئی کہ ہندوستان کے اقتصادی اور سماجی مسئلوں کے حل کی طرف بدیسی حکمرانوں کی نہ تو توجہ ہے اور نہ ان میں انھیں حل کرنے کی صلاحیت ہے ۔ وہ اقتصادی ترقی کے لیے ضروری اقدام کرنے سے صرف چشم پوشی ہی نہیں کرتے بلکہ اسے روکتے ہیں اور قدیمی روایت پرستی اور سماجی انتشار کی تخریبی قوتوں کی حمایت کرتے ہیں۔

حکمراں طبقہ ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینے سے انکار کرنے میں یہ موقف اختیار کرتا تھا کہ ہندوستانی لوگوں میں بہت سے اندرونی جھگڑے اور اختلافات ہیں اس کے برعکس ہندوستانی قوم پرست اپنی آزادی کے مطالبے کو اس لیے حق بجانب ٹھہراتے تھے کہ حکمراں طبقہ ان جھگڑوں اور اختلافات کو دور کرانے میں ناکامیاب رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں دونوں میں رسہ کشی ہونا لازمی تھی۔

مگر یہ جھگڑا عجیب وغریب تھا کیونکہ اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک طرف جارحانہ جدوجہد تھی لیکن عدم تشدد کے ساتھ تاکہ گورنمنٹ کا غلبہ کمزور پڑ جائے۔ اس کے جواب میں حکومت حملہ کرنے کی حکمت عملی اختیار کرتی تھی جس میں جبر کے ساتھ اختیارات بھی دیے جاتے تھے۔

1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اس مسلسل جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا۔ اس ایکٹ کو بڑے طویل بحث ومباحثوں کے بعد تیار کیا گیا تھا اور اس میں جہاں بانی کی بڑی ترکیبیں کام میں لائی گئی تھیں تاکہ دونوں پارٹیاں: برطانوی لوگ اور ہندوستانی اس سے مطمئن ہوسکیں اور ان کے مقاصد اور ارادے پورے ہوسکیں۔ برطانوی مقصد ان دونوں فریقوں کی کشاکش کے باعث متعین ہوا تھا۔

1919ء ہی سے ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں اس اشد ضرورت پر زور دے رہی تھیں کہ اقتدار ہندوستانیوں کو سونپ دیا جائے۔ حکمراں طبقے نے چنانچہ بالآخر محسوس

کرلیا کہ مطالبات کا یہ سیلاب ہمیشہ کے لیے روکا نہیں جا سکتا لیکن سامراجی مفادات اقتصادی اور سیاسی حالات اس کے خلاف رائے دیتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ برطانوی اقتدار میں ذرا سی بھی کمزوری آئی تو سیلاب آ جائے گا اور پوری برطانوی سلطنت کو لے ڈوبے گا۔

چنانچہ بڑی مدبرانہ چال بازی اور ہنر مندی کی ضرورت پڑ گئی کہ ان دونوں مخالف فریقوں کے لیے ایسا حل نکالا جائے جو اصلی اقتدار تو برطانوی ہاتھوں میں رکھے لیکن ظاہر یہی ہو اختیارات منتقل کر دیے گئے ہیں۔

دستور (آئین) سازوں کے سامنے دو صورتیں تھیں (1) یا تو وہ ایسا طریقہ اختیار کرتے جس سے طویل مدت کے لیے ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفادات محفوظ ہو جاتے اور دیگر مختلف پارٹیوں اور مفادات پرستوں کے ناجائز مطالبات کی کوئی پروانہ کی جاتی (2) دوسرا کم پریشان کن طریقہ یہ تھا کہ برطانیہ کے سرمایہ کاروں اور صنعت سازوں کی وقتی ضروریات کو پورا کر دیا جاتا۔ پہلے طریقہ اختیار کرنے پر برطانیہ کو ایک انقلابی پالیسی اختیار کرنا پڑتی یعنی ملک کے لوگوں کا جو استحصال ہو رہا تھا اسے روک دینا پڑتا اور کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا۔

آسان طریقہ ان لوگوں کے لیے یہی تھا کہ اکثریت کے مطالبات کو حد سے زیادہ قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر ہندوستان کے تمام لوگوں کی مستقل بہبود کو اقلیتوں کے فوری اور وقتی فائدے کی خاطر قربان کر دیا جائے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کا مطلب ہوتا کہ اقلیتوں سے دوستی اور راہ رسم و بڑھائی جائے۔ اکثریت سے جو ان کے اختلافات تھے ان کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے اور انھیں اکثریت کی طرف سے خوف زدہ اور بددل کر دیا جائے اور اس طرح انھیں حکمرانوں کے دامن دولت سے وابستہ رکھا جائے۔

یہی دوسرا طریقہ اس خوش فہمی اور امید کے ساتھ اختیار کیا گیا کہ اگر اس کے خلاف اکثریت نے کانگریسی نمائندوں کے ذریعے مخالفت کی تو وہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اگر رہی بھی تو حکومت کی فوجی طاقت اور اقلیتوں کی اخلاقی حمایت[1] اس پر غالب آجائے گی۔ یہ نظریہ دراصل سامراجی پالیسی کی تنگ نظری اور تنگ دلی پر مبنی تھا یعنی اول تو وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے سامراج کے مفادات ضرور محفوظ رہیں، دوسری ضرورت یہ تھی کہ سلطنت برطانیہ بہت وسیع حلقے میں پھیلی ہوئی تھی اور ہندوستان اپنی جائے وقوع کے باعث اس وسیع سلطنت کو قابو میں رکھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اس نئے دستور کے اعلان کے بعد دس سال کا بھی عرصہ نہیں گزرا کہ تاریخ کی پیش رفت نے اس زمانے کے سامراجی مدبروں کے مفروضات کا کھوکھلا پن واضح کر دیا۔

دستور بناتے وقت دو ابتدائی مسئلوں کا حل درپیش تھا۔ پہلا یہ کہ کیا دستور کے دو جدا جدا حصے ہوں اور دونوں کو پالیمنٹ الگ الگ پاس کرے۔ ایک حصے میں تو وہ جزو ہو جس کا نفاذ فوراً کر دیا جائے یعنی جن کا تعلق صوبوں سے تھا اور دوسرے جزو پر اس وقت عمل کیا جائے جب چند شرائط پوری ہو جائیں یعنی جب مرکزی حکومت قائم ہو جائے؟ یا ایک ہی دستور بنایا جائے جس میں دونوں اجزا شامل ہوں۔

سکریٹری آف اسٹیٹ کا خیال یہ تھا کہ دو جداگانہ دستور ہوں لیکن وایسرائے نے یہ سوچ کر کہ دستور کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے ہندوستان پر اچھا اثر نہ پڑے گا، اس نے دوسرے طریقے کو اختیار کرنے پر زور دیا اور آخر کار وہی منظور ہوا۔

دوسرا اور بہت اہم سوال یہ تھا کہ مرکزی حکومت کس نوعیت کی ہو۔ سائمن کمیشن نے مشورہ دیا تھا کہ اس کی ہیئت وفاقی ہو لیکن تمام ذمہ داری مرکز کو سونپی جائے اس خیال کو رد کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ہندوستان میں ہر قسم کے اہل الرائے اس خیال پر متفق

تھے اور چاہتے تھے کہ مرکز میں ذمہ دار حکومت ہو لیکن برطانوی لوگ اس رائے کے موافق نہیں تھے کہ عوام کا اقتدار و اختیار مرکز کو حاصل ہو۔ چنانچہ بڑی ہوشیاری سے ایک چال چلی گئی۔ کہا گیا کہ فیڈرل یونین میں دو عملی حکومت کا انتظام کیا جائے گا لیکن اس پر عمل اس وقت ہوگا جب کئی ہندوستانی ریاستیں بھی اس میں شامل ہو جائیں گی۔ یعنی وفاق (فیڈریشن) اسی وقت وجود میں آسکے گا اگر والیان ریاست کو یہ بات منظور ہوئی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں مرکزی حکومت کے لیے دو متبادل دستور رکھے گئے تھے۔ ایک یہ فرض کر کے تیار کیا گیا تھا کہ اگر وفاقی یونین بن جائے جس میں سارا ہندستان یعنی برطانوی ہندوستانی صوبے اور ہندوستانی ریاستیں شامل ہوں تو دستور کیسا ہو۔ اور اگر یہ شرط نہ پوری ہو تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء ہی چند ترمیمات کے ساتھ نافذ رہے گا۔ پہلی صورت تو پیدا ہی نہ ہو سکی کیونکہ ریاستوں کی ایک مقررہ تعداد نے اسے منظور ہی نہیں کیا۔ اس لیے ضروری نہیں ہے کہ اب برطانوی اسکیم کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ البتہ مرکز پر ذمہ دارانہ حکومت منظور کر لینے میں برطانوی طریقہ کار کیا رہا، اس کی وضاحت ضروری ہے۔ ساری اسکیم اس طرح تیار کی گئی تھی کہ ہندوستانی سوسائٹی کے ترقی پسند اور لبرل لوگوں کے لیے تو یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ کوئی اقتدار حاصل کر کے ضروری اصلاحات کر سکیں۔ مثال کے طور پر وفاقی مجلس قانون ساز کو دو ایوانی کر دیا گیا۔ ایوان بالا میں 260 نمائندے مقرر کیے جانے تھے جن میں سے 104 یعنی 2/5 ممبروں کو ریاستوں کے حکمراں منتخب کر کے بھیجتے۔ بقیہ 156 کو مندرجہ ذیل طریقے پر منقسم ہونا تھا۔

140 نشستیں صوبوں کے لیے مقرر کی گئیں جن میں سے 75 عام انتخابات کے لیے تھیں، 6 مندرجہ فہرست ذاتوں کے لیے، 4 سکھوں کے لیے، 49 مسلمانوں کے

لیے اور 6 عورتوں کے لیے۔ 10 نشستیں محفوظ رکھی گئیں: ایک اینگلو انڈین لوگوں کے لیے، سات یوروپین لوگوں کے لیے اور دو ہندستانی عیسائیوں کے لیے۔ چھ نشستیں گورنر جنرل کی مرضی پر چھوڑ دی گئیں کہ وہ اپنی رائے سے جن لوگوں کو چاہے نامزد کردے۔

اس طرح 260 کے ایوان میں آبادی کی اکثریت یعنی ہندو (بہ شمول پست طبقے کے) صرف 31 فی صدی ممبروں کا انتخاب کرسکتی تھی جب کہ 24 فی صدی نشستیں فرقہ وارانہ اقلیتوں میں تقسیم کردی گئی تھیں۔ 40 فی صدی ریاستوں کو دی گئیں اور تقریباً 5 فی صدی نامزد کیے جانے والے لوگوں اور عورتوں کو (جنھیں مجلس قانون ساز منتخب کرتی)۔

دستور کے مرتب کرنے والے چاہتے تھے کہ ریاستیں ایک مخصوص امتیازی رول ادا کریں۔ ان کی طرف سے یہ امیدیں تھیں کہ یہ لوگ صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں مفید ثابت ہوں گے۔ سیاسی ترقی اور سماجی انقلاب کے راستے میں ان کی پوزیشن گویا راستے کی روڑوں کی تھی۔ تمام ریاستوں میں ہندوستان کی کل آبادی کا صرف 24 فی صد حصہ آباد تھا لیکن ان کو 40 فی صدی نشستیں دی گئیں۔ اگر یہ سوچا جائے کہ سارے وفاق ہندستان کی مالیات میں ان ریاستوں سے کتنا لگان وصول ہوتا تھا تو معلوم ہوتا کہ ان سے آمدنی ملک کی کل آمدنی کا صرف $1/_{10}$ تھی لیکن سیاسی اقتدار میں ان کو $4/_{10}$ حصہ دیا گیا۔

ایوان زیریں (فیڈرل اسمبلی) میں 375 ممبر رکھے گئے جن میں 125 نمائندے ریاستوں کے لئے تھے یعنی 24 فی صدی آبادی کو $1/_{3}$ 33 فی صد نمائندگی دے دی گئی تھی۔

250 نشستیں جو صوبوں کے لیے مخصوص کی گئی تھیں ان کی تقسیم اس طرح تھی:

ہندو (بہ شمولیت اقوام مندرجہ فہرست) 105 یعنی 42فی صد نشستیں۔ اس کی وجہ سے اکثریت والے باشندوں کی نمایندگی اقلیت میں ہوگئی۔ مسلمانوں کو 82 نشستیں ملیں یعنی 24فی صد آبادی والوں کو تقریباً33فی صدی نشستیں مل گئیں۔ بقیہ اقلیتوں کو 24، صنعت وتجارت والے طبقے کو 11، مزدوروں کو 10، زمینداروں کو 7 اور عورتوں کو 9 نشستیں ملیں۔

اس کے علاوہ برطانوی صوبوں سے فیڈرل اسمبلی میں منتخب ہوکر جانے والے بہت سے ممبروں کا انتخاب خود انہیں کے فرقے والے ان ممبروں کے ذریعہ ہوتا تھا جو صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر ہوں اور طریقہ انتخاب یہ رکھا گیا کہ واحد منتقل کیے جانے ووٹ سے تناسب کے ساتھ نمائندگی ہو۔

فیڈریشن کی انتظامیہ مقرر کرنے کا اختیار ملک معظم کے نمائندے گورنر جنرل کو حاصل تھا اور گورنر جنرل کو اپنے کاموں میں مشورہ اور مدد دینے کے لیے وزراء کی ایک کونسل، جس کی تعداد دس ممبروں سے زیادہ نہ ہو، فراہم کی گئی۔ وزرا کا تقرر گورنر جنرل کے سپرد تھا اور جتنی مدت کے لیے وہ چاہتا انہیں مقرر کرسکتا تھا۔ یہ وزرا مجلس قانون ساز کے ممبر تو ضرور ہوتے لیکن مجلس قانون ساز کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری نہ تھی اگرچہ دستاویز ہدایات (Instrument of Instruction) میں صاف تحریر تھا کہ ان وزرا کو مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہونا چاہئے۔

گورنر جنرل کے کچھ اختیارات تو اس کی ذاتی مرضی پر منحصر کردیے گئے تھے، بعض صورتوں میں وہ اپنا ذاتی فیصلہ دے سکتا تھا اور سب پر مزید یہ کہ اس کو حکومت کی کسی کارروائی کو مسترد کردینے کا حق حاصل تھا۔

مجلس قانون ساز کے اختیارات محدود تھے۔ مالیات کے معاملات میں بھی اور ان امور میں بھی جو گورنر جنرل کے لیے مخصوص طور پر محفوظ تھے یعنی دفاع، امور خارجہ،

کلیسائی امور اور مستثنیٰ علاقوں کے متعلق اختیارات۔ سول سروس اور پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرری سکریٹری آف اسٹیٹ کے اختیار میں تھی اور ان افسروں کے حقوق اور شرایط ملازمت کا تحفظ خاص قوانین کے تحت تھا۔

مجلس قانون ساز کے اختیارات قانون سازی بھی محدود تھے۔ اس کے ممبران دفاع کے معاملات، سول سروس کے افسروں کے حقوق، اقلیتوں اور ریاستوں کے متعلق کوئی قانون نہیں بنا سکتے تھے نہ ایسی تجاویز منظور کرا سکتے تھے جن کی زد میں برطانیہ کے اقتصادی مفادات آ سکتے ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گورنر جنرل جس بل کو مجلس قانون ساز پاس کرتی، روک سکتا تھا، نامنظور کر سکتا تھا، آئندہ غور کرانے کے لیے ملتوی کرا سکتا تھا اور مسترد بھی کر سکتا تھا۔ اس کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ ایسے قانون نافذ کر دے یا ایسے فرمان جاری کر دے جو چھ ماہ تک قانون کا درجہ رکھتے ہوں۔

گورنر جنرل کے اختیارات بہت وسیع تھے کیونکہ متعدد امور صرف اس کی مرضی پر منحصر تھے۔ جن میں اس کو اپنے وزیروں سے بھی مشورہ کی ضرورت نہ تھی نہ مجلس قانون ساز کی صلاح کی۔ مزید یہ کہ اس کی چند خاص ذمہ داریاں تھیں، جن کو وہ خود اپنی رائے اور فیصلہ کے مطابق پوری کرتا۔ یہ ذمہ داریاں ان چار امور کے علاوہ تھیں جو صرف اس کے زیر انتظام تھیں۔

ان سب باتوں کے پیش نظر فیڈرل یونین (وفاقی اتحاد) کو مرکز پر خود ذمہ داریاں منتقل ہوئیں وہ نہایت قلیل تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی وزیروں کو لوگوں کی سماجی یا اقتصادی فلاح و بہبود کے لیے یا ملک کے انتہائی ضروری معاملوں کو حل کرنے کے لیے تدابیر اختیار کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ بہر حال سلطنت برطانیہ کی فصیل کے برج کے طور پر ہندوستان محفوظ رہا۔

جہاں تک دستور کے صوبائی حصے کا تعلق ہے، 1935ء کے ایکٹ میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی۔ وفاق کے اصول کو مان لینے کی وجہ سے صوبوں کو چند ذمہ داریاں منتقل کردینے کے باعث انہیں وفاق کا ماتحت نہیں بلکہ ایک خود مختار جزو سمجھا جاسکتا تھا لیکن حکومت ہند اور سکریٹری آف اسٹیٹ سے بظاہر آزاد ہونے کے باوجود صوبوں کا اختیار اتنا ہی محدود رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ خاص تبدیلی صرف یہ تھی کہ محفوظ اور منتقل شدہ امور کی تقسیم ختم کردی گئی تھی۔ دوعملی ختم کردی گئی تھی اور صوبائی حکومت کی تقریباً تمام تر ذمہ داری صوبوں کو منتقل کردی گئی تھی۔

دوسری پیش رفت یہ ہوئی تھی کہ حق رائے دہندگی آبادی کے 2.8 فی صد سے بڑھا کر 11 فی صد کردیا گیا تھا اس طرح سے کہ جائدادی ملکیت کی اہلیت میں کمی کردی گئی تھی۔ قانون اسمبلیوں اور قانون ساز کونسلوں کی ساخت پرانے اصولوں کی بنیاد ہی پر قائم رہی۔ جداگانہ فرقہ وارانہ نمائندگی کا مذموم طریقہ برقرار رہا بلکہ بڑھادیا گیا۔ اقلیتوں کو ان صوبوں میں جہاں وہ اقلیت میں تھے نمائندگی ان کی آبادی کے لحاظ سے زیادہ دی گئی لیکن پنجاب اور بنگال میں ہندو اقلیتوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی جو مسلمانوں کو ملی۔ مسلمانوں کو جو پنجاب اور بنگال میں اکثریت میں تھے پنجاب مجلس قانون ساز میں 50 فی صدی سے کچھ زیادہ اور بنگال مجلس قانون ساز میں 50 فی صد سے کچھ کم نشستیں دی گئیں اور سکھوں اور یوروپین لوگوں کی تعداد میں رعایت ملحوظ رکھی گئی۔ بعض صوبوں میں دوایوانی مجالس قانون ساز قائم کی گئیں۔

مرکز کے متعلق یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ پارلیمنٹ کے طاقتور پہاڑ نے بڑی محنت سے ایک چوہا پیدا بھی کیا تو وہ مردہ پیدا ہوا۔ لہٰذا یہ مان لینا چاہئے کہ خود اختیاری حکومت کی منزل اتنی ہی دور رہی جتنی کہ پہلے تھی اور درجہ نوآبادیات کا خواب تو فضا میں تحلیل ہوگیا۔

سیموئل ہور نے اپنے فیصلے کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے لکھا: ''ویسٹ منسٹر کے تحریری قانون نے اس صورت حال کو بالکل تبدیل کر دیا ہے جیسا کہ اس وقت تھی اور ہیلی فکس نے اپنی تقریر میں بتائی تھی......... کیا یہاں اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کے فرائض منصبی آئندہ کسی زمانے میں بالکل وہی فرائض ہوں گے جو ویسٹ منسٹر کے تحریری قانون میں بتائے گئے ہیں؟''[1] اس نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ انڈین کمپنی کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ دستور کے دیباچے میں نو آبادیاتی درجے کا کوئی ذکر نہ کیا جائے اور صرف قدامت پسند ممبر ہی نہیں بلکہ بہت سے لبرل اور چند لیبر پارٹی کے ممبر بھی درجۂ نو آبادیات کا ذکر کرنے کے خلاف تھے۔ اس نے مزید یہ بتایا کہ ''شاید آپ کو یہ بات جاننے میں دلچسپی ہو کہ آسٹن چیمبرلین اور یوسیس پرسی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر دستور کے دیباچے میں وہ چیزیں درج کی جاتیں جن کا مطالبہ بہت سے ہندستانی کر رہے تھے تو بل کبھی منظور نہ ہوتا اور وہ اور ان کے رفقا اس کی مخالفت کرتے۔''[2]

ولنگڈن نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ ایک نیا دیباچہ دستور کے لیے تیار کیا جائے جس میں ہندوستانی پالیسی کی منزل یعنی نو آبادیاتی درجہ کا ذکر کیا جائے لیکن اس کی بات رد کر دی گئی اور برطانوی حکومت نے نئے دیباچے میں اس قسم کی کسی بات کا ذکر کرنے سے انکار کر دیا لیکن 1919ء کے ایکٹ کا دیباچہ دسویں گوشوارے میں برقرار رکھا جس میں منسوخ شدہ قوانین کا ذکر تھا۔ اے۔ بی کیتھ نے اس پر یوں تبصرہ کیا: ''اس عجیب الخلقت قانون سازی کی مثال مبصرین کی نظر میں چیشائر کی بلی کی اس

1۔ ٹمپل وڈ (سیموئل ہور) کلیکشن: خطوط منجانب سکریٹری آف اسٹیٹ۔ جلد چہارم، سیموئل ہور بنام ولنگڈن، 1935ء

2۔ ایضاً: 24 جنوری 1935ء

مسکراہٹ سے دی جا سکتی ہے جو غائب ہونے کے بعد پھر برقرار کر دی گئی ہو۔"[1]

ایکٹ میں وفاق (فیڈ ریشن) کی اسکیم شامل کر دی گئی تھی لیکن اسے قانونی شکل دینے سے پیشتر اس کے قابل عمل ہونے کے متعلق بڑے شکوک تھے۔ ریاستوں کے راجاؤں نے پہلی گول میز کانفرنس میں تو اس اسکیم کا بڑا خیر مقدم کیا تھا کیونکہ وہ اپنے دو مقاصد اس سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اول تو یہ کہ وہ ریاست کے اندر اپنی داخلی خود مختاری کو لامحدود اور غیر واضح برطانوی اقتدار اعلیٰ اور اس اقتدار کے نائب یعنی وایسرائے کی من مانی مداخلت سے محفوظ کرنا چاہتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ سارے ہندوستان کے انتظامی معاملات میں اپنا اثر قایم کرنا چاہتے تھے۔

لیکن کانفرنس کے ختم ہونے کے فوراً بعد ہی فیڈ ریشن کے مضمرات کے بارے میں ان کو شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ فروری 1935ء میں تمام ریاستوں کے حکمران بمبئی میں مجتمع ہوئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ پہلے اس کی وضاحت کر دی جائے کہ ہمارے تعلقات اقتدار اعلیٰ سے کس طرح کے رہیں گے اس کے بعد ہم طے کر سکیں گے کہ وفاق (فیڈ ریشن) میں شامل ہوا جائے یا نہیں۔ اس سے پہلے دہلی میں 22/جنوری 1935 کو چیمبر آف پرنسز (دیسی ریاستوں کی ایک انجمن) نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں اس بات کو زور دے کر کہا گیا تھا کہ فیڈ ریشن کا نفاذ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ریاستوں کی حکمرانی اور ان کے حکمرانوں کے وہ حقوق جو مختلف عہد ناموں کے ذریعے طے ہو چکے ہیں واضح طور پر تسلیم کر لیے جائیں۔ ہور اس سے گھبرا گیا اور ریاستوں کے وزرا کے خیالات نیز اس قرارداد کی منظوری پر اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے لکھا: "ہمارے دشمن خوش ہو گئے اور دوست سخت پریشان، بلکہ کابینہ میں میرے رفقا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ایسے بل کو آگے بڑھانے سے کیا

---

[1] اے کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا 1935—1600ء (دوسرا اڈیشن 1961ء) ص 316

فائدہ ہوگا۔"[1]

اس نے شکایت کی: "ہم کو آپ کی جانب سے قدرے قلیل بلکہ کوئی مدد نہیں مل رہی ہے۔ اگرچہ کٹر قدامت پسندوں کو برابر مطلع کیا جاتا رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور روزانہ وہ اپنے دوست راجاؤں پر اپنے اثرات جماتے رہتے تھے، اب جو کچھ ہوا اس سے تو ہم اپنے کو بالکل بے بس اور مجبور پاتے ہیں۔"[2]

ہور کے بیان کے مطابق ونسٹن چرچل اور کورٹالڈ، پٹیالہ اور دھول پور پر زور ڈال رہے تھے اور راور مور اور دیگر صاحبان زر کثیر صرف اس بات کے لیے صرف کر رہے تھے کہ والیان ریاست وفاق میں شریک ہونے سے انکار کر دیں۔ ولنگڈن کو بتایا گیا کہ رش بروک ولیمس جو ایک زمانے میں گورنمنٹ کے سالانہ رسالہ "انڈیا" کا اڈیٹر رہ چکا تھا اور اس کے بعد والیان ریاست کا مشیر ہو گیا تھا، والیان ریاست کے پاس جا جا کر یہ کہہ رہا تھا کہ گورنمنٹ کو فیڈریشن قائم کرنے کے معاملے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

لیکن اسی زمانے میں سوشلسٹ ذہنیت رکھنے والے کانگریسیوں کے بدلے ہوئے رویّے سے والیان ریاست خوف زدہ ہو گئے۔ 1935ء کے ایکٹ کے منظور ہو جانے تک کانگریس نے گاندھی جی کے مشورے کے تحت ریاستوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے گریز کیا تھا اور دستوری تبدیلیوں کے مسئلے کو خود ریاستوں کے باشندوں پر چھوڑ دیا تھا لیکن جب 1934ء میں گاندھی جی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تو کانگریسیوں کو قابو میں رکھنے والی طاقت بیچ سے ہٹ گئی اور تب کانگریس نے جواہر لال کی سربراہی میں ریاستوں کی عوامی تحریک میں مستعدی سے دلچسپی لینا شروع

1۔ ٹمپل وڈ (سیموئل ہور) کلیکشن: سکریٹری آف اسٹیٹ کے خطوط: جلد چہارم، خط بنام ولنگڈن، یکم مارچ 1935ء

2۔ ایضاً ایضاً

کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ تو لاپرواہ رہی اس خیال سے کہ والیان ریاست خود ہی فیڈریشن میں شرکت کرنے سے انکار کردیں گے لیکن والیان ریاست نے جب فیڈرل یونین کے مضمرات پر غور کیا اور اس پارٹی کے بدلے ہوئے نظریات کا مطالعہ کیا جس کو آئندہ اقتدار حاصل ہوسکتا تھا تو ان کی رائیں بھی بدلنے لگیں۔ کانگریس کے اس مطالبے نے کہ ریاستوں کو اپنے وہاں ذمہ دار حکومتیں قائم کرنا چاہئیں اور اپنی رعایا کو موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کر کے وفاقی مجلس قانون ساز میں بھیجیں، والیان ریاست کو سخت تشویش میں ڈال دیا۔

والیان ریاست کے اس تذبذب، کانگریس کی علی الاعلان مذمت، قدامت پسند ٹوڈی پارٹی والوں کی دشمنی اور مانچسٹر والوں کی مخالفت کے باعث گورنمنٹ برطانیہ ہچکچانے لگی کہ اس بل کو پارلیمنٹ میں آگے بڑھایا جائے یا نہیں لیکن اب وہ بہت آگے بڑھ چکے تھے اس لیے گورنمنٹ کے افسران بالا نے بادل ناخواستہ طے کرلیا کہ بل کو منظور ہی کرالیا جائے۔ یہ بھی امید تھی کہ شاید ولنگڈن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو۔ اس نے ہور سے کہا تھا ''میں نے عموماً محسوس کیا ہے کہ ہندوستانی جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہم نے کسی خاص کام کو کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے تو وہ چند ہفتے تو چیخ پکار مچاتا رہتا ہے جیسا کہ اس نے اس معاملے میں کیا ہے اور اس کے بعد وہ بیٹھ جاتا ہے اور صورت حال کو قبول کرلیتا ہے۔''[1]

بہ ظاہر ذمہ دار حکومت دینے میں خلوص نیت سے نہیں بلکہ اس اندیشہ سے کہ صورتحال تباہ کن نہ ہوجائے یعنی اس خوف سے کہ کہیں ہندوستان سلطنت برطانیہ سے تمام رشتے منقطع نہ کرلے اگر کوئی دستوری پیش رفت نہ دکھائی جائے، پارلیمنٹ کی تمام خاص پارٹیوں نے بڑی اکثریت کے ساتھ اس بل کو منظور کرلیا۔ بالڈون نے

1۔ ایضاً ولنگڈن بنام سیموئل ہور، 13 / جنوری 1935ء

ترمیم شدہ دستور کی ان الفاظ میں سفارش کی:

''وسیع دنیا کے تمام تغیرات واتفاقات کو دیکھتے ہوئے میں نے بہت غور کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ اب آپ کو برصغیر ہندوستان کو ہمیشہ سلطنت برطانیہ میں شامل رکھنے کا بڑا اچھا موقع مل گیا ہے۔''[1]

اسی دوران دوسمتوں سے متنبہ کرنے والی آوازیں اٹھیں یعنی کٹر ٹوڈیوں اور بنیادی تغیر چاہنے والے سوشلسٹوں (Radical Socialists) نے پورے دستور پر اعتراضات کیے۔ پہلی پارٹی کے ترجمان دارالعوام میں چرچل اور دارالامرا میں لائڈ تھے۔ یہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان خود مختار حکومت چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے ایک غیر اہم طبقے کی طرف سے شوروغل مچانے کے باعث اگر اس سمت میں کوئی پیش رفت روا رکھی گئی تو یہ اقدام تباہی، دست برداری، انتشار اور ابتری کی طرف لے جائے گا۔

دوسری طرف پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے لیڈر اٹیلی نے یہ دلیل پیش کی کہ ''ہندوستان میں بہتر حکومت کے لیے کسی قسم کی قانون سازی اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوگی جب تک وہ ہندوستانی باشندوں کے تعاون اور رضامندی سے واضح طور پر ہندوستان کے نو آبادیاتی درجے کے حق کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کے حصول کے ذرائع کو اس میں شامل نہیں کرتی۔''[2]

1۔ مائی فادر: دی ٹرو اسٹوری (1955ء) از او، آر، بالڈون ص 76-175 (ماخوذ از برٹین اینڈ مسلم انڈیا، از کے۔ کے۔ عزیز ص 134)

2۔ ایچ۔ سی۔ ڈیبٹس۔ پانچویں سیریز، جلد 297، کالم 1167، دارالعوام میں۔ سی۔ اٹیلی کی تقریر 6/ فروری 1935ء

ایٹلی نے بل میں 'نوآبادیاتی درجہ' کا فقرہ نہ استعمال کیے جانے پر افسوس ظاہر کیا اور یہ بھی واضح کیا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کو جو خوش فہمی تھی کہ اس بل کا ہندوستان میں خیر مقدم کیا جائے گا غلط ثابت ہوئی کیونکہ اسے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی تمام جان دار تحریکوں نے اسے نامنظور کر دیا ہے۔ ایٹلی کا خیال تھا کہ اس بل میں کئی خامیاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ دستور بندھا ٹکا اور بے لوچ ہے اور اس میں نمو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں ہندوستانیوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کیا گیا:

'' کیونکہ اگر آپ بل کا مطالعہ کریں تو خاص چیز جو آپ کو عجیب معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ اس میں تحفظات کی کثرت ہے۔ بل کا مرکزی خیال بے اعتمادی ہے یعنی ہندوستان پر کسی قسم کا اعتقاد نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کو اپنی خارجہ پالیسی اور مالیات پر اختیار نہیں دیا گیا۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ صوبوں میں بسنے والے لوگ وہاں کی دہشت پسندیوں پر قابو نہیں پا سکتے۔ سارے بل کو دیکھ کر یہ نہیں واضح ہوتا کہ ہم ایسا دستور دے رہے ہیں جس کو ہندوستانیوں کو چلانا ہے بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس ایک دستور ہے جس میں ہر جگہ تحفظات ہر موقع کے لیے پیش پیش ہیں۔ دراصل جس بات کا فقدان اس میں نظر آتا ہے وہ ہیں ہندوستانی لوگ۔'' [1]

انہوں نے اس بل کو ایک مشنیری سے تشبیہ دی اور ایک ایسے جہاز سے جس کو چلانے والی توانائی مفقود تھی۔ '' یہ گویا رابنسن کروسو کا جہاز ہے۔ اس بل کو رابنسن کروسو نے تیار کیا ہے اور اس میں ہر موقع پر جو ہندوستانی پیش کیے گئے ہیں ان کی حیثیت اس مرد سے بہتر نہیں ہے جس کا نام فرائیڈے تھا (اور جو رابنسن کا غلام تھا) سارے بل میں رتبے اور حیثیت کی نابرابری مستقل طور پر دکھائی گئی ہے۔''

آخر میں انہوں نے آگاہ کیا: '' جن واقعی تبدیلیوں کے مطالبے ہندوستان میں

---

1. ایضاً

کیے جا رہے ہیں انہیں ایسا دستور بروئے کار لانے سے حاصل کرنا ناممکن ہے جس کو بعض لوگوں نے مجبوراً منظور کرلیا ہے اور جسے امیروں کا طبقہ چلائے گا لیکن جسے ہندوستان کی کسی ترقی یافتہ پارٹی کا یا ان لوگوں کا جو واقعی تبدیلی چاہتے ہیں، تعاون حاصل نہ ہوگا۔'' انھوں نے اصرار کیا: '' ہندستانیوں کو مستقبل میں خود اپنے ملک پر حکومت کرنے کی ذمہ داری سونپنا چاہیے اور یہ بل ایسا نہیں کر رہا ہے اور نہ کرسکتا ہے اسی لیے ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔'' 1

دستور سازی پر ایک مستند ماہر، اے، بی، کیتھ نے بھی اٹیلی کی ہم نوائی کی۔ انھوں نے لکھا: '' اس تاثر کو دور کرنا مشکل ہے کہ یا تو گورنمنٹ صاف صاف اس کا بات کا اعلان کردیتی کہ ذمہ دار حکومت دینا ممکن نہیں ہے یا پھر واقعتاً دے دیتی۔ اسی لیے تعجب کی بات نہیں ہے اگر ایسے گڈمڈ دستور کا کوئی احسان نہیں مان رہا ہے۔ نہ کوئی فوری طور پر اس سے تعاون کر رہا ہے جس میں مخصوص ذمہ داریاں صوبائی نظام میں رکھی گئی ہوں اور جس میں شخصی طور پر فیصلہ کرکے قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔

'' جہاں تک فیڈریشن کی اسکیم کا تعلق ہے وہ ناقابل اطمنان ہے...... برطانیہ کی جانب سے اس اسکیم کی موافقت اس لیے ہو رہی ہے کہ اسکیم میں کٹر قدامت پسندی کا عنصر برقرار رکھا گیا ہے تاکہ برطانوی ہند میں پیدا ہونے والے جمہوریت کے خطرناک عناصر کا مقابلہ کیا جاسکے...... ہندوستانیوں کی اس دلیل کو رد کرنا مشکل ہے کہ فیڈریشن کا منصوبہ دراصل برطانوی ہند کی مرکزی حکومت کو ذمہ داریاں نہ سپرد کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ اس کے علاوہ وفاق کے سپرد دفاع اور امور خارجہ کرنے کو (جسے اس کے کنٹرول میں ہونا لازمی ہے) ذمہ داریاں سپرد کردینے کا نام دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' 2

---

1 ایضاً

2 بحوالہ گزشتہ، از اے، بی کیتھ، ص 74-473

مشہور سیاسی مفکر ہیرالڈ لاسکی نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ اسکیم ہر طرح کے تحفظات اور رکاوٹوں سے داغ دار ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ "جدید بدترین دستوروں میں جتنی بدترین باتیں ہیں وہ سب اس میں پیش کردی گئی ہیں۔" [1]

لیکن پروفیسر کوپ لینڈ نے 1935ء کے ایکٹ کو یہ کہہ کر مناسب قرار دیا کہ "یہ نہ صرف 1917ء کی پالیسی کی تصدیق کرتا اور اسے آگے بڑھاتا ہے بلکہ اس میں یہ پیش بینی بھی موجود ہے کہ ہندوستان دیگر دولت مشترکہ ممالک کے ساتھ مکمل مساوات کا درجہ نسبتاً تھوڑے ہی عرصے میں حاصل کر سکے گا"۔ [2] منزل مقصود پر نہ پہنچنے کی خامی کے لیے اس نے فرقہ وارانہ اختلافات کو مورد الزام ٹھہرایا اور کہا کہ اس کے ذمہ دار خود ہندوستان لوگ ہیں۔ اگر دستور کا بغور مطالعہ کیا جائے اور برطانوی نیز ہندوستانی ماہرین دستور کی وزنی رایوں کو پیش نظر رکھا جائے تو پروفیسر کوپ لینڈ کی اس بات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔

2- ہندوستانی تنقید

ہندوستانی قانون ساز اسمبلی نے 4/فروری 1935ء کو اسمبلی کے لیڈر کی تحریک پر پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر غور وخوض کیا۔ حزب مخالف کے لیڈر بھولا بھائی دیسائی، آزاد ممبروں کے لیڈر جناح، نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر راینے اور کئی دوسرے لوگوں نے کمیٹی کی سفارشات پر نہایت کڑی تنقید کی۔ بھولا بھائی نے کہا کہ "رپورٹ سے نہ تو ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کا مقصد پورا ہوتا ہے نہ گورنمنٹ کے مقاصد کا۔" [3] انھوں نے

---

1. ہومس۔ لاسکی لیٹرس (1953) جلد دوم، ص 1396، خط لاسکی بہ نام جسٹس ہومس
2. دی انڈین پرابلم۔ جلد اول، از، آر کوپ لینڈ، ص 47-146
3. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1935ء جلد اول، ص 123 ہندوستانی قانون ساز اسمبلی میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر مباحثہ بتاریخ 7/جنوری 1935ء

ایوان کو خودداری کا واسطہ دلا کر اپیل کی کہ دستور نامنظور کر دیا جائے۔ جناح نے وفاقی اسکیم کو سراسر مہمل، قطعی ناقابل قبول اور بالکل ناقابل عمل قرار دیا۔ انھوں نے ایک ترمیم پیش کی: ''جہاں تک صوبائی گورنمنٹ کی اسکیم کا تعلق ہے اس ایوان کی رائے ہے کہ یہ نہایت غیر اطمینان بخش اور مایوس کن ہے'' اور ''مرکزی گورنمنٹ کی اسکیم کے متعلق جسے 'کل ہند فیڈریشن، کہا گیا ہے اس ایوان کی قطعی رائے ہے کہ یہ بنیادی طور پر فضول ہے اور برطانوی ہندوستان کے باشندوں کے لیے قطعی ناقابل قبول''۔[1]

دیگر سیاسی پارٹیوں نے اس سے بھی زیادہ سخت مذمت کی۔ ہندومہا سبھا نے اپنے کانپور کے اجلاس میں جو 20/اپریل سے 22/اپریل 1935ء تک ہوا تھا یہ خیال ظاہر کیا کہ پارلیمنٹ میں جو گورنمنٹ آف انڈیا بل پیش ہے وہ قطعی طور پر ہندوستان کے ہر طبقہ کے نزدیک ناقابل قبول ہے کیونکہ مجوزہ دستور تو موجودہ دستور سے بھی زیادہ خراب ہی نہیں زیادہ رجعت پسند اور قومیت و جمہوریت کی ترقی میں حائل ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں 11/اور 12/اپریل 1936ء کو سید وزیر حسن کی صدارت میں ہوا۔ صدر نے نئے دستور کا ان الفاظ میں ذکر خیر کیا: ''برطانوی پارلیمنٹ واقعتاً ہم پر ایک ایسا دستور مسلط کر رہی ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ماننے کے کو تیار ہے۔ کئی برسوں کے کمیشنوں، رپورٹوں، کانفرنسوں اور کمیٹیوں کے بعد ایک عجیب الخلقت چیز تیار کی گئی ہے اور اسے ہندوستان کو اس دستوری قانون کے بھیس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ غیر جمہوری ہے۔ اس سے ملک کے نہایت رجعت پسندانہ عناصر کو تقویت پہنچے گی اور بجائے اس کے کہ ہم کو ترقی کے راستوں پر لگائے، وہ ان

1. ایضاً۔ ص 129

طاقتوں کو جو جمہوریت اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں، پابہ زنجیر کر کے کچل دے گا۔ مسلمان کے مختلف طبقے اور مسلم عوام اس نئی اسکیم سے اتنی ہی ایذا اٹھائیں گے جتنی ہندوستان کا کوئی دوسرا طبقہ۔'' 1

لیگ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں 1935ء کا ایکٹ نافذ کیے جانے پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ حقوق اور ذمہ داریاں جو صوبوں کو دی گئی ہیں بیکار اور بے اثر ہیں اور ہندوستانی وفاق (فیڈریشن) کی اسکیم شر انگیز اور مذموم ہے۔

28/دسمبر 1935ء کو موگا میں خالصہ دربار کی صدارت کرتے ہوئے سردار منگل سنگھ نے 1935ء کے ایکٹ کا ذکر کیا اور کہا: ''برطانوی حکومت نے تمام سیاسی ذہن رکھنے والے ہندوستانیوں کی متفقہ رائے پر توجہ نہیں دی اس لیے اس دستور کو متفق علیہ دستور قرار نہیں دے سکتے بلکہ ایسا دستور کہہ سکتے ہیں جسے نہ منظور کرنے والے بے بس لوگوں پر زبردستی عائد کیا گیا ہے۔'' غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں نے بھی نئے دستور کی مذمت میں اسی طرح کی شدت کا اظہار کیا۔

نیشنل لبرل فیڈریشن نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے متعلق 30/دسمبر 1934ء کو درج ذیل قرارداد منظور کی:

''نیشنل لبرل فیڈریشن آف انڈیا پچھلے سال کی قرارداد کی توثیق کرتے ہوئے اس بات پر اظہار فسوس کرتی ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی تقریباً تمام تر متفقہ رائے کو نظر انداز کر دیا اور صرف یہی نہیں ہندوستانی نقطہ نظر سے پیش کیے گئے کسی ایک مشورے کو بھی قبول نہیں کیا۔ بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو مزید قابل اعتراض دفعات کے ساتھ ملک پر عائد کر دیا۔

''لبرل فیڈریشن اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ کوئی ایسا دستور ہندوستانیوں کو

---

1 ہندوستانی سالانہ رجسٹر، 1936ء جلد اول ص 294

مطمئن نہیں کرسکتا جو نوآبادیاتی مملکت کے دستور سے جتنا ممکن ہو قریب تر نہیں آجاتا اور ہندوستان کے باشندوں کو قومی خود مختار حکومت کے پورے اختیارات نہیں دے دیتا اور جس میں قانونا تحفظات کم سے کم رکھے جائیں اور وہ بھی تھوڑی مدت کے لیے، اور جس سے قومیت کے استحکام میں فرق نہ آنے پائے۔''

کانگریس کا موقف غیر مصالحانہ اور قطعی طور پر 1935ء کے ایکٹ کی دفعات کے خلاف تھا۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ دسمبر 1929ء میں کیا تھا اور اس کا بار بار اعادہ کیا تھا۔ گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں اپنی 15 ستمبر کی تقریر میں اسے واضح طور پر سے پیش کر دیا تھا اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے گاندھی جی کی انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد اپنے بمبئی کے اجلاس میں یکم جنوری 1932ء کو اس کی توثیق کر دی تھی۔ اس نے بالا علان کہا تھا: ''مکمل آزادی کے سوا جس میں دفاع، امور خارجہ اور مالیات پر پورا اختیار ملے اور جس میں تحفظات ایسے ہوں جو واضح طور پر قوم کے لیے سود مند ہوں، کوئی اور چیز کانگریس کو مطمئن نہیں کر سکتی۔''

4 جنوری 1932ء لغایت اکتوبر 1934ء کانگریس پر حکم امتناعی لگا رہا لیکن گورنمنٹ کے احکام کے خلاف غیر قانونی طور پر اس نے دہلی میں اپریل 1932ء میں اور کلکتہ میں 31 مارچ 1933ء کو اپنے جلسے کیے اور ان میں ایک قرارداد بھی منظور کی جس میں بیان کیا گیا تھا کہ موجودہ حالات میں کسی قسم کا دستور اس قابل نہ سمجھا جائے گا کہ اس پر غور کیا جا سکے۔ اس کے بعد مجلس عاملہ کے اس جلسے نے جو دسمبر 1934ء میں ہوا نئے دستور کو نامنظور کر دیا اور یہ قرارداد منظور کی:

''یہ دستور جو ملک پر بدیسی لوگوں کے قبضے اور استحصال کو ہمیشہ اور آسانی سے برقرار رکھنے کے لیے ایک بہت بیش قیمت نقاب کی صورت میں تیار کیا گیا ہے موجودہ دستور سے کہیں زیادہ شر انگیز اور خطرناک ہے۔''

قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) کا ردعمل جواہر لال پر ویسا ہی ہوا جو ایک انقلابی اور اشتراکی پر ہوتا۔ انہوں نے 'قرطاس' کو یہ کہہ کر مورد الزام ٹھہرایا کہ اس نے ''پورے ملک کو ایک شان دار ریاست'' میں تبدیل کر دیا ہے اور ہندوستان کو شہر لندن سے منسلک کر دیا ہے اور لوگوں کے مخصوص مفادات کو نہایت استحکام کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے، ساتھ ہی نئے مخصوص مفادات بھی پیدا کر دیے ہیں۔ ہندوستان کا تمام روپیہ ان مفادات کو پورا کرنے کے لیے رہن ہو کر رہ گیا ہے.........صوبوں کو خود مختاری دی جا رہی ہے لیکن گورنر کیسا ہوگا ایک فیاض مگر بہت با اثر ڈکٹیٹر جو ہم کو ہمہ وقت اپنے قابو میں رکھے گا اور سب سے بڑھ کر بلند ترین شخصیت سب سے بڑے ڈکٹیٹر یعنی وایسرائے کی ہوگی جس کو مکمل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جو چاہے کرے اور جب چاہے روک دے''۔ [1]

جب ایکٹ پاس ہو گیا تو انہوں نے لکھا: ''سیاسی تبدیلیوں کے نقطۂ نظر سے یہ مجوزہ دستور لغو اور مہمل ہے۔ سماجی اور اقتصادی نقطہ نظر سے اس سے بھی بہت بدتر...... برطانیہ نے اپنا اقتدار بغیر ذمہ داریوں کے برقرار رکھا ہے اور اپنی عریاں مطلق العنانی کو چھپانے کے لیے اس نے معروف انجیر کے پتوں سے بھی ستر پوشی نہیں کی ہے۔'' [2]

گورنمنٹ کا رویہ کانگریس کی طرف خوف اور نفرت کا ایک عجیب مرکب تھا۔ خوف اس لیے تھا کہ کانگریس کا عوام پر بہت زیادہ اثر تھا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لیے گورنمنٹ مجبور ہو جاتی تھی کہ مصالحت آمیز اشارے کرے، اور ہچکچاتے ہوئے عارضی طور پر چند معمولی اختیارات کو منتقل کر دینے کی بات کرے۔ نفرت کے باعث گورنمنٹ کانگریس کی تنظیم کو حقیر گردانتی تھی اور اقلیتوں، اعتدال پسندوں اور

---

1. این آٹو بایوگرافی (ایک خود نوشت سوانح عمری) از جواہر لال نہرو۔ ص 386

2. ایضاً ص 581

ریاستوں کو بہت مبالغہ آرائی کے ساتھ اہمیت دیتی تھی۔ نفرت ہی کی وجہ سے گورنمنٹ عدم تشدد کے ساتھ عدم تعاون کرنے والوں کے ساتھ بڑے ظلم و تعدی کے ساتھ پیش آتی تھی یعنی جلوسوں اور جلسوں کی ممانعت، اندھا دھند بڑے پیمانے پر گرفتاریاں، لاٹھی چارج، مار پیٹ اور گولیاں چلانا، قیدیوں سے برا برتاؤ، جرمانے، جائدادوں کی ضبطی اور پولیس کی زیادتیاں وغیرہ۔

گورنمنٹ مخالفت کے جوش کو دبانے میں تو کامیاب نہیں ہوسکی البتہ تلخی، بدمزگی اور بے اعتمادی بڑھا دینے میں کامیاب رہی اور اتنی کہ اب وہ جو تدبیریں پیش کرتی تھی انھیں شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا اور اس کی تمام حرکات پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔

1935ء کے ایکٹ کو نامنظور کرنے میں مسلم لیگ، انڈین نیشنل کانگریس سے متفق تھی خصوصاً اس جزو سے جو مرکزی حکومت کے متعلق تھا لیکن اس نے جن وجوہ سے اسے نامنظور کیا وہ کانگریس کے وجوہ سے بالکل مختلف تھے۔ لیگ نے محسوس کر لیا تھا کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں ہندوؤں کی تعداد اکثریت میں ہوگی اور اسے سیاست کے کسی داؤ پیچ سے اتنا کم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلم اقلیت اپنے کو بالکل محفوظ سمجھ سکے۔ فیڈریشن کے نافذ ہو جانے اور اس میں ریاستوں کے شامل ہو جانے کے باعث فرقہ وارانہ نابرابری بہت بڑھ جائے گی کیونکہ ریاستوں میں بھی ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے فوری طور پر لیگ نے یہ تجویز کیا کہ مرکز کے اختیارات تین طریقوں سے کم کر دیے جائیں: (1) مرکزی فیڈرل گورنمنٹ کے ذمہ شعبوں کی تعداد کم سے کم کر دی جائے یعنی صرف وہ شعبے اس کے ماتحت رکھے جائیں جنھیں صوبے اور ریاستیں متفقہ طور پر منظوری دیں (2) صوبائی حکومتوں کے اختیارات زیادہ سے زیادہ کر دیے جائیں۔ یہاں تک کہ انھیں صوبائی

فوجیں رکھنے کا اختیار بھی حاصل ہو، اور (3) باقی اختیارات اور اقتدار صوبوں کو سونپ دیا جائے۔

مسلم لیگ دراصل یہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کی شمال مغربی اور مشرقی سرحدوں پر خود مختار مسلم صوبہ یا صوبے ہوں تاکہ بقیہ ہندوستان کے مقابلے میں طاقت کا توازن برقرار رہ سکے اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ بقیہ ہندوستان میں اچھے برتاؤ کی گارنٹی ہو جائے۔ چونکہ 1935ء کے ایکٹ سے ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا اس لیے اس نے اسے یکسر نامنظور کر دیا۔ 1935ء کا ایکٹ برطانوی حماقت اور کج روی پر اپنا زور صرف کرنے کی ایک یادگار چیز تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ہندستان کی ذہنیت، اس کے نصب العین، اس کے حوصلوں، صلاحیتوں، طاقت، اعلیٰ مقاصد کے لیے خود کو وقف کر دینے اور ان کے حصول کے لیے ہر قیمت دینے کی ہمت پر حیرت تھی یا کہ محض ناواقفیت تھی۔ اسی لیے وہ اپنے اوپر عائد کردہ نامقبول کام میں لگے رہے۔

برطانوی حکمراں ہندوستان پر اپنے ڈیڑھ سو سالہ حکومت کرنے کے تجربے کے باوجود، محض تکبر اور تنفر کی بنیاد پر ہندوستان کی قومی تحریک کو نفرت اور تمسخر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ لیکن بہت کچھ کھو کر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ہندستان کے لوگوں اور یہاں کی تحریکوں کا اندازہ اور حکومتی تدابیر کے متعلق ان کی پیشین گوئیاں بری طرح غلط ثابت ہوئیں۔ پھر بھی وہ غیر مطمئن عناصر یعنی مسلمان، ہندوؤں میں پست اقوام کے طبقے، تنگ نظر، خود غرض والیان ریاست جیسے لوگوں کی اہمیت اور طاقت کو بڑھا بڑھا کر بیان کرتے رہے اور آزادی اور ترقی کے ان شیدائیوں کو جو ہندوستان کو اس کی نکبت، غربت اور جہالت کے دلدل سے نکالنے کے لیے دل سے جدوجہد کر رہے تھے حقیر سمجھتے رہے۔

سات سال کا طویل عرصہ ضایع ہو گیا۔ پارلیمینٹس، کابینی وزرا، وزرائے اعظم،

کئی سکریٹری آف اسٹیٹ، کئی وایسرائے، اگزیکٹیو کونسلر، گورنروغیرہ محنت کرتے رہے لیکن سب بے نتیجہ رہی۔ کاغذوں کے پہاڑ جیسے انبار لگ گئے روشنائی کے دریا بہہ گئے ، لاتعداد کروڑوں الفاظ تقریروں میں بول ڈالے گئے۔ اس کے علاوہ بحری اور بری سفر، کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں زرکثیر صرف کرڈالا گیا اور یہ سب کس لیے؟ مور کے نزدیک یہ سب صرف خام خیالی کے سوا کچھ نہ تھا۔

3- انتخابات، نئے دستور کے تحت

گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ 1935ء کے ایکٹ کا نفاذ یکم اپریل 1937ء سے ہو جائے گا لیکن ایکٹ کے اس جزو کا نفاذ جو مرکزی حکومت سے متعلق ہے اس وقت سے ہوگا جب پہلے یہ شرط پوری ہو جائے گی کہ ریاستوں کی کافی تعداد فیڈریشن میں شامل ہونا منظور کرلے گی۔ چونکہ یہ شرط پوری نہ ہوسکی فیڈرل یونین (وفاقی اتحاد) کا دستور ملتوی رہا۔ اس لیے یکم اپریل سے نئے دستور کے صرف اس جزو کا نفاذ ہوسکا جس کا تعلق صوبائی حکومتوں سے تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ ہر چند تمام سیاسی پارٹیوں نے صوبائی دستور سے بے اطمینانی ظاہر کی تھی، پھر بھی جب صوبوں کی مجالس قانون ساز میں انتخابات کا اعلان ہوا تو سبھی پارٹیوں نے طے کرلیا کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ چند پارٹیوں کی تنقیدیں صرف چرب زبانی دکھانے کی خاطر تھیں اور انھوں نے واقعی طور پر نہیں بلکہ محض تصنع کے طور پر دستور کی مذمت کی تھی لیکن دوسری پارٹیاں راسخ العقیدہ تھیں اور نئے دستور کی قطعی اور یکسر مخالف۔

بعض پارٹیاں چاہتی تھیں کہ جو کچھ ملا ہے اسے آزمالینا چاہئے۔ بعض دوسری پارٹیاں یہ کہتی تھیں کہ ہم اس پر عملدرآمد کرکے اس دستور کو تباہ کردینا چاہتے ہیں تاکہ

اس کے بجائے کوئی ایسا دستور لایا جاسکے جو ملک کے لیے واقعی مفید ہو اور ملک میں موجودہ خرابیوں اور کوتاہیوں کو دور کر سکے۔ ان دونوں قسم کی پارٹیوں میں بظاہر فرق صرف الفاظ کا تھا۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا۔ شاید دونوں قسم کی پارٹیاں یہ سمجھتی تھیں کہ ان کو دستور سے جتنا مل سکتا تھا اس سے کچھ زیادہ مل جائے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ دستور بنایا اس نوعیت کا گیا تھا کہ اس سے ایسی غلط امیدیں قائم ہوسکیں۔ صوبائی خودمختاری میں اگرچہ وہ تحفظات نہ تھے جو دستور میں رکھے گئے تھے پھر بھی صوبوں کو وہ اختیارات نہیں ملے تھے جو ملک کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں بنیادی اصلاحات لانے کے ضروری ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اصلاحات قومی معاشیات میں بنیادی تبدیلیاں لانے پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثلاً بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی جس کے لیے سرمایہ کاری کے مسائل ہوتے ہیں۔ تکنیکی ترقی، درآمد و برآمد پر محصول کا معاملہ، ذرائع نقل وحمل، مواصلات، شرح تبادلہ زر، بیرونی امداد وغیرہ لیکن یہ سب صوبائی حکومتوں کے اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں۔

اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ دستور پر ناموافق حالات میں کام کرنا تھا تو پھر ناکامی اور اس کے باعث ناامیدی پیدا ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

بدقسمتی سے اس زمانے میں جب کہ یہاں نیا دستور آزمائشی دور سے گزر رہا تھا، اسی زمانے میں مالی بحران نے انگلستان کو بہت گہرائی میں پہنچادیا تھا اور جس سے وہاں کی سیاست متاثر ہوگئی تھی۔ آئیور جیننگس کے الفاظ میں: "1931ء میں جو کچھ ہوا وہ گویا شعبہ جاتِ معاشیات وسیاسیات کا ڈرائنگ روم میں کھیلا جانے والا ایک کھیل تھا۔" 1

اصول بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ شخصیتیں سامنے آگئیں۔ لیبر پارٹی کی

1۔ پارٹی پالیٹکس، دی گروتھ آف پارٹیز، از آئیور جیننگس، جلد دوم، ص289

رجائیت پسندی اور پیش بینی کے پروگرام کی جگہ بوڑھی پارٹی کی رجعت پسندی اور واقعیت نے لے لی۔ 1931ء کے الیکشن نے ایک نئی سوسائٹی اور ایک نئی تہذیب پیدا کرنے کے جوش کو دبا دیا اور یورپ کے فاشزم اور نازی ازم کے نظریات میں دلچسپی پیدا کرادی اور اس کا اثر ان مباحثوں پر پڑا جو پارلیمنٹ میں ہندوستان کا دستور بنانے کے سلسلے میں ہو رہے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دستور جو پک پکا کر نکلا وہ کسی مزے کا نہ تھا۔ اس کے برطانوی مرتبین اس کے انجام کے متعلق اسی طرح شبہات رکھتے تھے جس طرح کہ ہندوستانی لوگ جن کا اس سے تعلق خاص تھا۔

لیکن جب دستور کا نفاذ کیا گیا تو انگلستان اس وقت ایک اور بھی زیادہ تباہ کن پریشانی سے دوچار ہو گیا تھا یعنی اس بین الاقوامی دہشت سے جو اولوالعزم ہٹلر نے جرمنی میں 1933ء میں برسراقتدار آنے پر پھیلا رکھی تھی۔ اگرچہ انگلستان میں جنگ مخالف جذبات ابھر رہے تھے جیسا کہ نیشنل پیس پیکٹ میں اور لیگ آف نیشنز میں اجتماعی تحفظ اور اقتصادی پابندیوں کی حمایت میں پرجوش لفاظیوں سے ظاہر ہوتا تھا لیکن جب ہٹلر نے ویسائی کے صلح نامے کو رد کر دیا اور مسولینی نے ابی سینیا کو ہڑپ کر لیا تو یورپ دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کے بعد صورت حال اور بدتر ہو گئی۔ جرمنی نے رہائن لینڈ پر قبضہ جما لیا اور فرانکو نے اسپین میں خانہ جنگی شروع کر دی۔

جنگ کے سایے بڑھنے لگے اور انگلستان جلد ہی اسلحہ بندی کے معاملات اور ہونے والی معرکہ آرائی کی تیاریوں نیز زور و شور سے سفارتی گفت وشنید میں مصروف ہو گیا۔

ہندوستان جس کی طرف اب تک برطانوی پارلیمنٹ کی بڑی توجہ رہی تھی اب پس منظر میں چلا گیا کیونکہ یوروپی منظر میں سایے تیزی سے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

سیموئل ہور جس کو ہندوستانی معاملات کو خوش اسلوبی سے نپٹانے کی بنا پر پبلک بڑی قدر کی نظر سے دیکھنے لگی تھی اب ان کو اور زیادہ اہم شعبے یعنی امور خارجہ کا سکریٹری بنادیا گیا اور ان کی جگہ پر جون 1935ء میں انڈیا آفس کا محکمہ مارکوئس زیٹلینڈ (لارڈ رونالڈ شے) کے سپرد ہوا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد ولنگڈن سبکدوش ہو گئے اور 18ر اپریل 1936ء کو لن لتھ گو کو ہندوستان کا وایسرائے مقرر کردیا گیا۔ لیکن اس پوری ٹیم کی تبدیلی سے گورنمنٹ کی پالیسی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

زیٹلینڈ اور لن لتھ گو کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جو دشوار بھی تھی اور پریشان کن بھی۔ اقتصادی حالت افسوس ناک تھی۔ زراعت کی حالت میں عالمی کساد بازاری کے باعث کوئی بہتری نہیں دکھائی دیتی تھی۔

سیاسی میدان میں صورت حال عجیب غریب تھی۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کے لیے ایک آئین (دستور) تیار کیا تھا جس کو یہاں کی سیاسی پارٹیوں نے یا تو قطعی نامنظور کردیا تھا یا بہت بے دلی سے قبول کرلیا تھا۔ پھر بھی وایسرائے پارٹیوں کے لیڈروں کو ترغیب دے رہا تھا کہ وہ لوگ اسے مان لیں اور تعاون کی یقین دہانی کرادیں۔ اس نے 21ر ستمبر 1936ء کو قانون ساز اسمبلی میں کہا: "میری ہر خیر خواہ اور پبلک کی خیر سگالی رکھنے والے ہر مرد و زن سے یہ دلی اور پرزور استدعا ہے کہ وہ نئے اصلاحات کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک واضح اور مناسب موقع دیں اور میرے ساتھ نیز صوبوں کے گورنروں کے ساتھ نئے دستور کو چلانے میں رواداری اور تعاون کے جذبے سے اپنے مادر وطن کی عزت اور بہبود کے لیے پرخلوص جدوجہد کریں۔"[1]

حیرت کی بات ہے کہ ملک کی تمام بڑی اور طاقت ور سیاسی پارٹیوں نے بہت

---

1. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1936ء جلد دوم ص 100 قانون ساز اسمبلی: وایسرائے کا ہندستان قانون ساز اسمبلی میں خطبہ، 21ر ستمبر 1939ء

سے موقعوں پر نہایت واضح طور پر سختی سے دستور کو نامنظور کر دیا تھا پھر بھی لن لتھ گو یہ یقین رکھتے تھے کہ دستور کو جو لوگ چلائیں گے اگر وہ اسے نامنظور بھی کر چکے ہوں اس کی اپیل کا اثر لیں گے۔ اگر چہ کانگریس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ دستور کو آزما کر دیکھ لیا جائے تو بھی اس کے وجوہ قطعی مختلف تھے اور کانگریس یہ فیصلہ بھی آسانی سے نہیں کر سکی تھی۔ اس کے لیے طویل مباحثے ہوئے تھے اور اس کے کئی گروپوں کے درمیان اس مسئلے پر شدید اختلاف رائے تھا۔

1936ء کی ابتدا ہی میں انڈین نیشنل کانگریس نے اعلان کر دیا تھا کہ 1935ء کے ایکٹ میں جو تجاویز رکھی گئی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ خراب ہیں جو قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) اور جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں پیش کی گئی تھیں اور ''ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے لوگوں پر غلبہ اور ان کا استحصال آسانی کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔'' لیکن یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ کانگریس کی طرف سے نشستوں کے لیے امیدوار کھڑے کیے جائیں گے جو اس کے احکام اور اس کی واضح پالیسی کے تحت کام کریں گے۔ کسی عہدے کو قبول کرنے کے سوال پر کانگریس نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی۔

عہدے قبول کرنے کے خلاف جو جذبات تھے ان کی شدت کا اندازہ جواہر لال نہرو کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے کانگریس کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1936ء میں بحیثیت صدر کی تھی۔ ظاہراً انھوں نے وایسرائے کی اپیل کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

''ہم مجالس قانون ساز میں برطانوی سامراج کے آلہ کار (دستور) سے تعاون کرنے کی غرض سے نہیں جا رہے ہیں بلکہ ایکٹ کا مقابلہ کر کے اسے ختم کر دینے کی غرض سے شریک ہو رہے ہیں۔ ہماری یہ ہر طرح کوشش ہوگی کہ برطانوی سامراج کی اس جدوجہد کو روکیں جو وہ ہندوستان پر اپنا اقتدار بنائے رکھنے اور ہندوستانی لوگوں کا

استحصال کرنے کی غرض سے مضبوط کرنا چاہتا ہے .... ہم مجالس قانون ساز میں دستوریت یا بنجر اصلاحات کا راستہ اختیار کرنے نہیں جارہے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں دستور کے وفاقی جزو سے اپنا اختلاف ظاہر کیا صرف نظریاتی اصولوں پر نہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ" یہ بے حد اہم معاملہ ہے جو ہماری جدوجہد آزادی پر خراب اثر ڈال سکتا ہے نیز ہمارے مستقبل پر بھی۔" انہوں نے رائے ظاہر کی:" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریسی پالیسی کا واحد منطقی نتیجہ یہ ہے .... کہ وہ عہدوں اور وزرات سے کوئی تعلق نہ رکھے کیونکہ لامحالہ یہ برطانوی سامراج کے ساتھ ایک قسم کی شرکت ہوگی..... ہمارے بڑھے ہوئے حوصلوں کو دبادینے کا یہ ایک نفرت انگیز کام ہوگا..... ہم کو تو تعطل پیدا کرنے کی سوچنا چاہئے نہ کہ عہدوں پر فرض شناسی دکھانے کی۔"[1]

الیکشن کا انتظام کرنے کی خاطر کانگریس کی مجلس عاملہ نے اپریل 1936ء میں ایک پارلیمنٹری کمیٹی بنادی جس میں مندرجہ ذیل سات اشخاص تھے اور اس میں تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے صدر اور ڈاکٹر خاں صاحب بھی شامل تھے۔

(1) راجندر پرساد (2) بھولا بھائی دیسائی (3) ابوالکلام آزاد (4) سی۔ راج گوپال اچاریہ (5) ولبھ بھائی پٹیل (6) آچاریہ نریندر دیو اور (7) گووند بلبھ پنت بحیثیت کنویز۔ بعد میں ولبھ بھائی پٹیل اس کے صدر منتخب ہو گئے اور راجندر پرساد اور گووند بلبھ پنت بحیثیت سکریٹری اور ٹی پرکاسم، این، بی کھرے اور بنگال کا ایک نمائندہ بھی کمیٹی میں شامل کرلیا گیا۔ مجالس قانون ساز میں نشستوں کے امیدواروں کے دستخط کے لیے ایک عہد نامہ بھی تجویز کرلیا گیا۔

آل انڈیا کانگریس نے الیکشن کے لیے ایک منشور بھی تیار کرلیا جس میں درج

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر: 1930ء جلد دوم ص 227 انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ فیض پور میں مورخہ 27 دسمبر 1936ء کو جواہر لال نہرو کی صدارتی تقریر

ذیل امور کی طرف توجہ دلائی گئی تھی: ملک میں بڑھتی ہوئی غریبی، ہر طبقے کے حالات میں روز افزوں ابتری، قومی تحریک اور گورنمنٹ کے مظالم، 1935ء کے ناپسندیدہ ایکٹ کا مسترد کیا جانا اور اس کے بجائے ایسا دستور تیار کرنا جو عوام کی منتخب کردہ دستور ساز اسمبلی تیار کرے۔ اس منشور میں یہ بھی اعلان تھا کہ کانگریس کے ممبران مجلس قانون ساز کا خاص مقصد یہ ہوگا کہ وہ ان تمام احکامات، قوانین اور ضابطوں کو کالعدم کرادیں جو عوام کے لیے پریشان کن ہیں۔ نیز شہری آزادی کو استوار کرائیں، سیاسی قیدیوں کو رہا کرائیں اور کاشتکاروں کو جو نقصانات پہنچے ہیں ان کی تلافی کرائیں۔

اس کا پروگرام تھا: (1) زراعتی نظام میں تبدیلی، دیہی قرضوں کو کم کرنا، سستی شرح پر قرضے فراہم کرنا (2) کارخانوں میں لگے ہوئے مزدوروں کے معیار زندگی کو ترقی دینا (3) کارکردگی میں جنسی امتیازات کو دور کرنا (4) مندرجہ فہرست اقوام کی حالت درست کرنا (5) بنکروں اور دیگر دیہی مصنوعات کی ہمت افزائی کرنا (6) فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک متفقہ حل تلاش کرنا: ''مختصراً یہ کہ ہندوستان کو آزاد کرانا۔ عوام کا استحصال ختم کرنا اور ایک خوش حال، مضبوط اور متحد قوم تعمیر کرنا جس کی بنیاد عام فلاح اور بہبود پر ہو۔''

جواہر لال نے اپنے صدارتی خطبے میں پروگرام کے پہلے حصے پر خاص زور دیتے ہوئے کہا: ''ہندستان کا سب سے بڑا مسئلہ فی الوقت زراعت کا ہے، کسانوں کی غربت اور بے روزگاری کا اور ایک بالکل فرسودہ زراعتی نظام کا۔ گزشتہ کئی نسلوں سے بعض حالات کے ایک عجیب گڈمڈ کے باعث ہندوستان کوئی ترقی نہیں کرسکا ہے۔ وہ جو سیاسی اور اقتصادی ملبوسات پہنے ہوئے ہے اب اس کے بدن پر زیب نہیں دیتے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے اور پھٹے ہوئے ہیں۔'' [1]

---

[1] ایضاً: جلد اول ص 277، انڈین نیشنل کانگریس، لکھنؤ مورخہ 12 / اپریل 1936ء، جواہر لال نہرو کی تقریر

صدر کی رائے میں ہندستان کے مسائل کو ساری دنیا کی صورت حال کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ دنیا میں اس وقت دو قسم کی دو طاقتوں کے درمیان آویزش ہے ایک طرف سرمایہ دار سامراجیت ہے دوسری طرف اشتراکیت جو غریبی کو دور کرانے کی امید دلاتی ہے اور محکومیت اور استحصال کو ختم کرانا چاہتی ہے۔ چونکہ اشتراکیت کے لیے آزادی پہلی شرط ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس جدوجہد کو عوام کی ترقی دینے اور انھیں غلامی سے نجات دلانے کی طرف مرکوز ہونا چاہیے۔ اس لیے متوسط طبقے کے تمام انقلاب پسند عناصر کا فرض ہے کہ اپنی تمام قوتیں عوام کی تائید اور تعاون حاصل کرنے میں لگا دیں۔

چونکہ نئے انتخابات میں حلقہ رائے دہندگی بہت وسیع کر دیا گیا تھا (پہلے سے چار گنا زیادہ ساڑھے تین کروڑ یا ہندوستان کی کل آبادی کا گیارہ فی صد) اس سے عوام سے زیادہ سے زیادہ رابطہ قائم کرنے کا موقع مل گیا اور یہی خاص وجہ تھی کہ کانگریس نے انتخابات میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ، فطری طور پر ہر ممکن کوشش کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ نشستیں کانگریس کو مل جائیں۔ اس کوشش میں گاندھی جی نے کل ہند کتائی ایسوسی ایشن کے تحت کھادی کے جو بہت سے مرکز کھول رکھے تھے ان کو ان سے بڑی مدد ملی۔

لیکن عوام سے رابطہ قائم کرنے کی تحریک میں سب سے مشکل مسئلہ یہ اٹھا کہ مسلمان ووٹر کو کیونکر راغب کیا جائے۔ فرقہ وارانہ رائے دہندگی کی تنگ دیواروں میں محصور کر کے مسلمانوں کو الگ تھلگ رکھنے کی جو شرارت آمیز پالیسی بنائی گئی تھی وہ بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی اور ایسی پیچیدہ مشکل درپیش کر دی جو ناقابل حل بن گئی۔ صرف یہی صورت رہ گئی تھی کہ یا تو ان مسلمانوں کو کھڑا کیا جائے جو کانگریسی تھے یا اس مسلم سیاسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کر لیا جائے جس کا پروگرام کانگریس سے ملتا جلتا ہو۔

مسلم لیگ کی سیاست میں جو تبدیلیاں ہوگئی تھیں ان کے باعث پہلی صورت ناقابل عمل تھی۔ دوسری صورت اختیار کرنے میں وہ مشکلات درپیش تھیں جو دسمبر 1928ء میں متحدہ کانفرنس (یونٹی کانفرنس) کے ختم ہوجانے کے زمانے سے کانگریس اور لیگ کے درمیان کشیدگی کے باعث پیدا ہوگئی تھیں۔ الیکشن ہونے سے قبل کے مہینوں میں کانگریسی لیڈروں میں اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ مسلم لیگ سے اشتراک کی صلاح دیتا تھا۔ یہ گروہ کہتا تھا کہ لیگ نے اپنے انتخابی منشور میں جس قسم کا پروگرام پیش کیا ہے وہ کانگریسی پالیسیوں سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جناح اور ان کے کئی ساتھی کانگریسی سے تعاون کے بہت خواہش مند ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سے پرانے کانگریسی رہ چکے ہیں اور دستور میں مسلمانوں کے لیے تحفظات کے سوال پر کانگریس سے الگ ہوگئے تھے۔ ویسے اپنے نظریات میں وہ اتنے ہی انقلاب پسند تھے جتنے کہ کانگریسی حریت پسند۔ لیگ سے اشتراک کرنے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جمیعت العلماء جو مسلمان عالموں کی ایک جماعت تھی اور جس نے گزشتہ میں مسلسل کانگریس کے ساتھ تعاون کیا تھا اور گورنمنٹ کے مظالم برداشت کیے تھے اب مسلم لیگ کی تشکیل نو کے باعث اس کے ساتھ ہوگئی تھی۔

کانگریس کے اس گروہ کے معترضین کہتے تھے کہ اول تو فرقہ وارانہ جداگانہ انتخابات کے بنیادی مسئلے پر لیگیوں کا رویہ انتہائی شدت کا ہے دوسرے ان کو یہ بھی شبہ تھا کہ کانگریس کی زراعتی پالیسی سے لیگ والے متفق نہ ہوں گے کیونکہ کانگریس کی زرعی پالیسی زمینداروں کے مفادات کے خلاف ہے اور لیگیوں کی باا ثر جماعت زمینداروں پر مشتمل ہے۔

الیکشن کے دوران کانگریسی مسلمانوں اور ان مسلمانوں کو جو ذرا انقلابی مزاج کے

تھے کانگریسی لیڈروں نے آمادہ کرلیا کہ وہ لیگ کی طرف سے کھڑے ہوں تاکہ لیگ کے سیاسی نقطہ نظر میں آزادخیالی آسکے اور وہ پارٹی کے اندر اس کا ایک ترقی یافتہ بازو بن سکیں۔ اگرچہ کانگریس اور لیگ کے درمیان کوئی باقاعدہ سمجھوتہ نہیں ہوا تھا لیکن دونوں طرف کے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ الیکشن کے بعد اگر عہدوں کو قبول کرنے کا سوال اطمینان بخش طریقے پر طے ہوگیا تو دونوں پارٹیاں مل کر کام کریں گی۔

دونوں پارٹیوں (لیگ اور کانگریس) کے رویے سے یہ خیال غالب ہو چلا تھا دونوں میں اتفاق ہو جائے گا۔ کانگریس نے فرقہ وارانہ مراعات کی مذمت نہ کرکے اور ایک غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرکے فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لیے دروازہ کھلا رکھا تھا۔ مسلمان جنھوں نے مجلس قانون ساز میں جناح کی رہبری میں آزاد پارٹی بنائی تھی تمام سنگین معاملات میں گورنمنٹ کے خلاف کانگریس اور دیگر قومی پارٹیوں کے ساتھ ووٹ دیتے تھے۔ ان حالات میں تعجب کی بات نہ تھی کہ اگر امیدیں ہونے لگی تھیں کہ نئے مجالس قانون ساز میں بھی دونوں میں اتفاق برقرار رہے گا۔

1937ء کے آغاز میں دونوں اپنی جدوجہد میں ایک دوسرے کی طرف خیر سگالی کا جذبہ رکھتے تھے۔ کانگریسی امیدواران پارٹیوں کے خلاف لڑ رہے تھے جنھوں نے نئے دستور کو منظور کرلیا تھا اور گورنمنٹ کے ساتھ تعاون کرنے پر راضی تھے۔ یوپی میں ان کا مقابلہ لبرل امیدواروں، تعلقداروں اور زمینداروں سے تھا اور مدراس میں جسٹس پارٹی سے اور جہاں انہوں نے شمکھم چیٹی کو شکست فاش دی۔ مسلم لیگ کی مخالفت پنجاب میں اتحادی (یونینسٹ پارٹی) کررہی تھی اور یوپی اور بنگال میں بھی اسی پارٹی کے حلیف — اس طرح کانگریس اور لیگ کے درمیان کسی قسم کا تنازعہ یا رقابت نہ تھی۔ ان دونوں کی مخالفت ایک ہی طرح کی جماعتیں کررہی تھیں۔

نتیجے حیرت انگیز نکلے خود کانگریسیوں کی امیدوں سے کہیں زیادہ۔ صوبائی

انتخابات میں 54 فی صدی ووٹروں نے ووٹ ڈالے اور 808 عام نشتوں میں سے 711 کانگریس نے جیت لیں۔ مسلم حلقہ انتخابات کی 482 نشستوں میں سے 58 امیدوار اس نے کھڑے کیے تھے جن میں سے 26 نشستیں اس کو مل گئیں۔ ان میں سے شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس کو 19 ملی تھیں۔ درج ذیل گوشوارے سے مجالس قانون ساز میں کانگریس کی حالت واضح ہو سکے گی۔

صوبہ	کل نشستیں	نشستیں جو کانگریس نے جیتیں	فی صد
مدراس	215	159	74
بہار	152	95	65
صوبہ متوسط	112	70	62.5
یو پی	228	133	59
اڑیسہ	60	36	60

ان پانچ صوبوں کے علاوہ جہاں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہو گئی تھی، بمبئی میں بھی اس کی پوزیشن بہت اچھی تھی اس لیے کہ کل 175 ممبروں میں سے 86 فی صد کانگریسی تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں کانگریسی گروپ سب سے بڑا واحد گروپ تھا کیونکہ کل 50 ممبروں میں سے 19 کانگریسی تھے اور بقیہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ آسام میں بھی اسی قسم کی صورت حال تھی۔ وہاں کل 108 ممبروں میں 33 کانگریسی تھے۔ بنگال اسمبلی میں ممبروں کی کل تعداد 250 تھی جن میں سے 60 یعنی 22 فی صدی کانگریسی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ پنجاب اور سندھ میں اس کی پوزیشن بہت معمولی رہی۔ یعنی پنجاب کے 175 ممبروں میں سے 18 (یعنی 10.5 فی صد) اور سندھ کے 60 ممبروں میں سے صرف 7 (یعنی 11.45 فی صد) کانگریسی تھے۔ مزدور جماعت (لیبر) کے لیے جو 38 نشستیں

مخصوص کی گئی تھیں ان میں سے 18 کانگریس نے جیتیں زمینداروں کے لیے 37 مخصوص نشستوں میں سے 4 اور صنعت و تجارت کی 56 نشستوں میں سے 3 کانگریس کو ملیں۔ دو ایوانی مجالس قانون ساز میں ایوان بالا کی مجموعی 299 نشستوں میں کانگریس کا حصہ 64 یعنی 28 فی صد رہا۔

4- مسلمانوں کے انتخابات

1927ء سے جب کہ سائمن کمیشن کی تقرری کا اعلان ہوا تھا مسلم لیگ کئی گروہوں، میں منقسم ہوگئی تھی۔ ایک گروہ نے جس کی سربراہی جناح کررہے تھے یہ طے کیا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس سے سیاسی اور سماجی تعلقات نہ رکھے جائیں اور اس معاملے میں کانگریس اور لبرل فیڈریشن کی حمایت کی جائے۔ مسلم لیگ کے دوسرے گروہ نے جس کے لیڈر پنجاب کے محمد شفیع تھے یہ طے کیا کہ کمیشن کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ محمد شفیع نے ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کے سرپرست آغا خاں بنائے گئے۔ جناح نے اگرچہ 1920ء میں اپنے تعلقات کانگریس سے منقطع کر لیے تھے پھر بھی کانگریس کا جو رویہ ہندوستان کے مسائل کے سلسلے میں تھا اس کی وہ قدر کرتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بیحد کوشاں تھے اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نکالنے کی تحریک کی تائید میں تھے۔ اگرچہ وہ آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو کمیٹی میں جس نے برکن ہیڈ کے چیلنج کو قبول کرلیا تھا غوروخوض کے دوران ہندستان میں موجود نہ تھے پھر بھی کلکتہ میں جو کانفرنس ہوئی اس میں وہ شامل ہوئے۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ نہرو کمیٹی کی تجاویز ان کے فرقے کو مطمئن نہ کرسکیں گی اس لیے انہوں نے اس میں چند ترمیمات پیش کیں تا کہ نہرو رپورٹ جو مشترکہ انتخابات پر مبنی تھی ان کے فرقے کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ ان ترمیمات میں سے

خاص یہ تھی کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں 1/3 نشستیں مسلمانوں کے لیے محفوظ کردی جائیں۔

لیکن کانفرنس اور کانگریس نے جس کا اجلاس فوراً بعد کو ہوا تھا جناح کی اس ترمیم کو نامنظور کردیا۔ اس سے جناح کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس لیے اور بھی کہ مہا سبھائی لیڈران جیکار اور مالویہ نے ان پر سخت مخالفانہ حملے شروع کردیے۔ کانگریسی لیڈران گاندھی جی اور موتی لال نہرو نے بھی جناح کی حمایت کرنے کے بجائے مہا سبھائی نقطۂ نظر کی تائید کی۔

جناح کو پورا اعتماد تھا کہ وہ کانگریس کی حمایت سے فرقہ وارانہ مصالحت کرالیں گے لیکن اب ان کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کا اعتماد کانگریس کی طرف سے بالکل پارہ پارہ ہوگیا۔ پھر بھی وہ اتنے روشن خیال اور محبِ وطن تھے کہ انھوں نے اس مرحلے پر برطانوی حکمرانوں کا سہارا نہ ڈھونڈا جیسا کہ بہت سے دیگر مسلم لیڈران کی عادت تھی۔

اس کے بعد 1929ء میں کانگریس کا اجلاس لاہور میں ہوا اور اس میں مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اسے جناح نے قطعی پسند نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ یہ مطالبہ بے جا تھا بلکہ اس لیے کہ جس طریقے سے اس کا اعلان کیا گیا تھا اس میں مسلم لیگ کو قطعی طور پر نظر انداز کردیا گیا تھا۔ اس واقعے نے جناح کو اور بھی کانگریس سے دور کردیا۔ پھر بھی گول میز کانفرنس کے موقع پر انہوں نے مسلمان نمائندوں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ مشترکہ انتخابات کی بات منظور کرلیں جس کے لیے کانگریس مصر تھی۔ ان کی یہ کوشش فضل حسین اور برطانوی قدامت پسند سیاست دانوں کی بدولت ناکام ہوگئی۔ ان مسلمان سیاست دانوں سے بیزار ہوکر اور کانگریس کی لاپروائی سے آزردہ ہوکر جناح بہت مایوس ہوگئے انھوں نے طے کرلیا کہ وہ

ہندوستانی سیاست سے سبک دوش ہوجائیں گے اور انگلستان میں مقیم ہوکر وکالت شروع کردیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے ملک سے تین سال تک دور دور رہے لیکن ہندوستان کے واقعات کا دور ہی سے بغور مشاہدہ کرتے رہے۔

اس عرصے میں فرقہ وارانہ مراعات دیے گئے جس سے دونوں فرقوں کے درمیان خلیج اور وسیع ہوگئی۔ 1932، 1933 اور 1934ء میں جابرانہ ظلم توڑے گئے جس سے گورنمنٹ کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی اور آخر میں کانگریس کا یہ فیصلہ سامنے آیا کہ سوراج پارٹی کو ازسرنو زندہ کیا جائے اور 1934ء میں قانون ساز اسمبلی کے ہونے والے الیکشن میں مقابلہ کیا جائے۔

1934ء میں لیگ کی بمبئی والی شاخ نے جناح سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان واپس آجائیں اور اسمبلی کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوں۔ جناح نے اسے قبول کرلیا اور اکتوبر 1934ء میں واپس آگئے اور اسمبلی میں بلا مقابلہ منتخب کرلیے گئے اور فوراً ہی انھوں نے لیگ کو ازسرنو منظّم کرنے اور اس میں جان ڈالنے کا کام شروع کردیا۔

ان چند برسوں میں مسلمانوں کی سیاست بڑی بے ترتیبی کی حالت میں تھی۔ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ دونوں کا جوش ایک ٹھہراؤ کی حالت میں تھا۔ فضل حسین جو مسلمانوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کسی کل ہند جماعت بنانے کی زیادہ موافقت میں نہ تھے۔ وہ ایسی صوبائی جماعتیں بنانے کی حق میں زیادہ تھے جو مقامی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔

پنجاب میں فضل حسین کی متحدہ پارٹی (یونینسٹ پارٹی) بنگال میں فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی، یوپی میں نواب چھتاری کی قومی زراعتی پارٹی (نیشنلسٹ ایگری کلچرسٹ پارٹی) اور سندھ میں عبداللہ ہارون کی آزاد پارٹی، وجود میں آگئیں۔ شمال

مغربی سرحدی صوبے میں خاں عبدالغفار خاں نے اپنی پارٹی کو کانگریس میں ضم کر دیا تھا۔ ان سب پارٹیوں کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنی شاخیں کھول کر اسے وسیع بنانے میں دقتیں درپیش ہوئیں۔

جناح کا پہلا مقصد یہ تھا کہ جاں بہ لب لیگ میں نئی روح پھونکی جائے۔ مسلمان لیڈر یا تو گورنمنٹ کے پٹھو تھے یا کانگریس کے حاشیہ بردار۔ انھوں نے اس ذلت آمیز صورت حال کو بدلنے کا ارادہ کر لیا۔

لیگ کے ممبروں کی تعداد بہت کم تھی۔ 1927ء میں اس کے صرف 1330 ممبر تھے۔ 33-1931ء میں اس کے سالانہ مصارف صرف تین ہزار روپے سے زاید نہ ہوئے۔ جب الہ آباد میں لیگ کا اجلاس اقبال کی صدارت میں ہوا تھا تو اس وقت 75 ممبران کا مقررہ کورم (تعداد) بھی پورا نہ تھا۔ لیگ کے سالانہ اجلاس نجی مکانوں میں منعقد ہوا کرتے تھے جن میں حاضرین کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ اس کی ممبری کی سالانہ فیس پانچ روپے بھی بہت سے لوگوں کے ذمے باقی رہتی تھی اس لیے اسے گھٹا کر ایک روپیہ سالانہ کر دیا گیا تھا۔ [1]

جب جناح نے لیگ کو از سر نو منظم کرنے کی جدوجہد شروع کی تو انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی خصوصاً مسلم اکثریت والے صوبوں میں جہاں مقامی پارٹیاں تھیں اور وہ کسی کل ہند جماعت میں ضم ہو جانا ناپسند کرتی تھیں۔ جناح لاہور گئے اور بالکل ناکام رہے۔ کلکتہ میں بھی ان کو برائے نام کامیابی ملی لیکن ان کو اپنا مقصد حاصل کر لینے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

انھوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ پہلے لیگ کے بنیادی اصول متعین کیے۔ 7 رفروری 1935ء کو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے موقف کی پوری وضاحت

1۔ پاکستان: دی فارمیٹو فیز (1960) خالد بن سعید، ص 2-191

کردی۔ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ میں دستور کا جو خاکہ دیا گیا تھا اور اس میں جو یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اس وقت تک نمایندگی ملتی رہے گی جب تک ہندوستانی لوگ خود آپس میں مل کر کوئی اس کا حل نہ نکال لیں اس کی تو جناح نے موافقت کی لیکن دستور کے بقیہ دونوں اجزا یعنی وفاقی یونین اور صوبائی گورنمنٹ کے خلاف اپنی قطعی ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ اسے نامنظور کرنے میں انہوں نے کانگریس کے نمائندوں سے کہیں زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے۔

18 / فروری 1935ء کو دہلی کالج میں فرقہ وارانہ مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے صاف صاف کہا: ''اگر میں یہ (ہندو مسلم اتحاد حاصل کرسکوں تو یقین جانیے کہ ملک کی آزادی کے لیے آدھی لڑائی جیت لی گئی...... جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہوتے، میں آپ سے کہہ دیتا ہوں کہ پھر ہندوستان کی آزادی ملنے کی کوئی امید نہیں ہے اور ہم دونوں بدیسی حکومت کے غلام رہیں گے''۔ اسمبلی کے منعقد ہونے سے پیشتر 23 / جنوری 1935ء کو جناح نے راجندر پرساد سے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، تبادلہ خیال کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آپس میں کوئی معاہدہ ہو جائے اور جب ان دونوں کی گفتگو ناکام ہو گئی تو جناح نے اسمبلی کے مباحثے میں فرقہ وارانہ مراعات کو اپنی منظوری دیدینے کا اعلان کر دیا۔ دیگر قومی مسائل پر جو اسمبلی میں پیش ہوتے رہے مثلاً ہند برطانوی تجارتی معاہدہ، ظالمانہ قوانین اور ضوابط کے تعزیری قانون میں ترمیمات کے ایکٹ کی تردید، فوج میں ہندوستانیوں کی شمولیت، عام اور ریلوے بجٹ میں کٹوتیاں وغیرہ۔ ان سب میں جناح کی پارٹی نے گورنمنٹ کے خلاف کانگریس اور نیشنلسٹ پارٹی کے ساتھ ووٹ دیا۔

اس طرح مجلس قانون ساز میں جناح کے عمل سے یہ واضح ہو گیا کہ سوائے ایک استثنا یعنی فرقہ وارانہ مسئلے کے وہ اور ان کی پارٹی قومی مسائل پر کانگریس کی ہم نوا تھی۔

اس اتفاق رائے کا ثبوت اس وقت بھی مل گیا جب 11 ر اور 12 اپریل 1936ء کو جناح نے بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ طلب کیا اور جس کی صدارت سید وزیر حسن نے کی۔ اس جلسے میں 1935ء کے ایکٹ کی سخت مذمت کی گئی۔

صدر نے اتحاد کے لیے ان الفاظ میں اپیل کی: "کیا اس کا کوئی اخلاقی جواز ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے اختلافات ہمیشہ برقرار رکھیں جب کہ ملک کی سب سے اولین ضرورت آزادی کے لیے متحدہ ہوکر جدوجہد کرنے کی ہے؟ ایک متحد ہندوستان ایک ایسی طاقت بن جائے گا جسے وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ ایک بے حس اور غیر ذمہ دار حکومت کا بے بس اور مجبور شکار بن کر نہ رہے گا۔"[1]

سید وزیر حسن اور جواہر لال نہرو نے جو زوردار فقرے استعمال کیے یا جس قسم کی قراردادیں اس موضوع پر منظور کیں ان میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

لیگ کے اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ جناح کو اختیار دیا جائے کہ وہ 35 ممبروں کا ایک سنٹرل بورڈ اپنی صدارت میں صوبائی الیکشن لڑنے کے لیے بنائیں۔ جناح نے سارے ہندوستان سے اس بورڈ کے لیے ممبر منتخب کیے۔ منتخبہ ممبران میں مسلم یونیٹی بورڈ کے بھی ممبر بھی شامل تھے[2] جو قوم پرست مسلم گروپ کی نمائندگی کرتے تھے۔ کئی ممبر پرانی خلافت کمیٹی، احرار پارٹی اور جمعیت العلماء کے بھی تھے۔

اس بورڈ کی پہلی نشست لاہور میں 8 / جون 1936ء کو ہوئی اور اس نے الیکشن کے لیے ایک منشور تیار کیا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ لیگ "ہندوستان کے لیے مکمل ذمہ دار حکومت" کے حق میں ہے۔ 1935ء کے دستور کے نفاذ پر اظہار افسوس بھی کیا گیا۔ فرقہ وارانہ مراعات کو قبول کیا گیا لیکن وفاقی اور صوبائی دستوروں کو نامنظور کیا

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1936 جلد اول، ص 294ء

2۔ یونیٹی بورڈ کے پانچ ممبر یہ تھے: شوکت علی، خلیق الزماں، حسین احمد مدنی، کفایت اللہ اور احمد سعید

اور الیکشن کے لیے اپنے پروگرام کی وضاحت اس طرح کی:

''مذہبی حقوق کی حفاظت کرنا، تمام ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرانا، ان تمام تدابیر کو رد کرنا جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہوں اور جو لوگوں کی بنیادی آزادیوں میں بے جا مداخلت کریں اور ملک کا اقتصادی استحصال کریں، مرکزی اور صوبائی انتظامیہ میں جو بہت زاید مصارف ہو رہے ہیں انھیں کم کرانا اور قوم کے تعمیری شعبوں کے لیے زیادہ رقم مہیا کرنا۔ ہندوستانی فوج کو قومیانہ اور فوجی مصارف کم کرانا۔ صنعتوں کو جن میں گھریلو صنعتیں بھی شامل ہوں گی ترقی دینا۔ نظام زر، شرح مبادلہ زر اور قیمتوں کو ملک کی اقتصادی ترقی کی خاطر باقاعدہ بنانا۔ دیہی آبادی کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی بہتری کے لیے کوشش کرنا۔ کاشت کاروں کے لیے قرضوں کی سہولت فراہم کرنا۔ ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دینا۔ اردو زبان اور اس کے رسم خط کی حفاظت کرنا۔ مسلمانوں کے عام حالات کو بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔ ایسے اقدام کرنا جن سے بھاری ٹیکسوں کا بار ہلکا ہو اور سارے ملک کی عام پبلک میں صحت مند شعور اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا''

اگر اس منشور کا آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ 22 راگست 1936ء کے منظور کردہ منشور سے موازنہ کیا جائے تو دونوں کے اعلانوں میں کافی مماثلت نظر آئے گی۔

جناح نے اب اپنے دونوں مقاصد کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دیں۔ 1936ء کے اسمبلی کے اجلاس میں انھوں نے پھر نیشنلسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کی منظور کی گئی گرانٹوں کو اسمبلی نے نامنظور کر دیا اور جناح کی یہ ترمیم کہ اوٹاوا پیکٹ (معاہدہ) فوراً ختم کر دیا جائے اسمبلی نے منظور کر لیا۔

شروع مارچ 1936ء میں جناح نے اپنی تقریر میں کہا: '' میں نے مسلمانوں کو ناراض کر دیا (گول میز کانفرنس میں) میں نے اپنے ہندو دوستوں کو مشہور عام چودہ

نکات کے باعث ناراض کردیا، میں نے والیان ریاست کو ناراض کردیا کیونکہ میں ان کی اندر ہی اندر نقصان پہنچانے والی حرکتوں کے سخت خلاف تھا اور میں نے برطانوی پارلیمنٹ کو ناراض کردیا کیونکہ میں نے اس سے بغاوت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ سب (ان کی حرکتیں) ایک فریب ہیں.......... لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا اس سے مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ذرا سی بھی نہیں۔ جب میں انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہوا تھا اس وقت سے لے کر اب تک کوئی تبدیلی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعض موقعوں پر میں نے غلطی کی ہو لیکن وہ غلطی کسی تعصب کی بنا پر میں نے کبھی نہیں کی۔ میرا تمام تر اور واحد مقصد اپنے ملک کی بہبودی رہا ہے۔"[1]

انھوں نے مسلمانوں کو منظم ہو جانے کا مشورہ دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان ہم آواز ہو کر بول سکیں گے تو ہندو مسلم اتحاد جلد تر ہو جائے گا۔ وہ جداگانہ انتخابات یا قومی مراعات کو ایک مثالی نظم و نسق نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ بجائے ان کے ان سے بہتر کوئی چیز چاہتے تھے۔ 20/ اکتوبر 1936ء کو انھوں نے اعلان کیا: "اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے ایک ایسی محب وطن قوم پرست اور آزاد خیال جماعت تیار کرسکوں جو دوسرے فرقوں کے ترقی پسند عناصر کے ساتھ قدم ملا کر چل سکے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنے فرقے کی بڑی خدمت کرلی ہے"۔[2]

اگرچہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں ان کا مشن ناکام رہا لیکن مسلم اقلیت والے صوبوں میں ان کو بہت کامیابی ہوئی۔ مثلاً یوپی میں شروع فروری 1936ء میں

1۔ دی پارٹیشن آف انڈیا، از سی، ایچ فلپس اور ایم ڈی وین رائٹ (1970) ص 50-249 پر "مسلم لیگ کی ارتقائی کیفیتیں 47-1937" میں زیڈ، ایچ، زیدی سے منقول

2۔ بحوالہ گزشتہ، فلپس اور وین رائٹ، ص 54

جب خلیق الزماں اور یونیٹی بورڈ کے دیگر ممبران جناح سے ملے تو اس ملاقات کی کیفیت یہ رہی:

''مسٹر جناح نے ہم لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ میں مسلم لیگ کی لیڈری سے بہت زیادہ غیر مطمئن ہوں کیونکہ اس میں زیادہ تر بڑے زمیندار، خطاب یافتہ اور خود غرض لوگ ہیں جو اپنے فرقے یا قومی مفادات پر اپنے طبقے کے اور اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں اور برطانوی پالیسی کی ہمنوائی کی خاطر ملی یا قومی مفادات کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں'' [1]

ان لوگوں کو جناح نے یقین دلایا کہ وہ الیکشن لڑنے کے لیے ایک پارلیمنٹری بورڈ بنائیں گے جس میں ان کی یونیٹی پارٹی کے لوگ اکثریت میں ہوں گے۔ اس یقین دہانی پر ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ الیکشن کے سلسلے میں کسی پارٹی سے منسلک ہونے کے لیے وہ اپنے فیصلے کو التوا میں رکھیں گے۔ جناح نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ایک یوپی پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل کی اور اس میں خلیق الزماں اور دیگر لوگوں کو شامل کیا۔

جب جنوری 1937ء میں الیکشن شروع ہوئے اور مسلم لیگ نے اس میں حصہ لیا تو اس کے لیے یہ بات ناموافق ضرور تھی کہ پنجاب، بنگال، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبوں میں اس کو کسی کا تعاون حاصل نہ تھا۔ ان حالات کے تحت لیگ کو وہاں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ پنجاب میں تو اس کی فاش شکست ہوئی یعنی 86 مسلم نشستوں میں سے اسے صرف 2 نشستیں مل سکیں اور ان دو میں سے بھی ایک نے لیگ کو چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شرکت کرلی۔ بنگال میں لیگ کی حالت بہتر رہی۔ وہاں اس کو 119 نشستوں میں سے 40 مل گئیں۔ لیگیوں نے کرشک پرجا پارٹی سے اتحاد کرلیا اور اس اتحاد سے ان کو وہاں کی مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہوگئی۔

1۔ بحوالہ گزشتہ، فلپس اور وین رائٹ ص 154

سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبوں میں لیگ کو کوئی نشست نہ مل سکی۔

ہندو اکثریت والے صوبوں میں لیگ کی حالت بہتر رہی۔ یو پی میں جہاں مسلمانوں کے لیے 64 نشستیں رکھی گئی تھیں لیگ کو 27 ملیں (خلیق الزماں 29 بتاتے تھے) آزاد مسلمانوں کو 27، نیشنلسٹ ایگری کلچرسٹ پارٹی کو 9 اور کانگریس کو ایک۔

بمبئی میں 29 مسلم نشستوں میں سے 20 لیگ کو حاصل ہوئیں اور مدراس میں 28 میں سے 11۔

مجموعی طور پر لیگ کی کامیابی بہت معمولی رہی کیونکہ سارے ہندوستان کی مسلم نشستوں میں سے اس کو 25 فی صدی سے بھی کم ملیں۔ اس کی وجہ سے وزارت سازی کے سلسلے میں کانگریس سے لیگ کی مصالحت کے لیے گفت وشنید کمزور پڑگئی۔

بدقسمتی سے مسلم نشستوں کے سلسلے میں کانگریس کا ریکارڈ تو بہت ہی خراب رہا تھا۔ اس کو صرف 26 یعنی 5.4 فی صد نشستیں مل سکی تھیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلم فرقے کی بھی نمائندہ ہے مبالغہ آمیز تھا۔

5- عہدوں کو قبول کرنے کا سوال

الیکشن ختم ہو گئے اور کانگریسی بجا طور پر اپنی کامیابی پر مسرور وشادماں تھے۔ رائے دہندگان نے کانگریس پر اعتماد بھرپور طور پر ظاہر کر دیا تھا اور قدامت پسند ٹوڈیوں کے برعکس بیانات کو قطعی طور پر غلط ثابت کر دیا تھا۔ ہندوستان کے حکمراں یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے عوام ان پر پورا اعتماد کرتے ہیں اور انھیں کو اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ کانگریس کی فتح نے ان مغالطوں اور غلط فہمیوں کا کھوکھلا پن واضح کر دیا۔ لوگوں نے کانگریس کو کامیاب بنا کر پوری طرح بتا دیا کہ وہ سب اس پارٹی کے ہم نوا ہیں جو

ایک بدیسی حکومت سے مکمل طور پر آزادی حاصل کرنے کے حق میں ہو اور ہندوستان کے خودساختہ متولیوں کی محسن گورنمنٹ سے فوراً چھٹکارا چاہتی ہو۔

الیکشن کے بعد فوراً عہدے قبول کرنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کانگریسی لیڈر اس معاملے میں متفق الرائے نہیں تھے۔ جواہر لال نے لکھنؤ میں اپنے صدارتی خطبے میں بہت پرزور طریقے پر کہا تھا کہ عہدے نہ قبول کیے جائیں۔ انھوں نے کہا تھا:

"ایکٹ کی شرایط کے تحت عہدے اور وزارتیں قبول کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری ایکٹ کی نامنظوری باطل ٹھہرے گی اور اس طرح ہم خود اپنی ملامت کے ذمہ دار ہوں گے۔ قومی عزت نفس اور خودداری اس پوزیشن کو منظور نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا لازمی طور پر مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی نہ کسی حد تک سامراجی جبر وظلم کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور اس طرح حکومت کے ظلم اور اپنے لوگوں کے استحصال میں شریک ہیں۔" [1]

انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اس ایکٹ کے تحت ہندوستانیوں کو ذمہ داریاں تو مل جائیں گی مگر وہ بغیر کسی طاقت کے ہوں گی اور ذمہ داریاں بھی جو منتقل ہوں گی ان میں غیر جمہوری تحفظات، محدود طاقت اور مرہونہ مالی وسائل کی رکاوٹیں لگی ہوئی ہیں۔ نفسیاتی طور پر بھی یہ بات غلط ہوگی کہ ہم اپنے عوام الناس کو مجالس قانون میں شمولیت کے باعث اس دھوکے میں رکھیں کہ ہندوستان کو کوئی واقعی اقتدار یا سچ مچ کی آزادی مل گئی ہے۔ اور اپنی تقریر کا خاتمہ اس طرح کیا:

"مجھے پورا یقین ہے کہ اگر کانگریس نے عہدے قبول کرنا منظور کر لیا یا اس مسئلے کے متعلق تذبذب کا بھی اظہار کیا تو یہ اس کی بہت بڑی بنیادی غلطی ہوگی۔ یہ پھر ایسے

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1936ء جلد اول ص 272 لکھنؤ میں جواہر لال نہرو کا صدارتی خطبہ، مورخہ 14/اپریل 1936ء

گڑھے میں جا گرے گی کہ جس سے ہمارا باہر آنا مشکل ہو جائے گا۔''

اس کے بجائے انھوں نے اس کی صلاح دی کہ سوویٹ روس کے نمونے پر عوام سے رابطے قائم کر کے ان کو منظم کیا جائے اور سرکار اور عوام کے درمیان ایک دوسرے سے تاثر پذیری قائم کی جائے۔

''عہدے قبول کرنے کا سوال ان کانگریسی ممبروں کے لیے جو نئے دستور کے تحت مجالس قانون ساز میں منتخب ہو کر آ گئے ہیں کانگریس کی مجلس عاملہ صوبائی الیکشن کے بعد جس قدر جلد ممکن ہوا طے کر دے گی۔'' اس قرارداد کے ساتھ کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ بمقام فیض پور (مہاراشٹر) بتاریخ 27/28/دسمبر 1936ء میں جس کی صدارت جواہر لال نے کی تھی عہدوں کے متعلق فیصلہ ملتوی کر دیا۔

لیکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور اس کی مجلس عاملہ میں ایسے ممبروں کی تعداد زیادہ تھی جو جواہر لال کے برخلاف یہ سمجھتے تھے کہ جب الیکشن میں شرکت کر لی گئی تو عہدے قبول کرنا اس کا ایک لازمی ضمیمہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ جو دہلی میں 17/اور 18 مارچ 1937ء کو ہوا اس میں یہ قرارداد اس طرح منظور کی گئی:

''عہدے قبول کرنے کے زیر غور سوال پر اس پالیسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کا خلاصہ پچھلے پیراگرافوں میں پیش کیا گیا ہے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اختیار اور اجازت دیتی ہے کہ ان صوبوں میں جہاں کانگریس اکثریت میں ہے عہدے قبول کر لیے جائیں۔''

19/اور 20/مارچ کو دہلی میں کانگریسیوں کا ایک خصوصی اجتماع (کنونشن) ہوا جس میں مجالس قانون ساز کے کانگریسی ممبر بھی تھے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی۔ اس اجلاس میں دستور کو رد کرنے، ایک نیا دستور بنانے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کے طلب کرنے اور مجالس قانون ساز میں کانگریس کی پالیسی کو متعین کرنے کے لیے

قرار دادیں منظور کی گئیں۔ تمام ممبروں سے کہا گیا کہ وہ اس بات کا حلف لیں کہ" وہ کانگریسی نظم وضبط کے تحت ملک کو آزاد اور خود مختار بنانے کے لیے اور ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کو ان بھاری بوجھوں سے نجات دلانے کی کوششیں کریں گے جو ان کے لیے مصیبتوں کا باعث ہیں۔" [1]

قبل اس کے کہ صوبوں کے گورنروں کی طرف سے پیش کردہ عہدے قبول کئے جائیں ایک اور رکاوٹ بھی دور کرنا تھی۔ کانگریس نے گورنروں سے اس بات کی یقین دہانی چاہی کہ وہ اپنی مداخلت کے مخصوص اختیارات کا استعمال نہ کریں گے یا دستوری معاملات میں وزیروں کے مشوروں کو نظر انداز نہ کریں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ دستور میں اقلیتوں اور بعض دیگر قسم کے مفادات کے لیے جو تحفظات اور حفاظتی تدابیر رکھی گئی ہیں ان کا بطلان ہو جائے۔

اس مطالبے سے ایک تعطل پیدا ہو گیا کیونکہ سوال یہ اٹھا کہ کیا اسے دستور کے قانون میں ترمیم کیے بغیر منظور کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے حل میں مہینوں لگ گئے اور بحثیں چلتی رہیں۔ کانگریس کے اس مطالبے کی موافقت اور مخالفت میں اس کی قانونی اور سیاسی حیثیتوں پر دلیلیں پیش کی جاتی رہیں۔ پارلیمنٹ میں زیٹلینڈ اور ہور نے تقریریں کیں۔ لوتھیان نے لندن ٹائمس میں لکھا بھی اور دارالامرا (ایوان بالا) میں تقریر بھی کی۔ گاندھی جی نے جن کے اشارے پر یہ مطالبے اٹھایا گیا تھا ان تقریروں اور تحریروں کے جوابات لکھے اور اس مطالبے کی معقولیت کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ اس عرصہ میں غیر کانگریسی وزارتیں عارضی طور پر عہدوں پر فائز کر دی گئی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ دستور تباہی کے دہانے پر آ گیا ہے۔ بالآخر 21/جون کو وایسرائے نے ایک بیان دیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ کانگریسیوں کے شکوک صحیح ہیں لیکن

---

1. ایضاً ص 82-181

غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اس نے یقین دلایا کہ ''کسی صوبے کی انتظامیہ کا اقتدار و اختیار گورنر ہی کے نام سے چلتا ہے لیکن وزارتی معاملات میں گورنر مجبور ہے کہ وہ اپنے اختیار و اقتدار کو اپنے وزیروں کی صلاح و مشورہ سے عمل میں لائے (سوائے چند سخت محدود اور مخصوص صورتوں میں) ویسے وزرا تمام تر ذمہ دار رہیں گے اور مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ.......... یہ خیال کرنا بے بنیاد ہے کہ گورنر یکسر آزاد ہوتا ہے یا اس کو جو اختیار و اقتدار حاصل ہوتا ہے کسی صوبے کے روزمرہ کے انتظامی امور میں مداخلت کرتا رہے گا۔ وہ صرف ان چند محدود قسم کی ذمہ داریوں میں با اختیار ہوگا جو اسی کے سپرد کر دی گئی ہیں۔'' [1]

اس یقین دہانی سے صورت حال بہت تبدیل ہوگئی اور کانگریس کی مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ ان کے مطالبے کا اصل مقصد منظور کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ 5/جولائی کو وردھا میں اس کا جلسہ ہوا جس میں کانگریسیوں کو اجازت دے دی گئی کہ جہاں کہیں ان کو عہدے قبول کرنے کے لیے مدعو کیا جائے وہ قبول کر لیں۔ 7/جولائی 1937ء کو کانگریسی وزیروں نے عہدے سنبھال لیے۔

6- وزارت سازی پر کانگریس اور لیگ میں اختلافات

دستوری رکاوٹ تو دور ہوگئی لیکن ایک نہایت تشویش ناک سیاسی مشکل درپیش ہوگئی جس نے کانگریس کے قدم ڈگمگا دیے۔ دستور میں درج تھا کہ وزیروں کے انتخاب کے موقع پر گورنر اقلیتوں کے مطالبے کو بھی دھیان میں رکھیں گے۔ کیا اقلیت کے یہ معنی لیے جائیں کہ اقلیتی فرقے کے وہ ممبر جو اس اکثریت والی پارٹی کے بھی ممبر

---

1. لارڈ لن لتھ گو کا بیان گورنر کی پوزیشن پر 22/جون 1937ء (دیکھو دی ایوولیوشن آف انڈیا پاکستان، ص 334-5 از سی، ایچ فلپس)

ہوں جو مجلس قانون ساز میں منتخب ہو کر آئی ہے (مثلاً وہ قوم پرست مسلمان جو کانگریس میں تھے) یا اقلیتی فرقے کے وہ ممبر جو فرقہ وارانہ نمایندگی کے تحت الیکشن میں کامیاب ہوئے اور کانگریس کے علاوہ دیگر فرقہ وارانہ جماعتوں کے ممبر تھے؟ یہ سوال یو پی میں سب سے زیادہ شدت پکڑ گیا۔ وہاں مسلم لیگ کو 64 مسلم نشستوں میں سے 29 حاصل ہوئی تھیں لیکن صرف تعدادی قوت کے علاوہ چند اہم مسائل بھی ان کے ساتھ تھے۔ 1936ء کی مسلم لیگ 1906ء یا 1919ء والی پرانی لیگ نہ تھی۔ اب اس کی حالت بہت زیادہ بدل گئی تھی۔ اب اس کا دستوری مقصد وہی تھا جو کانگریس کا تھا اور مجلس قانون ساز میں بھی اس کے اور کانگریس کے پروگرام میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اب اس کے ممبروں میں پرانے قدامت پسند زمینداروں کا عنصر بھی نمایاں نہ تھا۔

یو پی کا معاملہ فیصلہ کن اور سنگین تھا۔ یو پی میں لیگ کی باگ ڈور پرانے خلافت کے لیڈر شوکت علی اور پرانے کانگریسی مثلاً خلیق الزماں کے ہاتھ میں تھی۔ صوبے کے کانگریسی لیڈروں نے عقلمندی دکھائی تھی کہ انھوں نے کسی کانگریسی مسلمان کو لیگ کے امیدواروں کے خلاف نہیں کھڑا کیا تھا بلکہ واقعہ تو یہ ہے انھوں نے بعض مسلمان کانگریسیوں کو مشورہ دیا تھا کہ لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں۔ لیگ نے ایگری کلچرسٹ پارٹی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑا۔ اس پارٹی کی تنظیم فضل حسین کے اثرات کے تحت کی گئی تھی اور اسے صوبے کے گورنر مالکم ہیلی کی حمایت حاصل تھی۔ لیگ نے کانگریس کے امیدوار کا مقابلہ نہیں کیا۔

اس کے ساتھ وہ جمعیت العلماء جس کا مسلمان عوام پر بڑا اثر تھا اور جو اپنے آغاز (1919ء) سے لے کر برابر کانگریس سے تعاون کرتی رہی تھی (مثلاً ترک موالات اور سول نافرمانی کی 22-1920ء اور 32-1930ء کی تحریکوں میں) اب فروری 1936ء میں مسلم

لیگ کے ساتھ مل گئی تھی۔ مسلمانوں کی دوسری سیاسی پارٹی یعنی احرار پارٹی بھی الیکشن میں لیگ کے ساتھ ہوگئی تھی۔ اتر پردیش کے مسلم یونٹی بورڈ نے جناح کے ساتھ شمولیت کا اس شرط پر وعدہ کرلیا تھا کہ لیگ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کرے گی۔

اس حقیقت سے کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی، بنگال کی کرشک پرجا پارٹی، یوپی کی ایگری کلچرسٹ پارٹی اور دیگر اسی قسم کی پارٹیوں نے سب جگہ لیگ کے امیدواروں کی مخالفت کی، یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ لیگ کی پوزیشن اب پہلے سے کہیں بہتر ہوگئی تھی۔

یوپی میں مسلم لیگ نے الیکشن مسلم تعلقداروں اور زمینداروں کے خلاف جیتے اور اس سے ظاہر ہے یہ فتح غریب مسلم طبقے کی مدد سے ملی جو علماء کے زیر اثر تھے۔ مسلم لیگ کی ہی مدد سے کانگریس کو ایک واحد مسلمان نشست ملی۔

الیکشن کے دوران جناح نے اپنی تقریروں میں کانگریس سے دوستی کا اظہار کیا تھا۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا:

''ہماری تحریک کوئی مخالفانہ تحریک نہیں ہے۔ ہماری تحریک ہر فرقے کے ساتھ صلح کا ہاتھ بڑھانے کو تیار ہے۔ ہم اتحاد کے لیے تیار ہیں۔ ہم کسی بھی جماعت یا جماعتوں کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہونے کو تیار ہیں بشرطیکہ ان کے خیالات اور ان کے مقاصد تقریباً وہی ہوں جو ہمارے ہیں۔'' 1

بمبئی میں پھر انھوں نے اعلان کیا: ''مسلم لیگ ہندوستان کے تمام لوگوں کے لیے مکمل قومی خودمختار حکومت چاہتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے درمیان باعزت سمجھوتہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر ہندوستان کے 38 کروڑ لوگوں کی قومی خودمختار حکومت کی عمارت تعمیر ہوسکتی ہے۔'' 2

1۔ بحوالہ گزشتہ: خالد بن سعید کی کتاب میں مذکور، ص 13

2۔ ایضاً ص 84-83

دوسری تقریر میں وہ یہاں تک کہہ گئے: "مسلم لیگ اور کانگریس کے نصب العین یعنی ہندوستان کی مکمل آزادی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندوستان کا کوئی ایسا باعزت فرد نہیں ہے جو بدیسی حکومت کا طرف دار ہو یا اپنے دیس کے لیے مکمل آزادی اور خود مختاری نہ چاہتا ہو۔"[1]

الیکشن کے نتائج کے اعلان کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان اتحاد کی کوششیں ہوں گی۔ پہلا قدم اس سلسلے میں اس وقت اٹھایا گیا جب 12 / مئی 1937ء کو خلیق الزماں جواہر لال سے الہ آباد میں ملے۔ لیکن کوئی معاہدہ نہ ہوسکا کیونکہ جواہر لال کا نظریہ یہ تھا کہ مجلس قانون ساز کے اندر کسی علاحدہ مسلم جماعت کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد یوپی کے نامزد وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت نے جولائی میں خلیق الزماں سے ملاقات کی اور ایک ملی جلی وزارت کے امکانات پر غور وخوض کیا لیکن کوئی خاص نتیجہ اس سے بھی نہ نکل سکا۔

14 / جولائی کو ابوالکلام آزاد اور خلیق الزماں کی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ تین دن کے بعد آزاد نے ایک تحریر ایک کاغذ پر لکھ کر دی جس میں وہ شرایط لکھے تھے جن کی رو سے کانگریس کا تعاون حاصل ہوسکتا تھا۔ ان میں سے خاص شرطیں یہ تھیں: (1) یوپی کی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ کا گروپ بحیثیت ایک علاحدہ گروپ کے کام نہیں کرے گا (2) یوپی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد بورڈ کسی ضمنی الیکشن کے لیے کوئی امیدوار نہ کھڑا کر سکے گا۔"

ان شرایط کا مطلب تو یہ تھا کہ یوپی میں لیگ کا خاتمہ ہو جاتا۔ چنانچہ اس کے بعد ان شرایط میں کچھ نرمی کی گئی اور خلیق الزماں واسماعیل خاں انھیں منظور کرنے کو تیار

---

1. ایضاً ص 84

ہو گئے تھے بشرطیکہ یوپی اسمبلی میں فرقہ وارانہ معاملات پر مسلم لیگ پارٹی کے ممبروں کو اس کی آزادی ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دے سکیں۔"[1]

28/جولائی تک یوپی میں کانگریس اور لیگ کے درمیان معاہدے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں۔ بنگال میں مسلم لیگ کو 40 نشستیں ملی تھیں اور کرشک پرجا پارٹی کو 39، بقیہ مسلمان کسی پارٹی سے متعلق نہ تھے۔ پہلے کوششیں کی گئیں کہ کرشک پرجا پارٹی جس کے سربراہ فضل الحق تھے اور کانگریس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ تب مسلم لیگ اور کرشک پارٹی نے متحد ہو کر گورنمنٹ بنالی۔

دیگر مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم لیگ اتنی کمزور تھی کہ وہ وزارت سازی پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔ یوپی میں بھی لیگ کی حلیف جماعتیں مثلاً جمعیت العلماء اور احرار پاٹی نے لیگ سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور ابوالکلام کے مشورے سے کانگریس کے ساتھ شریک ہو گئیں۔

یوپی میں کانگریس اور لیگ کے درمیان کوئی مصالحت کیوں نہ ہو سکی اس کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ ابوالکلام کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ جواہر لال نے جو یوپی میں الیکشن لڑانے کے منتظم تھے، خلیق الزماں سے وعدہ کیا تھا کہ وزارت میں دو لیگیوں کو شامل کر لیا جائے گا لیکن بعد میں صرف ایک ہی جگہ دینے کو کہنے لگے۔ لیگ اس تبدیلی کو منظور نہ کر سکتی تھی اسی لیے اتحاد کی بات چیت ختم ہو گئی۔[2]

اس بیان کی جواہر لال نے بعد کو تردید کی اور کہا کہ "بعض واقعات کے بیانات صحیح نہیں ہیں کیونکہ مولانا نے صرف اپنی یادداشت پر بھروسہ کر کے انہیں لکھا ہے"[3]

1۔ پاتھ وے ٹو پاکستان از چودھری خلیق الزماں ص 162

2۔ انڈیا ونس فریڈم از ابوالکلام آزاد ص 6-160

3۔ لوک سبھا میں جواہر لال نہرو کی تقریر بتاریخ 27/مارچ 1959

کانگریس کا مورخ لکھتا ہے: ''مسٹر خلیق الزماں جو لیگ کی طرف سے الیکشن لڑانے کے مہتمم تھے اور یو پی میں متوازی کانگریسی کارکن ایک دوسرے سے مل کر الیکشن کا کام کررہے تھے...... اور ایک دوسرے سے صلاح ومشورہ اور یگانگت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جب رفیع احمد قدوائی نے ایک ضمنی الیکشن کانگریس کی طرف سے لڑا تو لیگ نے ان کے خلاف اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا اور رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔ ان سب باتوں سے بعض لوگوں کو یقین ہوگیا تھا اور بظاہر مناسب بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ یو پی میں ایک قسم کی ملی جلی وزارت قایم ہوجائے گی۔ کم از کم اتنا تو یہ یقینی تھا کہ خلیق الزماں اس میں ضرور شامل ہوں گے۔'' 1

سری پرکاش نے جو ایک ممتاز کانگریسی لیڈر تھے اور جو بعد کو ایک صوبے کے گورنر بنے اور نہرو کی کابینہ میں بھی ایک وزیر تھے ایک خط میں خلیق الزماں کو لکھا: ''مجھے 37-1936ء کے الیکشن کے بعد والا واقعہ یاد آیا اور یہ کہ کس طرح کانگریس اور لیگ جنھوں نے مل جل کر الیکشن میں کام کیا تھا اور ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تھے صرف اول الذکر کے لیڈروں کی غلطیوں کے باعث۔'' 2

جواہر لال کا کہنا یہ تھا کہ 1937ء میں ان کی بڑی خواہش یہ تھی کہ یو پی میں کانگریس زرعی اصلاحات کرے اور ''اس لیے وہ مسلم لیگ کو کابینہ میں شامل کرنے کے خلاف تھے جس میں بعض بڑے زمیندار شامل تھے۔'' 3

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظریات کی یکسانیت کا اصول اور کابینہ کی مجموعی

---

1. دی ہسٹری آف دی انڈین نیشنل کانگریس از پی سیتارمیا۔ جلد دوم ص 690

2. بحوالہ کتاب گزشتہ از چودھری خلیق الزماں ص 188

3. بحوالہ گزشتہ: خالد بن سعید ص 18

ذمہ داری کا سوال درمیان میں حائل تھا اسی لیے اتحاد کی کوشش ناکام ہوگئیں۔

خلیق الزماں کا کہنا یہ تھا کہ آزاد نے وزارت میں لیگ کی شرکت کے لیے جو بنیادی شرطیں رکھی تھیں ان کا مطلب تو یہ تھا کہ لیگ کالعدم ہو جاتی۔ یہ شرطیں بعد کو نرم کردی گئی تھیں اور وہ انھیں منظور کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ لیگی وزرا کو اس کی اجازت ہو کہ وہ فرقہ وارانہ معاملات پر (مذہب، مذہبی تقریبات، زبان، کلچر ملازمتیں وغیرہ) اپنے ضمیر کے مطابق رائے دے سکیں۔ یہ شرط کانگریس کو منظور نہ ہوئی اور گفتگو ناکام ہوگئی۔

یہ کہا گیا ہے کہ الیکشن کے دوران کانگریس نے لیگ کے ساتھ دکھاوے کا ساز باز اس لیے کیا تھا کہ اس کو الیکشن میں اپنی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ لیکن جب الیکشن کی بدولت کانگریسی مکمل اکثریت کے ساتھ مجلس قانون ساز میں پہنچ گئے تو ان کو لیگ یا دیگر پارٹیوں کی امداد کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ پھر جب مسلم اکثریت والے صوبوں میں لیگ بری طرح ناکام رہی تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس کا مسلم عوام پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہے۔ اس کی صفوں کو بھی بہت لوگ چھوڑ کر چلے جا رہے تھے اس لیے فرقے وارانہ مسئلے کو طے کرنے کے لیے اس کی امداد کچھ قدر و قیمت نہ رکھتی تھی۔

بہرحال، ان باتوں کے علاوہ چند بڑے بنیادی سوالات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جواہر لال نے اپنی گفتگو اور تقریروں میں ان کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً انھوں نے خلیق الزماں سے کہا تھا: ''ہندوستان میں ہندو مسلم سوال دراصل چند تعلیم یافتہ زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے جو اسے ایک مسئلہ بنا کر پیش کر رہے ہیں اور جس کا احساس درحقیقت عوام کے ذہنوں میں نہیں ہے۔'' انھوں نے اس خیال کا مذاق اڑایا کہ ''مجلس قانون ساز کے حدود کے اندر مسلمانوں کی کوئی علاحدہ جماعت

اپنا وجود جتائے۔'' [1]

بنگال میں الیکشن کی مہم کے سلسلے میں جب جناح تقریر کر چکے تو جواہر لال نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ جناح کی تقریر کا مطلب تو یہ ہے کہ'' سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات میں مسلمان ایک علاحدہ جماعت کی حیثیت رکھیں اور دوسری جماعتوں سے ان کا برتاؤ ایسا ہو جیسا ایک قوم دوسری قوم سے کرتی ہے۔'' انھوں نے مزید یہ بھی کہا'' مسلم لیگ کے بہت سے ممبروں سے زیادہ میرے تعلقات مسلم عوام سے ہیں۔ میں ان کی مفلسی، فاقہ کشی اور مصیبتوں کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ جانتا ہوں جو فی صدی کے حساب سے کونسلوں میں نشستوں اور صوبوں کی ملازمتوں میں ان کو جگہیں دینے کی بات کرتے ہیں۔'' [2] انھوں نے جنوری 1937ء میں ایک خط میں جناح پر واضح کر دیا کہ'' آخری تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں یعنی برطانوی سامراج اور کانگریس جو ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کرتی ہے۔'' [3]

اس طرح انھوں نے گویا لیگ کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

دہلی میں آل انڈیا نیشنل کنونشن میں 19 / مارچ 1937ء کو نہرو نے اپنے خطبے میں یہ بتاتے ہوئے کانگریس مسلمان امیدواروں کو مجالس قانون ساز میں کامیاب کرانے میں کیوں ناکام رہی، کہا کہ'' ہم ناکامیاب اس لیے رہے کہ ہم نے عرصے سے مسلم عوام سے رابطہ چھوڑ رکھا تھا اور ہم ان تک وقت پر نہ پہنچ پائے .... فرقہ وارانہ مسئلہ جس کے متعلق ہم آج کل بہت کچھ سنتے رہتے ہیں اس وقت بالکل ناپید

---

1. بحوالہ گزشتہ، از چودھری خلیق الزماں۔ ص 157
2. بحوالہ گزشتہ از خالد بن سعید ص 115 (ماخوذ از ویکلی اسٹیٹس مین اوور سیز اڈیشن، کلکتہ، 14 / جنوری 1937ء)
3. انڈین مسلمس: اے پولیٹیکل ہسٹری ص 251، از رام گوپال

ہو جاتا ہے جب ہم کسی کسان سے بات چیت کرتے ہیں خواہ وہ ہندو یا مسلمان یا سکھ........... مجھے ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے کہ وہ لوگ کانگریس کی طرف واپس آرہے ہیں تا کہ جن تکلیف دہ بھاری بوجھوں سے وہ لدے ہوئے ہیں اس میں ان کو راحت مل سکے۔ اس لیے اس امر کا یقین رکھنا چاہیے مستقبل میں ان کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا بشرطیکہ ہم مناسب طور پر ان سے ملیں اور اقتصادی معاملات کی بنیاد پر ان سے گفتگو کریں۔"[1]

جواہر لال کے درشت الفاظ کے پس پشت ان کا یہ عقیدہ تھا اور جو کانگریس کا پہلا بنیادی اصول بھی تھا کہ ہندوستان ایک اکائی ہے اور ہندوستانی قوم ایک مجموعی یگانگت ہے جس میں اسکے تمام وہ باشندے جو ہندستان کی جغرافیائی حدود کے اندر بستے ہیں مل جل کر ایک قوم بن جاتے ہیں۔

مسلم لیگ جو 1937ء تک اس تصور کو مانتی رہی تھی کہ ملک ایک ہے، قوم ایک ہے اور حکومت ایک ہے اب اصرار کرنے لگی کہ مسلم فرقے کو بحیثیت ایک ضمنی قومیت کے تسلیم کیا جانا چاہیے جس کا اپنا کلچر ہے، اپنی زبان ہے، اپنا مذہب ہے، اپنی روایات اور اپنے نجی قوانین ہیں اور جس کے باعث اس کے سیاسی مفادات جداگانہ ہیں۔ اس لیے اس کے لیے دستوری تحفظات ضروری ہیں۔

لیکن مبالغہ برطرف، کیا کانگریس اور لیگ کے درمیان نظریاتی اختلافات کوئی اصلی حقیقت بھی رکھتے تھے؟ اختلافات کی خاص باتیں تین تھیں: (1) 1937ء کے الیکشن لڑنے کے لیے کانگریس کی منظوری تا کہ کانگریس اپنے نصب العین یعنی سوراج کی تبلیغ کر سکے اور اس کے بعد عہدوں کی قبولیت بظاہر 1935ء کے دستور کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے۔ لیگ کا نظریہ بھی یہی تھا یعنی مکمل خود اختیاری حکومت یا سوراج

1۔ ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1937ء جلد اول، ص 208

حاصل کرنا لیکن لیگ عہدے اس لیے قبول کرنا چاہتی تھی کہ دستور جیسا کچھ ہے اسے آزما کر دیکھا جائے۔ جناح کانگریس کے رویے کو پر تصنع اور غیر واقعیت پسند سمجھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ 1923ء میں بھی سوراج پارٹی نے یہی مقصد پیش کیا تھا لیکن ان کے عمل سے ان کے زبانی دعوے ثابت نہیں ہوئے تھے۔

کانگریسی وزارتوں نے بعد میں جس طرح صوبوں میں کارروائیاں کیں ان سے ثابت ہو گیا کہ جناح صحیح کہتے تھے۔

(2) وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کے عطا کردہ فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل اوارڈ) کو کانگریس نے نہ تو منظور کیا تھا نہ نامنظور، بلکہ کوشش کی تھی کہ فرقوں کے درمیان خود آپس ہی میں کوئی معاہدہ ہو جائے۔

لیگ چاہتی تھی کہ 'فرقہ وارانہ مراعات' کو عارضی طور پر قبول کر لیا جائے اور اس درمیان کوششیں جاری رکھی جائیں کہ دونوں فرقوں کے درمیان مصالحتی گفتگو سے اس کی جگہ کوئی دوسری فارمولا نکال لیا جائے۔

(3) سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیدا ہوئی جب کانگریس نے مسلم لیگ کو ایک بالکل الگ جماعت کی حیثیت سے اور اس سے وابستہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک سیاسی گروپ یا فرقے کے ماننے سے انکار کر دیا۔

بدقسمتی سے کانگریس اور لیگ دونوں اس نکتہ پر غلط فہمی کے باعث نقصان میں رہیں۔ کانگریس کا یہ عقیدہ کہ ہندوستان ایک وحدانیت ہے مخلصانہ ہی نہیں بہت گہری بنیادیں رکھتا تھا۔ ہندوستانی تاریخ کے آغاز سے ملک جس کے شمال میں ہمالیہ اور دریائے سندھ تھا، جنوب میں راس کمورن اور بحر ہند، اور جس کے مغربی اور مشرقی ساحل پر سمندر موجیں مارتا تھا، یہاں کے باشندوں کے لیے ایک غیر منقسم ملک تھا۔ یہاں کے قدیم رشیوں نے اس دیس کی تقدیس میں بیانات دیے تھے اور یہاں کے

موسیقاروں نے اس کے گن گائے تھے۔اس کی تعظیم وتکریم یہ کہہ کر کی جاتی تھی کہ یہ ہر مذہب کے سنتوں، مصلحوں اور شاعروں کا مسکن رہا ہے ۔ بڑے بڑے کشور ستانوں،سورماؤں اور فاتحوں کی جولاں گاہ رہا ہےاورمدبروں، حاکموں اور بہادروں کا وطن۔ اس میں دونوں فرقوں کی بے مثال شان وشوکت کی یادگاریں محفوظ ہیں۔ یہاں حسن کے خالقوں،لوہے،سونے ، چاندی،سوت اورریشم اور پتھر پرنقش بنانے والوں نے جنم لیا ہے۔ ہندوستانی روح کا سب سے زیادہ وجدآفریں خواب اور یہاں کے ذہن کی سب سے بڑی کاوش یگانگت اوروحدت ہی رہی ہے۔

ہندوستان کی اس وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا خیال ہی سوہان روح تھا۔لیکن ارفع واعلیٰ خیالات چاہے جتنی جذباتی قدروقیمت رکھتے ہوں واقعیت پسندی کا تقاضا تھا کہ اس پر خارجی نقطہ نظر سے اور اپنائیت سے دور ہوکر غوروخوض کیا جائے۔تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان کو یہ تصوراتی اور مثالی وحدت کبھی نہ حاصل ہوسکی۔صرف کبھی کبھی اوروہ بھی تھوڑی مدت کے لیے سیاسی ہندوستان یا ہندوستان کی حکومت تو ضرور اس کی جغرافیائی حدود تک پھیل سکی۔مثلاً عیسیٰ سے تین سو سال قبل موریہ کے زمانے میں پچاس برس تک، خلجی اور تغلق دور میں کچھ عرصے کے لیے اور مغل شاہنشاہوں کے عہد میں وسط سولھویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے آغاز تک اورآخر میں عہد انگلستان میں سو سال سے کچھ زاید عرصہ تک ہندوستان سیاسی طور پر ایک وحدت رہا ورنہ زیادہ عرصوں تک تو ہندوستان کے شمال مغربی،مشرقی اور جنوبی حصے الگ الگ ہی رہ کر اپنے اپنے علاقوں پرحکومت کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ ایک ہی نظام حکومت کے تحت رہنا اقتصادی اور سیاسی نقطہ نظر سے بہت مفید اور مناسب تھا۔متحد رہ کر دونوں ایک دوسرے کی اقتصادیات پر قابو رکھ کر ملک کی اقتصادی حالت کوجلد تر ترقی پذیر بنا سکتے تھے۔دونوں مل کر باہری خطرات کا

زیادہ کامیابی سے مقابلہ کر کے اپنی آزادی اور اقتدار کو بڑی خوش اسلوبی سے برقرار رکھ سکتے تھے۔ غیر متحدہ اور جدا رہنے کی بہ نسبت دونوں مل کر ساری دنیا کے معاملات پر اثر انداز ہونے کا رول بہتر طور پر ادا کر سکتے تھے۔ بہر حال مختلف علاقوں کے یہ دونوں گروپ دو قومیتیں مانے جانے کا اتنا ہی اخلاقی استحقاق رکھتے تھے جتنا کہ ہندوستان کے تمام بقیہ لوگ۔

اس لیے جواہر لال کی اس رائے پر کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں اور جناح کا یہ خفگی سے اصرار کہ نہیں تین ہیں حق بجانب تھا لیکن جو دلیل اس کے ثبوت میں انھوں نے پیش کی وہ غلط تھی کیونکہ کسی صورت میں جناح کے یہ دو قضیے تسلیم نہیں کیے جا سکتے تھے یعنی (1) ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے اور اس لیے یہ دو الگ الگ قومیں ہیں (2) برصغیر ہندوستان کے تمام مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں اس لیے ان کے لیے جداگانہ ریاست کی ضرورت ہے۔

قطع نظر اس سے کہ کلچر اور طرز رہائش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذہبی معاملات میں بھی ہندوستان کے مسلمان باہری ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوستانی نقطہ نظر کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ اسلامیات کا ایک مستند عالم اور پاکستانی معاملات ایک ہمدرد اس طرح لکھتا ہے:

"برصغیر ہندو پاکستان میں اسلام عدیم المثال ہے کیونکہ صدیوں سے اس کی قربت ہندومت سے رہی ہے اور مسلم اقلیت نے مدتوں ہندو اکثریت پر حکومت کی ہے۔"[1]

اسی طرح کی دوسری بڑی اہم غلط فہمی اور اس کے باعث نظریاتی تصادم کی وجہ یہ

---

1. اسلام ان ماڈرن نیشنل اسٹیٹ (1965) ص 47-246 از ای، آئی، جے روزنتھال

تھی کہ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلم مفادات کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی جائے۔ جواہر لال پوچھتے تھے کہ وہ مفادات کیا ہیں۔ یہ مفادات یا تو مذہبی ہوتے ہیں یا ثقافتی (کلچرل) یا سیاسی۔ جہاں تک پہلے مفاد کا سوال ہے کانگریس ایک بار نہیں، متعدد بار سنجیدگی سے اعلان کر چکی ہے کہ دستور میں مذہبی مفادات کا تحفظ مسلمانوں کے لیے نہایت اطمینان بخش طریقے پر کیا جائے گا۔

دوسرے قسم کے مفاد کے متعلق نہرو کا کہنا یہ تھا کہ سیاسی مفادات اصلاً زیادہ تر اقتصادی مفادات ہوتے ہیں اور اقتصادی مفادات کا تعلق دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم سے ہوتا ہے۔ اور یہ چیز تمام ہندوستانیوں کے لیے مشترک ہوگی بلالحاظ اختلاف مذہب و سماج و کلچر کے۔ اس لیے فرقہ کی بنیاد پر کانگریسی کسی قسم کے امتیاز واختلاف کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ عام حقوق کے علاوہ کوئی مخصوص اقتصادی حقوق نہیں ہو سکتے جن کے لیے کسی قسم کے قانونی یا دستوری تحفظات کی ضرورت ہو۔ دولت پیدا کرنے والے معمولی لوگ: کسان، وہ تمام مزدور جو صنعت وحرفت یا کسی قسم کی تجارت یا پیشے میں لگے ہوئے ہیں، ان سب کے مسائل ایک ہی جیسے ہیں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔

سیاسی سرگرمیوں کی اس اقتصادی تشریح سے مدلل طور پر یہ واضح کر دیا گیا کہ فرقہ وارانہ سیاست خود تردیدی ہے اور اس لیے جو پارٹی فرقہ وارانہ بنیاد پر بنائی جائے گی اس کا کوئی جواز نہ ہوگا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کے لیڈر بغیر کسی فلسفہ طرازی کے یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اقتصادیات کی اہمیت سیاسی سرگرمی کو ختم نہیں کر سکتی۔ سیاسی سرگرمی مذہبی، ثقافتی بلکہ اقتصادی سرگرمی سے بھی جداگانہ چیز ہے۔ سیاست کی روح اور اس کی امتیازی خصوصیت حصولِ اقتدار ہے اور اقتدار ہی سے سماجی، اقتصادی اور قومی معاملات پر

فیصلہ کرنے اور ان کو نافذ کرنے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے لیگ جب حقوق کی ضمانت کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فیصلے کرنے اور انھیں نافذ کرانے کی طاقت میں اپنا حصہ طلب کرتی ہے۔

لیگ کو رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ اقتدار دستور کے کاغذات میں یا کسی قانون کی دفعات سے نہیں پایا جا سکتا۔ 1935ء تک تو وہ واضح طور پر نہ سمجھ سکی نہ کوئی ایسی تدبیر سوچ سکی تھی جس سے وہ اقتدار میں کوئی حصہ بٹا سکتی۔ 1937ء اور 1939ء کے دوران تو اس کا یہ اعتماد بھی جاتا رہا کہ تحفظات، مراعات یا اسی قسم کی دیگر دستوری تدابیر وتراکیب سے اس کو اپنا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح یا غلط، بہرحال لیگ اس نتیجے پر پہنچی کہ واحد حل یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی اپنی ایک ریاست ہو جائے جس کے وہ حاکم مطلق ہوں۔

جمعیت العلماء (مسلمان عالموں کی جماعت) نے 1936ء میں جناح سے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک ہی مسئلہ ہے۔ مذہب، کلچر، زبان، قانون شریعت اس معاملے کی نہ بنیادی شقیں ہیں نہ اصل معاملے کی جان۔

آخرکار، کانگریس اور لیگ نے جب ان دونوں کے آپس کے تعلقات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا یہ محسوس کیا کہ دونوں اپنے طریقوں پر صحیح ہونے کے باوجود غلطی پر تھے۔ کانگریس کے صدر نہرو اور جناح کے درمیان جنوری اور فروری 1938ء میں جو خط وکتابت ہوئی اس میں نہرو نے مسلم لیگ کے متعلق اپنا پرانا نظریہ بدل دیا۔ انھوں نے 4/فروری 1938ء کو لکھا: ''مجھے نواب اسمٰعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں سے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ یوپی مسلم لیگ یا یوپی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے یہ پروگرام منظور کر لیا (جسے کانگریس کی مجلس عاملہ نے 1937ء میں بنایا تھا)۔ اس کے مشمولات میں تھے ہمارا مقصد یعنی آزادی، ایک دستور ساز

اسمبلی کے لیے ہمارا مطالبہ، دستوری ایکٹ اور وفاق کے متعلق ہمارا عام رویہ اور مجالس قانون ساز کے اندر اور باہر رہ کر ہمارا طریق کار۔ اس میں ہمارے زرعی اور مزدوروں سے متعلق پروگرام بھی تھے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان بہت سی باتوں میں اتفاق رائے ہے نہ صرف بنیادی امور پر بلکہ بہت سے تفصیلات پر بھی۔"[1] اس احساس نے آخرکار کانگریس کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ مغربی اور مشرقی علاقے ایک دوسرے سے الگ رہنے کا حق رکھتے ہیں اور لیگ بھی مجبور ہوئی کہ وہ اپنی یہ خود فریبی ترک کردے کہ ہندوستان کی ساری مسلم آبادی ساری اسلامی قوم کا ایک جزو اور حصہ ہے۔ وزارت سازی کے سلسلے میں کانگریس کی آپس کی یگانگت کا اصول بھی مختلف فیہ تھا کیونکہ سوال یہ اٹھا کہ کیا کانگریس ایک سیاسی پارٹی ہے یا ایک قومی تحریک جس میں مختلف نظریات رکھنے والے گروپ ایک واحد مقصد یعنی آزادی حاصل کرنے کے لیے مجتمع ہو گئے تھے۔ اس کے دامن میں دائیں بازو والے مالویہ جیسے لوگ، اعتدال پسند پٹیل اور راجندر پرساد قسم کے اشخاص جواہر لال جیسے بائیں بازو والے، سوشلسٹ جیسے جے پرکاش نرائن اور نریندر دیو اور کمیونسٹ خیالات کے افراد بھی موجود تھے۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ سب جواہر لال کے اقتصادی یا زرعی اصلاحات کے پروگرام پر متفق ہو جاتے۔

صوبوں کے گورنروں کو وثیقۂ ہدایات (Instrument of Instructions) جو ملی تھی اس کی دفعات 7 اور 9 پر مسلم لیگ کے اپنے معاملے کا انحصار تھا۔ دفعہ 7 میں درج تھا کہ "وزیروں کی کونسل کی تقرری میں گورنر حتی الامکان وزیروں کا انتخاب اس شخص کے مشورہ سے کرے گا جو اس کے نزدیک اس بات کی اہلیت رکھتا ہو کہ وہ مجلس قانون ساز میں ایک مضبوط اکثریت کا مالک ہے اور وہ ایسے لوگوں کو (جن میں جہاں

1 انڈین سالانہ رجسٹر 1938ء جلد اول، ص 364

تک ممکن ہو اہم اقلیتی فرقے کے ممبران بھی شامل کیے جائیں) وزیر بنا سکتا ہے جو مجموعی طور پر مجلس قانون ساز میں معتبر و مقتدر سمجھے جاتے ہوں۔"

دفعہ 9 گورنر کے اس ذمہ داری کے متعلق تھی جس کے تحت اس کو اقلیتوں کے جائز مطالبات کا تحفظ کرنا تھا۔ اس دفعہ کے تحت ضروری تھا کہ وہ عام طور پر ملحوظ رکھے کہ وہ مذہبی اور نسلی فرقے جس کے ممبروں کو خاص طور پر نمائندگی ملی ہے...... کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانے پائیں یا کسی قسم کی غفلت یا ظلم کے باعث ان پر خوف طاری ہو جائے۔"[1]

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خاص پارلیمنٹری حکومت کے دیس، انگلستان میں مجموعی ذمہ داری کے اصول کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ 1931ء میں وہاں مشترکہ گورنمنٹ تھی جس کے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ لیبر پارٹی کے ممبر تھے اور دوسرے اہم وزیر بالڈون قدامت پسند پارٹی کے تھے۔ چار برس کے بعد 1935ء میں صورت حال بدل گئی تھی اور ان کے منصب ادل بدل گئے تھے لیکن مشترکہ گورنمنٹ چلتی رہی۔ 1932ء میں اس مشترکہ کابینہ کے وزرا میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ وزرا کی اکثریت یہ چاہتی تھی کہ برطانوی صنعت کے تحفظ کے لیے درآمدی محصول لگایا جائے۔ بعض وزرا بشمول سیموئل (لبرل) اور اسنوڈن (لیبر) اس رائے کے خلاف تھے اور استعفار دینے پر تیار تھے۔ لیکن بحران اس فیصلے سے ٹل گیا کہ وزرا استعفیٰ نہ دیں بلکہ ان کو اجازت ہوگی کہ وہ اس معاملے میں اپنے اختلاف رائے کا اظہار پارلیمنٹ میں بھی کر سکتے ہیں۔

یہ اگر مان بھی لیا جائے کہ کانگریسی لیڈروں نے مسلم لیگیوں کو وزارت میں شامل کرنے سے انکار کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ دستوری ضابطے کے مطابق تھا پھر بھی اس کو

---

1. انڈین کانسٹی ٹیوشنل ڈیولپ منٹ (دوسرا اڈیشن 1949ء) جلد سوم ص 22-321 از اے۔ سی۔ بنرجی

عقل مندی قرار دینا مشکل ہے۔

جواہر لال کے اس فعل پر آزاد نے یوں تبصرہ کیا:

"بعض اوقات نظریاتی اصول ان پر اس قدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعی صورت حال کا اندازہ صحیح نہیں لگا پاتے۔" 1

جناح کی سرکشی سے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور کانگریسی لیڈروں کے خلاف ان کا غم و غصہ حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے پھر بھی انھوں نے جو بعض بیانات دیے ان کو صحیح قرار دینا ممکن نہیں۔ مثلاً اپریل 1937ء میں انھوں نے یوپی پارلیمنٹری بورڈ کی یہ کہہ کر سرزنش کی کہ بورڈ ان کے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو منظم کرنے کے مقصد کو تہس نہس کر رہا ہے اور بورڈ کو روکا کہ وہ صوبے میں کانگریس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ بغیر لیگ کی منظوری کے نہ کرے۔ لیکن لیگ بورڈ نے کسی متفقہ طور پر منظور کردہ پروگرام کی بنیاد پر کانگریس یا کسی دوسری پارٹی سے اتحاد اور اشتراک کا فیصلہ کر لیا۔

جناح کے اس فعل کے نتائج خراب ہوئے۔ لیگ کیمپ میں برگشتگی پھیل گئی کیونکہ کانگریس کی طرف سے ناامید ہو کر جناح نے مجلس قانون ساز کے ان مسلمان ممبروں کی حمایت حاصل کرنا چاہی جنھوں نے مسلم لیگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی دوسری پارٹیاں بنالی تھیں۔

یوپی میں ایگریکلچرل پارٹی سے ساز باز کرنے سے قوم پرست مسلمان مثلاً جمعیت العلماء، احرار اور دوسرے لوگ ناراض ہو گئے۔ جمعیت کے ایک بہت معزز لیڈر حسین احمد مدنی نے اپنے رسالے میں ان وجوہ پر روشنی ڈالی جن کے باعث جمعیت، لیگ سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ان وجوہ میں سب سے اہم وجہ یہ بتائی گئی کہ جناح نے جو یہ وعدہ کیا تھا کہ لیگ رجعت پسند مسلمانوں سے اشتراک

---

1 بحوالہ کتاب گزشتہ: از مولانا ابوالکلام آزاد، ص 160

نہ کرے گی اس کی خلاف ورزی کی۔[1]

جناح کا تعاون کھو دینے کے باعث کانگریس کی اپنی طاقت میں کمزوری آگئی۔ 1937ء میں مسلمانوں میں جناح ہی صرف ایسی حیثیت کے لیڈر تھے جو کل ہند شہرت وعزت کے مالک تھے۔ ان کے واحد رقیب، فضل حسین کا جولائی 1936ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ پنجاب، بنگال، آسام اور سندھ کے لیڈران صرف صوبائی عزت رکھتے تھے اور ان کی صوبائی سیاسی تنظیمیں اپنے اثرات میں محدود تھیں۔

جناح ان سب سے بلند تر حیثیت کے مالک تھے۔ لیاقت تجربہ اور کردار میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ وہ مسلم لیگ کے واحد ڈکٹیٹر تھے اور مسلم لیگ اب ان کی پر جوش کوششوں کے باعث اپنے پچھلے زوال سے ابھر کر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن کر سامنے آرہی تھی۔ اس کی حریف آل انڈیا مسلم کانفرنس مر چکی تھی۔

جواہر لال نے لیگ کے متعلق جو بیان دیا تھا جناح کی طرف سے اس کا جواب ایک طرف تو لیگ کی اس پریشان خاطری کا اظہار تھا جو اس کو اپنے حلیفوں یعنی جمعیت العلماء اور دیگر پارٹیوں کے علاحدہ ہو جانے کے باعث لاحق ہوگئی تھی دوسری طرف کانگریس کی اس قرارداد کی اس دھمکی کا بھی احساس تھا کہ وہ (کانگریس) مسلم عوام سے اپنے تعلقات بڑھائے گی۔

اقبالؔ نے جناح کو متنبہ کیا تھا: ''ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی سیاسی جماعت جو عام مسلمانوں کی حالت کی بہبودی کا وعدہ نہیں کرتی وہ ہمارے پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔'' اور مشورہ دیا: ''ہندوستان کے مسلمان اپنے ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہوسکیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کو از سر نو تقسیم کیا جائے اور کوئی ایک یا

[1] مسٹر جناح اور اس کا پراسرار کام (اردو) از حسین احمد مدنی

ایک سے زیادہ ایسی مسلم ریاستیں بنائی جائیں جن میں ان کی مطلق اکثریت ہو۔'' 1

جناح کو اقبال کی تحریک کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ ایسی طاقت ور جماعت بنالیں گے جس کو نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اتنی شدید قوت اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ دکھایا کہ ہر شخص متعجب رہ گیا۔ اپنے غیض وغضب میں انھوں نے ان اصولوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جن کی وہ ساری زندگی وکالت کرتے رہے تھے یعنی خود اختیار حکومت حاصل کرنے کے لیے دستوری اور قانونی طریقوں کا استعمال، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد تاکہ ایک بدیسی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہو سکے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا، نامذہبیت، سیاسی تحریکوں میں عوام کی دخل درانداز ی کو قبول نہ کرنا۔

جب یوپی میں کانگریسی وزارتوں کو قائم ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے اس وقت لکھنؤ میں 15 / اکتوبر لغایت 18 / اکتوبر 1937ء مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ جناح نے اپنے صدارتی خطبے میں کانگریس پر الزام لگایا کہ یکسر ہندوانی پالیسی اختیار کرنے کے باعث وہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ دور اور الگ کرنے لگ گئی ہے اور چونکہ انھوں (کانگریسیوں) نے صوبوں میں صرف اپنی حکومتیں بنالی ہیں اور اپنی باتوں، اپنے افعال اور اپنے پروگرام سے واضح کر دیا ہے کہ مسلمان ان سے کسی انصاف یا مساوی برتاؤ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔'' 2

انھوں نے گورنمنٹ کو ان الفاظ میں متنبہ کیا: ''یہاں جتا دینا، نامناسب نہ ہوگا کہ ان تباہ کن نتائج کی ذمہ داری کے لیے جو آئندہ ہو سکتے ہیں، برطانوی حکومت

---

1. بحوالہ کتاب گزشتہ از ایم ایچ سید، ص 61-260

2. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1937ء جلد دوم ص 403 میں محمد علی جناح کے خطبۂ صدارت کا ذکر جو مسلم لیگ لکھنؤ کے اجلاس میں 15 / اکتوبر 1937ء کو دیا گیا تھا۔

اپنے کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی۔ یہ بالکل صاف صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ گورنروں اور گورنر جنرل.........ان کو (اپنے اختیارات اور ذمہ داریوں کو) بروئے کار لانے میں ناکام رہے ہیں اور مسلمان وزیروں کی تقرری کے سلسلے میں دستور کے اصل مقصد اور ہدایات کی دستاویز کی صریحاً خلاف ورزی کے وہ بھی ذمہ دار ہیں۔"[1]

کانگریس کی طرف رخ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کے عام مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کا مقصد مسلمانوں کو منقسم اور کمزور کر دینا ہے اس لیے یہ مقصد خطرناک ہے۔

انھوں نے تمام صوبوں کے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ لوگوں کی بہبودی یعنی مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی بہتری کے لیے لیگ ان کے ساتھ تعاون کرے گی اور یہ بھی جتادیا کہ ان کی قسمت خود ان کے اختیار میں ہے اور ایک نہایت منظم، مضبوط، منضبط اور متحد طاقت ہر خطرے کا سامنا اور ہر مخالفت کا مقابلہ کر سکتی ہے"۔[2]

اس خطبہ سے ظاہر ہو گیا کہ انھوں نے اپنے ماضی سے اپنا تعلق قطعی منقطع کر لیا ہے۔ انھوں نے کہا" کوئی ہندو لیڈر جو ذمہ داری کے ساتھ کوئی بیان دیتا ہے، سمجھوتے کے لیے کسی قسم کی دلچسپی یا پرخلوص خواہش کا اظہار نہیں کرتا۔ باعزت سمجھوتے یا معاہدے برابر والوں ہی میں ہو سکتے ہیں اور جب تک دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے سے ڈرنا نہ سیکھیں کسی معاہدے لیے زمین ہموار نہیں ہو سکتی۔ اگر کمزور پارٹی صلح کی پیشکش کرتی ہے تو اسے ہمیشہ کمزوری کا

---

1. ہندوستانی سالانہ رجسٹر 1937ء جلد دوم ص 403 میں محمد علی جناح کے خطبۂ صدارت کا ذکر جو مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس میں 15 اکتوبر 1937ء کو دیا گیا تھا۔

2. ایضاً

اعتراف اور حملہ کی دعوت سمجھا جاتا ہے۔ حب وطن، انصاف اور ایمانداری کے لیے اپیل کرنا سب بے اثر رہتا ہے۔ اسے بات کو سمجھنے کے لیے کسی خاص سیاسی بصیرت کی ضرورت نہیں کہ تمام تحفظات اور معاہدے صرف ردی کاغذ کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک ان کی پشت پناہی کے لیے طاقت نہ ہو۔ سیاست کا مطلب طاقت ہے، انصاف، مساوات اور خیر سگالی کے لیے چیخ پکار کرتے رہنے پر بھروسہ کرنا نہیں۔''[1]

فیصلہ قطعی ہو گیا۔ علاحدگی نے میدان جیت لیا۔ پاکستان کا بیج بو دیا گیا اور اسے خوف، غصہ اور مایوسی کے احساس کے الغاروں پانی سے سینچا گیا۔ بہت جلد اس کا بدشکل انکور زمین میں سے اپنا سر اوپر نکال لایا۔

جناح کی تقریر سے ایک برقی رو کا اثر ہوا۔ بنگال میں فضل الحق کے تحت اور پنجاب میں سکندر حیات خاں کے تحت جو وزارتیں کام کر رہی تھیں انھوں نے مسلم لیگ کی اطاعت کا اعلان کر دیا اور اس کے عہد و پیمان (Pledge) پر دستخط کر دیے۔ بقول خلیق الزمان '' سر سکندر اور فضل الحق نے بڑے نازک موقع پر مسلمانوں کے مقدمے (کاز) کو اپنا بھرپور سہارا دے کر ہندی مسلمانوں کو بچا لیا۔ یہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تھا اور یو پی میں کامیابی پر مسلمانوں کا جوش بالکل مناسبت رکھتا تھا اس عظیم الشان فائدے سے جو ان کو حاصل ہو گیا تھا۔'' [2]

بہر حال، اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ اجلاس کے بعد لیگ کی مقبولیت مسلمانوں کے ہر طبقے میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ بڑھ گئی اور اس صورت میں زور اور جوش اس بات سے اور پیدا ہوا کہ تمام صوبوں کی مجالس قانون ساز میں حکومتی

1۔ ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح۔ جمع کردہ و ترتیب از جمیل الدین احمد۔ جلد اول۔ ص 33

2۔ بحوالہ کتاب گزشتہ از چودھری خلیق الزماں

پارٹی اور حزب مخالف کے ممبران مذہب کی بنیاد پر بٹے ہوئے تھے۔

صوبہ بنگال میں اسمبلی کے 250 ممبروں میں سے 119 مسلمان تھے جو دو پارٹیوں میں منقسم تھے۔ مسلم لیگ (40) اور کرشک پرجا پارٹی (31) اور بقیہ زیادہ تر آزاد تھے۔ پہلے کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر، فضل الحق اور کانگریس پارٹی کے درمیان اشتراک کے لیے گفت وشنید ہوئی لیکن ناکام ہوگئی۔ تب فضل الحق نے اپنی مخصوص شعلہ بیانی کے انداز میں اعلان کیا کہ کانگریس کی پیشکش قبول کر لیتے تو گویا ''اسلام کی موت پر وہ خود دستخط کر دیتے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایک مضبوط بلاک بنا کر حکومت بنالی اور حزب مخالفت میں زیادہ تر ہندو ممبر ہی رہے۔

پنجاب میں صورت حال کچھ پیچیدہ تھی اس لیے کہ وہاں کی اسمبلی میں تین قسم کے فرقوں کی نمائندگی کافی تعداد میں تھی۔ لیکن کانگریس 42 عام نشستوں میں سے صرف 18 حاصل کر سکی تھی اور یونینسٹ پارٹی کو کل 175 نشستوں میں سے 96 مل گئی تھیں اور ان کو خالصہ نیشلسٹ سکھوں کے 15 سے لے کر 20 ممبروں کے گروپ کا تعاون بھی حاصل تھا اس طرح وہاں کی حکومت میں بھی حزب مخالف ہندو ممبروں پر مشتمل تھا۔

دوسری طرف ان صوبوں میں جہاں کانگریس برسر اقتدار ہوگئی تھی صورت حال برعکس تھی۔ یوپی میں کانگریس نے جہاں اس کو مکمل اکثریت حاصل تھی لیگ کی اس تجویز کو کہ مشترکہ وزارت بنائی جائے نامنظور کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے 29 ممبروں کے ساتھ حزب مخالف کی سربراہی کی اور غیر لیگی مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ کر لیا۔ اس طرح وہاں کانگریسی حکومت کا جس میں ہندو بڑی کثیر تعداد میں تھے، مقابلہ ایسے حزب مخالف سے رہا جس میں خاص طور سے صرف مسلمان ہی تھے۔

بہار کا معاملہ بھی اس طرح کا رہا۔ اس کی 152 ممبروں کی اسمبلی میں کانگریس کو 98 نشستیں ملیں اور مسلمانوں کو 39 - یہاں بھی کانگریسی ہدایت کے بموجب غیر کانگریسیوں کو حکومت میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور حزب مخالف میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس قانون ساز، کانگریس پارٹی، ہندو اور مسلم مخالف پارٹی میں منقسم ہوگئی۔

سامراجیوں نے اپنے مفاد کی خاطر جداگانہ فرقہ وارانہ رائے دہندگی کا طریقہ جو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا بہانہ بنا کر ہندوستان پر زبردستی تھوپ دیا تھا اس کا براہ راست اور لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ ایسی غلط اور تباہ کن صورت حال ملک میں پیدا ہو جائے۔

پارٹیوں کی سیاست میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ جو پارٹی حزب مخالف بنتی ہے وہ اس پارٹی کو جو برسر اقتدار ہوتی ہے ہر قسم کی واقعی یا فرضی غلط کاریوں، بداعمالیوں اور ضرر رسانیوں کے لیے مورد الزام ٹھہراتی ہے۔ چونکہ مجالس قانون ساز کے اجزائے ترکیبی فرقہ وارانہ تھے۔ یہ الزام تراشیاں فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ گئیں اور اس کے باعث افتراق نمایاں تر ہوتا گیا اور فرقوں کے درمیان خلیج وسیع تر ہوگئی۔

مسلم فرقے میں جناح نے بہت ہی زیادہ بااثر مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گورنمنٹ کی طرف داری اور تعاون ان کو مل رہا تھا۔ 1937ء کے الیکشن میں جب کانگریس کو نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں تھیں تو گورنمنٹ بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے فوراً کانگریس کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے پرانے اسلحہ کو پھر سے چمکانا شروع کر دیا۔ فرسودہ اسلحے پھر باہر نکالے گئے یعنی:

1- دوستوں کو ہموار کرنا۔ اس موقع پر مسلمانوں کو، اور انھیں کانگریس کے

خلاف استعمال کر کے توازن برقرار کرنا۔

2-سیاست دانوں میں مختلف گروپ پیدا کرنا اور انھیں کانگریس کی سربراہی سے الگ رکھنا مثلاً لبرل پارٹی۔

3- خاص طور سے ایسے غیر مطمئن اور شکایتیں رکھنے والے عناصر کو اکسانا جو کانگریس کی مخالفت کر سکیں۔

4-اپنے دشمن یعنی کانگریس کی مزاحمت کے لیے گورنمنٹ کا اپنی پوری طاقت لگا دینا اور ضرورت پڑے تو اسے کچل دینا۔

اس صورت حال میں گورنمنٹ کا سب سے زیادہ اعتماد مسلمانوں پر تھا جن کی اس نے ہر طرح ہمت افزائی۔ گورنمنٹ نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کے طور پر تسلیم کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ کوئی اصلاح یا خود مختاری دینے کے سلسلہ میں کوئی قدم مسلمانوں کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھائے گی۔ استرداد (Veto) کی طاقت حاصل کرنے کے بعد جناح نے محسوس کیا کہ وہ جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔

آنے والی جنگ کے آغاز نے گورنمنٹ کو بالکل سراسیمہ کر دیا۔ کانگریس سے اس کی دشمنی نے جس کا مطلب تھا کہ آزادی کے مطالبے کی مخالفت، اس کو اندھا کر دیا۔ اگر چہ سکندر حیات خاں نے لن لتھ گو منع کر دیا تھا کہ جناح کی اہمیت زیادہ نہ بڑھائیں لیکن گورنمنٹ نے اپنے کو جناح کے بالکل سپرد کر دیا اور یہ بھی نہ سمجھی کہ جناح اپنے شرایط پر مال غنیمت میں ضرور حصہ طلب کریں گے۔ حکومت کو ہندوستان تقسیم کر کے چھوڑ دینا پڑے گا۔

جناح، جنھوں نے اپنی ساری عمر متحدہ ہندوستان کے لیے جدو جہد کی تھی اب اس سے پھر گئے اور اب ایک اس سے زیادہ پر کشش مقصد کی طرف مائل ہو گئے یعنی آزاد مسلم ہندوستان۔

اس طرح یہ سیاسی تنگ نظری تھی اور کانگریسیوں کی برطانوی حکمرانوں سے نفرت جس نے جناح کو دفعتاً ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

☆..................☆..................☆

پانچواں باب

نئے دستور کے تحت صوبہ جاتی خودمختاری

1- کانگریس اقتدار میں

7/ جولائی 1937ء کو کانگریس نے سات صوبوں میں عارضی وزرا میں بنا کر اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی۔ بقیہ چار صوبوں یعنی پنجاب، بنگال، آسام اور سندھ میں غیر کانگریسی وزارتیں اپریل سے کام کر رہی تھیں۔ ستمبر 38ء میں کانگریس کی سربراہی میں آسام میں مخلوط یعنی ملی جلی سرکار قائم ہوئی۔ ان حکومتوں کو زبردست معذوریوں کے تحت کام کرنا پڑا اور انھیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔ ہر حکومت کو دو قسم کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی یعنی لازمی جیسے کہ امن و امان قائم رکھنا اور دوسرے ثانوی یعنی معاون جیسے زرعی اصلاح، صنعتی ترقی، تعلیم، صحت عامہ اور دیگر فلاحی کام۔ کانگریسی وزیروں کو پہلی دشواری خود دستور کی دفعات کی وجہ سے پیش آئی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا یعنی وزیر ہند، گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات خصوصی کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کی خود مختاری پر زبردست پابندی تھی۔ لیکن وائسرائے اور کانگریس کے درمیان ایک شریفانہ سمجھوتے کی وجہ سے صوبوں کے روزمرہ کے نظم ونسق کے معاملوں میں گورنروں کی مداخلت بڑی حد تک کم ہوگئی اور کانگریس کو اپنے دور حکومت میں انگریز سربراہوں سے کوئی شکایت نہ ہوئی، اگرچہ بعض معاملات میں دونوں یعنی گورنروں اور کانگریسی وزیروں کے درمیان کبھی کبھی خاصی تلخی پیدا ہوئی۔

نظم ونسق کے علاوہ کی دوسری دشواریاں بھی تھیں۔ زیادہ تر وزیر نا تجربہ کار تھے مگر ان میں اصلاح کرنے کا زبردست جذبہ تھا۔ اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے، بروئے کار لانے کے لیے انھیں اعلیٰ سرکاری عہدیداروں اور افسروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جبکہ سرکاری عہدیدار ایک بالکل ہی الگ قسم کے نظم ونسق اور کام کاج کے بالکل ہی مختلف طور طریقوں، رجحان اور طرز عمل کے عادی تھے۔

پرانی بوتلوں میں نئی شراب کے رکھ دینے سے نت نئے مسائل پیدا ہوئے۔ وزیروں کے محکموں کے سکریٹری انڈین سول سروس میں سے ہوتے تھے وہ بلاشبہ بڑے لائق، قابل اور تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر یا منتظم تھے لیکن وہ جمہوری طور طریقوں سے بالکل نا آشنا تھے اور ان کی نزدیک وزیروں کے نظریات کو عملی جامہ پہنانا ناممکن تھا۔ ہندوستان کے ان اعلیٰ ترین سرکاری ملازمتوں شہری اور انتظامیہ پر اکثریت یورپینوں کی تھی اور ان کے لیے نئے ہندوستانی حاکموں کی ماتحتی میں کام کرنا آسان نہ تھا۔ وہ مکمل طور سے وزرا کے ماتحت بھی نہیں تھے۔ ان کی تقرری، ترقی، برخاستگی وغیرہ انگریز وزیر ہند (سیکریٹری آف اسٹیٹ) کی ذمہ داری تھی۔

ان حالات میں یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہ تھی کہ وزیر خود کو بے بس ولاچار سمجھیں لیکن بحیثیت مجموعی دونوں یعنی وزیر اور سرکاری عہدیدار ایک دوسرے سے خوش اسلوبی سے تعاون کرتے رہے۔ اصل جھگڑے کی جڑ مالیات (Finance) تھا۔ ہندوستان کی سالانہ سرکاری آمدنی کا بہت بڑا حصہ مرکزی حکومت کے تصرف میں تھا اور چالیس فیصدی سے بھی کم سرکاری آمدنی گیارہ صوبوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ مندرجہ ذیل گوشوارے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

(1) 1938-39ء میں مرکزی حکومت کی آمدنی یا محاصل کے ذرائع:

(الف) کسٹم، اکسائز ٹیکس، انکم ٹیکس، کارپوریشن ٹیکس، افیون اور نمک کی اجارہ

داری اور دوسری مدیں۔

(ب) ریلوے، آب پاشی، ڈاک وتار، کرنسی اور ٹکسال، دفاع یا نظم ونسق، خدمات عامہ اور متفرقات = میزان 119.25 کروڑ

اخراجات: سرکاری قرضوں کی ادائیگی، سول ایڈ منسٹریشن، پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ، دفاع کے لیے اخراجات، صوبوں کی مالی امداد، ٹکسال اور کرنسی۔

(ب) ریلوے، آب پاشی، ڈاک وتار: میزان = 122 کروڑ

(2) نو صوبائی حکومتیں 39-1938ء

(1) محاصل یا آمدنی: مال گذاری بشمول جنگلات۔ آبپاشی = 35 کروڑ

(ii) نمک، آبکاری، ٹکٹ، موٹر گاڑیاں، انکم ٹیکس، سود وغیرہ = میزان 40 کروڑ

میزان کل..........75 کروڑ

مصارف

(1) آراضی کی مالگذاری بشمول جنگلات وآب پاشی......11 کروڑ

(2) نمک اکسائز، اسٹامپ، موٹر گاڑیاں......16 کروڑ

(3) عام نظم ونسق، عدالتیں، جیل اور پولیس......24 کروڑ

(4) تعلیم، صحت، دوائیں، سائنسی محکمے......16 کروڑ

(5) زراعت......(انڈسٹری)...... 4.4 کروڑ

کل مصارف......72 کروڑ

اگر آمدنی کا پچاس فیصدی ان امور کے لیے محفوظ کر دیا جاتا جس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جاسکتی تھی تو عام فلاح و بہبود کے کاموں، یعنی تعلیم، صحت اور صنعتوں کے لیے صوبائی حکومتوں کے پاس بہت ہی کم روپیہ رہ پاتا تھا۔

وزیروں کے بڑے بڑے اور مفید منصوبے مالی وسائل کی کمی کی وجہ بروئے کار

نہیں لائے جاسکتے تھے۔ آمدنی کے وہ ذریعہ جو برابر بڑھتے رہتے تھے مثلاً انکم ٹیکس اور کسٹم پورے طور سے مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھے جبکہ صوبوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ مالگذاری تھی جس کے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے کہ کانگریس وزارتیں اس وعدے کی پابند تھیں کہ کسانوں سے لگان کم لیا جائے اس وجہ سے حکومت کو مالگذاری بھی کم ملتی تھی۔

دوسری طرف وہ سارے محکمے جن کا تعلق سماجی فلاح و بہبود اور معاشی ترقی سے تھا صوبوں کے حوالہ کیے گئے تھے۔ ان محکموں کو اب تک مالی امداد کم ہی مل پائی تھی اس لیے اب ان کو جتنی بھی رقم دی جاتی، وہ کم ہی ہوتی۔ تعلیم اور صحت عامہ کے محکموں میں فوری ترقی، توسیع اور اصلاح کی اشد ضرورت تھی اس لیے کہ خواندگی کی شرح بہت کم تھی اور شرح اموات بہت زیادہ۔ دیہاتوں میں رہنے والے ان پڑھ اور جاہل تھے اور وہ اپنی زندگی گندگی میں بسر کرتے تھے۔ دیہاتوں میں نہ تو اسکول تھے اور نہ ہسپتال، دیہی صنعتیں دم توڑ رہی تھیں۔ کھیتی باڑی میں فرسودہ طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ سڑکیں برائے نام تھیں۔ محدود ذرائع آمدنی اور پورے اختیار حاصل نہ ہونے کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس سمت مؤثر اصلاحی قدم اٹھاسکیں۔

ہندوستان میں ان شعبوں میں انقلابی اصلاح کی ضرورت تھی۔ لیکن نئے دستور کے تحت ایک معمولی اور جزوی اصلاح تک کی گنجائش نہ تھی۔ اصلاحی اور فلاحی پروگراموں اور منصوبوں میں پیسے کی کمی کی وجہ سے کسی مؤثر یا نتیجہ خیز تبدیلی کا امکان نہ تھا۔

کانگریسی وزارتوں کی بعض مشکلات خود ان کانگریسیوں کی پیدا کردہ تھیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور کانگریس پارلیمانی بورڈ، کانگریس کی یہ دو مرکزی تنظیمیں مجالس قانون ساز کے ممبران میں ڈسپلن قائم رکھتیں اور کانگریس وزارتوں کی ہر وقت

رہنمائی کرتی رہتی تھیں۔ یہ دونوں تنظیمیں اس پر برابر نظر رکھتی تھیں کہ کانگریسی وزارتیں کانگریس کے سیاسی مقاصد کو نظر انداز نہ کریں۔ اس لیے وہ مختلف مسئلوں کے بارے میں انھیں برابر ہدایتیں دیتی رہتی تھیں۔ جن حالات میں کانگریس نے صوبوں کی باگ ڈور سنبھالی تھی ان کے پیش نظر یہ سب ضروری تھا کہ صوبائی وزراء، جنھیں حکومت چلانے کا بہت ہی کم تجربہ تھا یا بالکل بھی تجربہ نہ تھا اور جنھیں ہر قسم کی مشکلات اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، کو ان کی مرکزی جماعت کی انتظامیہ کی طرف سے ہدایتیں حاصل ہوں۔ کانگریس کے اس سسٹم کو جمہوری نظام/ ضابطوں اور روایتوں کے خلاف سمجھنا یا اسے کلیت پسند قرار دینا بے جا اور بے اصل نکتہ چینی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس نکتہ چینی سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی کرنے والوں کو خود مختار صوبوں کے معاملوں میں گورنروں اور گورنر جنرل کے مداخلت کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا اور وہ اس طرح کی مداخلت کو جمہوریت یا جمہوری روایتوں اور طور طریقوں کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب کانگریس کی مرکزی جماعتیں یا کانگریس کی مرکزی انتظامیہ یعنی ورکنگ کمیٹی کانگریس وزارتوں کے معاملوں میں دخل دیتیں یا انھیں ہدایتیں دیتیں تو وہ اسے جمہوریت شکنی سے تعبیر کرتے تھے۔

اس بارے میں پروفیسر کوپ لینڈ کا کہنا تھا: ''برطانیہ میں مقامی حکومتوں میں جو پارٹیاں کام کر رہی ہیں ان کا قومی پارٹیوں سے بڑا گہرا یا قریبی تعلق بن جاتا ہے۔ سب ہی وفاقی جماعتوں میں صرف ایک قومی پارٹی ہوتی ہے جو وفاقی حکومت کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتی ہے۔''

اصل بات یہ تھی کہ کانگریس یہ نہیں چاہتی تھی کہ صوبوں کی حکومت چلانے کی وجہ سے اپنی توجہ اصل اور بنیادی مقصد یعنی مکمل آزادی کے حصول کی طرف سے ہٹالے۔ کانگریسی عادی ہو جائیں کہ بلا چون و چرا برطانوی منصوبوں اور اسکیموں کو منظور کرلیا

کریں اور برطانوی حکمرانوں سے مستقل تعاون کرنے لگیں۔ اس کے لیڈران کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ کانگریس کہیں صوبائیت یا پراونشل ازم کی عصبیت میں مبتلا نہ ہو جائے اور اپنے صوبوں کے مفاد کے خاطر مرکزی، ملکی یا قومی مقاصد کو بالکل نظر انداز نہ کر دے۔ جواہر لال نہرو کانگریسیوں کی توجہ اس بہت بڑے خدشے کی طرف مسلسل دلاتے رہتے تھے کہ ہم کہیں معمولی اصلاحی کاموں میں نہ پڑ جائیں اور کہیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں کہ اب ہم اقتدار کے مالک ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وزارت سے زیادہ اہم کانگریس ہے۔ وزارتیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن کانگریس اس وقت تک بدستور قائم رہے گی جب تک وہ ہندوستان کے آزادی کے حصول کے تاریخی موقف کو انجام نہ دے لے۔ لیکن یہ شکایت بالکل صحیح تھی کہ مقامی کانگریسی تنظیمیں اور کانگریس کے چھوٹے لیڈر ایڈمنسٹریشن میں دخل اندازی کرتے رہتے تھے۔ مثلاً سرکاری افسران کی تقرری اور تبادلہ کرانا چاہتے تھے۔ جن کسانوں کی ان سے کسی قسم کی کوئی رنجش تھی انھیں ان کے کھیتوں سے بے دخل کرانا چاہتے تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اس قسم کی قابل اعتراض باتوں کے خلاف ایک سرکلر جاری کرنا پڑا کہ کانگریس کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کانگریس کمیٹیاں عام ایڈمنسٹریشن میں دخل اندازی کر رہی ہیں۔ کانگریس کا کانگریسیوں کو مشورہ ہے کہ وہ ایڈمنسٹریشن میں دخل نہ دیں۔ 27 مہینوں تک کانگریس حکومتیں اس آزمائش کو جھیلتی رہیں اور غیر کانگریسی وزارتوں نے زیادہ لمبی مدت تک اس آزمائش کو جھیلا۔ کیا انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا اور کیا ان حکومتوں کے ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے اہل نہیں۔

قبل اس کے اس ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے اور اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے، زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ ہندوستانی، حکومت خود اختیاری

کے اہل ہیں یا نہیں یہ بات ہندوستان میں دستوری تبدیلیوں کے ضمن میں بار بار دھرائی جاتی ہے۔ کیا تاریخ اہلیت کی کوئی تعریف پیش کرتی ہے؟

یہی تاریخ بے شمار مملکتوں کے عروج وزوال کی داستان سے بھری ہوئی ہے۔ یہ ان کے کارناموں کو بیان کرتی ہے۔ یہ ان کے اندرونی حالات یعنی معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی اور بہت سی دوسری چیزوں کو بیان کرتی ہے اور ان مملکتوں کے اپنے پڑوسی ملکوں سے تعلقات کا تذکرہ کرتی ہے۔ اور یہ کہ ان جنگوں میں کس کو فتح حاصل ہوئی اور کس کو شکست ہوئی گویا ان کے مابین جنگ اور صلح کے تعلقات کو بیان کرتی ہے اور ان تمام اسباب کو بھی بیان کرتی ہے یعنی مادی، اخلاقی، ماحولیاتی اور انسانی، یہ دیہی تاریخی تبدیلیوں کو بھی بیان کرتی ہے لیکن وہ اب تک ایسے قوانین اور وجوہ کا پتہ چلانے سے قاصر رہی ہے جو تبدیلیوں کو معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔

لیکن کیا تاریخ قوموں کی کامیابی اور ناکامی میں قوموں کے عروج وزوال کے سلسلہ میں ان کی اہلیت اور نااہلیت کی تشریح کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں ہمیں چند مثالوں پر غور کرنا چاہئے۔

کیا یونانی اس کے اہل تھے جب سولون (Solon) نے جمہوری نظام کی بنیاد ڈالی۔ اور کیا ان کی اہلیت بالکل ختم ہوگئی تھی جب مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے انھیں اپنا محکوم بنالیا۔

موجودہ یوروپین قوموں کے بارے میں بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔ پچھلے سوسالوں میں فرانس تین بار اپنے کو شکست سے اور دوسروں کے زیر تسلط آنے سے نہ روک سکا۔ 77-1876 میں، 1914 سے 1919 تک اور 1939 سے 1945 تک اگر دوسری قوموں نے اس کی مدد نہ کی ہوتی تو یہ بھی جرمن فیڈریشن کا ایک حصہ بن جاتا۔ جرمنی بھی اپنی آزادی سے دوبار محروم ہوا۔ اس کو شکست ہوئی اور اسے زبردست تباہی

اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں جو بھی حکومت اس وقت برسر اقتدار تھی پورے طور سے تباہ و برباد ہوئی۔ کیا ان قوموں کی شکستوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت اور صلاحیت جاتی رہی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد پولینڈ کو، جسے اٹھارہویں صدی میں تسلیم کر لیا گیا تھا اور وہ دوسرے ملکوں کے تسلط میں رہا تھا، دوبارہ آزادی حاصل ہوئی۔ دوسری عالمی جنگ میں یہ پھر پہلے جرمنی کے زیر نگیں آیا اور اس کے بعد وہ سوویٹ یونین کی سربراہی میں کمیونسٹ نظام کا حاشیہ بردار ہو کر رہ گیا۔

ماضی میں ہندوستان میں اپنی آزاد حکومتیں رہیں۔ قدیم ہندو حکومتیں اور پھر سلطنیں قائم رہیں۔ قرون وسطیٰ میں انفرادی حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ بعض ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں کی حکومتیں تھیں۔ پھر مسلمان سلاطین کا دور شروع ہوا حتی یہ کہ مسلمانوں نے ایک بہت بڑی اور بڑی مستحکم شہنشاہیت قائم کی جو تقریباً سارے ہندوستان پر حکمراں رہی۔ اٹھارہویں صدی میں اس عظیم الشان شہنشاہیت کے حصے بخرے ہو گئے اور اسی وجہ سے یوروپین قوموں کو ہندوستان کو اپنے زیر نگیں لانے کا موقعہ ملا۔

کیا یہ ریکارڈ بہت مختلف ہے اس رومن شہنشاہیت سے جو تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہی یا آٹھویں صدی اور نویں صدی عیسوی کی کارلوونجین (Carlovingian) جیسی شہنشاہیت سے یا قرون وسطیٰ کے Hohenstauffees سے یا اسپین کی سولھویں، سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی شہنشاہیت سے۔ کیا ان سلطنتوں کے زوال سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ قومیں نااہل تھیں جنھوں نے انھیں قایم کیا تھا؟

کیا میکسیکو کے اصلی باشندوں آزٹیک (Aztecs) پر مختلف قوموں کا فتحیاب ہونا اس کا ثبوت ہے کہ وہ نالایق حکمراں تھے۔ اگرچہ انھوں نے بڑی شہنشاہیتیں قائم کیں۔ انھوں نے عالیشان عمارتیں تعمیر کی اور اپنے عروج کے زمانہ میں بے حساب

دولت جمع کی لیکن وہ اپنے سے زیادہ بہترین ہتھیاروں سے مسلح اور زیادہ مہذب دشمنوں سے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے۔

یہ برطانوی حکمرانوں کی کوتاہ نظری تھی کہ صرف اینگلو سیکسن قومیں ہی ان اوصاف کی حامل ہیں جو پارلیمنٹری طرز حکومت کی کامیابی کے لیے لازمی اور ضروری ہیں حالانکہ آزادی اور طرز حکومت دو بالکل ہی مختلف مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حکومت کے کسی طرز کو بھی مستقل اور دائمی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پارلیمنٹری طرز حکومت خود مغرب میں بھی نیا ہے۔

انگلستان جہاں سب سے پہلے اس طرز حکومت کا آغاز ہوا وہاں یہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں وجود میں آیا۔ پچھلی صدی اور اپنے زمانے کی تین چوتھائی سے زیادہ مدت کے دوران اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں مزید تبدیلیاں نہ ہوں گی۔ یونانی سیاسی مفکرین کے نزدیک دستوری تبدیلیوں کا چکر مستقل چلتا رہتا ہے۔ اسپنگلر (Spingler) نے پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں اپنی کتاب 'مغرب کے زوال' میں مغربی تہذیب کے زوال کی پیشینگوئی کی تھی۔ کچھ نے ماضی کے سماجی اور سیاسی نظام کے احیاء کی پیشین گوئیاں کیں۔ بالفور (Balfour) نے ہندوستان میں دستوری اصلاحات کے بارے میں ہاؤس آف کامنز میں یہ تجویز کیا تھا کہ آزادی کے مطالبہ کو اس تجویز کے ساتھ کہ ہندوستان میں پارلیمنٹری طرز حکومت قائم کی جائے ، کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جائے ۔ اس سے پہلے مارلے (Morley) نے یہ تسلیم کیا تھا کہ فرکوٹ (Furcoat) جو کناڈا کی آب وہوا کے لیے ضروری ہے وہ ہندوستان کی آب وہوا کے لیے موزوں اور مناسب نہیں ہے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہندستان نے نہ صرف آزادی کا مطالبہ کیا بلکہ اس کو برطانوی لباس میں ملبوس دیکھنا چاہا۔ زیادہ تر تعلیم

یافتہ ہندوستانیوں نے اس مطالبہ کی حمایت کی لیکن خود گاندھی جی برطانوی طرز حکومت کے قائل نہ تھے۔

برطانوی حکمراں ہندوستان کو کسی شکل میں بھی آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ پارلیمنٹری طور طریقہ اور ادارے ہندوستان کے سماجی حالات سے میل نہیں کھاتے اور اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کسی طرح بھی آزادی کے قابل نہیں حالانکہ شاید یہ بالکل صحیح نہ تھا۔ سوویٹ روس اور مشرقی یوروپین ممالک اور چین آزاد ہیں لیکن ان ملکوں کی حکومتیں آزاد پالیمنٹری جمہوریتیں نہیں ہیں۔

ہندوستان کا مطالبہ آزادی، جمہوریت اور ملکی اتحاد کا تھا۔ 39-1937ء کے تجربہ کا اس مطالبہ کی روشنی میں تجزیہ کرنا چاہئے۔

اس مطالبہ کا مسلسل خوردبینی جائزہ لیا گیا اور اس نے 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی شکل اختیار کی جس میں اس قسم کی دفعات رکھی گئیں کہ کسی بھی قسم کے انقلابی کام نہیں کیے جاسکیں اور اختیار اور اقتدار کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ یعنی وزیروں یا عوامی نمائندوں کی طرف سے اس نئے ایکٹ میں اس قسم کی صورت حال رونما نہ ہونے دینے کے لیے بے شمار تحفظات رکھے گئے لیکن اصل میں کیا ہوا کہ پچھلے تنازعہ کے بعد جس کی وجہ سے سمجھوتے ہونے میں تین مہینے لگ گئے۔ سمجھوتہ ہوا کہ گورنر روزمرہ کے ایڈمنسٹریشن میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور وزیر دستور کے مطابق کام کریں گے۔ اس کے بعد کوئی بڑا تعطل سوائے یوپی اور بہار کے اور کہیں پیدا نہیں ہوا۔ یہ تعطل فروری 1938ء میں پیدا ہوا جب گورنر جنرل نے یوپی اور بہار کے گورنروں کو یہ ہدایت کی کہ شدید اور سنگین قسم کے سیاسی جرائم میں ملوث اور ماخوذ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں ان صوبوں کے وزراء کا مشورہ بھی نظر انداز کردیں۔ اس پر ان دونوں صوبوں کے وزراءِ اعلیٰ اپنی وزارت سے ساتھ مستعفی

ہو گئے لیکن چند روز بعد یہ استعفے واپس لے لیے گئے جب گورنر جنرل نے یہ یقین دہانی کی کہ ہر کیس میں انفرادی طور پر غور کیا جائے گا اور ان سیاسی قیدیوں کو رفتہ رفتہ رہا کیا جائے گا۔ ایک اور معاملہ میں ممبران اڑیسہ، گورنر اور وزیروں کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا جب اڑیسہ کے گورنر مختصر چھٹی پر جا رہے تھے اور اس دوران ان کی جگہ ایک سینئر آئی۔سی۔ایس افسر کا تقرر ان کے جانشین کے طور پر طے ہوا تھا۔ اس پر وزارت نے اعتراض کیا۔ یہ بحران اس لیے ختم ہو گیا کہ گورنر نے اپنی رخصت منسوخ کر دی۔

بحیثیت مجموعی گورنروں نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس پوری مدت میں صرف دو بل (Bills) شمالی مغرب سرحدی صوبہ میں اور ایک سندھ صوبہ میں گورنروں نے اپنے اختیارات خصوصی کے تحت مسترد یا نامنظور کیے۔

اس طرح وزیروں کی طرف سے بھی یہ احتیاط برتی گئی کہ وہ اعلیٰ سرکاری افسروں پر خواہ مخواہ ناراض نہ ہوں اور نہ ان پر افسری یا بالادستی کی دھونس جمائی جائے۔

دراصل ان وزیروں نے ان سرکاری افسروں اور پولیس کے ہاتھوں جنگ آزادی کی تحریکوں کے دوران بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں اور مظالم سہے تھے اور اس وجہ سے ان کے دلوں میں ان کے خلاف بڑا تنفر تھا مگر بڑے ہی قابل رشک انداز سے انھوں نے بھی ان افسران سے تعاون کیا۔

اگر تعمیری ایڈمنسٹریشن کے دونوں پہلوؤں پر جن کی وجہ سے خاصی تشویش تھی، غور کیا جائے تو نتیجہ مفید و موافق نکلتا۔ قدامت پسند اور لبرل سیاسی لیڈروں کو اس سے بڑی تشویش تھی کہ لا اینڈ آرڈر یعنی امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری صوبائی وزیروں کو دی گئی اور ان وزیروں کے بارے میں یہ اندیشہ تھا کہ ان معاملوں میں نہ تو وہ انصاف اور غیر جانب داری سے کام لیں گے اور نہ سختی سے کام لیں گے۔ لیکن صوبائی وزیروں کی کارگذاری نے اس قسم کے شکوک و شبہات و اندیشوں کو بالکل غلط قرار دیا۔

معمولی جرائم اور قانون کی خلاف ورزی کو چھوڑ کر امن واماں کے لیے تین مسئلے زبردست تھے:

(1) سیاسی ایجی ٹیشن (2) مزدوروں کی اسٹرائیکس (3) فرقہ وارانہ جھگڑے۔

کسانوں اور زمینداروں کے درمیان براہ راست زرعی جھگڑے پرانے حالات اور بعض دوسرے اسباب سے پیدا ہوئے۔ ان آویزشوں کی تاریخ بڑی پرانی ہے اور اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب 1921ء میں کسانوں نے بڑے پیمانے پر ایجی ٹیشن شروع کیا تو کانگریسی لیڈروں نے ان کے مطالبہ سے ہمدردی ظاہر کی اور انھیں اس کی ترغیب دی کہ وہ اپنی شکایتوں کو دور کرانے کے لیے اپنا ایجی ٹیشن جاری رکھیں۔ جب کانگریس برسراقتدار آئی تو کسانوں کی امیدیں اور توقعات اور زیادہ بڑھیں۔

کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فسٹو میں کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ لگان میں کمی کرنے کا وعدہ اور ان کو زمین پر کاشت کرنے کا حق اور مستقل درجہ دینے کا اور ان پر سے قرض کا بوجھ کم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کسان مسیحاؤں نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ ان وعدوں کو پورا کریں۔ لیکن انھیں اس کا علم نہ تھا کہ زرعی اصلاحات کو نافذ کرنے میں کتنی دشواریاں حائل ہیں۔ وہ کانگریس کے وعدوں پر جلد از جلد عمل درآمد دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں خاص کر بہار اور ایک حد تک یو پی میں اس قسم کے جھگڑے شروع ہوئے اور بعض جھگڑوں میں بری طرح تشدد کا استعمال کیا گیا۔ کسانوں نے لوٹ مار کی۔ فصلوں کو جلا دیا۔ لگان ادا کرنے سے انکار کیا۔ زمینوں اور کھیتوں پر زبردستی قابض ہو گئے۔ زمینداروں کو دھمکیاں دیں۔ بڑے بڑے جلوس نکال کر مظاہرے کیے۔ اس طرح امن واماں درہم برہم ہونے کے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کانگریسی حکومتوں نے اس سنگین صورتحال کو ایک حد تک کسانوں کی حالت کو بہتر

بنانے کے قانون بنا کر نپٹایا۔ یو پی 1939ء کے ایکٹ 17 نے کسانوں کے موروثی حق کو تسلیم کیا۔ زرعی نظام کی بہت سی خرابیوں کو دور کیا۔ اس قسم کے قوانین بہار میں بھی پاس کیے گئے۔ لگان کم کیا گیا۔ لگان کی وصولی اور کسانوں کو بے دخل کرنے میں زمینداروں کے حقوق کو کم کیا گیا۔ زیادہ تر صوبوں میں کسانوں کو قانون کے ذریعہ قرض کے بوجھ سے راحت ملی۔ قحط پڑنے اور خشک سالی کے رونما ہونے پر کسانوں کو مزید راحت دے گئی۔ اپنی فصل کو بیچنے کے لیے انھیں منڈیوں اور بازاروں کی سہولتیں بھی دی گئیں۔

کانگریس وزارتوں کے وزیروں نے براہ راست کسانوں اور دیہات میں رہنے والوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے معاملات نمٹوانے کی کوشش کی اور اس وجہ سے ہنگاموں میں کمی ہوئی۔ مزدوروں کے مسئلے ان مقامات پر شروع ہوئے جو صنعتی مراکز تھے مثلاً بمبئی کے صوبے میں، احمد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں یعنی یو پی میں کانپور، بنگال میں کلکتہ۔ صنعتی زمرے میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت حد درجہ قابل رحم اور اندوہناک تھی۔ ٹریڈ یونین تحریک بہت کمزور تھی حالانکہ کمیونسٹ لیڈر فیکٹریوں میں کام کرنے والے لوگوں کو اس تحریک سے منسلک کرنا چاہتے تھے اور مزدوروں کی بڑی تعداد اس تنظیم میں شامل ہونے لگی تھی لیکن حکومت نے مزدور تحریک کو کچلنے کے لیے سخت اقدام اٹھائے۔

جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں کانگریس نے مزدوروں کے مسئلوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ کانگریس کی لیبر کمیٹی نے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک جامع پروگرام تیار کیا جس کو اکتوبر 1937ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے منظور کیا۔ اس پروگرام میں مزدوروں کی اجرت اور ان کے کام کرنے کے اوقات، ان کی رہائش کے مسئلے، ان کی چھٹی کے مسئلے، ان کے لیے بیمہ اور انشیورنس، ان کے اور مل

مالکوں کے درمیان جھگڑوں کے طے کرنے کے طریقے اور فیکٹری ایکٹ کو پوری طرح نافذ کرنے کے مسئلے شامل تھے۔

صنعتی مراکز میں مزدوروں کی بے چینی بڑھتی گئی اور آخرکار بہت سے مراکز میں مزدوروں کی اسٹرائیکس ہوئیں۔ احمد آباد اور بمبئی میں مزدوروں کی بڑی تعداد اسٹرائیکوں میں شامل ہوئی لیکن حکومت کی حکمت عملی اور سختی نے حالات کو سنبھال لیا اور امن وامان قائم ہوگیا۔ کانپور کی کپڑا ملوں میں جولائی 1937ء میں اسٹرائکس شروع ہوئیں جو برابر ہوتی رہیں لیکن کانگریس لیڈروں کی مداخلت سے ان میں کمی ہوئی۔ کانگریسی حکومتوں نے ان اسٹرائیکوں کی چھان بین کے لیے تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کیں اور ان کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا۔ بمبئی میں صنعتی جھگڑوں کے طے کرنے کے بارے میں الگ قانون پاس کیا گیا۔

امن وامان کے لیے سب سے بڑا خطرہ فرقہ وارانہ فساد تھے۔ بدقسمتی سے کانگریس کے برسراقتدار آنے کے بعد ہندو مسلم تعلقات بہت زیادہ خراب ہوگئے۔ مسلم لیگ نے بڑے شدومد سے کانگریسی وزارتوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا جو دیہاتوں تک میں پھیل گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مقامات پر فرقہ وارانہ بلوے ہوئے۔ جب ہولی اور محرم ساتھ ساتھ پڑے یا دسہرہ، دیوالی عید کے ساتھ پڑے تو زیادہ ہوئے۔ یوپی اور بہار اس کے بدترین نمونے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ اور مدراس میں بھی فسادات ہوئے۔

اگست 1939ء میں یوپی ایک طرح سے خاکسار تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس مسلم عسکری تنظیم کو عنایت اللہ خاں مشرقی جو انگلستان سے اعلیٰ تعلیم پاکر آئے تھے اور پشاور میں پروفیسر تھے، انھوں نے قائم کیا تھا۔ پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی۔ متعدد خاکسار مارے گئے۔ اس کے بانی اور بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے کچھ ہی

عرصہ کے بعد کانگریس وزارت مستعفی ہوگئی۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق اکتوبر 37ء سے نومبر 39ء کے آخر تک کانگریس وزارتوں کے صوبوں میں 7 بڑے بلوے ہوئے اور ان میں تقریباً سترہ سو افراد زخمی ہوئے اور 13 افراد مارے گئے۔ ان واقعات سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایڈمنسٹریشن کے اس شعبہ میں کانگریسی وزیروں نے متعلقہ پارٹیوں سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور ان کے مطالبوں پر ہمدردی سے غور کیا لیکن ضرورت پڑنے پر سختی کرنے سے نہ ہچکچائے۔ اس سے یہ بخوبی صاف ہوجاتا ہے کہ حکومت کے خلاف کیے گئے جرائم کے ساتھ سختی سے نمٹنے اور بغیر کسی پس وپیش کے سخت گیر اقدامات ان افراد اور اخبارات کے خلاف کیے گئے جنہوں نے حکومت کے اختیار اور اقتدار کو چیلنج کیا تھا یا جنھوں نے لوگوں کو تشدد پر اکسایا تھا۔ اس معاملہ میں انھیں کانگریس کی پوری تائید حاصل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

''جب شہری آزادی کی دہائی دے کر بعض افراد جن میں کانگریسی بھی شامل ہیں قتل، لوٹ مار اور دوسرے متشددانہ طریقوں سے لوگوں کو طبقہ وارانہ جنگ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور جب بعض اخبار بالکل غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور اپنے قارئین میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلاتے ہیں تو کانگریس تمام لوگوں کو متنبہ کرتی ہے کہ شہری آزادی کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ متشددانہ کارروائیاں کی جائیں یا لوگوں کو تشدد کرنے پر اکسایا جائے، کھل کر غلط بیانی کی جائے اور جھوٹ بولا جائے۔

شہری آزادی کے تعلق سے اپنی پالیسی پر پوری طرح قائم رہتے ہوئے اور اپنی روایتوں کی پابندی کرتے ہوئے کانگریس پارٹی ان اقدامات کی پوری تائید کرتی ہے جو کانگریسی حکومتیں عام لوگوں کی جان و مال کے تحفظ کے بارے میں اٹھارہی ہیں۔

2-فلاح و بہبود کی اسکیمیں

صوبہ جاتی خود مختاری یا صوبہ جاتی دستور کو منظور کرنے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اس سے سماجی فلاح و بہبود کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ملے گا۔ یہ اصلاحی تحریکوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انھیں ذرائع اور وسائل میسر ہوں یعنی سرمایہ ہو اور کام کرنے والے افراد میسر ہوں۔ ان تمام اصلاحی اسکیموں میں جن سے لوگوں کی بڑی تعداد کو فائدہ پہنچتا ہے اس کے لیے ضروری تھا کہ اس سلسلہ میں ضروری تبدیلیاں عمل میں آئیں اور بڑے پیانہ پر منصوبہ بندی ہو۔ ان اصلاحات کا تعلق چونکہ قومی معاملوں سے تھا اس لیے یہ نہ صرف صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں تھیں بلکہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں بھی آتی تھیں۔

اس باب میں اور دوسری دشواریاں بھی عام لوگوں کے تعصب اور قدامت پرستی کی وجہ سے پیش آئیں۔ ان تمام اصلاحی اسکیموں اور منصوبوں کے پورے طور سے مکمل ہونے میں بہت وقت لگتا تھا لیکن کانگریسی حکومتوں کو انھیں مکمل کرنے یا عملی جامہ پہنانے میں صرف 27 مہینے کی قلیل اور مختصر مدت ملی۔ لیکن یہ حکومتیں قابل صد مبارک باد و تہنیت ہیں کہ انھوں نے قومی زندگی کے ہر شعبہ کو سدھارنے کے لیے زبردست کوششیں کیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ بہت زیادہ سدھار نہ کر سکیں۔

سب سے زیادہ جس میدان اور شعبے میں فوری سدھار اور اصلاح کی ضرورت تھی وہ زراعت کا میدان تھا جس سے ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی کو روٹی اور روزی ملتی تھی۔ اس نظام کی خامیاں اور خرابیاں بالکل ظاہر اور واضح تھیں۔ یہ نظام بالکل سڑ گل چکا تھا۔ اس کی وجہ سے کسان مفلوک الحال اور ہولناک مفلسی کا شکار تھے۔ دیہاتوں میں رہنے والے عوام ہر قسم کی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا تھے اور اس سے یعنی کھیتی سے

کسی قسم کا منافع نہ ہونے کی وجہ سے قومی معیشت بری طرح متاثر تھی۔

برطانوی حکومت کے خلاف سخت ترین الزام تھا کہ اس نے دیہی معیشت کو بری طرح نظر انداز کیا تھا اور اس مستقل غفلت کی وجہ سے بے چینی اور بے صبری بڑھی اور انڈین نیشنل کانگریس نے اس پر بہت زیادہ زور دیا کہ سیاسی اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ کسانوں کی بہتری کے لیے کام کرے گی اور اس وقت کانگریس لگان اور آراضی میں سدھار چاہتی ہے اور وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ زرعی آراضیوں پر بوجھ منصفانہ ہو۔ کسانوں پر سے قرض کا بوجھ ہلکا کیا جائے اور انھیں حکومت سستی شرح پر قرض حاصل کرنے کی سہولت دے۔

اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں مدراس میں منسٹری پرکاسم وزیر مال کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اڑیسہ میں ایک قانون پاس کیا گیا اور کسانوں کا لگان کم کیا گیا اور زمینداروں کے لیے معاوضہ طے کیا گیا۔ لیکن وزارت کے مستعفی ہو جانے کے بعد گورنر جنرل نے اس قانون پر اپنی منظوری نہیں دی۔ یوپی میں 1939ء کے ایکٹ نمبر 17 نے تفصیل سے زرعی نظام میں اصلاحیں کیں۔ اس کی رو سے کسانوں کو موروثی حقوق دیے گئے۔ ان کے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا۔ ان کے بے دخل کرنے کو روکا گیا۔

لگان کی شرح پر نظر ثانی کی گئی۔ بہار میں بھی ایسے ہی ایک قانون نے پچھلے لگان کے بقایا کو کم کیا اور موجودہ لگان کی شرح کو تشخیص کرنے کے پرانے طریقہ کو ختم کیا گیا اور لگان وصول کرنے کے مصارف کو بھی کم کیا گیا۔ لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں کسانوں کے کھیتوں سے بے دخلی کو منسوخ قرار دیا گیا۔ بمبئی اور صوبہ جات متوسط اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بھی آراضی نظام میں اصلاحیں کی گئیں۔

صنعت وحرفت کے میدان میں وزیروں نے بڑی سرگرمی دکھائی لیکن اس زمرہ میں کسی قسم کا سدھار کرنا صوبہ جاتی حکومتوں کے دائرہ اختیار اور اقتدار سے باہر تھا۔ اس لیے کہ اس میں جامع معاشی منصوبہ بندی کا پیچیدہ مسئلہ آجاتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی سدھار اور ترقی تب ہی ممکن تھی جب اس زمرہ میں بے حد سرمایہ لگایا جائے اور اس کے لیے ملک اور ملک سے باہر سے قرض لیا جائے یا ٹیکس لگائے جائیں۔ باہر سے مشینیں منگائی جائیں۔ اعلیٰ ٹکنالوجی کی معلومات حاصل کی جائیں یا صنعتی ماہروں یا اعلیٰ اہلیت رکھنے والے انجینئروں کو ٹریننگ دی جائے۔ مسائل نقل وحمل اور مواصلات کو وسعت دی جائے۔ بازاروں اور منڈیوں میں مصنوعات کو لے جانے کی سہولتیں حاصل ہوں۔ ان سب امور کی انجام دہی کے لیے مرکزی حکومت کے اختیارات کا استعمال ہونا ضروری تھا۔

ان سب باتوں کی وجہ سے صوبائی حکومتیں صرف چھوٹی اور اوسط درجہ کی صنعتوں کو سدھارنے اور قرض دینے کی طرف توجہ مبذول کر سکتی تھیں۔ ان صوبہ جاتی حکومتوں کی آمدنی محدود تھی۔ اگرچہ انھیں قرض دینے کا حق حاصل تھا لیکن اس بارے میں ان کی اہلیت کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس زمرے میں اپنی مختلف اسکیموں کو یہ حکومتیں تب ہی عملی جامہ پہنا سکتی تھیں جب مرکزی حکومت ان کی مالی مدد کرتی۔ لیکن مرکزی حکومت اس قسم کے اسکیموں کے منظور کرنے کے حق میں نہ تھی۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس تجویز پر غور کیا کہ ایک کمیٹی آل انڈیا صنعتی منصوبہ تیار کرنے کے لیے مقرر کی جائے۔ جولائی 38ء میں کانگریس کے صدر نے صوبائی وزیروں کی ایک کانفرنس طلب کی اور اس کے بعد ایک پلاننگ کمیٹی جواہر لال نہرو کی چیرمین شپ میں مقرر کی اور صوبہ جاتی حکومتوں نے اس کے مصارف کے لیے مالی مدد کی لیکن قبل اس کے یہ کمیٹی اس سلسلہ اپنی سفارشات پیش کرتی اور سب کمیٹیاں اپنا

کام پورا کرتیں کانگریس وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں تعلیم سب سے اہم تھی۔ صوبہ جاتی حکومتیں اس کو پھیلانا اور فروغ دینا چاہتی تھیں خاص کر ابتدائی تعلیم کو جسے پچھلی حکومتوں نے پوری طرح نظر انداز کیا تھا مگر اس میں بھی سب سے بڑی دشواری روپیہ کی کمی تھی۔ پھر بھی کوشش کی گئی کہ بچوں کی تعداد اسکولوں میں بڑھے۔ چنانچہ ان کی تعداد بڑھانے اور ان کی حاضری لازمی کرنے کے لیے داخلہ کے لیے بچہ کی عمر میں اضافہ کیا گیا۔

ابتدائی تعلیم کے تعلق سے گاندھی جی اخراجات کے مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک نیا تعلیمی تجربہ شروع کیا۔ وہ تعلیم کو اور اس کے اسباب کو سماجی تقاضوں اور ضرورتوں کے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ تعلیمی نظام بنیادی تعلیم کے نام سے موسوم ہوا۔ اس میں ہاتھ کے کام اور پیداوار کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ اس کو متعدد صوبوں میں اختیار کیا گیا۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ کے بعد اگرچہ اسکیم کو ترک نہیں کیا گیا لیکن اس نظام کی روح اکتوبر 39ء کے بعد ختم ہو گئی تھی۔

دوسری اسکیم جس پر وزیروں نے خاص توجہ مبذول کی، وہ بالغوں کی تعلیم یعنی بڑوں کو خواندہ (تعلیم یافتہ) بنانے کی اسکیم تھی۔ روپئے کی کمی کی وجہ سے اس اسکیم کو زیادہ بڑھایا نہیں جا سکا۔

گاندھی جی نے اچھوت اوّدھار کے لیے یعنی اچھوتوں کی حالت سدھارنے کے لیے بہت بڑا کام کیا تھا۔ ان کے سماجی اصلاح کے پروگرام میں ان طبقوں جنھیں انھوں نے ہی ''ہری جن'' یعنی 'خدا کے لوگوں' کا نام دیا تھا، کی حالت سدھارنے کا خاص درجہ تھا۔ ہری جنوں کی شکایتوں کو دور کرنے میں صوبائی حکومتوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اس سلسلہ میں تین باتوں کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ ایک تو ہری جنوں کو مندروں میں داخلہ ملے۔ دوسرے ان کے اوپر جو سماجی پابندیاں عائد تھیں خاص کر

ان کے تعلیم حاصل کرنے میں جو پابندیاں تھیں ان کو ختم کرنے کے لیے قانون بنائے گئے اور انتظامی اقدامات اٹھائے گئے۔لیکن چھوت چھات کی زبردست بیماری کی ہندو سماج میں بڑی گہری جڑیں ہیں اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔

کانگریس کی حکومتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے کوپ لینڈ، جو کانگریس کے بڑے زبردست نکتہ چین تھے اور جنھوں نے بڑی شدت سے کانگریس ہائی کمانڈ کی کلیت پسندی(Totalitarianism) مذمت کی تھی، نے تسلیم کیا کہ کانگریسی حکومتیں مستحکم حکومتیں تھیں اور وزراء میں ذمہ داریوں کا زبردست جذبہ تھا اور انھوں نے انتظامی مشینری پر پورا قابو پالیا تھا۔

انھوں نے مالیات کے بارے میں مالیات عامہ کے مسلمہ اصولوں کے مطابق کام کیا۔مجالس قانون ساز کا کام خوش اسلوبی سے چلتا تھا۔بڑی لگن سے کام ہوتا تھا۔ اس دور میں دونوں بازو یعنی مجالس قانون ساز اور انتظامیہ نے سماجی اصلاح کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔اس طرح پرانی دلیل صحیح ثابت ہوئی کہ اگر کوئی ہندوستانی سماجی پسماندگی پر زبردست حملہ کرتا ہے تو اس کے لیے ہندستانی حکومت کو خود اختیاری کی ضرورت ہے۔

ہڈسن(Hodson) وایسرائے کے 42-41ء میں آئینی مشیر رہے۔انھوں نے صوبہ جاتی نظام کے بارے میں رائے ظاہر کی کہ سماجی اور معاشی اصلاحیں جو خودمختار صوبہ بائی حکومتوں کا خاص مقصد تھا، وزیروں کو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اور اپنے حامیوں کے مختلف گروہوں اور طبیعتوں میں توازن نہ رکھنے کی وجہ سے دقتوں کا شکار ہوئیں لیکن اس میں جو ترقی ہوئی وہ خاص تھی اور وہ اجنبی حکومت نہیں کرسکتی تھی جس کا مقصد مخصوص مفادات کی حمایت کرنا تھا۔سیموئل ہور نے پارلیمنٹ میں ہندوستان میں

صوبہ جاتی خودمختاری کی زبردست کامیابی کا ذکر کیا اور لارڈلن لتھ گو(Lord linlithgo) کے پچھلے ڈھائی برسوں میں عام کارکردگی کے بڑے امتیازی ریکارڈ پر اپنا اطمینان ظاہر کیا۔

ہیری ہیگ(Harry Haig) یوپی کے گورنر اور مدراس کے گورنر ارسکن (Erskine) نے وزیروں کے کاموں پرخراج تحسین پیش کیا۔1937-39ء کے تجربہ نے ثابت کردیا اگر کوئی ثبوت درکار تھا کہ ہندوستانیوں میں پارلیمنٹری طرز کی جواب دہ اور ذمہ دار حکومت چلانے کی صلاحیت ہے۔ اس بارے میں برطانوی رائے بالکل غلط تھی اور یہ خیال کہ ہندوستانیوں کو حکومت خوداختیاری کے قابل برطانوی نگرانی کے تحت طویل ترین تربیت یا ٹریننگ کے ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، بالکل ہی بے بنیاد تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ملک کے فوری سماجی اور معاشی مسئلوں کو جو ایک غیرملکی حکومت نہیں حل کرسکتی ہندوستان کے منتخبہ لیڈر بہ آسانی حل کرسکتے ہیں۔

فیڈرل یا وفاقی یونین کا دستور محض ایک کاغذی اسکیم بنارہا۔ اس پر کوئی بھی نہیں عمل کرتا تھا۔ کنزرویٹو پارٹی کا ایک با اثر بازو اس کا سرے سے اسلئے مخالف تھا کہ اس کے تحت مرکز میں اقتدار کی جڑیں منتقل ہوئیں اگرچہ وہ بے شمار تحفظات کے ماتحت تھیں۔ پارٹی کی اکثریت بالڈون(Baldwin) اور ہور (Hoare) کے ہاتھوں میں تھی جن میں اس کے نفاذ کے بارے میں کوئی جذبہ نہ تھا یا کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بڑے تامل اور پس وپیش سے اسے منظور کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ انھوں نے یعنی اس پارٹی کے لیڈروں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ مانٹیگو کے پہلے سے سوچ سمجھے جنرل ازم کے وجہ سے بندھ گئے تھے۔ ان کے ضابطوں نے فیڈریشن کے اردگرد ایسی گرہیں لگادیں کہ یہ بالکل ناقابل عمل ہوگیا اور اس میں محرک رہنے کی صلاحیت جاتی رہی۔ ان میں سے دو بندشیں یا گرہیں مسلمانوں اور والیانِ ریاست کے ویٹو کے حق تھے۔

نہ انگلستان کی حکومت اور نہ حکومت ہند اس کے لیے کسی طرح آمادہ تھی کہ اسے نافذ کیا جائے۔ ٹمپل وڈ (Templewood) اور ہیلی فاکس یعنی ارون کے نزدیک ان کے جانشینوں میں زیٹلینڈ اور لن لتھ گو اس دستور کے نافذ کرنے میں تاخیر کے ذمہ دار تھے۔ ٹمپل وڈ کا خیال تھا کہ ہندستان کے افسروں کی بڑی تعداد آل انڈیا فیڈریشن کے تصور سے بالکل متفق نہ تھی اس لیے والیان ریاست کو اس میں شمولیت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہیلی فاکس کو بھی اس سے پورا اتفاق تھا۔ انھوں نے لکھا فری مین (ولنگڈن) والیان ریاست کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور ہندوستانی لیڈروں سے نفرت کرتے تھے۔ ہوپ (لن لتھگو) نے والیان ریاست کو استعمال نہیں کیا اور دراصل انھوں نے کسی سے بھی عام انسانی برتاؤ نہیں کیا۔

لارڈ لن لتھگو کے بیٹے گلینڈیوان Glendevon نے اپنی کتاب "وائسرائے ایٹ بے" (Viceroy at Bay) میں اپنے باپ کے خلاف ٹمپل وڈ اور ہیلی فاکس کے بیان کی تردید کی۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے تقرر کے بعد انھوں نے 1936ء میں والیان ریاست کو فیڈریشن میں شامل کرنے کی ترغیب دینی شروع کی لیکن زیٹلینڈ کی احتیاط پسندی نے اس مسئلے کو زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے سے روکا۔ انھوں نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے تمام افسروں کو ہدایتیں دیں کہ جتنی جلدی فیڈریشن وجود میں آئے گا اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ایک ٹائم ٹیبل تیار کیا گیا جس کے تحت فیڈریشن میں والیان ریاست کو شامل کیا گیا۔ ان افسروں کو ریاستوں میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ والیان ریاست سے مل کر ایکٹ کی دفعات کی تشریح کریں اور مختلف ملکوں کے بارے میں ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب دیں۔

لیکن اس کوشش پر کہ فیڈریشن کی تکمیل جلد ہو، وزیر ہند زیٹلینڈ (Zetland) نے پابندیاں عائد کردیں، اس لیے کہ وہ سالسبری (Salisbury) اور ان کے

حامیوں سے حد درجہ خائف تھے، بالخصوص چرچل سے جنھوں نے آرڈر ان کونسل کی مخالفت کی تھی اور دھمکی بھی دی تھی کہ بغیر احکام کے پاس ہوئے فیڈریشن وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

بعد میں بعض نمایاں اور مقتدر والیان ریاست کا جون میں بمبئی میں ایک جلسہ ہوا جس میں انھوں نے فیڈرل پیش کش کو غیر اطمینان بخش اور نا قابل منظوری قرار دیا۔ لن لتھگو نے چاہا تھا کہ بمبئی کی میٹنگ سے پہلے ان پر یعنی والیان ریاست پر دباؤ ڈالیں لیکن زیٹ لینڈ اپنے مخالفوں کی وجہ سے بالکل بے بس ہو گئے تھے کیونکہ ان کے مخالف چال بازیوں میں ماہر تھے اور تذبذب کے شکار والیان ریاست کے فیڈریشن میں شامل نہ ہونے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کر رہے تھے۔

انھوں نے خاتمہ میں یہ لکھا کہ فیڈریشن کے معاملہ میں لن لتھگو حالات کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے حالانکہ وہ انھیں بدلنا چاہتے تھے اور اس لیے بھی کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور ان کا وقت والیان ریاست کو فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادہ کرنے کی انتھک کوششوں اور زیٹ لینڈ کو متنبہ کرنے میں نکلا جا رہا تھا۔ ان حالات میں ان پر یہ الزام مضحکہ خیز ہی ہے کہ انھوں نے فیڈریشن کو عملی جامہ پہنانے میں بہت تاخیر کی۔

بغیر والیان ریاست کی رضامندی کے ہندوستانی فیڈریشن قائم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کا افتتاح یا آغاز اس لیے ممکن ہو سکا کہ حکومت مسلم لیگ سے یہ وعدہ کر چکی تھی کہ کوئی ایسی دستوری تبدیلی نہیں کی جائے گی جو مسلم لیگ کو قابل قبول نہ ہو۔ اگر والیان ریاست کسی دستوری تبدیلی کو منظور کر لیتے اور لبرل اس کی تائید کرتے تو بھی حکومت مسلم لیگ کی مخالفت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ دراصل اس کی یعنی برطانوی حکومت کی خواہش یہ نہ تھی کہ وہ اقتدار سے دستبردار ہو۔ خواہ وہ دستبرداری کتنی ہی معمولی اور برائے نام ہی کیوں نہ ہو یا کانگریس کو اس کا فائدہ ملے۔ اس لیے اس نے مسلم لیگ کی آڑ لی کہ

مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر کسی قسم کی دستوری تبدیلی ممکن نہیں۔

مور (Moore) کا کہنا ہے کہ اگر پچھلے سے جائزہ لیا جائے تو پہلی گول میز کانفرنس میں آل انڈیا فیڈریشن کے بارے میں سمجھوتے نے ہندوستان کی دستوری حیثیت متعین کردی تھی لیکن ٹوریوں کی عیارانہ حکمت عملی نے مرکز میں کسی بھی دستوری ترقی کو والیان ریاست کی فیڈریشن پر منحصر کر دیا اور مرکزی ذمہ داری کو اصل اقتدار کی منتقلی سے دور کر دیا۔ ہور نے بھی یہ فارمولا اپنے نظر رکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ درجہ نوآبادیات کی مانگ کو نظر انداز کیا جائے اور مانٹیگو کی جمہوری پالیسی کی لبرل منزل سے پیچھے ہٹا جائے یا اس مقصد کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

جب گاندھی جی گول میز کانفرنس سے واپس آگئے تو ٹوری حکومت نے عملاً مسلمانوں کی حمات حاصل کرلی اور والیان ریاست کے ساتھ مصالحت کرنے اور ہندو برٹش انڈیا کو نظر انداز کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کرنا شروع کیا۔

یہ پالیسی دراصل اس مخفی کوشش کا نتیجہ تھی کہ ہندوستانیوں کو سیاسی اقتدار منتقل کیا جائے۔ اس نے ان تمام اسباب کو تقویت پہونچا جائی جو فیڈرل منصوبے کے تمام تر مخالف تھے اور اس طرح سے انھوں نے دستور جس کے تحت مرکزی امور میں ذمہ داری ہندوستانیوں کو تفویض ہوتی، کے قیام اور تعاون میں زبردست رکاوٹیں ڈالیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تو لن لتھ گو نے سکون کی سانس لی کہ اب اس نوزائیدہ بچہ کو دفن کرنے کا موقعہ حاصل ہوگیا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ تقسیم ہند کی اصل اور فوری وجہ فیڈرل اسکیم کا خاتمہ تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانوی حکومت نے 1930ء اور 1935ء کے درمیان جو پالیسی اختیار کی اس میں سوائے پاکستان کے اور دوسرا مسئلہ نہ رہا۔

1935ء کے ایکٹ کے ذریعہ برطانیہ نے مشرقی اور شمال مغربی ہندوستان میں

مضبوط اور مستحکم خود مختار صوبوں کا ایک قائم کر دیا جس نے مسلمانوں کو اس کا موقعہ فراہم کرا دیا کہ جب فیڈریل اسکیم کے ختم ہو جانے کے بعد واقعی امرکزی حکومت کے قیام کا مسئلہ پر امید ہو تو وہ اس سے سودے بازی کر سکیں۔ اس نے پاکستان کے قیام کو ممکن بنا دیا۔

3۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں کانگریس پارٹی

نئے دستور کے فیڈرل حصے کے تعطل میں پڑ جانے کے بعد بھی سینٹرل اسمبلی جو 1934ء کے الیکشن کے بعد وجود میں آئی تھی اپنا کام کرتی رہی۔ اس اسمبلی میں 44 کانگریس کے اور 11 نیشنلسٹ تھے جو عام طور پر اپنے لیڈروں بھولا بھائی ڈیسائی اور اینے (Aney) کی سرکردگی میں ووٹ دیتے تھے۔ آزاد یا انڈیپینڈنٹ (Independent) جو حکومت اور قومی پارٹیوں کے درمیان پاسنگ کا کام کرتے تھے محمد علی جناح کی قیادت میں کام کرتے تھے۔ نیشنلسٹوں کا خاص کام/مقصد گورنمنٹ آف انڈیا کے غیر ذمہ دارانہ کردار کو نمایاں کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستانی عوام کو گورنمنٹ پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں اور اس کو ان کی مطلق حمایت حاصل نہیں۔ یہی نیشنلسٹ پارٹیوں کا خاص مقصد تھا۔ حکومت سے مخالفت کے اظہار کے اہم موقع تو بہت تھے۔ جب اسمبلی ریلوے اور عام بجٹ پر ووٹنگ ہوتی تھی بہت سے امور پر مطالبہ زر یا گرانٹ اس مقصد کے پیش نظر نامنظور کر دیے جاتے تھے۔ تخفیف کی تحریکیں پیش کی جاتی تھیں تا کہ عام لوگوں کی تکلیفوں اور شکایتوں کو منظر عام پر لایا جائے اور حکومت کی ان وجوہات سے ملامت کی جائے کہ وہ عام لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی اور ان کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ نہیں کرتی۔ بہت کی تخفیفوں کی تحریکوں کو گورنر جنرل کے تصدیق کرنے کے مخصوص

اختیارات کے تحت واپس کر دیتی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہندوستان پر گورنر جنرل کے امر اور خاص اختیارات تھے نہ کہ منتخب نمائندوں کی مرضی اور رضامندی سے حکومت کی جا رہی تھی۔ ہر سال یہ رسم لیجسلیٹو اسمبلی میں دہرائی جاتی تھی اور تلخی جلتی تحریکیں ان تجاویز کے ساتھ پیش کی جاتی تھیں، خواہ وہ ریلوے بجٹ ہو یا وہ جنرل ایڈمنسٹریشن یا عام بجٹ، اسمبلی ہر مالی مطالبہ کو نامنظور کر دیتی تھی۔ ایک موقعہ ایک دن (20) بیس مطالبوں کو نامنظور کر دیا گیا تھا۔ ریلوے اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا مسئلہ ہوتا تو اس بارے میں اسمبلی گورنمنٹ کی ملامت کرتی تھی اور پراگندہ خیال سرکاری ممبروں کے ذہن میں خلل اندازی کے بغیر ایجنڈے کے دوسری مدات پر غور کرتی تھی۔ اس اسمبلی کے اجلاس باقاعدگی سے ہر سال ہوا کرتے تھے لیکن ہندوستان کے عام لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی سوائے اس کے کہ جب گورنمنٹ کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کا موقعہ ہاتھ آ جاتا تھا، وہ اسے تفریح تھیٹر سمجھتے تھے جہاں نقلی تلک بازی کا تماشہ ہوتا تھا۔

کانگریس تنظیم کی خاص سرگرمی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے خلاف شدید مخالفت اور سرگرم جدوجہد تھی۔ وہ اس ایکٹ کی اسپرٹ یا مقصد کے خلاف پوری طرح تیر دا آزما تھی۔ 1935 کے ایکٹ کو شاطر برطانوی سیاست دانوں نے اس لیے لاگو کیا تھا کہ اس کے ذریعہ کانگریس کے مطالبہ آزادی کو ہر طرح ٹالا جائے۔ اس مسئلہ کو والیان ریاست کے زبردست احتجاج اور جوشیلے مسلمانوں کی وجہ سے پس پشت ڈال دیا گیا اور اس کا ذمہ دار کانگریس کی پالیسی اور طرز عمل کو قرار دیا گیا۔ اس طرح حکومت نے کسی بھی معاملہ میں اپنے موقف کو بہت کم بدلا، دو رجہ نو آبادیات کے مطالبہ کو ٹالنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ جو شیلے گروہوں میں تقسیم کرو یعنی کانگریس، والیان ریاست اور مسلم لیگ۔

4- کانگریس اور ریاستیں

بدقسمتی سے والیان ریاست جنھوں نے متحدہ ہندوستان میں ہندوستانی فیڈریشن کے منصوبے کو پہلی گول میز کانفرنس میں خود منظور کرلیا تھا رفتہ رفتہ فیڈریشن کی افادیت کے تعلق سے شک میں پڑ گئے اور انھیں اپنی پوزیشن اور اختیارات کے متعلق خدشات لاحق ہوگئے۔ ان کے پچھلے فیصلے کے بارے میں ان پر مختلف قسم کے اثرات پڑنے لگے۔ مثلاً انگلستان کے ٹوری سیاست دانوں ، سیاسی لیڈروں اور اونچے سرکاری پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسروں اور والیان ریاست کے درمیان گوناں گوں قسم کے شک وشبہ اور خدشات پیدا ہوگئے اور انھوں نے دستور کے مرتب کرنے یا اس کے بنانے کے عمل میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء ان کے سامنے آیا جس کی رو سے ریاستوں کو فیڈرل یونین میں شامل کیا جاسکتا تھا تو وہ حد درجہ پریشان اور مضطرب ہوئے۔

فروری 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں حیدرآبادی ڈیلی گیشن کے مشیر ریجی نالڈ گلیکسی (Reginald Glaxy) نے یہ رائے ظاہر کی کہ نتیجہ بہت ہی تیرہ اور تاریک ہے اور برطانوی اور ہندوستانی پارٹیوں کے درمیان کسی قسم کے سمجھوتے کے امکانات نہیں ہیں۔ اب والیان ریاست کا یہ خیال ہونے لگا کہ کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور وہ اپنی مخصوص پوزیشن کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں گے۔

1936ء میں والیان ریاست خدشات کی وجہ سے بہت زیادہ فکرمند اور بہت زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ انھوں نے وکیلوں اور ممتاز قانون دانوں سے مشورے لینے شروع کئے۔ بعض مشورے اس کے یکسر مخالف تھے کہ وہ فیڈریشن میں شامل ہوں۔ مثلاً جے ، ایچ ، مارگن نے انھیں خوف زدہ کردیا اور ان پر انھوں نے ڈبلیو، گرین، والٹر مانکٹن ، جی سیمنڈز ، جوویٹ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے واڈھم اور

ہندستان میں سر تیج بہادر سپرو سے مشورے کئے اور بالآخر انھوں نے وائسرائے سے استدعا کی کہ وہ وثیقہ شمولیت پر تفصیلی نظر ثانی کریں۔

اس نظر ثانی میں بڑا وقت صرف ہوا۔ مارچ 1939ء کے وسط میں وائسرائے نے چیمبر آف پرنسز کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ والیان ریاست نے فیڈریشن میں شمولیت کے لیے جو نکتے اٹھائے ہیں ان سب کو طے کیا جاچکا ہے اور ترمیم شدہ وثیقۂ شمولیت والیان ریاست کے پاس ان کے دستخطوں کے لیے بھیجا جائے گا۔ انھوں نے والیان ریاست کو یقین دلایا کہ ریاستوں میں دستوری اور انتظامی تبدیلیاں پوری طرح ان کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ اس بارے میں کسی قسم کا کوئی دباؤ ان پر نہیں ڈالا جائے گا۔ والیان ریاست نے حیدری کمیٹی سے درخواست کی وہ نئے وثیقہ شمولیت پر غور کرے اور اس کے متعلق اپنی رائے دے ۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ان کے موافق نہ تھی۔ 10 رجولائی 1939ء کو والیان ریاست اور ان کے وزرا کی مشترکہ کمیٹی نے اس رپورٹ پر غور کیا وثیقہ شمولیت اور فیڈریشن کے قیام کی شرطوں کو اپنے لیے نا قابل اطمینان اور نا قابل منظور پایا۔

قبل اس کے کہ سست رفتاری سے چلنے والی حکومت ہند کی مشینری صورتحال کا سامنا کرسکتی یا حل کرسکتی دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ 5 رستمبر کو وائسرائے نے لیڈر اسمبلی کو مطلع کیا کہ فیڈرل یونین اسکیم جو 1935ء کے ایکٹ کا حصہ تھی، جنگ کے دوران بالکل منسوخ رہے گی۔

اس تمام مدت میں ریاستوں کے مسئلے کے بارے میں انڈین نیشنل کانگریس کی خاموشی کی پالیسی رہی۔ حکومت نے اپنی پالیسی اور مفاد کے تحت والیان ریاست کو یقین دلایا کہ بالادست اقتدار (Paramount Power) ان کے حقوق،

مراعات، وقار پر ہر قسم کے بیرونی حملوں سے ہر طرح کے تحفظ کا پابند ہے۔ انھیں اس
کا بھی اطمینان دلایا کہ دستوری معاملہ میں وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ دوسری طرف
کانگریس اپنے جمہوری اور آزادی کے اصولوں کے ماتحت اس پر مجبور تھی کہ وہ
ریاستوں کے لوگوں کے سامنے جو ریاستوں میں انتظامی اور دستوری اصلاحات کے
لیے ایجی ٹیشن کر رہے تھے اس بارے میں اپنی پالیسی بیان کرنے۔

اس لیے کانگریس نے صوبوں میں وزارتی عہدے قبول کیے تو اس مسئلے نے ترجیح
کی صورت اختیار کی تھی کہ اس کو جلد از جلد حل کیا جائے۔ ریاستوں کے لوگ قدرتاً
اپنی جدوجہد میں ملک کی تابعداری اور حمایت کی توقع رکھتے تھے اور انھوں نے خاص
طور سے ایسے حکمرانوں کے خلاف جدوجہد میں کانگریس کی حمایت کی جو قوم پرست
تھے مگر بعض نادان والیان ریاست نے ایجی ٹیشن کو فروغ کرنے کے لیے جابرانہ
اقدامات کیے اور اس رویہ نے ریاست کے لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ برطانوی
ہند کے سیاسی لیڈروں کی حمایت حاصل کریں۔ یہی مسئلہ کانگریس کے سامنے آیا اور
اس کا یہ ردعمل ہوا کہ وہ ان ریاستوں کے عوام کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار
کرے لیکن ان کی جدوجہد میں عملی مدد دینے سے باز رہا جائے۔ اس نے والیان
ریاست کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے لوگوں کے حقوق کو تسلیم کر لیں اور ذمہ دار حکومت
قائم کرنے کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے ریاستوں کے
عوام کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ خود اپنی ہی طاقت پر ہی جدوجہد کریں اور اس
بارے میں برطانوی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہ کریں۔

1937ء کے الیکشن نے جس میں ہندوستانی عوام نے بڑے جوش و خروش کے
ساتھ کانگریس کی اپیل پر لبیک کہا تھا یعنی اپنے ووٹ دیا تھا ہندوستانی ریاستوں کے
لوگوں میں بڑی توقعات پیدا کر دیں کیونکہ بہرحال وہ برطانوی ہندوستانی عوام کے

بھائی بندلا تھے ادراس میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ جب فیڈرل یونین کا قیام عمل میں آئے گا تو وہ ہندوستان کی حکومت میں براہ راست حصہ لیں گے۔

1937ء میں کانگریس نے بنیادی حقوق، شہری آزادی، حق رائے دہی بالغان، عوامی رابطے وغیرہ مسئلوں پر خصوصی توجہ مبذول کی۔ اس کے بعد اب یہ اور بھی ضروری ہوگیا کہ کانگریس اس بارے میں سوچے جس پر بلا تفریق مذہب وملت پورے ملک میں عمل درآمد ہو۔ اس لیے اب اس کی دلچسپی ہندوستانی ریاستوں کے معاملے میں بھی زیادہ بڑھ گئی۔

1937ء میں کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں جابرانہ پالیسی کے خلاف ایک ریزولوشن پاس ہوا۔ جس میں ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ میسور کے لوگوں کی جدوجہد میں، جو وہ حکومت کے خلاف حق خود ارادیت کے حصول کے لیے کر رہے ہیں، ہر قسم کی مدد اور حمایت کریں۔

ہری پورہ میں منعقد کانگریس کے 1938ء کے اجلاس میں ریزولوشن میں خاص تبدیلی کی گئی۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ ان ریاستوں کو ہندستانی فیڈریشن میں شامل ہوتا دیکھنا چاہتی ہے اور وہاں ایسی جمہوری حکومت چاہتی ہے جیسی کہ باقی ماندہ ہندوستان میں ہے لیکن آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کا سارا بوجھ پوری طرح ہندوستانی عوام کے اوپر ہونا چاہیے۔ لیکن کانگریسیوں کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ انفرادی حیثیت سے اس جدوجہد میں مدد کریں۔

اسٹیٹ یا ریاستی کانگریس کمیٹیوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نگرانی اور ماتحتی میں کام کریں۔

میسور کے واقعہ کے بعد 1938ء میں حیدرآباد، ٹراونکور، کشمیر اور بعض دوسری

چھوٹی ریاستوں میں ہنگامے شروع ہوئے اور ان کے وجہ سے کانگریس اس پر مجبور ہوئی کہ وہ ریاستوں کے تعلق سے اپنی عدم مدافعت کی پالیسی پر نظر ثانی کرے یعنی اسے تبدیل کرے۔

گاندھی جی نے کانگریسوں کو مدد دینے کے ساتھ والیان ریاست سے اپیل کی کہ وہ کانگریس سے اچھے تعلقات رکھیں ورنہ وہ ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں اپنی پالیسی پر مجبور ہوگی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے والیان ریاست کو حکومت کی فوج کی مدد سے اپنی رعایا کے خلاف جابرانہ اقدام کرنے کے خلاف وارننگ دی۔ ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں کانگریس کی نرم اور مذبذب پالیسی سے نہرو متنفر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ناقابل عمل اور مہمل یونین کا تصور بھی محال ہے جس میں والیان ریاست کی مطلق العنانیت کو باقی ماندہ جمہوریت سے ملا دیا گیا ہو۔ 1938ء میں انھوں نے والیان ریاست کی یہ کہہ کر زبردست مذمت کی کہ وہ برطانوی سامراج کے بہت بڑے حامی اور حلیف ہیں۔ 15/ فروری 1939ء کو انھوں نے آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی صدارت کی اور اس کے بعد انھوں نے یاد دلایا کہ ہری پورہ کانگریس نے صاف اور غیر مبہم لفظوں میں یہ کہا تھا کہ ملک کی سالمیت لازمی ہے۔ باقی ماندہ ہندستان کی طرح وہی پوری سیاسی اور معاشی، سماجی اور ثقافتی آزادی اور اس قسم کی مکمل ذمہ دار حکومت ہندوستانی ریاستوں میں بھی ہونی چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی ریاستوں کی حکومتیں بالکل فرسودہ ہیں اور ان کے برطانوی حکومت سے کیے گئے وعدے معاہدے کرم خوردہ دستاویز ہیں جو عوام کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں۔

انھوں نے وعدہ کیا کہ یہ کانگریس کا فرض ہے کہ وہ ہری پورہ کانگریس کے متعین کردہ اور طے شدہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ انھوں نے یہ بھی کہا

کہ ریاستوں کے معاملوں میں عدم مداخلت کا کوئی سوال نہیں۔ کانگریس ہندوستان کے لوگوں کی خواہشات اور امنگوں کی نمائندہ جماعت ہے اور اس قسم کی کسی پابندی کو تسلیم نہیں کرسکتی جو ہندوستان اور اس کے لوگوں کے بارے میں کام کرنے کی آزادی میں مخل ہو۔ اس زمانے میں متعدد ریاستوں میں سنگین صورتحال پیدا ہوگئی۔ راجکوٹ کے حکمراں ٹھاکر کو اپنی رعایا کی طرف سے سیاسی اور انتظامی اصلاحات کے بارے میں ایجی ٹیشن کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ایجی ٹیشن کو والیان ریاست نے سخت گیر پالیسی کے ذریعہ دبانا چاہا۔ اس سے ریاست کے لوگ اور زیادہ مشتعل ہوئے اور ایجی ٹیشن نے خطرناک صورتحال اختیار کرلی۔ اس وقت سردار پٹیل نے مداخلت کی اور ٹھاکر صاحب اور ان کی رعایا کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ ریاست کے حکمراں اس پر راضی ہوگئے کہ اصلاحات پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس میں پٹیل کے نامزد کردہ لوگوں میں سے ٹھاکر اس کمیٹی کے ممبر مقرر کریں لیکن بعد میں ٹھاکر اس سمجھوتہ سے مکر گئے اور معاملہ بہت زیادہ خطرناک ہوگیا۔ اس موقعہ پر گاندھی جی نے مداخلت کی اور انھوں نے ریاست کے حکمرانوں کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں۔

لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ ان کا احتجاجی برت، ثالث کی مداخلت اور چیف جسٹس آف انڈیا کی اور گاندھی جی کی ساری کوشش ناکام ہوئی اور انھیں اپنی شکست ماننی پڑی۔ انھیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ٹھاکر صاحب اپنی بات پر کیوں اڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو پوری دلچسپی تھی۔ اس نے راجکوٹ میں کانگریس کی مدافعت کو اپنے لیے زبردست چیلنج سمجھا۔ اس لیے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ راجکوٹ میں کانگریس کامیاب ہو، کیونکہ اس سے بالادست طاقت پیرا ماؤنٹ (Paramount Power) وائسرائے کے بجائے کانگریس بن جاتی اور ایک جگہ

کامیابی حاصل کرنے کے بعد کانگریس کو دوسری جگہوں پر بھی کامیابی ہوتی اور گورنمنٹ آف انڈیا کا ریاستوں میں اقتدار اور اختیار ختم ہو جاتا۔

لن لتھ گو نے ڈرسیر ہنڈ کو لکھا کہ "یہ اہم ترین بات تھی کہ راجکوٹ کسی دباؤ کے تحت فیصلہ کرے اور اپنے لوگوں کی شکایتوں اور دوسری خامیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی کارروائی کرے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ کانگریس کی ان کوششوں کو جو وہ ریاست کے معاملہ میں ثالث بننے کے لیے کرے، ان کوششوں کو ناکام بنانے۔ اس توجہ سے انھیں میری مکمل تائید اور حمایت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ اگر کانگریس کو راجکوٹ میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو کانگریس اپنی سرگرمیاں دوسرے معاملوں میں شروع کر دیتی۔"

کانگریس نے بڑی تشویش کے ساتھ اس صورتحال پر غور کیا۔ ملک کی چھوٹی اور بڑی ریاستوں میں پھیلی ہوئی بہت سی جگہوں پر یعنی بعض ریاستوں میں وہاں کے لوگوں نے ریاستی کانگریس قائم کر لی تھی اور وہ انڈین نیشنل کانگریس سے الحاق کی خواہش مند تھیں۔

چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو اپنے حکمرانوں کے جور و استبداد اور مظالم کا شکار تھیں، وہ اڑیسہ، راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ وغیرہ تھیں۔ بڑی ریاستوں نے نئے طور طریقہ اختیار کیے یا نئی چالیں چلیں اور عوامی تحریکوں میں فرقہ وارانہ اختلاف کو داخل کر دیا۔

بہ حیثیت مجموعی کانگریس عدم مداخلت کی پالیسی پر قائم رہی لیکن اس نے ریاستی کانگریس کمیٹیوں نے الحاق کو منظور کر لیا۔ اس نے لوگوں ریاستوں کے لوگوں کے اس مطالبہ کی پرزور حمایت کی کہ ان کی ذمہ داری منتقل کر دی جائے یا شہری آزادی کا نفاذ ہو اور ان کے اس حق کو جائز ٹھہرایا جائے اور عوام کے جان و مال کا تحفظ کیا جائے اگرچہ اس نے فوری اور عملی اقدام اٹھانے سے گریز کیا۔

نے نہرو رپورٹ کے وحدانی نظام حکومت کی سفارش سے اختلاف کیا تھا۔ وہ اس کے حق میں تھے کہ صوبوں کی حد بندی نسلی، تمدنی اور لسانی بنیادوں پر کی جائے اور بالآخر ہندوستان کا فیڈریشن قائم کیا جائے۔

تقریباً اس زمانہ میں کیمرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی نے ہندوستان میں ایک مسلم قومی مملکت کے قیام کی تحریک شروع کی۔ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی 33-1932ء کے اجلاس میں اس اسکیم پر غور کیا گیا۔ مسلم شاہد یا گواہوں میں چودھری ظفر اللہ خاں بھی تھے۔ انھوں نے اسے بچکانہ، بے اصل، حقیقت سے دور بتایا۔ لیکن یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ نہ جوائنٹ پالیمنٹری کمیٹی نے اس پر غور کرنا ضروری سمجھا اور نہ جناح نے توجہ کی اسی لیے کہ اس قسم کی یا اس سے ملتی جلتی تجویز 1930ء میں اقبال نے پیش کی تھی۔ جس میں ایک مضبوط مسلم مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ درگا داس نے فضل حسین سے اپنی گفتگو کا ذکر کیا ہے جس میں پاکستان کے منصوبے پر روشنی پڑتی ہے۔ فضل حسین کے نزدیک جن لوگوں نے اس دستور کو 1930ء کی دہائی میں پیش کیا تھا ان کی برطانیہ خفیہ ایجنسیوں نے مالی امداد کی تھی۔

بعض دوسرے لوگ اس انداز پر سوچ رہے تھے اور ساری فضا مسلم فرقہ وارانہ مسئلوں سے گونج رہی تھی۔ بظاہر مسٹر جناح نے ہندوستان آنے پر ان مسائل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا لیکن یہ تصور کہ ہندوستانی مسلمان محض ایک فرقہ نہ تھے بلکہ ایک علیحدہ قوم تھے ان کے دماغ یا ذہن میں پیدا ہو چکا تھا۔ 1925ء سے 1937ء کے درمیان ان کی تقریریں اور ان کی ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں ان کے ذہنی تضاد کو ظاہر کرتی تھیں۔ 1935ء کے شروع میں انھوں نے کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد سے گفت وشنید کی۔ جناح کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان مذاکرات میں جہاں ایک طرف سمجھوتہ کرنے اور ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کی

زبردست خواہش تھی تو دوسری طرف گہرے خدشات بھی تھے۔ اس کے باوجود بھی دونوں سمجھوتے کی شرطوں پر متفق ہو گئے۔ لیکن دونوں کو اپنی اپنی جماعتوں کی منظوری حاصل کرنا تھی بلکہ ہندو مہاسبھا کی بھی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بھی تسلیم کرانا تھا۔

بابو راجندر پرشاد نے انھیں مطلع کیا کہ وہ سمجھوتے کی ہندو مہاسبھا کی طرف سے منظوری کی گارنٹی نہیں دے سکتے اس لیے کی اس کی الگ قانون ساز پارٹی تھی اور اس نے 1934ء میں کانگریس سے الگ رہ کر الیکشن لڑا تھا۔ پھر بھی پنجاب کی ہندو مہاسبھا اس کے حق میں تھی اور انھوں نے یعنی راجندر پرشاد نے ہندو مہاسبھا کو اس سمجھوتے کو منظور کرنے کی ترغیب دینے اور آمادہ کرنے کا وعدہ کیا۔ مسٹر آصف علی نے رائے ظاہر کی کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس لیے نہیں مانا جا سکتا ہے کہ متعدد آزاد اور علیحدہ مسلم جماعتوں کا ہندوستان میں وجود ہے۔ مثلاً آغا خاں کی سرپرستی میں کام کرنے والی، آل انڈیا مسلم کانفرنس، خلافت کمیٹی، علماء، احرار، قادیانی اور دوسری جماعتیں۔

ان مذاکرات میں مسٹر جناح نے اپنے کو ایک نئے جناح کے روپ میں ظاہر کیا۔ ان کی حکمت عملی کے تین اہم نکتے تھے۔

پہلے تو کانگریس کے ملک کی آزادی کے مطالبہ کو منظور کرنا۔ دوسرے اس پر زور کہ مسلم لیگ ہی ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے اور تیسرے یہ کہ کانگریس کے اس دعوے کی تردید کہ وہ بلا تفریق اور تخصیص مذہب، نسل، تمدن سارے ہندوستان کی نمائندہ سیاسی پارٹی ہے۔

چند ہفتوں کے بعد بمبئی کے اجتماع میں/ مسلم طلباء کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان بڑی دشواریوں اور مشکل صورتحال سے

دوچار ہیں۔ ایک طرف انھیں حکومت کی ناخوشی، دوسری طرف ہندو مہا سبھا کی زہریلی مخالفت اور کانگریس کی طرف سے شک و بدگمانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے یہ سوال اٹھایا کہ جب ہمارا یہ عظیم ملک حکومت خود اختیاری حاصل کرے گا یعنی آزاد ہوگا تو کیا ہم ہندوؤں کے محکوم ہو جائیں گے۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمان کسی کو بالادست اور حاکم نہیں ہونے دیں گے۔

انگلستان میں چند مہینے قیام کے بعد (23 اپریل سے 24 اکتوبر تک) مسٹر جناح ہندوستان آئے۔ اس وقت تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء پاس کیا جا چکا تھا۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان کسی آل انڈیا شہرت یافتہ لیڈر کے بغیر تھے۔ صرف مسٹر جناح ہی ایسے لیڈر تھے جو اس کمی کو پورا کر سکتے تھے۔ وہ لبرل یا جدید الخیال بلند و بالا دانشور تھے مگر مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے نمائندہ نہیں تھے بلکہ ان کے مقابلے میں قدامت پسند زمینداروں اور مسلمانوں کے بالائی طبقے کے نمائندے تھے جنھوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے کے تلے اہم دانشوروں کو جمع کر لیا اور اس قریب المرگ تنظیم میں جان ڈال دی اور اس میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو نئے نعرے دیئے کہ اسلام کی یکجہتی کو بچایا جائے۔ سیاسی اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ انھیں بھی مساوی مقام حاصل ہو یعنی مسلمانوں کو بھی مساوات کا درجہ حاصل ہو اور ملک کو مکمل قومی آزادی حاصل ہو۔ ان کا اثر و رسوخ روز بروز بڑھنے لگا۔ ان کو پہلی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب انھوں نے جمعیۃ العلماء کو مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شامل کر لیا۔ انھوں نے اپریل 1936ء میں دہلی میں علماء کانفرنس میں تقریر کی اور علماء کو بتایا آٹھ کروڑ مسلمان نہ صرف اس کے لیے آمادہ ہیں بلکہ اس کے لیے بیتاب ہیں کہ مادرِ ہند کی آزادی کے لیے لڑیں۔ یہ بالکل وہی بات تھی جس کے لیے علماء عرصے سے کوشاں تھے۔ مسٹر جناح نے نہ صرف انھیں مسلم لیگ

کے اصل مقصد اور ارادے سے مطلع کیا بلکہ مسلم لیگ کو اپنے بالائی طبقے میں رجعت پسندوں سے پاک کرنے کا بھی یقین دلایا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کا پارلیمنٹ بورڈ بنائیں گے جس میں جمعیۃ العلماء کی اکثریت ہوگی۔ انھوں نے اس کانفرنس کو یہ بھی بتایا کہ مسئلہ مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی ہے اور مسلمان دستور میں اپنے حقوق کے لیے تحفظات چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ اقتدار میں آجانے کے بعد لوگ اس کے نشے میں چور ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ مسٹر جناح نے جواہر لال نہرو کی اس تقریر کی تردید میں زور دے کر کہا کہ ملک میں چار پارٹیاں ہیں: والیان ریاست، ہندو، مسلمان اور برٹش حکومت۔

انھوں نے اعلان کیا مسلمانوں کا بھی وہی مقصد ہے جو ہندوؤں کا (ہندو قوم پرستوں کا) اور وہ (مسلمان ہند) ہندو قوم پرستوں کی طرح ملک کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یاد دلایا کہ پہلی بار ایک ایسے دستور پر عمل درآمد ہوگا جس میں حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہوگی اور مسلمان اقلیت ہیں۔ مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے سیاسی تحفظات کا ہونا ضروری ہے۔

مسلم لیگ نے 1937ء کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اپنی انتخابی مشنری تیار کی۔ پچھلے ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ اس الیکشن میں مسلم لیگ کی کارکردگی کیسی رہی اور کس طرح مسلم لیگ کی یہ توقع کہ وہ کانگریس کے ساتھ اقتدار میں ساجھے دار ہوگی پاش پاش ہوگئی اور کانگریس کے رویے پر اسے قصوروار ٹھہرایا گیا۔ اور یہ بلاوجہ نہیں تھا اس لیے کہ اس نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں آگے پیش آنے والے نتیجوں پر غور نہیں کیا تھا بلکہ مسٹر جناح نے تعاون کی جو شرطیں پیش کیں وہ اتنی ہی ناممکن تھیں جتنی

کی انھیں 1935ء میں راجندر پرشاد نے پایا تھا۔

مسٹر جناح اور مسلمانوں کا رویہ حد سے تجاوز کر گیا۔ یہ نہ صرف غیر دانشمندانہ اور انتہائی غیر محتاط رویہ تھا جس نے بجائے ہندو مسلمان اتحاد کے اس نے ہندو مسلم کشیدگی کو بڑھا دیا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا اس نے مسلمانوں کے فلاح بہبود کے ساتھ ہندوؤں کے فلاح و بہبود کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

صوبہ جاتی الیکشن کے ختم ہونے پر مسٹر جناح کو اس کا زبردست صدمہ ہوا۔ اسمبلیوں میں مسلمانوں کی 485 میں سے مسلم لیگ کو 109 سیٹیں ملیں۔ اس کے بعد ایک اور صدمہ بھی پہونچا۔

مسٹر جناح چاہتے تھے کہ ایگری کلچرسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے والے آزاد امیدوار جن کی انھوں نے مخالفت کی تھی مگر وہ مقابلے میں کامیاب ہو گئے تھے، مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے ممبران مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور مسٹر جناح کو ان کا یہ وعدہ یاد دلایا کہ وہ رجعت پسندوں کو مسلم لیگ سے نکال دیں گے۔ انھیں مسلم لیگ کے بعض ممبروں کے رویہ سے سخت تکلیف پہنچی تھی مثلاً یوپی مسلم لیگ کے صدر نے عبوری دور میں وزارت قبول کر لی۔ مسٹر جناح کے متکبرانہ طرز عمل نے بھی علماء کو بڑی ٹھیس پہونچائی اور وہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد بورڈ کے اور ممبروں نے بھی یہی کیا۔

مسٹر جناح بڑے کشش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ کانگریس سے تعاون کے خواہش مند تھے تاکہ اقتدار میں مسلم لیگ کو بھی ساجھیداری حاصل ہو اور اس کا وقار بلند ہو لیکن تعاون کرنے میں وہ اپنی شرطوں میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں گے تو وہ اپنی ملت کا اعتماد کھو بیٹھیں گے اور

خاص کر شور اور غوغا کرنے والے گروہ کا جس کو تحفظات پر اصرار تھا اور جس کی گارنٹی ریمزے میکڈانلڈ کے فرقہ وارانہ فیصلہ (Communal Award) نے دی تھی۔ ایک طرف انھوں نے کانگریس سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھا دوسری طرف مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔

اس دوہری پالیسی کو چلانے کے لیے 13 سے 15 / اکتوبر 37ء مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جس میں لیگ کے تمام ممبران کے علاوہ پنجاب اور بنگال کے وزراء اعلیٰ نے بھی شرکت کی۔ مسٹر جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں کانگریس پر لے دے کی کہ وہ کہتی کچھ ہے اور کرتی کچھ ہے اور اسے مسلم مفاد کے خلاف ٹھہرایا۔ انھوں نے کانگریسی حکومتوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہندی کی ترویج کررہی ہیں اور اسے فروغ دے رہی ہیں۔ بندے ماترم کا گیت اور کانگریس کے جھنڈے کو مسلط کیا جارہا ہے اور یہ دکھایا جارہا ہے کہ ہندی صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے برطانوی حکومت کو اس پر لتاڑا کہ اس نے اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے اختیارات کا صحیح استعمال نہیں کیا اور اس کے تباہ کن نتیجوں کی پوری طرح ذمہ داری اس پر ڈالی۔

انھوں نے مسلم لیگ کو بتایا کہ اکثریت سے کسی قسم کے سمجھوتے کا امکان نہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی ہندو لیڈر جسے کسی قسم کی کوئی بھی حیثیت حاصل ہے سمجھوتہ کا کسی طرح بھی خواہش مند نہیں ہے۔ باعزت سمجھوتہ صرف دو برابر کے لوگوں میں ہوتا ہے اور جب ملک کی دو بڑی پارٹیاں ایک دوسرے کی عزت نہ کریں اور انھیں ایک دوسرے کا خیال نہ ہو یا خوف نہ کریں تو کسی بھی سمجھوتہ کی کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی۔

انھوں نے اپنی صدارتی تقریر اس پر ختم کی کہ سیاست کے معنی اقتدار کے ہیں اور انصاف، غیر سگالی کا شور بلند کرنے کے نہیں۔ انھوں نے ہر صوبے، ہر ضلع، ہر تحصیل

اور ہر قصبے کے مسلمانوں سے سماجی، معاشی اور سیاسی سدھار کے طریقے اختیار کرنے کے لیے اپیل کی اور ہر مرد عورت اور بچے سے الگ مشترکہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی درخواست کی۔ ان کے سوانح نگار کے لفظوں میں جناح کا خطبہ صدارت خاص اہمیت کی حامل دستاویز ہے اس لیے کہ اس میں لیگ اور مسلمانوں کے لیے ایک نئے عزم اور ارادے کا اعلان ہے۔ یہ کانگریس کے خلاف کھلے ٹکراؤ اور تصادم کا اظہار ہے۔ یہ اس کی ساری پالیسیوں اور پروگرام سے علیحدہ ہونے کا اعلان ہے۔

غالباً یہی زمانہ تھا جب مسٹر جناح اور تھامپسن کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا۔ تھامپسن نے مسٹر جناح سے پوچھا: ''مسٹر جناح ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ میں دو قومیں ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کر رہی ہیں۔ کیا یہی حل ہے؟'' مسٹر جناح نے کہا: ''ہاں ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ میں یہی ہو رہا ہے۔'' تھامپسن نے مسٹر جناح سے کہا'' مسٹر جناح بلاشبہ یہ بڑا خطرناک حل ہے۔'' جناح نے کہا تھا۔'' لیکن یہی ایک واحد حل ہے۔'' سکندر حیات خاں اس شرط کے ساتھ کہ یونینسٹ پارٹی کے معاملوں میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی، جناح کے ہم نوا ہو گئے تھے۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ فضل الحق اور آسام کے وزیر اعلیٰ سعد اللہ تھے، ان کی مسلم لیگ میں شمولیت نے مسلم لیگ کے اثر میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ یوپی اسمبلی کے ضمنی الیکشن میں مسلم لیگ کامیابی ہوئی۔ یوپی میں اس کے ایک لاکھ ممبر بھرتی ہوئے اور اس کی 90 شاخیں قائم ہوئیں اور چالیس پنجاب میں۔ شہری مسلمان بڑی تعداد میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اس لیے کہ انھیں سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں دلچسپی تھی۔ دیہاتوں میں رہنے والے مولویوں نے مسلم لیگ کی حمایت کی کیونکہ یہ کانگریس کی سیکولرازم کے مخالف تھے۔ پنجاب کے مسلمان جو پہلے مسلم لیگ کے

مخالف تھے اب اس میں اس لیے شامل ہوئے کہ صوبہ جاتی مجلس قانون ساز کے ہندو ممبروں نے رہن شدہ آراضیوں کے ایکٹ، مہاجنوں کے رجسٹریشن ایکٹ اور مقروضوں کو راحت دینے کے لیے ایکٹ جس سے چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کو فائدہ پہونچتا تھا، مخالفت کی تھی۔ بنگال میں مسٹر جناح نے کرشک پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں سمجھوتہ کرادیا۔

کانگریسی اس چیلنج پر خاموش نہ رہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے یکم نومبر 37ء تک منعقد ہوتے رہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے لیے الگ مستقل تجویز پاس کی گئی۔ کانگریس کے اصل مقصد پر مبنی ہندوستان کی آزادی اور ہندوستان کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے اس نے اسے دوہرایا کہ کسی طبقے یا گروہ کو کسی دوسرے طبقہ یا گروہ کے استحصال کرنے کا حق نہیں۔ اس نے بنیادی حقوق کو یعنی رائے اور خیالات کے اظہار کی آزادی، جماعتوں میں شریک ہونے کی آزادی، ضمیر کی آزادی، مذہب کی آزادی، ملک کے اندر آمد رفت اور رہنے کی آزادی، تمدن، زبان اور رسم الخط کی آزادی، عام حق بالغ رائے دہی اور حکومت کی مذہبی معاملوں میں مکمل غیر جانب داری۔ اس کے ساتھ کمیونل اداروں کی مذمت لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا کہ اس میں کوئی بھی تبدیلی تمام فرقوں کی رضامندی سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ اقلیتوں کے معاملے میں ان کے تعاون اور غیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ ہی دخل دینا چاہئے۔ اس نے ایک بیان بھی شائع کیا جس میں بندے ماترم گیت کے بارے میں اعتراضات اور شکایتوں کو دور کیا گیا۔

جوہرلال نہرو نے کانگریس پر زور دیا کہ بڑی تندہی سے عوامی رابطے کی تحریک کو چلائے جس کا مقصد کانگریس کو مضبوط کرنا یعنی ہندو، مسلمان، سکھوں اور عیسائیوں میں بڑھتے ہوئے جوش اور بیداری کو کانگریس کی طرف راغب کرنا ہے۔ مسٹر جناح

نے کانگریس کو دھمکی دی کہ مسلمانوں کے معاملات میں کانگریس کی دخل اندازی کے نتیجے بڑے ہی تباہ کن ہوں گے۔

اس پر نہرو نے 4رفروری کو جناح کو خط لکھا جس میں باہمی اختلاف دور کرنے اور اتحاد یا ہم خیالی کے امور کے بارے میں تقویت چاہی اور انھیں گفتگو کرنے کی دعوت دی۔ جناح نے نہرو کی بے خبری پر حیرت کا اظہار کیا اور ان کے پاس اخباروں کے تراشے بھیجے جس میں ہندو مسلم اختلافات کا ذکر تھا۔ اس کے بعد 18راپریل تک دونوں کے درمیان طول طویل مراسلات کا سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر یہ خط و کتابت بغیر ان مسائل کو صاف کیے ختم ہوگئی۔ اسی اثناء گاندھی جی اور مسٹر جناح نے خط کتابت شروع کی۔ لیگ کے اجلاس کے بعد 19راکتوبر 1937 کو گاندھی جی نے مسٹر جناح کو لکھا کہ وہ ان کے خطبۂ صدارت کو اعلان جنگ سمجھتے ہیں۔ جناح نے جواب دیا کہ ان کی یہ تقریر تمام تر اپنی صفائی میں تھی۔ یہ خط و کتابت فروری 1938ء میں دوبارہ شروع ہوئی جب جناح نے مولانا آزاد سے خاموشی کی شکایت کی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری ہوگیا اور انھوں نے ایک دوسرے کو خط لکھے۔ بالآخر مسٹر جناح نے گاندھی جی سے ملاقات کے لیے بعض شرطیں پیش کیں: ”آپ یہ تسلیم کرلیں کہ مسلم لیگ ہی ہندوستانی مسلمانوں کی واحد اور مسلم جماعت ہے اور یہ کہ دوسری طرف آپ اور کانگریس سارے ملک کے نمائندگی کرتے ہیں۔ صرف اس بنیاد پر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کرسکتے ہیں۔“

اس قسم کا آمرانہ خط لکھ کر جناح نے ایسی پوزیشن اختیار کی جسے کانگریس نہیں مان سکتی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کو ہندوؤں کا واحد نمائندہ ہونے کا منصب قبول کرنے کی ہدایت کی اور یہ کہ وہ ان کے اس فیصلے کو بھی منظور کرلیں کہ کانگریس خالص

ہندو جماعت ہے۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی اس قسم کی رائے کو کیسے قبول کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح سے ملنے کو تیار ہو گئے۔ ابتدائی قیل وقال کے بعد دونوں مسٹر جناح کی بمبئی کی قیام گاہ پر 28/اپریل 1938ء کو ملے۔

اس ملاقات کا نتیجہ صرف یہ مبہم بیان تھا کہ ہم نے ہندو مسلم مسئلے پر 3 گھنٹہ تک دوستانہ گفتگو کی۔ آئندہ اس مسئلے کو آگے بڑھایا جائے گا" اس قسم کی ملاقاتوں میں آخری ملاقات جناح اور سبھاش چندر بوس کی ہوئی اور اس کے بعد ان دونوں کے مابین 2/اگست 38ء سے 12/اکتوبر 38ء تک خط وکتابت رہی مگر اس کا نتیجہ صفر رہا۔ یہ خط سبھاش چندر بوس نے ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کے بعد دسمبر 1938ء میں لکھا:

"ورکنگ کمیٹی نے آپ کے 10/اکتوبر 1938ء کے خط پر غور وخوض کیا اور اس کے مندرجات پر اسے افسوس ہے۔ چونکہ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین گفت وشنید کی بنیاد پر متعین نہیں ہے اس لیے اسے افسوس ہے کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں مسلم لیگ سے گفت وشنید کرے۔"

اس خط نے اتحاد کی کوششوں کو ختم کر دیا۔ کانگریس نے مسٹر جناح کے اس نا قابل قبول اور نا قابل برداشت مطالبے کو کہ وہ اپنے اعلیٰ اصولوں سے دست بردار ہو جائے جس پر وہ اپنی ابتدا سے اب تک کاربند رہی تھی ماننے سے انکار کر دیا۔ اور نہ وہ اس پر مجبور کی جا سکتی تھی کہ وہ لیگ کے اس دعوے کو مان لے کہ مسلم لیگ ہی ملک کے سارے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس نے جناح سے اس لیے گفت وشنید کی وہ ان کے ساتھ ہندوستان کے سارے گروہوں کے ساتھ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، ان کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی تھی اور اس لیے بھی کہ

اس کو اس کا پختہ یقین تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت اس کی حامی ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے یہ تعاون ضروری ہے۔ اس کے بعد اب اس نتیجے پر پہونچے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ کانگریس کمیٹی کی اس تجویز کے بعد جناح کو اب اس اتحاد میں دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اقبال جیسے لوگوں کے خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے۔

آزادی کے نصب العین سے جناح اپنے تکبر کی بنیاد پر نہیں ہٹے لیکن اس سے بالکل جڑا ہوا مسئلہ یعنی قومی اتحاد بڑی تیزی سے زائل ہوتا جا رہا تھا جب کہ وہ کانگریس سے اپنی شرطیں نہ منوا سکے۔ اس لیے وہ اصل مسلم لیگ کی پرانی پالیسی پر گامزن ہوئے کہ مسلمانوں کے مقاصد حکومت ہی کی مدد سے حاصل کیے جائیں لیکن حکومت سے مراعات اور نوازشیں حاصل کرنے کے لیے بھیک مانگنے اور خوشامد کرنے کے بجائے انھوں نے وائسرائے پر دھونس جمانا شروع کی اور حکومت کو بلیک میل کرنا شروع کیا۔

حکومت جس کی سربراہی زیٹلینڈ، ریمزے اور لن لتھ گو کر رہے تھے ان کی بڑی شکر گزار تھی اور حسب معمول ہندوستانی صورتحال کی گہرائی اور پیچیدگی کے بارے میں ان کا اندازہ بالکل غلط تھا۔ جب تک مسلم لیگ کانگریس کے راستے میں ملک کی آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے رکاوٹیں ڈالتی رہی تو وہ نئی حکومت کی سربراہی سے پورے طور سے مطمئن تھے اور وہ مسلم لیگ کے انتہا پسندانہ مطالبات کو محض دھونس نہیں بلکہ سودے بازی سے تعبیر کرتے تھے اور اس لیے وہ بدستور مطمئن رہے۔ انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر مانٹیگو اور چیمس فورڈ نے پہلی عالمی جنگ کے شکنجہ میں اعصاب کو پوری طرح کس لیا ہوتا تو جنگ کے بعد میں ہندوستان کو خاموش اور مطمئن رکھ سکتے تھے اور وہ اس قسم کی چالبازیوں سے دوسری عالمی جنگ کے خطرناک دنوں کو جب کہ

جنگ ہندوستان کے دروازے تک آگئی ہو بہ آسانی گذر سکتے تھے۔ حالانکہ عام سمجھداری اور دانشمندی کا تقاضہ تھا کہ یورپ میں سنگین بحران کے پیدا ہوتے ہی اور ہندستان کی غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر برطانوی حکومت کے پرانے اور آزمودہ دوستوں اور خیر خواہوں کو پوری طرح مطمئن رکھا جاتا خواہ وہ کتنے ہی ناگوارا اور شاطر کیوں نہ ہوتے۔

8/ اکتوبر 38ء کو سندھ مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ کانگریس نے جب سے صوبوں میں اکثریت حاصل کی ہے کانگریس ہائی کمانڈ نے مسلم لیگ کے بارے میں وحشیانہ، سفاکانہ اور ظالمانہ اور دشمنی کا رویہ اختیار کیا ہے۔

اس انتہائی تلخ اور تند تنقید سے انھوں نے حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے کانگریس سے خفیہ معاہدہ کرلیا ہے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کرے گی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی قوت پر انحصار کریں اور اپنے مسئلوں اور مطالبوں کو منوانے کے لیے اپنے میں قدرت پیدا کریں۔ اپنی تقریر کے اختتامی جملوں میں انھوں نے مسلم اکثریتی علاقوں کا موازنہ سوڈیٹن لینڈ Sudetenland سے کیا۔ انھوں نے کہا سوڈیٹن لینڈ ایک مصنوعی حکومت تھی جو جرمنی سے علیحدہ کرکے بنائی گئی تھی لیکن وہاں کے لوگ اسے نہیں بھولے کہ ان کا مادر وطن سوڈیٹن لینڈ نہیں جس کو اجنبیوں نے بنایا۔ اس لیے نئے نقشے بنائے گئے۔ اس سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ہٹلری طور طریقوں کی کیسی ہوائیں چل رہی تھیں۔

دسمبر 1938ء میں پٹنہ میں مسٹر جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں کانگریس اور صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے بارے میں الزامات دہرائے۔

جس چیز کی مسٹر جناح نے بطور ماہر دستور زندگی بھر سخت مذمت کی تھی جب کانگریس نے اسے اختیار کیا تھا یعنی ڈاریکٹ ایکشن یا حکومت کے خلاف براہ راست اقدام، اسے اس اجلاس میں یو پی کے مسٹر عزیز احمد خاں، وزیر اعلیٰ سکندر حیات خاں اور بنگال کے پریمیر فض الحق کی تائید سے بالاتفاق منظور کیا گیا۔ اگرچہ مسٹر جناح کا پٹنہ کا خطبہ صدارت چیلنج کا بگل تھا مگر یہ برطانوی آقاؤں کے خلاف نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف تھا۔ محمد مہدی راجہ آف میر پور کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ وہ کانگریس حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی جانچ پڑتال کرے اور اس بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے۔ یکطرفہ تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ دسمبر 1939ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں ہندوؤں اور کانگریسی حکومتوں پر مختلف قسم کے الزام لگائے گئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو حکومت میں یعنی سرکاری ملازمتوں میں حصہ نہیں دیا گیا۔ واردھا تعلیمی اسکیم کو شروع کرنا، مسلمانوں کو کانگریس کے جھنڈے کے احترام کے لیے مجبور کرنا اور انھیں بندے ماترم گانے پر مجبور کرنا اور خاص طور سے ہندی کے استعمال کو وسیع کرنا اور اردو کو نظر انداز کرنا۔

مارچ 1939ء میں اس سے بھی بڑھ کر شدید فرد جرم بہار میں شایع ہوئی۔ یہ شریف رپورٹ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کے بعد 1939ء میں فضل الحق کا پمفلٹ: 'کانگریسی حکومتوں میں مسلمانوں کے مصائب، مسلمانوں پر مظالم' اس پمفلٹ میں شکایتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر اور مبالغے کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ زیادہ تر شکایتیں یا تو بے اصل تھیں یا پورے طور سے صحیح نہ تھیں۔ کانگریس نے تجویز کیا کہ ان شکایتوں کی جانچ ایک آزاد اور غیر جانبدار اور بااختیار جماعت کرے لیکن مسٹر جناح نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ جہاں تک ان شکایتوں کے متن کا تعلق تھا ہیری ہیگ اور ارسکن (Erskine) نے کانگریسی حکومتوں کو صاف چٹ دیدی اور لن لتھ

گو نے مسٹر جناح کی ان شکایتوں کی تحقیقات کے مطالبے کو نامنظور کردیا۔ لیکن لیگ کے پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اس بات کا یقین تھا کہ جتنا بڑا جھوٹ بولا جائے گا یا جتنا زیادہ جھوٹ بولا جائے گا اتنا ہی زیادہ اسے مان لیا جائے گا۔ کانگریس وزارتیں جنگ کے مسئلے پر جب مستعفی ہوگئیں تو مسٹر جناح نے 22/ دسمبر کو یوم نجات یا یوم تشکر منانے کا فیصلہ کیا۔

کانگریس کی وزارتوں کے مستعفی ہوجانے کے بعد ملک کی آزادی کی جدوجہد کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ لیکن اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کانگریس کی اندرونی کشمکش یا باہمی تصادم کو بیان کیا جائے۔

6- کانگریس کے اندر گروہ بندیاں

وزارتیں قبول کرنے کے مسئلے پر کانگریس میں شدید اختلافات تھے۔ ایک گروہ جس کی حمایت گاندھی جی کررہے تھے وزارتیں قبول کرنے کے حق میں تھا۔ دوسرا گروہ جس کی قیادت جواہرلال نہرو کررہے تھے اس کا مخالف تھا۔ جب مارچ 1937ء میں جواہرلال نہرو نے اس کی مخالفت ختم کردی تو ان لوگوں کے نئے لیڈر سبھاش چندر بوس جو 1897ء میں پیدا ہوئے تھے اور جو سارے ہندوستان میں مشہور اور معروف تھے اور ان کو آل انڈیا حیثیت حاصل تھی، ہندوستانی سیاست میں داخل ہونے کے بعد انھیں مشہور قومی رہنما سی۔ آر۔ داس کی مربیانہ اور مشفقانہ خصوصی توجہ اور سرپرستی حاصل ہوئی۔ وہ کئی بار جیل گئے اور انھوں نے جلاوطنی بھی سہی، آزادرائے رکھتے تھے اور بڑی استقامت سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے والے عزم مصمم رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ کسی دھارے کے ساتھ بہیں (بہہ جائیں)۔ انھیں 1922ء میں گاندھی جی سے شدید اختلاف پیدا ہوا جب انھوں نے

تحریک عدم تعاون چلائی۔ اسی طرح انھوں نے 1928ء میں ان کی کانگریس کی حکومت سے مقابلہ کرنے یا مزاحمت کرنے کی پالیسیوں اور طریقوں سے شدید اختلاف کیا۔ 1933ء میں جب وہ وائنا میں جہاں وہ علاج کی غرض سے گئے تھے انھوں نے یہ خبر سنی کہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی ہے تو وہ بہت زیادہ بے چین ہوئے اور اس فیصلہ کو حد درجہ ذلت آمیز اور حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا اور شدید غم اور غصہ میں کہا کہ ''گاندھی جی ایک پرانے اور بیکار اور فرسودہ فرنیچر کی طرح ہیں۔'' انھوں نے بسمارک کی اس رائے سے پورا اتفاق ظاہر کیا کہ صرف بحث مباحثے سے دنیا کی تاریخ میں کوئی اہل اور اہم تبدیلی نہیں ہوئی اور اب صرف جنگ ہی متبادل ہے۔ اس سے کیا حاصل ہوگا؟

اپنی آزادی کے لیے ہندوستان جانی اور مالی قربانیاں دے سکتا ہے۔ 35 کروڑ (350 ملین) ہندوستانیوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے بھری ہوئی زندگیاں اپنی نجات کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ وٹھل بھائی پٹیل کے ساتھ انھوں نے ایک بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ بحیثیت ایک سیاسی لیڈر گاندھی جی ناکام رہے اور اس کی حمایت کی کہ نئے اصولوں، نئے طریقوں اور نئی قیادت کے تحت کانگریس میں انقلابی تنظیم کی جائے۔

1935ء میں اپنے سیاسی خیالات کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب The Indian Struggle (ہندوستانی جدوجہد) میں کیا جو انھوں نے جلاوطنی میں لکھی تھی اور جو لندن سے شائع ہوئی تھی۔ اسے ہندوستان میں ضبط کرلیا گیا۔ دوسرے سال اپریل میں وہ ہندوستان واپس آئے مگر بمبئی میں اترتے ہی انھیں گرفتار کرلیا گیا اور انھیں کلکتہ میں ان کے بھائی کے مکان میں نظر بند کردیا گیا۔ بعد میں رہا کردیا گیا۔

بوس پیدائشی باغی تھے اور جذبات کے لحاظ سے ہمیشہ اختلافات والے تھے۔

ن کا پختہ خیال تھا کہ ہندستان کا مستقبل ان انتہا پسند اور جنگ جو قوتوں سے وابستہ ہے جو آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے اور تکلیفیں اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔

وہ نوجوان کانگریسیوں، جو سوشلزم میں پختہ اعتقاد رکھتے تھے اور جارحانہ طریقوں کے حامی تھے، کے ہیرو بن گئے ،اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے 1938ء میں انھیں کانگریس کی صدارت حاصل ہوگئی اور یہ ظاہر ہوگیا کہ ان میں اور دوسرے کانگریسی لیڈروں میں گہرے اختلافات ہیں۔ گاندھی جی کا تعلق اس گروہ سے تھا جو عہدے قبول کرنے کا حامی تھا۔ ان کو اس عہدے پر اس لیے مقرر کرنا چاہا کہ عہدے کی ذمہ داری ان کی انتہا پسندی، شدت پسندی میں اعتدال پیدا کردے گی۔ ان کا انتخاب ہری پورہ کانگریس کے اجلاس منعقدہ 19 /فروری 1938ء کی صدارت کرنے سے ہوا۔

ان دنوں لوگوں میں بڑا جوش تھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے جھگڑے تھے۔ کانگریسیوں میں مختلف قسم کے خیالات پائے جاتے تھے۔ بعض گاندھی جی کے نظریوں کے ماننے والے تھے اور بعض قدیم ہندوستان کی روایتوں اور تصورات کے قائل تھے اور اس کو ہندوستان کے لیے مثالی سمجھتے تھے۔ بعض مغرب کے دیے ہوئے تصورات، سوشلزم، کمیونزم اور فاشزم کی طرف مائل تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو مشرقی اور مغربی سماجی تصورات کو سمجھنا چاہتے تھے۔ بعض کٹر قدامت پسند تھے جو کسی بھی انتہا پسندانہ تبدیلی کے موافق نہ تھے اس بارے میں بھی، کہ شدت یا متشددانہ طریقوں کو اختیار کیا جائے یا عدم تشدد کو، بہت اختلافات تھے۔ کانگریسی وزارتوں نے ہنگاموں اور فسادوں کو فرد کرنے کے لیے اور متشددانہ یا تشدد کی سرگرمیوں اور کاموں کو روکنے کے لیے تشدد یا طاقت کا استعمال کیا جائے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس کے علاوہ خود ان

وزارتوں کی کارکردگی کے بارے میں اعتراضات تھے کیونکہ بنیادی مسئلے حل نہیں ہوئے تھے۔ انسان قدرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ کانگریسی بھی اس وجہ سے بڑے انتشار ذہنی اور پراگندہ خیالی میں مبتلا تھے۔

ان حالات میں سبھاش چندر بوس کا انتخاب بہ حیثیت صدر ہری پورہ کانگریس کے لیے ہوا جس کا اجلاس 18 رفروری سے ہونے والا تھا۔ انھوں نے اپنی پالیسی کا اعلان اس موقعہ پر ان الفاظ میں کیا: ''میری عہدہ صدارت کی مدت، ناپسندیدہ وفاقی اسکیم جو غیر جمہوری اور قوم مخالف اصولوں، پر بنائی گئی ہے، مقابلہ کرنے میں صرف ہوگی۔ ملک کے اس رخ کو مستحکم بنانے میں اس اسکیم کا پوری طرح مقابلہ کیا جائے۔''

اپنے خطبۂ صدارت میں قومی منصوبہ بندی، اتحاد اور قومی جدوجہد کے لیے عوام کو منظم کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے یورپ کی صورتحال خاص طور سے ان خطرات کی طرف جو برطانوی شہنشاہیت کو معرض خطرے میں ڈال رہے تھے اور جس سے ہندوستان میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو رہی تھی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

اپنی صدارت کی مدت میں انھوں نے قومی منصوبہ بندی کی سینٹرل کمیٹی کی جس کے چیرمین جواہر لال نہرو تھے، تشکیل کی۔ ان کی اعلیٰ پیمانے پر صنعت کاری کی کوشش اور برطانوی حکومت سے کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کی شدید ترین مخالفت کرنے کی پالیسیوں کی وجہ سے گاندھی جی کے حامیوں کے حلقے میں جو برطانوی حکومت سے سمجھوتہ کرنے کے حق میں تھے ان کے خلاف شدید ناراضگی پیدا ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت یہ کوششیں کی جارہی تھیں کہ وفاقی یا فیڈرل حکومت کے جلد قیام کے بارے میں کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ 16 راپریل 1938ء کو گاندھی جی لن لتھ گو سے ملے۔ انھوں نے ان کو بتایا کہ وہ اس فارمولے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس سے لارڈ لوتھین کو مطلع کر چکے ہیں اور اس کی منظوری کو اس کی کسوٹی قرار دیتے ہیں کہ

برطانوی حکومت ہندوستان کو مکمل اقتدار اعلیٰ دے رہی ہے یا اس کے دینے سے انکا
کر رہی ہے۔

وایسرائے کا یہ تاثر تھا کہ وہ یعنی گاندھی فیڈریشن کو منظور کرلیں گے بشرطیکہ بڑی
چھوٹی ریاستیں اپنے عوام کی مرضی کے اصول کو مان لیں۔

ستمبر 1938ء میں معاہدے یا پیکٹ کے بعد میں سبھاش چندر بوس نے سارے
ہندستان میں ہندوستانی عوام کو جدوجہد کے لیے تیار کرنے کا زبردست پروپیگنڈ
شروع کیا اور یہ جدوجہد جواب میں چھڑنے والی جنگ کے ساتھ شروع ہوگئی۔ اس
سے ان میں اور کانگریس کے گاندھوی بازو میں زبردست اور شدید آپسی اختلاف پید
ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گروپوں کے مابین آئندہ اجلاس کے کانگریس کے صدر
کے بارے میں زبردست رسہ کشی شروع ہوگئی۔ یہ الیکشن جنوری 1939ء میں ہوا۔
ایک گروہ کے امیدوار پٹابھی سیتارمیا تھے اور دوسرے کے سبھاش چندر بوس تھے۔
اس الیکشن میں حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ گاندھوی امیدوار پٹابھی سیتارمیا کو شکست
ہوئی اور سبھاش چندر بوس دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہوگئے۔

تری پورہ مہا کوشل میں کانگریس کا اجلاس 10 / مارچ 39ء کو منعقد ہوا اس میں
انھوں نے زور دیا کہ کانگریس برطانوی حکومت کو فوری الٹی میٹم دے کہ وہ ہندوستان کو
چھ مہینے کے اندر مکمل آزادی دیدے اور اس کے ساتھ ملک کو قومی جدوجہد کے لیے
تیار کرے لیکن اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہوا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور سبجکٹس کمیٹی
کے جلسوں میں بڑا شوروشغف ہوا اور ہنگامہ آرائی ہوئی۔ مقرروں کو تقریر کرنے سے
روکا گیا اور انھیں بولنے نہیں دیا گیا۔ جواہر لال نہرو کو زبردست مخالفانہ نعروں کا سامن
کرنا پڑا۔ اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی:

'کانگریس اپنی بنیادی پالیسیوں پر سختی سے کاربند رہنے کا اعادہ کرتی ہے۔ پچھلے

بیس سالوں سے وہ گاندھی جی کی قیادت میں ان کی پالیسیوں کے پروگرام پر چل رہی ہے۔اس کی سوچی سمجھی اور قطعی رائے یہ ہے کہ ان پالیسیوں سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں ہونا چاہیئے اور آئندہ بھی یہی کانگریس کی بنیاد ہونگی۔

اس خطرناک صورتحال کے پیش نظر جو آنے والے سال میں پیش ہونے والی ہے اور اس امر کے پیش نظر مہاتما گاندھی ہی کانگریس اور ملک کی رہنمائی اس زبردست اور سنگین بحران کے دور میں تھے اور کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ کانگریس کی انتظامیہ یا ورکنگ کمیٹی ان کی مرضی کے مطابق ہو۔اس لیے یہ صدر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ورکنگ کمیٹی کو گاندھی جی کی مرضی کے مطابق نامزد کریں۔'

اس سے صدر کو یہ صاف نوٹس مل گیا کہ ان کے لیے گاندھی جی اور ان کے پیرووں سے آزادرہ کر کام کرنا ممکن نہ ہوگا۔کانگریس کے ڈیلی گیٹوں نے جنھوں نے ان کو یعنی بوس کو صدر منتخب کیا تھا اب گاندھی جی کی ناخوشی، ناگواری کو دور کرنے کے لیے کفارہ ادا کیا اور یہ انھوں نے بڑی کثرت رائے سے گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد ظاہر کر کے کیا۔

اس سے ایک تعطل پیدا ہو گیا اور اسے سبھاش بابو اور گاندھی جی اور ان کے حامیوں کے مابین گفت وشنید کے ذریعہ دور نہ کیا جاسکا۔بوس نے اس گفت وشنید پر یہ تبصرہ کیا کہ ان کے اور گاندھی جی کے مابین گفتگو نے اسے بالکل صاف کر دیا کہ کانگریس کا گاندھیائی بازوان کی قیادت کی پیروی نہیں کرے گا جبکہ دوسری طرف وہ یعنی بوس اس سے اتفاق نہ کر سکے کہ وہ کانگریس کے کٹھ پتلی صدر کی طرح کام کریں اس لیے اب سوائے صدارت سے مستعفی ہونے کے ان کے لیے کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔

26/اپریل 1939ء کو سبھاش چندر بوس مستعفی ہوگئے اور انھوں نے اپنی نئی پارٹی فارورڈ بلاک کے نام سے کانگریس کے گاندھیائی بازو سے مقابلہ کرنے اور بعد میں سنگین بحران کے رونما ہونے پر کوئی کارروائی کرنے کے لیے بنائی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے صدارت کی خالی جگہ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد کو مقرر کر کے پر کرلیا اور انھوں نے تری پورہ کانگریں کی تجاویز کے مطابق ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کی۔ ایسے وقت میں جب دینا سنگین بحران سے دوچار ہونے والی تھی اور کانگریس میں اتحاد کی شدید ضرورت تھی، سبھاش چندر بوس کی اس سے علیحدگی حد درجہ افسوس ناک تھی۔

چھٹا باب

ہندوستان اور جنگ

1939 ء کے دستور کے مطابق صوبہ جاتی حصہ پر عمل درآمد کا تجربہ مشکل سے 27 مہینے رہا (کانگریس کے اکثریت والے صوبوں میں)۔

کانگریس وزارتیں صوبہ جاتی ایڈمنسٹریشن یا نظم ونسق میں خود اعتمادی حاصل کررہی تھیں اور لوگ فیڈرل یونین قائم ہونے کی امیدیں لگا رہے تھے اور اس کی بھی کہ مرکز میں ہندوستانیوں کو ذمہ داری منتقل کردی جائیگی جب کہ دفعتا وہ خوفناک ہر لحاظ سے ہمہ جہت متوقع تباہی ہوئی۔ عالمی جنگ نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کی وجہ سے ہر منصوبہ غیر یقینی ہوگیا اور ہندوستان کی ترقی کی ساری امیدیں التوا میں پڑ گئیں۔

کانگریسی وزارتوں کے عہدے سنبھالنے سے بہت پہلے جنگ کی پرچھائیوں نے بین الاقوامی امن کو تیرہ و تاریک کرنا شروع کردیا تھا اس لیے کہ ویسائی (Versailles) صلح نامے نے یورپ میں غیر یقینی یا ناپائیدار امن قائم کیا تھا۔ 30 ر جنوری 1933 ء کو ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار آ گیا لیکن اس واقعہ کا یوروپین ملکوں کے مستقروں یا دارالسلطنتوں پر بہت کم اثر پڑا۔ فرانسیسی سیاست دانوں اور لیڈروں کو پورا پورا یقین تھا کہ وہ شعلہ بار ہٹلر اور شمشیر برہنہ مسولینی سے بہ آسانی نمٹ لیں گے۔ جرمنی کو پوری طرح غیر مسلح کردیا گیا تھا اور اس طرح اسے بالکل ہی بے دست و پا کردیا گیا تھا اور مسولینی کو محض ہیکڑی باز یا محض دھونسیں جمانے والا سمجھا گیا۔

انگلستان میں 1931ء کے عام الیکشن سے بالڈون عہد کا خاتمہ ہوگیا تھا اور میکڈانلڈ کٹھ پتلی یا نمائشی وزیراعظم کی ذہنی گرفت اور دماغی حدت روز بروز جواب دیتی جارہی تھیں۔ وزیر ہند سیموئل ہور ہندوستان میں دستور سازی کے بنجر ریتیلے میدانوں میں کاشت کررہے تھے اور سائمن کمیشن کے تہنیت یافتہ سائمن ان کے دوش بدوش وزیر خارجہ تھے۔ چرچل جو کہ کنزرویٹو پارٹی میں تھے اس بااثر گروہ سے باہر تھے۔ وہ یورپ میں آنے والی تباہی کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ پہلی قومی حکومت کے پہلے چار سالوں میں یعنی ٹڈی دل کے سالوں اگست 1931ء سے 1935ء تک میں برطانوی سیاست میں بڑی کمزوری رہی۔ اس میں کسی بھی سمت کا فقدان تھا اور ہر طرح کی ابتری تھی جب کہ یورپ میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن برطانوی مدبر ہر چیلنج کے بارے میں بالکل لاتعلق رہے۔

ہندوستان کے بارے میں بھی برطانوی مدبرین نے صورتحال کی اصلیت سے مکمل بے خبری کا مظاہرہ کیا اور بڑی مستقل مزاجی سے ایسا طرز عمل یا رویہ اختیار کیا جو ہر اعتبار سے تباہی کا پیش خیمہ تھا بلکہ اس قسم کی بے خبری اور دوراندیشی کی کمی کا مظاہرہ یورپ کی بڑی تیزی سے بدلتی ہوئی صورتحال کے بارے میں بھی کیا۔ فرانس اور برطانیہ امن، اسلحہ بندی، تحفظ یا سلامتی کا ذکر لیگ آف نیشنز کے ذریعہ یعنی اس کے جلسوں میں کرتے رہے اور معاشی پابندیوں پر تقریروں کے ذریعے اٹلی کے غیر مصالحانہ رویہ کو کچل دینے کی ڈینگیں مارتے رہے۔ ہٹلر اور مسولینی لیگ آف نیشنز کی تجویزوں کے باوجود اور اپنے مخالفوں کی غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے اپنے عزائم اور منصوبوں کی تکمیل کرتے رہے۔

1933ء میں اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد ہٹلر نے جرمنی کو تیزی سے مسلح کرنے اور اسکی فوجی طاقت کو بڑھانا شروع کر دیا۔ فروری 1935ء کے استصواب

رائے (Plebisite) نے اسے سار (Saar) واپس دلوادیا۔ مارچ میں اس نے صلح نامہ سار کی خلاف ورزی کی جس کی رو سے جرمنی کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ اس نے ملک میں فوجی تربیت لازمی قرار دیدی۔ اکتوبر میں مسولینی نے ابی سینیا پر حملہ کر دیا۔ 1935ء میں ہٹلر نے اس بارے میں کہ جرمن بحری بیڑہ برطانوی بحری بیڑہ کے مقابلے میں 35 فیصدی کے تناسب سے دوبارہ بنایا جائے ، برطانوی حکومت کی رضامندی حاصل کر لی۔ مارچ 1936ء میں اس نے رھائن لنیڈ کو دوبارہ فوج سے لیس کر دیا اور جولائی میں اس نے جنرل فرانکو کی اسپین میں خانہ جنگی یا سول وار میں اچھی خاصی مدد کی جب کہ انگلستان سختی سے غیر جانب دار رہا۔

ہٹلر کی طرف سے معاہدہ ویسائی کی پیہم خلاف ورزیوں کے خلاف انگلستان سست رفتاری سے اس معاہدہ امن کو قائم یا برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اینوول رجسٹر (Annual Register) کے الفاظ میں انگلستان کی 1939ء کی پالیسی مذبذب ،غیر فیصلہ کن ،معذرت آمیز اور بے مقصد تھی۔ خواہ یہ پالیسی ویسائی صلح نامہ کی رو سے بے انصافی کی وجہ سے بعد میں پیدا ہونے والے احساس کے سبب ہو یا امن پسندی کے قومی جذبہ کی وجہ سے ہو یا واقعات سے سبق نہ لینے کی وجہ سے یا جنگ کے دوران زبردست قربانیاں دینے یا جنگ کے بعد مزید قربانیاں کرنے سے احتراز کی وجہ سے ہو۔ برطانیہ میں فرانس مخالف جذبات پیدا ہو گئے تھے اور اس بارے میں بھی شک ہو چلا تھا کہ آئندہ جنگ میں فرانس اس کا ساتھ دے گا۔ یہ بات اپنی جگہ پر تھی کہ اپنے تذبذب، گومگو اور یا خوش رکھنے کی پالیسی سے اس کی جنگی تیاریاں بہت زیادہ پیچھے رہ گئی تھیں اور ہٹلر کی مہم جو پالیسی کی ہر طرح ہمت افزائی کی گئی جو بالآخر جنگ کا باعث بنی۔

جب بالڈون علالت کی وجہ سے 1938ء میں ریٹائر ہو گئے، چیمبرلین وزیراعظم

ہوئے تو اس وقت یورپ چٹان کے سرے پر پہنچ گیا یعنی خطرے یا جنگ تک۔ ہٹلر اس مسئلے کہ جرمنوں کے رہنے کے لیے مزید زمین یا علاقہ حاصل کرنے کی فکر میں سرگرداں تھا۔ 1938ء میں اس نے آسٹریا کو جرمنی میں مدغم کرنے کا قدم اٹھایا۔ آسٹریا میں کامیابی کے بعد اس نے سارے جرمنوں کو الگ ہی مملکت یا اسٹیٹ کے اندر لانے کے خواب کو سچ کر دکھانا چاہا۔ چیکوسلواکیہ کے شمالی حصہ میں جرمن آباد تھے اور یہ علاقہ سوڈیٹن لینڈ کے نام سے موسوم تھا۔ اس علاقے کی جرمن پارٹی نے جرمنی کی شہہ پر یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم Reach ریچ یعنی جرمن مملکت یا جرمن شہنشاہیت میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے بڑا سنگین بحران پیدا ہو گیا۔ جنگ کے خطرے کو ٹالنے کی غرض سے چیمبر لین سوڈیٹن لینڈ مسئلے کو حل کرنے کے لیے 28-29 ستمبر کو میونخ پہنچ گئے اور وہاں جو سمجھوتہ کیا وہ چیکوسلواکیہ کے ساتھ غداری اور دغابازی تھی اور ہٹلر کے سامنے سپر اندازی تھی۔ اس سمجھوتے سے جنگ تھوڑے عرصہ کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ 15/ مارچ 1939ء کو جرمن فوجیں چیکوسلواکیہ میں داخل ہو گئیں اور چیکوسلواکیہ کی حکومت نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ جمہوریت ختم ہو گئی۔

پھر انتہائی ہراس اور مایوسی کے عالم میں ہوائی، بحری اور اسلحہ بندی کا پروگرام شروع کر دیا گیا اور فوجی بھرتی لازمی کر دی گئی۔

اگست میں ڈانزگ میں بغاوت رونما ہوئی اور اسے جرمنی میں شامل کر دیا گیا۔ ہٹلر نے روس کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے اس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دئے اور اسٹالن نے بحر بالٹک کی مملکتوں کو اپنے یعنی روس کے دائرہ اثر میں رکھنے پر رضامندی ظاہر کی۔ خطرے کا بگل بجا دیا گیا۔ یکم ستمبر کو جرمن فوجوں نے پولینڈ کی سرحدوں کو پار کر لیا یعنی پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔

2- ہندوستان کا جنگ یا قومی تصادم کے بارے میں ردعمل

جنگ کے آغاز نے متحارب یا فریقین جنگ کے بارے میں کانگریس لیڈروں کے رویے کو تبدیل کیا۔ بلاشبہ ان کی ہمدردی برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے ساتھ تھی۔ وہ برطانیہ کے شکست کے خواہاں نہ تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ برطانوی جمہوری اداروں کے دلدادہ تھے۔ وہ برطانوی ثقافت، لٹریچر، فلسفہ، سائنس، طور طریقوں اور صنعت کے بہت زیادہ معترف تھے۔ وہ تالتیوں (نازیوں) اور فسطائیوں کو ترقی اور آزادی کا دشمن گردانتے تھے۔ مسولینی کا ابی سینا کو ہڑپ کر جانا، اسپین میں آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑنے والوں کے خلاف جنرل فرانکو کی بے دریغ اور حد درجہ کی بددیانت امداد، نسلی برتری کا غیر اخلاقی نظریہ، دنیا کو اپنے زیر نگیں یا زیر تسلط رکھنے کا تصور یا نوآبادیاتی نظام قائم کرنا مسلمہ بین الاقوامی تعلقات کے بنیادی اور اساسی اصولوں کی انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی سے خلاف ورزی کرنا اور ہٹلر اور مسولینی کا بین الاقوامی معاہدوں اور عہد و پیمان کی دھجیاں اڑانا، ہندوستانی ذہن اور دل و دماغ کے لیے انتہائی کریہہ اور ناقابل برداشت تھے۔

اگرچہ ہندوستانی برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے شدید حامی تھے لیکن وہ برطانوی مدبرین اور سائنس دانوں کے طرز عمل اور پالیسیوں سے سخت نالاں تھے۔ ان کے رویہ سے ان کے یعنی ہندستانیوں کے ذہن اور دماغ میں گہرے شک و شبہ جاں گزیں تھے۔ ان کے نزدیک یہ بڑے بے اصول اور کسی قسم کے فیصلہ نہ کرنے والے لوگ تھے جن کے دعووں، باتوں اور وعدوں پر ذرہ برابر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس بارے میں بھی انھیں بڑا شک تھا کہ وہ دوسرے ڈکٹیٹروں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر جنگ کے اعلان یا آغاز سے پہلے ان کا یہ رویہ ہندوستان کے بارے میں تھا۔ انھوں نے یعنی برطانوی مدبرین نے یا برطانوی سیاست دانوں نے ہندوستان کے ساتھ ہمیشہ حقارت کا برتاؤ کیا اور ہندوستانیوں پر

ہولناک مظالم کیے اور انھوں نے ہندوستانیوں کی آزادی کی خواہش اور تڑپ کی مخالفت کوتاہ نظری اور بے رحمی سے کی۔ ان کی مصیبتوں پر انتہائی بے اعتنائی اور بد دیانتی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی کانگریس سے شدید دشمنی اور ہندوستانیوں کے ساتھ۔ تفاخرانہ برتاؤ نے مل کر ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کے خلاف شدید برہمی اور ناراضگی اور شدید بدظنی پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو ہندوستانی، برطانوی عوام کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچانا چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ اس کے متمنی تھے کہ برطانوی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو۔

3 ستمبر 1939ء کو جنگ کے آغاز سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس نے حکومت کو جتادیا تھا کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں اس کا کیا رویہ ہوگا اور اس کی کیا پالیسی ہوگی۔ مثلاً اپریل 1936ء میں جواہر لال نہرو نے کانگریس کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج دنیا جنگ کی افواہوں اور خطروں سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے اس کا اعادہ کیا کہ ہندوستان سامراجی حملوں میں ایک مجہول آلہ کار نہ ہوگا۔ کانگریس نے جنگ کے خطرے کے بارے میں ایک تجویز پاس کی۔

ستمبر میں بروسلز امن کانفرنس میں کانگریس کی نمایندگی کرشنا مینن نے کی۔ انھوں نے امن کے لیے عہد کیا۔ جب اسپین میں فسطائی قوتوں نے اس کی جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کی تو کانگریسیوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور اس نے آزادی کے خلاف مطلق العنانی یا آمریت کی اس جنگ کی شدید مذمت کی۔ فیض پور کانگریس نے دسمبر میں ابی سینا پر اٹلی کے حملہ کے خلاف اور برطانیہ کے خلاف اینگلو جرمن بحری معاہدہ کے خلاف جس کی وجہ سے فرانس کو مجبور ہو کر فسطائی اٹلی سے دوستی کرنی پڑی بڑے غم اور غصہ کا اظہار کیا اور برطانوی حکومت کی خارجہ پالیسی کی مذمت کی جس نے ڈکٹیٹروں کی پوری حمایت کی تھی۔

اس کے بعد 1937ء میں جب ہندوستانی حکومت نے چین میں فوجیں بھیجیں تو کانگریس نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ یہ قدم ہندوستان کی مرضی کے خلاف اٹھایا گیا تھا۔ اس نے جاپان کی اس کے چین کے علاقوں پر حملہ کرنے پر سخت ملامت کی۔ حکومت کو بتایا گیا کہ کانگریس ہندوستانی ذرائع اور قومی خدمات دینے کے قابل ہندوستانیوں کے استحصال کو سامراجی اغراض کے لیے ہرگز برداشت نہیں کرسکتی اور یہ کہ وہ ملک کو اس قسم کی کوششوں میں لگانے کی پوری اور پرزور مخالفت کرے گی اور اس کی پوری مزاحمت کرے گی۔

ہری پورہ کانگریس میں سبھاش چندر بوس صدر نے برطانیہ کے بہت سے ملکوں میں دخل دینے یعنی آئرلینڈ، مصر، عراق اور خود برطانوی شہنشاہیت کے اندرونی مسئلوں اور اس کے باہر جرمنی، اٹلی اور جاپان کا حوالہ دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر اس پر ختم کی اس عظیم شہنشاہیت کے مٹی کے پیر اب ظاہر ہوگئے ہیں جو کبھی ظاہر نہ ہوئے تھے۔ یعنی یہ کہ یہ شہنشاہیت بالکل کمزور ہوچکی ہے۔ جون اور جولائی 1938ء میں جواہرلال نہرو، مصر، اسپین، فرانس اور انگلستان کے دورے پر گئے اور وہاں سے واپسی پر انھوں نے ملک کو متنبہ کیا کہ اب جنگ بہت قریب ہے۔

ہری پورہ کانگریس میں مارچ 39ء میں ہندوستان کی برطانوی پالیسی سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جنگ کو ہندوستان پر تھوپنے کی مزاحمت کرنے کا تہیہ کیا اور صوبہ جاتی حکومتوں کو مرکز کی ڈکٹیٹرشپ قبول نہ کرنے کی صلاح دی۔ 2/اپریل کو کانگریس نے جنگ مخالف دن منایا۔

9/اگست کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جنگ کی صورتحال پر اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیا۔ اس نے ان تمام لوگوں کو جو جمہوریت اور آزادی کے حامی تھے اپنی پوری پوری تائید اور حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے فسطائی حکمرانوں کی شدید مذمت کی اور

سامراجی اعتراض اور مقاصد کے لیے ہندوستان کا استحصال کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کانگریسی وزیروں کو یہ ہدایت کی وہ جنگ کی تیاریوں میں کسی قسم کی کوئی مدد نہ کریں۔

جنگ کے شروع ہوجانے سے اپنے مستقبل کے بارے میں ہندوستان کی تشویش اور زیادہ شدید ہوگئی۔ اس وجہ سے کہ وہ اس بارے جلد فیصلہ کا متوقع تھا۔ جیسے جیسے جنگ بڑھتی گئی اس کی تشویش میں اضافہ ہوتا گیا اور جیسے جیسے جنگ کی صورتحال بڑھتی گئی کانگریس کے مطالبے نے قطعیت کی صورت اختیار کی۔ اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ مختصراً جنگ کی رفتار کو ذہن میں رکھا جائے۔

3-جنگ کی رفتار

جنگ جس کا آغاز ہٹلر نے یکم ستمبر 1939ء کو پولینڈ پر حملہ کر کے کیا تھا جو پورے چھ سال جاری رہی۔ اس کی رفتار کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے مرحلے میں ستمبر 1939ء سے 19/ اپریل 1940ء تک پولینڈ پر جرمنی کے حملے سے لے کر ناروے اور ڈنمارک کے 19/ اپریل 1940ء تک کے جرمن حملے شامل ہیں۔ 19/ اپریل 40ء سے دسمبر 42ء تک کے دوران جنگ نے زبردست زور پکڑا اور اس مدت میں بڑی تیزی سے دنیا کو چونکا دینے والے مندرجہ ذیل واقعات رونما ہوئے۔

(1) اسکینڈے نیویا جنگ (اپریل 1940ء میں)
(2) نیدرلینڈ کی جنگ 10/ مئی 40 سے لیکر 28/ مئی 1940ء تک
(3) فرانس کی جنگ 5/ جون 1940ء سے 25/ جون 1940ء تک
(4) 10/ جولائی 1940ء سے 17/ ستمبر 1940ء تک برطانیہ سے جنگ

(5) اٹلانٹک کی جنگ ستمبر 1939ء سے دسمبر 42ء تک اور 1941ء سے روس کے خلاف جنگ کا آغاز

جنگ کا تیسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب 1942ء کے بعد جنگ کا پانسہ مغربی محاذ پر پلٹنے لگا اور جرمن جنگی مشینری اٹلانٹک کی جنگ میں امریکی اور برطانوی جنگی اقدامات کی برتری کی وجہ سے زیر ہونے لگی۔ روس کی جنگ پہلے تو ایک سی رہی یعنی کسی قسم کی مزید پیش قدمی نہیں ہوئی اس کے بعد جرمن فوجوں کی پسپائی شروع ہونے لگی اور جرمن ہتھیاروں کی تباہی اور بربادی شروع ہوگئی۔ دسمبر 1942ء سے 9/ مارچ 1945ء تک شمالی افریقہ میں اٹلی میں جرمن کی پیش قدمی کی 13/ مئی 1943ء تک ہزیمت ہوئی اور پیش قدمی رک گئی۔

بحرالکاہل Pacific Ocean یا کی جنگ جو جاپان نے دسمبر 1941ء کو شاندار فتوحات سے شروع کی تھی اوائل 1944ء سے ہی جاپان کے خلاف ہوگئی اور 2/ ستمبر 1945ء کو ختم ہوئی۔ جب علی الترتیب 9/ اگست 1945ء اور 19/ اگست 1945ء کو ہیروشیما اور ناگاساکی ایٹم بم کا نشانہ بنے اور جاپان نے بلاشرط ہتھیار ڈالنے والے دستاویز پر دستخط کر دیے۔

4-حکومت کی کانگریس کو کچلنے کی تیاریاں

وائسرائے اور وزیر ہند اس پر پہلے ہی سے غور کر رہے تھے کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں ان کا کیا رویہ رہے گا، لن لتھ گو نے تجویز پیش کی کہ فیڈریشن کے قیام کو ملتوی کر دیا جائے اور اس کی آڑ لے کر فوری دستوری تبدیلی کرنے سے انکار کیا جائے۔ مرکز کو اپنے اس فیصلہ سے بڑی تقویت پہونچی کہ بمبئی کے گورنر نے انھیں یقین دلایا کہ کانگریسی وزراء اپنے عہدوں پر برقرار رہنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی یقین

دہانی مدراس کے گورنر نے بھی کرائی تھی کیونکہ وزیروں کو اس کی توقع تھی کہ وائسرائے گاندھی جی سے ملاقات کریں گے اور ان کی حمایت جنگ کے بارے میں حاصل کرلیں گے۔

جنگ چھڑ گئی اور زیٹلینڈ نے دار الامرا میں اور لن لتھ گو نے دہلی میں بیانات دئے۔ وائسرائے نے اعلان کیا کہ بڑی شدید قسم کی ناگہانی صورتحال یا ایمرجنسی پیدا ہوگئی ہے جس سے ملک سلامتی کو زبردست ترین خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ دشمن قوموں سے تجارت کرنا جرم قرار دیا گیا اور ملک کی عام سلامتی اور تحفظ کے لیے آرڈی نینس نافذ کیے گئے۔

5/ستمبر کو گاندھی جی وائسرائے کی دعوت پر ان سے ملے۔ انھوں نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ کانگریس کی طرف سے کسی قسم کا وعدہ نہیں کرسکتے لیکن عدم تشدد اور اہنسا کے پجاری ہونے کی حیثیت سے وہ ہٹلر کے خلاف اس کے پولینڈ پر حملہ کرنے کی مذمت کرتے ہیں۔ دراصل وہ ہٹلر کو پہلے ہی خط لکھ چکے تھے جس میں انھوں نے انھیں (ہٹلر کو) تشدد پر عامل نہ ہونے اور جنگ شروع کرنے سے روکنے کی ترغیب دی تھی۔

گاندھی جی کی وائسرائے سے ملاقات کے ایک دن پہلے ہندوستان کو متحارب ملک قرار دیا جاچکا تھا اور اگرچہ وزیر ہند و وائسرائے کو بتا چکے تھے کہ صوبہ جاتی حکومتیں حکومت ہند کی ذمہ داریوں اور مشکلات میں برابر کی ساجھی دار ہیں لیکن نہ تو ان سے کسی قسم کا مشورہ کیا گیا نہ کانگریس ہائی کمانڈ سے۔

حکومت کو کانگریس نے پہلے ہی جتا دیا تھا کہ اگر ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ میں متحارب ملک قرار دیا گیا تو اسے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حکومت نے کانگریس کے اس جتانے کے بعد اپنے کو پہلے سے تیار کرلیا۔ گورنر جنرل

نے صوبائی گورنروں کو اس صورت حال کے بارے میں کہ جب وزیر مستعفی ہو جائیں گے اور صوبہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ کا نفاذ ہوگا، خط لکھے۔ ان سے 1908ء کے ترمیم شدہ فوجداری ایکٹ کے تحت تنظیموں مثلاً صوبہ جاتی کانگریس کمیٹیوں کو خلاف قانون قرار دیئے جانے اور کسی بھی تحریک کے خلاف برق رفتاری کے ساتھ اختیار کیے جانے والے مؤثر اقدامات، جنگ کے خلاف توڑ پھوڑ کی سرگرمیوں کا قلع قمع کرنے اور پولیس میں خاص قسم کے اضافہ کے بارے میں ان سے رائے اور خیالات پیش کرنے کو کہا گیا۔ ایک دوسرے مراسلہ میں حکومت ہند نے گورنروں کو ہدایت کی وہ سب تیاریاں مکمل کرلیں جو مساعی جنگ کے خلاف، کسی بھی تنظیم اور کسی بھی تحریک کے خلاف ضروری ہوں۔ متعدد سرکاری مراسلوں میں اس پر بھی غور کیا گیا کہ اگر کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی تو اس کے خلاف کس قسم کے اقدامات کیے جائیں۔ ان میں یہ تجویز کیا گیا کہ اس صورتحال میں انقلابی تحریکوں کے خلاف آرڈی نینس اور فوجداری ترمیمی ایکٹ کے تحت اقدامات کیے جائیں۔ 2 راگست 1940ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت داخلہ نے صوبہ جات متحدہ حکومت کے چیف سکریٹری کو طویل مراسلت میں یہ لکھا کہ وہ ایسے حالات پیدا ہی نہ ہونے دیں جن سے مساعی جنگ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ پڑ سکے۔ اس کے بعد ایک انتہائی خفیہ خط بھیجا گیا جس میں یہ خاص طور سے لکھا گیا تھا کہ اصل صورتحال یہ ہے اور کانگریس سے تصادم ہونا بالکل حتمی ہے اور ایک ایسا مرحلہ پیش آنے والا ہے جس میں جنگ کا اعلان کیے بغیر حکومت کی طرف سے بڑا ہی دانشمندانہ قدم ہوگا کہ وہ خود کانگریس پر حملہ کرے۔

چنانچہ کانگریس کے خلاف جنگی پیمانے پر ساری تیاریاں ایک برق رفتار جنگ کی طرح ممکنہ وسائل اور ذرائع کے ساتھ مکمل کرلی گئیں۔ اس کے ساتھ متعدد اور مختلف

صورتیں بھی اس تصادم کو ٹالنے کے لیے سوچی گئیں۔ دلیلیں، استدلال، اپیل، اور ایسے مطالبات کو تسلیم کرنا جن کا سیاسی اقتدار کی منتقلی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ خفیہ ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر اور اپنے اندازے کی بنا پر جنگ کی بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق حکومت اس پر رضامند ہوگئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو کچھ معمولی رعایتیں دے دی جائیں۔

رعایتوں کی اس پالیسی کا اعلان شملہ سے 18 ر اکتوبر 1939ء کو کیا گیا۔ اس میں دعویٰ کیا گیا کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں توسیع کی جائے گی۔ (2) ایک وار کونسل یا جنگی کونسل قائم کی جائے گی جو حکومت کو صلاح مشورے دے گی (3) ایک ایسی جماعت مقرر کی جائے گی جو جنگ کے خاتمہ کے بعد کانسٹی ٹیوشن یا دستور کا ڈھانچہ تیار کرے گی۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کانگریس کو یہ پیش کش منظور نہیں ہوئی، وائسرائے نے 17 ر اکتوبر 1939ء کو یہ مزید اعلان کیا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستانی جماعتوں کے نمائندوں کے مشورہ سے گورنمنٹ آف انڈیا 1935ء کے ایکٹ پر نظر ثانی کرے گی۔

یہ رعایتیں فیاضانہ اسپرٹ میں نہیں بلکہ بخل کی اسپرٹ پر مبنی تھیں۔ اس لیے مسٹر ڈیجوڈین اور مسٹر سیموئل ہوا کو دار العوام اور دار الامرا میں انھیں ریزہ ریزہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

عام توقعات کے مطابق کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی تجویزیں اس کے بارے میں مختلف تھیں۔ لن لتھ گو نے گفت وشنید کرنے کی تازہ کوشش کی۔ شروع میں تو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے اس تجویز یعنی (1) صوبہ جاتی حکومت اور وزارتوں کی از سر نو تشکیل کی جائے اور مرکزی حکومت کی انتظامیہ کمیٹی یعنی وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں شمولیت کو منظور کرنے کے لیے کہا۔ لیکن یہی

مذاکرات اس لیے ناکام رہے کہ کانگریس نے اس پر اصرار کیا کہ حکومت اس کی اس تجویز کو قبول کرلے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ہندوستان کی منتخبہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی بنائے گی۔

وزیر ہند کانگریس کے انکار سے بالکل مطمئن نہ ہوئے۔ 7/دسمبر 1939ء کو انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت کا اس لیے کانگریس کا مطالبہ قبول کرنا ممکن نہیں کہ حکومت نہ تو اپنی ذمہ داریوں کو ترک کرسکتی ہے اور نہ انھیں نظرانداز کرسکتی ہے۔ 14/ دسمبر کو انھوں نے زور دے کر کہا کہ کوئی بھی دستور کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں چل سکتا اگر وہ اقلیتوں مرضی کے مطابق نہ ہو۔

اس کے بعد انھوں نے وہ وجہیں بیان کیں جن کی وجہ سے حکومت مسلمانوں کو اقلیت نہیں سمجھتی۔

لِن لتھ گو نے ہندوستانی پارٹیوں کو حکومت سے تعاون کرنے کی پھر سے ترغیب دینے کی کوشش کی اور اس غرض سے انھوں نے 13/جنوری 1940ء کو اوریئنٹ کلب ممبئی میں تقریر کی جس سے گاندھی جی اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ اسے سمجھوتے کا امکان قرار دیا۔ مسٹر جناح بھی 13 جنوری 1940ء کو وائسرائے سے ملے اور انھوں نے اس نئے منصوبے کو اس صورت میں منظور کیا کہ ان کی معلوم اور معروف شرطوں کو مان لیا جائے۔

گاندھی جی وائسرائے سے 3/فروری کو ملے لیکن انھوں نے جناح کی شرطوں کو منظور کرنے سے انکار کردیا اور اس طرح سے سمجھوتہ کی یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

5-حکومت کی مسلم لیگ کو یقین دہانیاں

جب سے کانگریس وزارتوں نے عہدے سنبھالے مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی قیادت میں کانگریس کو اپنا دشمن ٹھہرانا شروع کیا۔ مسٹر جناح نے اپنی ساری کوشش اور

توانائی کانگریس کو بدنام کرنے اور اسے شکست دینے پر صرف کی۔ 1938ء میں محمد مہدی آف میرپور کی صدارت میں کانگریسی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی شکایتوں کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ 1939ء کے آخر میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ کانگریس عہد حکومت کے خلاف الزام تراشیوں کا عجیب وغریب پلندہ تھی۔ اس میں کانگریسی حکومتوں پر مسلمانوں کے خلاف برابرتاؤ کرنے، بے انصافی کرنے اور ظلم کرنے کے الزام لگائے گئے تھے۔ ہیری ہیگ یوپی کے ریٹائرڈ گورنر نے اپنے مضمون (سچائی یہ ہے) میں لکھا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلوں کے بارے میں وزرا نے عام طور سے غیر جانبدارانہ طور سے کام لیا ہے اور وہ کرنے کی کوشش کی جو انصاف پر مبنی تھا۔ ان کے یعنی کانگریس وزارتوں کے مستعفی ہونے یا ان کے عہدے کی مدت ختم ہونے کی قریب ہندو مہا سبھا ان کی اس وجہ سے مذمت کرتی تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیتی تھیں۔

اس قسم کی رائے کا اظہار مدراس کے گورنر ارسکن نے بھی کیا۔ جب لن لتھ گو سے کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کی شکایتوں کی جانچ کرنے کے لیے ایک سرکاری کمیشن چیف جسٹس آف فیڈرل کورٹ کی صدارت میں مقرر کریں تو انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ان کو کسی گورنر کی طرف سے ایسی کوئی رپورٹ نہیں موصول ہوئی۔

اس بارے میں انھوں نے وزیر ہند کو لکھا تھا:

''میرا اپنا بھی یہی تاثر ہے کہ کسی خاص صوبے میں کچھ متعین ثبوت مل جائیں گے لیکن جناح کے لیے کانگریس حکومتوں کے مسلم مخالف کاموں اور پالیسیوں کو ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں احساس کمتری کے جذبے اور کانگریسی صوبوں کے ہندوؤں میں احساس برتری کے جذبے کی وجہ سے نفسیاتی مسئلہ پیدا ہوا ہے جس کا پورے طور پر اعتراف کرنا چاہیے۔

1938ء سے 1940ء تک سی۔ پی کے گورنر فرانس وائیلی نے اپنے ایک مقالہ میں یہ تحریر کیا کہ کانگریس وزارتوں کے خلاف سخت مسلم مخالف ہونے کا الزام محض خیالی تھا۔ یوپی وزارت 39-1937ء کی تشکیل کے تجربے سے مسلم لیگ کو سخت دھچکہ لگا۔1935ء سے مسٹر جناح نے اس کی بڑی کوشش کی کہ مسلم لیگ جہاں تک ممکن ہو کانگریس کی ہمنوا رہے لیکن جب کانگریس لیڈروں نے ان کے ان اقدامات کو رد کر دیا تو ان میں زبردست جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ گورنر جسے مسلمان اپنے حقوق کا محافظ سمجھے تھے ناقابل اعتبار نکلا۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہوا کہ حکومت یا اقتدار میں ساجھے داری یا حصہ ملنا تمام تر اکثریت یا ہندوؤں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس لیے مسلم لیگ کو ایک ایسا حل نکالنا چاہئے کہ اسے اس قسم کی ذلت آمیز یا اہانت آمیز صورت سے نجات ملے۔

یہ مسئلہ کہ یہ شکایتیں صحیح تھیں یا غلط یا مبالغہ آمیز قطعی غیر متعلق ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم ذہن کو کانگریس اور ہندو سماج کے خلاف بڑے ثابت قدم انداز سے مسموم کیا جاتا رہا اور ان میں علیٰحدگی پسندی کے جذبات کو بڑی تیزی سے تقویت پہونچائی گئی۔

ایک زمانہ تھا کہ 1933ء میں مسٹر جناح اور دوسرے مسلم لیڈروں نے پاکستان کے تصور کا مذاق اڑایا تھا۔1938ء میں کراچی میں صوبائی مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی صدارت میں درج ذیل تجویز پر غور کیا:

'سندھ مسلم لیگ کانفرنس ہندوستان کے برصغیر میں دائمی امن وامان قائم رکھنے اور بلا کسی روک ٹوک کے تمدنی اور ثقافتی ترقی کی خاطر معاشی اور سماجی بہتری اور دونوں قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے احساس حق خود ارادیت کے لیے اسے ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان تقسیم کر دیا جائے۔ ایک مسلم ریاستوں فیڈریشن اور

دوسرا غیر مسلم ریاستوں کا فیڈریشن، مگر یہ ریزولوشن واپس لے لیا گیا۔ اس معاملہ میں حکومت کی کیا پالیسی رہی، اس کی وضاحت مسٹر جناح اور لن لتھ گو کے مابین خط وکتابت سے ہوئی۔ جناح نے اپنے خط مورخہ 5/ نومبر 1939ء میں ان سے مطالبہ کیا کہ وہ مندرجہ ذیل باتوں کا جواب دیں:

''یہ کہ کوئی اعلان اصولی اعتبار یا کسی اور حیثیت سے نہ کیا جائے گا اور کوئی بھی دستور ہز میجسٹی یا ملک معظم کی طرف سے یا پارلیمنٹ سے بغیر ہندوستان کی دو اہم ملتوں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کی منظوری اور مرضی کے بغیر پاس نہ کیا جائے گا۔'' لن لتھ گو نے جواب 3/ دسمبر 1939ء میں دیا: ''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہز میجسٹی یا ملک معظم کی حکومت کو ہندوستان کی دستوری ترقی کے استحکام اور کامیابی کے بارے میں مسلمانوں کے اطمینان کی اہمیت کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے اس لیے آپ کو اس بارے میں کسی قسم کا کوئی بھی اندیشہ یا خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی ملت کی ہندوستان میں جو پوزیشن ہے اس کے مدنظر آپ کے خیالات کے وزن کو پوری طرح ذہن میں رکھا جائے گا۔''

وائسرائے کے اس اعلان سے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی مطمئن نہ ہوئی اور مسٹر جناح نے وائسرائے سے مزید وضاحتیں طلب کیں۔ وائسرائے نے انھیں ممنون کیا اور اپنے 19/ اپریل 1940ء کے جواب میں وزیر ہند کی 18/ اپریل کی تقریر کو پیش کیا جس میں انھوں نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ ''ملک معظم کی حکومت نے دستور کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہندوستان کی تمام پارٹیوں اور مفادات سے مشورہ کرنے کا جو وعدہ کا تھا اس کا مطلب گفت وشنید سے ہے نہ کہ کسی قسم کے کسی آمرانہ حکم سے۔ میں کبھی باور نہیں کرسکتا کہ اس ملک کی کوئی بھی حکومت یا پارلیمنٹ طاقت یا قوت کے بل پر کوئی دستور کسی قسم کا بھی ملک معظم کے ہندوستان میں آٹھ کروڑ

مسلمان رعایا پر مسلط کرے گی جس کے تحت وہ امن وچین اور اطمینان سے نہیں رہ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بیان سے آپ کے سارے شکوک اور شبہات دور ہو جائیں گے۔''

اس سلسلہ میں خلیق الزماں نے 25/مارچ 1939ء کو انگلینڈ سے اپنے ذاتی انٹرویو کا حال مسٹر جناح کو لکھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دوران گفتگو میں زیٹلینڈ نے ان سے پوچھا 1935ء کے ایکٹ اور فیڈرل یونین کا متبادل کیا ہے۔ خلیق الزماں، جو رحمت علی سے مل چکے تھے اور پاکستان کے منصوبے اور تصور کے بارے میں ان سے تفصیلی گفتگو کر چکے تھے اور خود ارادیت کے حق کو جس کی بنیاد پر یہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا، نے فوراً جواب دیا کہ آپ مسلم علاقوں کو بقیہ ہندوستان سے تقسیم کر سکتے ہیں یعنی الگ کر سکتے ہیں اور اپنی فیڈریشن کی اسکیم کو ہندوستانی صوبوں اور مسلم علاقوں کے جو باقی ماندہ ہندوستان سے آزاد ہوں، نافذ کر سکتے ہیں۔ خلیق الزماں کا تصور تھا کہ وہ زیٹلینڈ اور ان کے نائب اس مطالبے کی زیادہ مخالفت نہیں کریں گے۔ یہ تاثر بے جا اور بے اصل نہ تھا۔ زیٹلینڈ کا ذہن مسلم علیحدگی پسندی کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں یعنی 1917ء سے 1922ء تک جب وہ بنگال کے گورنر تھے، وہ اپنے تجربوں کی روشنی میں اس نتیجے پر پہونچنے سے باز نہ رہ سکے کہ آئندہ دستور کی شکل کو متعین کرنے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا رول مؤثر رہے گا۔

دسمبر 1938ء میں انھوں نے لن لتھ گو کو لکھا تھا کہ ایک چیز یقینی ہے کہ مسلمان اس عزم کے تحت متحد ہو رہے ہیں کہ ہندوؤں کے تسلط میں رہنے والی مرکزی حکومت جو معرض وجود میں آئے گی کی مخالفت کریں گے۔ جناح نے بمبئی میں خلیق الزماں سے سب تفصیل سن کر انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کی تجویز کے کسی طرح بھی مخالف نہیں

ہیں۔ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے۔

یہ خیال کر کے یہ یقین دہانیاں ناکافی ہیں زیٹلینڈ نے دو تقریریں دارالامرا میں کیں۔22 رنومبر کو انھوں نے برطانوی حکومت کو اس تجویز کا خاکہ پیش کیا کہ جس سے فرقہ وارانہ اختلافات کو حل کیا جانا تھا۔اس نے یعنی اس تقریر نے صورتحال کو اور بگاڑ دیا کیونکہ اس تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'بلا شبہ ان حالات میں دانش مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ پہلے دو اہم ملتوں کے نمائندوں یعنی، ہندوؤں کی نمائندگی کرنے کے لیے کانگریس کو اور مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والوں کے لیے مسلم لیگ کے لیڈروں کو ایک غیر جانبدار فریق کی طرح کھل کر اختلافات پر غور وخوض کرنا چاہئے کہ کیا ان کا حل نہیں تلاش کیا جاسکتا۔، اپنی تقریر کے ایک فقرے میں انھوں نے 3 زبردست غلطیاں کیں:

(1) کانگریس کو فرقہ وارانہ ہندو جماعت قرار دیا۔

(2) جناح کے اس نظریہ کو تسلیم کرلیا کہ صرف مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

(3) دونوں ملتوں کو مساوی درجہ دیا اور ایک غیر جانب دار کو ان کے مابین ثالث کے فرائض ادا کرنے کے لیے کہا۔ظاہر ہے کہ یہ غیر جانبدار سوائے برطانوی حکومت کے نامزد کردہ شخص کے اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ظاہر ہے کہ زٹلینڈ ثالثی پوری طور سے برطانیہ کے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد 14 ردسمبر کو دارالامرا میں انھوں نے یہ بیان دیا: ''جب ہم مسلمانوں کا ذکر بطور اقلیت کے کرتے ہیں تو یہ اعداد کی بنیاد پر ہوتی ہے کہ مسلمان تعداد میں ہندوؤں سے کم ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ 90 ملین تک کی ایک ملت ہیں اور ان کا اپنا ماضی ہے اور ان کی نسلوں کی یادیں ہیں۔ دو صدیوں تک مغلیہ

خاندان نے برصغیر ہندوستان کے بڑے حصہ پر حکومت کی۔ ان کے پاس فوجی کارناموں اور خدمتوں کی روایتیں ہیں جو اس وقت تک زندہ ہیں۔ اس کی مثال اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی فوج میں ان کا بڑا تناسب ہے۔"

ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنا حد درجہ احمقانہ تھا جیسا کہ The Heart of Aryavarata کے مصنف نے اس حد درجہ مہمل بیان کے ساتھ یہ مضحکہ خیر بات بھی کہی: "یہ واقعہ بھی اپنی جگہ پر ہے کہ صوبائی مجالس قانون ساز کے ایوان زیریں کے 482 ممبران میں جو پچھلے تمام انتخابات میں منتخب ہوئے تھے صرف 26 مسلمان کانگریس کے ٹکٹ پر جیتے۔" یہ اعداد شمار پیش کرنے سے اس کا خاص مقصد دارالامرا کے بے خبر اور ناواقف ممبروں کو دھوکہ دینا تھا۔ کیونکہ امر واقعہ یہ تھا کہ 482 ممبران میں سے 109 ممبر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ زیٹلینڈ کا ذہن 1906ء سے آگے نہیں بڑھا جب کہ مسلمانوں نے اپنے مطالبے کی تائید میں اس قسم کے دلائل پیش کیے تھے۔ سرکاری تحریروں اور تقریروں سے قدرتاً مسلم لیگ کے ترجمان اس نتیجہ پر پہونچے کہ انھیں جملہ دستوری تجویزوں کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔ اس لیے بالکل عین فطرت انسانی کے مطابق مایوس، انانیت پسند، طیش اور غصے کے شکار مسٹر جناح نے اسے بہت زیادہ استعمال کیا۔

زیٹلینڈ اور لن لتھ گو کی تقریروں سے مسٹر جناح کے اس یقین کو اور تقویت پہنچی کہ ان کا جو بھی مطالبہ ہوگا یا جس قسم کی آتش بار تقریریں وہ کانگریس کے خلاف کریں گے ان کی حکومت پوری پوری تائید کرے گی۔ 22ر دسمبر کو مسلم لیگ یوم نجات اور یوم شکر گذاری منانے والی تھی۔ انھوں نے یعنی مسٹر جناح نے بے ہمت گورنر جنرل سے اپنی دھمکیوں اور چاپلوسیوں سے مزید یقین دہانیاں اور تقویت حاصل کرلی۔ انھوں نے عالمی جنگ میں مسلمانوں کے تعاون کا پختہ وعدہ حکومت سے کیا۔ پہلے ہی حکومت

فوجی بھرتی میں مسلمانوں کو ترجیح دیتی تھی۔ لن لتھ گو سے اپنی ملاقات میں اپنے منصوبوں اور مقاصد میں انھوں نے یعنی جناح نے حکومت کی حمایت حاصل کر لی اور انھوں نے حکومت کے اس ارادے کو مزید تقویت پہونچائی کہ وہ کانگریس کے اس مطالبہ کہ ہندوستان کا دستور مرتب کرنے کے لیے ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی بنائی جائے کے آگے نہ جھکیں گے۔ انھوں نے یہ تجویز کیا کہ دستور سازی کے معاملہ میں برطانیہ کو نہ کہ ہندوؤں کو حتمی حق حاصل ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں پر عدم اعتماد اور پردیسی وغیر ملکی حکمرانوں پر انحصار کیا۔ یہ بہت زیادہ قابل مذمت تھا اور اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ برطانوی یقین دہانیوں اور دعووں سے مسلح ہو کر مسٹر جناح نے لن لتھ گو سے 13/فروری 1940ء کو ملاقات کے دوران ان شرطوں کو دوہرایا جن کے تحت وہ جنگ کے دوران حکومت کی طرف سے نظم ونسق میں کیے گئے انتظامات، جنگ کے بعد دستور پر نظر ثانی پر اتفاق کریں گے۔ ان کی اہم ترین شرط یہ تھی کہ کسی قسم کے دستوری انتظامات خواہ وہ عارضی ہوں خواہ مستقل قابل قبول نہ ہوں گے جسے مسلم لیگ نے نامنظور کیا ہو۔

کانگریس کے رام گڑھ اجلاس نے اس بات کا اشارہ دیا کہ کانگریس کی طرف سے ایکشن ہوگا اور اس پر غور کرنے کے بعد مسلم لیگ کی کانگریس کے خلاف دشمنی اور عداوت اور بڑھ گئی اور ساتھ ہی ساتھ کانگریس کا خوف بھی اس پر مسلط ہو گیا۔ اس لیے جب مسلم لیگ کا اجلاس 22/مارچ 1940ء کو لاہور میں منعقد ہوا تو اس کو آخری فایر نے کا موقع مل گیا۔ مسٹر جناح نے جو اس اجلاس کے صدر تھے، کانگریس اور گاندھی جی کے خلاف سب شکایتیں بیان کیں اور اعلان کیا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا ہندوستان کے دستور کا مرتب کرنا بالکل غیر عملی ہے اور مسلم لیگ کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے بعد لیگ نے 24/مارچ کو مشہور پاکستان ریزولوشن

(Pakistan Resolution) پر غور کیا اور اسے اسی شکل میں پاس کیا۔" مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ کوئی بھی دستوری منصوبہ ملک کے لیے قابل عمل نہ ہوگا اور نہ مسلم لیگ کے لیے قابل قبول جو مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو یعنی جغرافیائی اعتبار سے ملے ہوئے علاقوں کی حد بندی ایسے خطوں میں ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہوں جیسے کہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی خطے میں ہیں۔ وہاں گروپ بندی کی جائے اور انھیں آزاد مملکتوں کی حیثیت حاصل ہو اور ان کی وحدتیں خودمختار ہوں اور اقتدار اعلیٰ کی مالک ہوں۔ اور یہ کہ دستور میں اقلیتوں کے لیے وحدتوں اور خطوں میں مناسب، مؤثر اور واجب التعمیل ابتدائی تحفظات ان کے مذہب، تمدن، معاشی، سیاسی، انتظامی ترقی کے لیے رکھے جائیں اور ان کے مشورے سے ان کے حقوق اور مفاد کے بارے میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور دوسری اقلیتوں کے بارے میں خاص طور سے واجب التعمیل تحفظات رکھے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور انتظامی حقوق کا تحفظ ہو اور ان کے مشورے سے ان کے اور دوسروں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو۔ مسلم اکثریتی علاقوں کے لیے خودمختاری بلکہ اقتدار اعلیٰ کے دعوت کی مذمت اس بنا پر نہیں کی جاسکتی کہ یہ مطالبہ نامعقول ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے قومیت کا مطالبہ درست تھا لیکن کیا کسی قومیت کی آرزوئیں، امنگیں اور توقعات ایک بڑی سیاسی فیڈرل یونین میں پوری ہوسکتی ہیں یا نہیں یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔"

زیادہ صحیح اور منطقی نکتہ چینی یہ ہے کہ آیا جس پاکستان کا لاہور ریزولوشن بقدر پیش کیا گیا ہے وہ زیادہ دیرپا اور پائیدار رہے گا یا قابل قبول ہوگا۔ سب سے زیادہ غلط اور مضحکہ خیز دعویٰ یا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان کے سارے مسلمان باشندے پشاور

سے لے کر کنیا کماری یا کچھ سے لے کر چٹا گانگ تک ایک قوم تھے اور دوسرے سارے غیر مسلم جو اس تحتی براعظم میں رہتے تھے ایک دوسری قوم تھے۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ صرف مسلمان ہی خیالی دنیا میں نہیں رہتے تھے جبکہ انگریز جو ایک قومی سوسائٹی میں رہتے تھے اور جنھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ قومیت کیا ہے اس مہمل تصور سے متفق تھے۔ لیکن اس معاملے میں مقدر سے زیادہ خوش فہمی یا آرزوؤں یا جذباتیت کو زیادہ دخل تھا۔ کانگریس لیڈروں کے نزدیک ہندوستان کا اتحاد بالکل بدیہی اور قدرتی تھا۔ اس کے تصور سے انکار کرنا گویا کشش ثقل کے قانون کو صحیح ماننے سے انکار کرنے کے مترادف تھا۔ گاندھی جی کو اس سے اتنا صدمہ پہونچا کہ انھوں نے تقسیم کو زندہ چیر پھاڑ سے تعبیر کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان ایک زندہ وجود تھا اور ناقابل تقسیم تھا۔ جواہر لال نہرو نے اس تصور کو احمقانہ قرار دیا اور اسے صرف 24 گھنٹے کی زندگی دی یعنی یہ کہ 24 گھنٹے کے اندر ختم ہو جائے گا۔ راجندر پرشاد نے پاکستان کے تصور کے ناقابل عمل ہونے پر ایک بڑی کتاب لکھ ڈالی۔

لیکن اس بارے میں ان کی رائے غلط تھی لیکن وہ اس نظریے کو مسترد کر دینے یا نامنظور کرنے کے بارے میں بالکل حق بجانب تھے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اس تصور کی تائید نہ تاریخ سے ہوتی ہے نہ سیاست سے اور نہ سماجی فلسفے سے۔ مسلم مملکتیں مثلاً بنو امیہ اور سلطنت بنو عباس قومی مملکتیں نہ تھیں، اسی طرح نہ ترکی، ایران اور ہندوستان۔ قرون وسطیٰ کی عثمانی، مغلیہ سلطنتیں قومی مملکتیں تھیں۔ اقبال کے خیال میں اسلام اور قومیت ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ موجودہ مسلم قومی مملکتیں مثلاً ترکی، مصر، لبنان، الجزائر اور دوسری مسلم مملکتیں مذہب اسلام یا شریعت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی ہیں۔ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر چلتی ہیں۔ ان میں سے تینوں کی شہریت کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی ہے۔ ان کی ساری رعایا کو تعبیر، تحقیق، تفریق

مذہب میں مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ بلاتفریق مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں۔ یہ سب شریعت کے خلاف ہے جس نے کسی ملک کے رہنے والوں یا باشندوں کو 3 طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) مسلمان یا مومنین

(2) ذمی یعنی جن کے مال اور جان کی حفاظت مسلم حکومت کی ذمہ داری ہے۔

(3) کافر یا خدا پر ایمان نہ لانے والے۔

موجودہ مسلم مملکتیں اپنے کو اس مشترک مسلم قومیت میں مدغم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ بظاہر مسلم لیگ نے 16 / مارچ 1940ء کو پاکستان کا مطالبہ کرنے کے بعد اس کے بارے میں خدشات اور مضمرات پر غور کرنا شروع کیا۔ اپریل 1941ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں مسٹر جناح نے پاکستان کے تصور کی وضاحت ان الفاظ میں کی: "ہم ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی خطوں میں مکمل آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کا مالیات، دفاع، امور خارجہ، باہری ملکوں سے تجارت، مواصلات، کسٹم، کرنسی، ایکسچینج وغیرہ پر پورا کنٹرول ہو۔ ہم کسی حال میں نہ تو پورے ہندوستان کے لیے ایک دستور چاہتے ہیں اور نہ مرکز میں ایک حکومت۔

لاہور کے ریزولوشن کی روشنی میں مسلم لیگ نے اپنے نصب العین کی توضیح کی۔ ریزولوشن کا سب سے دلچسپ پہلو پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں تحفظات کا ہے جس میں ان کے سیاسی اور انتظامی حقوق شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے لیے مجالس قانون ساز اور کابینہ میں سیٹیں ریزرو ہوں گی اور ان کا سرکاری ملازمتوں میں حصہ ہوگا۔ لیکن جب ان تحفظات کے دئے جانے کا یقین کانگریس دلاتی ہے تو انھیں مسلم لیگ صرف کاغذی تحفظات قرار دیتی ہے۔ اگر کانگریس کے پختہ وعدوں کی کوئی وقعت یا حیثیت نہ تھی تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ لیگ کی طرف سے

اس قسم کے وعدے اور عہد و پیمان کی پابندی کی جائے گی۔

یہ مان لیا گیا تھا کہ کوئی قومیت اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو آزادی یا اقتدار مملکت میں ہی بروئے کار لاسکتی ہے یا پورا کرسکتی ہے لیکن تاریخ اس تصور کی تائید نہیں کرتی۔ اس لیے کہ اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ دو یا دو سے زیادہ قوموں نے مل کر ایک قومیت بنائی۔ کناڈا میں 14 ملین باشندوں کی ایک مملکت ہے اور دو اہم اور خاص قومیں اس کی آبادی کی اہم ترین جزو ہیں۔ برطانوی جن کی تعداد آٹھ ملین ہے اور فرانسیسی جن کی تعداد پانچ ملین ہے۔ مذہب کے اعتبار سے 3.8 ملین رومن کیتھولک ہیں۔

یونائٹڈ چرچ آف کناڈا سے تعلق رکھنے والے 3.7 ملین ہیں اور چرچ کے پیرو 2.4 ملین ہیں۔ یہ دولسانی مملکت ہے اور انگریزی اور فرانسیسی اس کی زبانیں ہیں۔ جمہوریہ چیکوسلواکیہ دو قوموں چیک اور سلوواک کی مملکت ہے۔ تقریباً 12 ملین آبادی چیک اور سلوواک میں منقسم ہے۔ چیک کا تناسب آبادی میں 65.4 فی صد ہے اور سلوواک آبادی کا 28.4 فی صد ہے۔ سلوواک زبان کی دو شاخیں ہیں چیک اور سلوک دونوں خطوں میں بولی جاتی ہیں۔

یوگوسلاویہ کی سوشلسٹ فیڈرل جمہوریت حسب ذیل مملکتوں سے مل کر بنتی ہے۔

بوسینیا، ہرزی گوینا، مانٹی، نیگرو کروشیا۔ مقدونیہ، سربیا، سلونیکا۔ گریک یا آرتھو ڈاکس چرچ کے پیرو 41.2 فیصد ہیں۔ انگریز، ڈچ اور رومن کیتھولک پیرو، 31.7 فیصد ہیں۔

مسلمان......12.3 فیصد

پروٹسنٹ......15 فیصد

دہریے یعنی کسی مذہب کے نہ ماننے والے 12.6

جنوبی افریقہ کی یونین دو قومیتوں انگریز اور ڈچ اور سوئٹزرلینڈ میں 3 قومیں:

جرمن، فرانسیسی اور اطالوی اور برطانیہ کی متحدہ مملکت انگلستان، ہائی لینڈ، اسکاٹ لینڈ، لولینڈ، اور ویلس پر مشتمل ہے۔

لیکن کثیر القومی مملکت کی سب سے اہم اور نمایاں مثال سوویٹ سوشلسٹ جمہوریتوں کی یونین ہے۔ یہ بیس سے زیادہ قومیتوں پر مشتمل ہے اور اس میں رہنے والے بچے اپنی تعلیم اپنی بے شمار زبانوں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باشندے مختلف مذہبوں کے پیرو ہیں۔ مسیحی اور غیر مسیحی لیکن اسٹیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کردیا جائے حتیٰ کہ اقبال نے جو پاکستان کے منصوبے یا تصور کے بانی ہیں ہندوستان کے اندر مسلم ہندستان کی بات تھی۔ 1935ء میں جب جناح اتحاد کے لیے کوشاں تھے، جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں یہ کہا تھا۔ ''ہندوستان کے اسی ملین مسلمان تیار ہیں اور وہ کسی دوسری ملت سے زیادہ مادر وطن کی آزادی کے لیے دوسری ملتوں کے ساتھ دوش بدوش لڑنے پر تیار ہیں''۔ دوسرے سال یعنی 24/ اپریل 1936 کو وہ بمبئی میں مسلم لیگ کانفرنس میں مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ برطانوی حکومت کو ان کی خواہشوں اور مرضی کے سامنے جھکنے پر مجبور کرنے کا کام دونوں ملتوں کے دوش بدوش ہونے سے ہی ہو پائے گا۔ 1939ء تک جب چودھری خلیق الزماں نے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہا ہے کہ وہ پاکستان کے مطالبے کے بارے میں سوچیں تو انھوں نے کہا تھا کہ اگرچہ وہ اس کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ 1937ء کے انتخاب کے نتیجوں یعنی مسلم لیگ کے امیدواروں کی ناکامی اور کانگریس کی زبردست کامیابی نے ان پر اتنا اثر ڈالا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو

بیٹھے اور انھوں نے ان تمام اصولوں کو خیر باد کہہ دیا جن کا وہ ساری عمر دعویٰ کرتے رہے اور ان کی پوری اور کایا پلٹ ہوگئی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جناح کی یہ کایا پلٹ کچھ تو ان کی انا کو ٹھیس پہونچنے والے جذبے سے اور کچھ ان کے خانگی اور خاندانی صدموں کی وجہ سے ہوئی۔ وہ خود زبردست انانیت پسند، دوسروں پر اپنی مرضی چلانے والے اور کینہ جو تھے۔

ہندو مسلم جھگڑوں اور اختلافات کو بحیثیت کامیاب ثالث طے کرانے میں انھیں کانگریس نے شکست دی اور کانگریس کے سیلف گورنمنٹ کے حصول میں وہ نیک نامی سے محروم کر دیئے گئے۔ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں نے ان کے مشوروں کے مقابلے میں فضل حسین کے مشوروں کو ترجیح دی اور اس طرح انھوں نے اپنے کو برطانوی افسروں کے تابع فرمان ہونے کا مظاہرہ کیا۔ پھر ان کی جوان بیوی کی بے وقت موت جس کے لیے وہ خود ذمہ دار گردانتے تھے وہ گھریلو زندگی سے محروم ہوگئے۔

اس طرح سے مایوس، دل برداشتہ اور ذلت اٹھاتے ہوئے مسٹر جناح نے فیصلہ کیا کہ انھیں اقتدار حاصل ہو اور اس کے لیے وہ پوری طاقت استعمال کریں۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ حب الوطنی، انصاف اور خیر سگالی کی دہائی دینے اور ان کے نام پر اپیل کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ صرف طاقت اور قوت ہی کام کرتی ہے۔

غیر اخلاقی میکاولی اصولوں پر انھوں نے اپنی حکمت عملی تیار کی جس کے عناصر یہ تھے:

(1) مسلم لیگ کی تنظیم کی جائے اور اسے مضبوط بنایا جائے تاکہ وہ کانگریس کے بالکل مساوی ہو جائے۔

(2) اپنے دشمنوں کی پوزیشن کو ان کی غلطیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر کمزور کرنا اور اس قسم کی جدوجہد میں شرکت نہ کرنا جس سے اپنی تنظیم کمزور ہو۔

یہ حکمت عملی اس پر مبنی ہے کہ سیاست میں ہر ایک کو اپنی چال شطرنج کی بساط پر چلنا چاہئے۔

اس سازوسامان سے مسلح ہو کر یعنی مسٹر جناح کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئے اور ان کی کانگریس کے خلاف اس سخت جنگ سے برطانوی حکمرانوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اقلیتی فرقہ کو بے شمار اور قطعی یقین دہانیاں دستوری ترقی کے بارے میں دی گئیں اور مسلم لیگ کے اس مطالبے کو دستور ہند میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ عارضی نہ مستقل کی جائے گی اور یہ وعدہ کرنا کہ 1935 کے ایکٹ کی پوری اسکیم کے بارے میں جنگ کے بعد میں غور کیا جائے گا کہ اس میں ترمیم کی جائے یا اسے نامنظور کیا جائے۔ برطانوی سیاستدانوں کے دل میں جو اقلیت کے حقوق کا اتنا زیادہ خیال رکھنے والے تھے کبھی اس قسم کا خیال نہ آیا کہ آخر اکثریت کے بھی حقوق ہیں۔ اکثریت کو نظرانداز کیا گیا۔ اس کا لیگ کے مطالبوں کو منظور نہ کرنے کو نامناسب اور غیر معقول ٹھہرایا گیا اور اسے اقلیت پر ہندوؤں کی چیرہ دستی سے تعبیر کیا گیا اور اقلیت کے مطالبے کو خواہ وہ کتنا ہی غیر معقول کیوں نہ ہو اور دوسرے ہندوستانی فرقوں کے مفاد کے خلاف ہو یا صرف مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کے خلاف ہو منظور کر لیا گیا۔ حکومت نے کانگریس ،لبرل فیڈریشن، غیر پارٹی لیڈروں کی تنظیم، ہندو مہا سبھا، سکھوں یا عیسائیوں یا شمالی مغربی یا سرحدی کے صوبے کے مسلمانوں، جمعیۃ العلماء یا نیشنلسٹ مسلمانوں کی رائے سننے اور ماننے سے انکار کر دیا۔ مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بہت بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو لیگ کے مطالبوں سے شدید اختلاف تھا لیکن حکومت پورے طور سے مسٹر جناح کے ساتھ رہی اور مسلمانوں میں ان کے یعنی جناح کے وقار اور اثر کو چکرا دینے والی بلندیوں تک پہونچایا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے

ہمیشہ حکومت کی خوشنودی پر اکتفا کیا اور سرکاری افسران کی خواہشوں اور احکام کی تعمیل کرنے کو وہ اپنے مفاد اور اپنے حقوق کے لیے نہ صرف ضروری سمجھتے تھے بلکہ اسے اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور وہ قرون وسطیٰ کے لوگوں کی طرح اپنے قائد کی بلا چوں و چرا اطاعت کرتے تھے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ جناح کے قد وقامت کا کوئی دوسرا مسلم لیڈر اس وقت موجود نہ تھا اس لیے انھیں اس عجیب وغریب پوزیشن تک پہونچنے میں مدد ملی۔ سکندر حیات خاں، فضل الحق، سعد اللہ کے سے صوبائی لیڈر گورنمنٹ کی مہربانیوں اور لطف وکرم کی وجہ سے ترقی کر رہے تھے۔ انھیں جناح کی مخالفت نہ کرنے کی ہدایت کی گئی اور اس پر انھوں نے پورا عمل کیا۔ اس لئے حکومت کا رویہ، پاکستان کے تصور کا معقول یا دلفریب ہونا یا مسلم لیگ کا یہ بلند بانگ دعویٰ کہ وہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے یا اسلام خطرے میں ہے کہ مبالغہ آمیز خدشات، جناح کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا باعث بنے۔

6- کانگریس نے جنگ کے مقاصد کی وضاحت کا مطالبہ کیا

5 ر ستمبر سے 15 ر ستمبر 1939ء تک کانگریس کمیٹی کے جلسے واردھا میں ہوئے اور اس نے لیجسلیٹو اسمبلی سے نیشلسٹ ممبروں یعنی کانگریسی لیڈروں کے ہٹانے کا فیصلہ کیا اور حسب ذیل بیان جاری کیا: ” برطانوی حکومت نے ہندوستان کو متحارب ملک قرار دیا ہے۔ متعدد آرڈی ننس نافذ کیے ہیں جن کا ہندوستانی عوام پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اور جن سے صوبائی حکومتوں کے اختیارات اور کارروائیوں میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ سب ہندوستانی عوام کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے۔ ان معاملوں کے بارے میں ان کی خواہشوں کو برطانوی حکومت نے بری طرح نظر انداز کیا۔ ورکنگ کمیٹی کو ان تمام واقعات پر بڑا افسوس ہے۔“ کمیٹی نے اعلان کیا کہ ہندوستانی

عوام اس جنگ میں کسی قسم کا تعاون نہیں کریں گے جب تک انھیں مساوی درجہ اور آزادی حاصل نہ ہو۔ اس نے جتایا کہ ماضی میں برطانوی مدبرین کے دعووں اور اقوال کی تردید اور تکذیب کی جاچکی ہے اور ان سے روگردانی کی جاچکی ہے اور یہ پہلی عالمی جنگ ہے جس میں کہ علاقوں کے الحاق کرنے کے بارے میں، ترکی کے ساتھ برتاؤ کرنے کے بارے میں اور ہندوستان کی دستوری ترقی کے بارے میں عہد و پیمان ٹھکرائے گئے ہیں۔ کس طرح صدر ولسن کے 14 نکات نظر انداز کیے گئے۔ جرمنی پر ایک انتہائی سخت صلح نامہ مسلط کیا گیا۔ جمعیۃ بین الاقوام یا لیگ آف نیشنز کا کس طرح گلا گھونٹا گیا اور آخر میں کس طرح منچوریا، ابی سینیا، اسپین اور چیکوسلواکیہ کو دی گئی یقین دہانیوں کو جھٹلایا گیا۔

اس کے باوجود کمیٹی نے اس مسئلے کے بارے میں اپنا آخری فیصلہ محفوظ رکھا اور حکومت کو دعوت دی کہ جنگ کے مقاصد کو بیان کرے اور ان کی وضاحت کرے۔ اور خاص کر غیر مبہم انداز میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں اپنی تجویزوں سے مطلع کرے اور اس لیے کہ اگر یہ جنگ محض موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے لڑی جارہی ہے تو ہندوستان کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔

ورکنگ کمیٹی کے اس ریزولوشن کو حکومت نے مساعی جنگ میں کانگریس کے عدم تعاون سے تعبیر کیا۔ زیٹلینڈ نے اسے سودے بازی کی کوشش کہا۔ مدراس کے گورنر نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ ہمیں کبھی سودے بازی نہیں کرنی چاہئے اگر کانگریس ایسا کرتی ہے تو وہ اپنے کو دفن کرے گی ہمیں نہیں۔

وائسرائے نے ایک طویل مراسلت میں کانگریس کے مطالبے کے جواب میں تین (3) متبادل منصوبوں یا تجویزوں پر بحث کی۔ ایک تو یہ کہ اس مطالبہ کو سرے سے نامنظور کردیا جائے۔ اس سے اتفاق کیا جائے یا کوئی درمیانی راستہ اختیار کیا جائے

تا کہ کوئی باعزت راستہ نکل آئے۔ پہلی دو صورتوں کے خلاف رائے دیتے ہوئے انھوں نے ایک باعزت رعایت یہ تجویز کی کہ برطانوی ہندوستان کے نمائندوں اور والیان ریاست کے نمائندوں پر مشتمل ایک ڈیفنس رابطہ کمیٹی، مشاورتی اغراض کے لیے مقرر کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران کانگریس کی انتہا پسندی کو، ہندوستان پر برطانوی تسلط کو کمزور کیے بغیر یا مزید دستوری ترقی رو کے بغیر تا کہ ہمارے دوست یعنی والیان ریاست اور مسلمان ہمیں اپنے خلاف نہ سمجھیں، اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔

وزیر ہند نے دوسرے دن جواب دیا کہ کانگریس کے مطالبوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معینہ مدت کے اندر درجہ نو آبادیات دئے جانے کا وعدہ کرنا ناممکن ہے۔ اگر ایسا کرنا ممکن ہو تو ہم مسلم حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بعد گاندھی جی 23 ر ستمبر کو وائسرائے سے ملے اور انہوں نے ان کے سامنے کانگریس کے موقف کی تشریح کی۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد اور جواہر لال نہرو وائسرائے سے ملے۔ 30 ر ستمبر کو گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں لکھا۔

''بظاہر کتنا ہی عجیب معلوم ہو میری ہمدردی اتحادیوں کے ساتھ ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے یہ جنگ سوشل ڈیموکریسی اور حاکمیت پسندی جس کا مظہر ہٹلر ہیں کے درمیان ہے۔''

لیکن کانگریسی لیڈروں کی دلیلیں یا استدلال، ان کی برطانیہ سے ہمدردی اور نتیجہ کے بارے میں ان کے انتباہ کو وائسرائے نے اپنے 17 ر اکتوبر کے بیان میں بالکل صرف نظر کیا۔

''ملک معظم کی طرف سے مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی کہ جنگ کے ختم ہونے پر وہ بڑی خوشی سے ہندوستان کی مختلف ملتوں، پارٹیوں، اور مفادات کے نمائندوں اور

والیان ریاست سے مشورہ کرے گی تاکہ ان کی مدد اور تعاون سے ایسی تبدیلیاں کرے جو کہ مناسب اور ضروری ہوں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ فوری طور سے ایک نمائندہ گروپ کی تشکیل عمل میں آئے گی جو برطانوی ہند کی تمام بڑی پارٹیوں اور والیان ریاست کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی جس کا مقصد یہ ہوگا کہ جنگ کی سرگرمیوں اور مساعی کے بارے میں ہندوستانی رائے عامہ کو شامل کیا جائے۔ اس طرح کا حقارت آمیز بے کار اور لایعنی بھرتی کا اعلان جس نے بڑے بڑے وفاداروں کے دل کو بھی سرد کر دیا ہندوستانیوں کے ذہن میں جوش تو کیا ہمدردی تک پیدا نہ کر سکا۔

گاندھی جی نے اس اعلان کو بہت ہی مایوس کن قرار دیا اور رائے ظاہر کی کہ وائسرائے کے اس اعلان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لیے کوئی جمہوریت نہیں جسے برطانیہ روکنا چاہتی ہے۔ جنگ کے خاتمہ پر ایک اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ کانگریس نے روٹی مانگی تھی اس کے جواب میں پتھر دیا جاتا ہے۔

صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اعلان کیا کہ اب کسی کورس میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ برطانوی حکومت کی وہی پالیسی ہے جو پہلے تھی۔ لبرل رہنما تیج بہادر سپرو نے یہ تبصرہ کیا کہ وائسرائے کے اس اعلان سے مایوسی بہت زیادہ بڑھے گی۔

جواہر لال نہرو اور آزاد نے ایک مشترکہ بیان میں کہا اگر برطانوی حکومت کا ہندوستان کے لوگوں کو یہی آخری جواب ہے تو پھر ہم دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں اور ہمارے دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔

23/اکتوبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اس نے کانگریس وزارتوں کو مستعفی ہونے کی ہدایت کی اور ایک ہفتہ کے بعد استعفوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور

نومبر کے وسط تک کانگریس وزارتیں اقتدار سے باہر ہوگئیں اور کانگریس اور حکومت کے مابین سخت تفرقہ پڑ گیا۔ ان رکاوٹوں کا جن کے نتیجہ بڑے اندوہناک تھے کون ذمہ دار تھا۔ صوبوں کے گورنروں نے مطلع کیا کہ کانگریس کے وزیر عہدوں پر برقرار رہنا چاہتے تھے۔ بمبئی سے منشی اور مدراس سے سی۔ راجگوپال آچاریہ نے وائسرائے پر زور دیا کہ گاندھی جی جو سمجھوتہ کے خواہشمند ہیں کو راضی کر لیں یا ان کی حمایت حاصل کرلیں۔ جب گاندھی جی وائسرائے سے 24/اور 26 دسمبر کو ملے تو انھوں نے ان سے درخواست کی وہ درجہ نوآبادیات کے حق میں اعلان کردیں یعنی اس کا کہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دے دیا جائے گا۔ لن لتھ گو بخوبی جانتے تھے کہ یہ مطالبہ اس صورت میں منظور کیا جاسکتا ہے کہ جنگ کے بعد درجہ نوآبادیات دئے جانے کا وعدہ کیا جائے اور فوری رعایت مرکزی حکومت کی تشکیل کی صورت میں دے دی جائے۔

جواہر لال نہرو جنھوں نے یہ تجویز مرتب کی تھی تشریح کی لیکن زیٹلینڈ اس تجویز کا مطلب غلط سمجھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تعاون کے بارے میں دروازے بند ہوگئے ہیں یعنی یہ کہ تعاون نہیں کیا جاسکتا۔ اس تجویز نے راستہ بتایا کہ کانگریس باعزت طریقہ سے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے، حتیٰ کہ یوروپین ایسوسی ایشن اور اینگلو انڈین اخباروں نے جنگ کے مقاصد واضح کرنے کی تجویز کو سراہا۔

لن لتھ گو نے محسوس کیا کہ صورتحال تیزی سے بدل رہی ہے اور کوئی فوری قدم اٹھانا چاہئے۔ اگر ان کے ہاتھ میں ہوتا تو ان کو جنگ کے مقاصد کے بیان کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا یا سموئیل ہور کے فارمولے کے مرکز کے دائرے میں کچھ اضافہ کردیتے۔ لیکن برطانوی کابینہ اور وزیر ہند اس کے لیے قطعی راضی نہ تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پارلیمنٹ جنگ کے دوران دستوری امور پر کوئی بحث نہیں چھیڑے

گی۔ بہ ح ن ن حومت کسی سیاسی پیش رفت یا ترقی کے بارے میں اس لیے نہیں سوچ سکتی کہ اس کی مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت کی جائے گی۔

پہلی دلیل مغالطہ آمیز تھی اور محض کچھ نہ کرنے کا نمونہ تھی کیونکہ اگر ایک مختصر بل حکومت پیش کرتی تو اس کی شاید ہی مخالفت ہوتی اور قانون سازی کے طریقہ کو کم کیا جاسکتا تھا۔ دوسری دلیل سراسر شرانگیز تھی۔ مسلم اکثریت والے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ، مسلم لیگ کے چاہنے کے باوجود کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتے۔ پنجاب کے سکندر حیات اور بنگال کے فضل الحق پورے طور سے حکومت کے فرماں بردار تھے۔ مسلم یک جہتی قائم رکھنے کے اعلان کے بعد ان کی کیا مجال تھی کہ وہ حکومت کی مخالفت کرتے بشرطیکہ گورنمنٹ کا رویہ واضح ہوتا اور مذبذب نہ ہوتا۔ سندھ اور آسام کے پریمیروں کا حکومت کے خلاف کچھ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ مسٹر جناح البتہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ اس لیے کہ وہ مسلم اقلیت کے حقوق کے بارے میں سب سے زیادہ دخل در معقولات کرتے تھے اور وہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو نئے اعلان کی صورت میں بڑی سخت تشویش تھی۔ انھوں نے لن لتھ گو کو بتایا کہ انھیں علی گڑھ کے پروفیسروں کی اس قسم کی عرضداشتیں موصول ہوئی ہیں کہ وہ کسی صورت میں نہ تو کانگریس سے سمجھوتہ کریں اور نہ گونر جنرل سے جب تک کہ متحدہ ہندوستان کا منصوبہ ترک نہیں کر دیا جاتا اور مسلم اقلیتوں کا صوبوں میں تحفظ نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ بیان صحیح تھا؟ کیا بعض کانگریسی صوبوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی مثلاً صوبہ جات متحدہ میں جہاں غیر مسلم اکثریت ہے، مسلم اقلیت تقریباً 14 فیصدی ہے کہ مرکز میں ہندو راج کے قیام سے بہت بڑا دھاکہ ہو جائے گا۔ کیا یہ خیال کہ کانگریس کا یہ مطالبہ حد درجہ تباہ کن ہے صحیح ہے۔

یہاں پر پھر وہی پرانا سوال اٹھتا ہے جو ویجوڈ بین نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں

اٹھایا تھا اور جس کے جواب کی ضرورت تھی کیا اکثریت کو اس لیے آزادی اور جمہوریت سے محروم کردیا جائے کہ اقلیت جو آبادی میں 25/فیصدی سے بھی کم ہے، اس کی مخالف ہے۔ جناح کا مساوات کا مطالبہ بدیہی طور پر مہمل تھا۔ اقتدار، حقوق اور مراعات میں مساوات ذمہ داری، فرض اور قربانی کے مساوات سے پیدا ہوئی۔ مثلاً کیا مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مساوی اعتبار سے ٹیکس کا بوجھ برداشت کرسکیں اور کس طرح ذرائع اور وسائل مادی یا اقتصادی، معاشی، قومی، تعلیم سے قطع نظر ہندوؤں کے برابر ہوسکتے ہیں

کسی جمہوری ڈھانچہ میں مذہبی اقلیتوں کے لیے سوچنا غیر متعلق بھی ہے اور مغالطہ آمیز بھی۔ اگر حکومت کو کانگریس کا تعاون حاصل ہوگیا ہوتا تو پھر کیا صورتحال ہوتی۔ 75 فیصدی لوگ جو ساری غیر مسلم آبادی کے فرد ہیں حکومت کی حمایت میں ہوتے۔ پنجاب کے مسلمان اس وجہ سے کہ انھیں فوجوں میں بھرتی کیا جاتا تھا چونکہ صوبے میں ان کا غلبہ تھا اور اس وجہ سے کہ انھیں دوسری مراعات حاصل تھیں وہ امن وامان میں کسی قسم کا خلل نہ ڈالتے تھے۔ اس وجہ سے اور بھی کہ چیف منسٹر سکندر حیات خاں جناح کے اندھے مقلد نہ تھے۔ جہاں تک بنگالی مسلمانوں کا تعلق ہے وہ بہت ہی نادار تھے اور ان پر مولوی اور ملاؤں کا بے پناہ اثر تھا۔

1939ء میں جمعیۃ العلماء مسلم لیگ سے علیحدہ ہوگئی تھی۔ اس کا اثر مسلمانوں کے غریب طبقہ پر خاصہ تھا اور وہ کانگریس کے خلاف کسی قسم کی جدوجہد نہ کرتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں خلافت تحریک سے صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ اس تحریک کی پشت پناہ جمعیۃ العلماء اور اس کے پیرو تھے۔ جیسا کہ دارالعوام میں مسٹر ویجوڈ بین نے کہا تھا کہ مسلمان اس جنگ میں پچھلی جنگ کے مقابلے میں زیادہ جوش سے شامل ہوسکتے ہیں اس لیے کہ عظیم اسلامی طاقتیں یعنی عراق، مصر اور ترکی ہمارے حلیف ہیں۔

کیا اس صورت میں یو پی کا متوسط طبقہ برطانوی حکومت کے لیے کسی قسم کا خطرہ ہوسکتا تھا جو حکومت کو اس بات پر مجبور کرسکتا کہ وہ جناح کی ناراضگی کو دور کرے پر اس کا جواب صاف نفی میں ہے۔

زیٹلینڈ مسلمانوں کی مخالفت سے خائف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ آزادی کے جلد حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے لیکن لن لتھ گو کو ان سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے 19 رمئی 1939ء کو وزیر ہند کو لکھا کہ ہماری دشواری یہ ہے کہ مرکز میں ذمہ دار حکومت کی کسی بھی اسکیم سے مسلم خدشات پیوستہ ہیں۔ فیڈریشن کی کوئی بھی اسکیم جو نیابتی حکومت کی بنیاد پر ہو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگی اور وہ آئندہ ہندوستانی سیاست کے بارے میں کبھی بھی نہ ختم ہونے والے فرقہ وارانہ تنازعوں اور مقابلوں کی نقطہ نگاہ سے سوچتے ہیں یعنی کسی طرح بھی فیڈریشن کے متعلق مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے ہونے والی دقتوں اور دشواریوں کو ہلکا نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ فیڈریشن کے قیام کو روک سکیں یا اسے چلنے نہ دیں۔ مجھے ذرہ برابر بھی حیرت نہ ہوگی کہ اگر مسلمان اپنی صلاحیتوں کے مطابق فیڈرل دستور کو خوش اسلوبی سے نہ چلائیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ برطانوی حکمراں ہندستان میں جمہوریت کے قائم کرنے اور آزادی دینے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ وہ اپنے دشمن انڈین نیشنل کانگریس کو اقتدار حوالہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مسلم ہوا' دینا کو دھوکہ دینے کے لیے جو ہندوستانی معاملوں سے بالکل ناواقف تھی، پوری طرح استعمال کیا۔

7-سابقہ صورتحال کو برقرار اور قائم رکھنے پر برطانیہ کا اصرار

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے 22 راکتوبر کے ریزولوشن سے ہل چل مچ گئی اور

گورنمنٹ آف انڈیا نے محسوس کیا کہ کچھ نہ کرنے کی پالیسی سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ یہ ضروری ہے کہ سب سے زیادہ مضبوط سیاسی پارٹی کو دوسرا منطقی قدم اٹھانے سے جس سے کہ بہت نقصان ہو روکنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن مسٹر جناح نے یہ سوچا کہ کانگریس کی وزارتوں یا حکومت سے علیحدگی سے مسلم لیگ کو ملک میں اپنی قوت بڑھانے اور اثر بڑھانے کا سنہرا موقعہ ملا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے قابل نفرت دشمن کانگریس کے خلاف اکسائے اور حکومت جو مسلمانوں سے پہلے ہی سے مدافعت کرنے پر آمادہ ہے اپنی دوستی کے رشتوں کو استوار کرے۔ کانگریس متحد اعمال نہ تھی۔ سبھاش چندر بوس اور اس کا فارورڈ بلاک ایک سرے پر تھے اور برطانیہ سے کسی قسم کا بھی سمجھوتہ کرنے کے شدید مخالف تھے۔ ان کے نزدیک اصل منزل ہندوستان کی مکمل آزادی تھی اور اس کے لیے وہ ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنا چاہتے تھے۔ غیر متشددانہ اور تشددانہ دونوں اصول مقصد کے لیے خاص سیاسی تھے۔ شکر گذاری، فیاضی اور خیرات کے تصور ان کے نزدیک بالکل غیر متعلق تھے۔ ان کے نزدیک انگلستان کی دشواریاں اور مصیبتیں ہندوستان کے لیے بہترین موقع تھے۔ اس لیے کہ برطانوی پالیسیاں تمام تر برطانوی مفادات کے پیش نظر رکھ کر بنائی جاتی تھیں اور برطانوی مدبرین نے ہمیشہ ہندوستانی مفاد کو برطانوی اغراض اور مقاصد اور مفاد کے پس پشت ڈالا۔ جب ہندوستان کی خودداری کو ہر طرح مجروح کیا جاتا ہے اور اس کی امنگوں کو کچلا جاتا ہے تو ہندوستان سے یہ کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ جنگ میں انگلستان کی مدد کرے۔

جواہر لال نہرو کا ذہن دوسری سمت چل رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ ہندوستان کی قومی آزادی کے لیے مضطرب اور بیقرار تھے تو دوسری طرف انھیں اتحادیوں کے مقاصد سے بھی ہمدردی تھی۔ وہ اس جنگ کو محض دو قوموں کے درمیان سیاسی تفوق،

برتری اور مادی فوائد کے لیے نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے دو تصورات کے درمیان تصادم سے انسانوں کی تصویریں وابستہ سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی ہندوستان ان طاقتوں کی حمایت کرے جو آزادی، جمہوریت اور انسان کی فتح اور کامیابی کے لیے لڑ رہی تھیں۔ انھیں ان تصورات سے نفرت تھی جن پر فسطائیت اور فاشزم (نازی ازم) کی بنیاد تھی یعنی نسلی امتیاز، نسلی تفوق اور برتری، آزادی اور مساوات سے انکار لیکن انھیں اس کا بھی بخوبی علم تھا کہ انگلستان میں بھی سامراج اور سفید فام نسلوں کی برتری کے زبردست حامی موجود ہیں۔ وہاں محدودے چند وسیع لخیال اشخاص ہیں جو انسانی استحصال کے قدرے مخالف ہیں اور جو تمام نسلوں کو برطانوی دولت مشترکہ کے مساوی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے قدرتاً آخر الذکر گروہ کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ اس پر اصرار کرتے تھے کہ جنگ کے مقاصد کا خاص طور جن کا تعلق ہندوستان سے ہے اعلان کیا جائے۔

گاندھی جی نے سمجھوتے کی حمایت میں خاص طور سے درمیانی راستہ چنا۔ ان میں نازیت اور فسطائیت کے متشددانہ، جارحانہ اور غیر اخلاقی رویے اور حرکتوں سے نفرت تھی لیکن باوجود اس کے کانگریسی ان سے محبت کرتے تھے۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اس پالیسی کو کانگریس پر مسلط کردیتے مگر وہ جانتے تھے کہ کانگریس برطانیہ سے ایک واضح ثبوت اور ٹھوس وعدہ جمہوریت اور آزادی کے بارے میں چاہتی ہے۔ اسے برطانوی مدبرین کی زبانی وعدوں پر کوئی بھروسہ نہ تھا حالانکہ ذاتی طور سے گاندھی جی سودے بازی کے خلاف تھے اور وہ لن لتھ گو کے خلوص کے قائل تھے۔ جزوی طور سے سہ رکنی مذاکرات شروع ہوگئے۔ وزیر ہند نے وائسرائے کو 29/ اکتوبر کو یہ مشورہ دیا کہ کانگریسی اور مسلم لیگ لیڈروں کو مدعو کریں اور صورتحال پر ان سے گفتگو کریں۔

حکومت کی طرف سے انھوں نے یہ کہا۔ کابینہ کی منظوری جب اس مرحلہ پر پہونچے کہ ہندوستانی لیڈروں کو مرکزی حکومت میں شامل کرنے کی تجویز آئے تو اس شرط کے ساتھ اس کو منظور کیا جائے کہ کمانڈر انچیف ایکزیکیٹو کونسل کا ممبر رہے گا۔ اسے ذہن نشین کرلیا جائے کہ 1935ء کے ایکٹ کے سیکشن 42(2) کی رو سے جو اختیارات آپ کو دئے گئے ہیں اور مجھے جو اختیارات نویں شیڈول کے سیکشن 312 کی رو سے حاصل ہیں ان انتظامات کی وجہ سے ان میں نہ کسی قسم کی کمی کی جائے گی اور نہ انھیں ختم کیا جائے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ حفاظتی وسیلوں اور فوج پر برطانوی کنٹرول میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہوگی اور نہ یہ کہ فوجی قوتیں انڈیا باہر بھیجی جائیں گی۔

لیکن آئندہ کے لیے کابینہ کسی قسم کا وعدہ کرنے پر تیار نہ ہوئی۔ 26/اکتوبر کے دالعلوام کے مباحثے میں ویجوڈ بین نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس کا برطانیہ سے جنگ کے بارے میں اپنے مقاصد کے اعلان کے بارے میں مطالبہ بالکل صحیح اور مناسب ہے۔ اگر ہماری جنگ کا مقصد ایک بڑے اور اہم اصول کے تحفظ کرنے کا ہے تو آپ نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو اس کی تائید کے لیے اکٹھا کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگلستان کی حمایت میں جنگ کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

سیموئل ہور نے حکومت کی طرف سے جواب میں یہ کہا کہ درجہ نوآبادیات کوئی انعام نہیں ہے جو کسی مستحق فرقے کو دیا جاتا ہے بلکہ یہ ان تمام واقعات سے جو موجود ہوتے ہیں کی بنا پر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے حصول میں کچھ دقتیں حائل ہیں تو یہ ہماری پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہ اس عظیم تحتی براعظم میں طبقوں اور فرقوں کی تقسیم اور تفرقے کی وجہ سے ہیں۔ ہندوستانیوں کا فرض اولین ہے کہ ان نفرتوں اور تفریقوں کو ختم کرنا

ہے۔ والیان ریاست کو اس کا اندیشہ ہے کہ ان پر برطانوی ہندوستان کا غلبہ رہے گا۔ مسلمان مرکز میں ہندو اکثریت کے شدید ترین مخالف ہیں۔ پست اقوام اور دوسری اقلیتوں کو بجا طور پر اس کا اندیشہ ہے کہ ذمہ دار حکومت جو دراصل ہندو اکثریت کی حکومت ہوگی ان کے مفاد کو قربان کر دے گی۔ جب تک یہ خدشات موجود ہیں حکومت کے لیے ناممکن ہے کہ مرکز میں کسی مجوزہ تاریخ پر فوری مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کے مطالبہ کو منظور کرے۔

اس طرح حکومت نے خود کانگریس پر اس کے مطالبے کو پورا کرنے کی ذمہ داری منتقل کر دی لیکن دو نومبر کو دارالامرا میں ہربرٹ سیموئل نے ہور کو جواب دیا اور فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں یہ کہا کہ حکومت کہتی ہے اگر ہندوستانیوں میں اہم مسئلوں پر جیسے مختلف فرقوں کے درمیان کانگریس اور ریاستوں کے درمیان اتفاق رائے ہو جائے تو درجہ نو آبادیات کے قیام میں مسلمانوں کو ویٹو کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہندوستانی مسلمان فیڈریشن کے موافقت میں نہیں ہیں لہٰذا ملک معظم کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ اس باب میں آخری فیصلہ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک چوتھائی آبادی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اور اس سے مستقل تعطل اور جمود کی صورت ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس پر ذرہ برابر حیرت نہیں کہ کانگریس کو اس پر شک ہے کہ یہی مقصد ہے۔

انھوں نے انگلستان کی حکومت اور حکومت ہند دونوں پر یہ الزام لگایا انھوں نے ان پیچیدہ مسئلوں کے حل کرنے میں کوئی خاص مستعدی اور قوت عمل نہیں دکھائی۔ وہ ان مسئلوں کے الجھ جانے سے مطمئن ہیں۔ انھیں اس میں بڑا شبہ تھا کہ جنگ کی وجہ سے فیڈریشن کے التوا سے دہلی اور وہائٹ ہال دونوں جگہوں نے خوشگوار، مستحکم اور

چین کی سانس لی ہے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ برطانوی مدبر ہندوستان کے دستوری مسئلوں کو حل کرنے کے بجائے مساعی جنگ میں اتنے زیادہ کیوں سرگرم ہیں۔ یہ ہماری قوت اور حکمرانی کی صلاحیت کا زبردست ثبوت ہے اگر ایک طرف ہم پوری قوت سے زبردست جنگ لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف ہم شہنشاہیت کے دوسرے حصوں کے مشکل مسئلوں سے نمٹ رہے ہیں۔

کانگریس کی منزل مقصود جس کی وضاحت اور تشریح کانگریس کے ریزولوشن، گاندھی جی اور دوسرے قدامت پرست لیڈروں کے تحریری بیانات اور تقریروں میں کی گئی تھی، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اس سے مختلف نہ تھا جو حکومت نے تجویز کیا تھا یا جس کا مسلمان مطالبہ کر رہے تھے۔ بظاہر تینوں اپنے عام اعلانوں میں اس پر متفق تھے کہ ہندوستان کی منزل مقصود آزادی ہے۔ خواہ اسے پوراسوراجیہ کہا جائے خواہ ویسٹ منسٹر قسم کا درجہ نوآبادیات یا مکمل ذمہ دار حکومت۔

لیکن یہ اتفاق اس جگہ ختم ہو جاتا ہے کہ گاندھی کے مطابق کانگریس اور وائسرائے کے درمیان بنیادی اختلاف اس بارے میں تھا کہ وائسرائے کی پیش کش اس تصور پر تھی کہ ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ برطانوی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ کانگریس بالکل اس کے برعکس سوچتی تھی کہ کانگریس کی پوزیشن یہ تھی کہ اصل آزادی کا کام ہندوستانی عوام کا ہے جو بغیر کسی بیرونی اثر یا کنٹرول کے اپنی تقدیر کے خود مالک ہیں۔ جنگ کی صورتحال کی وجہ سے کانگریس کو ہندوستان کے موقف کے بارے میں بڑی تشویش تھی کہ آبادی ایک متحارب ملک کی حیثیت سے اس جنگ میں اس لیے شامل رہے کہ وہ تمام خطروں اور قربانیوں کے میں اتحادیوں اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ برابر کے ساتھی یا ساجھے دار کی حیثیت سے حصہ لے رہا ہے یا یہ کہ تمام تر ماتحت کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے مطابق کام کر رہا ہے۔

اس لیے اس نے برطانیہ سے غیر مبہم اور واضح الفاظ میں جنگ کے مقاصد کے اعلان کرنے کو کہا تھا اور اس کا بھی کہ ان اصولوں پر کس حد تک ہندوستان میں عمل ہوگا۔ اگر مقصد دنیا کو ڈکٹیٹر شپ کے خطرے سے بچانا ہے اور جمہوریت کو حکمیت پسندی کے حملہ اور فسطائیت کے ظلم وستم سے محفوظ رکھنا ہے تو پھر ان الفاظ کو ہندوستان کی صورتحال کے تقاضہ کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے۔

کانگریس چاہتی تھی کہ انگلستان ہندوستان کو آزادی کے زبردست جذبہ کا احساس دلائے تاکہ ہندوستان اس جنگ میں جوش وخروش سے حصہ لے۔ اس نے عارضی انتظامات کی تفصیل کے بارے میں اصرار نہیں کیا اسے حکومت کے بقدر جذبہ سے دلچسپی تھی۔

جہاں تک فرقہ وارانہ مسئلہ کا تعلق تھا اس کے بارے میں یہ حل تجویز کیا گیا کہ ہندوستان کے دستور کو بالغوں کے حق رائے دہی کی بنیاد منتخبہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ہو لیکن مسلمانوں کے اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے کہ اس میں یعنی اس اسمبلی میں ہندو اکثریت انھیں روند ڈالے گی، یہ تجویز کیا گیا کہ مسلم حقوق کو اکثریتی ووٹوں سے نہیں طے کیا جائے گا بلکہ پارٹیوں کے درمیان محبت کے جذبہ کے ذریعہ اور اختلافات کی صورت میں ثالثی سے حل کیا جائے گا۔

گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ حکومت قول اور عمل کے درمیان ابہام یا تضاد کو ترک کردے اور ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرلے اور اقلیتوں کے حقوق کی آڑ لے کر غور کرنے سے باز رہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا برطانیہ ہندوستان کے لوگوں کے تمام طبقوں کو مطمئن رکھنے میں زیادہ دلچسپی دکھا رہی ہے یا خود ہندوستان کے لوگوں کو مطمئن رکھنے ہیں اور یہ کہ اقلیت کا تحفظ برطانوی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد فرقوں کی باہمی خوشدلی اور مفاہمت سے کیونکر ممکن ہوگا۔

لیکن یہ دلیلیں دونوں پارٹیوں برطانوی حکومت اور مسلم لیگ کو قائل کرنے میں ناکام رہیں اور یہ مسئلے عقدۂ لاینحل رہے۔ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد کرنے یا اس کو آزادی دینے کے اقرار کرنے یا وعدہ کرنے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے کہ وہ آئندہ کے اپنے سامراجی مفاد کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی، خاص طور سے اس وجہ سے کہ اس وقت کوئی بھی جنگ کے نتیجہ کے بارے میں پیشینگوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی یعنی حکومت کی دشواری کی فوری وجہ یہ تھی کہ اسے ہندوستانی لیڈروں کی خاص طور سے کانگریسی لیڈروں کی نیک نیتی جنھیں وہ راج کا دشمن سمجھتی تھی، پر اعتماد نہ تھا۔ اور نہ اسے ہندوستان کی مساعی جنگ میں مستعدی دکھانے حتّٰی کہ جنگ کرنے کی صلاحیتوں میں مطلق اعتماد نہ تھا۔ فرقہ وارانہ مسئلے کو، کانگریس کے مطالبہ کو نامنظور کرنے کے لیے اور زیادہ مہلت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

نتیجوں کے لحاظ سے یہ بالکل غیر متعلق ہے کہ واقعی برطانوی حکومت ہندوؤں کے بارے میں مسلمانوں کے اندیشوں اور خدشوں کو صحیح سمجھتی تھی یا مسلمانوں کے اس پرزور دعوے کو کہ ان کے ہندوؤں سے شدید اور گہرے اختلافات تھے یا یہ کہ حکومت نے جان بوجھ کر ان اختلافات سے اپنے مفاد یعنی سامراجی حکمت عملی کی خاطر پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ آزادی یا درجہ نوآبادیاتی ہندو مسلم مسئلے کے حل پر منحصر ہے اور اس یعنی ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس اپنے اس دعوے سے دست بردار ہو جائے کہ سارے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے اور وہ برطانوی حکومت اور جناح کے اس نظریہ کو تسلیم کرلے کہ کانگریس ہندو جماعت ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد اور بااختیار نمائندہ جماعت ہے۔ اگر کانگریس جناح کے اس نظریہ سے جزوی طور سے بھی اختلاف کرے یا جناح کے ایک شوشہ سے بھی اختلاف کرے تو سمجھوتہ کے ناکامی کی ذمہ داری اور آزادی کے دئے جانے سے انکار کا سبب کانگریس

ہی کے سر ہے۔

8- جنگ کا دوسرا مرحلہ

مارچ 1940ء میں جنگ کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔ پولینڈ کو فتح کر لینے کے بعد ہٹلر نے مغربی طاقتوں سے مفاہمت کرنی چاہی۔ اس نے ان کے ساتھ جنگ نہ کرنے یا فوج کشی نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا اور پولینڈ کے علاقوں کی تقسیم کے بارے میں اسٹالن سے متفق ہوگیا۔ نومبر 39ء میں روس نے فن لینڈ پر حملہ کیا تھا۔ قبل اس کے مغربی حلیف اس میں مؤثر مداخلت کرتے فن لینڈ کو صلح کرنے کی درخواست کرنی پڑی۔

فن لینڈ پر روس کے حملے سے جرمنی کو اسکینڈ ینیوین ملکوں پر حملہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ 19/ اپریل کو جرمنی نے ناروے پر حملہ کر دیا۔ جس وقت چیمبر لین پارلیمنٹ کو یقین دلا رہے تھے کہ ہٹلر سے بس چھوٹ گئی ہے ہٹلر بڑی تیزی بلکہ برق رفتاری سے ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر چڑھ دوڑا بلکہ انھیں مسخر کرلیا۔

اسکینڈ ینیوین ملکوں اور نیدرلینڈ کو بچانے میں برطانوی بحریہ کی ناکامی اور جرمن فضائیہ کی زبردست کامیابی سے بڑا ہی سنگین خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ پارلیمنٹ میں ایک سینیر ممبر نے بڑی تند اور تلخ تقریر میں کرامویل کے لفظوں میں وزیراعظم سے کہا: ''خدا کے لیے آپ جائیں''، یعنی مستعفی ہو جائیں۔

چیمبرلین کو ہٹنا پڑا اور قسمت کے دھنی چرچل 10/ مئی کو ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ اگرچہ انھوں نے کسی قسم کا دعویٰ بجز خون یا جانفشانی اور آنسوؤں کے نہیں کیا۔ لیکن فتح کے بارے میں امید افزا یقین دہانیوں نے برطانوی عوام کے شکستہ دلوں کی ڈھارس بندھائی اور انھیں اونچا کیا حالانکہ فوری طور سے جنگ بڑی تیرہ و تاریک صورت اختیار کرچکی تھی۔ اپریل 1940ء سے دسمبر 1942ء تک کے مرحلے میں

جنگ برق رفتاری سے آگے بڑھی۔ مئی میں ہالینڈ نے ہتھیار ڈال دیے اور تھوڑے عرصہ کے بعد بلجیم کو بھی یہی کرنا پڑا۔ جرمنی کے طوفانی دستے سویڈن میں گھس پڑے اور انھوں نے فرانسیسی اور برطانوی فوجوں کے درمیان دراڑ ڈالدی۔ ان کے زبردست حملوں کی وجہ سے فرانس کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ فوجیں 11 ر جون کو پیرس سے ہٹ گئیں اور انھوں نے جنگ بندی کی درخواست کی۔ فرانس کے سارے اٹلانٹک ساحل پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا۔ برطانوی فوجوں نے ڈنکرک کے ساحل کے بڑے حصہ کو خالی کردیا۔

جون میں جرمنی کی کامیابی اور فتوحات نے اٹلی کو فاتح کا ساتھ دینے پر آمادہ کردیا۔ اطالوی فوجیں سوڈان میں داخل ہوگئیں اور برطانوی فوجیں سومالی لینڈ پر حملہ آور ہوئیں۔ انگلستان کو یک وتنہا فاتح کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہٹلر نے بے یارومددگار انگلستان کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر دن رات زبردست بمباری برق رفتاری سے شروع کردی اور رودبار انگلستان کے قریب اپنا بحری بیڑہ حملہ کے لیے تیار رکھا۔ 1940ء کے موسم گرما اور خزاں میں برطانیہ کی جنگ نے بڑی شدت اختیار کی اور انگلستان کی حالت بہت نازک اور خطرناک ہوگئی۔

دوسری بڑی ہی خطرناک صورتحال انگلستان کے لیے گھر ہی میں پیدا ہوگئی جب جرمن آپ دوزوں اور ہوائی جہازوں نے برطانوی تجارتی جہازوں پر جو برطانیہ کی رگ جان کی حیثیت رکھتے تھے حملے کیے۔

جب برطانیہ کی لڑائی جاری تھی اور برطانیہ کو زبردست نقصان اٹھانے پڑ رہے تھے۔ اندازہ لگایا گیا تجارتی جہازوں کا اوسطاً 4 لاکھ ٹن کا نقصان ہوا۔ لیکن یو بوٹ کی جنگ برطانیہ کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی کیونکہ اس وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے متحدہ سلطنت یعنی یونائیٹڈ کنگڈم (.U.K) کی امداد شروع کردی اور بالآخر امریکہ جنگ میں شریک بھی ہوگیا۔

ستمبر 1941ء تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ بغیر جنگ میں شامل ہوئے انگلستان کی ہر مدد کرتا رہا۔ اس مدد سے انگلستان کو زبردست فائدہ پہونچا۔ مارچ 1941ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر نے پٹے (Lease and lend Bill) اور قرضے پر دستخط کردئے۔ اس کے علاوہ امریکنوں نے سمندر کا آئس لینڈ سے لیکر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساحلی علاقے / خطے پر گشت کرنا شروع کردیا اور اس سے ان نقصانات میں زیادہ کمی ہوئی اور حملہ کا خطرہ ٹل گیا۔

1941ء میں جنگ کی صورتحال قدرے بہتر ہوئی۔ اگرچہ انگلستان پر حملوں کا خوف کم ہو چکا تھا لیکن قسمت اب بھی نازیوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ جب جرمنوں نے شمالی افریقہ پر قبضہ کرلیا اور اس کی وجہ سے مصر کے لیے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور اپریل اور مئی میں ایک بڑے ہی تیز اور زبردست حملے میں انھوں نے یونان اور کریٹ کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد ہٹلر سے فتوحات کے ذریعہ بہت بڑا بننے کا خبط میں ایک بڑی ہی زبردست غلطی سرزد ہوئی یعنی اس نے 22/ جون 1941ء کو روس پر حملہ کردیا۔

روس پر حملہ کے بعد چرچل اور روزویلٹ ارجنٹائنا میں اس کے بحری اڈے نیو فاؤنڈ لینڈ میں ایک جہاز کے عرشے پر ملے۔ اگرچہ وہ کسی جنگی معاہدہ میں باضابطہ طور پر شامل نہیں ہوئے لیکن دونوں نے 12/ اگست 41ء کو اٹلانٹک چارٹر پر دستخط کردئے عملاً یہ منشور نازیوں کے خلاف تھا کیونکہ اس کی دفعہ 6 میں نازی ظلم وستم کو ختم کرنے کے بارے میں کہا گیا تھا۔

فرانس کو پہلے ہی مار گرایا گیا تھا اور برطانیہ تمام تر دفاعی پوزیشن میں تھا اس لیے اپنی فتوحات پر نازاں جرمنی روس کی طرف پر بڑھا۔ ایک جرمن فوج بڑی سرعت سے سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) کی طرف بڑھی۔ دوسری نے ماسکو کی طرف یلغار

کی، تیسری یوکرین ہوتی ہوئی اسٹالن گراڈ کی طرف بڑھی۔ ہٹلر کو پوری پوری امید تھی کہ وہ چھ مہینے کی مدت میں روس کو گھٹنے ٹیکنے پر یعنی شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کا یہ اندازہ بالکل غلط نکلا۔ بہر حال جرمنی اس وقت ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اور اس کی قوت سے مقابلہ ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

یورپ کے مشرقی اور مغربی محاذوں پر، افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں جو خطرے پیش آرہے تھے اور آنے والے تھے کے ساتھ ایک نیا اور خوفناک خطرے کا مشرق بعید میں اضافہ ہو گیا۔ 1941ء میں جاپان نے جزیرہ ہوائی کی بندرگاہ پرل ہاربر پر تباہ کن حملہ کر دیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جاپانی، فلپائن، ملایا (موجودہ ملیشیا) اور جنوب مشرق میں برطانوی اور ڈچ مقبوضات پر چڑھائی کی۔ 7 رفروری 42ء کو برطانیہ کو سخت نقصان اٹھانے پڑے۔ سنگاپور بھی جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور برما میں ان کی پیش قدمی کو نہ روکا جا سکا اور وہ یعنی جاپانی برما کے جنگلوں کی طرف سے آسام کی طرف بڑھے اور 42ء کے وسط تک جنگ ہندوستان کی سرحد تک آ گئی۔

پرل ہاربر کے حملہ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنگ میں شامل ہونے کے سارے پس و پیش اور تامل کو ختم کر دیا۔ جہاں ایک طرف جرمنی اور اٹلی نے بڑی خوشدلی سے جاپان کا ساتھ دیا تو دوسری طرف ریاستہائے متحدہ امریکہ نے ان تینوں کے خلاف جنگ کا فوری اعلان کر دیا۔ اس طرح اب جمہوری قوموں کو صنعتی اور اقتصادی قوت کے بے شمار اور بے حساب وسائل میسر ہو گئے۔

چرچل نے اپنی کتاب میں یہ لکھا کہ 'کوئی امریکن مجھے غلط نہ ٹھہرائے گا اگر میں یہ کہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جنگ میں اپنے حلیف کی حیثیت سے دیکھ کر میری خوشی اور مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس طرح بہر حال ہم فتحیاب رہے۔ انگلستان زندہ رہے گا یا برطانیہ زندہ رہے گا اور قوموں کی دولت مشترکہ اور شہنشاہیت زندہ

رہے گی، ایڈورڈ گرے کے الفاظ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ پانی کو گرم کرنے کے انجن کی طرح ہے۔ جب ایک دفعہ اس مشین میں آگ سلگائی جائے تو وہ جتنی طاقت اور قوت پیدا کرتا ہے اس کا کوئی حد وحساب نہیں۔ اس کی یہ بے پناہ طاقت اور قوت اب پوری طرح حلیفوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب 1941ء کے آخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ جنگ میں کود پڑا۔ اس کی جنگی جسارت یا اہلیت نے جیت کی ترقی کی تھی۔ جب اس نے اسے ترقی دینا اور بڑھانا شروع کیا اس وقت انگلستان کو مسلسل ہزیمت ہو رہی تھی اور وہ ہر قسم کے نقصان اٹھا رہا تھا۔ شمالی افریقہ میں برطانوی اسلحہ جات جنگ بری طرح تباہ اور برباد ہو چکے تھے اور جنوبی مشرقی ایشیا میں اسے پے در پے ہزیمت اٹھانا پڑ رہی تھی۔ 1941ء میں اسے تقریباً 4 ملین ٹن کا جہازوں میں نقصان ہو چکا تھا اور 41ء میں یہ نقصان 7.8 ملین کی زبردست مقدار تک پہونچ گیا تھا۔ لیکن مغرب میں جنگ تقریباً ٹھیری ہوئی تھی۔ جرمن جنگی مشینری اپنی ابتدائی اقدامیت کھو چکی تھی۔ روس میں تینوں سمتوں کی طرف یلغار، سینٹ پٹیرز برگ کی طرف، ماسکو اور اسٹالن گراڈ کی طرف جو روک دی گئی تھی اور جرمنوں کو شمال افریقہ میں پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ جرمن برتری ختم ہو چکی تھی اور وہ اب پوری طرح دفاعی پوزیشن میں تھے اس لیے اسے انگلستان پر ہوائی حملے ترک کر دینے پڑے۔ جرمن فضائیہ کو زبردست نقصان اٹھانے اور بحر اوقیانوس واٹلانٹک میں امریکن بحری بیڑہ اور فضائی قوت کی وجہ سے جرمن یو بوٹوں کا پوری طرح صفایا کر دیا گیا تھا۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں صورتحال اب بھی غیر اطمینان بخش تھی لیکن یہ بات بالکل صاف تھی کہ اگر جرمنی کا قلع قمع کر دیا جائے تو تنہا جاپان برطانوی شہنشاہیت کے لیے خطرہ نہ تھا۔

9-برطانیہ ہندوستان کے مسئلے حل کرنے کی بجائے انھیں ملتوی کرتا ہے۔

جنگ کے دوسرے مرحلے میں جرمن حملے کا خاص نشانہ فرانس اور انگلستان تھے۔ فرانس شروع ہی کے مرحلے میں مار گرایا جاچکا تھا۔ ہٹلر نے اپنی ساری طاقت انگلستان کے خلاف لگادی۔ اس زندگی اور موت کی جدوجہد میں برطانیہ نے عزم مصمم اور مکمل اعتماد کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ جنگ کو جاری رکھنے کے لیے شہنشاہیت کے سارے وسائل پوری طرح استعمال کیے گئے لیکن نہ کسی قسم کا نیا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا اور نہ کسی قسم کا نیا تجربہ نظم ونسق میں کیا جاسکتا تھا۔ مستقبل یا آئندہ پر موجودہ کو ترجیح دی گئی۔ کنزرویٹو پارٹی جو اس وقت برسر اقتدار تھی انھیں لائنوں پر کام کر رہی تھی اور جب چرچل وزیر اعظم ہوئے تو وہ اس پالیسی پر بڑی سختی سے کاربند رہے۔ ٹوریوں میں ہندوستانی مسئلے پر وہ سب سے زیادہ رو کھے تھے۔ ان کے ذہن میں اب بھی وہی بیسویں صدی کے اوائل کی پرانی دنیا کا تصور تھا۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے اور شمالی مغرب میں مالاکنڈ کی مہم میں انھوں نے سکنڈ لفٹینینٹ کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اس وقت کی تفصیلات سے متاثر ہوکر 1932-33ء میں کنزرویٹو پارٹی کی موقف کی مخالفت کی۔

جب گول میز کانفرنس اور پارلیمنٹ میں ہندوستانی دستور پر غور کیا جارہا تھا، انھوں نے شیڈو کابینہ سے مستعفی ہوکر اپنی مخالفت کا برملا اظہار کر کے خاص اہمیت حاصل کی تھی۔ ان کی قیادت میں کسی بھی سیاسی ترقی وتبدیلی کا امکان نہ تھا لیکن دنیا کی رائے کی خاطر خاص کر امریکہ میں رائے عامہ کی خاطر کسی نہ کسی تحریک کو پیش کرنا ضروری ہوگیا تھا، جب ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یوروپ کے وسطی طاقتوں اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ستمبر 1939ء اور دسمبر 40ء کے درمیان اس قسم کی کوئی

ضرورت لاحق نہ تھی، اس لیے کہ اس مدت میں برطانیہ کا رویہ تمام تر غیر مصالحانہ رہا اور اس نے ہندوستانی رائے عامہ کو یک لخت نظر انداز کیا۔ انھیں ہندوستان میں رنگ روٹوں کی بھرتی، جنگی فنڈ میں ہندوستان سے روپیہ، اور جنگی سامان کی طرف سے اطمینان تھا۔ انھوں نے جنگ کے بارے میں کانگریس کے رویہ اور اس کے مطالبہ سے سخت برہمی کا اظہار کیا۔

10-سول نافرمانی

اس طرح سے جنگ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا جس میں برطانوی حکومت کے سر پر سخت خطرہ منڈلا رہا تھا اور ہندوستان کو تقسیم کا خطرہ درپیش تھا۔ اس خطرناک صورتحال کا مقابلہ کرنے یا اسے دور کرنے کے لیے برطانوی حکومت کوئی حل نہ پاسکی۔ نہ تو اسے ہندوستانی صورتحال کی سنگینی کا کوئی اندازہ تھا اور نہ اس کی پیش بینی کرسکتی تھی کہ تیزی سے بدلتی ہوئی جنگی صورتحال حالات کو کتنا زیادہ بدل دے گی۔ زیٹلینڈ نے اپنی آپ بیتی میں لکھا:

''ہم میں سے زیادہ تر جن کا 1935ء کے ایکٹ کے عمل درآمد سے تعلق تھا ان کے جذبات کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ ہندوستان میں جو حالات تھے ان سے قطعی یہ امید نہ تھی کہ جلد کوئی ترقی ہوگی۔ منزل تک دھندلی نظر آتی تھی۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ ہندستان کے نسلی، ذات پات اور مذہب کے اختلافات کی وجہ سے تھا۔'' سیموئل ہور کے لفظوں میں اس کو صاف لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس منظر نے مسئلے کو بالکل روک دیا تھا۔ ترقی کے راستہ میں دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ ہندوستان اپنے دفاع کو مؤثر طریقہ سے نبھانے کے قابل ہوسکے۔

اس کے ساتھ اس عظیم تحتی براعظم میں زبردست کثیر آبادی کے باعث بلا کا جمود

پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے دستور کے پیچیدہ اور بھدے میکنزم میں کسی قسم کی کوئی بھی تبدیلی ممکن نہیں۔ اتنی زیادہ اطمینان بخش یقین دہانیاں دی جا چکی ہیں کہ ذہنوں میں ترقی کی تیز رفتاری بجائے تیز رفتار ٹرین کے اسٹیم کی گاڑی ہو کر رہ گئی۔

انھوں نے پچھتاتے ہوئے اعتراف کیا کہ ایک مفروضہ یہ ہے جسے نتیجہ یا واقعات نے قطعی غلط ثابت کیا ہے کہ پچھلے الیکشن نے کانگریس کو ملک کے بہت بڑے حصے کے نظم و نسق (ایڈمنسٹریشن) پر کنٹرول یا اقتدار دلوادیا۔ انھوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ جمہوریت کا عمل ابھی جاری رہے گا اور اس کا اثر ریاستوں پر بھی پڑے گا۔ اس سے کانگریس کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہوگی اور اس کی مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز میں اکثریت ہوگی لیکن دو یا تین اڑچنیں حائل رہیں گی:

ایک، ہندوستان کی بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے کی عدم اہلیت اور دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات۔ کسی متعین سوچی سمجھی طویل المیعاد پالیسی کے نہ ہونے سے لندن اور دہلی کے عزت نشین بغیر نتائج اور عواقب پر غور کیے گھٹیا چالیں چلتے رہے اور ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پرانی پالیسی پر گامزن رہے۔

یہ خدشہ کہ مرکزی حکومت کانگریس کی ہوگی یا اس پر اس کی چھاپ ہوگی، حکمرانوں کی اصل پالیسی کا محرک بنا۔

کانگریس نے اپنے رام گڈھ کے اجلاس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل ہو جانے کے بارے میں اور سول نافرمانی کی تحریک کو چلانے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ 13 /اپریل 40ء کو زیٹلینڈ نے ایک نشریے میں دہرایا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی پائیدار حل بغیر

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سمجھوتے کے ممکن نہیں۔ انھوں نے 18 / اپریل 1940ء میں دارالامرا میں اعلان کیا۔ متحدہ ہندوستان کا تصور اس وقت حقیقی ہوسکتا ہے جب ہندوستان کے سب فرقوں میں سمجھوتہ ہو جائے۔ 8 / مئی 40ء کو زیٹلینڈ کی جگہ ایل۔ ایس۔ ایمرے نے بحیثیت وزیر ہند کے جگہ لی، وزیراعظم چرچل نے وزیر جنگ

ایڈن کو لکھا:

''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ہندوستان پر بہت زیادہ انحصار کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ بے شمار قومی دستے فلسطین اور مصر براہ بمبئی اور کراچی صحرائی راستوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہندوستان کوئی ایسی بات کر رہا ہے جو قابل ذکر ہو۔ میرا دراصل یہ خیال ہے کہ تم ایڈن، لائیڈ (نوآبادیوں کے وزیر) اور ایمرے مشرقی اور وسطی مشرق میں ہمارے معاملوں کو جو رابطہ نہ ہونے اور دوسری الجھنوں کے باعث پیدا ہو گئے ہیں، خوش اسلوبی سے حل کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تعریف اور مدح سرائی کا دور ختم ہو چکا جو جنگ کی شدید ضرورتوں کی وجہ سے لابدی ہو گیا تھا۔''

یہ کہ سامراجی منصوبوں میں محکوم ہندوستان کا کیا حصہ ہو، پہلی بار ہندوستانی مسئلوں کے بارے میں دارالعوام میں ایک سوال کا جواب دینے میں مسٹر ایمرے نے مداخلت کی جب انھوں نے 23 / مئی کو یہ کہا کہ ہماری پالیسی کی منزل یہ ہے کہ ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ میں مکمل اور مساوی ساجھے داری حاصل ہو۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے پیش رو نے 18 / اپریل کی تقریر میں کہا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کا کام ہے وہ دستور کی ایسی قسم کو مدون و مرتب کرنے میں جو ہندوستان کے حالات اور اس کے نقطہ نظر کے مطابق ہو، نمایاں حصہ لیں۔ جس منصوبے کی بنیاد پر یہ دستور متعین ہوگا اس پر جنگ کے خاتمہ کے بعد دوبارہ غور وخوض کیا جائے گا۔ اس

کے لازمی معنی یہ ہیں کہ بحث و مباحثہ ہوگا، گفت و شنید ہوگی اور کسی کے فرمان یا نادری حکم پر نہ چلا جائے گا۔

اس میں بڑا شبہ ہے کہ اس بارے میں مسٹر ایمرے سنجیدہ تھے۔ ہر ایسی بات کر چکنے کے بعد کہ جس سے ہندو مسلم مفاہمت ناممکن ہو جائے وزیر ہند اور گورنر جنرل مختلف ہندوستانی ملتوں کو نصیحت کرتے تھے کہ وہ اسے بھول جائیں اور برادرانہ مستقبل میں امن و اتحاد کے ساتھ رہیں۔

کسی بھی برطانوی مدبر نے، مارلے اور منٹو سے لے کر ایمرے اور لن لتھ گو تک نے اپنے مسلمان دوستوں اور ان کے حامیوں پر انگشت نمائی نہیں کی کہ وہ نتیجوں سے باخبر اور آگاہ ہو جائیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو اس تباہ کن اور خودکشی کے طرز عمل یا رویے سے باخبر کریں۔ برطانوی حکمرانوں نے سامراجی مفاد کے تحت ان کی یعنی مسلمان فرقہ پرستوں کی پوری پوری اعانت کی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت طوطے کی طرح بلا تکان اسے رٹتی رہی کہ اس قسم کے دستور کو کبھی نافذ نہیں کیا جائے گا جس کی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مخالف ہو۔ اس نے کبھی مسلم لیگ کو اس پر سرزنش نہیں کی کہ ہندوستان کی اکثریت کے پسندیدہ اور مسلمہ تصور سے مسلسل سرتابی کرنا کسی طرح بھی خود ان کے مفاد میں نہ ہوگا۔ اس کے بالکل برعکس عرب یہودیوں کی ہجرت کے بعد جو فلسطین میں ایک ہزار سال سے زیادہ رہتے چلے آ رہے تھے قدرتاً اس کے شدید مخالف تھے کہ ان کی سرزمین کسی بیرونی نسل کے تسلط میں رہے۔

برطانوی حکومت بڑے شش و پنج میں مبتلا تھی۔ تحقیقاتی کمیشنوں نے تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ مالکم میکڈانلڈ نے جو 1939ء میں نوآبادیوں کے وزیر تھے اس شش و پنج کی کیفیت کو ختم کرنے کے لیے عربوں اور یہودیوں کو ایک کانفرنس میں مدعو کیا۔ یہ وہی طریقہ تھا جو ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اختیار کرنے سے

برطانوی حکومت کبھی نہیں اکتائی۔ ایمرے جو سمجھوتے کے ذریعہ مفاہمت کے زبردست حامی تھے، نے میکڈانلڈ کی تجویز کو اس لیے سراہا کہ شاید یہی کانفرنس بنیادی طور سے دو بالکل مختلف نقطہ نظر کو ہم آہنگ کر سکے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد ایک اور پالیسی کا اعلان وہائٹ پیپر یا قرطاس ابیض میں کیا گیا۔ لن لتھ گو کے اگست کے اعلان کے بعد اس کی رو سے آزاد فلسطین کا دس سال میں قیام اور فسلطینیوں کا ایڈمنسٹریشن کے سربراہوں کی حیثیت سے حصہ لینا اور ایک منتخبہ مجلس قانون ساز کا قائم ہونا تھا۔

ایمرے نے میکڈانلڈ کی اسکیم یا منصوبے پر یہ تبصرہ کیا کہ فلسطین کے حالات کے پیش نظر یہ بے معنی ہے، اس میں تمام تر لفاظی ہے اور اس میں کسی مثبت قسم کی اسکیم کا فقدان ہے۔

ہندوستان کے متعلق ایمرے کی اسکیم کے بارے میں بعینہ یہی تنقید کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے مسٹر جناح کو ڈکٹیٹر کی جگہ دی تھی۔ انھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ ان کی یعنی جناح کی شرطیں غیر معقول ہیں اور بنیادی طور سے کانگریس مطالبوں کی مخالف ہے لیکن انھوں نے کبھی مسلم لیگ سے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنی شرطوں پر نظر ثانی کریں اور نہ انھوں نے کبھی ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کسی مثبت منصوبے یا اسکیم پر غور کیا۔

انھوں نے کبھی اس پر غور نہ کیا کہ اس انتہائی متضاد سیاست کا کیا نتیجہ ہوگا اگر ہندو اور مسلمان متحد ہو گئے اور انھوں نے انھیں یعنی ایمرے کو شکر گذار ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ بظاہر ہندو، مسلمان اور برطانوی حکومت ملک کی آزادی کے لیے بنیادی شرط ملک کے اتحاد کو قرار دیتے تھے اور اس بارے میں بات کرتے تھے لیکن اس میں ہر فریق اس پر یعنی ملک کے اتحاد پر مختلف وجہوں سے زور دیتا تھا۔ برطانوی حکومت اس

کی بہت زیادہ شائق تھی اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ اس کا حصول ممکن نہیں۔ اپنی پرائیویٹ مراسلت میں وزیر ہند اور وائسرائے صاف صاف اس کا اعتراف کرتے تھے کہ یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے بہت خوش تھے کیونکہ اس کی وجہ سے انھیں برطانوی اقتدار کی منتقلی کو ملتوی کرنے کا معقول عذر ہاتھ آ گیا تھا۔

خواہشوں اور اندازے کے خلاف حالات نے پلٹا کھایا۔

جون میں اٹلی کے جنگ میں شامل ہو جانے سے بحر روم، شمالی افریقہ اور مشرق قریب میں اتحادیوں کے لیے صورتحال بہت ابتر ہوگئی۔ اس وجہ سے ہندوستانیوں کو اپنے مستقبل کے بارے بہت زیادہ تشویش ہوئی۔ اب ان کے خدشات اور اندیشوں کو دور کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

کانگریس نے حکومت کو ایک موقعہ اور دیا۔ 4/ جون کو گاندھی جی نے اعلان کیا کہ وہ یونائیٹڈ کنگڈم یا یو کے کی تباہی و بربادی کی وجہ سے آزادی کے خواہاں نہیں اور وہ اس کے لیے جنگ کے خاتمے تک کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ 21/ جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولوشن میں کہا گیا کہ عدم تشدد کو ہندوستان کی آزادی کے لیے استعمال کیا جائے گا اور یہ ملک کے دفاع اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ناقابل عمل ہے۔ اس ریزولوشن کی وجہ سے گاندھی جی نے کانگریس سے اور اس کی قیادت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس سے اس کا صاف اشارہ تھا کہ کانگریسی جنگ اور مساعی جنگ میں حصہ لینے کے لیے سے پوری طرح تیار ہیں اور سر دست ان کے سامنے سول نافرمانی کے پروگرام کے شروع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر جولائی کے شروع ہفتوں میں طول طویل مباحثوں کے بعد کانگریس نے اپنی شرطیں پیش کیں۔ اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کا اعلان کرے کہ ہندوستان کی منزل آزادی ہے اور فوری طور سے قومی حکومت قائم کرے۔

اس کے جواب میں گورنر جنرل نے ہندوستانی لیڈروں سے گفت وشنید کی اور 8/اگست کوشملہ سے ایک اعلان جاری کیا گیا جس کا مقصد سیاسی تعطل کو دور کرنا تھا۔اس اعلان میں (3) تجویزیں پیش کی گئیں تھیں:

(1) وائسرائے کی ایگزیکٹوکونسل میں ہندوستانی نمائندوں کومقرر کر کے اس کی فوری توسیع

(2) ایک جنگی مشاورتی کونسل کا قیام جس میں برطانوی ہنداور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں اوراس کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کریں۔

(3) ان عملی اقدامات کوترقی دینا جن کی بدولت ہندوستانیوں میں طرز حکومت کے بارے میں سمجھوتہ ہو جو جنگ کے بعد کوئی نمائندہ جماعت طے کرے اور ان طریقوں کوبھی بڑھاوادے جن سے یہ جماعت دستور کے تعلق سے اصولوں اور اس کے خاکہ کے بارے میں فیصلہ کرے۔

ایمرے نے اپنی 14/اگست کی تقریر میں اسے تسلیم کیا کہ اگر درجہ نوآبادیات کے تعلق سے جنگ کے بارے میں فیصلہ ہو جاتا ہےتو پھر جنگ کے دوران بھی اس بارے میں بحث مباحثہ ہوسکتا ہےاور گفت وشنید بھی۔

یہ بیان ظاہر ہے کہ حق پرستوں کومطمئن نہ کرسکا اس لیے کہ کانگریس فوری طور پر جمہوری ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کررہی تھی اور برطانوی حکومت نے ہندوستانی نظم ونسق یاایڈمنسٹریشن کے آمرانہ نظام میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس پیش کش کا مطلب صرف یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہندستانی مجلس قانون سازکو ذمہ داری منتقل کرنے کے بجائے چند ہندوستانیوں کو وائسرائے کہ ایکزیکیٹو کونسل میں شامل کرلیا جائے۔اس پیش کش سے صرف مسلم لیگ خوش تھی، کہ ایمرے نے اس کے نقطۂ نظر کی حمایت کی تھی۔

گاندھی جی اس نتیجے پر پہونچے کہ حکومت کا ارادہ معاملوں کو طے کرنے کا نہیں ہے۔15 ستمبر کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے گاندھی جی سے دوبارہ کانگریس کی قیادت سنبھالنے کی درخواست کی۔ ایک انگریزی اخبار کو انھوں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا: یہ یعنی حکومت، ہندوستان جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے اور انگلستان کے درمیان خلیج کو وسیع کر رہی ہے۔ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ جمہوریت کو پوری طرح ختم کیا جارہا ہے یا توڑا جارہا ہے۔ ان حالات میں قومی عزت اور وقار کا تقاضا ہے کہ ملک مناسب اور ضروری جواب دے۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کو خارج از بحث قرار دیا تھا کیونکہ وہ حکومت کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ صرف انفرادی سول نافرمانی کا راستہ رہ گیا تھا جو حکومت کے اختیار یا اقتدار کے لیے کسی قسم کے چیلنج کا باعث نہ تھا۔ ضرورت صرف ایک اخلاقی تحریک کی تھی اور اس کے لیے ایک اخلاقی مقصد کی ضرورت تھی۔ ان کے یعنی گاندھی جی کے نزدیک آزادی تقریر ہر انسان کا اخلاقی حق تھا۔ سارے جمہوری ڈھانچے کی بنیاد آزادی تقریر تھی۔ برطانوی مدبرین بار بار اس کا اعلان کرتے تھے کہ وہ جنگ آزادی اور بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کہاں تک ان کے یہ اعلانات صحیح تھے اس کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس لیے گاندھی جی 2 ستمبر کو وائسرائے سے ملے اور انھوں نے ان کے سامنے یہ متبادل پیش کیا کہ وہ آزادی تقریر کے حق کو معہ اس کے مضمرات کے تسلیم کرلیں یا پھر اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کردیں اور اس کے نتیجے بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ ایک وحشت ناک اور خطرناک پسند تھی کیونکہ اس نے برطانیہ اور ہندوستان کے مابین اس مسئلہ کو بالکل صاف کیا کہ ہندوستان میں حکومت محض طاقت کے زور سے ہوگی یا رضامندی سے۔ ان کے جو بھی ذاتی خیالات رہے ہوں یا جو بھی ذاتی رائے ہولن لتھ گو نے سامراجی طاقت کے ایک نقیب یا ایجنٹ کی طرح ایک ہی ممکن جواب دیا۔ جنگ بہرصورت عقل اور اخلاق کی

مکمل نفی کرتی ہے اور ان تمام تصورات کو جو جنگ کو جاری رکھنے کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالنے کا باعث تھے خواہ اخلاقی اعتبار سے کتنے زیادہ صحیح اور اعلیٰ ہوں ان کو جنگ کی فوری ضرورتوں کے پیش نظر قربان کر دینا چاہئے۔

2، 4 اور 5 / اکتوبر کے 'ہریجن' اخبار میں گاندھی جی نے متعدد مقاصد اور تمام اسباب کو بیان کیا جن کی وجہ سے وہ اس راستہ پر چلنے پر مجبور ہوئے۔ 4 / اکتوبر کے مضمون میں انھوں نے لکھا کہ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح قدم اٹھانے میں ناکام ہوئے جب کہ ایسا کرنا بہت آسان تھا۔ اگر ہندوستان جنگ میں پوری طرح حصہ لینے کی موافقت میں ہے تو پھر انھیں یعنی برطانوی مدبرین کو سارے مخالف پروپیگنڈے کو بہ آسانی نظر انداز کرنا تھا لیکن رائے کے اظہار کی آزادی کو پوری طرح سے ختم کر دینا بشرطیکہ اس میں تشدد کی آمیزش نہ ہو برطانیہ کے اس دعوے کو ہندوستان اپنی مرضی اور خوشی سے اس جنگ میں حصہ لے رہا ہے، جھٹلا رہا ہے۔

11 / اکتوبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے انفرادی سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ 21 / اکتوبر کو ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی گرفتار کیے گئے۔ اس کے بعد بہت سے افراد بشمول جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کیے گئے۔

انفرادی سول نافرمانی کی مہم ونوبا بھاوے کی تقریر سے شروع ہوئی جس میں ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف جنگ میں ڈھکیلنے کے لیے احتجاج کیا گیا۔

17 / اکتوبر سے لے کر دسمبر 41ء تک یہ تحریک چار مرحلوں سے گذری۔ پہلے مرحلہ میں صرف چند افراد نے ستیہ گرہ کی مثلاً ونو بھاوے، جواہر لال نہرو، دوسرے مرحلے میں جو نومبر میں شروع ہوا اور جنوری 41ء تک جاری رہا، اس میں وہ ستیہ گرہی تھے جنھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے ممبروں کی نمائندگی کی جس میں کل ملا کر 11 ورکنگ کمیٹی کے ممبر 196

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور مجالس قانون ساز کے 400 ممبروں نے ستیہ گرہ کی۔ ان میں پٹیل، راج گوپال آچاریہ اور مولانا آزاد شامل تھے۔

تیسرے مرحلے میں جو جنوری سے اپریل 1941ء تک رہا، ایک بڑی تعداد کو ستیہ گرہ کرنے کے لیے چھانٹا گیا۔ ستیہ گرہیوں کی فہرستیں مقامی کانگریسی جماعتوں نے تیار کیں اور اس مرحلہ کے اختتام پر دو ہزار دو سو لوگ جیل گئے۔

چوتھا مرحلہ اس طرح خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس میں ٹیگور کا جنگ کی سفاکیوں اور ہلاکت خیزیوں کے بارے میں احتجاج شامل تھا۔ انھوں نے ساری دنیا کے نام اپنے پیغام میں کہا:

''اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم تہذیب کے اس ڈھکوسلے کا جو طاقت کے بل پر حکومت کرنے پر پورا یقین رکھتی ہے اور جو کہ آزادی کو بالکل نہیں پسند کرتی یا تسلیم نہیں کرتی کسی قسم کا لحاظ کروں۔ اپنی تہذیب کی قدروں کو ہندستانیوں کو سکھانے سے انکار کرکے ہندوستان سے انتہائی رشتے کو ختم کرکے انگریزوں نے ہمارے لیے ترقی کے سارے راستے بند کر دیے ہیں۔''

شاعر نے ہندوستان کے اخلاقی ضمیر کی نمائندگی کرتے ہوئے برطانیہ کا موازنہ کیا ہے اور اس میں بڑی کمی پائی۔ یہی مہاتما گاندھی کا جواب تھا جو انھوں نے ان نکتہ چینوں کو دیا تھا۔ انھوں نے بتلایا کہ ستیہ گرہ ایک اخلاقی احتجاج ہے۔

اس مہم کے اس مرحلے میں کانگریس کے عام کارکنوں نے اپنے کو ستیہ گرہ میں بھرتی کر دیا اور گرمیوں کے وسط تک بیس ہزار افراد کو سزائیں ہوئیں۔ متعدد ممبروں اور متعدد ہندوستانیوں نے اس بے حس اذیت رسانی پر بے اطمینانی اور تشویش کا اظہار کیا۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس تعطل یا جمود کو ختم کرنا چاہا لیکن ایمرے نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اس کے برعکس دارالعوام میں ایک طول طویل تقریر میں

کانگریس ہائی کمانڈ کی ملامت کی کہ اس نے 7 صوبوں کے 30 تمیں کروڑ باشندوں کو حکومت خود اختیاری کے طور طریقوں اور روایتوں کے قائم کرنے کے موقعہ سے محروم کر دیا۔ اس تقریر نے مسلمانوں اور والیان ریاست کے ہندوستان کی مرکزی حکومت میں حصہ لینے کے بارے میں پس پیش اور تامل کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کر دیا۔

اس تقریر نے گاندھی جی کو 2 / اپریل 41ء کو ایک بیان دینے پر مجبور کیا جس کا خلاصہ مشہور لبرل لیڈر سری نواس شاستری نے اپنی ایک تقریر میں بیان کیا جس کے ہر لفظ سے غصہ چمکتا ہے جو مہاتما گاندھی کے معمول کے بالکل خلاف ہے۔

گاندھی جی نے پر زور الفاظ میں کہا: مسٹر ایمرے جو حد سے زیادہ یہ دوہرا تے ہیں ہندوستانی سیاسی پارٹیوں کو آپس میں متحد ہونا ہے اور تب ہی برطانوی حکومت متحدہ ہندوستان کی مرضی کو پورا کرے گی، ہندوستانی فہم اور دانشمندی کی توہین کی ہے۔ ایمرے کو میں نے یہ بار بار جتلایا کہ یہ برطانوی حکومت کی روایتی پالیسی رہی ہے کہ سیاسی پارٹیوں کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' قابل فخر اصول رہا ہے۔ برطانوی مدبرین ہی ہندوستان میں تفرقے کے ذمہ دار ہیں کیونکہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان نہ پاٹی جانے والی خلیج ہے۔ اگر وہ ہندوستان سے چلے جائیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ مسلم لیگ اور کانگریس اور دوسری پارٹیاں اپنے مفاد کی خاطر آپس میں سمجھوتہ کر لیں گی۔ خالص ہندوستان کی حکومت چلانے کے لیے خالص ہندوستانی بنیاد پر ہم دستور مرتب کر لیں گے۔

انھوں نے کہا کہ مسٹر ایمرے سچائی اور حقیقت کو پس و پشت ڈال کر اپنے سامعین کو گمراہ کر رہے ہیں۔ 'وہ سب یا کچھ نہیں' کی پالیسی پر عامل ہیں۔ انھوں نے انھیں یاد دلایا کہ جون 1940ء میں برطانوی رائے عامہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کانگریس

نے حکومت کے ساتھ عدم تعاون کو ترک کردیا تھا اور ستمبر میں خود انھوں نے اقرار کیا برطانوی حکومت نے نہ تو ہندستان کو آزادی دی اور نہ اس کی آزادی کا اعلان کیا۔ اگر آزادی تحریر اور تقریر دے دی جائے تو کانگریس مطمئن ہو جائے گی۔

11- جنگ کی رفتار اور اٹلانٹک منشور

ایک طرف ایمرے اور لن لتھ گو کانگریس کی مذمت اور ملامت کے پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھے اور دوسری طرف قوم کے لیے اپنے کو وقف کرنے والے زائرین، سچائی، صداقت، ہمدردی، عدم تشدد کے جام خونی کی تلاش میں بڑھ رہے تھے۔ کثیر مقدار میں جدید ترین جان لیوا ہتھیاروں سے مسلح طاقت ور جرمن فوجیں روس کے وسیع میدانوں میں بڑھ رہی تھیں۔ سراسیمہ اور حواس باختہ یورپ بڑے خوف واندیشوں میں بدقسمتی کے احساس کے ساتھ جنگ کی برق رفتاری کو دیکھ رہا تھا جس کی وجہ سے ظاہر میں بہت تھوڑی مدت میں روس تہہ وبالا ہو جاتا اور اپنی فتح کے نشے سے سرشار ہٹلر سارے یورپ کو اپنے زیرنگیں لاکر جزائر برطانیہ کو فتح کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہوتا۔

ہٹلر کے روسی حملہ نے برطانوی اوسان اور ان کے ٹھنڈے ذہن کو برقرار رکھا۔ 11 رمہینے کے سوچ بچار کے بعد ایمرے کو 22 رجولائی کو حکومت کی 18 راگست 1940ء پیش کش کا اعلان کرنا پڑا۔ اس پیش قدمی کی وسعت کے جواز میں اور کانگریس کو رام کرنے کے لیے انھوں نے بلاوجہ یہ چبھتا ہوا فقرہ کہا: ’’جس طرح بلجیم ایک ہے، ہالینڈ ایک ہے اسی طرح ہندوستان بھی ایک ہے۔‘‘

بعض لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ ان لوگوں اور قوموں کے لیے جو اپنے دلوں میں آزادی کی زبردست تمنا رکھتے ہیں منشور بہت بڑا سہارا ثابت ہوگا کیونکہ اس کی

دفعہ 3 کے تحت لوگوں کے اس حق کو کہ وہ جس قسم کی حکومت اپنے ملک کے لیے چاہتے ہیں تسلیم کرلیا گیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وزیر خارجہ کا ڈول ہل کا خیال تھا کہ عملاً اس منشور کے سارے اصول عالمگیر پیمانے پر عمل درآمد کے قابل ہیں۔ کلیمنٹ ایٹلی برطانیہ کے نائب وزیر اعظم نے لندن میں مغربی افریقہ کے طلباء کے ایک گروپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک کی حکومت کی طرف سے ان اعلانوں میں کوئی ایسی بات نہ ملے گی جس سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ آزادی اور سماجی تحفظ جس کے لیے ہم لڑرہے ہیں بنی نوع انسان کی کسی بھی نسل کے لیے نفی میں ہو۔ بعینہ اس انکار کو دسمبر 41ء میں چرچل نے دارالعوام میں جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے دوہرایا۔

''اٹلانٹک میٹنگ میں ہمارے ذہن میں بنیادی طور سے یہ تھا کہ یورپ کی جو قومیں اور مملکتیں ناتی (نازی) تسلط میں ہیں ان کی حاکمیت اور ان کی حکومت خود اختیاری اور ان کی قومی زندگی کو بحال کیا جائے اور ان کی علاقائی سرحدوں میں تبدیلی کی جائے جہاں ضروری ہیں۔ لیکن اب ان خطوں یا قوموں یا لوگوں کو جو تاج برطانیہ کے حلقہ بگوش ہیں اور انھوں نے تدریجی حکومت خود اختیاری میں کس حد تک ترقی کی ہے کا مسئلہ بالکل ہی الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

ایمرے کی 22/جولائی کی تقریر اٹلانٹک منشور کی صاف، واضح اور غیر مبہم تعبیر ہے۔ لن لتھ گو کی چرچل کے اصول کی آنکھ بند کرکے تائید نے گاندھی جی کی اس رائے کو بالکل صحیح اور ناقابل تردید ٹھہرایا کہ برطانوی حکمرانوں کے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے دیے جانے کے وعدے محض ہندوستان اور دنیا کو دھوکہ دینے کے مترادف تھے اور یہ کہ یہ خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

ایمرے اور لن لتھ گو کی پیچیدہ گفتگو اور چرچل کے بے رحمانہ دعوے کے بعد کسی

بھی خود دار قوم پرست کے لیے ممکن نہ تھا کہ جنگ میں حکومت سے کسی قسم کا تعاون کرے اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق آزادی تقریر کے اپنے اخلاقی حق پر زور دینے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ رہا اگر چہ اس کی وجہ سے قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے قید و بند بھی بھگتنا پڑتا تھا۔

سول نافرمانی کی تحریک اس زمانے تک جاری رہی جب جاپان کا خطرہ ہندوستان کی فضا اور اس کے ملحقہ سمندروں پر منڈلانے لگا۔25 ہزار ستیہ گرہی جیلوں میں بند تھے۔ جنگ کی نئی صورتحال کے پیش نظر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف گاندھی جی کے مکمل اہنسا یا عدم تشدد کے اصول سے اختلاف کیا اور اس وجہ سے 15 دسمبر کو گاندھی جی کانگریس کی قیادت سے علیحدہ ہو گئے ۔حکومت نے قیدیوں یعنی ستیہ گرہیوں اور کانگریس کے لیڈروں کو رہا کر کے سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کرنے میں مدد کی۔ جواہر لال نہرو اور آزاد 3 دسمبر کو رہا کر دیے گئے اور اس کے بعد دوسرے بھی۔

12- مسلم لیگ کا بڑھتا ہوا سخت رویہ

اس گفت وشنید کے دوران جو گورنر جنرل نے کانگریسی لیڈروں سے کی مسٹر جناح بڑی ہوشیاری سے اپنے اس مقصد یا حکمت عملی پر جمے رہے کہ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان اچھے تعلقات رکھے جائیں۔ ان کی اس خواہش اور ارادے کو حکومت نے پورا کیا۔ بیرابورن جو اگست 1938ء میں لن لتھ گو کی مختصر رخصت کے دوران قائم مقام وائسرائے رہے تھے انھوں نے انگلینڈ کو ان تجویزوں کے بارے میں مطلع کیا جو جناح اور سکندر حیات خاں نے مسلمانوں کے حکومت سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے پیش کی تھیں۔ اس بیان کے مطابق جناح نے یہ چونکا دینے والی

اور ششدر کر دینے والی تجویز پیش کی کہ ہمیں یعنی برطانوی حکومت کو مرکز کو اسی طرح قائم رکھنا چاہئے یعنی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنا چاہئے اور اگر ہم نے ایسا کیا تو مسلمان مرکز میں ہمارا تحفظ کریں گے یعنی ہماری حمایت کریں گے۔

سکندر حیات خاں نے فیڈرل اسکیم کے افتتاح یعنی اس کو نافذ کرنے کی مذمت کی۔ اس لیے اس کا مطلب سیدھا کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلنا تھا اور یہ کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیا گیا تو وہ اچھے اور برے ہر حال میں ہمارا یعنی حکومت کا ساتھ دیں گے۔

مسلم لیگ نے حکومت کی اس ضرورت کا پورا فائدہ اٹھایا اور پٹنہ سے ایک غیر مبہم اعلان شائع کیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنے یا اسے مدغم کرنے پر کبھی بھی راضی نہ ہوگی۔ اس نے انگلینڈ کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ وائسرائے کی اس مسئلے کو حل کرنے کی ساری کوششیں ان ہی کے رویے کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ اس باب میں زیٹلینڈ نے اپنی خودنوشت میں جو تاویلیں دی ہیں اور صورتیں پیش کی ہیں وہ ناقابل فہم ہیں۔ اس میں بھی شک ہے کہ انھوں نے اپنے خلاف ہیلی فاکس اور ٹمپل وڈ کے عائد کردہ الزامات کے اطمینان بخش جواب دیے ہیں۔

جب جنگ اس خطرناک ترین مرحلہ میں داخل ہوئی تو زیٹلینڈ نے ایک نشریہ میں مسلم لیگ کو بڑی تقویت پہونچائی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ

''مجھے پورا یقین ہے کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت نہیں ہو جاتی ہندوستان میں کوئی بھی پائیدار سمجھوتہ ممکن نہیں۔''

18 / اپریل کو انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں پھر دوہرایا گیا کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں سمجھوتہ دستوری ترقی کی پہلی شرط ہے۔ انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس پارٹی نے مسلمانوں کے ذہنوں میں بڑے گہرے اندیشے پیدا کر دیے ہیں

جو وہ خود ہی دور کر سکتی ہے۔

کانگریسی لیڈروں سے لے کر اس کے عام کارکنوں تک کا یہ مطالبہ کہ مرکز میں اقتدار کی منتقلی ہو مسلم لیگ کے لیے سخت ناگواری کا باعث بنا اور مسلم لیگ کو حکومت نے پوری طرح بڑھاوا دیا اور اسے پورا سہارا دیا۔ یہ مطالبہ مسلم لیگ کے لیے ناقابل قبول تھا۔

اسی اثنا میں بعض مسلم لیڈروں کو مسٹر جناح کے سخت اور غیر مصالحانہ رویہ کی وجہ سے شکوک پیدا ہوئے۔ فضل الحق نے اتحاد کی اپیل اور سکندر حیات خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ 31 افراد پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دستوری اور فرقہ وارانہ دشواریوں کو حل کرے۔ 7 / جون کو دونوں پریمیرز یعنی وزرائے اعلیٰ بعض کانگریسی لیڈروں سے ملے اور ان سے سیاسی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا۔ اس پر مسٹر جناح نے بڑی خفگی اور ناراضگی کا اظہار کیا اور ان دونوں کی اس پر ملامت کی وہ اپنی ان کارروائیوں اور سرگرمیوں سے مسلم یکجہتی کو کمزور کر رہے ہیں۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے اس پر اطمینان ظاہر کیا کہ وائسرائے کے 18 / اگست کے اعلان اور مسٹر ایمرے کی پارلیمنٹ میں تقریر نے مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی طرف خاص توجہ کی ہے۔

جب گاندھی جی لن لتھ گو سے انھیں مطلع کرنے کے لیے ملے کہ ان کا ارادہ آزادی تقریر کے حق کے لیے انفرادی سول نافرمانی کرنے کا ہے تو مسٹر جناح نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اسے فوری طور سے محسوس کیا کہ حکومت ان کی ملت یعنی مسلمانوں کی حمایت پر زیادہ سے زیادہ اکتفا کرے یا تکیہ کرے اور وہ مسلمانوں کے مفاد کی خاطر سودے بازی کریں۔ ان کا پہلا قدم یہ تھا کہ انھوں نے گورنر جنرل کی توسیع شدہ ایگزیکٹیو کونسل میں مسلم لیگ کو دو سیٹیں یا ممبران دیئے جانے کی پیش کش کو

نامنظور کردیا اور ہندو مسلم ممبران کے درمیان مساوات یا مساوی سیٹوں کے دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کو نہیں مانا گیا۔ اس پر 20 رنومبر کو ایمرے نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے اقدامات پر اظہار افسوس کیا اور یقین دہانی کی کہ ہم ایسے اقدام کو خوش آمدید کہتے ہیں جس سے ہندوستانی لیڈروں کو ہندوستانی دستور کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ملے۔ کانگریس نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے سے انکار کردیا لیکن مسٹر جناح نے کہا کہ برطانوی حکومت کے ترجمانوں نے حال میں اس کا اعلان کیا ہے کہ گفت وشنید کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ہم مسلمان بھی اس بیان کی پوری پوری تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گفت وشنید کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ کانگریس حکومت سے عدم تعاون کر رہی تھی اور مسلم لیگ حکومت کے ساتھ پوری طرح اشتراک عمل کر رہی تھی اس لیے مسٹر جناح کو قدرتاً اس کی توقع تھی کہ مسلمانوں یعنی مسلم لیگ کو 18 راگست کی پیش کش پر عمل کرنے کا موقعہ ملے گا۔ چونکہ حکومت نے ایسا نہیں کیا اس لئے مسٹر جناح نے حکومت کو ملزم گردانا اور ان لفظوں میں اسے لتاڑا کہ ''وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کی ناکامی برطانوی حکومت کی کمزور تذبذب اور غیر منصوبہ کن پالیسی کی وجہ سے ہے۔''

اب اسے سوائے اتفاق کے اور کس چیز پر محمول کیا جائے کہ مسٹر ایمرے اس جذبے کے تحت کہ کانگریس کو خوش کیا جائے ایک زبردست غلطی کے مرتکب ہوئے جو مسٹر جناح کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ یعنی ایمرے نے ہندوستان سے اپیل کی کہ وہ 'ہندوستان پہلے' کے نعرے کو سب سے آگے رکھیں۔ 14 رنومبر کو انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ شاید یہ تقریر کانگریس کو مسلمانوں اور والیان ریاست سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کردے اور شاید اس سے مسلمان بھی اس پر تیار ہو جائیں کہ وہ

فرقہ وارانہ حقوق پر اتنا زیادہ زور نہ دیں کہ اس سے ہندوستان کا اتحاد خطرے میں پڑ جائے اور شاید اس سے والیان ریاست بھی اپنی حکومت کے نظام کو باقی ماندہ ہندوستان کی سیاسی زندگی سے زیادہ ہم آہنگ کرسکیں۔

اتحاد کے لیے بعد از وقت زبانی جمع خرچ کیا گیا اور کوئی مناسب قدم نہیں اٹھایا گیا اور نہ کوئی مناسب کارروائی کی گئی، اس نے مسلمانوں کو برافروختہ کر دیا۔ جنوری 1941ء میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے مسٹر ایمرے کی تقریر پر شدید بے اطمینانی کا اظہار کیا اور یہ اعلان کیا کہ ان کا 'ہندوستان پہلے' کا نعرہ مسلمانوں کو یکسر انداز کرنا ہے یو پی مسلم لیگ نے دسمبر 1940ء میں اس تقریر کے خلاف 'اسلام پہلے' کا نعرہ بلند کیا۔

اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں مسلم لیگ نے پاکستان کے مطالبہ کو بعض تبدیلیوں کے بعد دوہرایا۔

مسلمانوں کے زخم خور جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے 22/اپریل 41ء کو مسٹر ایمرے نے یہ یقین دہانی دی کہ بذات خود دستور کو اور اس کی بنانے والی جماعت کو ہندوستان کی قومی زندگی کے اہم ترین عناصر کے باہمی سمجھوتہ کا نتیجہ ہونا چاہئے اور یہ ہندوستان کے آئندہ دستور کی کامیابی کے لیے پہلی شرط ہے۔

لیکن انہوں نے پاکستان کے متعلق مسلمانوں کو احتیاط اور ضبط سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس بحث سے دلچسپی نہیں کہ نام نہاد پاکستان کے منصوبے کے راستہ میں بڑی زبردست سیاسی دشواریاں حائل ہیں۔ وہ اس منصوبہ میں اس کی انتہائی صورت یا ماہیت پر اتنا زیادہ زور نہ دیں کہ اس سے ہندوستان کا اتحاد خطرے میں پڑ جائے اور شاید اس سے والیان ریاست بھی اپنی حکومت کے نظام باقی ماندہ ہندوستان کی زندگی سے ہم آہنگ کرسکیں۔

اتحاد کے لیے بھی محض زبانی جمع سے کام لیا گیا اور کوئی مناسب قدم نہیں اٹھایا گیا

اور نہ کوئی مناسب کارروائی کی گئی۔ اس نے مسلمانوں کو برافروختہ کر دیا۔

لیکن باوجود دونوں اہم ترین سیاسی جماعتوں کے مخالفانہ اور غیر ہمدردانہ رویہ کے جنگ کی صورتحال اس کی مقتضی تھی کہ مساعی جنگ میں ہندوستان زیادہ اور بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ اس پر جرمنی کے حملہ کے بعد حکومت نے 8/اگست 40ء کی پیش کش پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جولائی میں ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع کی گئی۔ اب اس کے ممبران کی تعداد بڑھ کر 12 ہوگئی۔ جس میں 8 ہندوستانی اور 4 برطانوی تھے، لیکن کانگریس اور لیگ کا کوئی ممبر کونسل میں شامل نہیں تھا۔ صرف پٹنہ کے سلطان احمد جو سربرآوردہ مسلم لیگی تھے وہ اس کونسل میں شامل ہوئے۔ تیس ممبروں پر مشتمل ایک قومی دفاعی یا ڈیفنس کونسل جس میں پنجاب، بنگال اور آسام کے پریمیرز یا وزراء اعلیٰ شامل تھے، قائم کی گئی۔ اس پر مسٹر جناح نے وائسرائے کی مذمت کی کہ انھوں نے ان کی مرضی اور رضامندی کے بغیر مسلم لیگیوں کو اس کونسل میں شامل کر لیا۔

مسٹر جناح اس قسم کی جسارت کر سکتے تھے اس لیے کہ انھوں نے لن لتھ گو کے قد و قامت کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور انھیں ان میں عقلمندی اور ہوش مندی کے فقدان کا پورا اندازہ تھا۔ کانگریس کے متعلق ان کی حکمت عملی بالکل صاف اور واضح تھی اور وہ اس کے منتظر رہتے تھے کہ کانگریس کا حکومت کی کسی تجویز اور اقدام کے بارے میں کیا ردعمل ہوگا۔ اور پھر اگر ان کے مفاد کا تقاضا ہوتا تو اس بارے میں اس کی تقلید کرتے اور یہ تاثر دیتے کہ کانگریس نے انھیں یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا گویا وہ کانگریس کی زبردست مخالفت کر کے حکومت کی پوری حمایت کرتے اور دونوں صورتوں میں فائدے میں رہتے۔

لیگ میں پیچیدہ صورتحال سکندر حیات اور فضل الحق کے ہتھیار ڈال دینے، سلطان احمد اور بیگم شاہ نواز کے اخراج اور گورنر جنرل کے ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع کی

مذمت کرنے سے ختم ہوئی۔حکومت کو سیدھے راستہ سے بھٹک جانے سے روکنے کے لیے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے 26ر دسمبر 41ء کے جلسہ منعقدہ ناگپور میں یہ دھمکی دی کہ اگر لیگ کی مرضی کے خلاف دستوری ترقی یا تبدیلی کے بارے میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ ڈاریکٹ ایکشن شروع کردے گی۔

لیکن واقعہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کی صفوں میں اتحاد اور یکجہتی اتنی مضبوط نہ تھی جتنا مسٹر جناح ظاہر کرتے تھے۔سکندر حیات اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ انھوں نے نیشنل ڈیفنس کونسل کی ممبری قبول کرلی تھی جو انھیں بعد میں چھوڑنی پڑی۔ انھوں نے مسلم طلباء کے انتہا پسندانہ فرقہ وارانہ جذبات کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔فضل الحق تذبذب میں رہے۔انھوں نے وائسرائے کے حکم کی تعمیل میں نیشنل ڈیفنس کونسل کی ممبری قبول کرلی تھی لیکن مسٹر جناح کی دھمکی کی وجہ سے وہ اس سے علیحدہ ہوگئے یعنی کونسل کی ممبری سے مستعفی ہوگئے۔اس کے بعد انھوں نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا لیکن پھر اس کے لیے معذرت خواہ ہوئے یعنی اپنے اس اقدام پر اظہار افسوس کیا۔اس وجہ سے ان کی مسلم لیگ کی ممبری بحال کردی گئی۔اس کے کچھ عرصے کے بعد انھوں نے مسلم لیگ سے بنگال کی وزارت میں اپنا اتحاد ختم کردیا اور ایک نئی پارٹی 'پروگریسو پارٹی' کی بنیاد ڈالی، اور ہندو سیاسی لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی مدد سے نئی کابینہ بنائی۔اس وجہ سے وہ مسٹر جناح کے شدید عتاب کا شکار ہوئے اور انھوں نے انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بقیہ دو مسلم اکثریتی صوبوں نے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے حکم کو مان لیا۔

کانگریس اور جمعیۃ العلماء سے وابستہ اور منسلک مسلمانوں کے علاوہ ممتاز اور مشہور ومعروف مسلمانوں کی مقتدر شخصیات اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل وغیرہ نے

مسلم لیگ کے نظریہ پاکستان سے شدید اختلاف کا اظہار کیا۔ لیکن برطانوی حکومت نے مسٹر جناح پر پورا پورا اعتماد کیا۔ دنیا کو دہلا دینے والے واقعات نے بھی ان کے اس رویہ کو ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ کیا۔

دسمبر 1941ء میں دنیا کی صورتحال نے بالکل ہی نیا موڑ لیا۔ 7ر دسمبر 1941ء کو جاپانی بم مار ہوائی جہازوں نے ہوائی کی بندرگاہ پرل ہاربر پر زبردست بمباری کی اور انھوں نے امریکن جنگی جہازوں کو تباہ و برباد کردیا اور اس طرح مغربی حلیفوں کے خلاف بڑی سخت جنگ کا اعلان کردیا۔ اسکے بعد انھوں نے یعنی جاپانی ہوائی جہازوں نے بڑی تیزی سے یوروپین اڈوں پر حملے کیے اور مشرقی ملکوں مثلاً فلپائن، انڈونیشیا، سیام (موجودہ تھائی لینڈ) ملایا (موجودہ ملیشیا) اور سنگاپور پر قبضہ کرلیا۔

جنگ بڑی تیزی سے ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر پہونچ رہی تھی۔
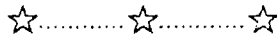
ساتواں باب

تجویز پاکستان

1 - پس منظر

24/ مارچ 1940ء کو مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک تجویز منظور کی جس کی رو سے فرقہ وارانہ بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم اور ایک آزاد اقتدار اعلیٰ کی مالک مملکت کے قیام کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اس تجویز سے جھلکتا ہے کہ وہ بڑی جلد بازی میں مرتب کی گئی تھی اور اس پر پورے طور سے غور و خوض نہیں کیا گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اس لیے پاس کی گئی کہ مسلم لیگ کے لیڈروں کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں جنگ کی صورتحال کی ابتری اور کانگریس کے رویے کے سخت ہوجانے کی وجہ سے حکومت کانگریس کے مطالبہ کو نہ مان لے۔

28/ فروری 1940ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی پٹنہ کی تجویز میں مکمل آزادی کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا دستور ایک دستور ساز اسمبلی مرتب کرے۔ اس نے اس بات کو بھی دوہرایا تھا کہ اگر حکومت اس کو اس کے مطالبے کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی یعنی اس کے مطالبے کو منظور نہیں کرتی تو وہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کردے گی۔ 19/ مارچ 1940ء کو رام گڑھ میں کانگریس کے اجلاس نے اس تجویز کی توثیق کی اور اپنے اس عزم یا ارادے کا اظہار کیا کہ وہ جنگ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک نہیں ہوگی۔

اس کے دو ہی روز بعد مسلم لیگ کے لیڈروں نے تجویز کے مطلب و مفہوم اور اس

کے مضمرات کو سمجھے بغیر اپنی قیام پاکستان کی تجویز کو پاس کر دیا۔ دراصل وہ سول نافرمانی کے بارے میں کانگریس کے ریزولوشن سے خائف ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس کو خطرے کا سگنل سمجھا اور اسے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ سمجھا اور اسے مسلمانوں کے سروں کو پستول کا نشانہ بنانے سے تعبیر کیا۔ لیگ کونسل انھیں خدشات کا شکار تھی اور انھیں خدشات کے تحت اس نے بڑی عجلت سے پاکستان کے حق میں تجویز پاس کر دی۔

کچھ عرصے سے ایک آزاد مملکت کا تصور بعض ذہنوں میں گشت کر رہا تھا۔ 1923 میں ساور کر نے 'ہندوتو' شائع کی جس میں انھوں نے ہندوؤں کی تعریف ان لفظوں میں کی: "ہر شخص ہندو ہے جو سندھ سے لے کر سمندروں تک سرزمین کو اپنا وطن سمجھتا ہے اور اسے اپنی مقدس سرزمین اور اپنے مذہب کا گہوارہ مانتا ہے۔" 1937ء میں انھوں نے مہا سبھا کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اعلان کیا: "آج ہندوستان کو متحدہ متجانس قوم نہیں تصور کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس ہندوستان میں دو قومیں ہیں: ہندو اور مسلمان اور یہ دونوں دشمن قومیں ساتھ ساتھ ہندوستان میں رہتی ہیں۔"

1924ء میں لالہ لاجپت رائے نے مسلم مملکتوں جو پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بنگال پر مشتمل تھا کا ایک منصوبہ تجویز کیا تھا۔

اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ کے 1930ء کے اجلاس میں ہندوستان میں مسلم مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ لیکن دراصل اقبال نے تقسیم ہند کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے اندر فیڈریشن میں خودمختار ریاستوں کا تصور پیش کیا تھا۔ انھوں نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ مرکزی حکومت مضبوط نہ ہو بلکہ ہندوستان صوبوں کا فیڈریشن ہو جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ

خودمختاری حاصل ہو۔ یہ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کی حیثیت رکھتا تھا۔لیکن ان کی تجویز پر غور نہیں کیا گیا۔

یہ بتایا جاتا ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا انعقاد اس لیے ہوا کہ ہندستان کی دستوری ترقی کے مسئلے کو طے کیا جائے۔ اس سے انگلستان کے سامراجی حلقوں اور ہندوستان کے بیوروکریٹوں کو بڑی تشویش ہوئی اور انھوں نے برطانوی انتہا پسندوں کے مقصد کو تاراج کرنا چاہا۔ اس گروہ کے سرغنہ چرچل، جارج لائڈ اور لارڈ سیڈنہم سابق گورنر اور دوسرے کئی تھے۔ سیموئل ہور اور پیل بھی اس گروہ کی حمایت میں تھے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے جج پلاؤڈن کے میمورنڈم میں جو ٹوری گروپ کو خفیہ طریقہ سے دیا گیا اور جسے Sunday Graphic (سنڈے گریفک) میں شائع کیا گیا کہ ہندوستانی مسئلے کا واحد حل ہندوستان کی ہندو مسلم حصوں میں تقسیم ہے۔لندن میں بمبئی کرانیکل کے خصوصی نمائندے نے لکھا کہ ہندستان کو ہندو اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی پوری پوری کوشش کی جارہی ہے۔ بمبئی سے بائیکاٹ کی دھمکی کی وجہ سے برطانوی تجارت کا مرکز کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔

1930ء میں تصور پاکستان سامنے آیا اور اس کا نام کیمرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی نے پیش کیا۔ بظاہر یہ بات ناقابل نظر آتی تھی کہ ہندوستانی سیاست کے زبردست اور حل نہ ہونے والے مسئلے کا حل ایک طالب علم پیش کرے۔ یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہ ہوتی اگر یہ تجویز کہیں باہر سے آئی ہوتی لیکن موجودہ معلومات کی روشنی میں اس کا کوئی متعین اور واضح ثبوت دینا ممکن نہیں۔ رحمت علی نے 1933ء میں ''ابھی ورنہ کبھی نہیں۔'' (Now and Never) کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں انھوں نے پاکستان کے تصور کی تشریح کی تھی لیکن جب ہندوستانی مسلم لیڈر جو اس پارلیمنٹری کمیٹی کو مدد دینے لندن گئے اور

پاکستان کے منصوبے کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے اسے اسکول کے لڑکے کا بچکانہ عمل قرار دیا۔

1933ء میں اسٹیٹس مین کلکتہ اور جون 1934ء کے ایسٹرن ٹائمس اور اکتوبر 1935ء میں لاہور کے ٹریبون نے پاکستان کے تصور پر تبصرہ کیا۔لیکن یہ عملی سیاست کا موضوع اس وقت بن گیا جب ہندستان کے دستور کے بارے میں متعدد اسکیمیں پیش کی گئیں۔اس میں سکندر حیات خاں کی ہندوستان کو سات حلقوں میں تقسیم کرنے اور ان کو ایک کمزور مرکز کے تحت متحد رکھنے والی اسکیم تھی جو جولائی 39ء میں شائع ہوئی اور اس کا شہرہ اس لیے زیادہ ہوا کہ اس کے مصنف کی پنجاب کے پریمیر کے طور پر بڑی اہمیت تھی۔بعض دوسری اسکیمیں بھی پیش کی گئی تھیں، ان میں حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر الحسن اور افضال قادری، پنجاب کے شاہ نواز خاں آف ممدوٹ اور عبداللہ ہارون وغیرہ کی اسکیمیں تھیں۔ان ساری اسکیموں میں سارے ہندوستان کے لیے مرکزی حکومت تجویز کی گئی تھی لیکن اس کو بہت کم اختیارات دیے گئے تھے اور صوبوں کو پوری خودمختاری عطا کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ چودھری خلیق الزماں، مسٹر جناح پر زور دے رہے تھے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لیں۔اس کے مواد کو انھوں نے لندن میں چودھری رحمت علی سے حاصل کیا تھا اور انھوں نے وزیر ہند زیٹلینڈ کو اس کے یعنی ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں مارچ 1939ء میں مطلع کیا تھا اور انھوں نے مسٹر جناح کو اپنی وزیر ہند سے گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔

جب 10رجنوری 1940ء کو وائسرائے نے اوریئنٹ کلب بمبئی میں اعلان کیا کہ حکومت کا ارادہ جنگ کے بعد ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کا ہے اور فوری طور پر وائسرائے کی ایکزیکیٹو کونسل میں توسیع کرنی ہے مسٹر جناح نے اس اعلان پر غور کرنے

کے لیے 3/فروری 1940ء کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ دہلی میں طلب کیا۔

وائسرائے کی ایکزیکیٹو کونسل کے ممبر ظفراللہ خاں نے خلیق الزماں کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے جلسہ سے پہلے یہ بتایا کہ برطانوی حکومت کانگریس کو راضی کرنے کے لیے بہت دور تک جانے کو تیار ہے۔ اس لیے وقت آ گیا ہے کہ مسلم لیگ کانگریس سے سمجھوتہ کرے ورنہ پھر آپ سے یہ بس چھوٹ جائے گی۔

لن لتھ گو نے فضل الحق اور سکندر حیات خاں کو یہ یقین دلایا کہ اگرچہ اپنی امکانی حد تک وہ بہت کچھ کر رہے ہیں لیکن مسلم لیگ کو وزیر ہند کے سامنے مسلمانوں کا معاملہ پیش کرنے کے لیے اپنا وفد لندن بھیجنا چاہئے۔

ورکنگ کمیٹی نے ممبروں پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجنا طے کیا اور اس وفد کو اس باب میں ہدایتیں دینے پر غور کیا۔ اس سلسلہ میں سکندر حیات خاں کی اسکیم اور چودھری خلیق الزماں کی اس تجویز کو کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو علیحدہ کیا جائے اور انھیں آزاد مملکت کا درجہ دیا جائے، پر بھی غور کیا۔ سکندر حیات خاں کی اسکیم کو نامنظور کر دیا اور خلیق الزماں کی تجویز کو منظور کر لیا۔

24/مارچ 1940ء کا ریزولوشن حسب ذیل ہے:

''قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ سوچی سمجھی اور پختہ رائے ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی دستوری منصوبہ یا تجویز قابل عمل نہ ہوگی اور نہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہوگی جب تک وہ اس بنیادی اصول پر مبنی نہ ہو کہ جغرافیائی حیثیت سے دو قوموں کی ایسے علاقوں میں حد بندی کر دی جائے اور یہ اس طرح بنائے جائیں اور ان میں ضرورت کے مطابق ایسی سرحدی تبدیلیاں کر دی جائیں کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہو مثلاً ہندوستان کے شمالی، مغربی اور مشرقی خطے مستقل مملکتیں بن جائیں اور ان مملکتوں کے اجزاء ترکیبی اندرونی طور پر خود مختار اور آزاد

ہوں۔ ان علاقوں اور منطقوں کے اجزاء ترکیبی میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق اور مفاد کے لیے مناسب، مؤثر اور واجب العمل تحفظات دیے جائیں۔ دوسرے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے مسلمانوں کے لیے نیز دوسری اقلیتوں کے لیے ایسے معقول، مؤثر اور واجب التعمیل تعلقات متعین طور پر دستور میں شامل کر دیے جائیں جن سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو جائے۔

"یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اس کا اختیار دیتا ہے کہ وہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کرے جو ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہوں اور اس قسم کی ہو کہ جس میں اس کی گنجائش ہو کہ ان علاقوں کو اس قسم کے اختیارات مل جائیں کہ جیسے دفاع، امور خارجہ، وسائل، رسل و رسائل، کسٹم اور نیز دوسرے ایسے امور جو ضروری ہوں۔"

بظاہر یہ تجویز جناح کے خیالات کا پرتو تھی اور اس میں چودھری خلیق الزماں کی اس تجویز کا بڑا گہرا اثر تھا کہ پورے ہندستان کے لیے نہ مضبوط اور نہ کمزور مرکزی حکومت کی ضرورت ہے۔

1937ء میں مسٹر جناح کا نیا کردار جب سے ان کا کانگریس سے نہ ختم ہونے والا بگاڑ شروع ہوا سامنے آیا۔ انھوں نے متحدہ ہندوستان کے تصور کو بالکل ہی نامنظور کر دیا اور 1935ء کے ایکٹ کے فیڈرل یونین کی شدید مذمت کی اور اقتدار کا نعرہ بلند کیا اور ہندوستانی قوم پرستی کو خیر باد کہہ دیا۔

اقبال نے ان پر زور دیا تھا اور یہی کہا تھا کہ آج وہی تنہا ایسے مسلم لیڈر ہیں جس سے مسلمانوں کی بجا قیادت کی توقع ہے۔ انھیں ان کے اس نظریہ سے کہ مسلم صوبوں کا فیڈریشن ہونا چاہیے اتفاق کرنا چاہیے۔ یہی ایک واحد راستہ ہے یا چارہ کار ہے جس سے ہم پُر امن ہندوستان حاصل کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے

سے بچا سکتے ہیں۔

یہ تصور جس پر کئی سالوں سے مسٹر جناح پر مختلف حلقوں سے زور ڈالا جا رہا تھا ان کے دماغ پر غالب آ گیا اور انھوں نے اسے آخری وقت مسلم لیگ پر مسلط کر دیا اور اس پر مسلم لیگیوں کی ایک بڑی تعداد کو بہت تعجب ہوا۔ ہڈسن کے لفظوں میں جو کسی طرح بھی غیر ہمدرد افسر نہ تھا نتیجہ نحوی در آمد ترکیبوں اور مبہم فقروں کا استعمال تھا۔

2- تجویز کی تشریح

اس تجویز کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے جس نے آئندہ ہندوستانی سیاست پر فیصلہ کن اثر ڈالا، کی تشریح کرنا بہت ضروری ہے۔

اس تجویز کی خامیاں بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہیں:

(1) یہ اپنی منزل کے متعلق بالکل ہی مبہم اور غیر واضح ہے۔ کیا یہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت تجویز کرتی ہے۔ فیڈرل یا وحدانی یا ایک سے زیادہ مملکتیں تجویز کرتی ہے۔ یہ آزاد اور اقتدار اعلیٰ کی مالک مملکت کا ذکر جمع کے صیغہ میں کرتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی مغربی منطقہ جو سندھ، بلوچستان، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب اور مشرقی منطقہ جو بنگال اور آسام پر مشتمل ہے جس میں مسلم باشندے اکثریت میں ہیں، دو آزاد مملکتیں یا ایک آزاد مملکت ہوگی۔

(2) اس ریزولوشن نے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کو اس کا اختیار دیا تھا کہ وہ دستور کی اسکیم مرتب کرے جس میں سارے خطوں کو اس طرح کے اختیارات دیے جائیں مثلاً امور خارجہ، دفاع و مواصلات یا ذرائع رسل و رسائل، کسٹم اور دوسرے ضروری امور لیکن اس میں دونوں منطقوں کو منسلک کرنے والے رابطوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا

ہے۔ اس کا ذکر کیوں اور کیسے رہ گیا اسے سکندر حیات خاں نے جو اس تحریک کے خاص محرکوں میں سے تھے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں ان لفظوں میں 11 / مارچ 41ء کو بیان دیا۔

''مجھے اسے تسلیم کرنے میں کسی قسم کی کوئی جھجھک نہیں کہ اصل تجویز کو مرتب کرنے کا ذمہ دار میں تھا لیکن مجھے یہ صاف کر دینا چاہئے کہ اس تجویز میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے بے انتہا ترمیمیں کر دیں اور اسے بالکل بدل دیا۔ اس وجہ سے اس تجویز میں جسے میں نے مرتب کیا تھا اور وہ جو بالآخر پاس ہوئی، اصل سے زبردست فرق اور اختلاف ہے۔ دونوں تجویزوں میں سب سے بڑا اور نمایاں اختلاف یا فرق یہ ہے کہ تجویز کے آخری حصہ میں جس کا تعلق مرکز سے تھا حذف کر دیا گیا ہے اس لیے لیگ کی اس تجویز کو میری تجویز قرار دینا سچائی کا خون کرنا ہے۔''

اس سہو کی تصحیح اپریل 1946ء میں کی گئی جب مسلم لیگی ممبران مجالس قانون ساز نے یہ فیصلہ کیا کہ صرف ایک بااقتدار مملکت پاکستان ہوگی۔ جناح نے یہ رولنگ دی کہ اسٹیٹ کے بجائے اسٹیٹس کا لفظ ٹائپ مشین یا پریس کی غلطی تھی۔

اس ابہام نے دستور بنانے والوں کو موردالزام ٹھہرایا کہ اس سے دونوں منطقوں کے درمیان حد درجہ کی تلخی پیدا ہوگئی جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں منطقوں کو زبردست خانہ جنگی کی وجہ سے تباہی اور بربادی سے گذرنا پڑا۔

(3) تجویز اس بارے میں بھی بہت مبہم ہے کہ وہ کون سے علاقے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اگر ہندوستان کو ایک وحدت مان لیا جائے تو بلاشبہ مسلمان اس میں اکثریت نہیں ہیں اور اس معنی میں مسلمانوں کو اقلیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کی مسلم لیگ نے تخلیط اور تردید کی اور اس نے ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلم اکثریت تھی ان کے تشخص کا سوال اٹھایا۔ سوال یہ تھا کہ آیا علاقہ سے مراد

پورا صوبہ تھا یا صوبے کا حصہ مثلاً پنجاب کے بعض اضلاع جس میں مسلمانوں اکثریت میں تھے (اور بعض میں اقلیت میں) یہی صورت بنگال اور آسام کی بھی تھی۔ مسلم لیگ کے لیڈروں نے علاقے کو صوبوں کے مساوی کرنے کی کوشش کی اور اس بنیاد پر دعویٰ کیا کہ تقسیم ہونے سے پہلے پنجاب، بنگال اور آسام کو پاکستان میں شامل کیا جائے۔

برطانوی کابینہ کے مشن نے اپنے مذاکرات میں پاکستان کی اس خامی کو واضح کیا۔ جب تقسیم کی تجویز منظور کر لی گئی تو ماؤنٹ بیٹن نے فیصلہ کیا کہ پنجاب اور بنگال کے وہ حصے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں پاکستان میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔ اس کے باوجود کمیشن کو جسے پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں کو متعین کرنا تھا دعوی اور جوابی دعووں کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے متعدد فیصلے پہیلی ثابت ہوئے۔ مثلاً کسی فرقہ کا دوسرے فرقوں کے علاقے میں ایک جزیرہ کی طرح گھرا ہونا۔

(4) پاکستان کی تجویز نے اس کی تشریح نہیں کی پاکستان میں کس قسم کی یا کس طرز کی حکومت ہوگی۔ حالانکہ پاکستان میں مملکت کی نوعیت کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر یا دو مکتب فکر تھے۔ ایک مکتب فکر جس کے سربراہ مولانا اشرف علی تھانوی (ان کا انتقال 1943ء میں ہو چکا تھا) اور سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے، وہ حکومت الٰہیہ کے لیے لڑ رہے تھے۔ دوسرے مسلم علماء بھی ان کی تائید میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامی مملکت کو قرآن، حدیث اور شریعت کے اصولوں پر کاربند ہونا چاہئے اور قرآنی احکام جن کی تشریح اور تعبیر آئمہ، فقہا اور علماء نے کی ہے اس سے سر مو انحراف نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرا مکتب فکر دوسری رایوں (Opinions) پر مشتمل تھا۔ اقبال کا خیال تھا کہ خود مختار مسلم مملکتوں کا یہ مطلب نہیں کہ ان مملکتوں میں مذہبی حکومت ہوگی۔ وہ جدید سماجی تبدیلیوں اور لچکدار انداز فکر اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ ان کے نزدیک

ہندوستان میں مسلم مملکت کا مطلب تحفظ اور امن سے تھااور یہ اسلام کواس کا موقعہ دے گی کہ وہ اپنے کوعرب سامراج کی چھاپ سے نجات دلائے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنے تمدن کی تجدید کرے اوران کواپنی اصلی روح اور موجوں کی روح سے ہم آہنگ کرے۔

جناح خود ہندوقوم اور مسلم قوم کے مابین زندگی کے تمام شعبوں اور خیالات کے اختلافات کے بارے میں کہتے تھےلیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ اگر مسلم قوم میں ایک قومی حکومت قائم ہوئی تو عوام کی ترقی رک جائے گی، مختلف طبقوں میں اختلافات ابھریں گے اور سماجی اور اقتصادی نجات کا راستہ بند ہو جائیگا۔ وہ پاکستان کو ایک دنیوی اور غیر مذہبی مملکت سمجھتے تھے جس میں نظم ونسق یعنی ایڈ منسٹریشن لوگوں کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگا۔لیاقت علی خاں، وزیراعظم پاکستان کواپنے لیڈر کے خیالات سے پورا اتفاق تھا۔ان دونوں مکتبہ ہائے فکر میں تصادم اور آویزش کی وجہ سے اب تک پاکستان کسی مستحکم حکومت کے قیام سے محروم رہا۔

(5)اس تجویز کا ایک زبردست نقص یہ تھا کہ اس میں سماج اور مملکت کے بارے میں انتشار ذہن پایاجاتا تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں نے یہ فرض کرلیا تھا کہ جن منطقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جوایک حکومت کی ماتحتی میں رہتے ہیں وہ ایک قوم ہیں۔ یہ بات بڑی ہی حیرت انگیز ہے کہ برطانوی تسلط کے زمانے میں یعنی1939ءتک مسلمان جواپنے کوایک فرقہ کہتے تھےاب مسٹر جناح کےفرمان سے ایک قوم ہوگئے۔ یہ تبدیلی بلاشبہ اچمبھے میں ڈالنے والی تھی۔

لیکن یہ دو وجہوں سے درست نہیں ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قوم پرستی کا شعور مسلمہ انداز زندگی کے اصول وعادت سے ہوتا ہےاور لوگوں کی بڑی تعداد کا عادتیں اختیار کرنا ایک عمل ہوتا ہے جس میں بہت وقت لگتا ہے۔ افراد کی حد تک تو ممکن ہے

کہ فوری طور پر مسلمہ روایتیں، طریقوں کی بنیاد پر بنے طرز عمل کو مستقل طور سے اختیار کر لیں، یہ عوام کی بڑی تعداد کے لیے نایاب ہے اور یہ انقلاب اب بھی پاکستان بننے کے 25 برس بعد پختگی سے دور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی منطقہ میں پٹھانوں اور بلوچیوں اور سندھیوں میں الگ ہو جانے والی تحریکوں اور مشرقی منطقہ کا پاکستان سے بالکل الگ ہو جانے سے ظاہر ہے۔

دوسرے ایک جنبش قلم سے ممکن نہ تھا کہ مختلف قومیتوں مثلاً پٹھانوں، بلوچیوں اور سندھیوں کو پنجابیوں اور بنگالیوں کی ایک قوم بنا دیا جاتا یا ایک قوم سے منسلک کر دیا جاتا۔ لسانی اعتبار سے وہ بالکل ہی مختلف تھے یعنی بالکل مختلف زبانیں بولتے تھے اور ان میں سے ہر زبان کا مختلف ادب یا لٹریچر تھا۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں، ماحول اور قدرتی اثرات ایک دوسرے سے بالکل ہی الگ اور مختلف تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت بھی بالکل مختلف اور جداگانہ تھی۔ اسی طرح ان میں سے ہر ایک کی معیشت بھی بالکل مختلف تھی۔ مغربی خطے میں گیہوں اور کپاس کی پیداوار باافراط تھی اور جب کہ مشرقی خطے میں چاول کی پیداوار بکثرت ہوتی تھی، ان کے جغرافیائی حالات مثلاً دریا اور زمین، بارش کا اوسط، رطوبت، پانی اور درجہ حرارت اور آب و ہوا بالکل مختلف تھے اور بالکل الگ تھے۔ مثلاً شمالی مغربی سرحدی صوبے میں اور بلوچستان میں قبائلی نظام کا دور دورہ تھا جب کہ پنجابیوں اور بنگالیوں کے سماجی طبقے یکساں نہ تھے۔ نسلی اعتبار سے بھی پانچوں وحدتیں یا علاقے ایک نہ تھے بلکہ بالکل مختلف تھے، نہ ان کی تاریخ مشترک تھی اور نہ ان کی روایتیں۔

(6) صرف مذہب ہی ان میں نقطہ اشتراک تھا جو کسی بھی قوم کی تشکیل اور ثبات میں ذیلی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کسی قوم کی اساس اور بنیاد نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی مذہب کے پیرو ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس مذہب کے سارے لوگ ایک سماج یا ایک

قوم کی حیثیت سے متحد ہو گئے۔ ساری یورو پین قومیں مسیحیت کی پیرو ہیں لیکن وہ تمیں مکمل آزاد مملکتوں پر منقسم ہیں۔ اسی طرح امریکہ کی ساری مسیحی اقوام تقریباً دو درجن آزاد اور با اقتدار مملکتوں میں رہتی ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی بے شمار مملکتیں ہیں اور ان میں دوستی سے لے کر دشمنی تک کے تعلقات اور رشتہ پائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف مذہبی اختلافات کی وجہ سے قومی مملکت کے قیام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

مغربی جرمنی کی جمہوریہ میں رومن کیتھولک۔	55.1	فیصد
اور مغربی جمہوریہ میں پروٹسٹنٹ	44.1	فیصد
نیدر لینڈ کے 12 ملین باشندوں میں رومن کیتھولک	4.6	ملین
// // // // // // // پروٹسٹنٹ	4.4	ملین

کسی بھی مذہب کے نہ ماننے والوں پر مشتمل ہے

بلجیم کی آبادی 4.7 ملین ہے لیکن وہاں کی حکومت اپنے شہریوں کے بارے میں اعداد و شمار کا ریکارڈ نہیں رکھتی۔ ویسے جب 1830ء میں اس کی علیحدہ اور آزاد مملکت وجود میں آئی تو رومن کیتھولک کا غلبہ تھا۔

سوئٹزرلینڈ میں رومن کیتھولک کا ملک کی آبادی میں 45.4 فیصد کا تناسب ہے۔ اور پروٹسٹنٹ کا تناسب 52.7 فیصد ہے۔ سوویٹ یونین کی مثال خاص طور سے قابل غور ہے اسلیے کہ اس میں اسٹیٹ ہر طرف سے مذہب کے مخالف پروپیگنڈے کو بڑھاوا دیتی ہے لیکن 223 ملین میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً 50 ملین آرتھوڈاکس چرچ کے پیرو ہیں۔ مسلمان جو مشرقی ایشیائی منطقے میں بحر کیسپین سے لیکر چین کی سرحدوں تک اکثریت میں ہیں عددی اعتبار سے دوسری سب سے بڑی ملت ہیں۔

یوروپ سے باہر کناڈا میں دو اہم فرقے پائے جاتے ہیں۔ رومن کیتھولک جن کی تعداد 8.3 ملین ہے اور پروٹسٹنٹ کی تعداد 7.5 ملین ہے۔ ایشیا میں چین کی 1953 کی مردم شماری کے مطابق 150 ملین بدھ ہیں۔ 30 ملین ٹاؤسٹ (Taoist) تقریباً 30 ملین مسلمان ہیں اور باقی کنفیوشس کے پیرو ہیں۔ اس طرح آبادی کی میزان 600 ملین ہوتی ہے۔

مغربی ایشیا میں لبنان ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر آبادی کے لحاظ سے عجیب اور انوکھا ہے اس لیے کہ اس کی 1.75 ملین آبادی میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعداد مساوی ہے۔ اس کے پڑوسی ملک سیریا (شام) میں 1962 کے اعداد شمار کے مطابق 5.5 ملین لوگ رہتے ہیں۔ 1954 کے اعداد شمار کے مطابق 4.3 ملین کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 3.13 ملین تھی عیسائیوں کی تعداد 4 لاکھ 9 ہزار، دروز Druzes اور علویوں (Alawites) کی تعداد پانچ لاکھ 27 ہزار ہے۔

1947ء میں مصر کی 19 ملین آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 17.4 ملین یا 91.40 فیصدی تھی اور مسیحوں کی تعداد 195 ملین تھی۔ 1970 کی مردم شماری میں کل آبادی بڑھ کر 26.3 ملین تک پہونچ گئی۔ ان اعداد وشمار سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ مذہبی اتحاد یا مذہبی اعتبار سے کثرت تعداد کا سیاسی یکجہتی سے کوئی تعلق نہیں۔ برطانوی سیاستداں یوروپین تجربوں سے ہندوستان حالات کے درمیان موازنہ کرنا بالکل بے محل سمجھتے ہیں۔

زیٹلینڈ کے خیال میں اقلیتیں بالکل غلط تھیں۔ اس لیے کہ ہندوستان کے مذہبوں کے درمیان مذہبی فرقوں کے اختلاف زیادہ گہرے تھے اور ہندو کا ہندوستانی تصور انسانیت کے یوروپین تصور سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھا۔ یہ دوسرا مفروضہ باوجود ہیگل کے اس کلیہ کے کہ مشرق داخلی موضوعی ہے اور مغرب کی معروضی سند

واقعیت پسندانہ ہے، سرتاسر مہمل ہے۔

پہلا مفروضہ یوروپ کی سولھویں اور سترھویں صدی میں رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے مذہبی جھگڑوں اور تصادم کو نظر انداز کرتا ہے جن کی وجہ سے بڑے وسیع پیمانے پر قتل عام اور خون آشام سفا کانہ جنگیں ہوئی تھیں۔ اسی طرح اسلامی فرقوں یعنی سنیوں، خارجیوں، شیعوں، اسمٰعیلیوں اور وہابیوں کے درمیان جولڑائیاں ہوئیں ان کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ ان میں جو ایک دوسرے سے شدید منافرت تھی وہ اس نفرت کے مقابلے میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی اور اسے دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(7) تاہم مذہب کے علاوہ کسی دوسرے جوڑنے والے یا متحد کرنے والے دوسرے عمل act کا ذکر نہیں کیا گیا اور اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا کہ پچھلے سو سالوں سے اوپر مسلم خطے ایک سیاسی تنظیم کا حصہ رہ چکے تھے اور اس کی وجہ سے ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں سوچا کہ وہ کسی دوسرے سیاسی نظام سے منسلک ہیں یا کسی دوسرے سماج سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ صورتحال بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی تک قائم رہی۔ متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ایسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے باوجود مذہبی اختلافات کے آل انڈیا سرگرمیوں مثلاً انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، جمعیۃ العلماء ہند، آل انڈیا سائنس کانگریس، انڈین ہسٹری، فلاسفی اور اکنامکس کانفرنس اور دوسری علمی جماعتوں کی کارروائیوں اور سرگرمیوں میں مل جل کر حصہ لیا۔

ہندوستان بھر کے مسلمان اردو کو لنگوا فرانکا (Lingua Franca) قرار دئے جانے کے حامی تھے خواہ وہ پنجابی، بنگالی، تامل بولتے تھے۔ بہت سے ہندو باوجود اپنی

مخصوص زبانوں کے ہندی کو مشترک زبان بنانا چاہتے تھے۔ پشاور سے لے کر تری وندرم تک، کراچی سے لے کر کلکتہ تک ایک ہی یا یکساں تعلیمی نظام تھا۔ اس طرح سے پنجابیوں سندھیوں، بلوچیوں، پختونوں، اور بنگالیوں کے ذہن اور دماغ ہندوستانی اتحاد کے عادی ہو چکے تھے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان مشترک قانون کے تحت اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور ان مشترک قوانین کا نفاذ مختلف عدالتی افسر کرتے تھے۔ انتظامی نظام، فوجداری اور مالی قوانین، ٹیکس، معیشت، پیداوار اور مصنوعات کی تقسیم، وسائل نقل وحمل دونوں فرقوں کے لیے یکساں تھے۔ دونوں فرقوں کو فوج میں، اس کے عہدوں میں اور وائسرائے کے کمیشنوں میں نمائندگی حاصل تھی۔ بہت سی رجمنٹیں ملی جلی کمپنیوں پر مشتمل تھیں۔ دوسری طرف ایسی نہ ایسی، نہ سماجی نہ اقتصادی اور نہ تمدنی سرگرمیاں یا تنظیمیں تھیں جو صرف مجوزہ پاکستان کے منطقوں میں رہنے والوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے ان علاقوں کے رہنے والے لوگوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ پاکستانی قوم پرستی پلک جھپکتے ہی اختیار کر لیں اور اپنے کو ایک قوم یا پاکستانی قوم سمجھنے لگیں۔

(8) اصل میں انسانی رشتے اور تعلقات خواہ وہ افراد سے متعلق ہوں، خواہ گروہوں سے، دوستانہ ہوں یا مخالفانہ، مشابہت اور باہمی اختلافات کی نوعیت پر منحصر نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق تمام تر جذباتی شدت سے ہے جس سے مشابہت یا اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔

یہ صرف محبت اور نفرت کی صنعت ہے جو اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ فریقین صلح اور آشتی سے رہیں یا لڑ بھڑ کر اور جنگ وجدال کے ساتھ رہیں۔ رومن کیتھولک پروٹسٹنٹوں کے خون کے پیاسے رہے، اس طرح سنی، شیعوں کے اور عیسائی یہودیوں کے لیکن یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کبھی بھی اتنا زیادہ کینہ جو اور کینہ سوز نہ رہے

جتنے کی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں رہے۔

(9) لیکن ہندوستان کے مغربی منطقوں میں قومیت کی تشکیل کے امکان معدوم نہ تھے۔ یہ علاقے تقریباً ایک جیسے اشوران کے اقتصادی حالات تقریبا یکساں تھے اور مذہب کا اشتراک واتحاد بھی تھا۔ ان بنیادوں پر سماجی اور سیاسی اتحاد نشو ونما پا سکتا تھا اور اتحاد کی بنیاد پر قومی مملکت کا دعویٰ قدرتی تھا۔

مغربی منطقوں کے چاروں صوبوں کی آبادی 1951ء کی مردم شماری کے مطابق 33.7 ملین تھی اس میں 20.6 پنجاب میں رہتے تھے۔ اس طرح پنجاب سماجی مرکز ہوسکتا تھا اور کم آبادی والے صوبوں اور علاقوں کو متحد رکھ سکتا تھا اور یہی ساری باتیں علیحدہ مشرقی منطقہ پر منطبق ہوتی تھیں۔

گاندھی جی کی زبردست فہم ودانائی نے انھیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ مسلمانوں کو اس قسم کا حق خود ارادیت حاصل ہونا چاہئے جو باقی ماندہ ہندوستان کو حاصل ہے۔ اس وقت ہم سب ایک مشترکہ خاندان میں ہیں اور اس کا کوئی بھی فرد کسی وقت بھی تقسیم کا مطالبہ کرسکتا ہے یا الگ ہونے کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

لیکن یہ حق کسی بھی منطق سے سارے اسی یا نوے ملین مسلمانوں کو حاصل نہ تھا۔ اس لیے کہ ان میں سے 35 فیصد سے زائد مسلم اکثریتی علاقوں سے باہر رہتے تھے، نہ مسلم لیگ کے ریزولوشن نے اس کا مطالبہ کیا۔

(10) یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ کسی نے بھی حتیٰ کہ مسٹر جناح نے بھی پاکستان کا اصل مفہوم مثبت یا واضح الفاظ میں بیان نہیں کیا۔ مسٹر جناح نے پاکستان کی تعریف اور مفہوم کے بارے میں کسی بحث ومباحثہ میں پڑنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کا عام جواب یہی تھا کہ پاکستان کے بارے میں تفصیل بتانا مہمل ہے حالانکہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے اسے اصولی طور پر تسلیم

کرلیا جائے۔ ہندوستان میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نمائندے نے بتایا کہ لیگ کے پاس سب سے بڑی سودے بازی کا نکتہ پاکستان ہے اور جناح اس کی تشریح اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک ان کو اس کا موقعہ ہاتھ نہیں آتا کہ وہ اسے مزید سودے بازی کے لیے مبالغہ انگیز اور بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ پیش کریں اور کانگریس سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کریں ۔اس وقت اس کی تعریف اور تعبیر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے محدود کردیا جائے اور اس لیے مسٹر جناح اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔اس کے بعد 19 /فروری 44ء کو نیوز کرانیکل، لندن کے نمائندے اسٹورٹ ایمنی سے الگ انٹرویو میں مسٹر جناح نے کہا:

''نئے دستور کے تحت ایک عبوری دور ہوگا جس میں سمجھوتہ ہوگا اور ہم آہنگی ہوگی کچھ تطبیق دی جائے گی اور جہاں تک فوجوں اور خارجی امور کا تعلق ہے برطانوی اقتدار بالادست رہے گا ۔اس عبوری دور کی مدت اس اختیار پر منحصر ہوگی جس میں دونوں قومیں اور برطانوی حکومت نئے دستور کے مطابق اپنے کو ڈھال لیتی ہیں۔آخر میں دونوں قومیں برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدہ کریں گی جیسا کہ مصر میں ہوا تھا جب اس نے آزادی حاصل کرلی تھی۔''

یہ ایک غیر معمولی اور بہت اہم بیان ہے۔کیا مسٹر جناح کا خیال تھا کہ بااختیار پاکستان کی منزل دور تھی اور اس وقت تک انھیں مصری ٹائپ کا عبوری دستور مطمئن کردیگا۔انھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ 1934ء کے اینگلو مصری معاہدے کی رو سے مصریوں کو صرف اندرونی خودمختاری حاصل ہوئی تھی۔امور خارجہ اور دفاع پر برطانیہ کا پورا کنٹرول تھا اور دوسرے تمام اہم امور پر بھی اس کا پورا کنٹرول تھا۔اور یہ کسی طرح بھی ویسٹ منسٹر کے قسم کا درجہ نوآبادیات نہ تھا۔کیا یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ کانگریس کے ہندوستان کی مکمل آزادی کے مطالبے کے پیچھے ہے یا تائید میں ہے، محض نمائشی

اور بلند بانگ دعویٰ تھا اور مسٹر ایمری کی پیشکش کے قبول کرنے پر عیارانہ پردہ ڈالنا تھا۔

اس شبہ کو درگا داس اور پینڈرمون کی شہادتوں سے تقویت پہونچتی ہے۔ مون کا کہنا ہے کہ ایک گفتگو میں مسٹر جناح نے لاہور میں دو ایک شخصوں کو یہ بتادیا کہ یہ ریزولوشن محض ایک سیاسی تحریک ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ چھ سال بعد وہ مکمل یا پورے پاکستان سے کم قبول کرنے پر تیار تھے اور یہ کہ 1940ء میں وہ دراصل پاکستان کے مطالبے کی منظوری کے لیے اٹل نہ تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جناح نے کبھی بھی پاکستان کی نوعیت نہیں بتائی اور 1947ء تک اس بارے میں شبہ تھا کہ وہ کیا منظور کریں گے جوان کے تصور کے مطابق ہوگا۔

اس کی تصدیق درگا داس ان لفظوں میں کرتے ہیں کہ جب میں مسٹر جناح سے لیگ کے مارچ 1940ء کے اجلاس کے بعد ملا اور انھیں یہ بتایا کہ سکندر حیات خاں نے مجھے قطعیت کے ساتھ یہ بتلا دیا ہے کہ یہ ریزولوشن دراصل سودے بازی کا حربہ ہے تو مسٹر جناح نے یہ جواب دیا کہ میرے دوست سودے بازی دو پارٹیوں میں ہوتی ہے۔ پہلے کانگریس کو یہ تسلیم کرنا ہے کہ دوسری پارٹی مسلم لیگ ہے۔ اس سے یہ بالکل صاف ہے کہ مسٹر جناح اس مسئلے پر کانگریس سے سودے بازی کرنے پر پوری طرح تیار تھے۔ پاکستان ان کا آخری یا اصل مطالبہ نہ تھا۔

اس کی مزید تصدیق وی۔ پی مینن کرتے ہیں کہ اگرچہ پاکستان کے نعرے نے بڑی اچھی طرح سے ان کے سیاسی مقصد کو پورا کیا تھا لیکن مسٹر جناح کے سامنے اس کا صاف اور واضح تصور نہ تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں مثلاً مدراس کے گورنر سے انٹرویو میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ ان کا خیال یا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو حسب ذیل چار منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(1) ڈرے وڈستان یعنی تقریباً ساری مدراس پریسیڈنسی

(2) ہندوستان (ممبئ اور صوبہ جات متوسط)

(3) بنگالستان (بنگال اور آسام)

(4) پنجاب (بعض علاقوں کو چھوڑ کر) سندھ اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ

یہ چاروں خود مختار نو آبادیات ہوں گی اور ایک دوسرے سے پورے طور پر بالکل الگ اور علیحدہ۔ ہر ایک کے لیے الگ الگ گورنر جنرل ہوں گے جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ایک وزیر کے ذریعہ جواب دہ اور ذمہ دار ہوں گے۔ خارجہ پالیسی اور ڈیفنس پر گورنر جنرل کا کنٹرول ہوگا۔

دو انتہائی ممتاز اور معروف صحافیوں کی رپورٹیں جن میں سے ایک اہم برطانوی اخبار کے نامہ نگار خصوصی اور دوسرے ہندوستان کے ایک چوٹی کے اخبار کے مشہور اور معروف ایڈیٹر اور دو چوٹی کے اعلیٰ افسران کی رپورٹیں جن میں سے ایک پنجاب کے گورنر کے پرائیویٹ سکریٹری اور دوسرے گورنر جنرل کے دستوری مشیر۔ اس بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ پاکستان کے بانی کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں وہ محض جذبات کو برانگیختہ کرتے تھے۔

انھوں نے اصل مسئلے کی پیچیدگیوں اور اس کے مضمرات پر کبھی توجہ نہ کی۔

یہ مقدمات جن کی بنا پر پاکستان کے مطالبے کی تائید یا حمایت کی جاتی تھی اور حق بجانب ٹھہرایا جاتا تھا دو تھے۔

پہلا مقدمہ تو یہ تھا کہ ہندو، مسلمان دو بالکل الگ اور علیحدہ قومیں ہیں اور ان میں کوئی بھی چیز مشترک نہیں ہے اور وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ برسرپیکار رہتی ہیں۔ مسٹر جناح کے نزدیک ہندوازم اور اسلام دو بالکل ہی مختلف اور ایک دوسرے سے الگ سماجی نظام تھے جن کا مذہب، فلسفہ یا سماجی رسوم ورواج اور ادبی تمدن ایک

دوسرے سے بالکل الگ اور مختلف تھا۔ نہ تو ان میں آپس میں شادیاں ہوتی تھیں اور نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔

اس طرح زندگی کے بارے میں دونوں کا تصور اور رویہ بالکل ہی مختلف تھا۔ ان کے مذہبی، عقیدوں نے ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر دیا تھا اور یہ کہ دوسرے انسانوں سے تعلقات کیسے رکھے اور کس قسم کے رکھے جائیں، پورے طور سے مذہب کے دائرہ اختیار میں تھے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے انھیں ایک قوم نہیں مانا جا سکتا۔

اس مقدمے سے دو صریحی نتیجے نکلتے ہیں:

(1) مسلم قوم کو اپنا جداگانہ تشخص یا وجود قائم رکھنا چاہیے: مذہبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی (2) دوسرا یہ کہ دو متضاد عناصر متحد نہیں کیے جا سکتے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اکثریتی حکومت ناممکن تھی اس لیے کہ مغربی جمہوریتوں کے برعکس کہ جہاں اقلیتیں اور اکثریتیں ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتی رہتی ہیں ہندوستان میں وہ مستقل ہیں اور کبھی بدل نہیں سکتیں۔ اکثریتی حکومت کے معنی ہمیشہ کے لیے ہندو حکومت کے ہیں اور چونکہ ہندو بنیادی طور پر مسلمانوں کے شدید مخالف اور دشمن ہیں اس لیے یہ صورتحال مسلمانوں کے لیے اور اسلام کے لیے سخت ترین خطرے کا باعث ہوگی اور اس وجہ سے ان کی زبردست تباہی اور بربادی ہوگی اور مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام ہو کر رہ جائیں گے۔

ان دونوں مقدموں میں کچھ اصلیت اور سچائی تھی جس وجہ سے مسلمانوں کے خدشوں اور اندیشوں کو تقویت پہونچتی تھی، وہ ہندوؤں کے انتہا پسند فرقہ پرستوں کا رویہ اور طرز عمل تھا۔ ان کے جارحانہ بیانات، ان کے احیاء پسندانہ تصورات، ہندو رسوم اور رویے اچھے برے اور لاتعلق، مسلم فکر کی تذلیل، مسلم تاریخ اور مسلمانوں کے طرز زندگی کی تذلیل اور مذمت اور مسلم لیڈروں کو خواہ وہ کتنے ہی زبردست قوم

پرور ہوں انھیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا، نے بالکل بجا طور پر مسلمانوں اور خاص طور سے مسلم لیگیوں کو اپنا دشمن بنالیا۔

ان فرقہ پرستوں کے نزدیک صرف ہندو ہی ہندوستانی شہری ہونے کے حقدار تھے اور ملک کے دوسرے باشندوں کو ان ہی کے رحم وکرم پر رہنا تھا۔ انھیں یا تو اس ملک سے چلا جانا چاہئے یا پھر دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت سے رہنا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس گروہ کو بہت زیادہ اہمیت دی اور اس معاملہ میں بڑی مبالغہ آرائی کی اور اس عام الزام تراشی میں سارے ہندوؤں کو بشمول کانگریس شامل کرلیا۔

انھوں نے 1923ء سے 1937ء کے الیکشنوں میں ہندومہا سبھا کی مسلسل شکست اور کانگریس کے امیدواروں کی کامیابی سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ ہندو فرقہ پرست لیڈروں جن کو ہندوؤں کی بہت تھوڑی یا برائے نام تائید حاصل تھی کی حیلہ سازیوں یا کھوکھلے دعووں اور اشتعال انگیز دعووں کو نمایاں کرتے رہے اور انھوں نے کبھی صحیح طور سے صورتحال کا جائزہ نہ لیا۔

یہ خیال کہ ہندو مسلم اتحاد اس لیے ناممکن ہے کہ ہندو مسلمان کے ساتھ شادی نہیں کرتے تھے یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے صحیح نہ تھا۔ اس لئے کہ ہر شخص اسے بخوبی جانتا تھا کہ مختلف ذاتوں کے ہندو، برہمن، چھتری، شودر نہ تو ایک دوسرے سے شادی کرتے تھے اور نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ لیکن کسی نے یہ نہ کہا کہ اس وجہ سے ہندو ایک فرقہ نہیں ہیں۔ مسٹر جناح کا رویہ مسلمانوں کی اس بڑی تعداد کے بارے میں جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں رہجاتی بڑا سنگ دلانہ اور ناقابل یقین تھا۔ وہ اپنے ایک تہائی ہم مذہبوں کو بڑی بے رحمی اور بے دردی سے قربان کردینے پر تیار تھے تاکہ باقی ماندہ مسلمان آزادی سے متمتع ہوسکیں۔

3- برطانیہ اور اصل پاکستان کا مقصد

جناح اور مسلم لیگ کے علاوہ اور کون پاکستان کا حامی تھا جس نے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں مدد کی ۔ بظاہر ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے پاکستان کی حمایت نہیں کی گئی۔ پنجاب جہاں مسلم آبادی 57 فیصدی تھی اور باقی ماندہ شمالی مغربی خطے میں جہاں ان کی تعداد 90 فیصدی تھی وہ پاکستان کی حمایت میں نہ تھے اور نہ اس بارے میں انھوں نے جوش کا مظاہرہ کیا۔ سکندر حیات خاں جو 1937 تا 1942ء پنجاب کے پریمیر یا چیف منسٹر رہے، نے خود ایک دستوری اسکیم تیار کی تھی جس میں انھوں نے 3 سطحی انتظامات تجویز کئے تھے۔ صوبے، خطے اور مرکز کے تحت امور خارجہ، ڈیفنس اور مالیات رکھے گئے تھے۔ پاکستان کا تذکرہ آنے پر انھوں نے پنڈرل مون کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا جب انھوں نے ان سے پاکستان کے تصور کی تائید چاہی تو انھوں نے باآواز بلند کہا۔'' اس طرح کی باتیں تم کیسے کر سکتے ہو۔ تم مغربی پنجاب میں عرصے تک رہے ہو اور تم وہاں کے مسلمانوں کو اچھی طرح سے جانتے ہو۔ بلاشبہ ان کے نزدیک پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ہندو بنئے کا گلا کاٹ دیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اس بارے میں دوبارہ تمہیں اس طرح کی گفتگو کرتے ہوئے نہ سنوں۔ پاکستان سے مراد قتل عام ہے۔''

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ سر سکندر اس تجویز یعنی تجویز پاکستان سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ ان کا پاکستان، جیسے وہ جنستان یعنی بھوت پریتوں کا مسکن کہتے تھے، تصور کو ناپسند کرنا سب کو معلوم تھا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ اگر پاکستان سے مراد یہاں مسلم راج اور دوسری جگہ ہندو راج مراد ہے تو میرا اس سے کوئی مطلب نہیں۔

مون کے نزدیک 1940ء میں سکندر حیات خاں کے مسلم پیروؤں کی خاصی

تعداد پاکستان کے تصور کے بارے میں ان کے ہم خیال تھی۔

1942ء میں کرپس نے اپنے دہلی کے قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سر سکندر حیات سے ملنے کو کہا تھا تا کہ کرپس کی پیشکش کے بارے میں ان کے خیالات معلوم ہو جائیں۔ سکندر حیات خاں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے اور ان سے بات چیت کی۔ اس گفتگو کے بارے میں مولانا آزاد کا یہ بیان ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ کرپس کی پیشکش فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین حل ہے۔ وہ اس کے پوری طرح قائل تھے کہ اگر اس مسئلے پر پنجاب اسمبلی کی رائے لی گئی تو اس کا فیصلہ فرقہ وارانہ لائنوں پر ہوگا۔

جب تک سکندر حیات خاں زندہ رہے تو اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ پنجاب مسلم لیگ کے نظریہ یا تصور پاکستان کو قبول کرے گا۔ اگر چہ خالص سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے وہ دکھاوے کے لیے مسلم لیگ میں شامل رہے۔

جہاں تک سندھ کا تعلق تھا 1937ء کے مجلس قانون ساز کے الیکشن میں مسلم لیگ کا کوئی بھی ممبر منتخب نہیں ہوا تھا۔ 1940ء میں اللہ بخش جو ایک پختہ نیشلسٹ تھے وہاں کے پریمیر یا چیف منسٹر تھے۔ مسلم لیگ کے پاکستان ریزولوشن پاس کرنے کے بعد نیشلسٹ مسلمانوں نے 27/اپریل سے 30/اپریل تک دہلی میں ایک کانفرنس کی۔ اس کی صدارت اللہ بخش نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے اخوت، بھائی چارے اور اچھے پڑوسی اور مشترکہ قومیت کے جذبے کو بڑھاوا دینے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ سوائے عام جلسوں کے مسلم لیگ کے پاس اور کیا ثبوت ہے کہ جس کی بنا پر اسے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا جائے۔

انھوں نے مسٹر جناح کے دوقومی نظریہ کو مسترد کر دیا۔

سارا ہندوستان سب ہی ہندو مسلمانوں کا ہوم لینڈ یا مادر وطن ہے۔ نہ کوئی علیحدہ

مخصوص منطقہ اور نہ کسی ہندو مسلمان یا کسی دوسرے کو یہ حق حاصل ہے کہ انھیں ان کے وطن سے محروم کردے۔

انھوں نے پاکستان کے تصور کو محض خیالی قرار دیا اور ہندوستان کی مکمل آزادی کی پرزور وکالت کی۔ ان کے نزدیک پاکستان ناقابل عمل تھا اور ہر اعتبار سے مضر اور تباہ کن۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ دستور کے مسئلے کو بھی کانسٹی ٹیوئنٹ یا دستور ساز اسمبلی طے کرے اور اقلیتوں کے لیے تحفظات رکھے جائیں۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ جس میں مسلمانوں کی بڑی زبردست اکثریت تھی پوری طرح خاں عبدالغفار خاں کے اثر میں تھا۔ اگرچہ اس وقت صوبے میں کوئی وزارت نہ تھی لیکن وہاں مسلم لیگ کا کوئی اثر نہ تھا۔

بنگال ہی صرف وہ واحد مسلم اکثریتی صوبہ تھا جو 1940ء میں کرشک پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کہ مخلوط وزارت کے تحت تھا اور اس میں کچھ آزاد ممبر بھی شامل تھے لیکن فضل الحق کو مسٹر جناح کی لیڈرشپ پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔ پنڈرل مون کے نزدیک فضل الحق نے دل سے پاکستان کو قبول نہیں کیا تھا حالانکہ پبلک میں وہ اس کے حامی ہونے کا اعلان کرتے تھے اور سکندر حیات خاں بڑی غلط پوزیشن میں تھے لیکن اس موقعہ پر وہ مسٹر جناح سے بگاڑ کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ سکندر حیات نے اس وقت بھی اور آخری دم تک یہی سوچا اور ان کا یہی سوچنا صحیح تھا کہ اگر وہ مسٹر جناح کی مخالفت کریں گے تو پنجابی مسلمان متحد نہ رہ سکیں گے اور وہ یعنی سکندر حیات خاں ان پر اپنا اثر کھو بیٹھیں گے۔ اس لیے وہ اوپری دل سے بظاہر جناح کی اطاعت کرتے تھے لیکن دل میں بہت تتر بتر ہوتے تھے۔

فضل الحق کا نیشنل ڈیفنس مشاورتی کونسل کی ممبری قبول کرنے پر مسٹر جناح سے اختلاف ہوا، اور وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ دسمبر 1941ء میں وہ لیگی وزیروں

خاص طور سے خواجہ ناظم الدین اور سہروردی سے اس درجہ ناراض ہوئے کہ وزارت سے بھی مستعفی ہو گئے اور انھوں نے دوسری وزارت مسلم لیگی مسلمانوں اور مہا سبھا کے ہندوؤں جس میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر مہا سبھا کے لیڈر شیاما پرشاد مکر جی تھے اور سبھاش چندر بوس کے پیروؤں کے ساتھ بنائی۔

مسلم صوبوں کے علاوہ جو پاکستان کے مخالف تھے یا اس کے تصور سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتے تھے متعدد مسلم جماعتیں اور تنظیمیں تھیں جو پاکستان کی شدید مخالف تھیں۔ یہ مجلس احرار، جمعیۃ العلماء، شیعہ پولٹیکل کانفرنس اور مومن کانفرنس تھیں۔

1940ء میں ہندوستانی ہندوؤں میں سے کوئی بھی پاکستان نہ چاہتا تھا اور نہ ہی اس کی مدافعت میں تھا۔ مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد اس کی موافقت میں نہ تھی لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا حالات ایسے ہوئے کہ اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔

پہلی وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کے اعلیٰ درجہ کی رائے میں تیزی سے تبدیلی ہوئی۔ حوصلہ مند اور الوالعزم سیاست دانوں اور سیاسی لیڈروں نے مجالس قانون ساز اسمبلی کی ممبریوں اور وزارتوں میں بڑھتے ہوئے اقتدار کا نقشہ دیکھا۔ سرکاری ملازموں، جن میں فوجی اور غیر فوجی دونوں شامل تھے کو آئندہ ترقی کے موقعے نظر آئے۔ اس طرح ڈاکٹروں، استادوں، انجینیروں اور تجارت پیشہ افراد، سرمایہ داروں، صنعت کاروں، بینکروں اور تاجروں کو اپنے کاروبار اور سرگرمیوں میں مزید ترقی کی راہیں نظر آئیں۔ لیکن ان طبقوں کو سب سے زیادہ اس خیال نے متاثر کیا کہ اب ان ہندوؤں سے مقابلہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلم آبادی تقریباً 24 فیصدی تھی اور انھیں 75 فیصدی سے زیادہ ہندوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد 85.9 تھی جو کہ اکثریت میں تھے اور ہندو 12.9 فی صدی تھے۔ وہاں مسلمان نوجوانوں کو سرکاری ملازمتوں میں چالاک ہندوؤں کا مقابلہ

نہیں کرنا پڑے گا۔ دوسرے پیشوں میں بھی پاکستان میں مسلمانوں کی اجارہ داری ہوگی اور وہاں تجارت پیشہ ہندو طبقے مسلمانوں کو تجارت میں آگے بڑھنے سے نہ روک سکیں گے۔ اس لیے کہ انھیں اسٹیٹ یعنی حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگی اور انھیں اس کی طرف سے پورا تحفظ حاصل ہوگا۔

جیسے جیسے یہ احساس بڑھتا گیا پاکستان کے لیے جوش بڑھتا گیا۔

دوسری طرف کانگریس کی پالیسی اور عمل نے مسلم لیگ کا اثر بڑھانے میں بڑی مدد کی۔ پہلے تو کانگریس نے صوبوں سے اپنی وزارتوں کو ہٹالیا۔ اس سے اس کا اثر اور اختیار بہت کم ہوگیا۔ مسلم لیگ نے اس موقعہ کا خوب فائدہ اٹھایا اور کانگریس کے خلاف اپنا پروپیگنڈہ شروع کیا اور اپنی تنظیم کی طرف خاص توجہ کی۔

اکتوبر 1940ء میں کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو اس وجہ سے برطانوی حکومت کا رویہ کانگریس کے بارے میں بڑا سخت ہوگیا اور حکومت مجبور ہوئی کہ وہ مسلم لیگ کی سرپرستی کرے اور اس کی پوری طرح حمایت کرے۔ اس سے مسلمانوں میں مسلم لیگ کے مستقل صدر مسٹر جناح کے وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

سول نافرمانی کی تحریک کے بعد 'انگریزو ہندوستان چھوڑو' کی تحریک 18/ اگست 1942ء کو شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے کانگریس ممنوع جماعت قرار دی گئی اور اس کے اہم لیڈر گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے گرفتار کرلئے گئے۔ اس طرح میدان تنہا مسلم لیگ کے لیے رہ گیا۔

تیسرے یہ کہ گورنمنٹ نے براہ راست یا جان بوجھ کر مسلم لیگ کو مضبوط اور مستحکم کرنے اور مسٹر جناح کی لیڈرشپ بنانے میں پوری مدد کی۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے

کہ لن لتھ گو نے جناح سے یہ عہد و پیمان کیا تھا کہ بغیر مسلم لیگ کی رضامندی کے نہ تو کوئی دستوری یا انتظامی تبدیلی کی جائے گی اور نہ ان پر غور کیا جائے گا اور یہ کہ مسلم لیگ کی رضامندی اور اطمینان کسی بھی بنیادی تبدیلی کے لیے بنیادی شرط ہے۔

یہ دراصل استرداد یا ویٹو کا حق تھا جسے مسٹر جناح کے ہاتھوں میں دیا گیا تھا حالانکہ مسٹر ایمرے اس کے بڑے شدومد سے منکر تھے حتٰی کہ انتظامی تبدیلیوں میں وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع اور سول ڈیفنس مشاورتی کونسل کے قیام کے متعلق وائسرائے نے مسٹر جناح سے وعدہ کیا تھا کہ بغیر ان کے مشورہ کے کسی مسلمان ممبر کو ان کونسلوں کا ممبر نہ مقرر کیا جائے گا۔ جب سلطان احمد کو وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا اور سکندر حیات خاں، فضل الحق اور بیگم شاہ نواز کو نیشنل ڈیفنس کونسل کا تو مسٹر جناح نے ان لوگوں کی زبردست ملامت کی اور لن لتھ گو کے اس فعل کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اس پر لن لتھ گو نے عذر خواہی کی۔

جناح کی کامیابی یا فتح پر آخری ردّا اس وقت رکھا گیا کہ جب کرپس پارٹی کو برطانیہ کی مساعی جنگ میں پوری طرح تعاون کرنے کے لیے آمادہ کرنے کے لیے برطانوی حکومت کی طرف سے پیش کش رکھی گئی۔ اس پیش کش میں ایک تجویز جناح کے مطالبہ پاکستان کے متعلق تھی۔ اس پیشکش میں اسے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اگر کوئی صوبہ یا صوبے نئے دستور سے متفق ہونے یا اتفاق کرنے یا اتفاق نہ کرتے تو انھیں اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنا دستور مرتب کریں اور ان کا بھی وہی پورا درجہ ہوگا جو مجوزہ انڈین یونین کو حاصل تھا۔

آخری بات یہ تھی کہ جنگ کی صورتحال خطرناک سے خطرناک تر ہوتی جارہی تھی۔ 1941ء کے نصف آخر میں جرمن فوجیں روس کے قلب میں داخل ہو چکی تھیں۔ شمالی افریقہ میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔

مشرقِ وسطیٰ میں اتحادیوں کے مفاد کو سخت ترین خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ جرمن رومانیہ پر قابض ہو چکے تھے۔ انھوں نے یوگوسلاویہ اور یونان کو شکست دیدی تھی۔ بلغاریہ عبوری طاقتوں کے ساتھ شامل ہو چکا تھا۔ اس طرح سے سارا مشرقی بحرروم، جرمن کارروائیوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ جاپان نے مشرقی ایشیا میں بڑی تیز رفتاری سے اتحادیوں خاص کر برطانیہ کے خطروں اور ان کی تشویش اور اضطراب کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔

1941ء کو پرل ہاربر پر جب بڑی زبردست اور تباہ کن بمباری کی گئی اور 7/ مارچ 1942ء کو ان کے رنگون میں داخل ہونے سے بہت بڑا ساحلی علاقہ جاپانی تسلط میں آ گیا تو ہندوستان بھی ایک جنگی محاذ بن گیا۔

جاپان کی یہ پیش قدمی اور برق رفتار یلغار برطانیہ کے لیے بالکل اچانک تھی اور اس کا فوجی ہائی کمان جو برسوں سے شمال مشرق میں جنگ کی مرحلہ وار حکمت عملی تیار کرنے میں لگا ہوا تھا کہ اسے جاپان کے یلغار کی مزاحمت کرنی پڑی جو برما سے براہ آسام اور بنگال ہندوستان کی طرف تھی۔

مشرقی محاذ پر جنگ سے چار ملک فوری طور سے متاثر تھے: چین، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور ہالینڈ۔

پہلے دونوں ملکوں کو جنگ کے بارے میں ہندوستانی رویےّ سے بڑی تشویش تھی اور انھوں نے یو کے یعنی برطانیہ پر بہت زور ڈالا کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جس کی وجہ سے ہندوستان تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن برطانوی حکومت دونوں جگہ یعنی لندن اور دہلی میں ذرہ برابر بھی اس کی قائل نہ ہوئی کہ ہندوستان قوم پرستوں کی رائے کو ہموار کرنے سے کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل ہوگا۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ

جن مادی وسائل کی اسے ضرورت ہے مثلاً فوج کے لیے رنگروٹ یا دوسری اشیاء وہ انھیں بغیر سیاست دانوں کی حمایت کے حاصل ہو رہی ہیں۔ اس لیے نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ مناسب کہ جنگ کے دوران کسی قسم کی انتظامی یا دستوری انتظامات میں کسی قسم کی انتہا پسندانہ تبدیلی کی جائے۔

اگرچہ کانگریس نے مساعی جنگ میں حکومت کی مدد کرنے سے انکار کیا تھا مگر دوسری پارٹیاں حکومت سے تعاون کر رہی تھیں اور ان میں مسلم لیگ بھی شامل تھی۔

کانگریس کی نارضامندی کی وجہ نے مسلمانوں کو دوست بنانے کی ضرورت کو اور بڑھایا۔ جناح نے اس صورتحال کا پورا فائدہ اٹھایا اور جتنا زیادہ حکومت کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں پر اکتفا کرتی تھی اتنا ہی زیادہ مسلمانوں یعنی مسلم لیگ کے مطالبے ماننے یا منظور کرنے پر مائل ہو رہی تھی، اس سے مسٹر جناح کی اہمیت نہ صرف ان کے ہم مذہبوں میں ہوئی جو روایتی طور سے اقتدار اور اختیار کے پجاری تھے بلکہ دوسرے لیڈر نے بھی اس کا فائدہ اٹھایا اور حکومت کی طرف سے مراعات حاصل کیں۔ دوسری طرف کانگریسی بھی آزادی کے حصول کی خاطر بااثر لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے بیقرار تھے۔

ان تمام واقعات کے پیش نظر جو بیان کیے جا چکے ہیں یہ نتیجہ نکالنا بالکل قدرتی ہے کہ یہی واقعات پاکستان کا مطالبہ کے پیش کرنے کے محرک ہوئے اور جس بنیادی سبب نے اس مطالبہ کو اتنا زیادہ مؤثر بنایا وہ برطانوی حکمرانوں کی مرضی اور ارادہ تھا۔ انھوں نے ہی مسلم علیحدگی پسندی کے لیے پوری طرح سے بیج بویا اور پھر انھوں نے ہی علیحدگی پسندی کے اس پودے کی پوری دیکھ بھال کی اور ہر طرح سے اسے پروان چڑھایا۔ بالآخر انھیں کی کوششوں سے یہ نخل بار آور ہوا یعنی پھل دینے لگا۔

آٹھواں باب

کرپس مشن

1-آغاز

جس عدیم المثال اور عدیم النظیر رفتار سے جاپان نے بحرالکاہل پر اپنی خوشحالی کا دائرہ وسیع کیا اسے جنوب مشرق میں متعلقہ قوموں یعنی برطانیہ، ہالینڈ، چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے محسوس کیا کہ مشرقی محاذ کی جنگ ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اس وجہ سے انھوں نے برطانیہ کو اپنی اس تشویش کے بارے میں مطلع کیا کہ جنگ میں ہندوستان کا کیا رویہ رہے گا۔

برطانیہ میں لیبر پارٹی کے ممبروں، لبرل پارٹی کے بعض ممبروں، کنزرویٹیو پارٹی کے لیڈروں اور بعض اخباروں مثلاً ٹائمز آف مانچسٹر اور گارجین نے بھی اس تشویش کا اظہار کیا۔ عام قیاس آرائی یہ تھی کہ مساعی جنگ میں حکومت، ہندوستان کو تعاون پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے گی۔

ہندوستان جو اب تک مساعی جنگ میں حصہ لینے سے باز رہا تھا اب اپنے رویّے میں تبدیلی کے اشارے دے رہا تھا۔

9/دسمبر 41ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تعاون دینے پر آمادگی ظاہر کی بشرطیکہ برطانیہ یعنی حکومت ایسے حالات پیدا کرے جن کی وجہ سے ہندوستان باعزت طریقے سے جمہوریت اور آزادی کے لئے لڑے۔

4/جنوری 1942ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس ریزولوشن کی توثیق کی۔

2/جنوری 1942ء تیج بہادر سپرو نے مقتدر ہندوستانی شخصیتوں کے ساتھ جن میں کسی کا بھی تعلق کانگریس سے نہ تھا وزیر اعظم چرچل کو ایک بحری تار بھیجا جس میں اس کا مطالبہ کیا گیا کہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کانسل کو فوری طور سے صحیح معنوں میں قومی حکومت میں تبدیل کیا جائے۔ صوبوں میں عوامی حکومتوں کو بحال کیا جائے۔ امپیریل وارکونسل میں قومی حکومت کے نامزد ہندوستانیوں کو داخل کیا جائے اور ہندوستان کو وہی درجہ دیا جائے جو دوسری برطانوی نوآبادیوں کو حاصل ہے۔ چرچل، جو اس وقت واشنگٹن میں تھے، نے 7/جنوری کو ایٹلی کو تار بھیجا کہ مجھے امید ہے کہ میرے رفقاء کار کو ایسے وقت کہ جب دشمن ہندوستان کی سرحدوں پر پہونچ چکا ہے ہندوستان میں دستوری تبدیلی کے مسئلے اٹھانے کا اور اس سے بڑھ کر دستوری تبدیلیوں کے کرنے کے خطرے کا پورا احساس ہے اور یہ خیال کہ ہم ہندوستان سے باہر ہو جائیں اور کانگریس کو اس نازک گھڑی میں ذمہ دار بنائیں، بالکل ہی غلط ہے۔

کانگریس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے متنبہ کیا کہ اس مخالف سیاسی عناصر کو ہمراہ لانے سے دفاعی مشنری بالکل مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ 21/جنوری کو وائسرائے نے وزیر ہند کو اپنی مراسلت میں دستوری تبدیلیوں کے عام مسئلے کو اٹھایا۔ وزیر ہند نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ بائیں بازو کے دباؤ یا دانشوروں کے عالمانہ نقطۂ نظر یا خالص جذباتی لوگوں کے اس دباؤ سے متاثر نہ ہوں جس کا ٹائمز جیسے اہم اور رفیع پائے کے اخبار میں اظہار کیا جاتا ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ حکومت کو کسی قسم کی کوئی تحریک نہیں کرنی چاہئے اپنے موقف پر ڈٹے رہنا چاہئے۔ انھوں نے وہ عام لائن تجویز کی جو حکومت پارلیمنٹ میں نکتہ چینوں کے بارے میں اختیار کرے گی۔

اس تار کے بارے میں ایٹلی (Attlee) کا ردعمل یہ تھا کہ ''مجھے یہ اعتراف کرنا

چاہئے کہ اس مراسلت کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ وائسرائے کے فیصلوں پر مجھے اعتماد نہیں۔ لن لتھ گو مجھے شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ کس اور دوسرے کے سپرد مشن کیا جائے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرے۔ یہ اس قسم کی عام رائے ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور جو اس رائے سے قطعاً غیر مطمئن ہیں کہ اب کچھ نہیں کرنا چاہئے اور اگست 1940ء کے اعلان پر جمے رہنا چاہئے۔"

28 /جنوری کو ایمرے نے ہندوستانی مسئلے کے بارے میں جنگی کابینہ کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں انھوں نے وائسرائے کے خیالات کی تہہ دل سے تائید کی۔ اس میمورنڈم اور لن لتھ گو کے خیالات پر ایٹلی نے بڑے سخت لفظوں میں تلخ اور تند تنقید کی: "میرے لیے وائسرائے کے بھدے اور ناپختہ امپیریلزم کو منظور کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے نہیں کہ میں اسے بالکل غلط سمجھتا ہوں بلکہ میں اسے سراسر مضر سمجھتا ہوں۔ یہ تمام تر کوتاہ بینی پر مبنی ہے اور خودکشی کی طرف لیجانے والا ہے۔ میں اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوں کہ اس بھدی چیز کو آزادی اور جمہوریت کے مقدس خیالات کے پیراہن میں ملبوس کیا جائے۔" انھوں نے تجویز کیا کہ سمجھوتے کے لیے گفت وشنید کرنے کے لیے کسی بلند و بالا شخصیت کو پورے اختیارات کے ساتھ بھیجا جائے۔

اس اثناء میں چینی جمہوریہ کے صدر چیانگ کائی شک اس سے بہت زیادہ مضطرب اور پریشان تھے کہ جاپانی بمبار ہوائی جہازوں نے شنگھائی اور ہانگ کانگ پر بمباری کی ہے اور جاپانی فوجیں فلپائن، ملایا اور برما پر حملہ آور ہوئی تھیں اور انھوں نے برطانوی بحریہ کے پرنس آف ویلیز اور ری پلس (Repulse) جیسے جنگی جہازوں کو تباہ کر کے زبردست ضرب کاری لگائی تھی اور جنوبی مغربی اشیاء میں اتحادیوں کی مزاحمت کرنے کی قوت کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ 15 /جنوری 1942ء کو جاپانیوں

نے سنگاپور کو فتح کرلیا اور اسکے بعد وہ برما تاخت وتاراج کرنے والے تھے۔ چین کے سمندری راستے بند ہو جانے کے باعث ضروری اشیاء یا تو بڑے لمبے بری راستہ سے یعنی روسی علاقوں کو طے کر کے یا پھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہنچائی جاسکتی تھیں اور چونکہ ہندستان ان اشیاء کی فراہمی کا مرکز تھا اس لیے اسے بہت اہم حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ چیانگ کائی شک نے اس مسئلے کے بارے میں امریکن حکومت سے تبادلہ خیال کیا تھا لیکن بدقسمتی سے نہ تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور نہ برطانیہ نے جاپان کے خلاف اپنے ناگزیر حلیف کے خیالات کو اتنے غور وتوجہ سے سنا جس کے وہ مستحق تھے۔

ان حالات میں چیانگ کائی شک نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ حکومت ہند کے ذمہ داروں اور اس کے ارباب حل وعقد اور ہندوستانی رائے عامہ کے نمائندوں یعنی سیاسی لیڈروں سے مل کر تبادلۂ خیال کریں۔ چنانچہ وہ 8 ؍فروری 1942ء کو ہندوستان پہونچے۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلے ہی مل چکے تھے جب وہ یورپ میں جنگ شروع ہونے سے پہلے چین گئے تھے۔ نہرو چینیوں یعنی چین کے لوگوں اور ان کے صدر سے بہت زیادہ خوش تھے۔ لیکن حکومت ہند نے نہ تو ان کے شایان شان تپاک کا مظاہرہ کیا اور نہ ہندستانی لیڈروں کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کو پسند کیا تاہم وہ دہلی میں دوسروں سے ملنے کے علاوہ نہرو اور آزاد دونوں سے ملے اور 18 ؍فروری کو کلکتہ میں گاندھی جی سے ملے۔

ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت اپنے الوداعی پیغام میں جو ان کے ہندوستانی بھائیوں کے نام تھا، انھوں نے کہا کہ ''تہذیب کی تاریخ میں اس نازک ترین موقعہ پر ہم دوقوموں کو پوری طرح بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے پوری طرح سے جدوجہد کرنی چاہئے۔ کیونکہ آزاد دنیا میں ہندوستان اور چینی قومیں اپنی آزادی حاصل کرسکتی

ہیں۔ اگر چین یا ہندوستان کو آزادی سے محروم کیا جاتا ہے تو پھر دنیا میں اصل اور پائیدار امن قائم نہیں ہوسکتا ہے۔''

انھوں نے مندرجہ ذیل لفظوں میں اپنے عظیم حلیف برطانیہ کو مخاطب کیا اور کہا کہ ''بغیر اس کا انتظار کیے ہوئے کہ ہندوستان کے کیا مطالبے ہوں گے انھیں (ہندوستان) جلد از جلد اصل سیاسی اقتدار دے دو تا کہ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنی روحانی اور مادی قوت کے ساتھ ترقی کر سکیں اور وہ اس کو محسوس کر لیں کہ جنگ میں حصہ لے کر وہ نہ صرف حملہ آوروں کے خلاف نبرد آزما قوموں کی مدد کر رہے ہیں تا کہ وہ فتح حاصل کریں بلکہ ہندوستان کے آزادی کی جدوجہد کو ایک نیا موڑ بھی دے سکیں۔''

کن منگ (Kunming) لوٹنے پر جو اس وقت چین کا دار سلطنت تھا، انھوں نے 24 رفروری کو لندن اور واشنگٹن میں اپنے سفیروں کو بحری تار سے ہدایتیں بھیجیں اور ان میں انھوں نے ان سے کہا کہ دورہ ہندوستان کے بارے میں چرچل اور روز ویلٹ کے بارے میں تاثرات سے مطلع کریں اور ان ہدایتوں میں چرچل سے یہ کہا گیا:

'' مجھے ہندوستان کی فوجی اور سیاسی صورت حال سے زبردست صدمہ ہوا۔ اس صورتحال کا اندازہ ہندوستان جانے سے پہلے نہیں کر سکتا تھا۔ میں بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو جلد از جلد حل نہ کیا گیا تو خطرہ دن بدن بڑھتا جائے گا۔ اگر جاپان کو اصل صورتحال کا پتہ چل جائے اور وہ حملہ کر دے تو جاپان بلا کسی مقابلہ کے فتحیاب ہو جائے گا۔''

صدر روز ویلٹ کا نام ان ہدایتوں میں یہ تھا کہ دنیا کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر برطانوی حکومت ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی نہیں بدلتی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان کو دشمن کے حوالے کیا جا رہا ہے اور اسے اس کی دعوت دی

جا رہی ہے کہ وہ ہندوستان پر قابض ہو جائے جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو میری تشویش اور اضطراب کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔''

چیانگ کے انتباہ اور اپیل کا چرچل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کا دباؤ پڑا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو بدنام کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر بہت اوچھا اور شرمناک پروپیگنڈہ شروع کیا۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی آرزوؤں کے خلاف حد درجہ تعصب سے کام لیا گیا لیکن بہت سے امریکیوں نے اس سے دھوکہ نہیں کھایا جیسا کہ اس میمورنڈم سے ظاہر ہوا جو نائب وزیر لانگ (Long) نے انڈر سکریٹری ویلس (Wells) کو بھیجا تھا۔ انھوں نے 25 رفروری 1942ء کو یہ لکھا کہ آج صبح خارجی تعلقات کی میٹنگ میں برطانیہ مخالف جذبات کے زبردست دباؤ کا اندازہ ہوا۔ ایک سینیٹر Senator نے یہ کہا کہ اگر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سامان جنگ ہو اور جنگ لڑانے کے لیے قابل امریکن افسروں کی رہنمائی تب یہ ہندوستانی انگلستان کا اپنے اوپر تسلط یا انگریزوں کی حکومت کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ ہمیں اس کا مطالبہ کرنا چاہیے کہ ہندوستان کو خود مختار حیثیت دی جائے۔ ہندوستانیوں کے لیے لڑنے کا صرف یہی راستہ ہے کہ وہ ہندستان کے لیے جنگ کریں۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی لیڈرشپ امریکہ کے قومی سامان جنگ کا حصہ ہونا چاہیے۔ اسسٹنٹ سکریٹری کو اس کا بڑا اندیشہ تھا کہ کہیں برطانیہ مخالف جذبات حکومت یعنی امریکن حکومت کے خلاف اس لیے نہ استعمال ہوں کہ برطانوی حکومت اس باب میں اپنا اثر ڈالنے میں ناکام رہی۔

لندن میں امریکن سفارت خانہ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو 26 ر فروری 42ء کو واشنگٹن میں مطلع کیا کہ چرچل اس کے لیے بیقرار ہیں کہ وہ صدر یعنی

امریکن صدر کو یہ بتائیں کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے بارے میں کیا کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ان معلومات سے جو انھوں نے دی ہیں آپ کو بڑی دلچسپی ہوگی۔

ہندوستانی فوجیوں اور والنٹیر ز میں مسلمان تقریباً 75 فیصدی ہیں باقی ماندہ میں سے نصف یعنی 12 فیصدی کانگریس گروپ کے حامی ہیں۔ مسلم آبادی 100 ملین سے متجاوز ہے۔ ہندوستان کے جنگ جو لوگ جو شمالی صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ تر کانگریس تحریک کے سخت مخالف ہیں۔ نشیب میں واقع مرکز اور جنوب کے علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں جنگ لڑنے کا جوش و خروش نہیں۔ اس لیے وزیر اعظم کوئی ایسا سیاسی قدم نہیں اٹھا سکتے کہ جس سے مسلمان ناراض ہو جائیں۔ چرچل، ایمرے اور دوسرے برطانوی سیاستداں اس طرح کے سفید جھوٹ بول کر دنیا کو دھوکہ دیتے تھے۔ خاص طور پر امریکیوں کو جو برطانوی حکومت اور اس کی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میجر جنرل لاک ہارٹ نے ہندوستانی فوجوں کی ہیئت ترکیبی یا تشکیل کے بارے میں واقعات بیان کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی فوجوں کی ہیئت ترکیبی اور تشکیل کے بارے میں یکم جنوری 1941ء کے اعداد شمار بتاتے ہیں کہ چار لاکھ اٹھارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار یعنی تقریباً 37 فیصد ہے۔ دو لاکھ 63 ہزار ہندو اور دوسرے مذہبوں کے پیرو ہیں۔

51 ہزار سکھوں کو شامل کر کے ان چار لاکھ 18 ہزار فوجیوں میں سے دو لاکھ ایک ہزار پنجاب سے تھے۔ یعنی تقریباً 48 فیصدی۔ ان میں مسلمان 96 ہزار تھے اور ایک لاکھ چار ہزار غیر مسلم اگرچہ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ 1941ء میں مردم شماری کے مطابق کل آبادی پنجاب کی 28.4 ملین تھی جو 16 ملین مسلمانوں، 8.6 ملین ہندوؤں، 3.8 ملین سکھوں پر منقسم تھی۔ فوج میں مختلف فرقوں کا تناسب

آبادی کے مطابق نہ تھا۔ ایک دوسرے اندازے کے مطابق 1942ء میں فوج کے اجزاء ترکیبی کا تناسب مندرجہ ذیل ہے۔

مسلمانوں کی تعداد 35 فیصدی تھی

غیر مسلم و دیگر کی تعداد 65 فیصدی تھی

(ہندوؤں، سکھوں، گورکھوں اور دوسرے مذہبوں کے پیروؤں کی تعداد)

فوج پر کانگریس کے اثر کے بارے میں رائے زنی بالکل ہی غیر متعلق تھی۔ یہ تنخواہ دار جماعت تھی اور کانگریس سے اس کی وفاداری کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوا جب تک سبھاش چندر بوس نے جاپانیوں کے ہاتھ گرفتار شدہ ہندوستان فوج پر مشتمل قومی فوج نہیں بنالی یا جب تک ہندوستانی بحریہ نے بغاوت نہیں کی۔

جنرل آئزن ہاور سپریم کمانڈر کے مطابق جنگ میں ہندوستان کا تعاون اشد ضروری تھا۔'' اس لیے کہ آسٹریلیا تک فضائی اور بحری ذرائع آمد و رفت کو محفوظ رکھنے کے علاوہ ہمیں ہر قیمت پر ہندوستانی اڈوں پر توجہ رکھنا ہے ورنہ جرمن اور جاپانی فوجیں خلیج فارس کے ذریعہ ایک دوسرے سے مل جائیں گی۔''

2-کابینہ کا کرپس مشن بھیجنے کا فیصلہ

اگرچہ چرچل اس کے شدید ترین مخالف تھے کہ ہندوستان کے مسئلے کو کابینہ میں اٹھایا جائے لیکن اس مسئلہ کو دبایا نہ جاسکا۔ برطانیہ کے جنگ کے بارے میں اعتراض ومقاصد کے بارے میں اعلان کرنے پر کانگریس کے پیہم اصرار کی وجہ سے ہندوستان سے باہر بشمول انگلستان اس سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہندوستانی اعتدال پسند سیاسی لیڈروں نے وزیراعظم کو ایک میمورنڈم بھیجا جس میں وزیراعظم سے اس مسئلے پر فوری کارروائی کرنے کو کہا گیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اس مسئلہ کو اب نظر

انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چیانگ کائی شک کے عام پیغام اور ان کی وزیر اعظم انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ کے نام خفیہ ہدایتوں کی وجہ سے اس مطالبے کو تقویت ہوئی۔

امریکیوں کا رویہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ انھیں چرچل کے اس اصرار پر کہ اٹلانٹک چارٹر کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوتا وہ شدید ناراض ہوئے۔ ان کی رائے میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ ہندوستان کے مسئلے پر فوری توجہ کی جائے۔ چرچل کی عدم رضامندی اور ایمرے اور لن لتھ گو کی مخالفت کے باوجود اس مسئلے پر کابینہ میں غور وخوض کو ٹالا نہ جا سکا اس لیے کہ ایٹلی نے جو کابینہ میں نمبر دو کی پوزیشن میں تھے، اسے ضروری سمجھا۔ ایمرے نے لن لتھ گو کو چرچل کی تبدیلی رائے کے بارے میں یہ لکھا کہ ''ونسٹن نے ہم دونوں کے لیے بیشمار دشواریاں اور دقتیں پیدا کر کے جیسی کہ ان کی عادت ہے لال بتی خاص کر امریکن لال بتی ایک رات میں دیکھ لی ہے۔'' چرچل اس کی طرف مائل تھے کہ صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے یا اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اعلان کیا جائے یعنی حکومت کی طرف سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تجویزیں پیش کی جائیں۔

چنانچہ اس اعلان کی شرطوں یا مضمون پر ایمرے اور لن لتھ گو نے مستقل اور عارضی و موجودہ صورتحال کے بارے میں بحث کی اور ایمرے کی تعارفی نوٹ کے ساتھ ہارڈنگ کے ذریعہ ملک معظم کے پاس اس اعلان کا مسودہ بھیجا گیا۔ ایمرے نے لکھا کہ میرے خیال میں اس اعلان کا مضمون زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ سوائے آئندہ دستور مرتب کرنے والی جماعت کے لیے طریقہ کار اور ناموں کو طے کرنے کے اس نے اس میں بہت کم اضافہ کیا ہے جس پر ہم اور لن لتھ گو جولائی 1940ء میں متفق ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کو مطلع کیا گیا لیکن 8/ مارچ 1942ء کو وائسرائے نے اس اعلان کے تباہ کن نتیجوں خاص کر

اقلیتوں کے بارے میں زبردست انتباہ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اندرونی معاملوں کو طے کرنے کی ذمہ داری ہندوستانی فرقوں پر نہ چھوڑ کر برطانوی حکومت پر ڈالی جائے۔ دوسرے دن انھوں نے ایک بحری تار بھیجا جس میں انھوں نے کہا کہ اگر یہ اعلان اصل مسودہ کے مطابق منظر عام پر آیا تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ اسی دن جنگی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ اس اعلان کو شائع کرنے سے پہلے لارڈ پریوی سیل(Privy Seal) ہندوستان جائیں اور انھیں یہ اختیار دیا گیا کہ اس اعلان کی اسکیم پر ہندوستانی سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیال کریں اور اس کا اندازہ کریں کہ کیا یہ اسکیم قابل قبول ہے چونکہ ان کی تائید سے ہی یہ اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے۔

پالیسی میں یہ دفعتہً تبدیلی اس احساس کا نتیجہ تھی کہ کہیں اس اسکیم کا خیر مقدم بھی 18 / اگست 1940ء کی تجویز کی طرح ہندوستان کی اہم سیاسی پارٹیوں کے لیے ناقابل قبول نہ ٹھہر جائے۔ وائسرائے یقیناً اس کے یا کسی بھی سیاسی ترقی کے مخالف تھے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ کسی کو ہندوستان بھیجا جائے کہ وہ وہاں جا کر اس اسکیم کے بارے میں ہندوستانی سیاسی لیڈروں سے بحث ومباحثہ کرے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس حد تک ان تجویزوں کو منظور کرتے ہیں۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہوگا کہ کچھ اور وقت مل جائے گا۔ اس لیے کہ اس اعلان کے کئے جانے اور جنگ کے بعد اس پر عمل درآمد ہونے میں لمبا عرصہ لگے گا۔

جب یہ تبدیلی کی گئی تو وائسرائے سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ ایمرے نے لن لتھ گو کو بتایا کہ اس فیصلے میں جلدی کیوں کی گئی: ''ونسٹن چرچل پر باہر سے دباؤ یعنی روز ویلٹ کی طرف سے، ایٹلی اینڈ کمپنی پر ان کی پارٹی کی طرف سے دباؤ'' اس کے ساتھ کرپس کے جنگی کابینہ میں داخلے نے دفعتاً باندھ کے دروازے کھول دئے اور یہ ساری کارروائی بڑی تیزی سے عمل میں آئی۔

اسکیم میں جلدی تبدیلی کے نتیجے بڑے سنگین تھے اور اس نے مشن کی تقدیر پر بھی اثر ڈالا۔ مثلاً کابینہ نے نہ تو اس مشن کے حدود یا دائرہ اختیار کا تعین کیا اور نہ اس کے طریقہ کار کی وضاحت کی۔

نائب وزیر اعظم ایٹلی نے کابینہ کو اپنے 20رفروری کے میمورنڈم میں یہ تجویز کیا کہ ہندوستانی مسئلے کے حل کی تازہ کوشش کی جائے اور اس کے لیے لائحہ عمل یا طریقہ کار بھی تجویز کیا جائے کہ کسی نمایاں یا معروف حیثیت والے شخص کو جو یا تو پہلے سے ہندوستان میں ہو یا یہاں سے ہندوستان سمجھوتہ کرنے کے لیے بھیجا جائے۔

جنگی کابینہ کی انڈیا کمیٹی کی طرف سے کرپس کو جو ہدایتیں دی گئی تھیں وہ حسب ذیل ہیں:

'' آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ گورنمنٹ کی پالیسی کے اعلان کے پیراگراف (ای) کے مطابق ہندوستانی رائے عامہ کے اہم عناصر سے گفت وشنید کریں اور ان کی فوری منظوری کسی اسکیم کے لیے حاصل کریں جس کے ذریعہ وہ مشاورتی یا صلاح کارانہ حیثیت سے ملک کے مسئلوں میں حصہ لے سکیں۔ اگر آپ ضروری اور مناسب سمجھیں تو آپ انھیں ایکزیکیٹو ممبری کی پیش کش کر سکتے ہیں بشرطیکہ موجودہ سنگین اور بحرانی دور میں دفاع اور ملک میں اچھی حکومت کے راستہ میں اس سے کوئی دشواری نہ ہو۔ اس معاملے میں آپ بلاشبہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف سے ضروری مشورہ کریں اور جنگی صورتحال کو سب سے زیادہ اہمیت دیں۔'' بعد میں ان ہدایتوں کی تشریح کرتے ہوئے وزیر ہند نے کہا: '' اگرچہ یہ ضروری ہے کہ سر اسٹیفرڈ کرپس ہدایتوں کے مطابق کام کریں گے مگر یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ ان کی حیثیت ایک گشتی سفیر کی سی ہے۔ میرے خیال میں ان کو دی گئی ہدایتوں پر یہ سخت اعتراض ہے کہ ان کے حوالے دینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مثبت اسکیم کا حصہ ہیں اگرچہ ہمارے نقطۂ نظر

سے وہ اس کے بہت قریب ہیں۔"

11 / مارچ کو وزیر اعظم نے دارالعوام میں کرپس کے مشن کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے۔ وہ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے اس کی کوشش کریں گے کہ وہ صرف ہندو اکثریت بلکہ عظیم اور اہم اقلیتوں کی جس میں مسلمان سب سے زیادہ اہم ہیں کی منظوری حاصل کریں۔ کرپس کے سوانح نگار کالن کک کے نزدیک وہ پورے اختیار رکھنے والے سفیر کی حیثیت سے گفت وشنید کے ذریعہ سمجھوتے کی شرطیں طے کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ وہ برطانیہ کی کابینہ کے رکن کی حیثیت سے پالیسی کی شرطوں کی جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی تشریح اور وضاحت کے لیے بھیجے گئے تھے۔

بہ ظاہر کرپس پر یہ واضح نہ تھا کہ وہ اس اختیار کے ساتھ گفت وشنید کرنے گئے تھے کہ وہ کابینہ کی تجویزوں میں کچھ ردوبدل کر سکتے ہیں یا وہ محض اس لیے بھیجے گئے تھے کہ وہ ہندوستانی لیڈروں کو، اس اعلان کو جس کا متن بے لچک تھا اور جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی، منظور کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ مثلاً کانگریسی لیڈروں سے گفتگو کے دوران انھوں نے ان حدود سے تجاوز کیا جو متن اور ہدایتوں میں مقرر کی گئی تھیں۔ ایگزیکیٹو کونسل کی تشکیل یا اس کے اختیارات اور محکمہ دفاع کے بارے میں ان کی وضاحت اس کی مثالیں ہیں۔ کرپس اور وائسرائے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مابین تعلقات کی تشریح بھی نہیں کی گئی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے اور دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھیں گے۔ اس کے برعکس دراصل وائسرائے کو یہ شکایت تھی کہ کرپس ان سے مشورہ نہیں کرتے تھے گو وہ عام طور سے انھیں باخبر رکھتے تھے۔ ان کی ایگزیکیٹو کونسل کو بھی کرپس نے گفت وشنید کے دوران کوئی جگہ نہ دی اور ان کو بھی کرپس کی کج خلقی کی شکایت تھی۔

ابتدائی مرحلے میں کرپس نے وائسرائے کے انگلستان واپس بلائے جانے کی تجویز پیش کی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وائسرائے اور لارڈ پریوی سیل میں تعاون یا ایک دوسرے کے نظریہ کو سمجھنے کا قطعاً فقدان تھا۔ دونوں ہی مختلف اغراض و مقاصد کے لیے سرگرم عمل تھے۔ ایک کا مقصد تھا کہ وہ حکومت خود اختیاری والے ہندوستان کی دستور سازی کے کام میں شرکت کرے اور دوسرا آزاد اور متحد ہندوستان پر ذرہ برابر بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ انھوں نے اطمینان کی سانس لی جب کرپس ہندوستان سے ناکام واپس چلے گئے۔

11/اپریل کو مشن کے خاتمہ پر لن لتھ گو نے اس کی شکایت کی کہ انھیں ایگزیکیٹو کونسل کی تشکیل نو کے بارے میں بالکل بے خبر رکھا گیا۔ اس کے بعد ایمرے کی مراسلت کے حاشیہ پر انھوں نے یہ لکھا کہ ''میں کیا کرسکتا تھا جب کرپس نے کسی بارے میں مجھ سے مشورہ نہیں کیا'' انھوں نے یہ نوٹ کیا کہ '' کرپس نے خود کو ایگزیکیٹو کونسل کے سب ہی ہندوستانی ممبروں بہ استثناء وزیر دفاع کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا انھوں نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا اور جس وقت انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ یہ کہہ چکے ہیں تو میں نے اس پر احتجاج کیا۔ جب میں نے انھیں اس پر آڑے ہاتھوں لیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ کابینہ نے مجھے اس کی اجازت دی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو کونسل سو فیصدی ہندستانی کردی جائے۔ اس سے بہت پہلے کرپس نے ہڈسن کو دہلی میں بتایا تھا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کابینہ نے یہ عزم مصمم کرلیا ہے کہ ہندوستان کو ہر طرح سے اصل درجہ نو آبادیات اور مکمل آزادی سوائے دفاع کے حاصل ہونی چاہیئے۔''

25/اپریل کو لن لتھ گو نے ایمرے سے دوبارہ اس کی شکایت کی کہ اگرچہ انھوں نے مجھ سے عام رابطہ قائم رکھا تھا لیکن وہ مجھ سے مشورہ بالکل نہیں کرتے تھے۔ بات

دراصل یہ تھی لن لتھ گو کا شروع ہی سے یہ یقین تھا کرپس مشن کامیاب نہیں ہوگا۔ انھوں نے 14 رمارچ کو ہی ریفارم کمشنر ہڈسن کو یہ بتلا دیا تھا کہ ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ کرپس ملک معظم کی حکومت کی پالیسی کو چلانے میں ناکام رہیں گے۔ ان کے خیال میں کرپس سڑی گلی مچھلی تھی۔ کرپس اور لن لتھ گو میں اختلافات کا اثر کیبنٹ کے فیصلوں پر بھی پڑا۔ چرچل اور ایمرے کو لن لتھ گو کی رائے پر پورا بھروسہ تھا جبکہ ایٹلی کی رائے لن لتھ گو کے بارے میں بالکل ہی مخالف تھی۔ ایٹلی کو لن لتھ گو پر مطلق اعتماد نہ تھا اور وہ بڑے سخت لفظوں میں ان کی رائے کی مذمت کرتے تھے۔

ایمرے نے کرپس کی ان کے ہندوستان بھیجے جانے کی جو وجہیں بیان کیں وہ عجیب وغریب تھیں اور ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں کا جو ہندوستان کی سنگین صورتحال سے نپٹ رہے تھے کا دماغ کس طرح کام کر رہا تھا۔ ایمرے نے لن لتھ گو کو لکھا کہ کرپس کا کیوں انتخاب کیا گیا تھا اور خود ان کا یعنی وزیر ہند کا کیوں نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام توقع تھی لن لتھ گو نے اس کی وضاحت میں بتایا کہ مستقبل میں اس کا مقصد انتظامیہ کو ہندوستانیوں کے کنٹرول میں دینے سے فوری انکار کرنا تھا جو کنزرویٹیو پارٹی کی مسلمہ پالیسی تھی۔ انتہا پسند یا بائیں بازو والے نہرو اور کانگریس سے گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ ایک اہم مسئلے یعنی فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں کرپس کو کنزرویٹیو پارٹی سے اتفاق تھا۔ انھوں نے پہلی بار ہندوستان آنے پر دسمبر 39ء میں اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی۔

مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں سے گفتگو کے بعد انھوں نے جب رائے ظاہر کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی حد تک علیحدگی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ وہ اچھوتوں اور ہندوؤں اور ہندوستانی ریاستوں کے عام مسئلوں پر جو سیاسی ترقی کے راستے میں حائل تھے، سے خاصے متاثر تھے۔

3- تجویز کا متن

25/مارچ 1942ء کو کرپس ہندوستان پہونچے اور اپنے ساتھ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے حکومت کی ڈرافٹ اسکیم لے کر آئے۔ اس کے ابتدائیہ میں کہا گیا کہ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک نئ انڈین یونین قائم کی جائے جو ایک نوآبادی ہوگی یا جسے نوآبادیات کا درجہ حاصل ہوگا اور جس کا تعلق تاج برطانیہ کی وفاداری کی وجہ سے یو۔ کے (U.K) کی اور دوسری نوآبادیات بھی سے ہوگا اور ہر لحاظ سے وہ ان کے بالکل مساوی ہوگی اور وہ اندرونی اور خارجی معاملات کے لیے بھی ان کی ماتحتی میں نہ ہوگی۔

اس اسکیم کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں اس نوآبادی کے دستور کے مرتب کرنے کے بارے میں یا طریقہ کار کے بارے میں بیان تھا۔ اس باب میں پہلا قدم یہ تھا کہ ساری صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کے لیے الیکشن کرائے جائیں۔ اس سلسلہ میں دوسرا قدم یہ تھا کہ صوبہ جاتی مجالس قانون ساز ایوان زیریں یعنی اسمبلیوں کے ممبر ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کے ساتھ مل کر ایک انتخابی کالج کی شکل اختیار کریں اور اس کالج کا مقصد دستور بنانے، دستور مرتب کرنے والی جماعت کا منتخب کرنا تھا۔ اس کی تعداد کے بارے میں یہاں کہا گیا کہ یہ انتخابی کالج کے 1/10 ممبروں پر ہوگی اور ان ممبروں کا انتخاب تناسبی طریقہ انتخاب کے مطابق ہوگا۔

تیسرا قدم یہ تھا کہ دستور ساز جماعت انڈین یونین کا دستور بنائے گی لیکن اگر آخری مرحلے میں کسی صوبے کی مجلس قانون ساز اپنے ووٹ سے اس دستور کو منظور کرنے سے انکار کرے یعنی اس دستور کو منظور نہ کرے تو اسے انڈین یونین سے الگ ہونے کا حق ہوگا اور پھر وہ اپنا دستور خود بنائے گی اور اسے وہی درجہ حاصل ہوگا جو انڈین یونین کو حاصل ہوں گے۔

یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ملک معظم کی حکومت ایسے دستور یا دستوروں کو جو مرتب کیے جائیں گے منظور کرے گی اور اس نو آبادی کو برطانوی شہنشاہیت سے الگ ہونے کا حق حاصل ہوگا۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ملک معظم کی حکومت اور دستور ساز جماعت کے درمیان ایک معاہدہ ہوگا جس کے دستور میں اقلیتوں کے لیے تحفظات رکھے جائیں گے۔

کسی صوبے کے اس حق حکومت کے بارے میں کہ وہ انڈین یونین سے علیحدہ ہوسکتا ہے اس شق کو لن لتھ گو اور ویول (Wavell) اسکیم میں رکھنے کے خلاف تھے۔ لیکن جنگی کابینہ اس پر اڑی رہی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا یہی حل ہے کہ صوبوں یا صوبے کو علیحدہ ہونے کا حق دیا جائے۔

اسکیم کے دوسرے حصے کا تعلق جنگ کے دوران عارضی یا فوری طور پر انتظامات کے بارے میں تھا۔

اس نے نہ تو 1935ء کے ایکٹ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کی اور نہ ہندوستان کی حکومت کے بارے میں ملک معظم کی حکومت میں ذمہ داریوں اور ہندوستان کے دفاع کو کنٹرول کرنے کے بارے میں کوئی ہدایت دی لیکن اسے تسلیم کیا کہ ہندوستان کے جنگی، اخلاقی اور مادی وسائل کو ہندوستان کے لوگوں کی پوری رضامندی کے ساتھ استعمال کرنا حکومت ہند کی ذمہ داریوں میں ہے اس لیے اس نے ہندوستانی لیڈروں سے ممالک دولت مشترکہ اور متحدہ اقوام کی سرگرم مدد کرنے پر زور دیا اور اس غرض سے انھیں مدعو کیا۔

دہلی آتے ہی کرپس نے اپنے مشن کا کام انجام دینا شروع کر دیا۔ گفت و شنید کے پہلے مرحلے میں اسکیم کے دونوں حصوں کے کمزور یا ناقص پہلوؤں پر گاندھی جی نے جوان سے 27/ مارچ کو ملے، بالکل صاف طور پر دوٹوک انداز میں انھیں بتادیا

کہ اگر ان کی پیشکش وہی تھی جس کا اعلان میں ذکر کیا گیا تھا تو انھیں پہلی پرواز سے انگلستان چلا جانا چاہیے۔

4- تجویز پر کانگریس کے اعتراضات

اہم سیاسی جماعتوں میں کانگریس اور مسلم لیگ تھیں جن میں مسلم لیگ اس اسکیم سے مطمئن نظر آتی تھی۔ اس کے مقابلے کانگریس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے مکمل آزادی کے مطالبے کو نہ تو فوری طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور نہ اسے دینے کا آئندہ وعدہ کیا گیا۔ اس اسکیم پر اس کے خاص اعتراضات یہ تھے:

(1) تجویز کے اس جزو پر جس کی رو سے صوبوں کو علیحدگی کا حق دیا گیا اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ پاکستان کو تسلیم کر لیا گیا۔

(2) ریاستوں کے نمائندوں کو والیان ریاست کو نامزد کرنے کا اختیار۔ اسکیم کے دوسرے حصے کے بارے میں ایگزیکیٹو کونسل کی حیثیت اور ڈیفنس منسٹر کی پوزیشن کے مسئلے خاص طور سے زیر بحث آئے۔

کرپس نے 24/ مارچ کو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کی میٹنگ میں یہ بتایا کہ ملک معظم کی حکومت دفاع کو اپنے کنٹرول میں رکھے گی لیکن اس میں دوسرے ممبروں کی کس حد تک شرکت ہو یہ وائسرائے کی مرضی پر منحصر ہے۔

29/ مارچ کو پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ دستور کو نہیں تبدیل کر سکتے۔ آپ دستور کی روایتوں اور کنونشنوں کو بدل سکتے ہیں اور آپ ایگزیکیٹو کونسل کو کابینہ کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

اس بیان سے لن لتھ گو ناراض ہوئے۔ انھوں نے کرپس کی تیار کی ہوئی ممبروں کی فہرست دیکھی تھی اور اس میں انھوں نے سوائے وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے

دوسرے سارے ممبروں کو ہندوستانی پایا تھا۔ اس پر ان کا دوٹوک یا صاف ردعمل یہ تھا کہ یہ میرا کام تھا لیکن کرپس نے مجھے بندھے جال میں ڈال دیا۔

کرپس کے ساتھ بات چیت کے دوران ان کے بیانات سے کانگریسی لیڈروں نے یہ رائے قائم کی کہ برطانوی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کو جس کے سارے ممبر ڈیفنس کے علاوہ ہندوستانی ہوں، کو قومی حکومت کی شکل دی جائے اور وائسرائے کو وہی حیثیت حاصل ہو جو بادشاہ کو برطانیہ میں حاصل ہے۔ 25/مارچ کو کرپس سے اپنی ملاقات کے دوران اپنی گفتگو کے بعد مولانا آزاد نے کہا کہ تجویز کا خاص مقصد یہ ہے کہ موجودہ ایگزیکیٹو کونسل بھی برٹش ممبروں کی اکثریت کے بجائے ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ہوگی۔

'' میں نے کرپس سے یہ سوال کیا کہ اس کونسل میں وائسرائے کی پوزیشن کیا ہوگی۔ سر اسٹیفرڈ نے جواب دیا U.K یا متحدہ سلطنت کے بادشاہ کی مانند وائسرائے بھی دستوری سربراہ ہوں گے۔ اس بارے میں شک وشبہ دور کرنے کے لیے میں نے ان سے پوچھا کہ آیا وائسرائے دستوری سربراہ کی حیثیت سے اس کونسل کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ مسٹر اسٹیفرڈ نے دوہرایا کہ اختیارات دراصل کونسل کے ہاتھ میں ہیں۔''

ایمرے کے نام لن لتھ گو کے خط سے مولانا آزاد کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ کرپس کی خاص کاوش اور کوشش یہی ہے کہ کسی طرح کانگریس کے ان کے وعدوں کو مان لے اور وہ اس کی تائید حاصل کریں تاکہ دوسری پارٹیوں کی تائید بھی حاصل ہو جائے۔ ان مذاکرات میں بعض خطرناک چیزیں معرض بحث رہیں اور میرے اس خیال کی تائید اور تصدیق ابوالکلام آزاد کے کرپس کے نام 11/اپریل کے اس خط سے ہوتی ہے کہ کانگریس نے کھل کر قومی حکومت کے بارے میں بات کی

جس کے سربراہ وائسرائے ہوں گے اور جن کی وہی پوزیشن ہوگی جو برطانیہ میں بادشاہ کی ہے اور اس کی کرپس نے کوئی تردید نہیں کی۔ آزاد نے کرپس کے نام 11/ اپریل کے خط میں زور دیا کہ آپ نے پچھلی میٹنگ میں مجھے بتایا تھا کہ ایگزیکٹیو کونسل قومی حکومت ہوگی جو کابینہ کی طرح کام کرے گی اور وائسرائے کی وہی پوزیشن ہوگی جو انگلستان میں بادشاہ کی ہوتی ہے۔

فوری طور پر قومی حکومت کے قیام کا سوال آئندہ دستور پر چھایا جا رہا ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ریزولوشن میں اس کی تصدیق اور توثیق کی ہے۔

ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی تجویز پوری چھان بین اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ آج کی موجودہ بڑی ہی تشویشناک پوزیشن کے پیش نظر موجودہ صورت حال زدہ اہم ہے۔ مستقبل کے بارے میں تجویزیں بھی جس حد تک ان کا تعلق حال یا موجودہ سے ہے اہم ہیں۔ اس لیے کمیٹی اس سوال کے اس پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے اور اس وجہ سے وہ لوگوں کو مشورہ دیتی ہے جو اس کے بارے میں اس کے مشورہ کے طالب ہوں۔

کانگریس کے صدر نے یہ رائے ظاہر کی:

''میں نے کرپس کے اس بنیادی اصول پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ آزادی، جنگ کے بعد تسلیم کی جائے تاہم میں نے محسوس کیا کہ جب تک اصل اقتدار اور ذمہ داری جنگ کے دوران کونسل کو نہیں دی جاتی تبدیلی کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ قومی حکومت کے قیام کا مسئلہ بہت ہی زیادہ اہم اور ضروری تھا لیکن جنگ کے دوران ڈیفنس کا محکمہ انتظامی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ یہ تمام محکموں پر پوری فوقیت رکھتا تھا۔ کانگریس لیڈروں کی قدرتاً خواہش تھی کہ ہندوستان جنگ جیتنے میں اور حملہ آوروں کو شکست دینے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ ان کے نزدیک یہ

ضروری تھا کہ ہندوستانی عوام یہ محسوس کریں کہ عوامی جنگ ہے اور ان میں یہ جذبہ تب ہی پیدا ہوسکتا تھا کہ ملک کا دفاع ہندوستان کے ہاتھ میں ہو۔''

کانگریس نے مستقبل کے مسئلے کو معرض التوا میں رکھ کر اور قومی حکومت کے قیام کے بارے میں اطمینان بخش یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ صرف ایک اہم مسئلہ جس کا تعلق ڈیفنس ممبر کے عہدے سے ہے، ردوبدل یا ہم آہنگی کا محتاج ہے۔

5- دفاعی ممبری کا مسئلہ

دفاعی ممبری یعنی ایگزیکیٹو کونسل ڈیفنس ممبری کے مسئلے نے دو وجہوں سے غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ جنگ کے بعد طویل المیعاد اسکیم یعنی مستقبل کو ساری سیاسی پارٹیوں نے نظر انداز کیا گو مسلم لیگ نے اس کی پوری تائید کی تھی۔ اگر اسکیم کا عارضی حصہ یا مختصر المیعاد حصہ ان کے نقطۂ نظر سے اطمینان بخش طریقہ سے طے ہو جاتا تو سب پارٹیاں کرپس کی پیشکش کے اس حصے کو منظور کر لیتیں اور مستقبل یا آئندہ کی اسکیم کے بارے میں کسی قسم کا وعدہ کیے بغیر جنگ کے بعد طویل المیعاد اسکیم کو عملی جامہ پہنانے یا اس پر عمل درآمد ہونے کی گارنٹی ہو جاتی۔ اگر قومی حکومت فوری طور سے قائم نہیں ہوتی تو مستقبل یا آئندہ کے لیے دعووں پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری وجہ یہ تھی جنگ کے دوران قومی دفاع کا دائرہ کار یا دائرہ اختیار بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ یہ قومی سرگرمی پر پوری طرح نہ صرف اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اسے اپنی ماتحتی میں لے لیتا ہے۔ اس لیے دفاع کے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں نہ آنے سے دوسرے تمام محکموں کا دائرہ اختیار بالکل ختم سا ہو جاتا ہے اور ان کے

چلانے کے لیے انتظام بری طرح متاثر ہوتے ہیں ۔ اس لیے کانگریس حکومت سارے وسیع میدان پر کنٹرول چاہتی تھی۔ اس باب میں وہ بڑے محدود اور کمزور اختیارات سے مطمئن نہ تھی۔

لیکن دفاع کے مسئلے پر کانگریس نے غیر مصالحانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔راجہ جی یعنی مسٹر راج گوپال آچاریہ نے تجویز کیا کہ رسمی طور پر اس محکمے کو ہندوستانی ممبر کو دیا جائے لیکن جنگ کے دوران دفاع کی ذمہ داری ملک معظم کی حکومت کی ہے۔ہم نے بھی اسے مانا کہ عملاً جنگی حکمت عملی اور جنگی چالوں کے مطابق فوجوں کی نقل وحرکت کمانڈر انچیف اور جنگی کابینہ کے مؤثر کنٹرول میں رہنا چاہئے۔لیکن انھوں نے اس کے ساتھ اس پر بھی زیادہ زور دیا کہ بہت سے دفاعی امور کا انتظام وانصرام ہندوستانی ہاتھوں میں دینا چاہئے۔

کرپس جنھوں نے مولانا آزاد کو پہلی ملاقات میں بتلایا تھا کہ دفاع کا موضوع کابینہ کے اعلان یا پیشکش پر غور وخوض میں خارج از بحث ہے، بعد میں کانگریس لیڈروں سے گفتگو کے دوران اس مسئلے پر بہت زیادہ زور دیا۔کرپس نے 29/ مارچ اور یکم اپریل کو چرچل کو دو تار بھیجے جس میں ہندوستانی صورتحال کا مایوس کن نقشہ ان لفظوں میں پیش کیا گیا:"میں نے آپ کے سامنے صورت حال کی یہ تصویر پیش کی ہے تاکہ دفاعی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کے بارے میں آپ فیصلہ کرسکیں کہ اس پر ہندوستان کے لیڈروں کو کنٹرول کرنے اور پوری طرح ہندوستانی عوام کی قیادت کرنے کے دوران کسی طرح کی ہمت افزائی کرنے دیں گے یعنی کیا ہندوستانی عوام کا پورا تعاون حاصل کرنے دیں گے ۔موجودہ حالات میں کوئی برطانوی یہ کام نہیں کرسکتا۔"

اس تجویز کا مطلب یہ تھا کہ کسی ہندوستانی کا تقرر کیا جائے جو دفاعی معاملات

دیکھے بغیر کمانڈر انچیف کے اختیارات سے کسی قسم کے تصادم یا ٹکراؤ کے بغیر، اس کے ذمہ کچھ دفاعی امور کئے جائیں۔ لن لتھ گو کو کرپس کے ہندوستانی صورتحال کے جائزے یا اندازے سے اتفاق نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت سے اور نہ اغراض ومقاصد سے کہ جس کے تحت کرپس دفاع کو ہندستانیوں سے متعلق کرنا چاہتے تھے۔ کرپس نے اپنے خیالات سے کابینہ کو بحری تار سے مطلع کیا اور اس کی اجازت چاہی کہ وزیر اعظم اس بارے میں بالکل الگ ہوکر کرپس سے مراسلت کریں۔ انھیں اس کی اجازت دے دی گئی اور اس طرح سے کابینہ کے سفیر کے اثر کو زبردست نقصان پہونچا۔ اب یہ ہوا کہ کرپس کی اس استدعا کو کہ کمانڈر انچیف اور وائسرائے کی رضامندی کے بغیر اگر کچھ ردوبدل ہوتا ہے تو کیا ایسا کرنے کا آپ انھیں اختیار دیتے ہیں، کابینہ نے فوری طور پر ٹھکرادیا۔

چرچل نے کرپس کو مطلع کیا کہ میں آپ اختیار نہیں دے سکتا کہ آپ ڈیفنس کے مسئلے پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ بغیر کابینہ اور وزیروں کو ہمنوا بنائے بغیر کریں۔ باوجود اس ناکامی کے کرپس نے پھر تازہ کوشش کی۔

4/اپریل کو انھوں نے ہندوستانی ڈیفنس ممبر کو دفاعی فرائض دئے جانے کے بارے میں تین فارمولے پیش کئے۔ لن لتھ گو نے اپنی ترجیح ایک تجویز میں ظاہر کی جو کرپس کی تجویز کیے ہوئے فارمولے سے بالکل مختلف تھی اور انھوں نے کابینہ کو مشورہ دیا کہ وہ قومی حکومت کے قیام کے مسئلے کے بارے میں کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔

6/اپریل کو کابینہ نے کرپس کی سفارشوں کو نامنظور کردیا اور لن لتھ گو کی تجویز کو منظور کرکے کابینہ نے کرپس کو مطلع کیا کہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت دئے ہوئے اختیارات ترک یا ختم نہیں کئے جاسکتے۔ یہ پہلی روک یا پابندی تھی جو کرپس پر ان کی گفت وشنید کے دوران لگائی گئی مگر اس سے مشن کے سربراہ اور ہندوستان کے سربراہ

کے درمیان تعلقات ذرہ برابر بھی بہتر نہ ہوئے۔

7/اپریل کو اس فارمولے کو جسے کابینہ نے منظور کیا تھا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جس کے جلسے کرپس کے دہلی میں قیام کے دوران ہورہے تھے نامنظور کر دیا۔ مذاکرات کے اس مرحلہ پر ایک اور زبردست عامل کا اضافہ ہوا۔ کرنل لوئی جانسن، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور انھوں نے ہندوستان کی صورتحال پر گہری نظر رکھی۔ کرپس نے ان کی دہلی میں موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں ڈیفنس کی ممبری کے مسئلے کو حل کرنے میں ان سے مدد کرنے کو کہا۔

جانسن نے ایک نیا فارمولہ تجویز کیا جس میں کرپس نے کچھ معمولی تبدیلیاں کیں۔ اس فارمولے کے مطابق ہندوستانی ممبر کو ڈیفنس انچارج ہونا تھا لیکن وہ اپنے اختیارات کمانڈ انچیف کو جو ایگزیکیٹو کونسل کی مجلس جنگ کا ممبر تھا، تفویض کردے کہ کمانڈ انچیف کو جنگی نقل وحرکت اور فوجوں کی نقل وحرکت پر پورا کنٹرول حاصل رہے۔ اور وہ ممبر جنرل ہیڈ کوارٹر اور بحری وفضائی ہیڈ کواٹرز کا پورے طور سے ذمہ دار اور بعض امور ڈیفنس کے رابطے یا تال میل کا انچارج ہوتا اور ملک معظم کی حکومت اس بارے میں فیصلہ کرتی کہ کوئی نیا کام کون کرے گا اور وہ اختلاف کو طے کرتی کہ فلاں معاملہ کس کے دائرہ اختیار میں ہوگا۔

اس فارمولے کو مسترد کیا گیا اور اس میں ترمیمیں تجویز کی گئیں۔ لیکن وائسرائے نے اس کی آخری شکل نہیں دیکھی اور انھوں نے اس کے لیے کئی قسم کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا۔ چرچل نے کرپس کو اشارہ دیا کہ وہ اس کی گورنمنٹ کی طرف سے منظوری نہ دیں۔

9/اپریل کو جنگی کابینہ نے اس فارمولے کے بارے میں اپنی رائے سے کرپس

کو مطلع کیا کہ ''یہ ضروری ہے کہ سارے معاملہ کو کابینہ کی اسکیم کے مطابق عمل میں لایا جائے اور اس میں صرف وہی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں جن سے ہمیں اتفاق ہو۔'' جنگی کابینہ نے لفظ قومی حکومت کے استعمال پر بھی اعتراض کیا۔

6- کرپس اپنے اقدامات واپس لیتے ہیں

اس تار سے یہ واضح ہو گیا کہ جنگی کابینہ نے کرپس کی تجویزوں سے اتفاق نہیں کیا۔ وائسرائے نے بھی انھیں بتایا کہ ایگزیکیٹو کونسل کے بارے میں وہ اپنی دستوری ذمہ داریوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ بھی صاف ہو گیا کہ قومی حکومت کے فوری قیام کے بارے میں انھوں نے بھی کرپس سے جو توقعات پیدا کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور نہ ڈیفنس کے لیے فارمولۂ کرپس، جانسن فارمولہ میں بدلے جانے کے بعد فارمولہ سے بہت زیادہ بدلا جا چکا تھا اور جواب اصل فارمولے سے بہت زیادہ مختلف تھا، کانگریس اسے پہلے ہی مسترد کر چکی تھی۔

انھیں اپنے اقدامات واپس لینے پڑے اور 9/اپریل کو کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کے دوران انھوں نے انھیں اس پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ اہل اسکیم نے کانگریس کے مطالبے کو تمام وکمال مان لیا ہے۔ انھوں نے اس اسکیم کو منظور کرنے کے لیے کہا کیونکہ ایسا نہ کرنے میں صورت میں جنگ کے بعد بھی دستوری ترقی رک جائے گی۔

7/اپریل کو وہ جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کے آخری جواب کا انتظار کر رہے تھے، انھوں نے اس کی آخری کوشش کی کہ ڈیفنس کے بارے میں جنگی کابینہ کی منظوری حاصل کرلیں۔ انھوں نے بذریعہ تار چرچل کو ایگزیکیٹو کونسل کے جنگ کے ممبر کے

فرائض کی فہرست روانہ کی اور اس یقین دہانی سے کہ قانون اور دستوری پوزیشن نہیں بدلی جائے گی۔لیکن انھوں نے نوتشکیل شدہ ایگزیکیٹو کونسل کو قومی حکومت کا نام دیا۔ اسی دن یعنی 10 اپریل کو وائسرائے نے جو اس کے شدید مخالف تھے کہ ایگزیکیٹو کونسل کو قومی حکومت میں بدلا جائے، وزیر ہند کو تار دیا کہ اس تنازعے کے بارے میں وہ ملک معظم کی حکومت کی رائے سے مطلع کریں یعنی یا تو گورنر جنرل کو نویں شیڈول کی 21 ویں شق کے تحت اپنے رفقاء کار سے اختلاف کرنے کا حق حاصل رہنا چاہئے یا اسے اس کا وعدہ کرنا چاہئے کہ کسی حال میں بھی وہ ان کے مشورہ کے خلاف کام نہیں کریں گے یعنی ان کے مشورہ کو پوری طرح عمل میں لائیں گے۔

اسی تاریخ یعنی 10 اپریل کو لن لتھ گو نے دوسرے تار میں اس کی شکایت کی کہ ڈیفنس کے بارے میں کرپس جانسن کے فارمولے کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پاس بغیر ان کے اور کمانڈر انچیف کے جواب کے یعنی ان دونوں کو دکھائے بغیر بھیجا گیا۔ ان کا خاص اعتراض یہ تھا کہ ڈیفنس ممبر جنگ کے فرائض اور اختیارات کے بارے میں اس فارمولے نے اسے وائسرائے کے دائرہ اختیار سے نکال کر ملک معظم کی حکومت کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ دے دیا تھا۔

جنگی کابینہ کی ہندوستانی کمیٹی کی میٹنگ چرچل کی صدارت میں لن لتھ گو کے تاروں پر غور کرنے کے لیے مقرر ہوئی۔ کمیٹی کا یہ تاثر تھا کہ لارڈ پریوی سیل یعنی کرپس نے کانگریسی لیڈروں کو مطلع کیا تھا کہ قومی حکومت کے قیام کے مسئلہ کو دستور میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے بغیر طے کیا جائے گا۔ لارڈ پریوی سیل نے یہ فرض کرلیا تھا کہ کنونشن کے ذریعہ مسئلہ کو حل کردیں گے یعنی کہ وائسرائے صرف دستوری سربراہ ہوں گے۔

جنگی کابینہ نے وائسرائے کی موافقت میں فیصلہ کیا اور کرپس کی رائے یا تجویز کو

مسترد کردیا اور اس فیصلہ سے بذریعہ بحری تار کرپس اور لن لتھ گو کو مطلع کیا گیا کہ کسی بھی کنونشن یا روایات کا سوال نہیں پیدا ہوتا جو وائسرائے کے موجودہ دستور کے تحت اختیارات کو کسی طرح محدود کرے اور جنگ کے دوران ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کرپس کو جنگی کابینہ کے اس رویہ پر شدید غصہ آیا اور انھوں نے فوراً تشریحی پیغام بھیجا اور اپنی ناراضگی کا اظہار اور مستعفی ہونے پر آمادگی ان لفظوں میں ظاہر کی: ''مجھے اس کا بہت زیادہ رنج ہے کہ میرے رفقاء کار اس مسئلہ پر مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں اور اس لیے اس مسئلے سے میں دست کش ہونے پر تیار ہوں۔ اور وہ کسی دوسرے شخص کو گفت وشنید کے لیے بھیجیں۔''

چرچل نے جواب دیا کہ ان پر اعتماد نہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن کابینہ نے قطعی طور سے اس تجویز کو رد کردیا کہ وائسرائے کے اختیارات میں کسی قسم کی تجویز یا کمی کی جائے۔ کابینہ کے کرپس کی تائید نہ کرنے کے فیصلے سے انھیں یعنی کرپس کو اپنی اور سب کی ذلت کا زبردست احساس ہوا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان کے ہندوستان میں ٹھہرنے سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے گا۔ اس لیے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔

اگرچہ ان کا مشن کو ختم کردینے کا فیصلہ کابینہ کے احکام یا فیصلے کے خلاف ردعمل تھا۔ انھوں نے اپنے کو اس بری الذمہ قرار دینے کے لیے کہا کہ مشن کو اس لیے ناکامی ہوئی کہ ان کی طرف سے یا ان کی حکومت کی طرف سے کسی قسم کی چوک ہوئی تھی۔ یہ عذر جو کرپس کی قلب ماہیت کا باعث ہوا، وہ انھیں اس خط سے ہاتھ آیا۔ مولانا آزاد نے ان کے پاس کانگریس ورکنگ کمیٹی ریزولوشن بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ '' اس ریزولوشن میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس مسئلے پر غور کیا اور یہ ریزولوشن پاس کیا جس میں ان کی پیشکش کو نامنظور کیا۔'' اس ریزولوشن نے اس کی تشریح کی کہ باوجود

موجودہ صورتحال کی سنگینی کے مستقبل کی اسکیم پر زبردست اعتراضات کے باوجود اپنی توجہ موجودہ پر صرف کی خاص کر ایگزیکٹیو کونسل کی پوزیشن اور تشکیل اور خاص طور سے ڈیفنس ممبر کے بارے میں۔ کرپس کے الفاظ نے کئی کو یقین دلایا تھا کہ نئی حکومت کابینہ کی طرح کام کرے گی اور وائسرائے کی حیثیت دستوری سربراہ کی ہوگی لیکن بعد میں ان سے گفتگو سے اندازہ ہوا کہ کرپس اپنی یقین دہانیوں سے پیچھے ہٹ گئے ہیں اور اس حکومت کا نقشہ پرانی حکومت سے مختلف نہ تھا یعنی کہ حکومت بالکل وائسرائے کی موجودہ ایگزیکٹیو کانسل کی طرح ہوگی۔

کانگریس نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ ہند میں قانون اور دستور میں تبدیلی ہو بلکہ کنونشن کی یقین دہانیوں سے اس پر بھی اتفاق ہوگیا تھا کہ جنگ اور اس سے متعلق سرگرمیوں میں کمانڈر انچیف کو پورا اختیار حاصل ہوگا اور وہ جنگ کے ممبر کی حیثیت سے کام کریں گے لیکن اس باب میں کرپس کی طرف سے مبہم یا کھلا وعدہ نہیں کیا گیا تھا کہ روایتیں وائسرائے اور نئی حکومت کے مابین قائم ہوں گی۔ ان حالات میں ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس کے سوا دوسرا چارہ کار نہیں تھا کہ وہ تجویز کے اس حصے کو نامنظور کردے۔

جہاں تک قانون میں تبدیلی کا تعلق ہے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ جنگ کے دوران کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ فرانس کی شکست سے پہلے فرانس اور انگلستان یونین کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ کمیٹی کو ڈیفنس کے متعلق جو فارمولہ دیا گیا تھا وہ جنگ کے محکمے پر مبنی تھا۔ دونوں محکموں کو جو امور تفویض تھے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل فارمولے اور نئے فارمولے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ کمیٹی نے پرانی فہرست کو منظور نہیں کیا تھا اور اب اس سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسے اس لیے منظور کرے کہ وہ نئے فارمولے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

خاتمہ کلام یہ ہے کہ کمیٹی ان وجہوں کی بنا پر کابینہ کی تجویز کو منظور نہیں کر سکی۔
کابینہ اور برطانوی حکومت کے ان اختلافات کے وجہ سے کرپس مشن ناکام ہو گیا۔

7- گفت وشنید کی ناکامی کی ذمہ داری

اسکیم کی نامنظوری سے متعلق مولانا آزاد کا خط موصول ہونے کے بعد کرپس نے ایک بڑے شاطر اور زیرک وکیل کی طرح دنیا کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ گفت وشنید کی ناکامی کی ذمہ دار کانگریس ہے۔ 10 / اپریل کو مولانا آزاد کے نام خط میں انھوں نے یہ لکھا کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ ایگزیکیٹو کونسل کو کابینی حکومت میں بدلا جائے قطعاً غیر معقول اور غیر منطقی ہے حالانکہ گفت وشنید کے ابتدائی مرحلوں میں انھوں نے اس کا امکان ظاہر کیا تھا کہ ایگزیکیٹو کونسل کو ایک کنونشن کے ذریعہ قومی حکومت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اب انھوں نے یہ کہا کہ اگر اس طریقہ کو موجودہ حالات میں ایک کنونشن کے ذریعہ نافذ کیا گیا تو نامزد کابینہ، اس لیے کہ اس کابینہ کو اہم سیاسی پارٹیاں نامزد کریں گی، سوائے اپنے کسی اور کے روبرو جواب دہ یا ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس لئے اسے ہٹایا نہ جا سکے گا۔ اس طرح سے دراصل خالص اکثریت کی واقعتاً ''ڈکٹیٹرشپ'' قائم ہو جائے گی۔

اس طرح سے اپنی روانگی کے وقت اپنی دوہری نال دار بندوق سے فائر کرنے میں انھوں نے اس مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور چرچل کو دوسرے دن یعنی 12 / اپریل کو اپنی انگلستان واپسی سے مطلع کیا۔

ہندوستان پر اپنا آخری تیر چلانے سے پہلے انھوں نے کانگریس کو زیادہ غیر معقول پارٹی کہہ کر بدنام کیا۔ کانگریس کے موقف کی غلط تشریح کر کے انھوں نے اس کے خلاف اقلیتوں کے شکوک اور شبہات کو زبردست تقویت پہونچائی۔

11 / اپریل کو انھوں نے اپنے نشریے میں سامعین کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش

کی کہ کانگریس ایک خاص عددی یا غیر ذمہ دار اور نہ ہٹائی جا سکنے والی پارٹی کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے جس میں اکثریت اقلیتوں پر اپنی تفوق رکھنا چاہتی تھی۔ انھوں نے یہ شر انگیز بات کہی کہ ملک کی عظیم اقلیت اس نظام کو کبھی بھی قبول نہیں کریگی۔ اس ڈرامے کا آخری باب جو انگلستان میں رچا گیا بڑا ہی دلچسپ تھا۔ صدر روز ویلٹ کو جو ہندوستان کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہے تھے گفت وشنید کی ناکامی سے سخت صدمہ پہونچا۔ اس لیے انھوں نے 12 /اپریل کو ہیری ہاکس کے ذریعہ چرچل کو بحری تار بھیجا اور ان سے کرپس کی ہندوستان سے روانگی کو ملتوی کرنے اور اس اثنا میں دوبارہ کوشش کرنے اور قومی حکومت قائم کرنے کا موقعہ دینے کے لیے کہا تا کہ اس کی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔

چرچل نے اپنے جوابی تار میں انھیں مطلع کیا کہ وہ اس مرحلے پر کوئی فیصلہ کابینہ کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتے اور اس کی میٹنگ 13 ہی کو ہو سکتی ہے۔ اسی اثنا کرپس ہندوستان سے روانہ ہو چکے تھے اور صدر امریکہ کی تجویز پر اس طرح عمل درآمد نہ ہو سکا کہ کرپس سے رابطہ قائم نہ ہو سکا اور اس طرح یہ بیل نہ منڈھ سکی۔

تاہم چرچل نے صدر کو یقین دلایا کہ آپ کو بخوبی علم ہے کہ ہر اس بات کو جو آپ مجھ سے کہتے ہیں کتنی زیادہ اور کس قدر اہمیت دیتا ہوں۔ انھوں نے یہ بلند بانگ وعدہ بھی کیا کہ اگر مجھ میں اور آپ کے تئیں کسی مسئلہ پر شدید اختلاف ہوا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

روز ویلٹ کی مداخلت پر چرچل کے ذاتی تاثرات یہ تھے۔ ''میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ واقعات نے اس پاگل پن کے فعل کو نہ ہونے دیا۔ انسانی نسل بغیر کسی نصب العین کے ترقی نہیں کر سکتی لیکن یہ نصب العین دوسروں کو نقصان پہونچائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور اسے اعلیٰ قسم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

مندرجہ ذیل اقتباسات سے چرچل کے ردعمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

1- جب چرچل نے ہندوستان سے یہ خبر سنی کہ کرپس ناکام ہو گئے تو کہا جاتا ہے کہ وہ خوشی کے مارے کابینہ کی میٹنگ کے کمرے میں ناچنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ غداروں کے ساتھ چاءنوشی نہیں۔ نہ امریکیوں یا برٹش لیبر پارٹی کی جذباتیت سے کسی قسم کا رابطہ۔ صرف ہوش اور جوش پیدا کرنے والے کاموں اور جنگ کے مسائل اور کاموں سے رابطہ۔

2- چرچل نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانوی لیبر پارٹی کو رسمی طور سے خوش کرنے کے لیے یہ تجویز رکھی تھی لیکن یہ پیش کش بالکل بے معنی تھی۔

3- چرچل نے 12 اپریل کو ایک بحری تار بھیجا جس میں یہ کہا گیا تھا جو کچھ ہوا اس پر انھیں ذرہ برابر افسوس نہیں ہوا۔ اس تار کا مضمون یہ تھا کہ نتیجے کے بارے میں نہ تو آپ کو ہمت ہارنی چاہئے اور نہ مایوس ہونا چاہئے۔ بحیثیت مجموعی برطانیہ اور ریاست ہائے امریکہ میں بڑا مفید اثر پڑا۔ اگرچہ آپ کی توقعات پوری نہیں ہوئیں لیکن آپ نے مشترک مفاد کے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔

4- جب چرچل کو دہلی میں گفت وشنید یا مذاکرات کی ناکامی کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے مہمانوں کے سامنے جھوٹے آنسو بہائے اور مصنوعی غم کا اظہار کیا لیکن اپنی خوشی اور مسرت کو نہ چھپا سکے۔

5- ناکامی کی خبر سن کر چرچل کا اپنا ردعمل ان کے لفظوں میں یہ تھا کہ میں اس خبر کو نہ سن سکا جس کے فلسفے کے بارے میں پہلے ہی سوچا تھا۔

جب 12 اپریل کو کرپس ہندوستان سے روانہ ہوئے تو ان کا مشن ختم ہو گیا۔ اس کے نتیجوں کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے آغاز اور اس کے مجوزین کو سلام کیا جائے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے خاص کر امریکن گورنمنٹ کے دباؤ کے تحت یہ مشن

بھیجا گیا تھا۔

چرچل کی حکومت امریکن رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل نہیں کر چاہتی تھی اس نے ہندوستانیوں کو دھوکہ دینے کے لئے دستوری شعبدہ بازیوں کے ساتھ ایک اسکیم تیار کی اور اگر کرپس کانگریس لیڈروں سے اپنی دوستی، اپنی ترغیب آمیز وکالت کی وجہ سے کامیاب ہو جاتے تو یہ ایک اضافی فتح یا کامیابی ہوتی۔

ایمرے، لن لتھ گو اور کرپس کی اس حقیقت پسندی کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان میں سے کسی کو بھی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ ایمرے کو بخوبی علم تھا کہ یہ وہی 18 اگست 1940ء کی پیشکش تھی جسے کانگریس مسترد کر چکی تھی۔ کرپس کو اس کی کامیابی کا چالیس فیصدی یقین تھا۔ کابینہ نے خود اعلان کیا کہ موجودہ اعلانات کا منشاء یہ ہے کہ وہ اپنے عام اعلانات سے یعنی 18 اگست 1940ء کی پیش کش کو منسوخ نہ کرے بلکہ اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرے اور ہندوستان کے لوگوں کو اس پر قائل کرے کہ کابینہ اپنے عزم اور ارادے میں مخلص ہے۔ باوجود سب جاننے کے کرپس نے ہر قسم کی ڈپلومیسی اور چکنی چپڑی باتوں سے کانگریس کے لیڈروں کو رام کرنے کی کوشش کی۔

8-مشن کی ناکامی کے اسباب

بہت سے لوگوں نے کرپس کی جنگی کابینہ کی تجویزوں کے بارے کانگریس کی تائید حاصل کرنے میں ناکامی کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب میں اس کے اسباب اس طرح بیان کئے ہیں: وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر عام قیاس آرائی یہ ہے کہ اسٹیفرڈ کرپس نے اپنے پہلے اور دوسرے انٹرویو میں اپنا موقف کیوں بدلا۔ ظاہری امکانی وجہ یہ تھی کہ کرپس کو پوری

امید تھی کہ وہ اپنی ترغیب دلانے کی زبردست صلاحیت اور اپنے حسن اخلاق سے کانگریس کو ان تجویزوں کو قبول کرنے پر آمادہ کرلیں گے حالانکہ بنیادی صورت حال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب ان تجویزوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور جب ان کے بارے میں کرپس پر جرح کی گئی تو انھیں احساس ہوا کہ انھیں محتاط ہونا چاہئے اور وہ ایسی امیدیں اور توقعات نہ پیدا کریں جسے وہ پورا نہیں کرسکتے تھے۔

دوسری بنیادی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقفے کے درمیان حکومت کے اندرونی حلقے نے انھیں متاثر کرنا شروع کیا۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقفہ کے دوران دہلی اور لندن کے درمیان پیغامات رسانی ہونے لگی اور جنگی کابینہ نے اس کوئی ہدایتیں بھیجیں جن کی وجہ سے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ حد سے باہر چلے گئے تو ان کی تردید کی جائیگی۔ کرپس واقعتاً ایک وکیل تھے جو واقعات کو دلچسپ اور دلفریب انداز میں پیش کرتے تھے حالانکہ واقعات اس کے برعکس تھے۔ ہڈسن جنھیں مشن کے بارے میں بہت مستند معلومات تھی اور جنھیں مشن کی کارکردگی کا اندازہ تھا، اس کی ناکامی کے اسباب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''غلطی دراصل بلاشبہ اسٹیفرڈ کی ہے کہ انھوں نے وائسرائے ایمرے کو پورے اعتماد میں لیے بغیر بڑے اہم مسئلوں کے بارے میں وعدہ کرلیا۔ کرنل جانسن نے حالات کو اور زیادہ بگاڑا۔ لیکن سراسر غلطی اس میں کرپس کی نہ تھی اس لیے کہ جنگی کابینہ نے خاص کر انڈیا کمیٹی نے بنیادی غلطی کی تھی اور یہ بڑے تعجب کی بات ہے ایسی غلطی ایسی تجربہ کار جماعت سے ہوئی کہ اس نے ایک ایسے سفیر کو ہندوستان بھیجا جس کی اس پالیسی سے جسے وائسرائے چلاتا تھا، اتفاق نہ تھا۔''

کرپس نے یہ لائن اختیار کی کہ کانگریس ہی ان کے مشن کی ناکامی کی پوری طرح ذمہ دار ہے کیونکہ اس نے اس کی پیشکش کو جس میں اس کے سارے مطالبوں کو

منظور کرلیا گیا تھا، خودکشی کی پالیسی کے تحت مسترد کر دیا۔ انھوں نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کو گاندھی جی کے اثر پر محمول کیا۔ کرپس کے سوانح نگار نے لکھا ہے:

''کانگریس لیڈران اور گاندھی جی کے ساتھ فون پر ان کی بڑی مفصل بات چیت ہوئی۔ گاندھی جی سے اس مفصل بات چیت سے نتیجہ بالکل صاف نکل آتا کیونکہ کانگریس کمیٹی کا رجحان مہاتما کے خیالات کی طرف تھا لیکن برطانوی حکومت سے سمجھوتہ، حکومت کے عملی دستور آزادی کی صورت ہی میں ممکن تھا۔ کرپس کے نزدیک گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی دونوں بلکہ خاص طور سے گاندھی جی مشن کی ناکامی کے ذمہ دار تھے۔ کالن کک کی یہ قیاس یا خیالی وضاحت دراصل افواہوں پر مبنی تھی جو دہلی میں گشت کر رہی تھیں اور جو سرتاسر بے بنیاد تھیں۔ گاندھی جی نے ان کی کھل کر پوری تردید کی لیکن جنگی کابینہ کے ثالث نے برطانیوں افسروں، کانگریس کے مخالفوں، حکومت کے ترجمانوں اور انگلستان کے پریس نے افواہوں کو پھیلایا۔

اس بارے میں امریکن جرنلسٹ کی غیر جانب دارانہ رائے بڑی اہم ہے:

''کرپس کا کہنا تھا کہ اگرچہ انھیں ہندوستان میں اصل کابینی حکومت کے قائم کرنے کا اختیار تھا لیکن اس اختیار کو 19 / اپریل کو قطعی طور پر واپس لے لیا گیا جب کرپس کو نئی ہدایتیں بحری تار کے ذریعہ موصول ہوئیں تھی۔ ان میں کرپس کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ انھیں برطانوی حکومت کے اعلان کے متن سے باہر جانے حق نہیں ہے تاوقتیکہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف اس پر راضی نہ ہو جائیں۔'' کرپس مشن کی ناکامی کی اصل وجہ یہ تھی۔

گراہم اسپرے کے ایک مضمون کے جواب میں کرپس کے سکریٹری نے اس سے انکار کیا کہ اس قسم کا کوئی وعدہ کیا گیا تھا یعنی کرپس نے ہندوستانی کابینی حکومت کے قیام کے بارے میں کوئی وعدہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں فنشر (Finsher) کا

کہنا ہے کہ کرپس نے قومی حکومت کے بارے میں وعدہ بغیر خلوص کے کیا تھا۔ انھوں نے اس وجہ سے اسے واپس لے لیا کہ ان کی پیٹھ میں ان انگریزوں نے چھرا گھونپا تھا جو ان کے مخالف تھے لیکن اس کے برعکس لاسکی، مشن کی ناکامی کا الزام ان کے دوش پر رکھتے ہیں۔

ان کے خیال میں مسٹر اسٹیفر ڈ کے لیے نفسیاتی اعتبار سے قبول کیا یا ترک کیا، کی پالیسی کے ساتھ ہندوستان جانا تباہ کن تھا اور انھیں واپسی پر ہی اعلان کرنا پڑا کہ وہ اس پیشکش سے پوری طرح دست کش ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اثر پڑنا لازمی تھا کہ اصل مقصد ہندوستان کو آزادی دلانا نہ تھا بلکہ اپنے حلیفوں میں خاص طور سے اپنے حق میں بھرپور پروپیگنڈہ کرنا تھا۔

کانگریس کی رضامندی حاصل نہ کرنے سے نہ تو کرپس مایوس ہوئے اور نہ حکومت اس لئے کہ دونوں کو بہت سے معاملوں اور باتوں میں کامیابی حاصل ہوئی۔

ہندوستان کی خودمختاری کے بارے میں امریکن تشویش کم ہوگئی۔ چیانگ کے اندیشے اور خدشات روز ویلٹ کے زبانی احتجاج تک محدود رہ گئے۔ لیبر پارٹی کے انتہا پسند ممبر اور کابینہ میں بغیر پارٹی کے وزراء ہندوستان کے بارے میں حکومت کی پالیسی سے مطمئن ہوگئے اور کانگریس کے رویہ سے سخت برہم ہوگئے۔

حکومت کے پاس کانگریس کے خلاف زبردست مواد موجود تھا اور اسے اس نے بڑی چابک دستی سے اس کے خلاف استعمال کیا۔ ایمرے کانگریسی لیڈروں مثلاً گاندھی جی اور نہرو کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا اظہار انھوں نے لن لتھ گو کے نام خط میں کیا۔ انھوں نے انھیں گھٹیا قسم کے غیر عملی لوگوں سے تعبیر کیا۔ ان کے بارے میں انھیں شک تھا کہ ہندوستان میں اس قسم کے لوگ کبھی بھی راہ راست پر رہیں گے۔ لن لتھ گو کا نظریہ یہی تھا کہ وہ کبھی بھی راہ راست پر نہیں رہیں گے اور ان

معمر اور پرانے لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جوان اور کمسن بہتر عناصر سے کام لینا ہوگا۔

9-عام اثرات

چونکہ سمجھوتہ نہ ہوسکا اس لیے وزیر ہند اور وائسرائے مشن سے پہلے والے دنوں کے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اب ایکزیکیٹو کونسل کی شکل بدلنے کی ساری باتیں ختم ہوگئیں۔ جہاں تک مستقبل کا سوال تھا وہ بھی مشکوک ہوگیا۔

ایمرے نے لکھا کہ میں فرض کرتا ہوں کہ فوری سمجھوتہ ہو یا نہ ہو ہماری مابعد جنگ پالیسی بدستور قائم ہے جسے ہم ترک کرسکتے ہیں اگر جنگ کے بعد کی صورتحال بالکل مختلف ہو۔

مستقبل کے بارے میں لن لتھ گو کے کیا خیالات تھے۔ اس سلسلہ میں جنگی کابینہ کو ایٹلی نے جو میمورنڈم پیش کیا اس کا اس میں ذکر ہے۔ وائسرائے کے تار کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان کے ذہن کا اندازہ آٹھویں پیراگراف سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے جنگ کے بعد کھوئے ہوئے موقعوں کی بات کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت معمولی رعایتیں دینا چاہتے ہیں اور سابقہ کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

اس تار کے چودھویں پیراگراف میں وائسرائے نے ہندوستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور برما کا شہنشاہیت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نسل، تاریخ اور مذہب کے لحاظ سے دونوں اس میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کو اس سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ وہ اس شہنشاہیت میں اس لیے ہیں کہ دونوں مفتوحہ ملک ہیں۔ دونوں کو قوت اور طاقت کے دباؤ سے اس میں رکھا گیا ہے۔ وہ ہمارے تسلط میں ہیں اور اب تک ان کا ہماری

حفاظت میں رہنا عین ان کے مفاد میں ہے۔

لن لتھ گو نے صیغہ راز میں یہ کہا کہ ہمیں یہ پورا یقین ہے کہ حکومت خود اختیاری اتحاد کے بالکل منافی ہے اور ہندوستان سے جاتے ہوئے درگاس داس کو بتایا کہ ہندوستان پچاس سال تک آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس ملک کے لیے پارلیمنٹری ادارے بالکل نئے ہیں اور ان کو کامیابی سے چلائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ برطانوی اور ذہین افسران کی بڑی تعداد یہاں یعنی اس ملک میں چھوڑی جائے۔ ہندستان میں ایرکنڈیشن آجانے کی وجہ سے اب برطانوی افسران کے لیے دہرہ دون ایسی جگہوں پر منتقل ہوجانے یا بودوباش اختیار کرنا ممکن ہوگیا ہے اور جب یہ چھ (6) ملین اندرونی ایڈمنسٹریشن چلانے کے لئے موجود ہوں گے تو ہندستانی حکومت خود اختیاری کے معاملہ میں زبردست ترقی کرے گی۔

سیاسی مستقبل کے بارے میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود یہ ممکن نہیں کہ برطانوی کابینہ کے اعلان کے تصورات کو پوری طرح بدلا جاسکے۔ سمجھوتے میں کم از کم نظریہ کے طور پر ایگزیکیٹو کونسل کو ہندوستانی تصور یعنی یہ کہ بجز وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے سارے ممبر ہندوستانی ہوں کو قبول کرنا پڑا۔

دوسرے اس نے اس پر رضامندی ظاہر کی اور وعدہ کرلیا تھا کہ صوبہ جاتی اسمبلیوں اور والیان ریاست کی منتخبہ دستور ساز اسمبلی کے بتائے ہوئے دستور پر عمل درآمد ہوگا۔ تیسرے مسلمانوں سے ہندوستان سے علیحدہ ہوجانے اور پاکستان سے الگ رہنے کا وعدہ کرلیا تھا۔

جنگ کے بعد ہندوستان کے مستقبل کا سوال اٹھا لیکن حکومت کو موجودہ صورتحال کا سامنا کرنا تھا۔ کرپس مشن کے آنے سے پہلے لن لتھ گو اس بارے میں ایمرے سے مشورہ کررہے تھے۔ جاپانی حملے اور ہندوستان سے جنگ کے لیے یہ بالکل تیار نہ تھے

جس سے بڑا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ دشمن کی مسلسل پیش قدمی اور اس کی بحری اور بری شاندار فتوحات نے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ برطانیہ میں ہندوستان کو حملے سے بچانے کے لئے نہ تو سکت ہے اور نہ اہلیت اور اس وجہ سے ان میں جاپانیوں کی حمایت کا جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

اقتصادی یا معاشی دباؤ یا ناگزیر جنگ کی وجہ سے عام اشیاء کی قلت اور ان کے داموں میں بے پناہ اضافہ کی وجہ سے زبردست بے چینی پائی جاتی تھی۔ برما کے پناہ گزیں جو بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور انھوں نے برطانوی حکومت کی نااہلی اور ناقابلیت اور اس کی طرف سے گوروں اور کالوں میں نسلی تفریق اور امتیاز کے برتاؤ کے بارے میں بتایا جس نے زبردست نسلی تلخی پیدا کر دی۔ دہشت اور اندیشے پھیلانے والے حکومتی اقدامات یعنی صوبائی بیڑوں یعنی کشتیوں اور اگن بوٹوں کو ضبط کرنے کے اقدام نے ملک کو سخت خطرے میں ڈال دیا۔

مزید براں اس وقت سیاسی افق پر بجلی کی زبردست چمک اور گرج سے زبردست ہنگامہ ہو رہا تھا۔ کانگریس بڑے پیمانے پر ڈاریکٹ ایکشن کی دھمکی دے رہی تھی۔ مسلم لیگ کو کانگریس کی کامیابی کے بڑے خدشے تھے اور اسے برطانوی حکومت کی کانگریس کے خلاف سختی کرنے کی پالیسی میں بڑا شبہہ تھا۔ اس وجہ سے حکومت بڑے خلجان اور مخمصے میں پڑی ہوئی تھی۔ ایسے بھڑک جانے والے آتش گیر مواد کی موجودگی میں ذراسی بھی چنگاری بڑے زبردست دھماکے کا باعث ہو سکتی تھی۔

ان حالات میں جب کہ دشمن ہندوستان کے دروازہ تک پہونچ چکا تھا کسی قسم کی کمزوری یا بے جا خود اعتمادی کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی اور کئی متبادلوں میں سے ایک تو متبادل یہ تھا کہ ہندوستانی سیاسی لیڈروں کا تعاون حاصل ہوتا۔ یہ وائسرائے اور جنگی کابینہ کو ناقابل قبول تھا اسلئے کہ وہ اس کی قیمت ادا کرنے پر تیار نہ تھے۔ دوسرا متبادل یہ تھا

کہ پودے کو توڑ لیا جائے اور اسے نوچ کر پھینک دیا جائے۔

پچھلی تحریکوں کے تجربوں نے حکومت کو پوری طرح اس کی نئی مشکل سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار کر دیا تھا۔ اس لیے کرپس مشن کے درمیانی وقفے سے پہلے سارا سامان اکٹھا کر لیا گیا تھا یعنی تیاریاں مکمل کی جا چکی تھیں۔ ایک تجویز یہ تھی ایک ہی جھپٹ یا وار میں کانگریس ہائی کمانڈ کو دبوچ لیا جائے اور انھیں کسی افریقی نوآبادی میں نظر بند کر دیا جائے لیکن بعد میں یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔

بے سر اور بے لیڈر کے ہجوم زیادہ دنوں تک ہنگامے نہیں کر سکتا تھا لیکن حکومت کے پاس ان ہنگاموں کو فرو کرنے کے لیے اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے خاص اور کافی طاقت اور قوت موجود تھی۔

کانگریس کو الگ کر کے حکومت مسلمانوں اور فہرست میں مندرج ذاتوں یعنی پست اقوام کی وفاداری یا والیان ریاست کے تعاون اور اعتدال پسندوں کی سول نافرمانی کی تحریک کی تائید پر بھروسہ تھا۔ ایگزیکیٹو کونسل، ڈیفنس کونسل اور امپیریل ڈیفنس کونسل کی ممبروں و دیگر بعض جماعتوں کا تعاون حاصل ہونے کا بھی امکان تھا۔

پروپیگنڈے کے حربے نے باہری ملکوں کے ان گروہوں کو جو ہندوستان کے لیے آزادی اور جمہوریت کی وکالت کرتے تھے غیر جانبدار بنایا تھا۔ ہندوستان میں جمہوریت پسند آزاد خیال اخباروں پر قانون اور ریگولیشن کے ذریعہ پابندیاں لگائی جا سکتی تھیں اور حکومت کے وفادار اخباروں کو بڑھاوا اور ان کی سرپرستی کر کے اول الذکر اخباروں میں کو دبایا جا سکتا تھا اور پھر مرکز سے ہدایتیں حاصل کر کے حکومت کی مشنری کو پوری طرح منظّم اور مضبوط بنایا جا سکتا تھا۔

باہر کے ملکوں میں پبلسٹی اور پروپیگنڈہ کرنے کے لیے پارلیمنٹ تھی جس کے پلیٹ فارم سے برطانوی سیاستداں اور سیاسی لیڈر ساری دنیا میں اپنے خیالات کی

ترویج کر سکتے تھے۔ واشنگٹن میں بھی برطانوی سفارتخانہ امریکیوں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کو اور دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندوں کو برطانوی نقطۂ نظر سے واقف کرانے کے لیے پروپیگنڈہ لٹریچر کی تقسیم کا مرکز تھا۔ انگلستان واپسی پر کرپس نے کانگریس کو بدنام کرنے کی مہم امریکنوں کے نام ایک نشریہ سے چھیڑی۔ انھوں نے کہا کہ امریکنوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے وہ اپنا مشن ہندوستان لے گئے تھے۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے نمائندوں کو وائسرائے کی ایکزیکیٹو کونسل جو صدر کو مشورہ اور فیض دینے والی جماعت ہے، میں شامل ہونے یا اس کے ممبر بنانے کی فوری پیشکش کی۔ انھوں نے اپنی شاطرانہ یعنی بالکل بے بنیاد تجویز کا ذکر کیا جس نے بڑے عیارانہ طریقہ سے اصل حقیقت کو دبا دیا تھا۔ انھوں نے کانگریس کے دوست ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ کانگریس کے حوالے سے امریکیوں کو آگاہ کیا کہ کانگریس اکثریت اقلیتوں پر ظلم کرنا چاہتی ہے اور یہ کہ گاندھی جی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو ان کی فیاضانہ کوشش کو مسترد کرنے پر آمادہ کیا۔

28/اپریل کو کرپس نے اپنے مشن کے بارے میں دارالعوام میں بحث کا آغاز کیا۔ ان کی تقریر بڑی شاطرانہ تھی۔ اس میں انھوں نے کسی کے خلاف نہ سخت الفاظ استعمال کئے اور نہ کسی کے خلاف الزام تراشی کی۔ انھوں نے برطانوی حکومت کی ایمانداری اور اپنے مقصد کے لیے خلوص اور نیک نیتی کے متعلق بڑا مضبوط کیس پیش کیا اور اپنے مشن کی ناکامی کی یہ وجہ بیان کی کہ اس کی کامیابی کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہوگئی تھیں:

(1) حکومت کی جنگ میں شمولیت کی وجہ سے۔

(2) محوری طاقتوں کا زبردست پروپیگنڈہ جس کی وجہ سے شکست خوردگی کی فضا قائم ہوگئی۔

(3) بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ منافرت اور مختلف پارٹیوں اور ملتوں کے تصادم

(4) کانگریس کے اعتراضات اصلاً ڈرافٹ یا اعلان کے پہلے حصے اور دوسرے حصے پر یعنی ایکزیکٹیو کی تشکیل یا حکومت ترکیبی یا ڈیفنس ممبری کے بارے میں۔

کانگریس نے اعلان کے پہلے حصہ پر زیادہ زور نہیں دیا تھا اور کرپس کی رائے تھی کہ ان اختلافات کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکلا اگر ساری پارٹیاں موجودہ صورتحال کے بارے میں تعاون کرتیں تو حصے کے مطابق ان کے مطالبے پورے ہو جاتے۔ ان کے مشن کی کامیابی دو سوالوں کے حل پر منحصر تھی:

(1) عارضی حکومت کی شکل کے بارے میں اور ڈیفنس کے بارے میں۔ پہلے کے بارے میں کرپس کا دعویٰ تھا کہ میں نے ان لوگوں سے ملاقات کی تو شروع ہی میں بالکل صاف اور واضح کر دیا تھا کہ نئے دستور کے نفاذ سے کسی قسم کی کوئی اہم تبدیلی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈیفنس کے بارے میں انھوں نے یہ بتلایا کہ ڈیفنس کے بیشمار پہلو ہیں۔ مثلاً سول ڈیفنس، کمیونی کیشن یا مواصلاتی نظام پہلے ہی سے وائسرائے کی کونسل کے ہاتھ میں تھے۔ برطانوی حکومت کے لیے ممکن نہ تھا تحفظ کے پیش نظر یا کسی قسم کے دباؤ۔ پیش نظر ایسے اہم ترین محکموں کے بارے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لیتی۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اقلیتیں کسی طرح دفاعی ذمہ داریوں کو کم کرنے کی تائید میں تھیں۔ ایکزیکیٹو کونسل کی شکل بدلنے کے بارے میں انھوں نے وہ سارے دلائل دہرائے جو دہلی میں پیش کر چکے تھے اور کہا چونکہ کانگریس نے اپنے ناممکن مطالبہ پر اصرار کیا اس لئے گفت وشنید ناکام ہوگئی۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے ایمرے، وزیر ہندستان نے قومی حکومت کے مسئلوں سے بحث کی۔ انھوں نے اتحاد کی حمایت میں ایک مہمل بیان دہرایا تا کہ بیرونی دنیا

سے ایک مشترکہ محاذ قائم کیا جائے اور ہندوستان کی قومی حکومت کا تصور یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ یہ حکومت بالکل غیر ذمہ دار ہوگی اور مسلمانوں و دیگر اقلیتوں کے لیے ہرگز ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔ انھوں نے بڑی بیباکی سے ہندوستانی لیڈروں کو جھڑکا کہ وہ بغیر ان کی موجودگی کے ایک دوسرے سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔

وائسرائے اور ان کی ایکزیکیٹو کونسل نے ان کی بہت زیادہ مدح سرائی کی اور لاڈ پریوی سیل یعنی اسٹیفر ڈ کرپس کو اس باب میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس عجیب وغریب تضاد کو پیش کرتے ہوئے بڑی جرأتمندانہ کوشش کی کہ ایک طرف تو برطانوی حکومت شہنشاہیت کا بوجھ اتارنا چاہتی ہے اور ہندوستان کو آزادی دینا چاہتی ہے۔ لیکن کانگریس خاص طور سے گاندھی جی اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ انھوں نے اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کردیا جو ان کے مفاد میں تھی۔ وہ اتنا زیادہ پاگل ہو گئے تھے کہ انھوں نے برطانوی پیشکش کو ٹھکرادیا اور موقعہ کھودیا۔ دوسری طرف ایمرے اور چرچل بار بار یقین دلاتے رہے کہ تجویز بدستور اپنی وسعت اور نیت کے ساتھ قائم ہے۔

☆..................☆..................☆

نواں باب

بے ساختہ انقلاب

1- کرپس کے الزامات پر کانگریس میں بحث

کرپس سے گفت وشنید کے اچانک خاتمے سے کانگریسی لیڈروں کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے مولانا آزاد کے نام خط، ان کے نشریہ جس میں انھوں نے کانگریس لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے ڈیفنس اور قومی حکومت کے بارے میں حالت کی بہت غلط تشریح اور ترجمانی کی اور ان کا یہ الزام کہ وہ پیش کش کو مسترد کرنے کے بارے میں ہمیشہ وجہیں بدلتے رہے اور محض اپنی کمزوری سے گاندھی جی کے مشورے کو قبول کرلیا۔ کانگریسی لیڈر انھیں پہلے بڑا دیانتدار، حریت پسند، کھلے ذہن کا مالک، ہندوستان کا بہی خواہ اور ہمدرد اور کانگریس کا دوست سمجھتے تھے لیکن مشن کے سلسلہ میں ان کی کارکردگی نے ان کے طلسم کو توڑ دیا۔ وہ ان تجویزوں کے وکیل تھے جنھوں نے کانگریس کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اپنی ملاقات اور پریس کانفرنس میں انھوں نے ایسی زبان استعمال کی جس کے کچھ معنی بظاہر نکلتے تھے اور جس کے بعد والے متن کے دوسرے مطلب نکلتے تھے۔ ایسا ہی کرپس کو کانگریس لیڈروں کی آزادی رائے کے بارے میں شک تھا۔ انھوں نے ان کو ایک مجروح معنویت قرار دیا۔

جواہر لال نہرو جو ان کے عزیز تر دوست تھے ان سے اس درجہ مایوس ہوئے کہ انھوں نے اعتراف کیا کہ یہ بے پناہ رنج اور صدمے کی بات ہے کہ کرپس ایسا شخص شیطان کی وکالت کرنے لگے۔

گاندھی جی کے اخلاقی اصولوں اور شریفانہ طور طریقوں کے احساس کو کرپس کے اعتراضات اور برطانوی سیاستدانوں کے جھوٹ سے بڑی تکلیف پہونچی۔ ان کے اصولوں میں نہ تو غصہ کی گنجائش تھی اور نہ جھوٹ کا جواب جھوٹ سے دینے کا حوصلہ اور انھوں نے اپنے ضمیر میں اس ذہنی کوفت سے بچنے کی پناہ لی۔

عہدے پر قائم کرپس بحیثیت جنگی سفیر کے لیبر پارٹی کے اعلیٰ ترجمان اور اعلیٰ سوشلسٹ اصولوں کے لیے لڑنے والے کرپس سے بالکل مختلف تھے۔ اس نئی حیثیت میں وہ بددیانت ڈپلومیٹ اور ایک شاطر وکیل جو اپنے موکل کی پرزور وکالت کرتا تھا، کے روپ میں نظر آئے۔

انھوں نے کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے جنگ کے دوران دستور میں تبدیلی کا مطالبہ کر کے اور دفاع کے نئے انتظام کا مطالبہ کر کے ایک تباہ کن کام کیا ہے جس سے کہ نہ صرف جنگ پر خراب اثر پڑا بلکہ ایسا مطالبہ کیا جو اقلیتوں کو کسی طرح قابل قبول نہ ہو۔ انھوں نے کانگریس لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ وہ جوڑ توڑ کے ذریعے ہندوستان کے لیے ایک غیر ذمہ دار یا عددی حکومت کے خواہاں ہیں۔

انھیں گاندھی پر شکست خوردہ ہونے پر شک تھا اور اس کا کہ وہ جاپانیوں سے مل کر ہندوستان کی آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کو خبطی سمجھتے تھے اور امن پسند بھی، جنھوں نے کانگریس کمیٹی کو ورکنگ کی کابینہ کی پیشکش کو مسترد کرنے کی ترغیب دی تھی۔

یہ الزامات بالکل ہی بے سروپا تھے۔ جہاں تک طویل المیعاد مسئلہ کا تعلق تھا کانگریس نے دستور میں ترمیم کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس لئے یہ پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوسکتا تھا اور اس وقت کے حالات کے تحت وہ اس سے باز رہی۔ جہاں تک عارضی حکومت کا تعلق تھا، کرپس نے خود تجویز کیا تھا کہ کنونشن کے ذریعہ ایگزیکیٹو کو کابینہ میں تبدیل کر دیا جائے۔

کانگریس لیڈروں نے اسے بتادیا کہ جنگ، برطانوی حکومت کی دستور میں انقلابی تبدیلی لانے میں مانع نہیں ہوئی۔ وہ یو کے اور فرانس کی ایک یونین بنانے پر پوری طرح تیار تھی۔ دوسری دستوری تبدیلیاں مثلاً انتخابی حلقوں کی حد بندی، نشستوں کی تقسیم، متناسب نمائندگی اور الیکشن کے مصارف کے تعلق سے دستوری تبدیلیاں جنگ کے دوران کی گئی تھیں۔

دفاعی ممبر کی تقرری کا مسئلہ صرف ہندوستانیوں پر ڈیفنس کو منظم کرنے اور جاپانیوں کے مزاحمت پر انحصار کرنے کا تھا لیکن ہندوستانیوں میں اہلیت اور بھروسے کی کمی کی وجہ سے برٹش کابینہ کو ہندوستانیوں پر اعتماد نہ تھا۔

یہ الزام کہ کانگریس اس لیے اقتدار کی خواہاں تھی کہ وہ اپنی حکومت کو عرصہ تک قائم رکھے، ترپ چال کے طور پر لگایا گیا تھا کہ مسلمانوں اور دوسروں کو خوف زدہ رکھا جائے۔ کانگریس نے علی الاعلان اور زوردار طریقے سے کہا تھا کہ اس کے مقاصد قومی تھے نہ کہ فرقہ وارانہ اور یہ وہ ایک ملی جلی کابینہ بنانے پر تیار تھی اور ہر دستور کے چوکھٹے میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے تحفظات کی گارنٹی دینے کے لیے تیار تھی۔ اس کا یہ احساس تھا کہ ایک غیر مطمئن اور طاقتور اقلیت اسٹیٹ کے لیے مستقل خطرہ ہوگی۔ اسے مسلم لیگ کے صرف اس مطالبے پر اعتراض تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کردیا جائے۔ یہ شک اور شبہ ایک حد تک جذباتی ہونے کی وجہ سے اور بڑی حد تک اس خیال سے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اس کی مداخلت میں نہیں ہے، مذہب کے نام پر تقسیم از منۂ وسطٰی کے تصور کا اعادہ تھا جس کا مطلب قوم پرستی، آزادی اور ترقی کے خیالات کو کلیتاً مسترد کرنا تھا۔

پاکستان کے قیام کو نہ چاہنے کے باوجود کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے 10/ اپریل کے ریزولوشن میں کہ صوبے کو مرکزی حکومت میں شامل ہونے کا حق حاصل

ہے، ان لفظوں میں منظور کیا:

"کانگریس ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کی پوری طرح قائل ہے اور اس پر اس کا پختہ عقیدہ ہے۔ اس اتحاد میں کسی قسم کا رخنہ خاص کر موجودہ دنیا میں جبکہ لوگ بڑے بڑے فیڈریشن کے بارے میں سوچتے ہیں سارے متعلقہ لوگوں کے لیے مضرت رساں ہوگا۔ اس بارے میں سوچنا حد درجہ تکلیف دہ ہے لیکن اس کے باوجود اس بارے میں نہیں سوچ سکتے کہ کسی علاقائی وحدت کو انڈین یونین میں ان کی مرضی اور منشاء کے خلاف رہنے پر مجبور کیا جائے۔"

یہ الزام لگا دیا گیا کہ کانگریس کا اصل مقصد تھا کہ وہ حکومت میں برتری اور تفوق حاصل کرے تاکہ اقلیتوں کو وہ پوری طرح اپنی ماتحتی اور تسلط میں رکھے۔ یہ الزام کتنا زیادہ غلط تھا کہ وہ گاندھی جی کے 13 اپریل کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے جو انھوں نے کرپس کی روانگی کے دوسرے روز دیا تھا جس میں انھوں نے کہا کہ آزادی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے یہ بالکل دوسرا سوال یا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو جو لاحل مسئلہ بنا ہوا ہے، حل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک سادہ طریقہ ہے عدم تشدد کا دوسرا طریقہ ہے تشدد کا۔ پہلے طریقے میں دوسری پارٹی کی منظوری یا تعاون غیر ضروری ہے۔ اگر کسی سیب کے لیے دو لڑکوں میں کوئی جھگڑا ہو تو اہنسا یا عدم تشدد کا طریقہ یہ ہے کہ سیب دوسری پارٹی کو دے دیا جائے اور دوسری پارٹی اسے اچھی طرح سمجھے کہ جس پارٹی نے سیب دیا ہے اس کے ساتھ وہ عدم تعاون کر رہی ہے۔

8 ر اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ممبئی میں گاندھی جی نے ایک مشترکہ دوست کو اس مضمون کا نوٹ دیا کہ صدر کانگریس نے برطانوی حکومت کو یہ پیش کش کی ہے کہ وہ ہندوستانی ملت یا فرقے کو اقتدار منتقل کر سکتی ہے۔

وہ ہر اعتبار سے ایک سنجیدہ اور قابل قدر پیش کش تھی اور اس کے لیے گاندھی جی کا نوٹ حسب ذیل تھا:

'آپ کا خط ملا جس میں آپ نے قائد اعظم سے اپنی گفتگو کا حوالہ دیا ہے۔ آپ نے بڑی صاف زبان میں گفتگو کی۔ اس بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ہریجن میں اپنے مضمون مسلم صدر کانگریس مولانا آزاد کی مسلم لیگ کی مطلوبہ پیشکش کو میں نے دہرایا یا نقل کیا تو میرا مطلب یہ تھا کہ یہ پیشکش ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے سنجیدہ پیشکش ہے۔ اس کی دوبارہ تشریح آپ کی تشفی کے لیے کرتا ہوں۔ اگر مسلم لیگ کانگریس کے فوری آزادی دئے جانے کے مطالبے کی بغیر پس وپیش کے حمایت کرے تو کانگریس کو اس پر کسی قسم کی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر سارا اقتدار سارے ہندوستان کے لیے جس میں نام نہاد ریاستی ہندوستان بھی شامل ہے مسلم لیگ کے حوالے کر دیا جائے تو کانگریس آزاد مملکت کی مشنری میں کسی قسم کا روڑا نہیں اٹکائیگی۔ یہ پیش کش پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ ہے۔'

گاندھی جی کو شکست خوردہ ذہنیت کا شکار قرار دینا صریحاً غلط تھا۔ گاندھی جی طبعی طور سے رجائیت پسند تھے اور سچے مقصد یا حق کی فتح میں غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔ جنگ کے دو متحارب فریقوں میں ان کو اس بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہ تھا کہ جس مقصد کے لئے اتحادی قومیں: برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، فرانس اور سب سے بڑھ کر روس اور چین لڑ رہے تھے وہ سراسر منصفانہ تھا اور وہ مقصد کی کامیابی کے پرجوش حامی تھے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق تھا ان کا اس کے لوگوں یا باشندوں سے دلی لگاؤ تھا اور ان کے بارے میں ذرہ برابر بھی برائی کا خیال نہیں لاتے تھے۔ جس چیز کی وہ بہت کھل کر مذمت کرتے تھے وہ برطانیہ کی سامراجی حکومت تھی۔

ان کے نزدیک برطانوی سامراج ایشیا اور افریقہ کے لوگوں پر اس قسم کا جارحانہ

سلط تھا جیسا کہ ہٹلر یا مسولینی اور جاپانی جنگ بازوں کا جارحانہ تفوق یا تسلط۔ تمام برطانوی پارٹیوں کے سامراج پسند کنزرویٹو، لبرل، لیبر سب اپنے کو دھوکہ دیتے ہیں جب وہ سامراج کے دشمنوں کو برطانیہ کا دشمن اور اس کے زوال کا خواہاں سمجھتے ہیں۔

گاندھی جی کا خیال یہ بھی تھا کہ جاپان برطانیہ کے خلاف جنگ میں اس لیے صف آرا تھا کہ اسے برطانوی شہنشاہیت سے حسد تھا اور وہ اس کی تباہی کا خواہاں تھا۔ اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا مقصد ہندستان پر حملہ کا نہ تھا اس لئے ہندوستان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اسے ہندوستان پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی ترغیب دے۔ اگر برطانوی حکومت اپنی شہنشاہیت کو ہندوستان میں ختم کردے مگر وہ اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے سے نہ باز آئے تو پھر دو راستے کھلے ہوئے تھے:

(1) ایک تو یہ کی اتحادی فوجیں ہندوستانیوں کی رضامندی سے ہندوستان میں جاپانیوں سے مزاحمت کریں۔

(2) دوسرے یہ کہ ہندوستان بڑے پیمانے پر غیر متشددانہ عدم تعاون کرے اور جاپان کے قبضے کو ناممکن بنادے۔

کانگریس اور کرپس کے درمیان مذاکرات کے دوران برطانوی ترجمانوں نے گاندھی جی کے رول کو پارلیمنٹ میں پیش کیا کہ انہیں کرپس سے ملاقات کرنے میں پس و پیش تھا لیکن جب ان پر دباؤ پڑا تو وہ اس غرض سے دہلی کا سفر کرنے اور 27/مارچ کو کرپس سے ملنے کو بھی تیار ہو گئے۔

کرپس نے انھیں برطانوی کابینہ کا متن دکھایا جسے انھوں نے فوری طور سے مسترد کردیا۔ انھوں نے کرپس سے اسے شائع نہ کرنے اور انگلستان واپس جانے کو کہا۔ 14/اپریل کو گاندھی جی دہلی سے روانہ ہو گئے اور وہ پھر کرپس کے قیام کے دوران دہلی نہ آئے۔ اس اثنا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گفت وشنید کا سلسلہ جاری

رکھا۔ 9/اپریل کی صبح تک سمجھوتے کے بارے میں اس کی توقعات بہت ہی روشن اور امید افزا تھیں۔ اسی شام کو مولانا آزاد کرپس سے ملے اور انھیں اس پر حد درجہ حیرت ہوئی کہ تصویر یا صورتحال بالکل بدل چکی ہے اور کابینی حکومت کا وعدہ اس بنیاد پر منسوخ ہو چکا ہے کہ یہ معاملہ پورے طور سے وائسرائے کے دائرہ کار میں آتا ہے اور یہ اس کی رضامندی کا محتاج ہے۔

یہ دراصل وائسرائے کو ذمہ دار قرار دینے کا بہانہ تھا۔ اس لیے کہ وائسرائے کی حیثیت ملک معظم کے حکومت کے ایجنٹ کی تھی اور وہ وزیر ہند کی ہدایت اور تقرری کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتا تھا اور وہ کابینہ کے فیصلوں کا پوری طرح سے پابند تھا۔

کرپس کے رویے میں تبدیلی سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے زبردست ردّ عمل کا اندیشہ تھا۔ کانگریس نے اپنی 10/اپریل کے صبح کی میٹنگ میں برطانوی جنگی کابینہ کی تجویزوں کو منظور کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اس میں گاندھی جی کو کچھ بھی دخل نہ تھا۔ مولانا آزاد نے اس بارے میں اپنی کتاب میں لکھا: ''جنگ میں حصہ لینے کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات سب کو اچھی طرح معلوم تھے اور یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کسی بھی نہج اور اعتبار سے ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے صاف صاف کہا کہ ہمیں پورا اختیار ہے کہ برطانوی کابینہ کے تجویزوں کے بارے میں کسی قسم کا بھی فیصلہ کریں۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے پچھلے جلسوں کی کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے اور وہ محض میرے اصرار سے کئی دن تک دہلی میں ٹھہرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ بالآخر انھوں نے محسوس کیا کہ اب وہ نہیں ٹھہر سکتے اور ان کے اس فیصلے کے بدلنے میں میری کوشش ناکام رہی۔'' 12/اپریل کو کرپس نے واپس جانے کی راہ لی اور وہاں پہونچ کر انھوں نے برطانوی کابینہ کی پیشکش کے حق میں اور کانگریس اور اس کے اس پیشکش پر

اعتراضات کے لیے زبردست پروپیگنڈے کی مہم چلائی۔

یہ پیشکش آزادی کے فخر سے بالکل خالی تھی۔ اس کا مبہم انداز میں پیش کیا جانا اور اس کے ساتھ دنیاوی رائے عامہ کو کانگریس کے خلاف کرنے اور گاندھی جی کو بدنام کرنے کی بڑی زبردست کوشش ہوئی جس کے لیے بڑے پیمانے پر غم اور غصہ کا اظہار کیا گیا۔ گاندھی جی نے جو اس زبردست پروپیگنڈے کا نشانہ تھے، اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کیا'' اس تمام تر مصنوعی اور مضحکہ خیز تشہیر کا مطلب اس کے سوائے کچھ نہیں کہ مجھے ڈرایا جائے اور کانگریس کی صفوں میں پست ہمتی پھیلائی جائے۔ یہ ایک بڑا ہی گندہ کھیل ہے۔ انھیں اس کا اندازہ نہیں کہ میرے سینہ میں کتنی زبردست اور ہولناک آگ جل رہی ہے۔

2- گاندھی جی کا عدم تعاون کرنے کا فیصلہ

اس آگ کا ایندھن برطانیہ کی سرکردگی میں اتحادیوں کی منافقت نے ہی انہیں فراہم نہیں کیا بلکہ بہت سے دوسرے ذرائع سے بھی حاصل ہوا۔

1942ء کے موسم گرما میں صورتحال بہت زیادہ مایوس کن تھی۔ 15 رفروری کو سنگاپور، 7 رمارچ کو رنگون اور 12 رمارچ کو انڈمان کے سقوط کے بعد ہندوستان کے اردگرد کے سمندر جاپان کے تسلط میں آگئے تھے۔ جب کرپس گفت وشنید میں مشغول تھے تو جاپانی بم ٹرون کمالی، کوکناڈا اور وزگیاپٹنم پر برس رہے تھے اور حکومت مدراس نے اپنے دفاتر پریسیڈنسی کے اندرونی حصوں میں منتقل کرلئے اور مشرقی ساحل پر ٹرون کمالی سے لے کلکتہ تک زبردست خوف وہراس پھیل گیا۔

کلکتہ کو خالی کرنے کی بات چیت سے اس کے رہنے والوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مولانا آزاد نے مئی میں کلکتہ کے حالات کے بارے میں لکھا کہ ہرطرف صورتحال

کے بگڑنے سے مجھے حد درجہ تشویش ہوئی اب لوگوں کی اکثریت کا پختہ خیال ہو گیا کہ برطانیہ کو اس جنگ میں شکست ہو گی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جاپان کی فتح کا خیر مقدم کریں گے۔ انگریزوں کے خلاف شدید تلخی اور برہمی تھی بسا اوقات وہ اتنی زیادہ تیز اور تند تھی کہ وہ ہندوستان پر جاپانی فتح چاہتے تھے۔

ان کی اطلاع یہ تھی کہ حکومت کو اس کا اندیشہ تھا کہ جاپانی ڈائمنڈ ہاربر سے کلکتہ کی طرف بڑھیں گے اور ان کا منصوبہ تھا کہ شہر کو خالی کر دیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو بنگال کو چھوڑ کر تیار شدہ مورچوں کی طرف ہٹ جائیں اور آمد رفت کے وسائل کو تباہ و برباد کرنے کی پالیسی پر عمل کریں یعنی پلوں کو اڑا دیں، فیکٹریوں اور صنعتی مراکز مثلاً جمشید پور کو تباہ کر دیں۔ جہازوں کے نقصانات کی وجہ سے اشیاء میں قلت ہو گئی۔ خاص طور سے غذائی اجناس اور سب سے بڑھ کر ان کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافے سے فاقہ کش عوام کی مصیبتوں میں اضافہ ہوا۔

ملایا اور برما پر جاپانی قبضے کی وجہ سے ہندوستانی اور یوروپین برما سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان آنے لگے اور ان دونوں نسلوں کے لیے الگ الگ انتظامات کیے گئے اور حسب معمول ان میں ہندوستانیوں سے امتیازی رویہ روا رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے سڑکیں تک الگ کر دی گئیں۔ ان سڑکوں کو سیاہ فام اور سفید نام دئے گئے۔ قدرتاً ہندوستانیوں کو ان کے ساتھ اس ناقابل برداشت اور غیر انسانی برتاؤ سے سخت اذیت پہونچی اور ان کی ان مصیبتوں کی داستانوں نے برطانوی مخالف جذبات کو اور زیادہ ہوا دی اور ہندوستانیوں کی ذلت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے بارے میں کانگریس کے جنرل سکریٹری نے تنقید کی۔

گاندھی جی کے حساس دماغ کے لیے جس میں مصیبتوں میں مبتلا لوگوں کی تکلیفوں کے بارے میں سخت ردعمل ہوتا تھا، لیکن ان کا ردعمل عام انسانون کا سا ردعمل

نہ تھا۔ انھوں نے منافقت اور جھوٹ کا جواب غصہ اور تشدد سے نہیں دیا۔ اتحادیوں میں منافقت اور جھوٹ تھا کہ ایک طرف وہ آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑ رہے تھے لیکن دوسری طرف وہ محکوم قوموں کو ان کے اصولوں سے متمتع نہیں ہونے دے رہے تھے۔ بداخلاقی اور جھوٹ کا مقابلہ صرف سچائی اور اخلاق سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ غلطی کا ازالہ دلیل یا عقل سے کیا جا سکتا تھا نہ کہ تشدد سے۔

ایک طرف گاندھی جی اپنی روحانی طاقت کو اس کا حل تلاش کرنے میں لگا رہے تھے اور دوسری طرف کانگریسی لیڈر بھی اس حل کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن یہ لیڈر مختلف انداز سے بات کرتے تھے۔

جواہر لال نہرو آخری وقت کرپس کی قلب ماہیت یا تبدیلی سے پہلے حل تلاش کرنے کے لیے اور ہندوستان کو مؤثر طریقے سے دفاع میں حصہ لینے اور جنگ کو عوامی مسئلہ بنانے کے لیے بیتاب اور بیقرار تھے۔ مولانا آزاد کے مطابق انھیں اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ ہندوستان جمہوریت کے ساتھ مل کر نہیں لڑ رہا ہے۔ ان کے دماغ میں کشمکش تھی اس لیے وہ اپنی پوزیشن کے بارے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ جاپانی حملے کے خلاف مزاحمت کرنے کے لیے لوگوں کو منتظم کیا جائے۔ وہ پوری طرح اس کے قائل تھے کہ اس موقعے پر کسی قسم کی غیر متشدد تحریک کو شروع کرنا بہت ہی غلط ہوگا۔

گاندھی جی کے پیرو اپنے لیڈر کی ہدایتوں پر آنکھ بند کر کے کاربند ہوتے تھے اور گاندھی جی خالص عدم تشدد کے بارے میں ہی سوچ بچار کرتے تھے۔ لیکن کانگریسی لیڈروں میں سی راج گوپال آچاریہ تھے جو مسلم لیگ کے مطالبے کی اور صوبہ جاتی حکومتوں جو اکتوبر/نومبر 39ء میں ختم ہوگئی تھیں کی بحالی کی پرزور وکالت کرتے تھے۔

الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں جو 19 / اپریل 42ء سے یکم مئی

42ء تک ہوا مختلف نقطہ ہائے نظر زور دیا گیا۔ اس نے کانگریس کمیٹی کے اس ریزولوشن کی توثیق کی جس نے برطانوی جنگی کابینہ کی طرف کے اعلان کو جو کرپس لائے تھے، مسترد کر دیا تھا۔ اس نے مندرجہ ذیل تجویز پاس کی:

کمیٹی کو پوری توقع ہے کہ ہندوستانی عوام مکمل غیر مشروط عدم تعاون کریں گے اور ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کریں گے لیکن جن مقامات پر برطانوی اور حملہ آور فوجیں نبرد آزما ہیں وہاں ہمارا عدم تعاون بے سود اور غیر ضروری ہوگا۔ برطانوی فوجوں کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم حملہ آوروں سے مکمل عدم تعاون کر رہے ہیں۔

اس بحث کے دوران یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا کہ جاپان کے نہ ٹلنے والے حملے کی صورت میں ہندوستان کا کیا فرض ہوگا۔ کچھ ممبران نے اس کی وکالت کی کہ مساعی جنگ میں اتحادیوں سے پورا تعاون کیا جائے بشرطیکہ ہندوستان کو آزادی ساجھے دار کی حیثیت سے حاصل ہو۔ گاندھی جی کے زبردست مقلدین یا پیروان کے خلاف تھے جو مسلح مزاحمت کرنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی نے اس جلسے میں خود شرکت نہیں کی لیکن انھوں نے ایک تجویز کا مسودہ اپنے نوٹس اور حواشی کے ساتھ بھیجا۔ ان نوٹس میں انھوں نے یہ لکھا کہ برطانیہ نے ہندوستان کی قصداً یا محض طاقت کے زور پر سامراج کا حلیف بنا دیا۔ اس لیے برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے لیے جنگ کرنے کا کوئی جواز نہیں اور ہندوستان میں اتحادی فوجوں کی موجودگی کے لیے ایک معاہدہ کیا جائے۔ برطانوی تسلط کے باقاعدہ اور پرامن طور پر ہٹ جانے سے ہندوستان کو طوائف الملوکی سے بچایا جا سکتا تھا اور مختلف گروپوں میں اتحاد اور باہمی یگانگت کو پیدا کیا جا سکتا تھا۔ تسلط کے ہٹائے جانے

کا یہ مطلب میں نہیں کہ ہندوستان سے ہر انگریز چلا جائے جب کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر طرف سارے ملک میں اتحاد کا دور دورہ ہو جائے۔

اس ریزولوشن میں یہ بھی کیا گیا کہ جاپانیوں کے ساتھ مکمل غیر متشددانہ عدم تعاون کیا جائے اور ان کو کسی قسم کی مدد نہ دی جائے۔ اگر چہ کمیٹی نے گاندھی جی کے تیار کردہ مسودہ کو منظور نہیں کیا لیکن غیر متشددانہ عدم تعاون کے اصول کو حملہ آوروں کی مزاحمت کے لیے منظور کیا گیا۔

راج گوپال آچاریہ کے ریزولوشن کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کی مسلمہ پالیسی کے خلاف ٹھہرایا۔ چونکہ وہ اس ریزولوشن کو واپس لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا۔ انھوں نے حسب ذیل ریزولوشن پیش کیا:

'آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا خیال ہے کہ ایسے نازک موقعہ پر قومی حکومت کی تشکیل محض ہندوستان کے اتحاد کے بارے میں بحث جاری رکھنا ہے جس کا سودمند ہونا مشتبہ ہے، غیر دانشمندانہ پالیسی ہے اور یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کم سے کم نقصان والی چیز کو اختیار کیا جائے۔ اس لیے مسلم لیگ کے علیحدگی کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا جائے۔ اگر چہ ہندوستان کے دستور کے مرتب کرنے کے وقت وہ اس پر اصرار کرے تو اس طرح اس باب میں تمام شکوک اور شبہات کو دور کیا جائے اور کانگریس مسلم لیگ کو مدعو کرتی ہے کہ وہ موجودہ ہنگامی صورتحال کے پیش نظر قومی حکومت کے قیام کے سمجھوتہ کے بارے میں صلاح و مشورے کرے۔'

راج گوپال آچاریہ برطانوی کابینہ کے اعلان کے مطالبے سے اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ برطانوی حکومت پاکستان کے بارے میں مسلم لیگ کے مطالبے کو منظور کر لے گی اور اس لیے اب اس کی مخالفت کرنا قطعی غیر حقیقت پسندانہ ہے جب

کہ کانگریس حق خودارادیت کو اس طرح سے تسلیم کرچکی تھی کہ علاقوں یا وحدتوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ یونین میں نہ شامل ہوں۔ منطق پورے طور سے مدراس کے اس لیڈر کے ساتھ تھی لیکن ہندوستان کی تقسیم کے خلاف ہندوستانی رائے عامہ اتنی سخت تھی کہ کانگریس نوشتہ دیوار کو نہ پڑھ سکی۔

اور ایک مختلف فیصلہ اس المیہ کو روک سکتا تھا جو آئندہ بڑے زبردست کشت وخون اور غارت گری کی صورت میں اور نہ ختم ہونے والی دشمنی کی صورت میں رونما ہوا۔ بدقسمتی سے کمیٹی نے جنگ کا ریزولوشن بڑی اکثریت سے پاس کیا جس میں کہا گیا کہ کوئی ایسی تجویز جس کی رو سے کسی صوبے کو ہندوستان سے الگ ہونے کا حق آزادی حاصل ہوتا ہے ہندوستانی مفاد کے خلاف ہے اور اس لیے ناقابل قبول ہے۔

کرپس مشن کی ناکامی سے گاندھی جی میں بڑے اعلیٰ قسم کا اخلاقی بحران یا کش مکش پیدا ہوئی۔ ان کے نزدیک یہ عالمی جنگ زبردست اخلاقی تصادم تھی۔ ایک طرف آزادی اور جمہوریت تھی جس کے لیے ایک فریق جنگ لڑ رہا تھا اور دوسری طرف وہ فریق تھا جو غلامی اور ڈکٹیٹر شپ کا علمبردار تھا۔ وہ برطانوی قوم کو بحیثیت عموی آزادی سے محبت کرنے والی قوم سمجھتے تھے۔ اس کے بارے میں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اعلیٰ قوموں کی اپیل کو وہ قبول کرتی تھی۔ کرپس نے ان کی تمام معلومات کو پاش پاش کردیا اور ان کی تمام توقعات کو غلط ٹھہرایا۔ دوسری طرف عام ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی حکومت کے بارے میں سخت بے اعتمادی تھی اور دشمنی کے جذبات موجزن تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ برطانیہ کو منافقت یا دوغلے پن کے داغ سے بچانے اور ہندوستانی عوام کی عزت، خوداعتمادی، یکجہتی کو بحال کرنے اور برطانیہ کے خلاف دشمنی کی جگہ خیرسگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔

سوموار کو اپنی خامشی کے دن اس مسئلہ کا حل انھیں ملا۔ انھوں نے ہوریس

الیکزنڈر کے خط میں یہ لکھا کہ یہ بحران اس وجہ سے تھا کہ دنیا کو برطانیہ چمکتا دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن دراصل وہ سامراج کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ اگر وہ اس جال کو توڑ دے اور اپنی شخصیت کو آزادی کے نقیب اور جمہوریت کے لیڈر کی حیثیت پیش کرے تو اصلیت اور ظاہری شکل میں جو تضاد نظر آتا ہے ختم ہوجائے گا۔ ہندوستان کی خیر سگالی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کے دشمنوں کی اخلاقی اور عملی شکست کی گارنٹی دی جاسکتی ہے۔ میرا پختہ خیال ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو ایک منضبط انداز میں چھوڑ دے اور اسے وہ خطرہ مول نہ لینا چاہئے جو اس نے سنگاپور، ملایا اور برما میں لیا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ عالی ہمتی کا ثبوت دے گا اور ہر ہندوستانی برطانیہ کے رویے کو انسانی قدروں کے اعتراف اور نیک نیتی پر محمول کرے گا۔

26 / اپریل کو انھوں نے ہریجن کے ایک مضمون میں یہ سب دوہرایا کہ ہندوستان کے اصل تحفظ کے لیے اور خود برطانیہ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ برطانیہ ہندوستان سے بروقت اور باقاعدہ انداز سے دست بردار ہوجائے۔ جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا الہ آباد میں 29 / اپریل سے 2 / مئی تک اجلاس ہوا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ برطانیہ سے ہندوستان چھوڑنے یا ہندوستان خالی کرنے کا مطالبہ کریں اور جاپانیوں کی مزاحمت مکمل غیر متشددانہ عدم تعاون سے کریں۔

اس مشورے کو کمیٹی کے قبول کرنے سے قدرتاً گاندھی جی کے شانوں پر کانگریس کی قیادت کرنے کی ذمہ داری آپڑی۔ انھوں نے کہا کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنی ساری طاقت اس زبردست کام کے کرنے میں لگا دینی چاہئے۔ 'ہندوستان چھوڑو' کے سارے مضمرات کے تشریح اور پروگرام کی وضاحت کرنے کے لیے اور سوالوں کا جواب دینے کے لئے انھوں نے ہریجن اخبار کے کالم وقف کردیے۔

انھوں نے جاپانی حملے کے بارے میں تفصیل سے بحث کی۔ اس بارے میں

صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ انگریز ہندوستان خالی کردیں اور جاپان کے پاس ہندوستان پر حملہ کرنے کا کوئی بہانہ نہ ہو کیونکہ ان کی دشمنی برطانوی شہنشاہیت سے تھی نہ کہ ہندوستان سے۔ لیکن اگر ہندوستان چھوڑنے کی جگہ وہ ہندستان کو فتح کرنا چاہیں اور اسے اپنا محکوم بنانا چاہیں تو پھر انھیں معلوم ہونا چاہئے زبردست مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

انھوں نے اس خیال کی بڑے شدومد سے تردید کی کہ ہندوستان کو جاپان کی مدد سے آزاد کرایا جائے۔ وہ ہندستان کے بارے میں، اس کے منصوبوں کے بارے میں ٹھنڈے دل سے نہیں سوچ سکتے کیونکہ اگر وہ نیک نیت ہوتے تو چین نے کیا کیا تھا جو انھوں نے چین کو ایسا تاخت وتاراج کیا۔

برطانیہ سے ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ برطانیہ ہندوستان کے خلاف ہمیشہ برسرپیکار رہا اور اس پر اس نے اپنا قبضہ محض فتوحات کی وجہ سے کیا اور یہ قبضہ فوجوں کی مدد سے قائم رکھا۔ ہندوستان کو برطانیہ کی زبردستی سے جنگ میں حصہ لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں کہ برطانیہ ہندستان کی حکومت کو کس کے حوالے کرے، انھوں نے کہا کہ میری تجویز کے مطابق انھیں ہندوستان کو خدا کے حوالے کردینا چاہئے۔ یا موجودہ بول چال میں طوائف الملوکی کے حوالہ کردینا چاہئے۔ اس طوائف الملوکی کی وجہ سے کچھ عرصہ تک تباہ کن خانہ جنگی رہے گی، بلا کسی روک ٹوک ڈکیتیاں پڑیں گی اور پھر اس کے بعد اصلی ہندوستان جو آج ہم دیکھ رہے ہیں ابھرے گا۔ طوائف الملوکی ہر لحاظ سے غلامی سے بہتر ہے۔ طوائف الملوکی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان پہلے ہی سے منظّم طوائف الملوکی میں رہا ہے، اس لیے کہ برطانوی دور حکومت میں لوگوں کے فلاح وبہبود کو ترقی نہیں دے گئی۔ اب اگر اس منظّم طوائف الملوکی کی جگہ لاقانونیت لے لیتی

ہے تو ہندوستان آزادی کے حصول کے لیے یہ خطرہ مول لینا گوارہ کرسکتا ہے۔

اگر چہ انھیں برطانیہ کے ساتھ ہمدردی نہ تھی پھر بھی ان کا خیال تھا کہ اسے شکست نہ ہوگی لیکن ان کا قیاس تھا کہ جنگ میں کسی بھی فریق کو فیصلہ کن فتح نہ ہوگی۔ ان کو پختہ یقین تھا کہ خواہ برطانیہ جیتے یا ہارے شہنشاہیت ختم ہو جائے گی۔ وہ آزادی کے زبردست پرستار تھے اور انھیں اس سے ذرہ برابر بھی سروکار نہ تھا کہ ہندستان کے لیے بدلے ہوئے یا نئے آقا کون ہوں۔ انھوں نے لوئی فشر کو بتایا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ امریکہ یا برطانیہ اور دوسرے ملک ہندوستان میں اپنی فوجیں رکھیں گے اور ہندوستانی علاقوں کو جنگی اڈوں کے طور پر استعمال کریں گے مثلاً یہ ریلوے کو فوج کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کریں گے۔

برطانیہ کا ہندوستان کی آزادی کے بارے میں ذرہ برابر بھی اعتقاد یا یقین نہ تھا اور نہ وہ اس کے لیے کسی دلیل سے قائل ہوتا تھا۔ انھیں بتادینے کے لیے کہ قومی حکومت کی تجویز انصاف کے مطابق ہے اور یہ قطعی قابل عمل ہے اس لئے ہم اسے اب شروع کریں گے۔ یہ جدوجہد بلاشبہ غیر متشدد ہوگی۔ مثلاً یہ ٹیکس کی عدم ادائیگی کی صورت میں ہوگی یا نمک بنانے کے ذریعہ ہوگی یا زمین پر قبضہ کرنے کی صورت میں ہوگی۔

اس پر فشر (Fisher) نے کہا اس صورت میں متشدد و مزاحمت ہوگی۔ اس پر گاندھی جی نے کہا ممکن ہے کہ افراتفری کے 15 دن ہوں لیکن اس کے بعد میرا خیال ہے ہم حالات پر قابو پالیں گے۔ فشر سے گفتگو کے بعد گاندھی جی نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا: ''میرے نزدیک ایک چیز اور صرف ایک چیز ٹھوس اور یقینی ہے جو ایک مستحکم قوم کی غیر فطری سپردگی ہے جس نے اتحادیوں کی فتح کو یقینی بنایا ہے۔ اتحادیوں کے پاس اخلاقی جواز کی کمی ہے۔ ان کو کسی طرح انسانی آزادی کی بات

کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ اس طرح کی دوسری باتیں کہنے کا حق ہے تاوقتیکہ وہ آلودگی اور کثافت سے پوری طرح اپنے ہاتھوں کو صاف کر کے علیحدہ نہ ہو جائیں۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا کیا وہ نئے نظام کے لیے لڑیں گے۔''

ہریجن کے ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے اس کی صراحت کی کہ ہندوستان سے انگریزوں کے دست بردار ہونے کی تجویز کے بارے میں کسی قسم کی گفت وشنید کی گنجائش نہیں ہے۔ یا تو اسے منظور کیا جائے یا نا منظور کیا جائے۔ اگر اسے منظور کیا جاتا ہے تو پورا منظر بدل جائے گا۔ تب بہت سے معاملات پر غور کیا جائے گا مثلاً یہ دست برداری یا ہندوستان چھوڑنا جنگ کے بعد فوری ہو یا دیر سے، ہندوستان اور برطانیہ کے آئندہ تعلقات کے بارے، عوامی حکومت کے قیام کے بارے میں اور نظم ونسق میں پارٹیوں اور فرقوں کے حصے کے بارے میں۔ امریکن جرنلسٹ نے سوال کیا کہ اگر انھوں نے صحیح بات نہ کی تو پھر ان کی اگلی تحریک کیا ہوگی؟ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ ایسی تحریک ہوگی جس کے اثرات ساری دنیا محسوس کرے گی۔ یہ برطانوی فوجوں کی نقل وحرکت میں رکاوٹ نہ ڈالے گی تاکہ ساری برطانوی قوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے۔ میں خالص آزادی چاہتا ہوں اگر فوجی سرگرمیوں یا ان کی نقل وحرکت کے سخت شکنجے کو مضبوط کیا گیا تو میں اس کی مزاحمت کروں گا۔

اپنی عام صاف گوئی کے مطابق گاندھی جی نے اپنی سلیس تشریح سے موجودہ صورت حال پر اپنے خیالات پیش کیے اور منصوبے پر سوچ بچار کیا۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ حکومت اپنے روایتی انداز سے اختلافی مسئلوں کو نظر انداز کرنے اور کوتاہ نظری کے باعث آئندہ اچھے اور مستقل مفاد جس کے قائم رکھنے کی فوری ضرورت تھی قربان کرنے اور کانگریس کی کسی بھی تحریک کو جو کانگریس شروع کرے کچلنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کانگریس ایوان پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کرپس اور ایمرے اور دوسروں کی

اشتعال انگیز اور سرتا سر جھوٹی تقریروں کا موزوں جواب دینے کے لیے بیقرار اور بیتاب تھی ۔ اب جبکہ حکومت نے کانگریس کے منصوبوں کو ناکام بنانے اور اس کی سرگرمیوں کو خواہ وہ کتنی ہی غیر تشددانہ کیوں نہ ہوں کچلنے کے لیے راستہ صاف کر چکی تھی، اس لیے اب کانگریس کو بھی اپنا فیصلہ کرنا تھا۔

لیکن غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے گاندھی جی نے چیانگ کائی شک اور روز ویلٹ کو خط لکھے جن میں انھوں نے فوری آزادی کے مطالبے کی تشریح کی اور ساتھ ہی اس کی یقین دہانی بھی کہ جاپانیوں سے لڑنے کے لئے اتحادی فوجوں کو ہندوستان میں رہنا چاہئے ۔ انھوں نے ان کو بتایا کہ ان کا اتحادیوں کی مساعی جنگ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنے یا انھیں پریشان کرنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں ہے بلکہ اگر ہندوستان آزاد ہو جاتا ہے تو وہ اتحادیوں کا سچا، اصلی اور بہت طاقتور حلیف ہوگا اور اس طرح سے متحدہ قوموں کی فتح یقینی ہو جائے گی۔

جب صورتحال گاندھی جی کے بیانات اور حکومت کی دھمکیوں سے بہت زیادہ کشیدہ ہوگئی تھی تو 6 ر جولائی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ سب ہی ممبروں نے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کیا اور برطانوی حکومت کے سرتاسر غیر منصفانہ پالیسوں کے خلاف شدید غم اور غصہ کا اظہار کیا اپنی اس بے چینی پر کہ وہ ہونے والے حملے کے خلاف پوری طرح مزاحمت کرنے کی تنظیم نہیں کر سکتے اور نہ اپنے ہم وطنوں کا حوصلہ بلند کر سکتے ہیں۔ وہ ان تمام مسئلوں کی وجہ سے اندرونی کش مکش کا بھی شکار تھے۔

آزادی کی زبردست خواہش اور ہندوستانی عوام کے بارے میں گہری تشویش اور اس کے ساتھ برطانوی حکومت کی شدید مخالفت نے ان کے مزاج کو برہم کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے یہ محسوس کیا کہ ان کے سینہ میں آگ لگی ہوئی ہے اور

اس کے شعلے دوسرے ممبروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ ان حالات میں کمیٹی کا جلسہ ہوا اور یہ کئی دن تک جاری رہا۔ صورتحال پر غور و خوض ہوتا رہا۔ مرض پر بھی اور اس کے علاج پر بھی۔

14 رجولائی کو بحث و مباحثہ ختم ہو گیا اور فیصلہ کن ریزولوشن کی منظوری دے دی گئی۔ اس میں کانگریس کی ان کوششوں کا خلاصہ دیا گیا جو اس نے برطانوی حکمرانوں کو ہندستان کو آزادی دیئے جانے کے تعلق سے قائل کرنے کے بارے میں کی تھیں۔ یہ آزادی نہ صرف ہندوستان کے مفاد میں تھی بلکہ یہ سارے عالم کی حفاظت یا تحفظ کے لیے تھی جو فسطائیت، جنگ جوئیت، ہر قسم کے سامراج اور ایک قوم کے دوسری قوم پر فوج کشی یا حملے کرنے کو ختم کر دے گی۔ اس میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لئے جس کے لیے ضروری تھا کہ بیرونی اقتدار ختم ہو کانگریس نے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسے بھی دہرایا گیا کہ کانگریس مکمل طور پر اتحادی طاقتوں کو مساعی جنگ میں کسی قسم کی پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتی یعنی ان میں کسی طرح کی رکاوٹ اور نہ وہ کسی طرح ہندوستان پر کسی حملے کی ہمت افزائی کرنا چاہتی تھی۔

اس نے برطانیہ سے اپیل کی کہ وہ ہندستان میں اپنی حکومت خوشدلی سے ختم کر دے تا کہ عارضی حکومت قائم ہو سکے جو متحدہ قوموں کے ساتھ حملے کی مزاحمت کرنے میں تعاون کرے گی لیکن اگر یہ اپیل ناکام ہوتی ہے تو کانگریس کو اس صورت حال کے جاری رہنے پر بڑی گہری تشویش ہے، بہت اندیشے ہیں۔ اس وجہ سے کانگریس بڑے پس و پیش کے ساتھ مجبور ہو گی کہ وہ عدم تشدد کی اس ڈھال کو استعمال کرے جو اس کو 1920ء سے طاقت دیتی آ رہی ہے۔

یہ تحریک بڑے پیمانے پر گاندھی جی کی قیادت میں ہوگی۔

3-تحریک کو کچلنے کا حکومت کا منصوبہ

14 رجولائی کو جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حکومت سے اپیل کی اور مطلع کیا کہ اس اپیل کی نامنظوری کی صورت میں اس کے پاس کوئی راستہ اس کے سوانہیں کہ وہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کرے۔ 7 راگست کو جس دن کانگریس کمیٹی کی میٹنگ رکھی گئی تھی بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ کانگریس کی اپیل کے جواب میں حکومت کا جواب غیر منصفانہ تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جب تک جنگ جاری رہتی ہے کسی بھی قسم کی کوئی دستوری تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اس نے اس کا عزم مصمم کرلیا تھا کہ کسی بھی سیاسی تحریک کو جو جنگ کی طرف سے توجہ ہٹا سکے نہ چلنے دیا جائے گا۔

حکومت نے کانگریس کے مطالبوں کو دشمن کے ہندستان پر حملہ آور ہونے یا اسے ہندستان سے مذاکرات کے لیے دعوت دینے پر محمول کیا۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کے اخلاقی جواز سے انکار کیا۔ حکومت نے گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی تنظیم کو حکومت کا دشمن قرار دیا اور اس لیے اسے کسی بھی توجہ کا مستحق قرار نہیں دیا۔ اس نے دو سال کی مدت تک کانگریس کو کچلنے کا انتظار کیا تھا۔ اب بہت دنوں کے بعد اسے یہ موقعہ حاصل ہوا۔ اس نے کانگریس تحریک کو بڑی تیزی اور مکمل طور سے کچلنے کا منصوبہ تیار کرنا شروع کیا۔

حکومت نے اپنے اس عزم میں شدید اقدامات کئے۔ اسے گاندھی جی کی تحریروں سے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی (اپریل رمئی)1942ء اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے 14 رجولائی کے ریزولوشنوں سے بڑا خطرہ لاحق ہوا۔ اس کے اندیشوں کو مزید تصدیق لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اور اس شک میں اضافہ ہونے سے ہوئی کہ برطانیہ میں ہندوستان کو بچانے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ بیرونی ممالک میں اس کا پروپیگنڈہ اتنا کامیاب نہیں ہوا جتنا وہ ریاست متحدہ

ہائے امریکہ اور چین میں چاہتی تھی۔ امریکہ کی گریڈی رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ امریکن مدد کے وعدے پر ہندستان میں جنگی صنعتیں قائم کی جائیں۔ اس کے بارے میں برطانوی حکومت کے رویے سے لوگ مطمئن نہ تھے۔

لیکن حکومت محسوس کرتی تھی کہ اس کا تعلق صرف جنگ اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے سے ہے۔ اس نے صوبہ جاتی حکومتوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ رائے عامہ اور پبلک سرگرمیوں کے بارے میں پندرہ روزہ رپورٹیں ارسال کیا کریں۔ کانگریس کو کچلنے کے بارے میں حکومت کو مسٹر جناح کے اس بیان سے بڑی تقویت پہونچی:

''14 رجولائی 1942ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تازہ ترین فیصلے سے کہ وہ ایک عوامی تحریک شروع کردے گی اگر برطانوی حکومت ہندوستان سے ہٹ نہیں جاتی، مسٹر گاندھی اور ہندو کانگریس اپنی پالیسی اور پروگرام کے ذریعہ برطانوی حکومت کو بلیک میل کررہے ہیں اور اس پر مجبور کررہے ہیں کہ وہ اس قسم کا حکومتی نظام اور اقتدار اس حکومت کو منتقل کردیں جو فوری طور پر ہندو راج برطانوی سنگینوں کے سائے میں قائم کردے اور اس طرح سے مسلمانوں، دوسری اقلیتوں اور مفادات کو کانگریس راج کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔''

ساورکر اور ہندو مہاسبھا کے دوسرے لیڈروں نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کی پالیسی کی ذرہ برابر بھی تائید نہ کریں۔ سپرو، شاستری اور لبرل لیڈروں نے یہ اپیل کی کہ سول نافرمانی کی تحریک کو ترک کردیا جائے کیونکہ اس سے ملک کے مفاد کو بڑا نقصان پہنچے گا اور برطانوی حکومت کے اس دعوے کی تصدیق کی کہ ہندوستان کا بڑا حصہ اس کے فیصلے کی تائید میں ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے 14 رجولائی کے ریزولوشن کے معاً بعد حکومت ہند کے ڈائریکٹر اطلاعات پکل (Puckle) نے 17 رجولائی کو سب ہی حکومتوں کے

چیف سکریٹریوں کوایک سرکلر بھیجا جس میں کانگریس ریزولوشن کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ انھوں نے اس باب میں متعدد تجویزیں پیش کیں۔ مثلاً کارٹون اور پوسٹر چپکائے جائیں جس میں یہ نمایاں ہو کہ ہٹلر اور مسولینی اور ٹوجو میں سے ہر ایک مائیکروفون پر یہ کہہ رہے ہیں کہ میں کانگریس ریزولوشن کی حمایت میں ووٹ دے رہا ہوں۔

18 / اگست کو حکومت ہند نے ایک ریزولوشن پاس کیا جس میں کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ کانگریس غیر قانونی یا خلاف قانون خطرناک اور متشددانہ سرگرمیاں شروع کرنے والی تھی جس کا مقصد مواصلات کے نظام مفاد عامہ کی سروسز کو درہم برہم کرنا، اسٹرائکیں کرنا اور دفاعی کارروائیوں میں رخنہ اندازی کرنا اور ترقی روکنا تھا۔

اس طرح 8 / اگست تک پروپیگنڈہ اور اقدامات دونوں کے ذریعے حکومت کانگریس کے خلاف مؤثر حربے استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔ اس فضا نے کہ جب جدوجہد اور مفادات کے اندیشے، قربانی دینے اور اپنے کو وقف کرنے کا جذبہ موجزن تھا، حالات برقی دوڑا دی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس 7 / اگست 1942ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس نے 14 / جولائی کے ریزولوشن پر غور وخوض کیا اور ایک طویل ریزولوشن پاس کیا جس میں برطانوی حکومت سے ہندوستان چھوڑ و کے مطالبے کو دوہرایا گیا اور اس کے مضمرات کی تشریح کی گئی۔ اس نے عارضی حکومت کی تشکیل کی ماہیت ترکیبی اور اس کے مقاصد کے بارے میں بتلایا اور فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں بھی اور امن عالم اور آشتی کے بارے میں بھی۔ ہندوستان کی توقعات یا ارادوں کا اعلان کیا۔ تجویز کے عملی حصہ میں یہ کہا گیا ہے کہ کمیٹی ہندوستان کی آزادی کے حق کو منوانے کے لیے خالص غیر متشددانہ انداز پر عوامی جدوجہد کو بڑے وسیع پیمانے پر چلانے کی منظوری دیتی ہے تا کہ ملک غیر متشددانہ قوت کا استعمال کر سکے جو

اس نے 22 برس کی عوامی پرامن جدو جہد میں جمع کی ہے۔

کمیٹی نے گاندھی جی کو اس کمیٹی کا قائد مقرر کیا ہے لیکن اس کا بھی انتباہ دیا ہے کہ ایسا بھی وقت آسکتا ہے کہ جب کانگریس لوگوں کو ہدایتیں نہ دے سکے۔ ایسی صورت میں ہر مرد اور عورت جو اس تحریک میں حصہ لے رہا ہو اعلان کردہ ہدایتوں کی روشنی میں اپنے کو خود ذمہ دار سمجھے۔

کمیٹی نے بڑی سنجیدگی سے اس کا اعلان کیا کہ جس اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ کانگریس کر رہی ہے وہ سارے ہندستان کا ہوگا اور اس کا یہ مقصد نہیں کہ اقتدار کانگریس کو ملے۔

گاندھی جی نے اس ریزولوشن کے پیش ہونے سے پہلے اور اس کی منظوری کے بعد جو تقریر کی اس میں متعدد چیزوں پر زور دیا۔

(الف) ہندو مسلمان کے فرق کو بھول جاؤ اور اپنے کو صرف ہندستانی سمجھو۔

(ب) برطانوی قوم سے ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم برطانوی سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے دلوں سے انگریزوں کے خلاف منافرت کو دور کر دینا چاہیے۔

(ج) ستیہ گرہ میں کسی قسم کے مکر یا فریب اور جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(د) یہ محسوس کرو کہ تم آزاد ہو۔ تم کسی دوسرے پر انحصار نہیں کرتے۔

(س) کرو یا مرو۔ یعنی یا تو ہندوستان کو آزاد کراؤ یا پھر اس کوشش میں اپنی جان دیدو۔

انھوں نے اس تحریک کے بارے میں اخبار نویسوں، والیان ریاست، سرکاری ملازموں، فوجیوں، سپاہیوں اور طلباء کو ان کے فرائض کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے حکومت کو بتلایا کہ ریزولوشن کو پاس کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اصل جدو جہد فوراً

شروع ہو جائے گی۔ وہ پہلے وائسرائے سے ملیں گے اور انھیں کانگریس کے مطالبے کو منظور کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اس کے بعد ہی وہ اس تحریک کا پروگرام طے کریں گے۔

انھوں نے اعلان کیا کہ ''ان کے ضمیر کی آواز انھیں عمل کرنے کے لیے کہہ رہی ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمیں ساری دنیا کے خلاف کھڑا ہونا ہے خواہ تم کو بالکل اکیلا ہی کھڑا رہنا پڑے۔ تمھیں دنیا پر نظر ڈالنی ہے خواہ دنیا تمھیں خون آلود نظروں سے دیکھے۔ تمھیں ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ تمھیں اس چھوٹی چیز پر بھروسہ کرنا چاہئے جو تمہارے دل میں رہتی ہے۔ وہ یہ کہتی ہے کہ دوستوں، بیوی اور سب کو چھوڑ دو بلکہ اس کا ثبوت دو کہ تم جس مقصد کے لیے زندگی بسر کر رہے ہو اور اسی مقصد کے لیے مر رہے ہو۔''

ریزولوشن کے پاس ہونے سے ایک روز پہلے گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے ان ہدایتوں کا مسودہ پیش کیا جو سول نافرمانی میں حصہ لینے والوں کے لیے جاری کی جائیں گی۔

ہدایتیں یہ تھیں: ایک مقررہ دن پر 24 گھنٹے کے مون برت اور دعائیہ جلسے ساتھ ساتھ کیے جائیں۔ ہڑتال والے دن گاؤں میں جلسے کیے جائیں، جلوس نکالے جائیں اور ستیہ گرہ کے مقاصد بیان کیے جائیں۔

سول نافرمانی کی تحریک کی ابتدا نمک کے قانون سے ہوگی اور اس کو خلاف قانون طریقے سے بنانے کے لیے ہوگی۔ آراضی کے قانون کی بھی خلاف ورزی کی جائے گی۔ زمیندار علاقوں میں یعنی جہاں زمینداری نظام قائم ہے زمینداروں کو رعیت یا کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہئے یعنی تحریک میں حصہ لینا چاہئے۔ ان کو ان کا حق ادا کر دیا جائے گا لیکن ان کو گورنمنٹ کی مالگذاری نہیں دینا چاہئے اور اگر زمینداروں نے حکومت کا ساتھ دیا تو ان کو کسان لگان نہیں دیں گے۔ حکومت کی

زیادتیوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

اس سوال کے متعلق کہ اس میں کون کون سے لوگ شامل ہوں گے یہ تجویز کیا گیا کہ سارے ہندوستانی خواہ وہ کانگریس میں ہوں یا نہ ہوں مگر سارے ہندوستان کی آزادی چاہتے ہوں اور سچائی اور عدم تشدد میں اعتقاد رکھتے ہوں اس تحریک میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن وہ جدوجہد میں حصہ نہیں لیں گے جب تک ان کا حصہ لینے کا موقعہ نہیں آتا۔ لیکن مجالس قانون ساز اور میونسپل بورڈ کے ممبران اور پبلک باڈیز کو مستعفی ہو جانا چاہئے۔ تمام طالب علم جو تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہوں، جو سرکاری دفتروں میں ملازم ہوں یا سرکاری فیکٹریوں میں کام کرتے ہوں، ریلوے ملازم ہوں یا ڈاک خانے میں ملازم ہوں، وہ اس تحریک میں اس وقت تک حصہ نہیں لیں گے جب تک ان کے حصہ لینے کا موقعہ نہیں آتا۔ لیکن مجلس قانون ساز اور میونسپلٹیوں کے ممبران کو ضرور آگے آنا چاہئے اور وہ جو 16 ر سال کی عمر کے اوپر ہوں انھیں تحریک میں ضرور حصہ لینا چاہئے لیکن اس معاملہ میں کسی کو بھی مجبور نہ کیا جائے۔ اس مسودے پر دوسرے دن یعنی 9 کو بحث ہونے والی تھی اور دوسرے مسئلے بھی زیر بحث آتے لیکن یہ جلسہ نہیں ہو پایا اور اس طرح سے منظور شدہ پروگرام نہ شائع کیا جا سکا اور نہ بھیجا جا سکا۔

4- کانگریس کے خلاف حکومت کے اقدامات

حکومت کو کانگریس کے عزائم کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا اور اس نے بہت پہلے سے متوقع صورتحال سے نمٹنے کے لیے انتظامات کر لیے تھے۔ وہ اپنے پیروں کے نزدیک گھاس اگنے نہیں دینا چاہتی تھی اور نہ کانگریس کو اس کی مہلت دینا چاہتی تھی کہ تحریک کا آغاز ہوا اور وہ زور پکڑ سکے۔ جنگ میں اچنبھے میں ڈالنا، اچنبھا

پیدا کرنا، جارحانہ عمل اختیار کرنا اور حملے میں پہل کرنا، کامیابی کی بنیادی شرطیں ہیں اور حکومت جو کانگریس کو بڑی تیزی سے شکست دینے کی خواہش مند تھی اس نے اس حکمت عملی کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کیا بلکہ اس نے بڑا زبردست اور کچل دینے والا بھرپور وار کیا بغیر قانون انصاف اور اخلاق کا لحاظ کیے ہوئے۔ اگر موجودہ قانون کو ایسے صورتحال سے نمٹنے کے لیے ناکافی محسوس کیا تو اس نے آرڈری نینسوں کا سہارا لیا اور انھیں نافذ کیا۔ اگر قانونی طریقہ کار کسی قسم کی رکاوٹ بنے یا اس کے راستے میں حائل ہوئے تو دوسرے طریقے اختیار کئے گئے۔ پکل کے سرکلر کے مطابق حکومت کو اس میں کسی اخلاقی اصول کا خیال نہ تھا۔ مسئلہ سارے کا سارا مصلحت کا تھا۔

پہلا وار بھرپور طاقت اور بھرپور سرعت سے کیا گیا۔ 9/ اگست اتوار کو علی الصبح پولیس نے برلا ہاؤس پر یورش کی جہاں گاندھی جی اور ان کے رفقاء کار ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے انھیں گرفتاری کا وارنٹ دکھایا اور روانہ ہونے کے لیے تیاری کرنے کو صرف آدھ گھنٹہ کا وقت دیا۔ اپنے سکریٹری بھولا بھائی ڈیسائی، بیوی کستور با گاندھی اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ گاندھی جی کو پونہ میں آغا خاں محل میں لایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو حراست میں لے لیا گیا اور انھیں احمد نگر کے پرانے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ گرفتاریاں سارے ہندوستان میں ہوئیں اور کانگریسیوں کی ایک بڑی تعداد کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ قبل اس کے کہ تحریک شروع ہو یا اس عملی پروگرام پر عمل درآمد ہو ملکی، صوبہ جاتی، صنعتی، تحصیل یا تعلقہ اور شہری ہر سطح پر یہ تنظیم یعنی کانگریس بغیر لیڈر کے رہ گئی اور حکومت نے بڑی تیزی سے ایکشن لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے تحریک یا اس کی کارروائیوں کا نام دینا تحریک کی توہین کرنا ہے۔ یہ غیر منظم، بلاکسی تیاری کئے ہوئے اور بغیر کسی قسم کی ہدایت حاصل کیے ہوئے پریشان اور غصہ سے پاگل لوگوں کے اندھے غصہ کا اظہار تھا۔ بلاکسی قیادت یا لیڈر

شپ کے عوام ادھر ادھر لپک رہے تھے اور ان کے اوپر بہتوں کے اثرات پڑ رہے تھے یعنی دہشت پسندوں کے، انقلابیوں کے، سبھاش چندر بوس کے جو برلن جا چکے تھے۔ فارورڈ بلاک کے، جے پرکاش نارائن کی سوشلسٹ کے جو کانگریس میں ضرور تھے لیکن اہنسا اور عدم تشدد کے شدید مخالف تھے اور سماج مخالف عناصر کے جو ہنگاموں اور فساد کرنے کے موقعے کی تلاش میں تھے اور وہ قوت اور طاقت جو لوگوں اور عوام کو عدم تشدد کے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتی، اسے گورنمنٹ نے اپنی کارروائیوں سے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔

بے صبر حکومت نے ظالمانہ اور بیرحمانہ انسانی کارروائیوں کی بارش سارے ملک میں اس توقع کے ساتھ کی کہ ساری ہنگامہ آرائیاں ختم ہو جائیں گی لیکن یہ اندازہ غلط تھا سب کانگریس کمیٹیوں کو خلاف قانون قرار دینے اور ملک کے مشہور کانگریسیوں کی گرفتاری سے سارے ملک میں غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

9راگست کو گرفتاریوں کی خبر پھیلتے ہی بمبئی احمد آباد اور پونہ میں جلوس نکلنا شروع ہو گئے اور لوگ جمع ہونے لگے۔ اس قسم کی سرگرمیاں دہلی اور شمال کے دوسرے حصوں میں پہنچیں اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہڑتالیں ہوئیں، پکٹنگ ہوئی اور قانون شکنی کے واقعات ہوئے اور حکومتی اقدامات کی خلاف ورزی ہوئی۔ ان واقعات کے بارے میں حکومت کا رویہ بہت ظالمانہ اور بے رحمانہ رہا۔ عوام کو لاٹھی چارج، زدوکوب اور ٹھوکریں مارکر اور دوسرے اذیت پہونچانے والے طریقوں اور ہر قسم کی بے عزتی کرنے والی کارروائیوں سے منتشر کیا گیا۔ ان باتوں نے لوگوں کو پاگل کر دیا اور انھیں انتقام لینے اور کارروائیاں کے کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک برائیوں کا چکر شروع ہو گیا۔ متشدد وارداتیں، وحشیانہ سزائیں، اس کے جواب میں انتقامی آرڈر، توڑ پھوڑ اور زیادہ سخت تعزیری اقدامات۔

ظالم اور بے رحم حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبے نے مواصلات کے نظام کے خلاف ہر قسم کی زیادتیوں کی صورت اختیار کرلی۔ ڈاکخانے، تارگھر، ٹیلیفون اور ٹرین کی لائنیں خاص نشانہ تھے۔ حکومت، ایڈمنسٹریشن پولیس اور انتظامی عہدیداروں کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہوئی اور ان پر بے رحمانہ حملے کیے گئے۔ مقامی ایڈمنسٹریشن کو مستعفی کرنے کی غیر منظم اور غیر مربوط کوشش کی گئی اور پبلک جائداد و سامان کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ پولیس تھانوں اور ڈاک خانوں، ریلوے اسٹیشنوں اور سرکاری گوداموں کو جلانے اور لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ ریل کی پٹریوں کو اکھاڑنے، پلوں کو بموں سے اڑانے اور سڑکوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔

بہار اور اس کے جنوبی اضلاع کو مستثنیٰ کرکے بہار اور یوپی کے مشرقی اضلاع اس قسم کی لاقانونی اکائی کی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ یوپی میں بلیا کا نمبر سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ لوگوں نے جیل کو کھول دیا اور ایک قیدی نے رہنمائی کی۔

لوگوں نے ایڈمنسٹریشن پر حملہ کردیا اور رسل و رسائل کے سارے ذریعے منقطع کردئے۔ کچھ دنوں تک وہاں پنچایتی راج قائم لیا۔

بنگال میں مدناپور ضلع نے حکومت کے اختیار کو چیلنج کیا۔ قومی حکومت عوام کے نام کردی گئی۔ ضلع میں پولیس، سڑکوں وغیرہ کے بارے میں متشددانہ کارروائیاں کی گئیں۔

صوبہ جات متوسط میں چیمور اور اشٹی دو مقامات خاص طور سے متاثر ہوئے اور مدراس کے صوبے میں رینی گنٹا سے لے کر بیرواڈہ تک یعنی تقریباً ڈیڑھ سو میل تک ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں۔ بمبئی کے صوبے میں ملوں اور فیکٹریوں میں زبردست اسٹرائکیں ہوئیں اور ان کے وجہ سے بڑے ہنگامے ہوئے۔

ریلوے کے محکمے کو زبردست مالی نقصان اٹھانا پڑا اور شمالی مغربی بنگال، مشرقی

ہندوستان، مدراس اور جنوبی مرہٹہ ریلوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ان میں رخنہ اندازی ہوئی۔ ریلوں کے سامان کو تباہ کرنے کے لیے خاص تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا گیا اور اسکے لیے مخصوص ہتھیار استعمال کیے گئے۔

بے شمار مقامات پر ٹیلیفون کے کاٹے گئے اور بجلی گھروں کو تباہ و برباد کیا گیا۔ ان مقامات پر جہاں حکومتی عملہ کم تھا کو بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں آزاد حکومت قائم کر دی گئی۔ ان مقامات کو مسلح پولیس نے فوج کی مدد سے دوبارہ حاصل کر لیا۔ بنگال اور باقی ماندہ ہندوستان کا رابطہ قائم ہونے یا سلسلہ رسل و رسائل میں رخنہ پڑا۔ غم اور غصہ سے بھرے ہوئے ہجوم نے نہ صرف سرکاری عمارتوں، دفتروں اور گوداموں پر حملہ کیا بلکہ افسروں پر بھی حملہ کیا۔ بہتوں کو زخمی کیا اور کچھ کو مار بھی ڈالا۔

دوسری طرف حکومت نے جو منتقمانہ کارروائیاں پولیس اور فوج کی مدد سے کیں، وہ بھی تمام حدود کو تجاوز کر گئیں۔ اخلاق، انسانیت، قانون اور امن وامان کے نام کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ ہجوم کو لاٹھی چارج کر کے، رائفل اور کبھی کبھی مشین گنوں کے ہوائی فائروں سے منتشر کیا گیا۔ مردوں پر کوڑے برسائے گئے اور انھیں بے رحمی سے پیٹا گیا۔ کم سنوں (بچوں) کو جسمانی اذیتیں دی گئیں اور انھیں سونے نہیں دیا گیا۔ انھیں بھوکا رکھا گیا۔ ان سے گھنٹوں بلکہ دن رات جرح کی گئی اور انھیں ہر طرح سے بے عزت کیا گیا۔ عورتوں کو برہنہ کیا گیا، مارا پیٹا گیا اور ان سے زنا بالجبر کیا گیا اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ گاؤں میں بے شمار مکانوں کو مسمار کیا گیا اور بہتوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ لوگوں کو درختوں سے باندھ دیا گیا اور مارا پیٹا گیا۔ بعض وقت ان کو برہنہ کر دیا گیا اور کوڑے برسائے گئے۔ ان کو لاٹھیوں، گھونسوں اور جوتوں سے مارا پیٹا گیا۔

بہت بڑی تعداد کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ انھیں جیل میں بھی سزائیں دی گئیں

اور بڑی سختیاں کی گئیں۔ سب سے مؤثر تعزیری حربہ اجتماعی جرمانہ تھا جو بڑی سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بری طرح خوفزدہ کیا جائے اور ان کے دماغ سے حکومت کے اختیار کو چیلنج کرنے یا مقابلہ کرنے کے جذبہ کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

یہ عام انقلاب زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ یہ زور وشور صرف چند ہفتوں قائم رہا۔ اس کے بعد حکومت کا جبر وتشدد اتنا زیادہ بڑھا کہ لیڈر روپوش ہو گئے یا زیر زمیں چلے گئے لیکن بغاوت کی آگ فرو نہ ہوئی۔ اس کے بعد مہینوں تخریب کار سرگرم عمل رہے اور اپنے تباہ کن پروگرام پر عامل رہے اور ایڈمنسٹریشن کے لئے سر درد بنے رہے۔ اس قسم کی کارروائیاں کرنے والوں میں بھی عوام کے ساتھ طلباء بھی شامل رہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم ترک کردی اور اسکولوں، کالجوں سے باہر نکل آئے۔ ان کے جوش وخروش کو دبایا نہیں جاسکتا تھا۔ انھوں نے پولیس کی لاٹھیاں اور گولیوں کا سامنا کرنے میں بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے مظاہروں کے کرنے میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ آزادی کا پیغام لے کر گاؤں گاؤں گئے۔ بہت سے لائق اور قابل نوجوانوں نے اپنے شاندار کیریر کو قربان کر دیا اور اپنے والدین اور سرپرستوں کی ناراضگی مول لی اور مفلسی کی زندگی گذاری۔ لیکن وہ بڑی استقامت اور بہادری سے اس پر ڈٹے رہے جسے وہ ملک اور قوم کا مطالبہ سمجھتے تھے۔

حکومت اور لوگوں کے نقصان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس کے اعداد وشمار باقاعدگی اور منظم طریقے سے اکٹھا نہیں کئے گئے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے مطابق 31/ مارچ 1943ء تک کے ہنگاموں کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے تھے۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) حکومت کی کارروائیاں ان ہنگاموں کو ختم کرنے کے لیے

پولیس فائرنگ کتنے موقعوں پر ہوئی	=	601
ہلاک شدگان کی تعداد اندازاً	=	733
زخمیوں کی تعداد	=	1941

(ب) لوگوں کی کارروائیاں

(1) ان پولیس تھانوں کی تعداد جنھیں جلایا یا نقصان پہونچایا گیا 2087

(2) عمارتیں جن کو تباہ کیا گیا جنھیں نقصان پہنچایا گیا۔ 749

(3) پبلک عمارتیں جنھیں تباہ کیا گیا 545

(4) پرائیویٹ عمارتیں جن کو تباہ کیا گیا 273

(5) سرکاری نقصان۔ 27 لاکھ پینتیس ہزار ایک سو پچیس روپے

(6) دوسری پارٹیوں کا نقصان 30 لاکھ سات ہزار دو سو چوہتر روپے

(ج) بم پھٹنے کے واقعات 664

(2) سڑکوں پر توڑ پھوڑ اور سڑکوں کو کمزور کرنے کے واقعات 474

(د) حکومت کی کارروائیاں

(1) واقعات جہاں اجتماعی تعزیری جرمانہ عائد کیا گیا 173

(2) وصول شدہ تعزیری جرمانے کی مقدار۔ نوے لاکھ سات ہزار 382 کی رقم وصول ہوئی۔

(3) کوڑے زنی یا کوڑے مارنے کے واقعات 268

(4) گرفتاریوں کی تعداد 9836

(5) مقامی جماعتیں جنھیں معطل کیا گیا (جن کے اختیارات کو سلب کرلیا گیا)	108

(ح) ریلوے کا محکمہ

(1) ریلوے اسٹیشنوں کی تعداد جنھیں تباہ کیا گیا	382
(2) یکم اکتوبر 1942ء کے بعد ٹریک کے زبردست نقصان ہونے کے واقعات کی تعداد	411
(3) رالنگ اسٹاک کے سخت نقصان ہونے کے واقعات	268
(4) ٹرین کے پیڑی سے اترنے اور دوسرے واقعات	68
ریلوے پراپرٹی کے مالی نقصان کی تعداد/ رقم	52لاکھ

(و) ڈاکخانے اور تار گھر

(1) جن دفتروں کو تباہ کیا گیا یا سخت نقصان پہونچایا گیا	945
(2) تباہی و بربادی وسخت نقصانات کی تعداد	12285

(ز) فوجی کارروائیاں

(1) ان موقعوں کی تعداد جب فائرنگ کی گئی	68
(2) فائرنگ سے ہلاک شدگان کی تعداد	297
(3) زخمیوں کی تعداد	238
(4) ہوائی فائرنگ کے واقعات کی تعداد	5

یہ ناگزیر تھا کہ ان دہشت ناک بہ کثرت واقعات میں حکومت کے منظّم دستے، جوش اور عوامی ہسٹریا سے مغلوب غیر منظم اور بے قابو ہجوم کے مقابلے میں زیادہ

دہشت ناک اور درد ناک واقعات کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ان اچانک اور خود بخود رونما ہونے والے واقعات میں اوشامہتہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے ممبئی سے 1942ء میں چند مہینوں تک ریڈیو براڈ کاسٹنگ یعنی ریڈیو نشریے کیے۔

ریلوے پراپرٹی اور اس کے دوسرے سامان کو تباہ و برباد کرنے میں ماہرانہ ٹیکنک یا تیاری کا مظاہرہ کیا گیا اور نقل و حمل اور مواصلات کے لیے نظام کو درہم برہم کیا گیا۔ مختلف مقامات کو بالکل علیحدہ کر کے اور عوامی حکومتیں قائم کر کے دور اندیشی کا ثبوت دیا گیا تھا۔لیکن بحیثیت مجموعی ان سارے ہنگاموں جو بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے تھے میں کسی قسم کا رابطہ اور منصوبہ بندی کی بڑی کمی تھی۔ چند ہفتوں میں ہی جوش وخروش عروج پر پہونچ گیا۔اس کے بعد اس کے عام اظہار میں کمی ہوئی اور ساری سرگرمیاں زیرزمیں چلی گئیں۔خفیہ اور اکا دکا واقعات کچھ عرصے تک ہوتے رہے۔

حکومت نے سخت گیر اقدامات میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں کی جب تک اس کو اس کا یقین نہیں ہو گیا کہ سول نافرمانی کی تحریک کا احیاء نہیں ہوسکتا۔حکومت نے ان کی گرفتاری کے 21 مہینے بعد 5رمئی 1942ء کو گاندھی جی کی رہائی کے احکام صادر کئے اور اس طرح یہ باب جو اہم واقعات اور نتائج سے بھرا ہوا تھا ختم ہوا۔

5-کانگریس کے خلاف برطانوی پروپیگنڈہ

جب ہندوستان میں جبر وتشدد پوری طاقت سے جاری تھا اور ہندوستان بے رحمانہ جدوجہد کی وجہ سے سخت اذیت میں مبتلا تھا دنیا اور عالمی جنگ ایک نیا رخ اختیار کر چکی تھی۔

اگست 1942ء اور 1944ء کے درمیان میں جنگ کا پانسہ بدل چکا تھا۔روسیوں نے جرمن ٹڈی دل کو نکالنا شروع کر دیا تھا۔جنوری 1943ء میں ایک جرمن فوج

اسٹالن گراڈ میں ہتھیار ڈال چکی تھی اور روسیوں نے جارحیت کا آغاز کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے دشمن کو باہر ڈھکیل دیا تھا۔ ستمبر 1943ء میں اتحادی فوجیں اٹلی میں اتریں اور مئی 1944ء میں شمال کی طرف بڑھیں اور انھوں نے اس ملک سے جرمن فوجوں کو صاف کر دیا۔

شمالی افریقہ میں مصر کی سرحد پر جنگ کے بعد جرمنوں نے پسپا ہونا شروع کر دیا۔ مئی میں تیونس کو جرمن تسلط سے آزاد کرا لیا گیا اور جنگ کی لہر اتحادیوں کی مدافعت میں چلنے لگی لیکن اس دوران اتحادیوں/اتحادی طاقتوں کی پوزیشن بدل گئی تھی۔ اب دو دیوہیکل طاقتیں مشرق میں روس اور مغرب میں ریاستہائے متحدہ امریکہ تھیں اور ان دونوں کے مقابلے میں برطانیہ کی حیثیت بونے کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب برطانیہ عالمی امور میں پہلے کے مقابلے میں برتری اور تفوق کی پوزیشن میں نہیں رہ گیا تھا۔ اس طاقتی توازن کی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب برطانیہ اپنی سیاست میں وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا جو وہ پہلے کرتا آ رہا تھا اب اسے پچھلی اجارہ داری حاصل نہیں رہ گئی تھی اور نہ پہلے کی طرح دوسری طاقتیں اس پر اثر انداز ہو سکتی تھیں۔

برطانوی حکومت نے محسوس کیا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی خیر سگالی اور ستائش حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی اور اقدامات کو ہر طرح جائز ٹھہرایا جائے۔ کرپس مشن اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھی۔ جب 'انگریز، ہندوستان چھوڑ' کا ریزولوشن کانگریس نے منظور کیا تو اس کے لیڈروں کو گرفتار کیا گیا اور سارے ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس کے بعد ایک خوف اور دہشت کی فضا قائم ہو گئی اور حکومت کی ان تمام کارروائیوں کو حق بجانب ٹھہرانا ضروری ہو گیا۔ امداد کی وجہ سے ہندوستان میں امریکن موجود تھے۔ ہندوستان کے واقعات کا جنگ پر، اتحادی قوموں پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ امریکی صدر نے جو اس سے بخوبی واقف

تھے اس معاملے میں اپنی تشویش کا اظہار اپنے ذاتی نمائندے جانسن کو کرپس مشن کے وقت بھیج کر کیا اور اس کے بعد فلپس کو بھیجا جو دسمبر 1942ء میں آئے اور ہندوستان میں 5 مہینے رہے۔

برطانیہ نے امریکن رائے عامہ اور اس کی حکومت کی رائے کو متاثر کرنے کے لیے زبردست کوشش کی۔

امریکن پریس کو ہندوستان کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ اس لیے کہ اس کے نمائندے ہندوستان میں موجود تھے۔ اس کے ساتھ بہت سے لکھنے والے اور فاضل امریکن پبلک کو ہندوستانی واقعات کے بارے میں برابر اپنے مضامین اور تحریروں سے باخبر رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض ہندوستان کے پکے حامیوں میں سے تھے۔

ہندوستان کی حمایت میں پھیلی ہوئی رائے عامہ کے جواب میں ملک معظم کی حکومت نے اس کا مقابلہ کرنے یا اس کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ پارلیمنٹ میں وزیر نے مغالطہ آمیزی بھرا مظاہرہ کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ برطانیہ کو جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ تمام تر خلوص پر مبنی تھا اور ہندوستانی قوم پرستوں کا حکومت پر عدم اعتماد کا کوئی جواز نہیں بلکہ چونکہ وہ فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کرنے میں قطعاً ناکام رہے ہیں اس لیے وہ حکومت چلانے کی کوشش سے انکار کرتے ہیں اور سارا الزام برطانوی حکومت پر لگاتے ہیں۔

11 ستمبر کو دارالعوام کے مباحثے میں ایمرے نے اپنی ساری قوت وحمایت گاندھی جی کے خلاف صرف کی۔ ان کا ایک الزام یہ تھا کہ گاندھی جی سے متاثر ہو کر کانگریس کا میلان حکومت کے اختیار کو براہ راست چیلنج کرنے کی پالیسی کی طرف ہوا تھا کہ موجودہ حکومت کو پوری طرح مفلوج کر دیا جائے۔

انھوں نے گاندھی جی پر یہ الزام بھی لگایا کہ انھوں نے اپنی زندگی کی تلخ ترین

جدوجہد چلانے کی دھمکی دی تھی جس کے لیے وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے اور جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے لوگ غلامی کی مزاحمت کریں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کہ گاندھی جی کا عدم تشدد محض دھوکے کی ٹٹی ہے اور اس دھوئیں کے بادل کے پیچھے انقلاب اور تشدد کا سرخ چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ توڑ پھوڑ اور تخریبی کارروائیوں کے سنگین واقعات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے ایمرے نے کہا کہ یہ خاص منصوبہ بندی کے تحت کئے گئے تھے اور یہ ایک مخصوص صوبہ جاتی کمیٹی کے عین ہدایتوں کے مطابق تھے۔ ان کے نزدیک ایک مخصوص اسکیم کے تحت ان کی منصوبہ بندی کی گئی تھی اور یہ نہ صرف روزمرہ زندگی کے خلاف تھے بلکہ یہ حملے ملک کی سلامتی اور سالمیت پر حملے تھے۔

حملوں کا خاص نشانہ جنگی حکمت عملی کے حساب سے اہم علاقہ تھا جو مشرقی علاقے میں واقع تھا اور جو جاپانی حملے کی زد میں تھا اور باقی ماندہ ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے کی کانوں سے کوئلہ نکال کر اسلحہ کارخانوں کو لے جایا جاتا ہے اس لیے یہ حملے بڑے خطرے کا باعث ہے۔

8 را کتوبر کو مسٹر ایمرے نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ گاندھی جی کے آمرانہ اثرات کی وجہ سے کانگریس انقلاب کی پارٹی ہوگئی۔ ان کا اور ان کے پیروؤں کا خاص مقصد یہ تھا کہ کانگریس خاص خاص موقعوں پر تخریب کاری کرے تاکہ اتھل پتھل اور شدید گڑبڑ مچے اور اس وجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کانگریس کے مطالبوں کے آگے جھک جائے۔

وزیراعظم ونسٹن چرچل نے اپنے مخصوص دھونس جمانے والے انداز میں جو وہ ہندوستان کے بارے میں اپنی تقریر میں اختیار کرتے تھے انڈین نیشنل کانگریس کی مذمت کی اور زور دے کر کہا: ''گھنٹی، کتاب یا شمع مجھے پیچھے نہ ہٹا سکیں گی، جب سونا

چاندی مجھے آگے بڑھنے کے لیے اکساتے ہیں!''

دارالعوام میں 10 ستمبر 42ء کے سال میں چرچل نے یہ الزام لگایا کہ کانگریس کی سرگرمیوں میں جاپانی پانچویں کالم کی مدد شامل ہے۔ انھوں نے کانگریس کو بدنام کرنے اور اس کی اہمیت کی تحقیر کرنے کی ان الفاظ میں کوشش کی:

''انڈین نیشنل کانگریس اب ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی۔ یہ ہندوستان کے لوگوں کی اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ یہ ان ہندو عوام کی بھی نمائندگی نہیں کرتی جو اس پارٹی سے باہر ہیں اور اصولاً اس کے مخالف ہیں اور اپنے حقوق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ 90 ملین مسلمان ہیں۔ پچاس ملین پست اقوام یا اچھوت ہیں جیسا کہ انھیں موسوم کیا جاتا ہے جو اپنی موجودگی یا سائے سے اپنے ہندو ہم مذہبوں کو ناپاک کردیتے ہیں۔ 95 ملین والیان ریاست کی رعایا ہے جن سے ہمارے معاہدے ہیں۔ اس طرح سے سارے ہندوستان کی 390 ملین آبادی میں 235 ملین کے یہ تین بڑے گروپ ہیں۔

اس میں برطانوی ہندوستان کے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں کے ان بڑے عناصر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے جو کانگریس پارٹی کی موجودہ پالیسی کی مذمت کرتے ہیں۔'' انھوں نے مزید کہا کہ'' کانگریس پارٹی نے بہت سی باتوں میں اہنسا یعنی عدم تشدد جسے گاندھی جی نے عرصہ تک بطور ایک نظریے کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے ایک انقلابی تحریک کی صورت میں بدل دیا ہے جس کا خاص مقصد رسل و رسائل اور مواصلات کے ذرائع یعنی ریلوے، ڈاک تار کو مفلوج کرنا ہے اور عام طور سے لاقانونیت اور امن شکنی کو ہوا دینا، دکانوں کو لوٹنا، ہندوستانی پولیس پر اچانک حملے کرنا اور اسکے ساتھ وقتاً فوقتاً باغیانہ زیادتیاں کرنا ہے تاکہ جاپانی حملہ آور جو آسام اور ضلع بنگال کی مشرقی سمت تک آگئے ہیں، کی مدد کے لیے خلاف ہندوستان کی دفاعی

کارروائیوں میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔''

ہندوستان اور نیشنل کانگریس اور گاندھی جی سے دشمنی کے ساتھ اس تقریر یہ واضح کیا کہ واقعات کا جائزہ لینے میں حکومت کے انداز یا روپ جس کی بنیاد پر اس نے اپنی پالیسی قائم کی تھی اس میں معروضیت کا فقدان تھا۔ اس سے یہ بات پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ برطانوی سیاستداں ہندوستان پر حکومت کرنے کے قطعاً اہل نہ تھے۔

نائب وزیر اعظم ایٹلی نے ہملیٹ کے انداز میں فلسفیانہ طور سے یہ کہا: '' ہم ہوں یا نہ ہوں؟ یہ اصل مسئلہ ہے۔''

ہندوستان کو حکومت خود اختیاری حاصل ہونا چاہیے لیکن کس ہندوستان کو کیا واقعی ایک ہندوستان ہے؟ اور حکومت خود اختیاری کس کے لیے؟

ہندوستان اور برما کے متفرقات کی دوسری خواندگی کے موقعے پر 8/ اکتوبر کے دار العوام میں انھوں نے ہندوستان کے سیاسی امور اور لاقانونیت کے پھوٹ پڑنے کے بارے میں حکومت کی پالیسی کو واضح قرار دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تشدد کرنے کے منصوبے بنائے گئے تھے اور سول نافرمانی کے احکامات دئے گئے تھے۔ ہر وہ شخص جو تاریخ سے واقف ہے جانتا ہے جب سول نافرمانی تحریک شروع ہوتی ہے تو تشدد بھڑک اٹھتا ہے۔

کرپس پیشکش کے بارے میں انھوں نے بھی چرچل اور ایمرے کی یہ یقین دہانیاں دوہرائیں کہ یہ پیشکش ختم نہیں ہوئی۔ اس بارے میں انھوں کہا کہ اصل دقت یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں کوئی تذکرہ کرنا خوشگوار نہیں اور یہ خیال کہ ہندوستان کے اتحاد کا مسئلہ آپ طے کر دیں گے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یورپ پر یورپ کو حکمراں ہونا چاہیے۔

انھوں نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا کہ جمہوریت کا یہ مطلب نہیں کہ سارے لوگوں پر ایک گروہ کا غلبہ ہو۔ بنیادی دقت جو ہم نے ہندوستان کے مسئلوں میں پائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس سوال یا مسئلے کو دبانا مناسب نہیں۔ مسلم فرقے کی اہمیت کو گھٹانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں نے کیا کیا تو میں اس کے جواب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کا تناسب لڑنے والی فوجوں میں بہت کم ہے۔ جب مصیبتیں کھڑی کی گئیں تو مسلم قوم نے ہندوستان میں کوئی مصیبت نہیں کھڑی کی۔ تب پارلیمنٹ کے ممبروں نے چند ممبروں کو چھوڑ کر بڑی سیاسی پارٹیوں کی پیروی کی اور ان کے ہمنوائی میں پریس کے بہت بڑے حصے نے ہنگاموں کی ساری ذمہ داری گاندھی جی اور کانگریس پر ڈالی۔

انگلستان کی لیبر پارٹی نے گرفتاری کی پالیسی کی پوری تائید کی اور اپنی تجویز میں اسے بروقت اور ناگزیر احتیاطی قدم ٹھہرایا۔ ہندوستان میں حکومت نے اس نازک اور خطرناک صورتحال کا سامنا روایتی دفاعی انداز سے کیا۔

(1) اس نے حکومت کے سخت گیر اور جابرانہ انداز کو حق بجانب ٹھہرایا اور کانگریس کی مذمت کی زبردست پبلسٹی کی۔

(2) اس نے حکومت کے وفاداروں کو عہدے دے کر اور مضبوط کیا اور ان کی وفاداری کو بھی۔ اس نے حکومت سے مسلمانوں کی وفاداری کو اور یقینی بنایا اور مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کیا۔

پبلسٹی کی اس مہم کا آغاز ہوم ممبر میکسویل (Maxwell) نے 10 ستمبر کو ملک میں سیاسی صورتحال پر اظہار خیال سے کیا۔ انھوں نے رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا اور یہ کہ ان کا آغاز کیسے ہوا اور گاندھی اور کانگریس کے خلاف وہ سارے الزامات دہرائے جو پارلیمنٹ نے اور مسٹر ایمرے نے لگائے تھے۔ دراصل وزیر ہند کو سارا

مواد فراہم کر دیا گیا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے تمام واقعات، نتیجے، فیصلے یا رائیں صوبائی پولیس اور ضلع مجسٹریٹوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی تھے۔ میکسویل نے یہ رائے ظاہر کی:

'کانگریس لیڈروں کو بے گناہ قرار دینے کی کوششیں بلاشبہ کی جائیں گی اور یہ کہا جائے گا کہ جو واقعات پیش آئے وہ بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے مجوزہ عوامی تحریک کا نتیجہ نہ تھے لیکن جو تجویز انھوں نے پاس کی اس میں ایسے اجزاء تھے جس میں اس کے بعد کے رونما ہونے والے واقعات سے انھیں بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ خود کانگریسی لیڈروں کے اقوال اور توجیہات کی اس کے سوا اور کسی طرح سے تشریح یا ترجمانی نہیں کی جا سکتی کہ انھیں اس کا علم تھا جو ہونے والا تھا۔ اس کو وہ پہلے منظوری دے چکے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی پوزیشن مضبوط تھی کہ اس لیے کہ اسے مسلم فرقے کے لیڈروں کی پوری پوری حمایت حاصل تھی اور پست اقوام کے زبانی جمع خرچ کرنے والے لیڈروں اور بعض اعتدال پسند سیاستدانوں کی جن کے لیے حکومت کے خلاف ڈاریکٹ ایکشن اور سول نافرمانی کی تحریک قابل نفریں تھی۔

ان کے اس قدم کی حمایت میں صوبائی حکومتیں بھی سرگرم عمل ہوئیں۔ انھوں نے یا تو گورنروں کی تقریروں سے یا جہاں جہاں مجالس قانون ساز کام کر رہی تھیں ان میں بیان دے کر اپنا فرض نبھایا۔ اس سلسلہ میں ایک حوصلہ مندانہ قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایک پمفلٹ ''1942-43ء میں ہنگاموں کی ذمہ دار کانگریس'' کی 13 رفروری 43ء کو اشاعت ہوئی جس میں گاندھی جی اور کانگریس کے خلاف الزام لگائے گئے۔ یہ تاریخ اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس تاریخ یا اس کے آس پاس گاندھی جی نے حکومت کے کمینہ پن اور اخلاق سے گرے ہوئے ارادوں کے خلاف بطور احتجاج 3 ہفتہ کا برت رکھا تھا۔

اس پمفلٹ پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ایڈیشنل سکریٹری کا پیش لفظ یا دیباچہ تھا۔ یہ ایک جرأت مندانہ کوشش تھی جس میں گاندھی جی کی تقریروں اور تحریروں کو مسخ کر کے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولوشن کو مسخ کر کے یا ان میں تبدیلی کر کے اور ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے کچھ نتیجے اخذ کئے گئے تھے اور ان کے لفظوں اور فقروں کے دو مطلب لگائے گئے تھے۔ ان تمام لوگوں کو جنھوں نے ہنگاموں میں حصہ لیا تھا گاندھوی کانگریسی قرار دیا گیا۔ ان ہزاروں لوگوں کو جنھیں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا محض شک پر اور بلا کسی ثبوت کے باغی اور مقابلہ کرنے والا ٹھہرایا گیا۔

پمفلٹ میں یہ کہا گیا کہ کرپس مشن کی ناکامی سے کانگریس ہائی کمانڈ میں اتھل پتھل ہوئی ہے۔ کانگریس کو اندرونی انتشار سے بچانے اور اس کے اثر کو ہندوستانی عوام پر قائم رکھنے کے لیے ایک طاقتور مقصد کی ضرورت تھی۔ ''انگریزو ہندوستان خالی کرو'' سے بہتر کون سا مسئلہ ہوسکتا تھا۔ جب برطانوی حکومت ہندوستان سے دستبردار ہو جائے گی تو اس کی جگہ ایک عارضی حکومت لے لیگی جس پر کانگریس کا غلبہ ہوگا اور جسے اتحادیوں کے مقصد پر کوئی اعتماد نہیں تھا۔ اس وجہ سے یہ تحریک آزادی کے اس بہت بڑے مقصد میں رکاوٹ ڈالتی تھی جس کے لیے اتحادی لڑ رہے تھے۔

یہ تحریک جدوجہد تھی آخری دم تک لڑائی کی۔ بیرونی تسلط کو ختم کرنے کی اور سارے عوامی حربے اس تحریک کو چلانے کے لیے اختیار کیے گئے۔ عام ہڑتالیوں سے لے کر ریلوے ٹرینوں کی آمد رفت کو روکنے کے اور محاصل کی عدم ادائیگی تک اور سرکاری ملازمین اور فوج کی وفاداری کو کمزور کرنا۔ یہ تحریک غیر متشددانہ کیسے بن سکتی تھی۔ گاندھی جی اور ان کے نائبین کی گفتگو پرجوش اور گرم ہوتی تھی اور تشدد سے تعلق رکھتی تھی گویا وہ آل انڈیا پیانے پر ایک متشددانہ تحریک چلانا چاہتے تھے۔

11/اگست سے صورتحال تیزی سے بگڑ گئی۔ ہڑتال اور احتجاجی جلسوں اور اس قسم کے مظاہروں کے ساتھ ہی تشدد کے واقعات، لوٹ مار، قتل اور توڑ پھوڑ کے واقعات پھوٹ پڑے۔ یہ سب واقعات اور ہنگامے مواصلات یعنی رسل ورسائل کے وسائل کے خلاف تھے یا پولیس کے۔ یہ سارے واقعات ایک وقت اور ایک ساتھ دور تک پھیلے ہوئے علاقوں، مثلاً بمبئی، مدراس، بہار، یوپی اور صوبہ جات متوسط میں رونما ہوئے اور بہت سارے نقصانات ہوئے اور یہ بغیر سابقہ تیاریوں اور ارادے کے ممکن نہ تھے۔ کچھ عرصہ بنگال کا رابطہ باقی ماندہ ہندوستان سے بالکل قطع رہا۔ اور یہ وہ علاقہ تھا جہاں دشمن کا حملہ ہونے والا تھا۔ پوری تصویر ایسی نظر آتی تھی کہ چنیدہ اشخاص کے خلاف عوام کا احتجاج تھا۔ کہیں جا کر چھٹے ہفتے میں عوامی متشددانہ ہنگامے کم ہوئے لیکن پھر ان کا رخ دہشت گردی کی طرف ہوگیا۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور سرکاری ملازموں پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی اور صوبہ جات متوسط اور یوپی میں بم پھٹنے کے واقعات رونما ہوئے۔

9/اگست کو لیڈروں کی گرفتاری کے بعد بہت بڑے پیمانے پر پھوٹ پڑنے والے ہنگاموں کی وجہ سے بعض حلقوں میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ یہ کانگریس کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ ایک عوامی تحریک ہے جو خود بخود شروع ہوگئی ہے۔ یہ اس طرح کی بالکل نہ تھی کہ ہندوستان کے سب لوگ اس تحریک کے پیچھے نہ تھے۔ مسلمان، مندرجہ فہرست کی ذاتیں یعنی اچھوت اور مزدور اس تحریک سے بالکل الگ رہے۔ گاندھی جی بڑی شدومد سے ہفتوں سے، انگریزو ہندوستان خالی کرو، کی تجویز کو پھیلا رہے تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ان کے اس پالیسی کو منظور کر لیا تھا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس تحریک کو منظوری دیدی تھی۔

حکومت کے لیے جو معلومات جمع کی گئیں ان کے بموجب عام بغاوت اور

انفرادی جرائم کی ذمہ داری گاندھی جی اور کانگریس کی تھی۔ گاندھی جی نے اس کا گہرا مطالعہ کر کے حکومت کو جواب دیا کہ وہ اپنے بیانات کی تائید میں ثبوت پیش کرے اور نظر بندوں کے خلاف مقدمہ چلائے تاکہ وہ ان الزامات کی تردید کر سکیں اور اپنا دفاع کریں۔

حکومت کسی طرح عدالتی طریقہ اختیار کرنے پر تیار نہ تھی چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے مقدمے میں کوئی جان نہ تھی۔

6- کانگریس مخالف پارٹیوں کو یکجا کرنا

2/جولائی 42ء کو دفاع کی دوسری لائن میں ایسے اقدام اٹھائے گئے اور یہ اعلان کیا گیا کہ ملک معظم وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں نئے ممبروں کی تقرری کی منظوری دی جائے۔ اس کے کونسل کے ممبروں کی تعداد وائسرائے سمیت 12 سے 15 کر دی جائے۔

ان 14 ممبروں میں 3 سرکاری اور 11 غیر سرکاری ممبر تھے اور ان گیارہ غیر سرکاری ممبروں میں ایک یوروپین تھا۔ اقوام مندرجہ فہرست سے ایک ہریجنوں کا نمائندہ ایک سکھوں کا نمائندہ چار ہندو اور چار مسلمان شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کونسل کا ممبر کوئی کانگریسی نہیں ہوسکتا تھا۔ مسلم لیگ نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف سلطان احمد نے اس کی ممبر قبول کر لی تھی۔

جنگی کابینہ میں بھی ایک ہندوستانی ممبر مقرر کیا گیا تھا۔ اس قدم کا پہلا مثبت نتیجہ یہ تھا کہ اس کونسل نے متفقہ طور پر گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کو گرفتار کرنے اور کانگریس پارٹی پر پابندی لگانے کا متفقہ فیصلہ کیا۔ اس طرح سے حکومت نے اس کا ظہار کیا کہ بہت سے مقتدر ہندوستانی کانگریس کے پروگرام کو نقصان دہ

تصور کرتے ہیں اور حکومت کی پالیسی کو پوری طرح منظور کرتے ہیں۔

تیسری لائن کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی مخالفت کو منظم کیا جائے۔ مسلم لیگ کے معاملے کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ چاروں مسلم اکثریتی صوبوں کی حکومت مسلم لیگ سے ملحق نہ تھیں اس صورت میں مسلم لیگ کا یہ دعویٰ کہ وہ سارے مسلم فرقے کی واحد نمائندہ جماعت ہے، باطل ٹھہرتا تھا۔

مسٹر جناح نے ان صوبوں کو ایسی ترغیب دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے اقتدار یا تسلط کو تسلیم کرلیں لیکن اس کوشش میں وہ اب تک ناکام رہے تھے۔ انھوں نے لن لتھ گو سے اس کے لیے مدد کی اپیل کی جو انھیں دو طریقوں سے دی گئی۔ جنگی کابینہ نے اپنی تجویز میں مسٹر جناح کے اس مطالبے کو تسلیم کرلیا کہ مسلم صوبوں کو انڈین یونین سے الگ ہونے کا حق حاصل ہے۔ اس سے ان کے وقار اور اثر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

دوسرا طریقہ یہ ہوا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے گورنروں نے جناح کو اس طرح ممنون کیا کہ انھوں نے غیر مسلم لیگی وزارتوں کو ہٹا کر مسلم لیگ کی وزارتیں قائم کرادیں۔

بنگال میں 1937ء سے بہت تبدیلیاں ہوئیں۔ کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر فضل الحق مارچ 1943ء تک چیف منسٹر بنے رہے۔ وہ ایک صاف ستھری شخصیت کے مالک تھے لیکن ان کے متعین اصول نہ تھے اور کسی بھی پارٹی سے جو ان کی چیف منسٹری کو یقینی بنا سکتی تھی، صلح کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ان کا پہلا جرأت مندانہ قدم یہ تھا کہ انھوں نے کرشک پرجا پارٹی اور مسلم لیگ کو ملا لیا۔ اس کے بعد انھیں مسلم لیگ کے افکار سے بے اطمینانی ہوئی۔ 1941ء کے آخر میں انھوں نے اپنی حکومت بنائی جو ان کی پارٹی کے نمائندوں، ہندو مہا سبھا اور فارورڈ بلاک کے نمائندوں اور آزاد

ممبروں پر مشتمل تھی اور250 کے ایوان اسمبلی میں ان کے حامیوں کی تعداد صرف10 تھی۔ بنگال کے گورنر سر جان ہربرٹ اس مخلوط حکومت جس میں سبھاش چندر بوس کے ممبروں کی خاصی مضبوط پوزیشن تھی، کے بارے میں بڑے شک وشبہ میں تھے۔ مسلم لیگ پارٹی فضل الحق جنھوں نے مسلم لیگ کی حکم عدولی کی تھی کی وزارت کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ ان کی حکومت کو شکست دینے کی کوشش دوبار ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے بعد گورنر نے دوبارہ مداخلت کی۔ انھوں نے فضل الحق کو بلایا اور ان کے سامنے استعفیٰ دینے کا مسودہ پیش کیا اور انھیں اس پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا بصورت ان کی وزارت کو برخاست کرنے کی دھمکی دی۔ اس طرح فضل الحق کو ٹھوکر مار کر نکال دیا گیا۔ مسلم لیگ کے خواجہ ناظم الدین کو 24/اپریل 1943ء کو بنگال کا پریمیر مقرر کیا گیا۔

پنجاب میں سکندر حیات خاں نے مسٹر جناح سے معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے یونینسٹ پارٹی سرکاری یا وزارتی پارٹی تھی اور اس کے مسلمان ممبر مسلم لیگ میں شامل ہوئے لیکن وہ یونینسٹ پارٹی کی بدستور حمایت کرتے تھے۔

دسمبر1942ء میں سکندر حیات خاں کے انتقال کے بعد خضر حیات خاں پنجاب کے پریمیر یا وزیر اعلیٰ ہوئے۔ مسٹر جناح نے ان پر زور ڈالا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کی جگہ مسلم لیگ کو دیں۔ انھوں نے اس کی مزاحمت کی اور مسٹر جناح کے حکم تعمیل نہ کی۔ مسٹر جناح نے سیال کوٹ کی ایک کانفرنس میں ان کے اس فعل کی شدید مذمت کی کہ انھوں نے پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے اور یہ کہ انھوں نے ایسا طریقہ کار اختیار کیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور جس کے بارے میں کبھی کسی نے نہیں سنا۔

خضر حیات خاں نے اس کے جواب میں اپنے معاہدے پر قائم رہنے کا عزم مصمم

ظاہر کیا اور یہ یقین دہانی کی کہ میں نے مسٹر جناح کے مطالبے کو منظوری کے قابل نہیں پایا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہمارے اغراض و مقاصد یعنی مسلم عوام کے ثقافتی تحفظ اور معاشی فلاح کے بارے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا 1940ء کا ریزولوشن پنجاب کے مسلمانوں اور دوسری جگہ کے مسلمانوں کی طرح آخری سہارا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو حق خودداریت حاصل ہونا چاہیے۔

اس اعلان کے باوجود مسلم لیگ ایکشن کمیٹی نے انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ اس کے باوجود بھی ان کی وفاداری مسلم لیگ سے غیر متزلزل رہی۔ انھوں نے پاکستان کے ریزولوشن کی پرزور حمایت کی اور یہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے حصول کے لیے اپنے فرقے والوں کے ہر امکانی مدد کریں گے۔

لیکن خضر حیات خاں اپنے پہلے معاہدے سے پیچھے نہ ہٹے اور پنجاب بدستور یونینسٹ پارٹی کے زیر حکومت رہا۔ لیکن گورنر اور سرکاری افسروں نے مسلم لیگ کی حمایت کی اور پنجاب کے ایڈمنسٹریشن پر ان کا حکم چلتا رہا۔ اس طرح سے دو بڑے صوبے مسلم لیگ کو فائدے حاصل کرنے کے لئے مل گئے۔ سندھ میں اللہ بخش ایک نیشنلسٹ چیف منسٹر تھے۔ انھوں نے حکومت کی جابرانہ اور متشددانہ پالیسی کو ناپسند کیا۔ اس پر 1935ء کی دفعہ 51 کے تحت گورنر نے انھیں برخاست کر دیا اور مسلم لیگ کے غلام حسین ہدایت اللہ سے حکومت سنبھالنے کو کہا۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریسی وزارت کی استعفیٰ کے بعد گورنر نے مسلم لیگ کے اورنگ زیب خاں کو وزارت بنانے کے لیے مقرر کیا۔ آسام میں سعد اللہ ایک مسلم لیگی نے وزارت بنائی۔

اس طرح سے 5 صوبے برطانوی حکومت کی زبردست حمایت سے مسلم لیگ کے زیر نگیں آ گئے۔ اس طرح مسلم لیگ کو یہ دعویٰ پیش کرنے کا موقعہ مل گیا کہ وہ

مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ حکومت کو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس نے کانگریس کے آزادی اور یونین کے مطالبے کے اثرات کو رد کر دیا۔ حکومت نے جو لائن اختیار کی اس سے جنگ کے دوران پوری راحت محسوس ہوئی۔

7-گاندھی جی کا برت

جہاں ایک طرف حکومت ہنگاموں کو فرو کرنے میں لگی ہوئی تھی تو دوسری طرف آغا خاں کے محل میں حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے تھے۔ گاندھی جی جو اس تحریک کے سب سے بڑے اور اعلیٰ کمانڈر تھے اور ہندوستان میں اس طاقت کے سب سے بڑے نمائندے جو اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا چاہتی تھی، وائسرائے سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ ایک فریق دوسرے کو دوستانہ نصیحت کرتا، اس کو عزیز دوست کے القاب سے مخاطب کرتا اور کہتا کہ اس نے اسے تشدد اور ہنگامہ آرائی کا بھڑکانے والا کہہ کر اس کے ساتھ ناانصافی برتی ہے حالانکہ اس کا اصل مقصد برطانیہ کو ایک سامراجی طاقت کی غلط حیثیت سے نکال کر اس کی حیثیت آزادی اور جمہوریت کے زبردست علمبردار کے طور پر دوبارہ قائم کرنی تھی۔

حریف کا جواب شائستہ تھا لیکن اس میں اپنے غیر منصفانہ ہونے کی پرزور تردید کی تھی اور یہ ترغیب دی تھی کہ تحریک کی مذمت کی جائے۔

دوسرا اہم واقعہ جس نے سارے ملک کو زبردست تشویش اور اضطراب میں مبتلا کر دیا گاندھی جی کا برت تھا جو اس خط و کتابت سے متعلق تھا جس میں ان کی صداقت اور اہنسا پسندی اور ان کی دیانتداری کے بارے شک کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ وائسرائے کو اس پر قائل کرنے میں ناکام رہے۔ لن لتھ گو نے اپنے اس الزام کو کہ وہ گاندھی جی اور کانگریس کو ہنگاموں کا ذمہ دار مانتا ہے، واپس نہیں لیا۔ آزادی کی تحریک میں یہ خط

وکتابت انوکھی تھی لیکن یہ بالکل بے ثمر ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کے ارادے بالکل پاک صاف تھے اور وہ اہنسا اور سچائی میں پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے لن لتھ گو کو مطلع کیا کہ میرا یہ برت سب سے بڑی عدالت میں انصاف کے لیے جو مجھے آپ سے حاصل نہ ہوسکا، کی اپیل ہے۔ اگر اس آزمائش میں میری جان نہیں بچتی تو میں انصاف کی سب سے بڑی جگہ اپنی معصومیت میں اعتماد پختہ رکھتے ہوئے جاؤں گا۔ آئندہ نسلیں، ایک انتہائی طاقت ور حکومت کے نمائندے اور مجھ جیسے ایک معمولی انسان جس نے اپنے ملک اور انسانیت کی خدمت برت کے ذریعہ کی، کے بارے فیصلہ کریں گی۔ تزکیہ نفس کے لیے یہ برت 10 رفروری 1943 کو شروع ہوا اور 3 ر مارچ 1943ء کو ختم ہوا۔ اس کا مقصد ساری دنیا کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول کرانا تھی۔

اس برت سے ساری دنیا کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں سوائے مسلم لیگ کے ساری سیاسی پارٹیوں اور سارے فرقوں نے گورنمنٹ آف انڈیا سے اپیل کی اور انگلستان میں حکومت کو میمورنڈم بھیجے گئے کہ گاندھی جی کو بلاشرط رہا کردیا جائے۔ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل نے بطور احتجاج 17 رفروری کو استعفیٰ دیدئے۔ 19 ر فروری کو سب پارٹیوں کی کانفرنس نے گاندھی جی کی رہائی کا مطالبہ کیا اور چرچل سے مداخلت کی اپیل کی۔

ملک کے باہر ریاستہائے متحدہ امریکہ کو اس وجہ سے تشویش تھی کہ اس برت کی وجہ سے جنگ کے چلانے میں کسی قسم کی مشکلات نہ پیدا ہوں۔ روزویلٹ کے ذاتی نمائندے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کانگریس کو اس کے موقف کو بدلنے کے لیے آمادہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے انٹرویو کی اجازت مانگی جس کے لیے انکار کردیا گیا۔

حکومت نے تہیہ کرلیا تھا کہ گاندھی جی اور کانگریسی لیڈروں کو جنگ کے دوران کوئی ایسا موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ آزاد رہیں۔ کسی قسم کا دباؤ یا تحریک ان کو اس فیصلے سے نہ ہٹا سکی۔ وائسرائے، وزیر ہند اور وزیر اعظم کا یہی نپا تلا جواب تھا کہ جب تک کانگریس 'انگریزو ہندوستان چھوڑو' کے ریزولوشن کو مسترد نہیں کرتی یا سول نافرمانی کی تحریک واپس نہیں لیتی اور مساعی جنگ میں تعاون کا وعدہ نہیں کرتی حکومت کی پالیسی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

1920ء اور 1930ء کی عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک جس کی قیادت گاندھی جی نے کی تھی کے بالکل برعکس گاندھی جی اور کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف 9/ اگست 42ء کو جو ہنگامے ہوئے وہ قطعی غیر منصوبہ بند تھے اور بالکل اچانک ہوئے ان دونوں تحریکوں کا مقصد بالکل واضح تھا اور دونوں تحریکیں خالص غیر متشددانہ لائنوں پر چلیں۔

اس تحریک میں 'انگریزو ہندوستان خالی کرو' کی تحریک کے بڑھنے کے بارے میں گاندھی جی کا پختہ خیال تھا کہ اگر یہ ایک دفعہ شروع کردی گئی تو یہ پیش قدمی کی صورت اختیار کرلے گی اور مخالف پارٹیوں کی سرگرمیوں کے مطابق یہ خود اپنا راستہ اختیار کرے گی۔ اپنے اس عقیدے کے تحت اہنسا یا عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کا مطلب جبر یا زبردستی نہیں بلکہ ترغیب ہے۔ دوسروں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو بلکہ عدم تعاون کرنے والے خود تکلیفیں اٹھاتے ہیں اس لیے کہ انھیں پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ مزاحمت کرنے میں خواہ کتنی ہی زیادہ مدت لگ جائے لیکن جیت سچائی ہوتی ہے اور یہ اس کے پروگرام کا حصہ ہے کہ ان کے ذہنوں کو بدلے جو اس کے راستہ میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ دوسری پارٹی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے بلکہ وہ اخلاقی فائدہ حاصل کرلیں اور مخالف سمتوں کی اچھائی بھی۔

42ء میں گاندھی جی وائسرائے سے ملنا چاہتے تھے اور ان کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ نہ تو جاپانیوں کے ہمدرد ہیں اور نہ وہ شکست خوردہ ذہنیت کے تھے۔ وہ اتحادی طاقتوں کی فتح چاہتے تھے۔ جس کا اخلاقی طور پر پورا جواز تب ہی ہوگا جب برطانیہ غیر اخلاقی رویے کو ترک کردے ورنہ اتحادی اور محوری طاقتوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ کوئی بھی صداقت پسند دونوں میں ضمیر اور شعور کے ساتھ فرق نہ کر سکے گا۔

یہ بھی اغلب تھا کہ ان ملاقاتوں کے درمیان گاندھی جی اس تحریک کے اصل مقصد اور غرض وغایت کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اگر اس تحریک کا چلایا جانا ناگزیر ہو جیسا کہ انھوں نے 1940ء میں آزادی تقریر کو انفرادی ستیہ گرہ قرار دیا تھا۔

وہ وائسرائے سے ملنے سے پہلے 9/اگست 1942ء کو اپنے رفقاء کار سے ان سب مسئلوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ 8/اگست کے ریزولوشن کے کانگریس کے اس مطالبہ کو کہ اقتدار کی جزوی منتقلی اور مساعی جنگ میں تعاون کے نامنظور کیے جانے کی صورت میں فیصلہ کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس کا بھی اعلان کیا تھا کہ اصل تحریک شروع کرنے سے پہلے وہ اس کی کوشش کریں گے کہ وائسرائے کو اس پر راضی کریں کہ وہ مساعی جنگ میں تعاون کے بارے میں کانگریس کی شرطوں کو منظور کر لیں لیکن حکومت نے وقتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے اپنے مستقل یا آئندہ مفادات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس نے گاندھی جی کے اس انتباہ کو کہ اگر جنگ میں برطانیہ کامیاب ہو گیا تب بھی اس کی شہنشاہیت کو بڑی حقارت سے دیکھا جائے گا اور ان کے اس خدشے پر کہ ہندستان کی آزادی سے برطانیہ کی جنگ شکست میں تبدیل ہو جائے گی کوئی بیان نہ دیا۔

جنگ کے خاتمہ نے گاندھی جی کی دونوں پیشین گوئیوں کو صحیح ثابت کر دیا۔ شہنشاہیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور دنیا میں برطانیہ اپنے اثر و اقتدار سے محروم ہو گیا۔

چرچل۔ ایمرے اورلن لتھ گو کی تثلیث نے جو برطانوی شہنشاہیت کے انصرام وانتظام پر مامور تھے اپنی کوتاہ بینی اور تنگ نظری سے اپنی مملکت کے جہاز کو ایسے راستہ پر ڈال دیا جو تباہی اور بربادی کا راستہ تھا۔ انھوں نے قبل از وقت اپنے آپ کو اس پر مبارکبادی کہ انھوں نے اپنے دشمن یعنی کانگریس کو کچل کرر کھ دیا۔ انھوں نے ان ساری رکاوٹوں کو جو مساعی جنگ کے لیے خطرہ بن رہی تھیں اور پریشان کن اور کبھی قابو میں نہ آنے والے ہندوستانی مسئلے سے جنگ کے دوران سکون مل گیا ہے اور وہ پبلک میں کانگریس کی ہر دلعزیزی اور اثر کو زائل کرنے میں بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔

حکومت اس کے لیے مضطرب تھی اور چاہتی تھی کہ وہ امریکیوں کی اس گمراہ کن کوشش کو کسی طرح ٹال دے جو وہ برطانوی حکومت سے ہندوستان کے مطالبات مان لینے کے لیے کرر ہے تھے۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہندوستان میں ضروری انسانی اور مادی سامان کی فراہمی کے لیے وہ کانگریس کے مدد کی محتاج نہیں ہے اور یہ کہ کانگریس اتنی زیادہ بااثر اور مقتدر جماعت نہیں ہے جیسا کہ امریکن سمجھتے ہیں اور یہ کی وہ باآسانی اس قوم پرست تنظیم کا نام ونشان مٹا سکتے ہیں اور بلا کسی روک ٹوک کے اپنے خاص دشمنوں یعنی محوری طاقتوں سے لڑنے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

اس بارے میں حکومت کے سارے اندازے غلط نکلے اور کانگریس بجائے شکست کھانے اور بے عزت ہونے کے فتحیاب ہوئی اور اس کے وقار اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا۔ اس کا ناقابل تردید ثمرہ ملا جب کانگریسی لیڈروں کی رہائی پر زبردست شادمانی اور بے پایاں مسرت کے عام مظاہرے ہوئے، یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے کانگریس کے اہنسا کے عقیدے کو خیرباد کہہ دیا تھا، وہ بھی کانگریس کے خاص طور سے گاندھی جی کے وفادار رہے۔ ارونا آصف علی نے اپنی خفیہ کمیں گاہوں سے گاندھی جی کو

خط لکھے جن میں انھوں نے اپنی روحانی اذیت اور کرب کا اظہار کیا جو اس عظیم لیڈر کے ساتھ عقیدت اور اپنے ذاتی فیصلہ پر مبنی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہوا کہ نوجوان انقلابی اس پرانے کانگریسی لیڈر کی کتنی زیادہ عزت اور کتنا زیادہ احترام کرتے ہیں حالانکہ جدوجہد کے چلانے میں ان کے طریقوں سے انھیں شدید اختلاف تھا یہاں تک کی سرکاری ملازم جنھوں نے ہر قسم کے فائدے برطانوی حکومت سے اٹھائے تھے چاہتے تھے کہ یہ حکومت چلی جائے۔

جہاں تک ہنگاموں کے اثرات کا تعلق ہے لن لتھ گو کے خیال میں 'انگریز ہندوستان چھوڑو' کی تحریک نے برطانوی مساعی جنگ کو اس وقت مفلوج کر دیا جب ہندوستان بیرونی حملے کے زد میں تھا۔

مشرقی منطقے میں مواصلاتی نظام کے درہم برہم ہو جانے کے علاوہ اس تحریک کی وجہ سے خاکی یعنی وردی کی پیداوار بالکل رک گئی اور چمڑے کی مصنوعات میں پچاس فیصدی کی کمی واقع ہوئی۔ فوجوں پر اثر پڑا اس لیے کہ سگریٹ بنانے والی فیکٹریوں کو سگریٹ کا کاغذ جس سے وہ سگریٹ تیار کرتے تھے کی فراہمی میں رکاوٹ اس وجہ سے ہوئی کہ سگریٹ تیار کرنے والی فیکٹریوں کو نقصان ہوا تھا اور اس وجہ سے سگریٹ فوجیوں کو کم مقدار میں مل سکے۔ اسی طرح سوتی کپڑوں کو سینے والی فیکٹریاں بھی بند ہو گئیں اور فوجی کپڑوں اور وردیوں کے بننے کے لیے سوتی دھاگہ نایاب ہو گیا۔ برما کی مہم میں ان ہنگاموں کی وجہ سے جو نقصان ہوا تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بلا شبہ شروع میں مشرقی سرحدوں پر برطانوی فوج کی ہزیمت کی ایک وجہ یہ ہنگامے تھے۔ 17 / دسمبر 42ء کو لن لتھ گو نے اپنی تقریر میں کلکتہ میں مساعی جنگ میں خلل اندازی ہونے کا اعتراف کیا اور اس کا بھی کہ ان ہنگاموں کی وجہ سے فوجوں کو دوسرے راستوں سے لے جایا گیا تھا۔

8-آزادی کی جنگ میں امریکیوں کی ہمدردی

حکومت باوجود بڑی زبردست کوششوں اور بڑے خرچیلے پروپیگنڈہ کے امریکن پبلک کو گمراہ کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ رہی۔ برطانوی پروپیگنڈۂ مشرق کی سربراہ ہندوستان کے سابق وائسرائے ہیلی فاکس کی شخصیت تھی اوران کی پوری طرح مدد ہندوستانی سول سروس کے ایک لائق ترین فرد سرگرجاشنکر باجپئی نے کی۔ یہ اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے۔لیکن اس پروپیگنڈے پرامریکی علمی شخصیتوں اورنامور فاضلوں ایڈگر اسنو، پرل بک،لن یوتانگ اورلوئی فشر جیسے پائے کے جرنلسٹوں اور وینڈل ولکی کے سے مدبروں اوربعض امریکی ریاستوں کے گورنروں ،مزدور رہنماؤں یونیورسٹی کے پروفیسروں اورججوں نے توجہ نہ دی اور ہندوستان کے لیے حکومت اختیاری کی حمایت کی۔

امریکن سرکاری حلقوں میں صدر روزویلٹ سے لے کر نیچے تک برطانوی حکومت کی کانگریس سے مصالحت نہ کرنے سے اوراس باب میں اس کی ہٹ دھرمی سے خاصے مضطرب تھے۔ افسروں میں جانسن اور فلپس کا اس سلسلے میں بڑا نمایاں حصہ ہے۔ کرپس کی ہندوستان میں آمد کے موقعہ پر جانسن کی سرگرمیاں پہلے ہی بیان کی جاچکی ہیں۔ ان کے جانشین،صدر کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے امریکن سفیر ہندوستان کے بارے میں اپنی رپورٹوں کی وجہ سے ایک بڑے تلخ اورتنازع کا مرکز بن گئے تھے۔

لن لتھ گوان کے بارے میں بڑے شک وشبہے میں تھے اس لیے انھوں نے انھیں گاندھی جی سے آغاخاں پیلس میں ملنے نہیں دیا اوران کے پاس اس کی متعدد وجہیں تھیں کیونکہ دہلی پہونچنے پر دوہی ہفتے میں فلپس نے وائسرائے کو پرانے سامراجی اسکول کا نمائندہ قرار دیا اور انھوں نے برطانوی بیوروکریسی کو یہ کہہ کر لتاڑا کہ یہ کسی بھی

طرح ہندوستان کی آزادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ اپنے دوسرے خط میں انھوں نے یہ لکھا کہ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے وعدوں پر ذرہ برابر بھی کسی کو اعتبار نہیں ہے۔ 3/ مارچ کو انھوں نے جمود کو توڑنے کا یہ حل تجویز کیا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر کی طرف سے اور شاہ انگلستان کی سرپرستی میں پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے اور اس کا صدر ایک امریکن ہو۔ اس کانفرنس میں آئندہ کے لیے منصوبے پر غور کیا جائے۔ اس نے اس کانفرنس کی تجویز اس لیے پیش کی کہ اس میں وہ گارنٹی تھی جس کے ہندوستانی خواہش مند تھے۔

فلپس کی جو بھی نیت ہو برطانوی حکومت کسی قیمت پر بھی اس تجویز کو منظور نہیں کرسکتی تھی لیکن فلپس صدر پر کارروائی کرنے کے لیے زور دیتے رہے۔

ایک اور خط میں انھوں نے لکھا کہ ہندوستان فالج میں مبتلا ہے اور لوگوں کی ہر طرح سے ہمت شکنی کی جارہی ہے اور ان میں زبردست بے چینی کا احساس ہے۔ ہندوستان میں اس وقت جمود اور مایوسی کا عالم طاری ہے اور مختلف قسم کی رائیں ہیں اور زبردست بے بسی ہے۔ انگریزوں کے ساتھ نفرت بڑھتی جارہی ہے اور امریکیوں کے تعلق سے بھی مایوسی ہے۔

انھوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ جو کچھ ہو ہم پوری قوت کے ساتھ ہندوستانیوں کو احساس دلائیں کہ امریکہ ان کے ساتھ ہے اور وہ ان کی دوستی کے عام وعدوں کے آگے بھی جاسکتا ہے۔ 14/ مئی 43ء کو جب وہ امریکہ واپس گئے انھوں نے ایک خط میں صدر کی توجہ اس طرف دلائی۔

(1) اہم ترین بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ہمدرد ہندوستان ہونا چاہئے۔

(2) برطانیہ سوائے رسمی اور علامتی کارگزاری کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔

(3) ہندوستانی محسوس کرتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی چیز ایسی نہیں جس کے لیے

وہ لڑیں۔ اس لیے ان پر اتحادی قوموں کے مقاصد جنگ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(4) ہندوستان کی موجودہ فوج محض تنخواہ دار ہے ۔ جنرل اسٹیل ویل (Stilwell) نے اس صورت پر مجھ سے تشویش ظاہر کی ہے خاص کر ہندوستانی افسروں کے حوصلوں اوران کی قوتِ مقابلہ پر۔

(5) عام لوگوں کا جنگ کے بارے میں رویہ اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ قحط کے حالات کی وجہ سے زندگی کی لازمی اور ضروری اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں، اس وجہ سے اور سیاسی جمود اور بعض تحریکوں کے برابر جاری رہنے سے لوگوں میں عدم دلچسپی، بے چینی اور شدید تلخی پائی جاتی ہے۔

فلپس کے نزدیک اس انتہائی غیر اطمینان بخش صورتحال کو دور کرنے یا ختم کرنے کا ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ جنگ کے بارے میں ہندوستان کے لوگوں کا رویہ بدلا جائے اور ان کو یہ احساس دلایا جائے کہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اتحادی قوموں کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور یہ کہ ہم ان کو سب طرح کی آسانیاں دینے کو تیار ہیں اور یہ کہ دنیا کے اتحادی نقطۂ نظر میں ہندوستان کی آواز کا مؤثر حصہ ہوگا۔

کسی طرح سے یہ خط عام ہو گیا اور اس کی وجہ سے برطانیہ کے جذبات کو بڑی ٹھیس پہونچی اور اس کا امریکن گورنمنٹ سے شدید اختلاف پیدا ہوا اور اس نے اس کی تردید پر اصرار کیا۔

لیکن باوجود اس برطانوی احتجاج کے قائم مقام سکریٹری آف اسٹیٹ یعنی امریکن وزیر خارجہ نے لندن میں امریکن سفیر کے ذریعہ فلپس کو یہ لکھا کہ یہ محکمہ آپ کی رائے سے متفق ہے۔

فلپس کے خط کے بارے میں برطانوی حکومت اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کے درمیان بحث مباحثہ شروع ہوا۔ اس پر حکومت ہند کے محکمہ امور خارجہ

کے سکریٹری نے وزیر ہند کو لندن تار بھیجا جس میں فلپس کو ناپسند شخصیت قرار دیا اور یہ کہا کہ ان کی ہندوستان میں موجودگی حکومت ہند گوارہ نہ کرے گی۔ سینٹر چیٹر لیر کو یہ تار مل گیا اور انھوں نے اسے سینیٹ میں پڑھ کر سنایا اور انھوں نے امریکن ڈپلومیٹک معاملوں میں برطانوی مداخلت کی شدید مذمت کی۔ اس سے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یونائیٹڈ کنگڈم کے رویے پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ برطانیہ کی کامیابی تھی کہ اس نے امریکن حکومت کے رویے کو متاثر کیا لیکن رائے کے اس اختلاف کا عملی اثر کچھ بھی نہ تھا۔ عام یہ تاثر تھا کہ امریکن حکومت برطانیہ پر مؤثر اثر نہ ڈال سکی جو جنگ کے دوران اتحادیوں کے تعاون پر اثر انداز ہوتی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا یہ منصوبہ کہ کانگریس کی تحریک کو بڑے ہی سخت حربے سے کچل ڈالے کے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے۔ اس منصوبے نے فرض کرلیا تھا کہ حکومت اسی طرح سے اس تحریک سے نمٹے گی جیسے کہ 1930ء اور 1932ء کی تحریکوں سے نمٹی تھی۔ لیکن یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ 1942ء کی تحریک، سول نافرمانی کی تحریکوں سے بالکل مختلف تھی اس لیے بھی حکومت نے بڑے خطرے کے عالم میں تقریباً خوفزدہ ہو کر کارروائی کی۔

اسے بڑی مایوسی ہوئی اگر خوف اور دہشت میں کمی ہوئی یا عام بے چینی کو کچل دیا گیا لیکن باغی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے روپوش ہو گئے تھے اور نہ صرف سیاسی اعتبار سے بیدار طبقے بلکہ عوام اس میں شامل ہو گئے تھے بعض صنعت کاروں نے بھی ان کی مدد کی۔

حکومت کو کسی طرح بھی ہندوؤں کی طرف سے مؤثر تائید وحمایت حاصل نہ ہوئی اور نہ مسلمانوں کی طرف سے جو جناح کے حکم کے مطابق غیر جانبدار رہے۔

لن لتھ گو نے دسمبر 1942ء میں تسلیم کیا کہ یہ شورش اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس پر انتہائی نگرانی اور چوکسی رکھی جائے۔

اس جدوجہد کی طوالت اور تخریب کاری کا تسلسل دونوں بڑے ہمت شکن ثابت ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا شروع کا یہ اتحاد کہ حکومت طاقت کے ذریعے صورتحال پر قابو پالے گی دھندلا ہوگیا اور حکومت کا یہ دعویٰ کہ عوام بحیثیت مجموعی وفادار ہیں اور کانگریس کا اثر زائل ہورہا ہے احمقانہ ثابت ہوا۔ اس کے برعکس کانگریس کا یہ دعویٰ کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے کم غیر حقیقی ثابت ہوا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ افسروں کے جارحانہ حملے زبردست ردعمل کا باعث ہوئے۔ صوبہ جاتی حکومتوں نے مرکز یا مرکزی حکومت کو اس سے مطلع کیا کہ تمام طبقے حکومت سے متنفر ہوتے جارہے ہیں۔

مثلاً ہوم ڈپارمنٹ کے انڈر سکریٹری نے یہ کہا کہ حکومت کی وفاداری کا دعویٰ کرنے والے مثلاً بہار کے زمیندار اور زمینوں کے مالک محض زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ''میں اس سے بالکل بے خبر ہوں کہ کانگریس کے ہنگاموں کے دوران ان کا ریکارڈ بہ حیثیت مجموعی کس طرح قابل اعتماد رہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بڑے ہی ابن الوقت یا اچھے وقتوں کے دوست ہیں اور وہ کانگریس کے خلاف مفید حمایت نہیں دے سکتے۔''

22/ جون 1944ء کو بنگال کے گورنر نے مندرجہ ذیل خط وائسرائے کو لکھا: ''یہ امر واقعہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی اکثریت ہمارے خلاف ہے اگر چہ دہشت پسند پارٹیاں تعداد کے لحاظ سے کم ہیں لیکن اندرونی طور انھیں عام ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے جبکہ ان میں ستائش کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

یوپی کی حکومت نے بیان کیا کہ امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے جو ضروری کارروائیاں کی گئی ہیں ان کی بہت کم ہندو حمایت کرتے ہیں اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر ان حلقوں سے مدد نہیں ملی جہاں سے حمایت یا تائید ملنی چاہئے تھی۔

بمبئی کی حکومت کی رپورٹ تھی کہ یہ پولیس کا عام تجربہ ہے کہ کوئی بھی دیہاتی کسی بھی کانگریسی ورکر کے خلاف گواہی نہیں دیتا اس وجہ سے کہ یا تو وہ اس سے خوف زدہ ہے یا وہ اس کا ہمدرد ہے۔ گورنمنٹ کو اس کی توقع نہ تھی کہ یہ تحریک جلد ختم ہو جائے گی۔ عام پبلک میں تحریک کا زور ہے اور سماج دشمن عناصر کے خلاف کوئی جذبہ نہیں۔

اس عالمگیر عدم اعتماد، مخالفت اور ہنگاموں کی وجہ جسے وہ کانگریس سے منسوب کرتے تھے، موثر طریقے سے نمٹنے کے لیے بیوروکریسی کی خود اعتمادی اور اہلیت متاثر ہوئی اور یہ عام مایوسی افسری سطح پر نیچے سے اوپر تک تھی اور اس کا اظہار چرچل کے شاہ انگلستان کے سامنے اعتراف سے ہوتا ہے۔ تبدیل شدہ صورت حال نے حکم رانوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنی پالیسی میں اس مسئلہ پر نظر ثانی کریں۔

لیکن جب تک لن لتھ گو ہندوستان کے مشیر اور سارے معاملات کے انچارج تھے، کانگریس کے لیڈروں بشمول گاندھی جی کے نظر بند رہتے ہوئے جمود کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

9- گاندھی جی کی رہائی

اس طرح سے وقت گذرتا رہا۔ گاندھی جی کہ عمر تقریباً 75 سال کی تھی۔ ملیریا، خون کی کمی اور بلڈ پریشر کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ یا 5 مئی 1944ء کو انسپکٹر جنرل آف پولیس ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور انھیں ان کی رہائی کی خبر دی۔

گاندھی جی کی نظر بندی کے خاتمے نے گاندھی عہد کا خاتمہ کر دیا۔ پچھلے دو برسوں کے واقعات اور سول نافرمانی کی تحریک کی ناکامی نے آزادی کی جدوجہد میں ایک عالمی جنگ نے تشدد کا ماحول قائم کر دیا تھا اور ہندوستانی قوم پرست اس کے بہت زیادہ قائل ہو چکے تھے کہ گاندھوی طریقے پر نظر ثانی کی جائے یا وہ بدلے جائیں۔ ان

کا خیال تھا کہ عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔

صرف ایک گاندھی ہی تھے جو عام آدمی کے اخلاق کو اونچا کر سکتے تھے مگر وہ بھی ایک مختصر مدت کے لیے۔ لیکن سنگ دل قدرت ان کے جسم پر اثر کر رہی تھی اور ان کی زندگی کو غیر یقینی بنا رہی تھی۔ سبھاش چندر بوس کے سے اشخاص اس عہد کے نقیب تھے۔ جب اقدار پر مقاصد غالب آ رہے تھے اب آزادی کی تحریک کو ان راستوں پر چلانا تھا جن سے تاریخ نے واقف کرا دیا تھا اور ان خطرناک راستوں پر عام انسانی فطرت چلنے کی عادی تھی۔

1944ء کے بعد گاندھی جی ہندوستانی سیاست کے جہاز کے ناخدا نہ رہے۔ وہ نہ تو فیصلہ کرتے تھے اور نہ کوئی رائے دیتے تھے۔ وہ اب بہت بڑے، قابل عزت وتکریم، محبوب، دانا عارف ہو گئے جس سے نئے لیڈر ملاقات اور مشورہ کرتے اور ہمت افزائی چاہتے تھے اور انتباہ بھی۔ ان سے وہ اپنی مشکلات دور کرنے کے لیے مدد اور اعانت کے طالب ہوتے تھے۔ گاندھی جی اب پہلے سے کہیں زیادہ اپنی روحانیت میں مگن ہو گئے تھے۔ انھوں نے غریبوں، کچلے ہوئے لوگوں کی دست گیری کی تاہم وہ اب دہلی میں رہنا نہیں چاہتے تھے جو سیاست کا مرکز تھا اور جہاں سیاسی سرگرمیاں زور وشور سے جاری تھیں، جہاں مستقبل کے بارے میں اہم فیصلے کیے جا رہے تھے اور مستقبل بنایا جا رہا تھا۔

اب وہ بہار میں نظر آتے تھے جو فرقہ وارانہ سفاکی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور وہاں متاثرہ مسلمانوں کو تسکین دے رہے تھے یا وہ مشرقی بنگال میں نظر آتے تھے جہاں ہندو ناقابل بیان مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ وہاں وہ ظلم کرنے والوں کے غصے اور منافرت کو کم کرتے اور مظلومین کے زخموں پر مرہم رکھتے نظر آتے تھے۔

10- گاندھوی تحریک کے اثرات

لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ گاندھی جی کی تحریک نے دو بڑے نتیجے حاصل کیے۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے انگریزوں کے اس فریب کو دور کر دیا کہ ان کی شہنشاہیت کا کوئی اخلاقی جواز ہے اور کہ ہندوستانی عوام کی اکثریت شہنشاہیت کی وفادار ہے اور اس کی خواہشمند ہے کہ برطانوی حکومت برقرار رہے۔

گاندھی جی کی سول نافرمانی کی عوامی تحریکوں نے ان بنیادوں پر وار کیا اور بالآخر برٹش کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اب انھیں ہندوستان میں پسند نہیں کیا جاتا۔ ان کا یہ خیال کہ مسلمان، پست اقوام، یا ہندستانی ریاستوں کے لوگ ان کی حکومت کو پسند کرتے ہیں محض ایک مغالطہ تھا۔ اس فریب کا ثبوت خود ارباب اختیار کے بیانات سے مل جاتا ہے۔

شاہ جارج ششم کے سوانح نگار لکھتے ہیں: ''سیاسی اعتبار سے کرپس مشن ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے سلسلہ میں جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں گیا تھا، پہلا مرحلہ تھا۔ 1942ء کی بغاوت کو فرو کرتے وقت یہ دیکھا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کا وقار اور اس کی طاقت اب بھی بہت زیادہ ہے لیکن جب اس نے انھیں استعمال کرنا چاہا تو انھیں خطرے میں پایا گیا۔ ان واقعات نے یہ دکھا دیا کہ ایجی ٹیشن کرنے والوں کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ عوام کو بھڑکا دیں اور ملک کے بہت بڑے حصے میں منظم اور باقاعدہ حکومت کے لیے کام کرنا ناممکن بنا دیں۔'' انھوں نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''بادشاہ کو دراصل بہت زیادہ خطرہ محسوس ہوا کہ برطانوی پارٹی لیڈروں کے دماغوں میں ہندوستان کو اقتدار کی منتقلی کا تصور کتنا زیادہ اہم مسئلہ ہو گیا ہے۔'' اس واقعہ کا چرچل نے جولائی 1942ء میں اپنے لنچ میں بڑے زوردار طریقے سے ذکر کیا تھا۔

بادشاہ نے 28/جولائی 1942ء کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ چرچل نے مجھے یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ ان کے رفقاء کار بلکہ دونوں یا تینوں پارٹیاں پورے طور سے اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دینے کی بات کر چکے ہیں۔ کرپس یا پریس اور امریکن رائے عامہ سب نے مل کر انھیں اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ ہندوستان میں ہماری حکومت غلط ہے اور ہندوستان کے لیے یہ ہمیشہ غلط رہی۔

اس طرح وہ پبلک میں کچھ بھی کہیں لیکن چرچل اینڈ کمپنی پس وپیش کے بعد اس بات پر مجبور ہوگئی کیونکہ گاندھی جی نے اپنے عدم تشددانہ کوشش سے انھیں قائل کر دیا تھا کہ اب انھیں ہندوستان چھوڑنا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ عوام کا محتاط، غیر متشددانہ اور بڑی حد تک نفرت سے مبرا کردار جدوجہد کو آگے بڑھا رہا تھا۔ جارحیت سے انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو کسی کو فائدہ نہیں پہونچاتے۔

11- مسلم لیگ کی فتح

ہندوستانی پارٹیوں سے گفت وشنید کرنے کے لیے کرپس کے کابینہ کے پیام بری حیثیت کے تصور کو مسلمانوں نے پسند نہیں کیا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا رجحان کانگریس کے نقطہ نظر کی حمایت کرنے کا تھا اور وہ بعض مقتدر کانگریسی لیڈروں کے دوست تھے۔ جناح سے پہلی ملاقات میں انھوں نے اپنے خلاف ان کے اس تعصب کو دور کر دیا اور جب انھوں نے اپنی تجویزوں کی وضاحت کی اور یہ ظاہر کیا کہ کابینہ نے صوبوں کے الگ ہوجانے کی تصور کو منظور کر لیا ہے تو انھیں مسٹر جناح کی دوستی حاصل ہوگئی۔ جناح کی تجویز پر انھوں نے اس شرط کو کہ صوبے اپنا حق استعمال کر سکتے تھے بدل دیا۔ اس فارمولے کے مطابق اگر قانون ساز مجلس کے 60 فیصدی ممبر

شمولیت کے حق میں فیصلہ نہیں کرتے تو اقلیتیں استصواب یا (Plebisite) کا مطالبہ کرسکتی ہیں۔ یہ انتظامات مسلمانوں کی مدافعت میں تھے اور ان کے ذریعے وہ استصواب کا مطالبہ کرسکتے تھے۔

جناح کو اس کی بڑی مسرت ہوئی کہ انھیں کانگریس کے خلاف کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کابینہ کی تجویز نے کھل کر پاکستان کے مطالبے کو مان لیا تھا۔ یہ رعایت اس پالیسی کا منطقی تتمہ تھا جو برطانیہ نے 1916ء میں دیدہ دانستہ اختیار کی تھی۔ ایمرے، جو اس پالیسی کے معمار تھے، نے چرچل سے کہا کہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظات کے لیے جو عہد و پیمان کیے گئے تھے، وہ پورے ہوں گے اگر صوبوں کے لیے علیحدہ ہوجانے کے حق کو اس میں جگہ دی گئی۔ انھوں نے کہا خوش قسمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا پھیلاؤ اس طرح کا ہے کہ انھیں صوبہ جاتی بنیادوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اگر صوبوں کی اکثریت ایک دستور سے متفق ہوجائے تو ہم اسے ان صوبوں کے لیے منظور کرلیں گے لیکن اختلاف کرنے والے صوبوں کو الگ رہنے دیں گے۔ اس بارے میں وزیر ہند نے وائسرائے کو اور صاف لکھا:

''ہم نے پاکستان سے مسلمانوں کا تحفظ کرلیا ہے''۔

لیکن مارچ 1942ء میں پاکستان کے بارے میں سیاسی پوزیشن زیادہ مشتبہ تھی۔ اگرچہ یہ جناح اور مسلم لیگ کا مطالبہ تھا لیکن اسے مسلم اکثریتی صوبوں اور ملت کی سیاسی تنظیموں کی نمائندگی حاصل نہ تھی۔ پنجاب کے پریمیر سکندر حیات خاں نے وائسرائے کو لکھا کہ حال میں چند مقتدر لیڈروں سے تبادلہ خیال کیا اور انھیں میں نے اعتماد میں لیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتے کی اور ملنے کی دلی خواہش تھی۔ ان کے آپسی اختلافات بڑی حد تک کم ہوگئے اور یہ کہ بڑی کوشش سے سارے شکوک دور ہوسکتے ہیں۔

انھوں نے دوقومی نظریے یا ہندوستان کے لیے دو مملکتوں کے نظریے سے اتفاق نہیں کیا۔ پنجاب اسمبلی کے 84 مسلمان ممبروں میں سے 73 یونینسٹ تھے۔ فضل الحق مسلم لیگ کے لیے نا قابل قبول شخصیت تھے اور بنگال اسمبلی میں 250 میں مسلم لیگ کے کل 40 ووٹ تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، خان برادران کی قیادت میں کانگریس کی پالیسیوں پر کاربند تھا۔ سندھ میں پارٹی بندی کا زور تھا اور اسمبلی میں مسلم لیگ کی پارٹی بے بس اقلیت میں تھی۔ آسام میں مجلس قانون ساز میں مسلمان اقلیت میں تھے اور کسی فیصلے کو بدل نہیں سکتے تھے۔ مارچ میں 3 مسلمان وزرائے اعلیٰ یعنی فضل الحق (بنگال) ڈاکٹر خان (شمالی مغربی سرحدی صوبہ سندھ میں) اور اللہ بخش (سندھ) نے وزیر اعظم کو تار بھیجا جس میں اشد ضروری مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو فوری طور سے اصل اقتدار منتقل کر دیا جائے اور اس کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے تا کہ نمائندہ ہندوستان پورے اختیار کے ساتھ ذمہ دار حکومت دفاعی ذمہ داریوں کے ساتھ قائم کر سکے۔ ان مسلم گروہوں میں جو پاکستان کے مسئلے پر مسلم لیگ کے مخالف تھے.. جمعیۃ العلماء، احرار، شیعہ اور مومن اتحاد اور خدائی خدمت گار تھے۔ اگر چہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسٹر جناح کے بڑے پر جوش لیگی موجود تھے یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ سب بہ حیثیت مجموعی مسلم لیگی تھے۔ اگر چہ وہ اس کی حمایت میں نعرے بلند کرتے تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں برطانوی حکمرانوں کا پاکستان کا مطالبہ قبول کر لینا، محض سیاسی یا فرضی تھا جو سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت منظور کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو ایک نہ چاہے جانے والی آزاد مملکت دینا تھا بلکہ اس کا اصل مقصد کانگریس کی آزادی کے راستہ میں مزاحمت پیدا کرنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کے سامنے پاکستان کا تصور رکھنا چاہتی تھی تا کہ وہ جنگ کے دوران خاموش رہیں جس کی عکاسی حکمرانوں کے ترجمانوں اور ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ

امریکہ کے نمائندوں کے مراسلوں سے ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کو پیش کرنے کے ساتھ ویول اور ایمرے دونوں ہندوستان کے اتحاد کا راگ الاپتے رہے۔ اس کی تشریح یا وضاحت مشرقی ڈویژن کے معاملات کے انچارج کالون، ایچ، اوکس کی گفتگو سے ہوتی ہے۔ اس بات چیت میں حصہ لینے والے، کرنل جانسن، کرنل ہیرنگٹن، مسٹر مرے۔ مسٹر آلنگ، مسٹر اوکس اور مسٹر پارکر تھے۔ یہ بات چیت واشنگٹن میں 26 رجنوری 1942ء کو ہوئی تھی۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کرپس مشن کیوں ناکام ہوا اور ہندوستان کے حالات سیاسی اعتبار سے کس قسم کے تھے۔

مباحثے کے دوران کرنل جانسن اور کرنل ہیرنگٹن جو حال ہی میں ہندوستان گئے تھے نے اپنا یہ پختہ خیال ظاہر کیا کہ برطانیہ ہندوستان پر سے اپنا تسلط کھونے کے لیے تیار ہے جیسا کہ انہوں نے برما میں اپنے تسلط کو کھو دیا مگر انھیں یقین ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان ان کے پاس سابقہ صورتحال کے ساتھ واپس آجائے گا۔

ویول اس کے شدید مخالف تھے کہ ہندوستان کے شمالی مغربی حصے میں کوئی آزاد مملکت قائم ہو کیونکہ اس سے کسی بھی حملہ آور کے خلاف سرحد کی حفاظت کرنا حکومت کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ برطانوی فوج ہندوستان کے تحفظ کے لیے حسب سابق ذمہ دار رہے گی۔ اس کا بھی خطرہ لاحق تھا کہ اس مملکت کے قیام سے ایک پورا مسلم بلاک قائم ہو جائے گا۔

اس نتیجہ پر پہونچنا مشکل نہ ہوگا کہ پاکستان مسلم لیگ کی خدمات کا عوض ایک گرانقدر انعام کی صورت میں نہیں دیا جارہا تھا اور نہ جنگ میں مسلمانوں کی وفاداری اور تعاون کی وجہ سے اور نہ مسلمانوں کی مخالفت کے خطرے یا دھمکی سے نمٹنے کے لیے بلکہ وہ جنگ کے بعد سامراجی تحفظ کے لیے تھا۔

سب سے بڑا سامراجی مفاد ایشیا میں روسی خطرے کا مقابلہ کرنا تھا۔ اگر چہ جنگ میں روس بھی برطانیہ کا حلیف تھا مگر برطانیہ روس کی توسیع پسندی سے خائف تھا۔

جنگ کے آخری مرحلوں میں پتہ چل رہا تھا ئے متحدہ امریکہ کو روس کے خطرے کا اشارہ دے رہے تھے۔ روسی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک مسلم مملکت قائم کی جائے جو اٹلانٹک سے لے کر ہمالیہ کی مشرقی حد تک پھیلی مسلم مملکتوں کے خطے پر گرفت کو قائم رکھے گی اور یہ خطہ روس کو برطانیہ کے دائرہ اثر اور اختیار میں داخل ہونے سے روکے گا۔

دوسرے خیال کے مطابق اس مسئلے کا تعلق صرف ہندوستان کے تحفظ سے تھا۔ اس خیال کے حامیوں کا کہنا تھا کہ منقسم ہندوستان روسی فوج کے حملے کو کیا روک سکے گا۔ بلکہ اور کئی سالوں تک دونوں مملکتیں مل کر یا متحد ہو کر بھی کامیابی سے مزاحمت نہ کر سکیں گی اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ایک تیسری قوت کو بہتر طریقے سے مسلح کیا جائے۔ اس کو بہتر ٹریننگ دی جائے اور اس کو اس غرض کے لیے زیادہ اہل بنایا جائے۔ قدرتاً اس قوت یا طاقت کو برطانوی کمانڈ میں رہنا چاہیے تاکہ یہ دونوں مملکتوں کے قدرتی ذرائع کا استعمال کر سکے۔

سیاست دانوں میں لن لتھ گو اور ایمرے، فوجی افسروں میں ویول اس دوسرے مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹیوکر (Tuker) نے فوج کی تقسیم کے اثرات اور نتیجوں کے بارے میں لکھا:

''یہ توقع کی جاتی تھی کہ فوج کو نصف نصف دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہماری فوج کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن ہمیں ان کو بچانے کا موقعہ دیا گیا اور انھیں بعد میں دوبارہ منظم کرنے کا بھی۔ یہ ایک موقعہ اس میں تھا کہ دونوں مملکتوں کو ان کی اپنی اپنی فوج حوالہ کر دی جائے۔ تیسرا حصہ برطانوی ہندو اور مسلم کنٹرول میں

رہے گا۔ اگر ممکن ہوا تو فوج کا یہ حصہ پوری طرح سے غیر جانبدار رہے گا یعنی گورکھا برگیڈ برطانوی افسروں کے ماتحت ہو۔ اور شروع میں فوج کا تکنیکی حصہ کچھ برطانوی ہو تو مفید رہے گا۔

ہر صورت میں پاکستان کی پیشکش سے فوری طور سے اس کا انعام ملا۔ 25/ مارچ کے پہلے ہی انٹرویو میں کرپس نے جناح کی دوستی حاصل کر لی۔ کرپس نے اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ ان کے پورے رویے سے یہ صاف ہو گیا کہ ان کی ورکنگ کمیٹی نے اس اسکیم کو پہلے ہی اصولاً منظور کر لیا ہے۔ انھوں نے 14/ اپریل کو چرچل کو لکھا کہ مسلم لیگ مطمئن ہے اور وہ اس اسکیم کو اس کی اصل صورت میں قبول کرنے پر تیار ہے۔

لیکن 11/ اپریل کو یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا ہے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے بھی کانگریس کی پیروی کی اور یہ فیصلہ کیا کہ یہ تجویزیں غیر اطمینان بخش اور نا قابل قبول ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس طرح 4 صوبوں کی تشکیل کی گئی ہے ان میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے اور اس وجہ سے ان کے ہند یونین میں عدم شمولیت کے بارے میں صاف یا واضح ووٹ نہیں مل سکیں گے اور یہ کہ استصواب مساوی آبادی کی بنیاد پر ہو گا نہ کہ صرف مسلمانوں کا ہوگا جیسا کہ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کو بالواسطہ طریقہ سے تسلیم کیا گیا ہے، صاف اور واضح طریقے سے نہیں۔ یہ صرف بعد کے خیالات تھے۔ نامنظوری کی اصل وجہ یہ تھی کہ کانگریس کی رضامندی کے بغیر مسلم لیگ کی منظوری بالکل بے وقعت تھی اور اس سے مسلم لیگ کی پوزیشن بہت مضحکہ خیز ہو جاتی۔ کوپ لینڈ کا کہنا ہے کہ اس صورت میں کہ جب کانگریس نے مسودے کو نامنظور کیا تو جیسی کہ توقع تھی جناح نے بھی ایسا ہی کیا لیکن ان کا ردعمل کانگریس کے مقابلے میں کم جارحانہ تھا۔ کوپ لینڈ

کے نزدیک جہاں تک ہندستانی سیاست کا تعلق تھا کرپس مشن نے ہندوستانی پبلک کے فرقہ وارانہ مسئلے کو نہ کہ ہندوستان کے برطانیہ سے تعلقات کا سامنا کرنے پر مجبور رکھا اور یہ کہ یہ ہندوستان کا بڑا مسئلہ ہے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آیا۔ یہ غالباً صحیح تھا کہ برطانوی حکمرانوں کا ہمیشہ یہ مقصد رہا کہ وہ ہندوستان کے اتحاد کو مرکزی نقطہ بنائیں اور ہندوستان کی آزادی کو پس پشت رکھیں لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس نے مسٹر جناح کے اثر کو مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھا دیا اور اس سے ان کا تکبر نا قابل یقین ڈگری تک پہونچ گیا۔

کرپس مسٹر جناح سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے وائسرائے کو جنھوں نے 8/اگست 40ء کے اعلان پر کرپس مشن کے وقفے کے درمیان عمل درآمد کرنے سے ملتوی کر دیا تھا اب پھر ترغیب دی کہ وہ اپنی کوششوں کو دوبارہ شروع کریں۔ لن لتھ گو نے فیروز خاں نون کے ذریعے سلسلہ جنبانی کی جنھوں نے انھیں بتایا کہ جناح اپنی چالوں سے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ تعاون کے لیے تیار ہیں، لیکن وہ میدان میں آنے کے لیے رضامند نہیں ہیں کیونکہ انھیں بغیر کانگریس کے، تعاون کرنے میں خوف ہے۔ ان کو خدشہ ہے کہ مرکزی حکومت میں کانگریس کی عدم موجودگی سے ہندوؤں کے خلاف جو کارروائیاں کی جائیں گی اس پر سخت قسم کے متشدد جوابی حملے ان کے خلاف کیئے جائیں گے۔

لیکن مسٹر جناح نے بڑی ہوشیاری سے اپنا مقصد بغیر کسی قسم کی مخالفت یا سمجھوتے کے حاصل کر لیا اس لیے انھوں نے نون کو بتایا کہ وہ بڑی خوشی سے بغیر کانگریس کے حکومت میں ان شرطوں پر آنے کو تیار ہیں کہ 15 (پندرہ) ممبروں کی ایکزیکیٹو کونسل میں مسلم لیگ کے 8 ممبر ہوں اور پست اقوام اور سکھوں کے وہ نمائندے جن کے نام مسٹر جناح منظور کریں۔ اس طرح سے وہ 15 میں سے 10 ممبران یا نمائندے مسلم

لیگ کے چاہتے تھے۔

لن لتھ گو نے مسٹر جناح کے اس مہمل مطالبے کی افادیت کو محسوس کیا جس کے عملاً معنی یہ تھے کہ جناح کو کونسل کی دو تہائی اکثریت حاصل ہو جاتی۔ ان کا تبصرہ یہ تھا کہ ہم اپنے کو مسٹر جناح سے اس حد تک باندھ کر نہیں رکھ سکتے تھے کہ وہ ہمیں اس شک وشبہ میں مبتلا کر دیں اور مجھے خود بھی یہ شبہ ہے کہ اس زیادتی کی طلب کی وجہ یا تو شاید یہ ہے کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں تک اس دوڑ میں ان کے ساتھ ہیں یا وہ اپنے مطالبے کو زیادہ بڑھانا چاہتے ہیں تا کہ ہم اسے منظور نہ کریں۔ اس لیے وہ اس توقع کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ تعاون کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے بشرطیکہ اصل طاقت حوالے کی جاتی اور ان کے عدم تعاون کی ذمہ داری پورے طور سے ہم پر عائد ہوتی ہے کہ ہم نے انھیں اصل طاقت دینے یا اقتدار دینے کی استدعا کو منظور نہیں کیا۔

وائسرائے کی بات کو بے پروائی سے مسترد کر دینے کے بعد جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط کرنا شروع کر دیا اور مسلم اکثریتی صوبوں کو مسلم لیگ کے کنٹرول میں لانا شروع کیا۔ وائسرائے اگر چہ جھنجھلاہٹ میں تھے مگر ان کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ تھا کہ وہ حکومت کے بڑے اور اعلیٰ مفاد کے تحت انھیں ممنون کریں۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ گورنروں نے کس طرح غیر لیگی حکومتوں کو باہر کرنے میں مدد کی۔

سارے ہندوستان میں مسلم لیگ کی پوزیشن کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا موقعہ اس وقت مل گیا جب مئی 1942ء میں الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کرپس کی تجویزوں کو یک لخت مسترد کر دیا اور اقتدار کی فوری منتقلی کا مطالبہ دہرایا اور راجگو پال آچاریہ کے اس ریزولوشن کو کہ پاکستان کی بنیاد پر مسٹر جناح سے گفت وشنید کی جائے، ناپسند کیا نامنظور کر دیا۔

مسٹر جناح نے کانگریس کے خلاف اپنا پروپیگنڈہ اور تیز کردیا۔ انھوں نے امریکہ کی انٹرنیشنل نیوز سروس کو یہ بتایا کہ اگر برطانیہ کانگریس کی سیاسی بلیک میل کے آگے جھک گئی اور ایک ایسی قومی مملکت جس پر ہندوؤں کا غلبہ ہو منظور کیا تو فوری اور بڑی زبردست طوائف الملوکی اور گڑبڑ پھیل جائے گی۔

مئی میں گاندھی جی نے 'ہندوستان چھوڑ' مہم شروع کی اور فرقہ وارانہ الجھن کو حل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد وہ فوری اس نتیجے پر پہونچے کہ برطانیہ کی موجودگی اس ناکامی کی ذمہ دار ہے۔ مسٹر جناح نے ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کو محض مکروفریب جھوٹا یا غلط پروپیگنڈہ اور ایک ڈری اور سہمی ہوئی برطانوی حکومت کو گاندھی جی کا مطالبہ ماننے کے لیے مجبور کرنے کی دھمکی سے تعبیر کیا۔

ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے کانگریس کا مطالبہ سوملین مسلمانوں کو نقصان پہونچا کر ہندوؤں کو تفوق، برتری اور سیادت دینے کا نام تھا۔ انھوں نے بڑے خوفناک نتیجوں کی پیشگوئی کی اگر برطانیہ امریکہ کی مدد سے کوئی ایسا قدم اٹھائے جو کسی طرح بھی پاکستانی مطالبے کے مخالف ہو۔ ''میرا پختہ خیال ہے کہ اس سے ملک میں زبردست تباہی پھیلے گی اور بڑی زبردست گڑبڑی ہوگی۔ اس لیے کہ ایک سوملین مسلمان برطانیہ کو کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔'' کانگریس ورکنگ کمیٹی کے 14ر جولائی کے ریزولوشن کے بعد جناح نے اعلان کیا کہ عوامی سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان پہلے تو برطانوی حکومت کے لیے چیلنج ہے لیکن یہ مسلم ہندوستان کے لیے بھی ایک چیلنج ہے جو کسی طرح ایسے حالات پیدا کردینا ہے کہ پاکستان کے منصوبے کو تباہ وبرباد کردیا جائے۔

جب 8ر اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کی منظوری دیدی، جناح نے کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری اور ہنگاموں کو فرو کرنے کے

لیے سخت ترین اقدامات کرنے کی پوری پوری حمایت کی۔ انھوں نے 14/اگست کو لندن کے ڈیلی ہیرالڈ کے ایک خصوصی انٹرویو میں کہا کہ ''کسی قسم کی گفت وشنید نہیں ہوگی جب تک کہ کانگریس کے لیڈر اپنا ذہن نہ بدلیں اور ایس مہم کو ترک نہ کریں۔ کانگریس کی ساری پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ اقتدار برٹش حکومت سے ہندوراج کو منتقل کردیا جائے۔''

پھر برطانوی حکومت کی طرف رخ کرتے ہوئے انھوں نے نوٹس دیا کہ ''غور کیجئے کہ غصہ اور تلخی کے جذبہ کے ماتحت اگر میں یہ کل کہوں کہ برطانوی حکومت کو پریشان کرواور اس سے عدم تعاون کروتو آپ یقین کریں گڑبڑا اور ہنگامے 5 سو گنا اورزیادہ ہوں گے جتنی آج ہم اس کی توقع کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہندوستانی فوج میں مسلمان 65 فیصدی ہیں۔ اگر مسلم لیگ نے کوئی مہم چھیڑ دی تو اس کا اثر فوج کے بہت بڑے حصے پر پڑے گا اور اس کے علاوہ ساری سرحد لپیٹ میں آجائے گی اور متعدد مسلم ملکوں کے لوگ مثلاً افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر مسلم ہندستان کے مطالبے سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اوران ملکوں کے اخبارات پوری طرح سے پاکستان کے مطالبے کی تائید کررہے ہیں اس لیے اگر مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مابین کوئی تصادم ہوا تو اس کا ان پر گہرا اثر پڑے گا۔''

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر جناح کی حکمت عملی یہ تھی کہ کانگریس کی آزادی کے مطالبے کی سخت مذمت کی جائے اور اگر برطانیہ کانگریس کے مطالبے پر ذرا بھی آمادگی ظاہر کرے تو اسے دھمکایا جائے یا ہندوؤں کو اخوت اسلامی، یا اسلام ازم سے حذف قرار دیا جائے اور مسلم دعووں کی حمایت میں غلط اعداد شمار پیش کیے جائیں۔ غلط اعداد وشمار کی ایک مثال ہندوستانی فوج کی ہیئت ترکیبی یا تشکیل کے بارے میں تھی۔ لن لتھ گو نے 6/ مارچ 1942ء کو ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کا

تناسب جناح کے 65 فیصدی کے مقابلے میں 35 فیصدی بتایا۔ 1941ء میں نام نہاد فوجی تنظیم میں مطلوبہ معلومات فراہم کرنے ناکامی پر غیر فوجی تنظیموں سے مدد لی گئی اور اس وجہ سے 1943ء میں مندرجہ ذیل مسلم بٹالینیں برطرف کردی گئیں:

10- بلوچ
12- سرحدی فوجیں
13- فرنیٹر فورس رائفلز
14- پنجاب
16- پنجاب

اس کے بعد ان کی جگہ پر یہ انتظام کیا گیا:

1- پنجاب
2- پنجاب
3- راجپوت
8- پنجاب
9- جاٹ
13- پنجاب
17- ڈوگرہ

سرکاری مؤرخ لکھتا ہے کہ 1940-41ء سے بڑے پیمانے پر فوجی بھرتی شروع ہوئی۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، مناسب اور موزوں آدمی ملنے مشکل ہوتے گئے۔ 1943ء کے آخری مہینوں میں جنگ سے پہلے پرانے طبقوں سے انسانی قوت بتدریج ختم ہونا شروع ہوئی۔

لفٹیننٹ جنرل فرگسن ٹیوکر ایسٹرن کمانڈ کے سابق جنرل کمانڈنگ آفیسر تھے۔ 1947ء میں ہندوستانی پیدل فوج کی طبقہ وارانہ نمائندگی ان کے بیان کے مطابق:

ہندوستانی فوج کی 23 بٹالینیں تھیں جن میں 6 3/4 بٹالینیں مسلمان تھیں اور 16 1/4 غیر مسلم۔ گویا مسلمان 34 فیصدی تھے۔

مسٹر جناح نے مسلمانوں کی بلند حوصلگی کو دنیا بھر میں اسلامی یکجہتی کے تصور اور ملت کے اتحاد و اخوت اسلامی کے حوالے سے سراہا۔ اکتوبر 1942ء میں عید الفطر کے موقعہ پر اپنے پیغام میں انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے کسی طرح بھی کم اطمینان بخش نہیں ہے کہ ہم نے مسلم ملکوں، ترکی، مصر، ایران، عراق، افغانستان اور دوسرے ملکوں کی آزادی اور خوشحالی میں مستقل دلچسپی لی ہے اور ہمیں ہمیشہ ان سے ہمدردی رہی ہے۔ اس طرح سے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان مسلم ملکوں کے لوگ پاکستان کے لیے ہماری جدو جہد میں پوری ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں۔

مسٹر جناح کی پالیسی یہ تھی کہ دوسروں کی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ ہندوستان کے اتحاد کے لیے کانگریس کی کمزوری سے اور حکومت کی ہندوستان کی آزادی کی مخالفت کرنے کی کمزوری سے۔ انھوں نے کانگریس کو اس پر مجبور کیا کہ وہ انکی شرطیں منظور کر کے ان سے حمایت کی استدعا کرے۔ انھوں نے کوشش کی کہ حکومت کانگریس سے متنفر ہو جائے اور ایسی صورتحال پیدا کی جائے کہ جس سے وہ ان کی خواہشوں کو پورا کرے۔ اپنی جسارت اپنی زیرکی اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اعصاب شکن طریقوں اور اخلاقی اصول یا شائستگی، منطق اور سیاست کے اصولوں کو نظر انداز کر کے اور سب سے بڑھ کر بہت ہی زیادہ انہماک، تن دہی اور لگن سے کام کر کے انھوں نے فتح حاصل کر لی۔ 1942ء سے 1944ء تک میدان میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ سارے کانگریسی لیڈر جیلوں میں تھے اور عام سیاسی سرگرمیاں بالکل معطل ہو کر رہ گئی تھیں صرف انھیں کا سایہ بڑھ رہا تھا۔ حکومت نے اپنے اغراض کے تحت ان کے مقصد کو ترقی دینے کی سازش کی۔ اس کے بدلے میں انھوں نے

حکومت کو مساعی جنگ میں پریشان کرنے سے احتراز کیا اور انھوں نے حکومت کی کانگریس کے خلاف جنگ میں پوری اخلاقی مدد کی۔ اب وہ ایک نئی تقدیر کے پیغمبر ہوگئے یعنی پاکستان کے جس نے مسلم عوام کو اپنی طرف راغب کرلیا اور سب مسلمانوں میں اپنے شاندار ماضی کی یادیں تازہ کردیں۔

14/اپریل 1942ء کو ایک پریس کانفرنس میں کانگریس کے کرپس کو دیئے گئے الٹی میٹم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مطالبہ کی آڑ میں یہ اہم ترین اور سب سے نازک مسئلہ کو شارٹ سرکٹ کرنے کی کوشش ہے۔ جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ''انگریز و ہندوستان چھوڑو'' کا مشہور ریزولوشن 14/جولائی کو پاس کیا تو انھوں نے اسے برطانوی حکومت کو کانگریس راج دینے پر مجبور کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال میں برطانیہ میں اس کی ہمت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو قربان کرسکے۔ 9/اگست کو گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد انھوں نے ایک بیان شائع کیا جس میں اس پر سخت افسوس ظاہر کیا کہ کانگریس نے اپنے مفادات کے علاوہ سب مفادات کو نظر انداز کرکے جنگ چھیڑ دی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس تحریک سے بالکل علیحدہ رہیں۔

لیگ ورکنگ کمیٹی نے 20/اگست کو بمبئی میں جناح کے ان خیالات کی پوری تائید کی اور کانگریس کے خلاف حکومت کے اس الزام کو دوہرایا کہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ملک کی حکومت پر کانگریس کا سپریم کنٹرول قائم ہوجائے۔

ان دو برسوں میں مسلم لیگ بہت بھاری اور تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ جناح نے شیخی بگھاری اور سینکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں نے بلکہ لاکھوں مسلمانوں نے ان کی آنکھ بند کرکے پیروی کی۔ ان کی تنظیم مسلم لیگ ملک کے سارے حصوں میں قائم ہوگئی۔ انھوں نے خاصی تعداد میں فنڈ جمع کیا اور والنٹیر کور قائم کی۔ مسلم لیگ نے

ساری مسلم تنظیموں کو پیچھے چھوڑ دیا اور اس طرح سے وہ جائز طور سے یہ مطالبہ کرنے لگی کہ وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہے۔

عوام کی حمایت سے مسٹر جناح نے اثر حاصل کرلیا تھا جو ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک چلانے کے لیے ضروری تھا۔ مسٹر جناح نے سب سے بڑے لیڈر یعنی قائد اعظم کی پوزیشن حاصل کرلی تھی۔ اب مسلم لیگ سب سے بڑی جماعت تھی اور اس نے مغربی پنجاب اور بنگال کے پریمیروں کو کونسل اور ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ انھوں نے وائسرائے کی ایکزیکو یٹو کونسل کے ممبری کے قبول کرنے پر سلطان احمد کی زبردست مذمت کی۔

مسٹر جناح نے اپنے میں مسلم لیگ کا سارا اختیار مرکوز کرلیا۔ مسلم لیگ اپنے صدر یعنی مسٹر جناح کی تخلیق تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ ایک بے اختیار جماعت تھی جس کا کام محض مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی تجویزوں کو وصول کرنے اور ان پر مہر تصدیق ثبت کرنا تھا۔ اس طرح مسٹر جناح ایک لوہے کی چھڑی سے مسلم لیگ پر حکومت کرتے تھے۔ 1943ء انھوں نے 7 ممبروں پر مشتمل ایک ایکشن کمیٹی کی تشکیل کی جس کا کام ڈسپلن قائم کرنا تھا اور بعد میں اسے ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی میں تبدیل کردیا گیا۔ یعنی ڈاریکٹ ایکشن کے منصوبے بنانے کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ جناح اب ڈکٹیٹر تھے اور مسلم عوام ان کی پیروی کرتے تھے اور دولت مند مسلمان ان کی پوری تائید کرتے تھے اور جو لوگ اختیار اور اقتدار میں تھے وہ ان سے ڈرتے تھے۔ لیکن ان تمام قاعدوں کے باوجود ان کے مسلم وزیروں کے تعلقات غیر اطمینان بخش تھے۔

مارچ 1943ء میں بنگال میں فضل الحق کو گورنر نے بڑے اکھڑ طریقے سے برخاست کردیا اور خواجہ ناظم الدین کی پریمیر شپ میں لیگ وزارت نے عہدہ سنبھال لیا۔ یہ سراسر بدقسمتی تھی کہ اچانک قدرتی تبدیلیوں یعنی موسم کی تبدیلیوں سے کھانے

چیزوں کی قلت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عدیم المثال سخت قحط پڑ گیا۔ لاکھوں آدمی بھوک کی وجہ سے مر گئے لیکن مسلم لیگ کی وزارت نے سوچا کہ یہ ان کے حامیوں اور مسلم تاجروں کے لیے بہت بڑا موقعہ ہے کہ وہ کھانے کی تقسیم کا جس میں لاکھوں روپئے کا سرمایہ لگا ہوا تھا منفعت بخش کاروبار کریں۔ حکومت نے نہ صرف سرمایہ فراہم کیا بلکہ شروع میں تاجروں کا جو نقصان ہوا تھا اس کی بھی بھرپائی کی۔ ناظم الدین بڑے خوش اخلاق تھے لیکن بالکل ناقابل۔ ان کے چیف لفٹیننٹ سہروردی کو بد دیانت سمجھا جاتا تھا۔

پنجاب میں چیف منسٹر خضر حیات خاں بڑی ہی ناخوشگوار پوزیشن میں تھے۔ صوبے کی سیاست انھیں ایک طرف کھینچ رہی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قوتیں بالکل دوسری طرف۔ ان کے پاس اس کا حل یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ مسٹر جناح کے حکم کی تعمیل میں پارٹی کو تحلیل نہ کریں اور حکومت مسلم لیگ کے نام سے نہ چلائیں اور دوسری طرف مسلم لیگ کی اطاعت کریں اور وفادار رہیں۔

لیکن اس سے مسٹر جناح مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے ان سے گفت وشنید کا سلسلہ ختم کر دیا۔

سندھ شخصی سازشوں اور گروہوں کی لڑائیوں کا شکار تھا۔ اللہ بخش کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ ان کو عہدے سے ہٹا دیا گیا اور غلام حسین ہدایت اللہ کو اکتوبر 42ء میں پریمیر مقرر کیا گیا۔ لیکن اس تقرری سے مسلم لیگ کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے میں اکتوبر 1940ء میں ڈاکٹر خان صاحب کے وزارت سے ہٹ جانے کے بعد اورنگ زیب خاں پریمیر مقرر کیے گئے۔ لیکن یہ صوبہ خان برادران کے زیر اثر تھا اور یہاں لیگ کے پیرو اقلیت میں تھے۔ ان صوبوں میں مسلم لیگی حکومتوں کی کارکردگی سے مسلم اکثریت میں آزاد اور ذمہ دار

جمہوریت کو باصلاحیت یا قابلیت سے چلانے کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوا۔ مسلم لیگ کے وعدوں اور مسلم لیگ حکومتوں کی کارکردگی نے بڑی زبردست خلیج پیدا کردی۔

12-1943ء کا قحط

جہاں ایک طرف حکومت ہند کانگریس کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کر رہی تھی اور دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ان کا وقار اور اس کی قوت پہلے کی طرح برقرار اور قائم ہے دوسری طرف یہ ملک کے اندرونی نظم و نسق میں اور جاپانیوں کے ہونے والے حملے میں بڑی کمزوری اور ڈھیلا پن دکھلا رہی تھی۔ جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق تھا پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے۔ جہاں تک اہم ترین پہلوؤں کا تعلق ہے ملک کی معیشت رفتہ رفتہ تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع کے سالوں کے مقابلے میں غذائی اجناس کی پیداوار گھٹ رہی تھی۔ 1896ء تا1905ء کی کل مدت میں اس کی قیمت 28.7 ملین روپے تھی۔ 45-1939ء کی مدت میں یہ گھٹ کر 27.2 ملین رہ گئی۔ پہلی مدت میں اشاریہ کا نمبر 100 تھا لیکن پچھلے اشاریہ میں یہ نمبر 97 تھا۔ ان 5 دھائیوں میں ہندوستان کی آبادی میں بتدریج 34 فیصدی اضافہ ہوا لیکن پیداوار بشمول زرعی اور صنعتی اور بچت میں بقدر 24 فیصدی اضافہ ہوا دوسرے لفظوں میں فی کس پیداوار 100 سے گھٹ کر 91 رہ گئی۔

غذائی اجناس کی پیداوار کا سالانہ اوسط اس سے زیادہ حیرت انگیز تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دھائی میں یہ پیداوار فی کس 560 پونڈ تھی جو 37-1936ء سے 46-1945ء تک گھٹ کر 399 پونڈ رہ گئی۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں اور غذائی اجناس کی پیداوار کے درمیان جو فرق تھا اس کو ایک حد تک درآمدات نے پورا کیا۔ اس طرح سے ہندوستان جو 1919ء

سے پہلے غذائی اجناس کو برآمد کرتا تھا اب درآمد کرنے والا ملک ہوگیا۔ 1935-36ء سے 1945-46ء کی مدت میں درآمدات تقریباً 104 ملین ہوگئیں۔ جب 1942ء میں برما پر جاپان نے حملہ کرلیا تو ہندوستان میں چاول کی درآمد رک گئی اور ہندوستان کی غذائی صورتحال بہت زیادہ نازک ہوگئی۔ حکومت کے ذمہ داروں نے اس صورتحال پر مطلق توجہ نہیں کی بلکہ ڈھیلے پڑ گئے۔

1942ء میں بنگال کی حالت بہت زیادہ خطرناک تھی۔ بنگال چاول پیدا کرنے والا علاقہ تھا اور اس کی پیداوار سے اس کی ضرورتیں بڑی حد تک فی کس نچلی سطح پر پوری ہوجاتی تھیں۔ ڈاکٹر ایکرائیڈ Dr.Aykroyd کے نزدیک ایک تہائی آبادی کو نشوونما کی کمی کا زبردست سامنا تھا۔

برے موسم میں فصل کی خرابی کی وجہ سے کم سے کم ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ 1941ء ایک ایسا ہی سال تھا۔ جاڑوں میں چاول کی فصل میں دوملین کی کمی تھی۔ اس کمی کو نہ تو درآمد سے پورا کیا گیا اور نہ بعد کی فصلوں سے۔ 1942ء کی فصل اچھی ہوئی لیکن اتنی زیادہ نہیں ہوئی کہ بچت ہوتی اور فصل کو اگلے سال کے لیے اسٹاک میں رکھا جاتا۔ 1943ء میں فصل خراب ہوئی اور اس وجہ سے پیداوار 3 ملین ٹن کم ہوئی۔

اس قدرتی آفت کے ساتھ دوسرے عوامل بھی تھے۔ برما سے درآمد کے رک جانے سے کنٹرول کی در سے اور سرحد پر جنگ کے خطرے کی وجہ سے تجارت میں گڑبڑ ہوئی جس کی وجہ سے غلّہ اور دوسری اشیاء کی فراہمی میں کمی آگئی۔ اضلاع یا صوبہ جاتی پابندی اور فوج کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور برما اور ملایا سے پناہ گزینوں کی آمد اور خاص کر قیمتوں میں اضافے سے صورتحال بہت ہی زیادہ ابتر ہوگئی۔ اس صورتحال کی خرابی کی ذمہ داری براہ راست حکومت پر آئی۔ 1939ء میں جنگ شروع ہوئی اور اپریل 1942ء میں سقوط برما کے بعد جو صورت حال 1943ء میں پیدا ہوئی، اس

صورتحال کا مقابلہ بروقت نہ کیا گیا۔ بجائے اس کے حکومت اجناس ریزور میں رکھتی اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ پرائیویٹ ذخیروں کو چھپائیں اور ان مشکلات میں حکومت پر بھروسہ نہ کریں۔ اپریل 1942ء میں اس ہدایت پر عمل کیا گیا۔ جتنا فاضل چاول تھا اس کو حکومت نے مقررہ قیمت پر خرید لیا۔ ان بیس کشتیوں کو جو مشرقی ہندوستان میں نقل وحمل کا ذریعہ تھیں فوجی ضرورتوں کے لیے لے لیا تا کہ انھیں دشمن نہ استعمال کرسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں زبردست خوف وہراس پھیل گیا اور لوگ بڑی تعداد میں بشمول دوکاندار بھاگنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔

حکومت نے عرصے تک زوردار قلت کی اس صورتحال کو کم کر کے ظاہر کیا حالانکہ قحط پڑنے کے آثار 1942ء میں ظاہر ہونے لگے تھے مثلاً مفلس مزدور لوگ کام کرنے کے لیے شہروں میں منتقل ہوگئے اور موٹے چاول کی قیمت 5 روپے سے بڑھ کر 8 روپے فی من ہوگئی۔

مرکزی حکومت نے صورتحال سے نمٹنے کے لیے جو قدم اٹھائے ان سے صورتحال اور ابتر ہوگئی۔ بنگال کی ناکارہ اور ناقابل لیگی حکومت نے لوگوں کی مصیبتوں کے سیلاب کو کنٹرول کرنے اور پھر بددیانت افسروں اور ناتجربہ کار ایجنسیوں کو غذائی اجناس خریدنے اور تقسیم پر مامور کر کے خوب استحصال کیا۔ جب تک اس زبردست آفت نے پورے بنگال کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیا حکومت نے نہیں مانا کہ قحط کے حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ اسمبلی میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر برائے غذا نے قلت سے انکار کیا اور وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں بڑے اطمینان دلانے والے بیان دئے۔ اس طرح سے حکومت کے تینوں اعضاء بنگال کی وزارت اگزیکیٹو کونسل اور لندن میں وزیر ہند معاملوں کی اصل صورت حال سے ناواقف رہے

اوراس آفت سے مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔

اس کا نتیجہ بڑی ہی المناک ٹریجڈی یعنی قحط کی صورت میں نکلا اوراس قحط کی وجہ سے لاکھوں افراد بنگال میں لقمہ اجل ہوئے۔ جولائی سے دسمبر 1943ء تک قحط تحقیقاتی کمیشن کے اندازے کے مطابق تقریباً 15 لاکھ لوگ ہلاک ہوئے اور ہندوستانی ماہر معاشیات پروفیسر چٹوپادھیائے کے سروے کے مطابق 35 ملین یعنی 35 لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

13-دفاعی کوتاہیاں

دفاع کے میدان میں حکومت نے عجیب طرح کی قابل رحم کوتاہی دکھائی۔ جب تک جاپان جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا حکومت نے ہندوستان کے دفاع کے متعلق کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ برطانیہ کو روایتی دشمن روس کی طرف سے کسی قسم کا کوئی بڑا خطرہ نہ تھا لیکن جب (نازیوں) نے اس پر حملہ کردیا تو شمال مغرب کی طرف سے مکمل تحفظ یقینی ہوگیا۔ ان حالات میں حکومت ہند کا خاص کام افریقہ اور چین میں رسد کا فراہم کرنا۔ جنگ کے محاذوں یعنی مصر، مشرق قریب، شمالی افریقہ اور چین کو رسد بھیجنا تھا۔ اس طرح سے شمالی مغربی سرحد سے متعلق سب ہی نظرانداز کردیئے گئے۔

پرل ہاربر پر غیر متوقع حملے اور جاپان کی متحیر کن کامیابی، جس سے بحر ہندان کے پوری طرح سے قبضے میں آگیا تھا، جنگ کو ہندستان کی مشرقی سرحد کے بہت قریب لے آیا اوراس سے بربادی کے تباہ کن امکان پیدا ہوگئے۔ بحر ہند پر جاپان کے تسلط کے تسلیم ہوجانے کا مطلب شمالی افریقہ کی برطانوی فوجوں کو ہندوستان سے اشیاء کی فراہمی سے محروم ہونا تھا۔ ان کے پسپا ہوجانے کا مطلب مواصلات کی لائن کا خلیج فارس سے ایران اور وہاں سے روس تک منقطع ہوجانا تھا۔ اس طرح سے روس کو

زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور فضائی راستے سے ہندوستان سے چین کی جو مدد کی جاتی تھی وہ بھی اس وجہ سے رک گئی تھی۔

حکومت ہند کہاں تک ان مہلک اور جان لیوا خطرات کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ کرنل جانسن اور ہیرنگٹن جو 1942ء کے موسم بہار میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے ہندوستان کے حالات کے بارے میں رپورٹ دینے کے بھیجے گئے تھے، نے نیو یارک میں مشرق قریب کے ڈویژن میں بحث ومباحثے کے درمیان مندرجہ ذیل بیانات دئے جو کالون ایچ، اوکس کے میمورنڈم میں شامل کئے گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کرنل جانسن نے بیان کیا کہ انھیں بڑے معتبر ذرائع سے مطلع کیا گیا کہ ذمہ داران حکومت جاپان کے حملے کی صورت میں ہندوستان کے دفاع کی خاص کوشش نہیں کریں گے اور یہی انھوں نے کرپس کو بھی بتلایا تھا۔ کرپس نے اس کا یقین نہیں کیا لیکن کرنل جانسن نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس الزام کے بارے میں جنرل ویول سے جواب طلب کریں۔ کرپس کے بارے میں کہا جاتا ہے انھوں نے بعد میں کرنل جانسن کو بتایا کہ ویول نے تسلیم کیا کہ فیصلہ یہی تھا۔

اوکس کے نزدیک جانسن کا حکومت ہند کی دفاعی صلاحیتوں کے بارے میں اندازہ تھا کہ فوجوں کی کمی اور برطانوی افسروں میں صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے صورتحال اور زیادہ تشویشناک ہوگئی۔ کرنل جانسن اور کرنل ہیرنگٹن نے بیان کیا کہ بالکل ظاہر تھا کہ جہاں تک افسروں کی پرسنل شخصیت کا تعلق ہے ہندستان میں کم صلاحیت اور اہلیت والے افسر بھر دئے گئے ہیں۔ خود ویول جو ایک زمانے میں بڑے اچھے جنرل رہ چکے تھے جسمانی اور اعصابی اعتبار سے بالکل تھکے ہوئے تھے۔ وہ نا صرف خود نا اہل سمجھے جاتے تھے بلکہ ان کے بارے میں یہ رائے تھی کہ ان کا اسٹاف بھی بالکل نا اہل ہے۔

دونوں کرنلوں کی یہ رائے تھی پچھلے دو مہینوں میں ہندوستان میں صورتحال اتنی زیادہ بگڑ چکی ہے کہ اگر ریاستہائے متحدہ مستقبل قریب میں فوجی ڈویژن اور 500 (پانچسو) ہوائی جہاز بھیج دے تو حکومت پسپا ہو جائے گی اور ملک ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ہندوستان کی فوجی طاقت کی تاریخ میں جوائنٹ پلاننگ اسٹاف کی سراہنا کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ جاپانی حملہ بڑے پیانے پر ہوا تو فوجی کمک جہازوں کے ذریعے سے بھیجی جا سکتی ہے لیکن فضائیہ بہت کمزور ہے۔

اس مقالہ میں جو اپریل 1942ء میں خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پلاننگ اسٹاف نے تیار کیا تھا کوئی جامع منصوبہ نہیں پیش کیا گیا۔لیکن اس میں صاف صاف زور دیا گیا کہ ہندوستان کے دفاع کے لیے موجودہ ذرائع بالکل ناکافی ہیں۔

اس مضمون کے لکھنے والے کا خیال تھا کہ جاپانی حملے کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ شمالی مشرقی ہندوستان میں داخل ہو اور بنگال، اڑیسہ اور آسام پر قبضہ کرے۔ اس کے بعد وادی گنگا میں داخل ہو پھر اپنی آخری منزل کی طرف بڑھے۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں فوجوں کی کمی اور مؤثر کمک کے نہ ہونے سے مخالف برتر فوج کا جو عددی اعتبار سے بہت بڑھی ہوئی ہے مقابلہ کرنا مشکل ہوگا اور کسی علاقے کو دشمن کو دینے سے انکار کرنا ممکن نہ ہوگا اور اہم مقامات پر مزاحمت کرنا آسان نہ ہوگا۔ بنگال کے قحط کا بھی صورتحال پر اثر پڑا۔

جنگ کے خوف سے ہزاروں کو کلکتہ سے بھاگنا پڑا۔ ان کے مغرب کی سمت بھاگنے کی وجہ سے ریلوے پر جو بنگال کو مغربی منطقے سے ملاتی تھی بڑا ہی زبردست بوجھ پڑا اور اسکی وجہ سے فوجیوں اور ان کے سامان کی نقل و حرکت میں سخت قسم کی رکاوٹ پڑ گئی۔ قحط کی وجہ سے لوگ دیہاتوں سے جہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں

تھا بھاگ بھاگ کر کلکتہ اور دوسرے شہروں کو آ رہے تھے۔

ہر جگہ سڑکوں پر قحط زدوں کا ہجوم تھا۔ جہاں بہت سے لوگ بھوک اور بیماریوں کی وجہ سے مر رہے تھے اور صحت عامہ، امن اور تحفظ کے مسئلے پیدا کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بم باری اور سرحد پار سے حملہ ہونے کا خطرہ بڑی تشویشناک صورتحال پیدا کر دیتا تھا۔ اس منطقے کی صورتحال جہاں حملہ ہونے والا تھا اتنی نا قابل برداشت ہونے پر لوگ حکومت کو مورد الزام گردانتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالف برطانوی جذبات بہت زیادہ بڑھ رہے تھے اور جاپان کے ساتھ عام ہمدردی پیدا ہو رہی تھی۔ نتیجہ کے طور پر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی جس سے لاقانونیت بھی بڑھی۔

دفاعی فوج کے لیے جو مخالف حالات سے گھری ہوئی تھی صورتحال قطعی اطمینان بخش نہ تھی کہ اس کا اثر جنگ پر نہ پڑتا جبکہ جنگی سرگرمیوں میں اس کی وجہ سے مزاحمت بھی ہو سکتی تھی۔

کانگریس لیڈروں کو جنگ کے بارے میں حکومت کی عدم تیاری اور ہندوستان میں اپنے حکمرانوں کے جنگ کے خلاف بیزاری کے جذبات کا علم تھا کیونکہ ان کا دفاعی معاملات کے بارے میں امریکن نمائندوں سے گہرا تعلق تھا جو ہندوستانی عوام سے گہرا اور براہ راست رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

امریکیوں کے نقطۂ نظر سے یہ خطرے دور ہو سکتے تھے اگر ہندوستانی عوام کا دلی تعاون حاصل ہو جاتا۔ لیکن حکومت کانگریس کی شدید دشمن ہو چلی تھی اور اس نے اس کی سیاسی جمود اور تعطل کو دور کرنے کی بنیادی تجویزیں نامنظور کر دیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے عوام کے لیڈروں کو رہا کر کے سمجھوتے کے لیے گفت و شنید کی تجویزیں بھی نامنظور کر دیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز بھی نامنظور کر دی گئی۔ کسی بھی شخص حتیٰ کہ صدر امریکہ روز ویلٹ کے ذاتی نمائندے فلپس کو بھی

اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ گاندھی جی یا دوسرے کانگریس لیڈروں سے ملے۔

14-آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی)

قبل اس کے پہلا قدم آغاز کے لیے اٹھایا جائے سول نافرمانی کی تحریک کو کچل دیا گیا۔ کانگریسی لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ عدم تعاون کے علمبرداروں کو میدان سے ہٹا دیا گیا۔ اس طرح سے میدان ان لوگوں کی سرگرمیوں کے لیے خالی کر دیا گیا جن کا عدم تشدد پر اعتقاد نہ تھا۔ ہنگاموں کے رونما ہونے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ گاندھی جی کی رہنمائی کرنے والے اثر کو ہٹا دیا گیا۔ اس لیے یہ امر ذرا بھی حیرت انگیز نہ تھا کیونکہ وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ تشدد کا جواب تشدد سے دینا چاہیے، اس لیے پیچھے ہٹ گئے تھے کہ گاندھی جی کے اصولوں پر عمل ہو رہا تھا۔ انہیں اب موقعہ مل گیا۔ ان میں سے بعض کو ریلوے ٹرینوں پر حملہ کرنے کے بعد حفاظتی ذریعوں کو ختم کرنے کا، ڈکیتیاں ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کا، کچھ کو آتش گیر مادہ تیار کرنے اور نظام مواصلات اور نقل وحمل کے ذرائع درہم برہم کرنے کا تجربہ تھا۔ اب انھوں نے اپنی ساری مہارت اور واقفیت استعمال کی۔ جے پرکاش نرائن کی ہدایتوں کے مطابق کس طرح گڑبڑ کی جائے کا پروگرام تحریر کیا گیا تھا۔ کچھ دوسرے عناصر بھی تھے جن کے نزدیک آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلح مزاحمت بالکل جائز تھی اور جیسا کہ 1857ء میں ہوا تھا اور جیسا کہ عالمی جنگ کے موقعہ پر ہندوستان کی خلافت تحریک اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی غدر پارٹی اور یورپ میں انقلابیوں کے درمیان جرمنی اور ترکی کی مدد سے آپسی تال میل کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

دوسرے عالمی جنگ نے دوبارہ اس طرح کا موقعہ فراہم کر دیا۔ اس وقت اس طریقہ کار کے خاص بانی اور رہنما سبھاش چندر بوس تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مفاد میں جنگ کی وجہ سے پورا فائدہ اٹھانے کا عزم کر لیا تھا۔

جب 1938ء میں یوروپ میں جنگ ناگزیر معلوم ہورہی تھی تو سبھاش بوس نے اس کی زبردست وکالت کی کہ ہندوستان کی فوری ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ برطانوی سامراج سے بلا کسی سمجھوتے کے جدوجہد شروع کردی جائے اور اس جدوجہد کے طریقے ان طریقوں سے جو مہاتما گاندھی نے اختیار کئے تھے زیادہ مؤثر ہونے چاہئیں۔ انھوں نے اس کی تشریح کی کہ گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفہ سے نہرو کی مخالف محوری خارجہ پالیسی میں رکاوٹ نہیں پڑنی چاہئے۔

مارچ 1939ء میں بہ حیثیت صدر کانگریس انھوں نے یہ تجویز کیا کہ حکومت کو اس کا الٹی میٹم دے دیا جائے کہ وہ ہندوستان کو چھ مہینے کے اندر آزاد کردے۔ اس مطالبے کو کانگریس نے مسترد کردیا۔ اس وجہ سے سبھاش چندر بوس کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہوگئے۔ انھوں نے ایک نئی پارٹی قائم کی جس کو فارورڈ بلاک جیسا قابل ذکر نام دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس پر قبضہ کرلیا جائے اور حکومت کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی جائے۔

جب جنگ چھڑ گئی تو انھوں نے ملک کا طوفانی دورہ کیا اور سیکڑوں جلسوں کو خطاب کیا اور برطانوی سامراج کی شدید مذمت کی اور ہندستانیوں سے اپیل کی کہ وہ مساعی جنگ میں برطانیہ کی مدد نہ کریں۔ انھوں نے 6/اپریل 1940ء کو سول نافرمانی شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارورڈ بلاک لیڈر 26/جولائی 1940ء کو گرفتار کرلیے گئے اور پولس نے ان کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دیا۔ جیل میں عمل سے محروم ہوکر انھوں نے ملک کے مسئلوں پر غور وخوض کیا اور تین نتیجوں پر پہونچے۔ پہلا یہ کہ اس جنگ میں برطانیہ کو شکست ہوگی اور برطانوی شہنشاہیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ دوسرا یہ کہ باوجود بڑی تشویشناک صورتحال میں مبتلا ہونے کے برطانیہ ہندوستانی عوام کو اقتدار حوالے نہیں کرے گا اور ان کو اپنی آزادی کے لیے

لڑنا پڑیگا۔ تیسرے یہ کہ ہندوستان اپنی آزادی حاصل کرے گا اگر اس نے جنگ کے دوران برطانیہ کے خلاف اپنا فرض پورا کیا اور ان طاقتوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا جو برطانیہ کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوستان کو بڑے سرگرم طریقے سے بین الاقوامی سیاست میں داخل ہو جانا چاہئے۔

جیل میں کاہلی کی زندگی سے عاجز آ کر اور اپنے خیالات سے کرب اور اذیت میں مبتلا ہو کر سبھاش بوس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس صورتحال کو ختم کرنے کے لیے انھیں کچھ کرنا چاہئے۔

انھوں نے اپنا احتجاج حکومت کو بھیجا اور 29/نومبر 1940ء کو غیر معینہ مدت کے لیے بھوک ہڑتال شروع کردی۔ حکومت نے انھیں چھ دنوں کے بعد رہا کردیا اور وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔ ان پر سخت نگرانی رکھی گئی۔ 17/جنوری 1941ء کو وہ اپنے گھر سے فرار ہو گئے اور جان جوکھم میں ڈالنے والا سفر طے کر کے ایک کابلی پٹھان کے لباس میں ملبوس وہ کابل پہونچے۔ وہاں وہ چند دن ٹھہرے اور پھر اس کے بعد وہ ماسکو روانہ ہو گئے۔ 28/مارچ کو وہ برلن پہونچ گئے۔

جرمن وزارت خارجہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو برلن میں رہ کر ہندوستان میں اپنے برطانیہ مخالف خیالات نشر کرنے کی سہولتیں دیں۔

جب جرمنوں نے اپنے فتح کے زعم میں جون 41ء میں روس پر حملہ کردیا تو انھوں نے ایک ہندوستانی فوج کی تنظیم کرنے کا ارادہ کیا جو جرمن فوج کے پیچھے مرکزی ایشیا میں داخل ہو اور شمالی مشرقی سرحد پر برطانیہ کے خلاف صف آرا ہو۔

سبھاش بابو اس کے لیے بیتاب تھے کہ پہلے اس کے کہ ہندوستانی فوج اپنی کارروائی کو شروع کرے، محوری طاقتیں ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرلیں۔ اس بارے میں اطالوی وزیر خارجہ کاؤنٹ کہالوی کی ڈائری کے حسب ذیل اقتباسات

سے بڑے انکشاف ہوئے:

''بوس یہ چاہتے ہیں کہ محوری طاقتیں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیں لیکن برلن میں ان کی تجویزوں کو بڑے تامل اور ریزرویشن کے ساتھ وصول کیا گیا۔ اس پر سمجھوتہ نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس لیے کہ اس شخص کے اثر کا ہمیں صاف اندازہ نہیں ہے۔''

29/مارچ کو بوس کی ہٹلر سے بڑی طویل گفتگو ہوئی لیکن جب جرمنی نے تجویز آزاد ہندوستان کے اعلان کے بارے میں سرد مہری کا اظہار کیا تو بوس نے محسوس کیا کہ وہ یورپ میں رہ کر کچھ زیادہ فائدہ حاصل نہ کرسکیں گے اس لیے انھوں نے جاپان جانے کا منصوبہ بتایا۔ بحرالکاہل اور جنوبی مشرقی ایشیا میں جنگ میں جاپان کی کامیابی نے اس منطقے میں رہنے والے ہندوستانی نژاد لوگوں کے دلوں میں بڑا زبردست جذبہ پیدا کیا۔ مغربی شہنشاہوں پر ایک ایشیائی طاقت کی فتح نے بڑی توقعات پیدا کیں اور اس وجہ سے انڈی پنڈنس لیگ کی بنیاد پڑی۔ اس لیگ کی بنیاد ڈالنے والے راس بہاری بوس ایک پرانے انقلابی تھے جو جاپان میں مقیم تھے۔ انھوں نے ایک کانفرنس 28 سے 30 مارچ تک طلب کی جس میں اس لیگ کو قائم کرنے کا اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ایک فوج کے بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان تجویزوں کی تفویق وتوثیق کرنے کے لیے ایک دوسری کانفرنس بڑے پیانے پر بنکاک میں 15 سے 22/جون 1942ء تک کی گئی۔ اس کی صدارت راس بہاری بوس نے کی۔ بالآخر اس کا فیصلہ کیا گیا کہ انڈی پنڈنس لیگ قائم کی جائے اور سبھاش بوس کو اس کی صدارت قبول کرنے کے لیے مدعو کیا جائے۔

اس کانفرنس میں متعدد تجویزیں پاس کی گئیں جس کے لیے جاپان کے منظوری کی ضرورت تھی مثلاً انڈی پنڈنٹ انڈین نیشنل آرمی یا ہندوستانی قومی فوج کے بارے میں، انڈین انڈی پنڈنٹ لیگ اور جاپان تعلقات کے بارے میں اور ملایا۔ برما میں

ہندوستانیوں کے مال اور جان کے تحفظ کے بارے میں۔

انڈی پنڈنس لیگ کے انتظامی یا عاملانہ کاموں کے لیے پانچ افراد پر مشتمل ایک کونسل آف ایکشن قائم کی گئی۔ ظاہر ہے کہ لیگ اپنا اختیار اسی وقت استعمال کر سکتی تھی جب جاپان اسے منظور کرے۔ بدقسمتی سے جاپانی نمائندے نے نہ تو ان تجویزوں کو منظور کیا اور نہ کونسل آف ایکشن کے فیصلوں کو۔ اس کی وجہ سے بالآخر بڑے مسئلے پیدا ہو گئے۔

اس اثنا میں جاپانی فوجوں نے ملایا پر حملہ کر دیا اور برطانوی فوجوں کو شکست دیدی۔ برطانوی افسر موہن سنگھ جنھوں نے جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے، کو اس کی ترغیب دی گئی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شامل ہو جائیں۔ جاپانیوں نے ہندوستانی قیدیوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے ان ہندوستانی رضا کاروں کو ایک فوج کی صورت میں، جس کا نام انڈین نیشنل آرمی یا آزاد ہند فوج رکھا گیا، منظم کرنا شروع کیا اور وہ (موہن سنگھ) انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے۔ کونسل آف ایکشن کے ایک ممبر نے اگست 42ء میں انڈین نیشنل آرمی کی ایک ڈویژن جو سولہ ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی تیار کی اور اسے جاپانیوں نے منظور کر لیا۔ موہن سنگھ اس فوج کی تعداد بڑھانا چاہتے تھے کیونکہ 40 چالیس ہزار سے اوپر جنگی قیدیوں نے اس میں شامل ہونے کا عہد کیا تھا۔ لیکن جاپانیوں کو انھیں اس کی اجازت دینے میں پس و پیش تھا۔ اس کے علاوہ موہن سنگھ اور جاپانی فوجی کمانڈر میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور کونسل آف ایکشن کے ممبروں میں بھی اختلافات پیدا ہونے لگے اور اس کے ممبروں نے استعفیٰ دے دیا۔ راس بہاری بوس کو برخاست کر دیا گیا اور وہ نظر بند کر دئے گئے اور انڈین نیشنل آرمی تعطل کا شکار ہو گئی۔

بالآخر یہ گتھی سلجھ گئی۔ سبھاش بابو نے یورپ میں اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی قیادت کرنا قبول کرلیا۔انھوں نے بنکاک کانفرنس کو ایک پیغام بھیجااوراس کانفرنس میں ان کالیڈر کی حیثیت سے خیر مقدم کیا گیالیکن برلن سے مشرق تک کا راستہ غیر معمولی طور سے بہت دشوار تھا۔ اور کہ خشکی کے سارے راستے بند تھےاور سمندروں کی حفاظت اتحادیوں کے بیڑے کرر ہے تھے۔

تاہم 8/فروری 1943ء کوانھوں نے کیل بندرگاہ (Kiel Post) سے ایک بڑی آبدوز میں چھپ کر نکل جانے کوشش کی۔ سمندری نگرانی سے بچتے ہوئے اور بحراٹلانٹک میں چکرلگا کر اس آبدوز نے کیپ کیمورن میں چارسومیل دور ایک جاپانی آبدوز سے رابطہ قائم کیااور 28/اپریل کو یہ کشتی سماترا روانہ ہوئی۔ یہاں سے وہ اپنے جاپانی دوست کرنل یاما موٹو (Yamamoto) سے ملے جن سے وہ برلن میں ملے تھےاوران کی ہمراہی میں وہ 13/جون کو بذریعہ ہوائی جہاز ٹوکیوروانہ ہوئے۔ٹوکیو میں وہ وزیر اعظم ٹوجو اور دوسرے اعلیٰ اور بااختیار لوگوں سے ملے لیکن وہ ہٹلر اور مسولینی سے مدد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔انھوں نے ٹوجو کوترغیب دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔وزیر اعظم نے جاپانی پارلیمنٹ (Diet) میں اعلان کیا کہ ''جاپان نے اس کا عزم مصمم کرلیا ہے کہ وہ ہرممکن اورتمام طریقے اس کے لیے استعمال کرے گا کہ ہندوستان سے اینگلو اثرات جو ہندوستانی عوام کے مخالف ہیں اوردشمن ہیں کوختم کردے اور ہندوستان کو مکمل آزادی اصطلاح کے اصل معنوں میں حاصل کرنے میں پوری مدد کرے۔'' سبھاش بابو کو جاپانیوں کے اختلافات انڈی پنڈنس لیگ سے دور کرانے میں ہزیمت ہوئی اور موہن سنگھ کوسخت مایوسی۔اس کے بعد وہ 2/ جولائی کوسنگاپور واپس آئے اور دودن بعدراس بہاری بوس کی طرف سے انڈین انڈی پنڈنس لیگ کی صدارت کی۔رسمی طور پر انڈین نیشنل آرمی کی طرف سے خراج عقیدت انھیں پیش کیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت کو منظم کرنا شروع کیا اور انھوں نے فوج میں جنگ آزادی کے لیے تازہ جوش پیدا کیا۔

"ہمارے سامنے ایک بڑی سخت جنگ ہے۔ ہمارا دشمن طاقتور اور قوی ہے اور بے رحم اور بددیانت ہے۔ آزادی کے اس فائنل مارچ میں بھوک، محرومی، افلاس اور جبری مارچوں اور موت کا سامنا کرنا ہے جب آپ اس آزمائش میں کامیاب ہوں گے تو آزادی حاصل ہوگی، انھوں نے فوج کی کمانڈ سنبھالی اور جنوبی مشرقی ایشیا میں جاپانی کمانڈر جو ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر انڈین نیشنل آرمی کے رول یا حصے کے لیے اصرار کیا۔ بڑی سخت ٹریننگ کے بعد نومبر میں رجمنٹ کو برما بھیجا گیا۔ اس ساری مدت میں وہ عارضی حکومت بنانے میں منہمک رہے جس کا افتتاح 21/ اکتوبر کو ہوا۔ بوس مملکت کے سربراہ، وزیر اعظم اور فوج کے سپریم کمانڈر تھے اور مالیات پبلسٹی اور خواتین کی تنظیم کے کام علی الترتیب اے کے چٹرجی، ایس اے آئر اور لکھشمی سوامی ناتھن کے سپرد کئے گئے۔ سبھاش بابو نے سب سے پہلے عہد لیا: "خدا کے نام پر میں قسم کھاتا ہوں کہ ہندستان کی آزادی کے لیے ہر قربانی دوں گا اور اپنی آخری سانس تک آزادی کی مقدس جنگ جاری رکھوں گا۔" اس کے بعد ان کی کابینہ کے اراکین نے بھی یہی عہد لیا۔ اس کے بعد ٹیگور کا مرتب کیا ہوا ترانہ گایا گیا۔

اس حکومت کو جاپان، جرمنی اور چھ دوسری مملکتوں نے تسلیم کرلیا۔ سبھاش مملکت کے سربراہ تھے اور ان کو صلاح و مشورہ دینے کے لیے وزیروں کی کابینہ تھی۔ اس کا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ متحدہ بادشاہت اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔ عارضی حکومت اور لڑنے والے فوجیوں کے مصارف پہلے رضا کار تنظیموں اور جاپانی اعانت سے پورے کئے جاتے تھے۔ بعد میں جب ضروری ہوگیا تو ہندوستانی جائدادوں پر 10 فیصدی سے 25 فیصدی تک کی لیوی لگائی گئی۔ انتظامی

افسروں کی ٹریننگ اور قومی اتحاد اور سیکولرزم کو ترقی دینے کے لیے ایک ری کنسٹرکشن کالج کھولا گیا۔ ہندوستانی کو لازمی زبان قرار دیا گیا۔ جے ہند کو تہنیت اور مبارک باد کے لیے استعمال کیا گیا۔ کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو قومی جھنڈا اور ٹیگور کے ترانے کو قومی ترانہ قرار دیا گیا۔

جاپانی حکومت نے انڈمان نکوبار کے جزائر کا نظم ونسق عارضی حکومت کے حوالہ کردیا۔ دسمبر 1943ء میں بوس نے ان جزائر کا دورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے سکریٹیریٹ کو رنگون منتقل کردیا۔

4رفروری 1944ء کو سبھاش چندر بوس کی پہلی رجمنٹ رنگون سے آراکان روانہ ہوئی۔ مارچ کے وسط میں انھیں خون کا پہلا تجربہ ہوا جب انہوں نے برطانیہ کی ہندوستانی فوج کے ایک دستے کو شکست دی۔ پھر وہ شمال کی طرف بڑھی۔ اور ہندوستانی سرزمین پر کانٹی بازار کے قریب موڈک پر اپنے قدم رکھے۔ لیکن اس بٹالین کو سپلائی کی کمی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا اور اس نے کیپٹن سورج مل کی کمانڈ میں ایک ہندوستانی کمپنی چھوڑی جو تمام حملوں کے درمیان ستمبر تک ڈٹی رہی۔

اس کے بعد دوسری بٹالینوں کو چن پہاڑیوں کی طرف جانے کا آرڈر دیا گیا جہاں ان کی برطانوی فوج سے جھڑپیں ہوئیں اور انھوں نے جاپانی فوج کے تال میل کے ساتھ فتح ان پہاڑوں کو فتح کرلیا اور پہاڑ کی چوٹی پر ترنگا جھنڈا لہرادیا۔ اسی وقت دوسری بٹالین امپھال کے میدانوں میں لڑ رہی تھیں۔

لیکن فوج کی ہمت یا حوصلہ کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ ہتھیار ہوں جبکہ انڈین نیشنل آرمی کی پاس ہتھیاروں اور توپ خانے کی کمی تھی۔ اس کے پاس گولہ پھینکنے والی چھوٹی توپ تک نہ تھی۔ سب ہی اہم مواصلاتی چیزوں کی کمی تھی اور نقل وحمل کے وسائل کی بھی کمی تھی۔

ان سب کی کمی ہندوستانی قومی فوج کے لڑنے کی صلاحیت پر اثر انداز ہوتی تھی۔
مئی تک سب باتیں بڑی شاندار طریقے سے ہو رہی تھیں اور ہر شخص کے حوصلے بہت بلند تھے لیکن انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر کو جاپانی فوجی پوزیشن کی ان کمزوریوں کا علم نہ تھا جن پر ان کی امیدوں کا انحصار تھا۔ 1943ء میں اتحادیوں کے بحری اور فضائی حملے کے خلاف جنوبی بحرالکاہل اور شمالی بحرالکاہل میں الیوٹن اور کیرائن جزیرے نشانہ بنا حملوں کا شروع ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے جاپان اپنے بہت سے فضائی دستوں کو برما سے جنوبی بحرالکاہل میں منتقل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ان کا برما میں فضائی تسلط ختم ہو گیا۔ اس وجہ سے ان کی سپلائی یا رسد کی فراہمی، بحری وسائل اور نقل و حمل کے ذریعہ یعنی جنگلوں سے گذر کر اور خراب سڑکوں سے ہو کر جن پر ہر وقت ہوائی حملے ہونے کا خطرہ رہتا تھا اور بارش میں حالات اور بھی زیادہ دشوار ہو جاتے تھے، ہونے لگی تھی۔

اس طرح سے مئی کے آخر میں بارش کے شروع ہو جانے پر جاپانیوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آگے بڑھنے والی لائن پر جو خلیج بنگال کے ساحل سے شمال میں ناگا پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی تھی، قائم رہیں۔

7 / جون کو ان کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ مگر اس وجہ سے فوجیوں کا 50 فیصدی نقصان ہوا اور اس کے ساتھ سڑکوں کے ذریعے ضروری اشیاء کی فراہمی مائنٹ کائی نا (Myntkyina) نامی چین کی سرحد تک مشکل ہو گئی۔

جاپانی فوج کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل آرمی مشرقی کنارے تک ہٹ گئی۔
جاپانیوں کے ان زبردست نقصانات، بیماری اور بھوک مری سے انڈین نیشنل آرمی کی بڑی حوصلہ شکنی ہوئی اور اس کے لوگ فوج سے بھاگنے لگے۔
سبھاش بوس اس لیے سب سے زیادہ غیر مطمئن تھے کہ جاپانی ضروری اشیاء کی

فراہمی میں بالکل ناکام رہے۔

ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس سے وہ بہت ناراض تھے۔ انہیں جاپانی ہائی کمانڈ کی غلط چالوں اور حکمت عملی کی وجہ سے بڑی مایوسی ہوئی اور جاپانیوں کے پسپا ہونے کی اصل وجہ کو سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔ انھیں یقین تھا کہ برطانوی فوجوں کے خلاف جنگ میں کامیابی ہوسکتی تھی۔

ہر چند انھوں نے اس کا ارادہ کیا کہ وہ انڈین نیشنل آرمی کو منظم کرنے کی دوبارہ کوشش کریں اور جنگ میں خود قیادت کریں لیکن ہندوستانی قومی فوج کی پہلی ڈویژن تتر بتر ہو چلی تھی اور اس میں سے نصف یا تو مر چکے تھے یا لاپتہ تھے اور جو صحت مند نہ تھے انھیں اسپتال بھیجنا پڑا۔ بوس نے 9 ر ستمبر کو اپر برما کا دورہ کیا اور انھوں نے افسوسناک صورتحال کا مشاہدہ کیا۔ انھیں شکست سے نہیں بلکہ بعض افسروں اور بعض فوجیوں کی غداری سے بڑا صدمہ ہوا۔ انکی ہمتوں کو بلند کرنے کی ان کی ساری کوشش ختم اور ان کے ہندوستان میں بہ حیثیت انڈین نیشنل آرمی سربراہ کے داخل ہونے کا منصوبہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

حالت کو بہتر بنانے یا کمی کو پورا کرنے کے لیے 1944ء کی فوجی کارروائیوں میں جو انتظامی اور فوجی کوتاہیاں ہوئی تھیں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے جاپانی وزیر اعظم کی یہ دعوت قبول کرلی کہ وہ اکتوبر میں ٹوکیو جائیں۔ جاپانی حکومت نے ان کی بہت مدد کی اور ان کے مطالبوں کو منظور کرلیا۔

ٹوکیو میں بوس کو جاپانی فوجی معاملات کی ابتری کا علم ہوا۔ ان کو معلوم ہوا کہ جاپان کے اردگرد حلقہ تنگ ہوتا جارہا ہے اور امریکی ہوائی جہاز جاپان پر بمباری کررہے ہیں۔ جاپانی وقار روبہ زوال تھا اور جنوبی مشرقی ایشیا میں اپنے مسائل کے پیش نظر مستقبل کے بارے میں بڑے خدشے تھے۔ اب ہندوستان کی آزادی کے

لیے جوش کی پہلی لہر ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

بوس کو اپنی فوج میں اب آدمیوں کو بھرتی کرنے میں زیادہ دشواریاں پیش آنے لگیں۔ فنڈز کی فراہمی کے ذرائع بھی اب مسدود ہو رہے تھے۔ ان کی حکومت کو فنڈ جمع کرنے کے لیے اور لوگوں کو ٹریننگ دینے کے لئے سخت اقدامات کرنے پڑے۔ لیکن ان سخت طریقوں اور جاپان کی فتح میں یقین کی کمی نے زیادہ دشواریاں اور مشکلات پیدا کر دیں۔

انڈی پنڈنس لیگ اختلافات کا شکار ہونے لگی اور اس کی سرگرمیاں سست پڑ گئیں۔ بوس کو اس منطقے کا دورہ کرنا پڑا اور ان موقعوں پر انھیں ان لوگوں سخت وارننگ دینی پڑتی تھی جو مدد دینے میں پس وپیش کرتے تھے۔ انھیں فنڈ جمع کرنے میں پولس کی مدد لینی پڑتی تھی۔

دسمبر 1944ء میں دوسری ہندوستانی فوج کی کچھ رجمنٹیں میدان جنگ میں آنے کے لیے تیار تھیں لیکن ان کا حوصلہ مشکوک تھا۔ بھاگنے والوں اور چھوڑنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی اور بہت سے مشتبہ اور مشکوک لوگوں کو اس سے خارج کیا جا رہا تھا۔ جنوری 1945ء کے شروع میں بوس برما پہونچے لیکن وہاں صورتحال مایوس کن تھی۔ جاپان اور ہندوستان فوجیں اراکان کے علاقے سے بھگا دی گئی تھیں۔ فروری کے وسط میں برطانوی فوجوں نے دریائے اراوادی کو عبور کر لیا تھا اور آزاد ہند فوج کی رجمنٹ کو پسپا ہونا پڑا۔

بہت سے فوجیوں نے افسروں کے ساتھ اس رجمنٹ کو چھوڑ دیا تھا۔ ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا تھا اور اس سے لڑنے کی قوت کو بہت دھکا پہونچا۔ مئی کے وسط تک انڈین نیشنل آرمی پارہ پارہ ہو گئی۔ جاپانیوں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیابی کا سہرا بہت بڑی حد تک امریکن مدد اور خاص طور سے ہوائی جہازوں، ہتھیاروں اور

سامان جنگ کی وجہ سے تھا۔1942ء میں سپلائی بڑی مقدار میں ہندوستان آنے لگی۔ افسروں اور دوسرے رینک پر مامور افسران نے ہندوستان کمانڈ کے ماتحت خدمات انجام دیں۔ان کی تعداد51992 سے بڑھ کر ایک لاکھ چونتیس ہزار ہوگئی تھی۔

یکم فروری1944ء میں ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی فضائی فورس،66 شاہی فضائی جہازوں اور47امریکی فضائیہ کے جہازوں کے دستوں پر مشتمل تھی جن میں کل 3332 اور 983 ہوائی جہاز تھے۔ یکم جولائی1944ءکو یہ تعداد بڑھ کرRAF-82اور71.US.A.F میں4187اور 1843 جہازوں تک پہنچ گئی۔

بوس نے جو رنگون پہونچے تھے،20/اپریل کو یہ خبر سنی کہ جاپانیوں نے رنگون کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ان کے پاس اس کے سوا دوسرا چارہ کار نہ تھا کہ وہ بھی اپنے وزیروں اور انڈین لیگ کے کارکنوں اور مردوں عورتوں کی رجمنٹوں کے ساتھ رنگون چھوڑ دیں۔ یہ انخلا24/اپریل کو شروع ہوا اور ایک بڑا خطرناک سفر کرنا پڑا جس میں رات کو چلنا ہوتا تھا اور دن میں پناہ لی جاتی تھی اور یہ سفر بنکاک (سیام) پہنچنے پر 15/مئی کو ختم ہوا۔

13/اگست کو انھیں اشد ضرورت سے سنگاپور بلایا گیا۔معلوم ہوا کہ جاپانیوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور یہ کہ انڈین نیشنل آرمی کے بچے کھچے افسروں کو بھی ہتھیار ڈال دینے ہیں۔ پولس نے سنگاپور میں ضروری انتظامات کئے اور16/اگست کو بنکاک اور اس کے بعد سیگاؤں کے لیے روانہ ہوگئے۔ سیگاؤں میں انھیں ٹوکیو جانے والے ایک ہوائی جہاز میں دو نشستوں کی پیشکش کی گئی۔ بوس، حبیب الرحمٰن کے ہمراہ سہ پہر کو روانہ ہوئے اور فارموسا سے18/اگست کو2بجے جہاز دوبارہ روانہ

ہوا لیکن چند ہی منٹوں میں اس میں آگ لگ گئی۔ بوس اور حبیب الرحمٰن نے اس تباہ شدہ جہاز سے نکلنے کی کوشش کی۔ بوس بری طرح جل گئے تھے اور وہ اسپتال لے جائے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن بوس کو پھر دیکھا نہیں گیا اس طرح سے ہندوستان کے ایک بڑے بہادر فرد کی زندگی جس نے ہمیشہ آزادی کا خواب دیکھا تھا، جس نے اپنی زندگی کو حصول آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا اور جس نے اپنے ملک کو حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی آزمائش شروع کی تھی، ختم ہوگئی۔ اگرچہ اس کی کوششیں ناکام ہوئیں لیکن بیکار نہیں تھیں۔

عارضی حکومت نے جسے بوس نے قائم کیا تھا اور انڈین نیشنل آرمی جسے انھوں نے منظم کیا، ہندوستان کی آزادی کے سوال کو برطانوی شہنشاہیت کے تنگ حلقے سے نکال کر بین الاقوامی سیاست کے میدان میں پہونچادیا۔ ہندوستان کی آزادی کو جرمنی، اٹلی، اور دیگر ملکوں نے تسلیم کرلیا اور ہندوستان کو نیا موقف عطا کیا۔

چین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ باوجود اس خواہش کے کہ وہ برطانیہ کو ناراض نہ کریں ہندوستانیوں کے حق خود ارادیت پر زور دیتے رہے۔ بوس اصولاً سامراجیت اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف تھے۔ اس طرح سے عالمی رائے عامہ پر عالمی جنگ اور بوس کی عظیم کوششوں کا بڑا اثر پڑا۔

انڈین نیشنل آرمی نے ثابت کیا کہ ہندوستانی فوجی محض کرایہ کا ٹٹو نہیں ہے بلکہ وہ ایک رضا کار ہے جو اپنی جان اپنے مادر وطن کے لیے ایک وفادار فرزند کی طرح قربان کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اس فوج کے افسروں نے آزادانہ طور پر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور اس طرح انھوں نے دشوار حالات میں اپنی خدمات کو ملک کے لیے ہر طرح قائم رکھا۔ بوس ہمیشہ یہی سوچتے تھے کہ وہ کس طرح حالات پر قابو پاسکتے ہیں۔

انڈین نیشنل آرمی ہندوستان کے بیرونی حکمرانوں کے لیے ایک وارننگ تھی کہ وہ

اب ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ہندوستان کے تنخواہ دار فوجیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہندوستانی نیشنل آرمی قومی قدروں کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔

ہندوستانیوں کو ایک دوسرا سبق جو اس نے سکھایا وہ یہ تھا کہ عدم تشدد کے طریقوں سے آزادی کی جدوجہد کے اسلحہ خانے کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ سبھاش چندر بوس ناکام ہوئے انھوں نے اپنی سواری ایک دھندلے ستارے کی طرح جھٹکے سے گھسیٹی تھی۔ لیکن ان کے جانشین ناکام نہ ہوئے۔ کیونکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا برطانوی شہنشاہیت کے غلبہ کے بغیر کی دنیا تھی۔

دسواں باب

گاندھی-جناح مذاکرات

1-جناح کا گاندھی جی کے نام دعوت نامہ

کانگریس نے ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کا مطالبہ کیا۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی تنظیم کے اعتبار سے سارے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کی ممبری کا دروازہ تمام ہندوستانیوں کے لیے بلاتفریق واتمیاز مذہب اور ملت اور ذات پات کے کھلا ہوا تھا۔اس کے پروگرام،اسکے تصورات اور اس کی تمنائیں سارے ہندوستانیوں کے مفاد کا مجسمہ تھیں۔اگر اس کے ممبروں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی تو اس کی یہ وجہ تھی کہ ان کی ملک کی آبادی میں اکثریت تھی۔یہ غیر ہندوؤں سے تعداد میں تقریباً تگنے تھے اور وہ نسبتاً تعلیم اور دولت میں زیادہ بڑھے ہوئے تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی زیادہ شعور کے مالک تھے۔کانگریس ہندوستان کے سارے لوگوں کے لیے آزادی کی طلب گار تھی اور ملک کے سارے شہریوں کے لیے مساوی موقعوں کی، تاہم وہ کسی بھی خطے کو خود ارادیت دینے کی حامی نہ تھی تاوقتیکہ اس کے باشندے اس کا دعویٰ کریں اور اسے محوری انداز یا طریقے سے ثابت کردیں۔ملک کی مکمل آزادی کی مخالفت برطانوی حکمرانوں کی طرف سے کی جاتی تھی۔اس وجہ سے کانگریس اور حکومت کے مابین سیاسی تعطل پیدا ہوگیا۔مسلم لیگ کو ملک کی آزادی کے حصول سے کم دلچسپی تھی۔کانگریس کسی بھی ملت یا فرقے کے لیے حق خود ارادیت علاقائی بنیاد پر قبول کرنے کو تیار تھی بشرطیکہ اس علاقے کے رہنے والے اس کا دعویٰ کریں اور اس کو

مجلس قانون ساز میں اکثریت کے ووٹ سے درست ٹھہرایا جائے یا پھر استصواب کے ذریعہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین۔ دوسرا اختلاف اس پر تھا کہ کانگریس پہلے ملک کی آزادی چاہتی تھی اور ملک کی علیحدگی بعد میں۔ دوسری طرف مسلم لیگ آزادی سے پہلے ملک کی تقسیم پر اصرار کرتی تھی۔ مسلم لیگ کو اس کا اندیشہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں اس کے لیے کسی بھی ہندوستانی صوبے میں اکثریت حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملے گا۔ یہ اپنے مقصد کے حصول میں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اسے برطانوی حکومت کی زبردست حمایت حاصل ہو۔ جہاں تک آزادی کا سوال تھا وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ شاید یہ بعید از قیاس ہے کہ برطانوی حکومت بقیہ ہندوستان سے دست بردار ہوجائے اور مسلم اکثریتی صوبوں پر اپنا تسلط برقرار رکھے لیکن گارنٹی ہوجاتی ہے اگر ہندوستان کا کوئی بھی حصہ خودمختار ہوجائے۔ لیکن ہندوستان میں کسی آزاد ریاست کا وجود میں آجانا بڑا مشتبہ تھا۔ اس لیے مسلم لیگ برطانوی حکومت سے چمٹی رہی اور اس نے کانگریس کی مخالفت کی اور فرقہ وارانہ تعطل پیدا کردیا۔ سیاسی تعطل اپنے پیچھے بڑی طویل تاریخ رکھتا تھا۔ لیکن فرقہ وارانہ تعطل موجودہ یا تازہ ترین تھا۔ ان دونوں کے تعطل کو ختم کرنے کی کوشش ناکام رہی۔

1942ء کی تازہ ترین تحریک سے بھی حسب دل خواہ نتیجہ نہ نکلا اس لیے کہ برطانوی حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی کہ ہندوستان اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کے لیے تیار تھی کہ وہ اقتدار بااختیار کانگریس کو منتقل کردے اور اسکی ہمت اور حوصلہ افزائی سے مسلم لیگ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔

باوجود انتہا پسندی کے مظاہروں کے مسلم لیگ میں یکجہتی اور قوت کا فقدان تھا۔ اس لیے اس کے ہوشیار یا زیرک رہنماؤں نے اس زمانے میں کہ جب کانگریس میدان میں نہ تھی اپنی اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ یہ

جوڑ توڑ شروع کیا کہ پاکستان کے مطالبے کو مختلف گروہ اور مفاد تسلیم کر لیں خاص طور سے کانگریس۔

1942ء میں حکومت کانگریس کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے گاندھی جی کو بدنام کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایمرے نے ان کا موازنہ جوزف ڈوٹریمیلے اور سترہویں صدی کے ایک پاکباز اور تارک الدنیا زاہد جوارض مقدس کو آزاد کرانا چاہتے تھے اور ترکوں کے خلاف صلیبی یا مذہبی جنگوں کو پھر سے چھیڑنا چاہتے تھے Leminence Cerice سے کیا۔ انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ ''اے خدا اگر آڑے وقت میں تو میرے کام آئے تو میں ساری دنیا کو پلٹ سکتا ہوں۔ یہ میری خواہشوں سے بہت کم ہے کہ میں اپنے آتش شوق کو بجھا سکوں۔ مجھے اپنے آپ کو خون کے سمندر میں غرق کر لینا چاہیے۔'' الڈوس ہکسلے نے مقدس جوزف پر اپنی کتاب میں یہ لکھا یہ ایک فرانسیکن راہب تھے جنھوں نے روحوں کو نجات دلانے کے لیے موجودہ خدمت کرنے کا تہیہ کیا لیکن انھوں نے اپنی تمام صلاحیت مثبت انداز میں استعمال نہیں کی۔

جب ایمرے دلفریب خیالی قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور خیالی گھوڑے دوڑا رہے تھے خالص عملی اور حکمت چھانٹنے والے اٹلی دارلعوام کو اپنی عقلمندی جتانے والے فقروں سے بہلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا: ''ذاتی طور سے میں جمہوریت پسند ہوں۔ میں مشہور و معروف رہنما کی مذہبی ڈکٹیٹر شپ کا بھی اس درجہ مخالف ہوں جتنا کہ ایک رسوائے زمانہ گنہگار کی ڈکٹیٹر شپ کا۔''

دشمنوں کے نزدیک کانگریس، حکومت کے زبردست وار کی وجہ سے منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور شدید ترین ضرورت کے موقعہ پر وہ اس کی دوست تھی۔ مسٹر جناح کے اس اعلان سے مسٹر ایمرے کو بے پناہ مسرت ہوئی تھی کہ ''اگر ہماری اپنی حکومت ہوتی تو میں اس قسم کے

لوگوں کو جیل میں ڈال دیتا تا کہ یہ طاقتور تنظیم جنگ مخالف مہم کا آغاز نہ کر دے۔''

ان حالات کی وجہ سے مسٹر جناح کو پاکستان کے مقصد کو بڑھانے، اس جمود اور تعطل سے پوری طرح فائدہ اٹھانے اور کانگریس کو ان کی اسکیم کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کوشش سے مسلم لیگ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اگرچہ اس کا مسلم اکثریتی صوبوں میں حکومتیں بنانے کا معاملہ حوصلہ شکن تھا۔

مسلم لیگ کی خوش قسمتی سے سی۔ راج گوپال آچاریہ جنھوں نے اپریل 1942ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی زبردست جھڑکی کے باوجود فرقہ وارانہ تعطل کو حل کرنے کی اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی ایک نئے فارمولے پر کام کرنا شروع کیا اور اسکی منظوری انھوں نے گاندھی جی سے فروری 1943ء میں برت کے موقعے پر حاصل کرلی۔ انھوں نے تشریح کی کہ میں پاکستان کی اس لیے حمایت کرتا ہوں کہ میں ایسی اسٹیٹ یا مملکت نہیں چاہتا ہوں جس میں ہندوؤں یا مسلمانوں کی عزت نہیں کی جائے۔

اسی اثنا میں دہلی میں اپریل 1943ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے خطبہ، صدارت میں مسٹر جناح نے گاندھی جی کو ان لفظوں میں دعوت دی:

''مجھ سے زیادہ اور کوئی اس کا خیر مقدم نہیں کرے گا اگر مسٹر گاندھی مسلم لیگ سے پاکستان کی بنیاد پر سمجھوتہ کرنے کے لیے رضامند ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے ایک بڑا دن ہوگا۔ اگر وہ مصمم ارادہ کرلیں تو آج مسٹر گاندھی کو کون روک سکتا ہے۔ وائسرائے کے پاس جانے سے کیا فائدہ؟ ان کے پاس وفد لیجانے سے کیا فائدہ؟ ان سے خط وکتابت رکھنے سے کیا حاصل؟ میں ایک منٹ کے لیے بھی باور نہیں کرسکتا کہ اس ملک میں حکومت کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، آپ اس حکومت کے خلاف کچھ بھی کہیں لیکن یہ حکومت اس کی جرأت نہیں کرسکتی کہ وہ ایسے خط کو روکیں جو مجھے بھیجا جائے۔ بلاشبہ یہ بڑا ہی سخت واقعہ ہوگا اگر یہ

حکومت ایسا کرتی ہے۔"

گاندھی جی نے اس تقریر کو اخباروں میں پڑھنے کے بعد مسٹر جناح کو خط لکھنے میں عجلت کی جو انھوں نے بطور نظر بند کے گورنمنٹ کو بھیجا کہ وہ مسٹر جناح تک پہونچائے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"میں آپ کے دعوت نامے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں تحریر کرتا ہوں کہ ملاقات بجائے خط وکتابت کے بالمشافہ ہو۔ میں پوری طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ خط آپ کو مل جائے گا اور اگر آپ میری تجویز سے متفق ہوں تو گورنمنٹ آپ کو مجھ سے ملنے کی اجازت دے تو میں اور آپ دونوں فرقہ وارانہ اتحاد اور دوسرے اہم مسئلوں پر ان اشخاص کی طرح نظر ڈالیں جو کوشش کر رہے ہیں کہ انھیں ایک مشترک حل تلاش کرنا ہے، ایسا حل جو قابل قبول ہو۔" اس خط کے وصول ہونے پر حکومت کا رویہ بڑا ہی مضحکہ خیز تھا۔ ایک طرف سے زخمی کرنا اور دوسری طرف سے علاج کرنا۔ اگرچہ اس نے مسٹر جناح کی دھونس کو ختم کر دیا لیکن حکومت نے گاندھی جی کے خط کو مسٹر جناح تک نہیں پہنچایا البتہ اس کا مفہوم ان تک پہونچا دیا۔

مسٹر جناح نے گاندھی جی کے نام اپنے مطبوعہ جواب میں حکومت کے اس انکار کو نظر انداز کیا اور ایسی زبان استعمال کی جس سے ایمرے اور لن لتھ گو بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ خط بدتمیزی میں بہت بڑھا ہوا تھا۔

جناح کی انانیت اور تکبر کو ٹھیس پہونچی تھی لیکن بجائے حکومت پر ناراضگی ظاہر کرنے کے جس نے ان کے چیلنج کی دھجیاں اُڑائی تھی انھوں نے قیدی سے انتقام لیا جسے جواب دینے کی قوت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ مسٹر جناح یہ چاہتے تھے کہ گاندھی جی ان کے دروازے کی سیڑھیوں پر ملیں اور کانگریس کے ریزولوشن کو واپس لیں۔ اور 18/اگست کے بعد ہونے والے واقعات کی مذمت کریں۔ انھوں نے لکھا:

''مسٹر گاندھی کے اس خط کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کا ٹکڑا اور برطانوی حکومت سے کرادیا جائے تا کہ ان کی رہائی میں آسانی ہو جائے اور وہ سب کچھ کرنے میں جو وہ کرنا چاہتے ہیں پوری طرح آزاد رہیں۔'' بلاشبہ مسٹر جناح کو اپنی قوت اور طاقت کے بارے میں غلط اندازہ تھا۔ اس لیے کہ جب لن لتھ گو اور ایمرے اور چرچل تک گاندھی جی سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے تو مسٹر جناح کیسے ان سے نجات حاصل کر سکتے تھے۔

مسٹر جناح کی گاندھی جی کی شخصیت سے حسد اور خصومت ان کے اپنے رعونت آمیز اور غیر لچکدار برتاؤ کی وجہ سے تھی۔ وہ اپنے پیروؤں کو متاثر کرنے کے لیے شیخیاں بگھارتے رہتے تھے۔ دراصل ان کا ذہن صاف نہ تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتے تھے اور ان کے خیالات بہت دھندلے تھے۔ لیکن وہ اپنے خلاف تنقید کا جب جواب نہیں دے سکتے تھے تو حریف کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے تھے لیکن پرائیویٹ میں بڑے پریشان رہتے تھے۔ انھوں نے 14/جنوری 1942ء کو اپنے دوست کانجی دوارکا داس سے پوچھا'' مائی ڈیر کانجی دوارکا داس! آخر جناح نے کیا کیا ہے جس کی وجہ اسے گالیاں دی جارہی ہیں۔ اس کی غلط ترجمانی کی جارہی ہے۔ اس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں۔ ہندو پریس میرے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟ آپ کے ہندو دوست میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں اور مجھے غدار کیوں قرار دیتے ہیں اور وہ میرے پچھلے ریکارڈ کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ میں ایسا بیوقوف ہوں کہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں کھیلنے لگا اور اس برصغیر کو آزادی سے دور رکھنے میں برٹش حکومت کا آلہ کار بن جاؤں گا۔'' پھر انھوں نے اپنی 1943ء کی تقریر کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے گاندھی جی سے ان کے نام خط لکھنے کو کہا تھا۔ اس کی تشریح میں انھوں نے کہا کہ ہاں میں ضرور اس کا خواہشمند تھا کہ میرے پاس

گاندھی جی کا خط آئے اور میں نے اس کے بارے میں کہا تھا لیکن میں ایسا خط نہیں چاہتا تھا جو گاندھی جی نے لکھا۔ آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ میں دراصل گاندھی جی کی رہائی کے لیے کام کر رہا تھا جب میں نے یہ تقریر کی تھی۔ اگر گاندھی جی صرف ان لائنوں پر مفصل خط لکھتے جس کو میں نے تقریر میں ظاہر کیا تھا تو مجھے گاندھی جی کی رہائی کے لیے ایجی ٹیشن کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ لیکن گاندھی جی نے اپنی فطری مکاری سے میری ایماندارانہ پیشکش کا فائدہ اٹھانا چاہا مگر میں نے ان کے پھندے میں آنے سے انکار کر دیا۔'' انھوں نے دوارکا داس کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔

'' میں پاکستان کا مطالبہ کر رہا ہوں آپ اس پر غور کریں کہ میں صرف اصول کی بات ماننے کو کہہ رہا ہوں یعنی میں پاکستان کے اصول کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس میں، میں نے کیا غلطی کی ہے! کیا ہندو اور کانگریس اسے نہیں سمجھتے کہ اگر ہم اور وہ متحد ہو جائیں تو ہم مشترک دشمن سے چھٹکارا پا جائیں گے۔ اگر ایک دفعہ ہم اس نکتہ پر اتفاق کر لیں اور متحد ہو کر کام کریں تو ہم برطانیہ کو نکال سکتے ہیں۔ ہم تفصیلات میں کم وبیش کر سکتے ہیں یا ردوبدل کر سکتے ہیں اور مستقلاً امکان اور تعاون کے لیے انتظامات کر سکتے ہیں۔''

جناح نے اس سوال پر کہ اگر گاندھی جی مر گئے تو کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہونے کی توقعات نہیں رہیں گی، کے جواب میں انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا اور بہت زیادہ یقین کے ساتھ کہ جب تک گاندھی جی زندہ ہیں مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ ہونے کی امید نہیں۔

2- گاندھی جی کی رہائی

4/ جولائی کو گاندھی جی سے ملنے نیوز کرانیکل لندن کی نمائندہ خصوصی اسٹورٹ

گلڈر پنچ گنی پہنچ گئی جہاں وہ اپنی رہائی کے بعد بحالی صحت کے لیے مقیم تھے۔ گاندھی جی نے انھیں ایک انٹرویو کئی دن میں دیا جو دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ وہ تھا جسے یہ نامہ نگار خصوصی وائسرائے تک پہونچاتا ہے اور دوسرا حصہ عام بحث مباحثہ کے لیے تھا۔ گلڈر نے ان دونوں کو ملا کر ایک بیان کی شکل میں پریس کو دے دیا۔ اس پر گاندھی جی نے ان دو حصوں کی اصل کاپی پریس میں اشاعت کے لیے دیدی۔ اس انٹرویو سے عوام نے بڑی دلچسپی لی اور اس پر بحث بھی چھڑ گئی یعنی یہ انٹرویو متنازعہ فیہ بھی ہوگیا۔ 10/ جولائی کو راجگوپال آچاریہ نے ایک فارمولہ شائع کیا۔ اس کے حسب ذیل دفعات تھے:

(1) مسلم لیگ درمیانی وقفے میں آزادی کے مسئلے کی تائید کرے گی۔

(2) جنگ کے بعد ایک کمیشن شمال مغرب اور شمال مشرق میں ان علاقوں کی حد بندی کرے گا جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے اور ان علاقوں میں استصواب رائے ہوگا۔ ان علاقوں کے تمام رہنے والے یہ طے کریں گے کہ وہ ہندوستان کی مملکت سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں کہ نہیں۔

(3) علیحدگی کی صورت میں ڈیفنس، تجارت اور مواصلات اور دوسرے اہم امور کے بارے میں معاہدے کیئے جائیں گے۔

(4) یہ شرطیں اس وقت عاید ہوں گی جب کہ برطانیہ پورا اقتدار منتقل کردے اور ہندوستانیوں کو حکومت کرنے کا موقعہ مل جائے۔

جناح نے 30/ جولائی کو اس فارمولہ کو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا لیکن ذاتی طور سے وہ اس فارمولے سے غیر مطمئن تھے۔ انھوں نے کمیٹی کو بتایا کہ مسٹر گاندھی ایک پرچھائیں، چھلکا، کٹا چھٹا، دست بریدہ اور کرم خوردہ پاکستان، پیش کررہے ہیں۔

اسی اثنا میں گاندھی جی پر مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے لیے زور ڈالا جارہا تھا۔ مسٹر راجگوپال آچاریہ اس پر مصر تھے کہ وہ مسٹر جناح سے خط وکتابت کریں۔ خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ خاں مشرقی نے مسٹر جناح کو خط لکھا جس میں انھوں نے یہ کہا کہ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس نازک موقعہ پر ہندو مسلمان پاکستان کے حصول اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک سمجھوتہ کرلیں لیکن آپ کا طیش، مایوسی اور بے عملی قیمتی لمحات کو ضایع کردیں گے۔ انھوں نے اس وقت گاندھی جی کو تار بھی دیا جس میں انھوں نے زور دیا کہ دونوں لیڈروں میں ذاتی ملاقات ہو۔ گاندھی جی فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لیے بیتاب تھے۔ انھوں نے قدم اٹھایا اور مسٹر جناح کو لکھا۔ ''جب آپ چاہیں مجھ سے مل لیں۔ مجھے اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھیں۔ میں ہمیشہ آپ کا اور بنی نوع انسان کا خادم اور دوست ہوں۔ آپ مجھے مایوس نہ کریں۔''

بعض لوگوں نے اس طریقے یا راستے کے خطروں اور اس کے تلخ نتیجوں کے بارے میں متنبہ کیا۔ ایک شکایت یہ تھی کہ گاندھی جی ایسے وقت میں مسٹر جناح کی پوزیشن مضبوط کررہے ہیں جب مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی وزارتیں غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھیں۔ گلڈر کے انٹرویو کے دو دن بعد ہندوستان ٹائمنر کے ایڈیٹر درگا داس کا ایک نوٹ اس عنوان سے شائع ہوا: ''جناح اور کٹر برطانوی قدامت پسندوں کی سازش'' یہ نوٹ اس گفتگو، جو ان کی ایک مشہور برطانوی شخصیت سے ہوئی تھی، پر مبنی تھا کہ مسٹر جناح دوران جنگ میں کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے اور اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے ہی وہ چوٹی پر رہیں گے۔ اگر وہ کسی عبوری سمجھوتے کے لیے رضامند ہوجائیں گے تو مسلم لیگ قومی تحریک میں ختم ہوجائے گی اور کبھی بھی کانگریس سے اپنی شرطیں نہیں منوا سکے گی۔ مسٹر جناح کی انتہا پسندی ہر طرح ہمیں پسند ہے۔ اگر وہ اپنے اس رویہ پر قائم رہتے ہیں اور پنجاب جو ہمارے لیے مخصوص

حیثیت رکھتا ہے، اس سے دست کش ہو جائیں تو جنگ کے خاتمے کے بعد انھیں تائید حاصل ہو گی۔ گاندھی جی نے مسٹر جناح کی اس نکتہ چینی پر پوری طرح غور نہیں کیا جب انھوں نے کہا تھا کہ مسٹر گاندھی اور مسٹر راجگوپال آچاریہ گاڑی کو گھوڑے سے پہلے رکھ رہے ہیں۔ (To put the cart before the horse) جب وہ کہتے ہیں کہ اس فارمولے کی دفعات کچھ معنی نہیں رکھتی ہیں مگر قابل نفاذ ہو سکتی ہیں اگر برطانیہ ہندوستان کو اقتدار منتقل کر دے۔ ان کا مطلب بالکل صاف تھا۔ وہ پہلے پاکستان چاہتے تھے اور ان دونوں مملکتوں کی آزادی بعد میں چاہتے تھے اور یہ گاندھی جی کی تصور کے بالکل برعکس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے ہندوستان آزاد ہو۔

3-مذاکرات

مسٹر جناح کے اس تجویز کے منظور کر لینے سے کہ ملاقات ہو تو مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح میں مذاکرات 9/ستمبر 1944ء کو مسٹر جناح کی قیام گاہ مالا بار ہل میں شروع ہوئے۔ ان مذاکرات کا سلسلہ 27/ستمبر تک جاری رہا جب مسٹر جناح نے ان مذاکرات کے ختم ہونے کا اعلان کیا اس لیے کہ دونوں کسی سمجھوتے پر نہ پہونچ سکے۔ دونوں پارٹیوں نے اپنے موقف کی تائید میں پریس کانفرنس کی۔ 9/ستمبر سے 27/ستمبر تک گاندھی جی اور مسٹر جناح میں جو مراسلت ہوئی وہ اخباروں میں شائع ہوئی۔ ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ دونوں میں سمجھوتہ اس لیے نہیں ہو سکا کہ دونوں کے موقف میں زبردست اختلافات تھے۔ تقریروں تحریروں میں تضاد تھا اور ان میں اعتمادی اور خدشے پائے جاتے تھے۔

جہاں تک پاکستان کے بنیادی مطالبے کا تعلق تھا، گاندھی جی نے اس پر زور دیا

کہ راجہ جی نے فارمولہ میں جسے انھوں نے پیش کیا تھا مسلم لیگ کے مطالبے کے
اصول کو تسلیم کرلیا تھا لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے لاہور ریزولوشن سے
کیوں نہیں اتفاق کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کی بنیاد دوقومی نظریہ پر تھی۔ انھوں
نے دعوے سے کہا کہ میں اس پر زور دے رہا ہوں کہ دوقومی نظریہ سے ہٹ کر میں
ہندوستان کی تقسیم کو لاہور ریزولوشن کے مطابق منظور کرسکتا ہوں لیکن بدقسمتی سے اس
نقطہ پر ہم میں اختلاف ہوا۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب وہ میز پر متفق ہو گئے تو محض نظریے پر ان
میں اختلاف ہوا۔ مسٹر جناح کا اصرار کہ گاندھی جی دوقومی نظریے کو تسلیم کرلیں اور اس
کو قبول کرلیں کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف اور جداگانہ قومیں ہیں، اس وجہ سے تھا کہ
شمال مغرب اور شمال مشرق میں صرف مذہب ہی اتحاد کا واحد رشتہ تھا۔ پنجابی، سندھی،
پٹھان اور بلوچی، نسلی، لسانی اور تمدنی اور تاریخی اعتبار سے مختلف قومیں ہیں۔ بنگالی ان
سب سے مختلف ہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے شمال مغربی حلقے سے تقریباً ایک ہزار میل
کے فاصلہ پر ہیں لیکن جناح کے نزدیک ان سب کا تعلق مسلم قوم سے محض مذہب کی
بنیاد پر تھا۔ ان مختلف العناصر گروہوں میں اتحاد کا دعویٰ کرنے کے لیے انھوں نے
مذہب کو بڑھا کر مشترک اور متحد کرنے والے عامل کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن مسٹر
جناح نے صرف ان خطوں کے رہنے والوں کو ہی مسلم قوم میں شامل نہیں کیا بلکہ انھوں
نے ہندوستان میں رہنے والے سب ہی مسلمانوں کو اس میں شامل کرلیا۔ گاندھی جی
نے اسے اس لیے نامنظور کیا کہ انھیں اس سے اطمینان نہ تھا کہ جو مسلمان ان خطوں
سے باہر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ رہتے ہیں، ایک مختلف قومیت ہیں۔ کسی قسم کی
قیاس آرائی اور دلیل سے مختلف ہندوستانی ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کو
ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے خطوں کا شہری قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

گاندھی جی نے حق خودارادیت اور ان دوعلاقوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کے حق کوتسلیم کیا لیکن اس سے مسٹر جناح مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے گفت وشنید ختم کردی اور گاندھی جی پر پاکستان کو نہ تسلیم کرنے کا الزام لگایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پہلے پاکستان اور اس کے بعد آزادی چاہتے ہیں جب کہ گاندھی جی اس پر اصرار کرتے تھے کہ پہلے آزادی حاصل ہو اور بعد میں ہندوستان سے الگ ہونے کا مسئلہ اٹھایا جائے بشرطیکہ استصواب میں اکثریت اس کی موافقت میں ہو۔ اس وجہ سے پاکستان کا وجود میں آنا مشتبہ ہوگیا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ مسٹر جناح نے کرپس کی مسلم اکثریتی صوبوں کی علیحدگی کی تجویز کو منظور کرلیا تھا لیکن انھوں نے اس سے مشابہ راج گوپال آچاریہ اور گاندھی جی کی پیشکش کو ٹھکرادیا۔ اس کی ایک ناممکن وجہ یہ تھی کہ غالباً مسٹر جناح کو بہ حیثیت مسلمانوں کے لیڈر کی پوزیشن میں گاندھی جی سے کوئی واضح سمجھوتہ کرنے میں پس وپیش تھا۔ ستمبر 1942ء تک جناح کو اس کا یقین نہ تھا کہ انھیں اپنے مطالبے کے لیے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی۔ آخر میں بہ حیثیت ایک بہت اچھے وکیل اور اپنی شرطیں منوانے والے مسٹر جناح اس کا اندازہ نہ کرسکے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے ملک کے تقسیم پر متفق ہوجانے سے پاکستان مل جائے گا۔ وہ فریق جو اصل قوت کا مالک تھا، صاحب اقتدار تھا یعنی حکومت تصویر میں کہیں نظر نہ آیا

ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کرپس نے یہ بات کیسے کہی کہ صوبے یونین سے الگ ہوسکتے ہیں۔ لیکن راجہ جی اور گاندھی جی نے صرف مسلم اکثریتی علاقوں کا ذکر کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ''کٹا پھٹا پاکستان'' ہوتا اور وہ پاکستان انکے خواب اور تصور سے بہت چھوٹا تھا۔

مسٹر جناح نے گاندھی جی کی تجویزوں کو تین وجوہات سے نامنظور کردیا۔ گاندھی

جی ہندوستان کی تقسیم صوبوں کی بنیاد پر کرنا چاہتے تھے یہ مسلم لیگ کے ریزولوشن کے
جس میں دستوری اسکیم کا اصول ان لفظوں میں بیان کیا گیا تھا بالکل خلاف تھا کہ
جغرافیائی اعتبار سے ان وحدتوں یا منطقوں کی کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت
میں ہیں جیسا کہ وہ ہندوستان کے مشرقی اور مغربی خطوں میں ہیں اور مملکتوں کے
طور پر گروپ بندی کر دی جائے۔ اس تجویز میں صوبے کا لفظ بڑی احتیاط سے استعمال
نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں ان علاقوں کو شامل کرنے کے لیے کہا گیا تھا جہاں مسلمان
عددی اکثریت میں تھے۔ اس لیے ان منطقوں میں علاقائی ردوبدل تجویز کیا گیا تھا۔
پورے صوبے کے شامل کرنے کا مطالبہ مسٹر جناح کے دوقومی نظریے کے بالکل
مخالف تھا اس لیے کہ پنجاب کے 43 فیصدی غیر مسلموں اور بنگال کے 46 فیصدی
غیر مسلموں کے شامل ہونے سے مسلم لیگ کے تصور کی سوسائیٹوں میں مسلم غلبے کا
کردار بہت کچھ تبدیل ہو جاتا اور اس مطالبے کے پیچھے تقسیم کے بعد جو مسلمان
ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کے اندیشوں کو دور کرنے کا جذبہ تھا۔ مسلمانوں کی
حکومت یا مسلمانوں کے تسلط میں ہندو، ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ برابرتاؤ
ہونے پر یرغمال رہیں گے۔

اس لیے اس مطالبے کے بارے میں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ مسٹر جناح کی
عادت تھی کہ وہ اپنے مطالبات کو برابر بڑھاتے رہتے تھے۔ جیسے ہی کوئی پچھلا مطالبہ
مان لیا جاتا یا اس پر فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں وہ نئے مطالبہ کا اضافہ کر دیتے تھے۔
یہ سلسلہ 1929ء کے 14 نکاتی مطالبوں تک چلتا رہا۔ صوبہ جاتی خودمختاری باقی ماندہ
اختیارات سے لے کر 1940ء میں پاکستان کے مطالبے تک، مرکزی مجالس قانون
ساز میں 33.3 فیصدی نمائندگی سے وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں مساوات کے
مطالبہ تک اور 1942ء میں پاکستان کے پورے صوبوں کی شمولیت تک اور آخر میں

1946ء میں چھ(6) صوبوں کے پاکستان سے ایک ہزار میل کی ملکی گذرگاہ کے مطالبے تک۔

راجگوپال آچاریہ کی اسکیم پر مسٹر جناح کا دوسرا اعتراض استصواب سے متعلق تھا۔ جناح کی رائے تھی کہ صرف مسلمانوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہونا چاہئے اور یہ بالکل نامعقول رائے تھی۔ انھیں اس کا یقین نہیں تھا کہ استصواب میں انھیں اکثریت حاصل ہوگی اس لیے کہ غیر مسلم بڑی تعداد میں اس میں ووٹ دیں گے اور انھیں اگر مسلمانوں کی اقلیت کی تائید حاصل ہوگئی تو پھر وہ مسلم لیگ کی تجویز کو نامنظور کردیں گے۔ لیکن استصواب کرانا اس صورت میں غیر ضروری تھا اگر اس سمجھوتہ کے بعد پنجاب اور بنگال کے ہندوؤں کو جن کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت کم ہوجاتی اس سے الگ کردیا جاتا۔ تیسرا سوال جس پر مسٹر جناح نے سخت اختلاف ظاہر کیا اس تجویز کے بارے میں تھا کہ مشترکہ بورڈ قائم کیا جائے جو مشترکہ امور مثلاً ڈیفنس، امور خارجہ اور مواصلاتی نظام کو کنٹرول کرے۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ دونوں بااختیار اور بااقتدار مملکتوں میں مشترکہ امور ہونے کا کوئی سوال نہ تھا انھیں اس کا خدشہ تھا کہ یہ مشترکہ بورڈ مملکتوں کی خودمختاری کو پار کرکے اتحاد کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ شک وشبہ کی انتہا تھی عالمی جنگ سے یہ بالکل ظاہر ہوگیا کہ دنیا کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت تھی جنگ کے بعد ملکوں کے اقتدار اعلیٰ کو کم کرے اور امن کے لیے کام کرے۔

پھر اس قسم کے اتحاد مثلاً اٹلانٹک معاہدہ، اٹلانٹک ٹریڈ آرگنائزیشن، یا آسٹریلیا، نیوزیلنڈ اور امریکن تنظیم جو بااقتدار مملکتوں کے ڈیفنس کے انتظامات کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

آسٹن کا نظریہ حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ کا نظریہ متروک ہوچکا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط میں کسی بھی قوم کی زبردست قوت پر پابندی عائد ہورہی تھی۔ اس وجہ سے

اب مشابہت یا خالص حاکمیت کے استعمال کرنے کا کوئی موقعہ نہ رہا۔ اب صرف یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ کس قسم کے انتظامات کیے جائیں اور اس بارے میں گفت وشنید ہوسکتی تھی۔ ان امور کے ہونے کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا اور نہ ان امور کے طے کرنے کے تعلق سے تعاون کے بارے میں۔

4- جناح اور لن لتھ گو

مسٹر جناح نے 13/ مارچ 1940ء کو وائسرائے سے انٹرویو میں بہت کچھ تسلیم کیا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ ملک معظم کی حکومت ہندوستان کا اقتدار ہندوراج کو منتقل کردے۔ وائسرائے نے ان کے سامنے تین (3) متبادل پیش کئے:

تیسرا متبادل یہ تھا کہ ایک سہہ فریقی انتظام کیا جائے تاکہ ملک معظم کی حکومت کی موجودگی میں ہندوستان کی امنگوں جو اس انداز سے ہوں کہ ہندوستان کے سب لوگوں کی امنگوں کے قریب ہوں اور جن کی ضرورت ہو، کی پذیرائی کی جائے۔ اس قسم کے انتظام میں ڈیفنس کے لیے برطانوی حکومت کی خاص ذمہ داری ہو۔

مسٹر جناح نے کہا جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ تیسرے متبادل کو بہت عمدہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی موافقت میں ہیں کہ مسلم علاقوں پر مسلمان اپنی حکومت برطانیہ عظمیٰ کے اشتراک سے چلائیں۔ جناح نے 1944ء میں اس کی تصدیق نیوز کرانیکل کے نمائندے سے اپنے انٹرویو میں کی۔

انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ پاکستان پر متحدہ ہندوستان قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کے حملے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ نئے دستور کے تحت ایک عبوری مدت معاملات کو طے کرنے، سلجھانے اور ہم آہنگی کے لیے ہوگی جس میں برطانوی

اقتدار ہوگا۔ جہاں تک مسلح افواج یا امور خارجہ کا تعلق ہے وہ بالا دست رہے گا اور اس عبوری مدت کی میعاد اس رفتار پر منحصر ہوگی جس میں دونوں قومیں اور برطانیہ عظمیٰ اپنے کو نئے دستور سے ہم آہنگ کریں گے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ مسٹر جناح کے نزدیک اقتدار کی منتقلی کے بعد مشترکہ امور مثلاً ویلفیر اور امور خارجہ کی دیکھ بھال کے لیے انتظامات ایک غیر معینہ مدت تک کے لیے ضروری ہوں گے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مسٹر جناح نے اپنے کو پاکستان کے دلفریب تصور میں اس درجہ کھودیا تھا کہ انھوں نے پورے ہندوستان کے مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ایک آزاد اور با اقتدار مسلم مملکت ان کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ ان میں اتنا بھی صبر نہ تھا کہ وہ اپنی تحریک کے مضرات اس کی شکل اور اس کے پیچھے کارفرما محرکات پر غور کرتے انھوں نے پاکستان کی سماجی منزل کو پس پشت ڈال دیا۔ پاکستان کا مجرد اصول ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا اور ہر چیز کو وہ غیر متعلق اور غیر ضروری سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کی کوشش ان کے اس یقین پر مبنی تھی کہ مسٹر جناح ایک قوم پرست تھے اور ہندوستان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ مسٹر جناح اپنی قوم پرستی کو 1939ء میں ترک کر چکے تھے۔ اس لیے یہ توقع بالکل غلط تھی کہ انھیں کسی طرح قوم پرستی کے راستہ پر لایا جائے۔ جناح کا مقصد صرف یہ تھا کہ کانگریس کو پاکستان تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیں اور اس طرح وہ برطانوی حکمرانوں سے اور خود مسلمانوں میں ڈھل مل یقین لوگوں سے اپنی پوزیشن منوالیں۔ گاندھی جی کی ناکامی نے مسٹر جناح کو اپنی ہر دلعزیزی، اثر اور اہمیت بڑھانے کا موقعہ دیا۔

5-بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خاں مذاکرات

لیکن فرقہ وارانہ اتحاد کا بھوت اس آسانی سے نہیں اتارا جا سکا۔ یہ دوبارہ سینٹرل اسمبلی کے اجلاس کے موقعہ پر نمودار ہوا۔1945ء کے بجٹ سیشن میں بڑی حیرت انگیز بات ہوئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تعاون کرنے پر سمجھوتہ کرلیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پارٹیوں نے مل کر حکومت کو بجٹ پر شکست دیدی۔لیگ کے ایک ممبر یامین خاں نے سرکاری بنچوں کے طعنوں کے جواب میں کہا کہ حکومت نے اپنے کاموں اور بری پالیسیوں سے سب ہی کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ حکومت بالکل سنجیدہ نہیں تھی۔ جب اس نے پارٹیوں سے متحد ہونے کو کہا بلکہ اس نے ان کے اختلافات سے خوب فائدہ اٹھایا۔حکومت کا مقصد بھی یہی تھا اور کوشش بھی کہ ہندوستان کے لوگ متحد نہ ہونے پائیں اور اگر متحد ہونے لگیں تو کوئی بات ایسی کردی جائے کہ وہ متحد نہ ہوسکیں۔

جنگ میں تعاون کے مسئلے پر کانگریس پارٹی کے لیڈر اور لیاقت علیخاں مسلم لیگ کے لیڈر ایک ہی انداز میں بولے۔ دونوں نے اس پر زور دیا کہ قومی حکومت اور تعاون دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک نئی صورت یہ ہوئی کی جب کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ تجویزیں مرتب کیں تو انھوں نے وائسرائے کو اس کے بارے مطلع کیا اور ان کے بارے میں گاندھی جی سے بھی مشورہ کیا۔گاندھی جی نے ان کی اس کوشش کی پوری ہمت افزائی کی اور ان کو جاری رکھنے کے لیے کہا۔ان تجویزوں پر انھوں نے لیاقت علی خاں سے گفتگو کی۔ جنوری45ء میں ان تجویزوں کا ڈرافٹ لیاقت علی خاں کو دیا گیا۔انھوں نے ڈیسائی کو مشورہ دیا کہ وہ ان تجویزوں پر گاندھی جی کی منظوری حاصل کرلیں۔ اس کے بعد وہ مسٹر جناح سے اس مسئلے کے بارے میں بات کریں گے۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ بھولا

بھائی ڈیسائی نے 22/اپریل 1945ء کو بمبئی پرونشیل کانفرنس کو مطلع کیا کہ یہ تجویزیں یعنی ڈیسائی اور لیاقت علی کی تجویزیں عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں حکومت کے سامنے ہیں۔ اس پر لیاقت علی خاں نے یہ تجویزیں پریس میں بغرض اشاعت دیدیں اور اپنا ایک بیان بھی دیا۔ یہ تجاویز حسب ذیل تھیں:

(1) کانگریس اور مسلم لیگ اس پر متفق ہیں کہ وہ مرکز میں شامل ہوں گی۔ اس حکومت کی تشکیل ان لائنوں پر ہوگی:

(الف) سینٹرل ایگزیکیٹو کے لیے مساوی تعداد میں کانگریس اور مسلم لیگ اپنے اپنے ممبر نامزد کریں گے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب ممبر مجالس قانون ساز کے ممبر ہوں۔

(ب) اس کونسل میں اقلیتوں کی نمائندگی ہوگی خاص کر فہرست میں مندرجہ اقوام اور سکھوں کی۔

(س) کمانڈر انچیف

یہ حکومت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت کام کرے گی اور اگر کابینہ کسی تجویز کو مجالس قانون ساز سے پاس نہیں کرائیگی تو وہ اسے گورنر جنرل یا وائسرائے کے کسی مخصوص اختیار کی رو سے بھی پاس نہیں کرائے گی۔ اس طرح حکومت گورنر جنرل سے بالکل آزاد رہے گی۔

دوسرا قدم یہ ہوگا کہ صوبوں سے سیکشن 93 ہٹالیا جائے گا اور جتنی جلدی ممکن ہوگا صوبوں میں مشترکہ بنیاد پر حکومتیں قائم کی جائیں گی۔ لیکن ان تجاویز کو جسے لیاقت ڈیسائی پیکٹ کا نام دیا گیا، کبھی بھی کانگریس یا مسلم لیگ کی منظوری حاصل نہ ہوئی۔ مسٹر جناح نے تو سرے سے ان کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے انکار کردیا بلکہ اپنی ناراضگی ظاہر کی تو اس وجہ سے لیاقت علی خاں نے انھیں بالکل مسترد کردیا۔ کانگریس

لیڈر اس وقت جیل میں تھے لیکن جب انھوں نے ان تجاویز کے بارے میں اخباروں میں پڑھا تو وہ حد درجہ برافروختہ ہوئے اور غریب ڈیسائی کا سارا کیریر تباہ و برباد ہوگیا۔ لیکن اس فارمولے کا ویول نے خیر مقدم کیا اور یہ تجاویز ان کی ایگزیکیٹو کونسل کی تشکیل نو کی بنیاد بنیں۔

جب ویول اپنی اسکیم تیار کررہے تھے جس سے پبلک بالکل بے خبر تھی تو سپرو نے ایک نئی تحریک کی۔ انھوں نے تجویز کیا کہ غیر پارٹی لیڈروں کی کانفرنس ایک اسٹینڈنگ کمیٹی منعقد کرے جو مختلف پارٹیوں کے نقطہ نظر ہائے نظر پر غور کرے، سب پارٹیوں کے لیڈروں سے رابطہ قائم کرے، ان سب کے معاملات میں ہم آہنگی پیدا کرے اور دستوری مسئلے کا حل تجویز کرے۔ گاندھی جی نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا لیکن مسٹر جناح نے کسی بھی قسم کا تعاون کرنے سے انکار کردیا۔ امبیڈکر بھی اس تجویز کو منظور کرنے کے بعد اس سے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کمیٹی نے جو 5 دسمبر 1944ء کو مقرر کی گئی تھی اپنی رپورٹ اپریل 1945ء میں پیش کی۔ اس کی سفارشوں میں مرکز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مساوات کی بنیاد پر قومی حکومت کا قیام ہو اور دستور سازی کے لیے ہندو مسلمانوں کی مساوی تعداد پر مشتمل ایک جماعت بنائی جائے جسے مسئلوں کا تین چوتھائی کی اکثریت سے فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن اس کمیٹی نے ملک کی تقسیم اور جداگانہ انتخاب کو مسترد کردیا۔

ان سفارشوں کی مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا نے زبردست مخالفت مختلف وجوہات کی وجہ سے کی اور ان پر عمل درآمد نہ ہوا۔

6- سیاسی جمود

فرقہ وارانہ جمود برطانوی سامراجی منصوبوں کا بالواسطہ تتمہ تھا اور برطانوی

حکومت نے مختلف چالوں سے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی تھی: کہ وہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے پر تیار ہیں لیکن اس پیشکش کو نہ قبول کرنے لیے خود ہندوستانی موردالزام ہیں اس لیے کہ اسکی بنیادی شرط اتحاد ہے۔ ان گنت چالوں کے ذریعے اس اتحاد کو ناممکن بنادیا گیا۔

عالمی جنگ چھڑنے پر حکومت، صدر کی شرطوں کے تحت اقتدار کی منتقلی کے دعوے سے پیچھے ہٹ گئی اور اس طرح ہندستانی سوسائٹی کے باشعور سیاسی طبقوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار نہ آیا۔ اس رجعت پسندانہ قدم سے فوری ناراضگی اس لیے پیدا نہیں ہوئی کہ کانگریس نے اعلان کیا تھا کہ مرکزی حکومت کے انتظامات غیر اطمینان بخش اور ناقابل قبول ہیں لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وائسرائے اور وزیر ہند دونوں برائے نام بھی اختیار کی منتقلی کے مخالف تھے اور اس کے بارے میں بالکل بے پرواہ تھے۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو جنگ میں شریک کرادیں اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر مساعی جنگ میں ہندوستان کا دلی تعاون اور حمایت حاصل کرلیں۔ ہندوستان کے لیے اس چیز کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ کانگریس نے مساعی جنگ میں اس شرط کے ساتھ حصہ لینا منظور کیا کہ ہندوستان کو ماتحتی کا نہیں بلکہ مساوی درجہ حاصل ہو۔ حکومت اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح کانگریس کو زیر کرلیا جائے۔

حکومت نے اپنی روایتی چالوں سے کام لیا یعنی ہندوستانیوں میں اختلاف پیدا کردیا کہ مسلمانوں کی ہر طرح ترغیب اور تحریص سے ہمت افزائی کی اور کانگریس کو ہر طرح دبایا۔ درگا داس اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ سر سکندر حیات کے اس اعلان سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ وزیر ہند کی ہدایتوں کے مطابق وائسرائے

نے انھیں اور فضل الحق کو اس کی ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر جناح کے حکم سے سرتابی نہ کریں۔ یہ دسمبر 1939ء کے آخر میں ہوا۔

اس نجی اعتراف کی تصدیق وزیر ہند کے ایک پبلک اعلان سے ہوئی جب انھوں نے اپنی 18/اپریل 1940ء کی تقریر میں دعویٰ کیا کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس ملک کی کوئی بھی حکومت کوشش کرے گی کہ قوت کے زور سے ملک معظم کی حکومت 80 ملین مسلمان رعایا پر کوئی ایسا دستور تھوپے جس کے تحت وہ امن چین سے نہ رہ سکیں۔

یہ یقین دہانی وزرائے اعلیٰ، وزیر ہند اور وائسرائے کی طرف سے برابر دوہرائی جاتی رہی اور اس طرح سے یہ مسلم مطالبے کا لنگر بن گیا۔ ویٹو یا مسترد کرنے کے حق سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ نے ہندستان کی تقسیم ایک آزاد اور با اقتدار پاکستان کے قیام کے ساتھ چاہی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے موثر تحفظات کا مطالبہ کیا۔

دوسری طرف برطانوی حکومت مسلمانوں کو اکسا رہی تھی اور قوم پرستوں کی مخالفت کرنے میں ان کی ہر طرح ہمت افزائی کر رہی تھی۔ دوسری طرف وہ کانگریس کو اس کا قصوروار ٹھہرا رہی تھی اور اس کے لیے مسلمانوں کو مخالف بنا رہی تھی اور اس کا مطالبہ کر رہی تھی کہ اگر کانگریس غلبہ والی ذمہ دار حکومت مرکز میں قائم کر دی جائے تو وہ ہر لحاظ سے مسلمانوں کے لیے غیر منصفانہ، نا قابل قبول اور دستوری اعتبار سے درست نہ ہوگی۔ چونکہ کانگریس جھکنے پر تیار نہ ہوئی اس لیے سیاسی جمود قائم رہا۔ ہر قسم کی کوشش کانگریس کو دھمکانے کی گئی اور اگست 1942ء سے ظلم و جبر کے تیاری کے سارے حربے اور بے دریغ پروپیگنڈے کے حربے اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیے گئے۔

جب بھی سیاسی سمجھوتے کا سوال اٹھایا گیا تو نپا تلا جواب یہی ملتا کہ کانگریس کو اپنے اقدامات واپس لینے چاہئیں۔ سول نافرمانی کی تحریک کو واپس لینا چاہئے اور 8/

اگست کے ریزولوشن کو ختم کر دینا چاہئے اور مساعی جنگ میں حکومت کی ہر ممکنہ مدد کرنا چاہئے صرف اس صورت میں حکومت اس مسئلے پر غور کرے گی۔ لن لتھ گو کی الوداعی تقریر اور ویول کے ابتدائی اعلانات اس قسم کے تھے۔

7-دستوری مسئلہ اور جنگ کی رفتار

لیکن سیاستدانوں کی اسکیمیں خواہ وہ کتنی ہی ہوشیاری اور چالاکی سے بنائی جائیں، اس وقت ختم ہو جاتی ہیں جب وہ تاریخی حقایق اور اصلیت سے متضاد ہوتی ہیں یا ان کے خلاف ہوتی ہیں۔ ساڑھے سات سال کے سخت گیر عہد کے بعد لن لتھ گو بالآخر 30/اکتوبر 1943ء کو ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ ویول کو وائسرائے کا حلف دلایا گیا۔ وہ ہندوستان میں دو سال تک بحثیت کمانڈر انچیف رہ چکے تھے اور جس صورتحال کا ان کو سامنا کرنا تھا وہ بڑی پیچیدہ تھی۔

مشرقی محاذ پر اب جنگ کا رخ اتحادیوں کی موافقت میں تھا۔ روسی جرمنوں کو بھگا رہے تھے اور انھیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ سب محاذوں سے پیچھے ہٹ جائیں۔ اٹلی میں اتحادی آہستہ آہستہ لیکن یقینی انداز میں شمال میں روم کی طرف بڑی یلغار کر رہے تھے۔ اٹلی نے اپنا بحری بیڑہ حوالے کر دیا تھا۔ شمالی افریقہ میں مصر کی جانب جرمنوں کی یلغار روک دی گئی تھی۔ برطانوی اور امریکن فوجیں شمالی افریقہ میں اتر چکی تھیں تاکہ تیونس سے محوری قوتوں کو نکال باہر کریں۔ اٹلانٹک میں آبدوزوں کے خطرے پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔

جنوبی اور شمالی بحرالکاہل میں جاپانی ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے تھے اگرچہ ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر ان کی فوجیں ہندوستان اور چین کے درمیان مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وسط 1944ء میں جرمنی پر یہ فتح حاصل کی

ہوئی معلوم ہوتی تھی اور بڑے لیڈر روز ویلٹ ، اسٹالن اور چرچل متعدد موقعوں پر نہ صرف حملے کی حکمت عملی طے کرنے کے لیے بلکہ آئندہ کی عالمی پالیسی طے کرنے کے لیے مل چکے تھے۔ لیکن جنگی فتوحات امن کے مسئلے پیدا کررہی تھیں اور ان کانفرنسوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ آخری فیصلے ریاستہائے متحدہ امریکہ یا سوویٹ یونین کی سپر طاقتیں ہی کریں گی۔ اور بعد جنگ کے دنیا میں برطانیہ کی حیثیت بونے کی ہوگی اور برطانیہ کو اپنی چھوٹی پوزیشن پر قناعت کرنی پڑے گی۔

لیکن انگلستان کی بونی پوزیشن کو برطانوی شہنشاہیت کے مسئلوں کا سامنا کرنا تھا۔

ویول نے مرکزی قانون ساز میں اپنی تقریر میں جنگ کی صورتحال کا حوالہ دیا اور کہا کہ ''جنگ کا خاتمہ بالکل یقینی ہے اور اس میں آپ کا جو حصہ رہا ہے اس پر آپ فخر کرسکتے ہیں۔ لیکن اب بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ خاتمہ کب ہوگا۔ جرمنی پے در پے ہزیمتوں اور صدموں سے لڑکھڑا گیا ہے اور وہ بہت جلد ہی جنگ سے باہر ہوجائے گا اور ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ جنگ کو اور تیز کردیں۔ آپ کو برما اور دوسرے علاقوں میں جن پر جاپانیوں نے شروع میں قبضہ کرلیا تھا فتح کرنے میں مشکلات کا اندازہ ہوگا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ جنگ کو ختم کرنا ہمارا پہلا کام ہوگا لیکن اس سے آئندہ کے لیے تیاریاں خارج از بحث نہیں ہوسکتیں۔''

انھوں نے آئندہ مستقبل کے لیے یہ بیان کیا کہ ''کرپس اعلان کا متن اب بھی ملک معظم کی طرف سے عہد ہے اور اب بھی قائم ہے کہ ہندوستان اسی طور اپنا پورا مالک ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد رہے۔ دستور سازی کے بارے میں یا اقلیتوں یا والیان ریاست کے بارے میں تجویز کی وہی دفعات ہیں لیکن یہ پیشکش اس کے لیے ہے کہ جو جنگ میں پوری طرح حصہ لینا چاہے اور جس کے سامنے ہندوستان کی فلاح و بہبود ہو لیکن ان لوگوں کی رہائی کا مطالبہ جو جیلوں میں ہیں بالکل بے معنی ہے جب

تک ان کی طرف سے تعاون کرنے پر رضامندی کا اشارہ نہیں ملتا۔''

مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے بارے میں انھوں نے کہا کہ'' آپ جغرافیہ کی شکل بدل نہیں سکتے۔ دفاع کے نقطہ نظر سے اندرونی، خارجی اور اقتصادی مسئلوں کی وجہ سے ہندوستان ایک وحدت ہے۔''

کانگریس کے بارے میں انھوں نے یہ کہا کہ'' میں اس کی موجودہ پالیسی اور اس کے طریقوں کو بالکل بے کار اور غیر عملی کہتا ہوں لیکن میں ان لوگوں کی رہائی کے لیے جنھوں نے 8 راگست کو عدم تعاون اعلان کیا تھا کوئی وجہ اور جواز نہیں پاتا کہ جب تک میں قائل نہ ہو جاؤں کہ عدم تعاون یا مزاحمت کرنے کی پالیسی یہ اعتراف کر کے واپس لے لی جائے گی کہ وہ غلط اور مضرت رساں تھی۔ محض اظہار افسوس اور رنج سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔'' ویول نے ہندوستانی معاملات کی ترجیح اس ترتیب سے رکھی۔ جنگ کو انھوں نے نمبر اول پر رکھا۔ اقتصادی یا معاشی تعمیر نو کو دوسرے نمبر پر اور مابعد جنگ کے مسئلوں کو تیسرے نمبر پر رکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک فوجی کی ترجیحات تھیں، کسی مدبر کی نہیں۔ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا جنگ کو جاری رکھنے اور اقتصادی تعمیر نو کے لیے سیاسی سمجھوتہ بنیادی چیز تھی۔ ہندوستان کے معاشی مسئلوں سے بے ڈھنگے پن سے نمٹنا ناممکن تھا لیکن ان پر بغیر ہندوستانیوں کو ذمہ دار بنائے قابو نہیں پایا جاسکتا تھا۔ اس طرح مساعی جنگ ریاستہائے متحدہ کی مجہول مدد سے جاری رہ سکتی تھی۔ لیکن نہ تو اس سے کسی خرچ میں کفایت ہوسکتی تھی اور نہ اس سے وقت کی بچت ہوتی تھی۔ ہندوستانی رائے عامہ کو مخالف رکھنا بڑا برا خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے ماہر جنگ کے سمجھوتے کی اسکیمیں بہت زیادہ یقین دہ نہ تھیں۔ تاہم ویول نے اپنی غلطی محسوس کی۔ بنگال کے سخت ترین اور بھیانک قحط کے بارے میں حکومت کی صوبائی یا مرکزی سطح پر اور انگلستان میں ملک معظم کی نااہلی اور نا قابلیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں

دوراندیشی کی کمی قحط کی شدت کو کم کرنے میں ناکام رہی اور اس سے ان کی انتظامی قابلیت اور سفا کی منظر عام پر آئی۔ لیکن قحط صرف ایک علامت تھا۔ بلاشبہ اقتصادی مسئلہ بہت سخت تھا جو ہندوستانیوں کو کھائے جا رہا تھا۔ زرعی پس ماندگی، صنعتی جمود میں اضافہ، افراط زر، آبادی میں بے پناہ اضافہ اور دوسرے بیشمار مسئلے ہندوستان کے دروازے کو کھٹکھٹا رہے تھے جنھیں خود پرستوں نے بند کر رکھا تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ بے لگام خود سر صورتحال جو ایک منصوبے کی وجہ سے رونما ہوئی تھی لیکن اس کی ذمہ داری ہندوستانی سیاست دانوں پر ڈالی گئی اور ویول نے ہندوستانی لیڈروں کی بے نتیجہ غیر عملی طریقہ اختیار کرنے پر سرزنش کی۔ اس طرح برطانوی حکومت نے خوددار لوگوں کے لیے احتجاج کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہ رکھا۔ دوسری طرف جہاں ایمرے اور لن لتھ گو اس پر فخر کرتے تھے کہ انھوں نے مسلم لیگ کو پاکستان کی رعایت دیدی، ویول ہندوستان کے جغرافیائی اتحاد کو دریافت کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کر رہے تھے۔ اس تقریر میں متضاد لازمی تجویزوں کو پیش کرنا بڑی حیران کن بات تھی۔ بظاہر ان پبلک وعدوں کو عملی شکل دینے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی دراصل کوئی خواہش نہ تھی۔ چرچل جرمن قوت کا اندازہ کر کے اپنے حملے کے منصوبے بنانے اور جنگ کے بعد قومی اور بین الاقوامی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کے مسئلے کے بارے میں دو وجہوں سے مطمئن تھے۔ ایک تو جنگ کی موافق صورتحال کی وجہ سے اور دوسرے بحرالکاہل میں جنگی سرگرمیوں کے بڑھنے کے سبب۔ امریکہ کی ہندوستان میں دلچسپی کم ہو جانے اور فوری طور سے یوروپ میں نئی جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے۔

لیکن چرچل کچھ بھی سوچتے ویول کو بڑی ہی مایوس کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور بگڑتی ہوئی اقتصادی صورتحال سیاسی آگ کے ایندھن کا کام کر رہی تھی جو اگر چہ

زیرز میں ہوگئی تھی لیکن بجھی نہ تھی اور جس کے شعلے اب کسی وقت بھی بلند ہو سکتے تھے۔ ہرطرح مایوسی، بددلی، مجبوری کی فضا نے بے اطمینانی، تلخی اور بے اعتمادی اور شک وشبہ کو بہت بڑھا دیا تھا۔

پھر حکومت نے اس کا پختہ عہد کیا تھا کہ جنگ کے بعد نوآبادیاتی طرز کی حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی اور دستور سازی کا کام شروع ہو جائے گا۔ تمام سیاسی پارٹیاں: لبرل فیڈریشن، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، سکھ اور دیگر پارٹیاں بے چین ہو رہی تھیں اور صورتحال کے ختم کرنے کے پیچھے پڑے ہوئی تھیں۔ اب منصوبے تیار کرنے یا اسکیم بنانے کا موزوں موقعہ تھا۔ سب سے زیادہ سیاسی تعطل اور جمود پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ کانگریسی لیڈر جو جیلوں میں محبوس تھے، یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ انھوں نے جرم کیا ہے اور اس لیے وہ اپنے کو مجرم ٹھہرائیں۔ مسلم لیگ یہ چاہتے ہوئے کہ حکومت اپنے قول وفعل سے پیچھے نہیں ہٹے گی اور چونکہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط پوزیشن میں تھی، اپنے مطالبے برابر بڑھا رہی تھی۔ کانگریس کے حلقے سے باہر مہا سبھائی اور سکھ، لیگ کے مطالبوں کو نامنظور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مسٹر جناح کو اپنے مطالبوں کی منظوری گاندھی جی سے حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔

لیجسلیٹو اسمبلی میں ناراض کانگریسی اور مسلم باوجود اختلاف کے متحد ہو گئے اور انھوں نے اپنے غصے کا اظہار حکومت کو شکست دے کر کیا۔ یہ صورتحال حکومت کی سوچی سمجھی صورتحال کا نتیجہ تھی۔

8-ویول کی تجویز

ویول نے جلد ہی محسوس کیا کہ گورنمنٹ پھنسی ہوئی ہے۔ مگر اب اسے اپنے کو مزید نہ پھنسنے نہ دینا چاہیے ورنہ تبدیلی کے نشان وآثار بالکل نمایاں تھے۔

گاندھی جی نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ 1944ء کی پوزیشن 1942ء سے بالکل مختلف ہے اس لیے اب وہ مکمل آزادی کا مطالبہ نہیں کریں گے جس پر تب انھوں نے اصرار کیا تھا۔ اس پر لارڈ اسٹرابرگ نے دارالامرا میں کہا کہ یہ بڑی قابل ذکر تبدیلی ہے۔ لیاقت علی۔ ڈیسائی معاہدہ غیر متوقع تھا اور جہاں تک ایگزیکیٹو کونسل میں مساوات کا تعلق ہے، کانگریس نے اس بارے میں سمجھوتہ کرلیا اور اس کی تائید غیر جماعتی لیڈروں کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے بھی کی۔ اگر چہ دارالعوام میں ایمرے نے گاندھی جی کی 28/اپریل 1942ء کی تجویزوں کو مسترد کردیا مگر ویول نے پہل کرنے کا عزم مصمم کرلیا تھا۔ اس غرض سے انھوں نے اگست 1944 میں صوبوں کے گورنروں کی کانفرنس طلب کی اور ان کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے۔ گورنروں نے ان سے اتفاق کیا کہ سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیے حکومت جس قدر جلد ممکن ہو حکومت مثبت اقدام کرے۔ ان کی آزمائشی تجویزیں یہ تھیں کہ گاندھی جی اور مسٹر جناح کے علاوہ پارٹیوں کے لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے اور اس میں عبوری حکومت کے بارے میں تجویزوں پر غور کیا جائے۔

ڈیسائی۔ لیاقت پیکٹ کے بعد انھوں نے یہ تجویز کیا کہ اس ایکزیکیٹو کونسل میں ہندو مسلم ممبروں کی تعداد مساوی ہو۔ وائسرائے، کمانڈر انچیف کے علاوہ سکھوں اور مندرجہ فہرست اقوام کا بھی ایک ایک نمائندہ ہو اور کونسل گورنمنٹ آف انڈیا کے 1935ء کے ایکٹ کے تحت فرائض انجام دے۔ خاص طور سے مساعی جنگ کا اور امن قائم رکھنے کا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ دستور ساز جماعت کی تشکیل پر بھی غور کرتی اور کانفرس یہ ظاہر کرتی کہ کس طرح سے صوبوں میں ذمہ دار حکومتیں بحال کی جائیں۔

اگر یہ کانفرنس کونسل کی تشکیل اور اس کے ممبروں کے ناموں سے اتفاق کرتی تو پھر یہ ممبر ملک معظم کی منظوری کے بعد اپنے عہدے سنبھال لیتے اور اس کے ساتھ

صوبوں میں باقاعدہ صوبائی حکومتوں کا قیام عمل میں آ جاتا۔

ایگزیکیٹو کونسل نئے دستور کے بارے میں تجویزیں مرتب کرتی۔ والیان ریاست سے گفت وشنید کرتی کہ اس مجالس کے دستور میں ان کی کیا پوزیشن ہوگی۔ اس اسکیم کو وزیر ہند کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے اس میں بعض خامیاں بتائیں لیکن اس سے اتفاق کیا کہ صورتحال کو بے قابو نہ ہونے دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے کچھ جوابی تجویزیں پیش کیں جن میں کانگریس اور مسلم لیگ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔

ویول نے ان تجویزوں کی منظوری پر بڑا زور دیا۔ اس پر ایمرے نے ایک انقلابی تجویز پیش کی کہ موجودہ حکومت کو نوآبادیات کی حکومت کا درجہ دیا جائے، برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے بارے میں قانون بنانے کے اختیار کو منسوخ کر دیا جائے اور ہندوستان کے آزادی کے مطالبہ کو فوراً تسلیم کر لیا جائے۔ وائسرائے نے اس تجویز کے عملی ہونے سے انکار کر دیا اور انھوں نے براہ راست چرچل کو خط لکھا۔ اس معاملہ کو اشد ضروری ہونے کی وجہ سے انھوں نے وزیر ہند سے انگلستان آنے کی اجازت مانگی تاکہ وہ ان تجویزوں کے بارے میں انگلستان کی حکومت سے تبادلۂ خیال کریں۔ بڑی تاخیر اور تفویض کے بعد ویول کو انگلستان بلایا گیا۔ وہ 25/مارچ کو انگلستان پہونچے اور وہاں مئی کے آخر تک رہے اور اس مسئلہ پر وزیر ہند اور کابینہ کی ہندوستان کی کمیٹی سے گفتگو کی۔ چرچل کو ویول کی تجویزوں کے بارے میں بڑا شک تھا۔ لیکن ایمرے اور کرپس نے اصرار کیا تو چرچل بڑے پس وپیش کے بعد کانفرنس کی تجویزوں سے متفق ہو گئے، اس لیے کہ ہم کوئی چیز نہیں دے رہے ہیں۔

9-شملہ کانفرنس

6/جولائی 1944ء کو نارمنڈی میں اتحادی فوجوں کے اترنے سے اس مہم کا

آغاز ہوا جو 7 رمئی 1945ء کو جرمن چیف آف اسٹاف کے بلاشرط ہتھیار ڈال دینے
سے ختم ہوئی۔ تقریباً اس زمانے میں روسیوں نے برلن فتح کر لیا تھا اور جنوب میں
اتحادیوں نے دشمن کی مزاحمت ختم کر دی اور اٹلی پر قابض ہو گئے۔

مشرق میں جاپانی برما سے بھگا دیئے گئے اگرچہ ان کی شکست کے بارے میں کسی
کو کوئی شک وشبہ نہ تھا مگر ان کی مزاحمت برابر جاری تھی۔ جنگ چلانے کا خاص
محور ہندوستان منتقل ہو گیا تھا اس لیے کہ اب ہائی کمانڈ نے اپنی خصوصی توجہ مشرق بعید
کی طرف مبذول کی۔ اب چونکہ جنگ اپنے خاتمے کے قریب آ رہی تھی، انگلستان کی
حکومت کے ارباب اقتدار کے اتحاد میں شگاف پڑنے لگے۔

لیبر پارٹی کا مخلوط حکومت میں رہنے کا جرمنی کے خلاف جنگ ختم ہونے کے بعد
کوئی ارادہ نہ تھا۔ جنگ کے انتہائی نازک سالوں میں وہ مابعد جنگ انگلستان کے
مسئلوں پر غور کرتی رہی تھی اور انھوں نے اپنے پمفلٹ بعنوان ''پرانی دنیا اور نئی
سوسائٹی'' میں اپنی عام پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ اس میں اگلے الیکشن کا ذکر تھا اور
سوشلسٹ پروگرام کا بھی جو الیکشن سے پہلے قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ الیکشن مہم
میں لیبر لیڈر مثلاً گرین وڈ اور لاسکی نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اگر لیبر پارٹی برسر اقتدار
آئی تو سیاسی جمود کو ختم کر دے گی۔

دوسری طرف کنزرویٹو پارٹی تعمیر نو کے مسئلے سے اتنی زیادہ واقف اور باخبر نہ تھی۔
شرکت جنگ کے معاملوں ملک اور بیرون ملک میں متعدد کانفرنسوں اور جنگ کو پوری
طرح چلانے میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اس نے انگلستان کے مسئلوں کی طرف توجہ
نہیں کی۔ مخلوط حکومت میں کنزرویٹو اور لیبر پارٹیوں میں شدت آتی جا رہی تھی مثلاً
لیبر پارٹی نے سماجی تحفظ کے مسئلے کو بڑے جوش وخروش سے اٹھایا لیکن لیبر پارٹی کو
کنزرویٹو پارٹی کی تائید نہ حاصل ہوئی۔

دوسرا خاص مسئلہ پلاننگ اور منصوبہ بندی کا تھا۔ ان جھگڑوں اور تنازعوں کی وجہ سے ضروری ہوگیا تھا کہ ووٹروں سے اپیل کی جائے۔ چرچل الیکشن جلد کرانا چاہتے تھے تاکہ فتح کے ماحول سے پورا فائدہ حاصل کرسکیں۔ انھوں نے 25/مئی کو مخلوط حکومت یا مشترکہ حکومت ختم کردی تاکہ کنزرویٹو اور کچھ لبرل وزیروں پر مشتمل نئی حکومت بنائی جائے۔ جنرل الیکشن 25/جولائی کو ہوئے اور 26/جولائی کو نتیجوں کا اعلان کردیا گیا۔

ووٹروں نے لیبر پارٹی کو زبردست کامیابی دلائی۔ لیبر پارٹی کے 392 اور کنزرویٹو پارٹی کے 231 امیدوار کامیاب ہوئے۔

ایٹلی وزیر اعظم ہوگئے اور انھوں نے فوراً چارج سنبھال لیا۔

عظیم اتحاد میں برطانیہ اور سوویت یونین میں مقاصد کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ خاص طور سے پولینڈ اور دوسرے یوروپین ملکوں خصوصاً بالٹک کی مملکتوں کے بارے میں۔ چرچل، روسیوں کے مقاصد اور عزائم کے بارے میں بڑے شک وشبہ میں مبتلا تھے اور وہ روس کے جرمنی کی طرف بڑھنے اور برلن کو فتح کرنے کے بارے میں متنبہ کررہے تھے۔ اسی طرح روسی بلقان کے متعلق برطانوی منصوبوں کے بارے میں گہرے شکوک رکھتے تھے۔

لیکن جب سے ریاستہائے متحدہ امریکہ جنگ میں شامل ہوا جنگی کونسلوں میں برطانیہ کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔ جرمن فوجوں پر روسیوں کی زبردست کامیابیوں نے اس کو اور زیادہ کم کردیا۔ چرچل کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اتحادیوں کی حکمت عملی کے بارے میں ان کی تجویزوں پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ آخری کانفرنس 17/جولائی سے 12/اگست تک پوسٹ ڈم میں ہوئی۔ اس میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتحاد ختم ہوجائے گا۔ چرچل نے اس پر لفظوں میں ماتم کیا کہ ہم برطانوی لوگوں کو شروع ہی میں جنگ

کی تباہیوں اور بربادیوں کے پیش نظر اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کو سمجھ لینا چاہیے تھا۔

اگست 1944ء کو ڈمبارٹن اوکس میں اتحادی مدبرین کی کانفرنس نے جنگ کے پیدا کردہ مسئلوں پر غور کیا تھا اور اقوام متحدہ کی تنظیم کی بنیادی ڈالی تھی۔ ان تجویزوں پر 25/اپریل 1945ء سے 26/جون 1945ء تک سان فرانسسکو کی کانفرنس میں غور وخوض کیا گیا۔ روسی وزیر تارجہ مالٹوف نے کانفرنس میں برطانوی نمائندوں کی موجودگی کے جواز کو چیلنج کیا۔ انھوں نے کہا ہم کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کے وفد کو دیکھ رہے ہیں لیکن ہندوستان آزاد مملکت نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا جب ہندوستان کی آواز بھی سنی جائے گی۔

ایک دوسرے بیان میں انھوں نے کہا کہ بین الاقوامی تحفظ اور مفاد کی نظر سے ہمیں پہلے اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ محکوم ملک جس قدر جلد ممکن ہو آزادی کے راستہ پر گامزن ہو جائیں۔ اقوام متحدہ کے اسپیشل کمیشن کو ترقی دینا چاہئے اور اس کو اس انداز سے کام کرنا چاہئے کہ قومیں مساوات اور خود ارادیت کے اصولوں پر جلد از جلد عمل درآمد کے قابل ہو جائیں۔

ان ڈرامائی واقعات کا ہندوستان پر بڑا ہی گہرا اثر پڑا۔ گاندھی جی نے 18/اپریل کو اپنے بیان میں کانفرنس کے ریزولوشن پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی پرزور وکالت کی: ''اس دنیا میں ہر قسم کی جنگ کو ختم کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہندوستان کو بیرونی کنٹرول سے مکمل آزادی حاصل ہو۔ یہ اس لیے نہیں کہ یہ سامراجی غلبہ کی مسلمہ مثال ہے بلکہ خاص طور سے اس لیے کہ یہ بہت بڑا تمدنی اور قدیم ملک ہے جو اپنی آزادی کے لیے 1921ء سے دانستہ صرف سچائی اور عدم تشدد کے حربے کے سہارے لڑ رہا ہے۔ دنیا کی حالت سب سے زیادہ غیر یقینی تھی اور برطانیہ، جماعتی تنازعہ، سیاست اور حکومتی تبدیلی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔''

ویول لندن سے واپس ہوئے اور انھوں نے ہندوستانی جمود اور تعطل کی گتھی کو سلجھانا چاہا جو اس وقت بظاہر موافق نظر نہیں آرہا تھا۔ 14ر جون کو ویول نے اعلان کیا کہ سیاسی اور دستوری اصلاحات کے بارے میں سیاسی لیڈروں سے صلاح ومشورہ کرنے کے لیے وہ شملہ میں ایک کانفرنس طلب کررہے ہیں۔

(1) فرقہ وارانہ مسئلے کو طے کرنا جو ترقی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

(2) نئی ایگزیکیٹو کونسل کی تشکیل جو منظّم سیاسی رائے کی زیادہ نمائندہ ہو۔ مجوزہ کونسل ہم ملتوں کی نمائندہ ہوگی اور اس میں ہندو مسلمان مساوی تعداد میں شامل ہوں گے اور قائم ہوجانے کے بعد وہ دستور کے تحت کام کرے گی۔

وائسرائے اور کمانڈ انچیف کی بطور ممبر جنگ شرکت ہوگی۔

10-ایگزیکیٹو کونسل کے فرائض

(1) جنگ کو جاری رکھنا (2) ہندوستان کی حکومت کو چلانا (3) ایسے ذرائع پر غور کرنا کہ مستقبل کے دستور پر اتفاق ہوجائے اور طویل المیعاد حل تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

امور خارجہ جو پہلے وائسرائے کے پاس تھا اب ہندوستان کے ممبر کے پاس منتقل کردیا جائے گا۔ اسی دن دارالسلام میں ایمرے نے ویول کے اعلان کے بارے میں بیان دیا اور ملک معظم کی حکومت کی اس خواہش اور ارادے کا ذکر کیا کہ ہندوستان میں سیاسی جمود ختم ہوجائے گا اس لیے وہ اس پر بھی غور کررہے تھے کہ جب تک دستوری انتظامات نہیں ہوجاتے، عبوری دور میں کیا کیا جائے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے لوگوں کی فلاح کے لیے پورا تعاون کرے۔

انھوں نے اس کو بھی واضح کیا کہ یہ تجاویز اپنی پوری صورت میں برقرار رہیں گی۔ اس کے معنی یہ تھے ہندوستان کی پوزیشن برطانوی دولت مشترکہ میں ایک نوآبادی کی طرح ہوگی یا اگر وہ چاہے تو اسے الگ بھی کیا جا سکتا ہے۔ وائسرائے نے اس کا بھی اعلان کیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی فوری رہائی کے احکام بھی جاری کر دئے گئے ہیں۔

وائسرائے کے اس نشریے کو سن کر گاندھی جی نے خود ان سے خط و کتابت شروع کر دی تا کہ ان کے بیانات کے بارے میں وضاحت مل جائے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ ان کے نشریے میں تحریر اور تقریر کی آزادی کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ وائسرائے کا جواب تھا کہ درجہ نوآبادیات کی منزل اور اس کے ساتھ برطانیہ کی دولت مشترکہ سے الگ ہو جانے کا اختیار آزادی کے مساوی ہیں۔

دوسرا اعتراض اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ترکیب استعمال پر تھا۔ گاندھی جی نے اس طبقاتی تقسیم کی پرزور تردید کی اور انھوں نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ اس قسم کے گروہ کو کوئی نمائندگی نہیں دی جائے گی۔

تیسری طرف انھوں نے سیاسی مسئلوں کو فرقہ کی بنیاد پر یا غور کرنے پر اعتراض کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مساوات کو قطعاً نا قابل قبول قرار دیا۔

وائسرائے نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لفظ کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اس سے وہ ہندو مراد ہیں جن کا شمار فہرست میں مندرج ہندو ذاتوں میں نہیں ہے۔ جہاں تک مساوات کے مسئلہ کا تعلق ہے یہ محض ایک تجویز ہے اسے منظور یا نامنظور کرنا کانفرنس کا کام ہے۔

گاندھی جی نے وائسرائے کی توجہ اس بات کی طرف بھی دلائی کہ ان کا تعلق کسی جماعت یا تنظیم سے نہیں ہے۔ وہ کانگریس کے معمولی اور ابتدائی ممبر بھی نہیں ہیں۔

اس لیے وہ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شرکت نہیں کر سکتے لیکن وہ ایک مشیر اور صلاح کار کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ وہ صدر کانگریس کو اس کانفرنس میں مدعو کریں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے 22-21 کو ہونے والی اپنی میٹنگ میں وائسرائے کی تجویزوں پر غور کرنا منظور کیا۔ اور 25/جون کی شملہ کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ وہ صرف عارضی حکومت کے لیے مساوات کے اصول سے متفق ہوئی۔

مسلم لیگ کو ویول پلان سے بہت کم دلچسپی تھی۔ خلیق الزماں جو مسٹر جناح کے چہیتے اور تصور پاکستان کے بہت بڑے مبلغ اور وکیل تھے، کی رائے تھی کہ مساوی مطالبے پر راضی ہوئے بغیر عارضی حکومت کو برسر اقتدار لانا ہمارے لیے مضرت رساں ہوگا۔ مسلم لیگ نے مطالبے پر متعدد اعتراضات کیے۔ ان میں سے دو اہم اعتراضات یہ تھے:

(1) جو فہرست مسلم لیگ وائسرائے کو پیش کرے گی وہ قطعی ہوگی۔

(2) کابینہ کے مسلمان ممبر مسلم لیگی ہوں۔

ہندو مہاسبھا کو پارٹیوں کی جماعت میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے کانفرنس نے اسے اس میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ کانفرنس کے افتتاح سے ایک دن پہلے وائسرائے گاندھی جی اور مسٹر جناح سے علیحدہ علیحدہ ملے۔ اس کانفرنس میں جو 25/جون کو شملہ میں منعقد ہوئی تھی، میں، ان صوبوں کے پریمیر جہاں عوامی حکومتیں کام کر رہی تھیں اور ان صوبوں کے سابق وزرائے اعلیٰ جہاں گورنمنٹ آف انڈیا کی دفعہ 93 کے تحت گورنر حکومت چلا رہے تھے، شامل ہوئے۔ قانون ساز اسمبلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر، اسٹیٹ کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر، لیجسلیٹو اسمبلی میں یوروپین گروپ کے لیڈر، فہرست میں مندرج ذاتوں اور

مسلمانوں کا ایک ایک نمائندہ شامل بھی تھے۔ گاندھی جی نے جو شملہ میں موجود تھے کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔

وائسرائے نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں مدعوئین کا خیر مقدم کرنے کے بعد کانفرنس کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا یہ دستوری سمجھوتہ نہیں ہے اور یہ کانفرنس ہندوستان کے پیچیدہ مسئلوں کا حل پیش کر رہی ہے اور نہ اس کا یہ مقصد ہے کہ یہ کسی طرح اصل فیصلے کے بارے میں کوئی متضاد رویہ اختیار کرے گی۔

صدر کانگریس مولانا آزاد نے اس کا آغاز کیا۔ انھوں نے کانگریس کے قومی کردار پر زور دیا اور یہ کہا کہ وہ کسی ایسے سمجھوتہ یا انتظام پر راضی نہ ہوگی جس کے تحت کانگریس کی حیثیت ایک فرقہ پرست جماعت کی ہو جائے اور جس کی وجہ سے قوم پرستی کے فروغ کو نقصان پہونچے۔ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہندوستانی ریاستوں کے عوام، والیان ریاست اور قومی حکومت کے مابین فاصلہ دور کیا جائے اور فوج کو قومی حیثیت دی جائے۔ انھوں نے کانگریس کے نصب العین یعنی مکمل آزادی کے حصول کا اعادہ کیا۔

مسٹر جناح نے اس پر زور دیا کہ کسی بھی صورت میں مسلم لیگ کسی ایسے دستور کو منظور نہیں کر سکتی جس کی بنیاد پاکستان کے مطالبے پر نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ اصولی طور سے کانگریس کے متحدہ ہندوستان اور ایک مشترکہ قومی حکومت کے مطالبے سے مسلم لیگ کو بنیادی اختلاف ہے۔ انھوں نے عارضی حکومت میں مسلم لیگ کے مساوات کے اصول پر دعویٰ پیش کیا لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ پاکستان فوراً ہی دے دیا جائے۔ مسلم لیگ کے دعوے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ نوے فیصدی سے زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے جس طرح کانگریس 90 فیصدی ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کانگریس تمام قوموں، فرقوں اور

ملتوں پر اثر رکھتی ہے۔

26/جون کو وائسرائے نے کانفرنس کے سامنے تجویزیں پیش کیں:

پہلی تجویز کا تعلق نئی ایکزیکیٹو کونسل سے تھا جیسا کہ 14/جون کے اعلان میں بتایا گیا تھا۔ دوسری کا تعلق کونسل کے ممبروں کی تعداد، اس کی تشکیل، ماہیت ترکیبی سے تھا جس کے تحت وائسرائے کو کونسل کے ممبروں کا پینل بھیجا جاتا تاکہ وہ ان میں سے تقرری کے لیے چھانٹ سکے۔

پہلی تجویز کے حوالے سے پارٹیوں کے مساوات کے اصول کو بہ حیثیت مجموعی نامنظور نہیں کیا گیا۔ دوسری تجویز کے تعلق سے یہ طے پایا کہ کانفرنس کو ملتوی کر دیا جائے تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ کو غیر رسمی گفتگو سے آپس میں سمجھوتہ کرنے کا موقعہ ملے۔

یہ گفتگو بھی ناکام ہوگئی۔ اس پر ویول نے تجویز کیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ ان کے پاس وہ فہرستیں بھیجے جن میں کم سے کم آٹھ (8) اور زیادہ سے زیادہ بارہ نامزد افراد کے علاوہ مندرج ذاتوں کے چار نمائندوں کے نام اور دوسری پارٹیوں کے علیحدہ علیحدہ تین تین نمائندوں کے نام ہوں اور وہ یہ نام اپنی اپنی پارٹیوں کے باہر سے بھی تجویز کر سکتے ہیں۔

فہرستوں کی وصولی کے بعد وائسرائے اپنے تصور کے مطابق کاغذ پر ایکزیکیٹو کونسل کی تشکیل کرے گا لیکن اپنی تجویزوں کو کونسل کے سامنے رکھنے سے پہلے وہ لیڈروں سے مشورہ کرے گا۔ کانگریس کے صدر نے وائسرائے کی تجویزیں منظور کرلیں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے 6/جولائی کو فہرست بھیج دی اور مسٹر جناح نے 7/جولائی کو وائسرائے کے سامنے یہ تجویزیں پیش کیں:

(1) مسلم لیگ وائسرائے کے پاس ناموں کا پنیل نہیں بھیجے گی بلکہ اس کے

نمائندے وائسرائے اور مسٹر جناح کے ذاتی بحث ومباحثہ کے بعد چھانٹے جائیں گے۔

(2) کونسل کے سارے ممبر مسلم لیگ سے ہوں گے اور

(3) کچھ موثر تحفظات وائسرائے کی ویٹو اختیارات کے علاوہ ہونے چاہئیں تا کہ کونسل کی اکثریت کے خلاف مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہو سکے۔

8/جولائی کو وائسرائے کی مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے مسٹر جناح کی تین تجویزوں پر تبادلہ خیال کیا اور 9/جولائی کو انھوں نے ان سے یہ کہا کہ وہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتے کہ مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ ہی نامزد کرے گی۔ مسٹر جناح نے وائسرائے کے پاس فہرست بھیجنے سے انکار کیا۔ ان کے انکار پر ویول نے خود فہرست تیار کی جو انھوں نے مسٹر جناح کو 11/جولائی کو دکھائی۔ اس میں چار مسلم لیگ کے نمائندے تھے ایک مسلمان ممبر پنجاب کی پارٹی سے تھا۔ اس طرح سے نہ صرف مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مساوات کی گارنٹی ہوئی بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ میں بھی مساوات کا امکان بڑھا۔ اس پر مسٹر جناح معترض رہے۔ وہ اس پر تیار نہ ہوئے کہ مسلم لیگ کے باہر سے کسی بھی مسلمان کو ایکزیکیٹو کونسل میں لیا جائے اور نہ وہ اس وقت تک تیار نہ ہوں گے جب تک کہ کونسل میں مسلم مفاد کے لیے مخصوص تحفظ نہ رکھا جائے۔ ویول نے ان دونوں شرطوں سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے مسٹر جناح کو بتایا کہ اس سے ان کے منصوبے کی ناکامی ظاہر ہوتی ہے اور وہ کانفرنس کو اس بارے میں مطلع کریں گے۔

ناکامی کا اعلان کرنے سے پہلے ویول نے فرانسس موڈی (Francis Mudie) ایون جنکنز اور اپنے دستوری مشیروی، پی مینن کو مطلع کیا کہ وہ وزیر ہند سے مراسلت قائم کئے ہوئے ہیں اور یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان تجویزوں پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

ویول تجاویز کی نامنظوری کنزرویٹو وزیر ہند اور کنزرویٹو چرچل کے لیے

ہندوستانی مسئلے کے حل کے سلسلے میں الوداعی تحفہ تھا۔

مسٹر ایمرے کے یاد رکھنے والے کاموں میں سے ایک کام یہ تھا جو انھوں نے لارڈ پیتھک لارنس کو چارج دینے سے پہلے انجام دیا تھا۔ ویول نے گاندھی جی کو بتایا کہ مسلم لیگ کے تعاون نہ کرنے کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہوگئی ہے۔

گاندھی جی کا مشورہ یہ تھا کہ اختلاف کی صورت میں اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ حکومت دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ کرے۔ وائسرائے نے کسی بھی قسم کا سمجھوتہ تھوپنے سے عدم اتفاق ظاہر کیا۔ 14 ر جولائی کو کانفرنس کے آخری اجلاس میں وائسرائے نے ایک بیان دیا جس میں کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "کامیابی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اگر چہ سب نے ان اشخاص کی فہرستیں دیدی تھیں جن میں سے وہ کونسل کے ممبروں کو چھانٹتے لیکن مسلم لیگ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے اپنی فہرست تیار کی اور اپنے حل کی وضاحت مسٹر جناح سے کی۔ انھوں نے اس حل کو مسلم لیگ کے لیے ناقابل قبول بتایا۔ میں نے محسوس کیا ان کے ساتھ شدید بحث اور مباحثہ کرنا بالکل بیکار ہوگا۔"

11- ناکامی کے اسباب

کانفرنس ناکام ہوگئی یہ قطعی ناممکن ہے کہ اس کی ناکامی کے اسباب کی چھان بین کی جائے کہ ناکامی کی کون سی پارٹی ذمہ دار تھی اور کن تصورات اور خیالات کی وجہ سے یہ افسوس ناک صورتحال پیدا ہوئی۔ تین خاص عوامل نے اس کانفرنس کی قسمت کا فیصلہ کیا اور اس کی ناکامی کا باعث ہوئے۔ یہ عوامل کانگریس، مسلم لیگ اور وائسرائے تھے۔ مسٹر جناح نے اپنے طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے ایک پریس کانفرنس

میں یہ کہا جس میں دوسری پارٹیوں کے نمائندوں نے بھی اپنے نقطہ نظر کی تشریح کی تھی۔ مولانا آزاد بول چکے تھے۔ انھوں نے برطانوی حکومت کو بری کرتے ہوئے مسلم لیگ کو کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ مسلم لیگ مرکز کی عارضی حکومت میں دو شرطوں پر شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔

(1) ایک تو یہ کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں ایک علیحدہ مملکت جنگ کے بعد قائم ہو۔

(2) اور چونکہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اس لیے ایکزیکیٹو کونسل میں دس ممبروں کی نصف تعداد اس کی بھی ہونی چاہیئے۔ ان شرطوں کو ویول نے ٹھکرادیا ان حالات میں وائسرائے کے پیش کردہ انتظامات کو منظور کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ ہم نے ان تمام چیزوں کو جن کے لیے ہم اب تک کوشاں تھے، شرمناک اور ذلت آمیز انداز سے چھوڑ دیں۔ ان کی آخری دلیل یہ تھی کہ اگر ہم اس انتظام کو قبول کر لیتے ہیں تو پاکستان کا مسئلہ غیر معینہ مدت کے لیے کھٹائی میں پڑتا جب کہ اس انتظام کے ذریعہ کانفرنس کو وہ سب کچھ حاصل ہوجاتا جو وہ چاہتے تھے یعنی ہندوستان کی ہندو قومی آزادی کے حصول کا راستہ صاف ہوجاتا۔ انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں ایمرے کی سند پیش کی۔ آخرالذکر نے دارالعوام میں کہا تھا کہ کوئی بھی عارضی ترقی یا پیش قدمی کسی طرح بھی اس سوال کے بارے میں پہلے سے فیصلہ نہیں کرسکتی، آیا کہ سمجھوتہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر ہوگا یا منقسم ہندستان کی بنیاد پر۔

مسٹر جناح کا بیان کانفرنس کی ناکامی کے بارے میں ان کو کسی طرح بری الذمہ نہیں کرتا لیکن ان کے پرجوش حامی اپنے لیڈر سے زیادہ آگے جانا چاہتے تھے۔ خلیق الزماں کے نزدیک کانگریس ہی خاص طور سے گفت وشنید اور مذاکرات کی ناکامی کی ذمہ دار تھی اس لیے کہ مسٹر جناح کے اس الزام کی وجہ سے [illegible]

پرست جماعت ہے، وہ غصہ میں بھری ہوئی تھی۔

انھوں نے مولانا آزاد پر بڑی لے دے کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ویول کی فہرست کو منظوری دی گئی ہوتی تو ایکزیکیٹو کونسل میں 7 (سات) مسلمان ممبر ہوتے۔ چودھری خلیق الزماں کو شکایت تھی کہ کونسل میں دراصل 5 مسلم لیگی ممبر ہوتے کیونکہ بقیہ دو میں ایک کانگریسی اور ایک یونینسٹ پارٹی کا ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں غیر لیگی ممبر مسلمان نہ تھے۔

کونسل آف اسٹیٹ میں مسلم لیگ کے لیڈر حسن امام نے مسٹر وی پی مینن کو اعتماد میں لے کر مذاکرات کی ناکامی پر اپنی دلی تشویش کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس تاثر کا بھی کہ وائسرائے کی پیش کش کو نامنظور کرنے کے بارے میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ایک رائے نہ تھے۔

مسٹر حسن امام نے یہ بھی کہا کہ وائسرائے اس سے بے خبر تھے کہ ایکزیکیٹو کونسل کا ایک خاص ممبر مسٹر جناح کو مشورہ دے رہا تھا کہ وہ اپنے موقف پر سختی سے ڈٹے رہیں۔ ممکنہ وثوق کے ساتھ یہ قیاس آرائی کی جاسکتی ہے کہ ان کا ایمرے سے رابطہ قائم تھا اور انھیں چرچل سے اس بات پر اتفاق تھا کہ ہم کوئی چیز دے نہیں رہے ہیں۔ ویول کے منصوبے کی کامیابی یہ تھی کہ بظاہر ہر چیز دی جارہی تھی، آزادی سے لے کر اتحاد تک۔ خلیق الزماں کے برعکس ڈاکٹر سعید کا خیال تھا کہ لارڈ ویول کے بیان کے باوجود کہ اس کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری ان پر ہے کہ مسٹر جناح کے غیر مصالحانہ رویہ سے کانفرنس ناکام ہوگئی۔ مصنف کے نزدیک اس کی متعدد وجہیں تھیں جنھوں نے کانفرنس کو ناکامیاب بنایا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی دونوں ویول کی اس تجویز کے مخالف تھے۔ ایک یونینسٹ مسلمان ممبر خاص کر خضر حیات خاں ان کے منظور نظر تھے۔ اور وہ ان کو ایکزیکیٹو شامل کرنا چاہتے تھے۔ وہ

بخوبی واقف تھے کہ اگر ایک دفعہ مسلم لیڈروں خاص کر پنجاب کے مسلمان لیڈروں پر یہ واضح ہوگیا کہ مسلم لیگ سے باہر رہنے کی صورت میں انھیں عہدے نہیں ملیں گے تو وہ جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔

دوسری ممکنہ وجہ یہ تھی کہ اب تک مسٹر جناح کا یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، ثابت نہیں ہوا تھا۔ مسلم لیگ ہر دلعزیز ہوگئی تھی۔ اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ 1937ء کے ان ضمنی الیکشنوں کے نتیجے تھے جواب تک ہوئے تھے، لگایا جاسکتا ہے۔

1937ء اور 1943ء کے درمیان صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کے 11 ضمنی الیکشنوں میں 8 میں مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن جہاں تک مسلم اکثریتی صوبوں کا تعلق تھا اس میں لیگ کوئی پوزیشن نہیں رکھتی تھی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبوں میں کانگریس وزارت تھی۔ بنگال میں دفعہ 93 نافذ تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت تھی۔ لیکن اس وزارت کا انحصار کانگریسی وزارت پر تھا۔

مسٹر جناح، جنھیں مسلم عوام میں اپنی دلعزیزی اور اثر کا پورا علم تھا، کو پوری امید تھی کہ الیکشن ہونے کی صورت میں وہ مسلم ووٹوں پر قابض ہو جائیں گے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ مسلمان اور برطانوی افسروں کی مدد سے وہ الیکشن میں کانگریس پارٹی کو شکست دیدیں گے اور اس کے لیے فضا ہموار ہوگئی تھی۔

مسٹر جناح نے خضر حیات خاں کو پارٹی سے نکال دیا تھا اور یونینسٹ پارٹی کے ممبروں میں اختلاف پیدا کرادیا تھا۔ اس پارٹی کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا تھا۔ ہندو جاٹ لیڈر چھوٹو رام جو پارٹی کے بہت بڑے ستون تھے، کے انتقال سے پارٹی بہت کمزور ہوگئی تھی۔

اس طرح مسلم لیگ ان وجہوں کی بنا پر کانفرنس کی کامیابی کی مطلق خواہاں نہ تھی

بلکہ اس پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ کانفرنس میں شامل کیوں ہوئی کیونکہ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایک بالکل علیحدہ اور الگ قوم کی ترجمان ہے۔ اس کا اس پر اصرار کہ اسے باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ مساوی درجہ میں رکھا جائے مشترک تصور سے بالکل ہم آہنگ نہ تھا۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی حلیف ہوسکتی تھیں اور مشترک حکومت قائم کرسکتی تھیں لیکن اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ دوقومیں مختصر مدت کے لیے ایک مشترکہ حکومت بنالیں گی۔ شملہ کانفرنس کے افتتاح کے بعد مسٹر جناح نے اس ابتدائی غلطی کو محسوس کیا اور ایسا راستہ اختیار کیا جس کا لازمی نتیجہ کانفرنس کو ناکام بنانا تھا۔ یہ بہت ہی حیران کن بات ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن سے ویول نے کانفرنس کو ختم کردیا اور شکست قبول کرلی۔ ویول نے مسٹر جناح کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیئے۔ خاص کر ایگزیکیٹو میں خضر حیات خاں کی شمولیت پر ہڈسن کا کہنا کہ وائسرائے نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ اس وقت مسٹر جناح کا مسلم لیگ پر کنٹرول نہیں تھا اور یونینسٹ پارٹی اس وقت بہت مضبوط تھی اور لیاقت علی خاں سمجھوتے کی مدافعت میں تھے۔ ملک میں بہت سے ایسے مسلمان تھے جو مسلم لیگ کے نظریے سے متفق نہ تھے اور یہ بھی بحث تھی اگر وائسرائے اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں تو مسٹر جناح اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح سے پارٹی کی تباہی روکی جاسکتی تھی اور باا ثر جماعتی سیاسی حکومت جنگ کے خاتمہ تک یا اس کے کچھ کم عرصے بعد تک برسراقتدار رہتی۔ صحیح یا غلط وقت بہت نازک تھا۔

ویول کے معاملے میں مہلک کمزوری ونسٹن چرچل کی ویول کے منصوبے سے بیزاری تھی کیونکہ اس منصوبے کے تحت ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کیا جارہا تھا۔ 25ر مئی کو مشترکہ حکومت ختم ہوچکی تھی اور خالص کنزرویٹو حکومت برسراقتدار تھی۔ چرچل کو جولائی میں الیکشن جیتنے اور ان کے دوبارہ برسراقتدار آنے کی توقع تھی اور ان کا

شہنشاہیت کو ختم کر کے سربراہ بننے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کا جنھوں نے انگلستان کا پورا ساتھ دیا تھا، ساتھ چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ یہ سب بخوبی جانتے ہوئے مسٹر جناح کے مشیروں نے ان کی پوری طرح ہمت افزائی کی تھی کہ وہ اپنے نہ جھکنے والے رویہ پر قائم رہیں اور ان کا یہ رویہ بالکل صحیح نکلا۔ اس لیے کہ جب ویول نے ایمرے سے اپنی فہرست جس میں مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا کے بارے میں مشورہ لیا تو انھوں نے انھیں باضابطہ طور پر یہ لکھ دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ناراض کرنے سے باز رہیں۔ ہڈسن کا کہنا ہے کہ جب تک وائسرائے، غلبے والی حکومت کے بارے میں نہ سوچیں گے وہ براہ راست اس نتیجے پر نہیں پہونچ سکتے اور نہ وہ مسٹر جناح کو کسی طرح روک سکتے ہیں۔ یہ بالکل صاف ہے کہ یہ ان کے منصوبے کا مقصد نہ تھا جس سے اس نے ملک معظم کی حکومت سے متفق ہونے پر اتنی محنت کی تھی۔ اس پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ منصوبے پر آگے بڑھیں۔ وہ لارڈ ویول کی اس توقع کے قائل نہ تھے کہ مرغی انڈے سے ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی رنگ کی حکومت پہلا ضروری قدم ہے۔ انھوں نے قبول کیا کہ ساری ہندوستانی پارٹیاں اس میں شامل ہوجائیں گی۔ مسٹر ایمرے کی مدافعت سے یہ ثابت ہوگیا کہ برطانوی حکمراں کانگریس کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اس پر تیار نہ تھے کہ اقتدار منتقل کیا جائے جو ویول چاہتے تھے۔ آزادی کے راستے میں اب سب سے بڑی رکاوٹ برطانوی مخالفت اور عدم اعتماد تھے (کم سے کم کنزرویٹو با اقتدار گروہ سے)۔

ویول کی شکست سے سب سے زیادہ فائدہ مسٹر جناح کو پہونچا۔ انھوں نے ہندوستان میں تاج برطانیہ کے سب سے بڑے نمائندے کی پوری تذلیل کی۔ انھوں نے اپنے دشمنوں خضر حیات خاں اور ان کی یونینسٹ پارٹی کو جو برطانوی حکومت کے بڑے چہیتے تھے بوٹ چاٹنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے کانگریس کے وقار کو کم کیا اور اس

میں کامیابی حاصل کی کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مساوات کو مان لے۔

مسٹر جناح نے کانفرنس کے دوسرے شرکاء کے جذبات کو بھی اپنے طرز عمل سے ٹھیس پہنچائی اور انتہائی غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا کیونکہ ان کا ایک ہی مقصد تھا، وائسرائے اور کانگریس کے عارضی حکومت کے قائم کرنے کا جس میں مسلم لیگ اقلیت میں ہوتی، اسے پورا نہ ہونے دیا۔ ان کی آنکھیں پاکستان کی منزل پر لگی ہوئی تھیں۔ عارضی حکومت ایک چال کی حیثیت رکھتی تھی اور مسلمانوں کی یک جہتی کو ختم کر سکتی تھی، اس کے بارے میں انہیں کوئی فکر نہ تھی۔

یہ ذرا بھی حیران کن نہیں تھا۔ شملہ کانفرنس کے بعد مسٹر جناح ایک فاتح کی حیثیت سے ابھرے اور مسلمانوں میں انھوں نے فاتح (ہیرو) کی پوزیشن حاصل کر لی۔ نہ تو مسٹر جناح نے اور نہ کسی اور نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی کامیابی تمام تر برطانوی حکومت کی مرہون منت تھی۔

کانگریس کا بھی اس کانفرنس میں کچھ حصہ تھا۔ 1940ء میں کانگریس نے قومی خودداری کا پرچم لہرایا تھا اور قومی مطالبوں کو اٹھایا تھا۔ اس نے پورے ہندوستان کے لیے مکمل خود اختیاری اور ہندوستانی ریاستوں کو جمہوری بنانے کا دعویٰ پیش کیا تھا۔ اس نے مرکز میں کابینی طرز حکومت کے لیے اصرار کیا کہ نظم و نسق کے محکمے سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو منتقل کر دئے جائیں اور وائسرائے کی حیثیت محض ایک برائے نام سربراہ کی ہو جس کے ہاتھ میں اختیارات نہ ہوں۔ بلاشبہ کانگریس کے دعوے بہت اونچے تھے مگر اس کو برطانوی حکومت کی محوری طاقتوں کی صلاحیت کا اندازہ بہت کم تھا۔ گاندھی جی نے برطانوی شہنشاہیت کو ایک دیوالیہ چیک سے تشبیہہ دی تھی لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ 1942ء میں باوجود ایشیا تا یورپ اور افریقہ میں بحری اور بری شکستوں کے برطانیہ جرمنی کے دفاعی دباؤ کے آگے نہیں جھکا اور اس نے امریکی امداد

سے آبدوزوں کے خطرے پر قابو پالیا۔ سب سے بڑھ کر اس کی مدافعت کی قوت سخت اور فولادی تھی اور یہ صرف چرچل کی محض شعلہ بیانی نہ تھی جب انھوں نے انگریز قوم کے اس عزم مصمم کا اعلان کیا کہ وہ دشمن سے سڑکوں، کھیتوں، میدانوں اور ساحلی کناروں پر لڑیں گے اور کبھی بھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

1944ء میں کانگریس کا وقار بہت اونچا تھا اور اس کا اثر بہت زیادہ تھا۔ امریکن اور چینی حکومتیں برطانوی حکومت پر ہندوستانی آزادی کے بارے میں دباؤ ڈال رہی تھیں جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ مسلم لیگ کا مسلمانوں پر بہت زیادہ اثر نہ تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں پاکستان کے مطالبے پر زیادہ سنجیدگی سے غور نہیں کیا جا رہا تھا۔ مسٹر جناح میدان میں بالکل یک وتنہا نظر آرہے تھے۔

1945ء میں حالات مکمل طور سے بدل گئے۔ برطانیہ کے سب سے بڑے اور طاقتور دشمن کو شکست ہو چکی تھی۔ جاپان فرار کے راستہ پر تھا اور اس کی دنیا میں پوزیشن بہت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ اس کو اتنے زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے تھے کہ اس کی معیشت تقریباً درہم برہم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی صنعتیں انتشار اور طوائف الملوکی کی حالت میں تھیں اس کی بیرونی تجارت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ملک امریکن مدد اور اعانت پر جی رہا تھا۔ مالی دیوالیہ پن کا خطرہ منڈلا رہا تھا اور خستگی کے آثار نظر آتے تھے۔ برطانیہ کا فخر وغرور بھی کم ہو گیا تھا اور 1942ء کے مقابلہ میں 1945ء میں برطانیہ کے حالات بہت ہمت شکن اور مایوس کن تھے۔

لیکن اگر کانگریس نے 1942ء میں برطانیہ کے تفوق کے بارے میں مبالغہ آرائی کی تھی تو وہ غلط تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اندازے کو کسی طرح حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ جب جنگ ختم ہو جائے گی تو برطانیہ کے پاس کوئی خاص وجہ ہمارے تعاون کے حاصل کرنے کی نہ ہوگی اس لیے ہمارے لیے

مناسب نہ تھا کہ لارڈ ویول کی پیشکش کو منظور کیا جائے اگرچہ وہ کرپس کی پیشکش سے کم فیاضانہ نہ تھی مگر اس میں طویل المیعاد حل کی کوئی دفعہ نہ تھی۔ نہ اس میں مکمل آزادی کا وعدہ تھا اور نہ اس میں جنگ کے معاوضہ کا ذکر تھا اور نہ وائسرائے ہند کے اختیارات ختم کرنے یا ترک کرنے کی بات کی گئی تھی اور کرپس پیشکش کے برعکس اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کو بالکل برابر کا رکھا گیا تھا۔

دوسری طرف کانگریس نے اس پر نگاہ نہیں ڈالی کہ جب اس کے لیڈر جیل میں تھے تو مسلم لیگ نے اس خلاء کا پورا فائدہ اٹھایا اور حکومت کی مہربانی اور تعاون سے اس کی تنظیمی کی طاقت میں زبردست اضافہ ہو گیا اور اس نے سرعت سے قدم اٹھائے۔ اب اس کے واحد نمائندہ جماعت ہونے کے دعوے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب اس کے مطالبہ پاکستان پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑ رہا تھا حالانکہ دوقومی نظریہ کی وجہ سے ضروری یا منطقی انتشار مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے لیے پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ نظریہ غلط تھا۔ لیکن ان علاقوں، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے کے لیے حق خود ارادیت کو جائز ٹھہرایا گیا اور ان کے لیے اس کو درست قرار دیا گیا۔

اگرچہ مسٹر جناح کے اس دعوے کہ وہ مسلم اکثریتی منطقوں کی طرف سے بولنے اور ان کی ترجمانی کا حق رکھتے ہیں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن ان کا یہ دعویٰ کہ باقی ماندہ ہندوستانی مسلمانوں کی بھی نمائندگی کرتے ہیں غلط اور غیر متعلق تھا۔ اس لیے کہ اول الذکر کو حق خود ارادیت اور جداگانہ قومیت کا جائز حق حاصل تھا اور نہ انھوں نے ایک علیحدہ قومی وجود کا مطالبہ کیا تھا۔ مسٹر جناح کو کسی طرح بھی دونوں یعنی مجوزہ پاکستان اور ہندوستان کا لیڈر بیک وقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ان حالات کی وجہ سے مسٹر جناح نے متحدہ ہندوستان کی عارضی حکومت کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

ویول کی پیشکش کو منظور کر کے کانگریسی لیڈروں نے یہ دکھایا کہ وہ آزادی کی جدوجہد سے تھک چکے ہیں اور وہ مجوزہ شرطوں پر سمجھوتہ کرنے کے لیے بیقرار ہیں۔ برعکس اس کے مسٹر جناح بہت زیادہ پراعتماد اور بہت زیادہ جارح تھے۔ کانفرنس سے پہلے بھی انھیں یقین واثق تھا کہ مسلم رائے دہندگان کی حمایت انھیں حاصل ہوگی اور انھیں اسی بات کا بےصبری سے انتظار تھا۔ انھوں نے کانفرنس کی ناکامی کا خیرمقدم کیا اور سیاسی بغض اسی طرح برقرار رہا۔

گیارھواں باب
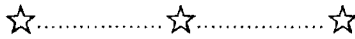
کیبنٹ مشن اور اس کے بعد ہندوستانی مسئلے پر لیبر حکومت کا موقف

شملہ کانفرنس کے افتتاح کے دو ہفتے بعد چرچل گورنمنٹ مستعفی ہوگئی اور 26 جولائی کو لیبر پارٹی کے لیڈر نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ حکومت کی اس غیر متوقع تبدیلی سے برطانوی رائے عامہ میں زبردست تبدیلی ہوئی۔ اپنے ہم وطنوں کی نگاہ میں جنگ میں فتح پانے کی تنظیم کرنے والے چرچل کی بہت زیادہ وقعت تھی۔ لیکن انگریز قوم جنگ سے تھک چکی تھی اور عوام عاجز آ چکے تھے۔ کشت وخون وتباہی بربادی کی جگہ وہ پرامن زندگی کے خواہاں تھے۔

پہلی دفعہ لیبر پارٹی نے دارالعوام کی سیٹیں اکثریت سے جیتی اور کنزرویٹو پارٹی سے اقتدار چھین لیا۔ لیبر پارٹی کی کامیابی کے ہندوستان میں لازمی طور سے اثرات پڑے۔ قوم پرست اور بہت سے کانگریسی اس سے خوش ہوئے۔ لیبر پارٹی سوشلسٹ اور انتہا پسندانہ اصولوں پر چلنے کا دعویٰ کرتی تھی اور عام طور سے ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کی آرزو کی حمایت کررہی تھی، اس لیے عام توقع تھی کہ یہ حکومت ہندوستان کی اپنے منزل تک پہونچنے میں مدد کرے گی۔

دوسری طرف مسلم لیگ بہت زیادہ ناخوش تھی۔ چودھری خلیق الزماں کے نزدیک مسٹر ایمرے کی جگہ لارڈ لارسن کا تقرر مسلمانوں کو یقین دلانے کے کافی تھا کہ لیبر

پارٹی ان کے ساتھ انصاف نہیں کرے گی لیکن نئی پارلیمنٹ کا افتتاح کرنے پر بادشاہ کی تقریر جو ''میرے ہندوستانی لوگوں'' سے شروع ہوئی تھی، یہ امید لیگ میں پیدا کردی تھی کہ لیبر پارٹی مسلمانوں کے مقصد کی پوری طرح مخالف نہ ہوگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایٹلی اور کرپس کے نام تہنیتی بحری تار اس خوش فہمی کا نتیجہ تھے کہ لیبر پارٹی ہندوستانی مسئلے کو حل کرے گی۔ اسی طرح مسلم لیگ کے خدشے بھی بے بنیاد تھے۔ ایک لحاظ سے لیبر پارٹی کا نقطہ نظر کنزرویٹو پارٹی کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف تھا۔ کنزرویٹو پارٹی نے اس اصول پر عمل کیا کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' اور لیبر پارٹی کا عمل تھا کہ ''پھوٹ ڈالو اور ہندوستان چھوڑ جاؤ۔''

لیبر پارٹی کانگریس کے عدم تعاون سے اتنی ہی ناراض تھی جتنی کہ کنزرویٹو پارٹی اس کی تصدیق ایٹلی اور گرین وڈ کی تقریروں سے ہوتی ہے جسے کرپس جو لیبر پارٹی کے چوٹی کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ کانگریس صرف اپنے لیے اقتدار چاہتی ہے جبکہ لیبر پارٹی کے بہت سے لیڈر بڑی احتیاط اور مرحلوں سے گذرنے کے بعد ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات تک لے جانا چاہتے تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ ہندوستان بورژوا طبقے اور مزدوروں کا مخالف نہ تھا۔ سب ہی کانگریسی لیڈروں گاندھی جی اور جواہر لال نے لیبر پارٹی کے اس طرز عمل کی نکتہ چینی کی۔ اس لیے نہ تو وزیر اعظم ایٹلی اور نہ وزیر ہند لارڈ لارنس اور نہ ہندوستانی مسائل کے ماہر کرپس نے اسے راز میں رکھا کہ وہ جنگی کابینہ کی 1940ء کی تجویزوں سے جو ہندوستان کو بھیجی گئی تھیں انحراف نہیں کرسکتے اور نہ مسلم اکثریتی صوبے ہندیونین سے علیحدہ ہوسکتے ہیں۔

لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد امریکیوں نے 9/اگست کو ہیروشیما اور 10/اگست کو ناگاساکی پر ایٹم بم برسائے اور 15/اگست کو اتحادیوں نے یوم فتح

منایا۔

اب جاپان کے خلاف جنگ ختم ہورہی تھی ۔ جنگ کے، بعد عارضی حکومت کا مسئلہ کوئی اہم مسئلہ نہ رہتا تو لارڈ ویول کے لیے طویل المیعاد سمجھوتے کے لیے ضروری اقدامات کرنے ضروری ہوگئے ۔ یکم اگست کو انھوں نے گورنروں کی کانفرنس طلب کی جنھوں نے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کے الیکشن کرانے پر زور دیا۔

6/ اگست کو مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں صوبہ جاتی اسمبلیوں کے تازہ الیکشن کرانے پر زور دیا اور پاکستان کا مطالبہ دہرایا۔ کانگریس بھی بغیر کسی تاخیر کے الیکشن چاہتی تھی۔

اس عام منظوری کے بعد 21/ اگست کو وائسرائے اور وزیر ہند نے یہ اعلان کیا کہ آنے والے موسم سرما میں الیکشن منعقد ہوں گے۔ لیبر گورنمنٹ نے باوجود مابعد جنگ کے معاملوں میں پوری طرح مشغولیت کے باوجود ہندوستانی مسئلے کو طے کرنے کے لیے لارڈ ویول کو انگلستان تبادلہ خیال کے لیے طلب کیا۔ 24/ اگست کو وائسرائے اپنے پرائیویٹ سکریٹری ایون جنکنس اور دستوری مشیر وی پی مینن کے ساتھ لندن روانہ ہوگئے۔ ان کی وزیر ہند اور کابینہ کی ہندوستانی معاملات کی کمیٹی سے گفتگو ہوئی اور انھوں نے آئندہ دستور اور اس کے مرتب کرنے کے بارے میں طریقہ کار کے سارے پہلوؤں کی خوب چھان بین کی۔

ہندوستانی مسئلے کے حل کرنے کے لیے ویول کے پاس دو متبادل تھے۔ ایک تو یہ ہندوستان پر قبضہ قوت اور طاقت کے زور سے قائم رکھا جائے اور جس کے لیے ہزار ہا ہزار کی تعداد میں برطانوی فوجیوں کی ضرورت تھی۔ دوسرا یہ کہ ذمہ داری ہندوستانی نمائندوں کو دیدی جائے۔ ایٹلی کا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف تھا کہ برطانیہ کو

ہندوستان چھوڑ دینا چاہئے۔

2-نئی ویول تجاویز

16 ستمبر کو ویول ہندوستان واپس آئے اور 19 ستمبر کو انھوں نے یہ اہم اعلان کیا کہ ملک معظم کا ارادہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو دستور ساز جماعت کو صوبہ جاتی اسمبلیوں کے الیکشن کے فوراً بعد طلب کیا جائے اور صوبوں میں اس امر کو جاننے کے لیے کہ آیا 1942ء کے اعلان کی تجویز صوبوں کے نمائندوں کو قابل قبول ہے یا کوئی دوسرا متبادل ان کے لیے قابل ترجیح ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ریاستوں سے بھی مشورہ کیا جائے کہ کس انداز اور طریقے سے وہ دستور ساز جماعت میں حصہ لے سکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ حکومت اس معاہدے کے مسودے پر غور کر رہی ہے جو برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ہوگا۔ چوتھے یہ کہ ایک نئے ایگزیکٹیو کونسل کی تشکیل جو ہندوستان کی اہم جماعتوں کی حمایت سے معاشی اور سماجی مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ہوگی اور نئے عالمی نظام میں ہندوستان کی پوزیشن کے بارے میں تفصیلی تجویزیں مرتب کرے گی۔

19 ستمبر کو اٹلی نے بھی لندن سے ایک تقریر نشر کی اور انھوں نے بادشاہ کی تقریر کی طرف توجہ دلائی جس میں انھوں نے یہ وعدہ کیا تھا: ”میری حکومت کی انتہائی کوشش ہوگی کہ ہندوستان لیڈروں میں مکمل خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے ان میں اتحاد کو ترقی دے۔“

انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت کرپس کی منشاء کے مطابق کام کرے گی۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان میں ویول کے اعلان کو دوہرایا۔ 19 سے 23 ستمبر تک بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ ولبھ بھائی پٹیل نے ویول تجاویز کے

بارے میں یہ ریزولوشن پیش کیا کہ جو تجویزیں اب پیش کی گئی ہیں وہ ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہیں۔لوگوں کے عزم کو ظاہر کرنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی طے کرتی ہے کہ ہونے والے الیکشنوں میں مقابلہ کیا جائے۔اس ریزولوشن میں یہ ترمیم پیش کی گئی کہ ان علاقوں کے ممبران کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کریں کہ وہ ہندوستان کی یونین میں شامل ہوں گے یا نہیں۔جواہر لال نہرو اور پٹیل نے اس کی مخالفت کی اور یہ ترمیم نامنظور ہوگئی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولوشن کے دوسرے حصے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اور آنے والے الیکشن کی تیاری کے لیے شروع دسمبر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ کلکتہ میں ہوا۔کمیٹی نے الیکشن مینی فسٹو تیار کیا جس میں کہا گیا کہ ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ ہوگا جس کے سارے شہریوں کو بنیادی حقوق اور آزادی حاصل ہوگی۔ وہ جمہوریہ ایسی فیڈریشن ہوگی جس کی وحدتوں کو خودمختاری حاصل ہوگی۔

مجالس قانون ساز بالغوں کی رائے دہندگی کی بنا پر منتخب ہوں گی۔یہ فیڈریشن ان تمام وحدتوں، جو اپنی مرضی سے اس میں شامل ہوں گے کا مجموعہ ہوگا۔اس میں فیڈرل یونین کو کم سے کم مگر اشد ضروری اختیارات و امور تفویض کیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ اضافی امداد کی فہرست بھی ہوگی اور یہ امور صوبوں کے حیطہ اختیار میں ہوں گے۔ ہندوستان کی آزاد مملکت کی ہیئت ترکیبی کے علاوہ مینی فیسٹو نے بھی اس کی وضاحت کی کہ اس مملکت کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے اور ہندوستان کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی۔لیکن مینی فیسٹو کا بہت زیادہ زور آزادی پر تھا جسے اتحاد اور قوت سے حاصل کیا جائے گا۔ مینی فیسٹو میں فرقہ وارانہ تنازعوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔اس میں سارے شہریوں کے لیے بلاتفریق مذہب وملت اور نسل وتمدن، آزادی ومساوات اور بنیادی حقوق پر زور دیا گیا تھا۔مسلم لیگ کے صدر اور سکریٹری نے ان تجویزوں کو

نا قابل قبول ٹھہرایا۔ اس لیے کہ اس میں آئندہ دستور پر غور وخوض کرنے کے لیے پاکستان کے قیام کے مطالبے کو قبول نہیں کیا گیا تھا۔

3-آزاد ہند فوج کا مقدمہ

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اس موقعہ کا خیر مقدم کیا جس کے ذریعہ وہ ووٹروں پر اپنا اثر جما سکیں اور اپنے وعدوں کو صحیح ثابت کر سکیں۔ لیکن ووٹنگ ہونے سے پہلے ایک واقعہ رونما ہوا جو الیکشن کے لیے بہت اہم تھا۔ یہ آزاد ہند فوج کے افسروں کا مقدمہ تھا۔ جاپانیوں کو برما سے نکالنے کے بعد برطانوی فوجوں نے انہیں گرفتار کرلیا تھا۔ ان کے خلاف یہ الزامات تھے کہ انھوں نے ملک معظم کے خلاف جنگ چھیڑی تھی اور وہ اپنے ساتھی قیدیوں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے انتہائی سفاکانہ طریقے استعمال کرنے کے مجرم تھے۔

ایک فوجی ٹریبونل مقرر کیا گیا اور ان کا یہ مقدمہ مشہور لال قلعہ میں ہوا۔ کانگریس نے اس مقدمے کو لڑنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ممتاز وکیلوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان میں بھولا بھائی ڈیسائی بھی تھے جو خاص وکیل دفاع تھے۔ دوسرے وکیلوں میں جواہر لال نہرو اور تیج بہادر سپرو تھے۔

اس مقدمے سے ملک میں زبردست جوش وخروش پھیل گیا اس لیے کہ اس مقدمے کا تعلق سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج سے تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے ہیرو تھے۔ انھوں نے ملک کی آزادی اور قوم کے لیے بہت سے اقدامات کئے تھے۔ بہت سے شہروں میں مظاہرے ہوئے اور جلسے بھی ہوئے۔ کانگریسی لیڈروں نے جوشیلی تقریریں کیں جن میں انھوں نے آزاد ہند فوج کی بے حد تعریف کی اور ان کے قابل ستائش کارناموں اور برطانوی حکومت کے ظلم وستم کی مذمت کی۔ اس کے ساتھ انھوں

نے برطانوی حکومت کے جنوبی مشرقی ایشیا، فرانس، ہالینڈ پر دوبارہ تسلط جمانے کی مذمت کی۔ لوگوں کے جذبات ابھارے جا چکے تھے اور وہ کانگریس کے پرچم کے تلے بڑے جوش وخروش سے جمع ہوئے۔ مولانا آزاد نے بیان کیا کہ جہاں وہ گئے وہاں بری، بحریہ اور فضائیہ کے فوجی ان سے ملے اور انھوں نے کانگریس سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ انھوں نے اس عجیب وغریب معاملے کو بھی بیان کیا کہ دوسری عالمگیر جنگ میں فوجی اور غیر فوجی مسلوں کے مابین تفریق بہت کم ہوگئی تھی اور فہرست میں مندرجہ ذاتوں کے لڑکے جو پہلے فوج میں داخل نہیں ہوئے تھے داخل ہونے لگے تھے۔ وہ محبّ الوطن نوجوان تھے اور انھیں بھی ملک کی آزادی کی تمنا تھی۔

4-1946ء کے الیکشن

کانگریس قومی اتحاد اور حب الوطنی کی لہر پر تکیہ کیے ہوئی تھی۔ برطانوی مخالف جذبات کو کم کرنے کے لیے وزیر ہند نے 4 ر دسمبر 1945ء کو پارلیمنٹ میں ایک دوسرا اعلان کیا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ حکومت الیکشن ختم ہونے پر بلا تاخیر دستور بنانے والی جماعت کو قائم کرے گی۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ پارلیمنٹ کا ایک خیر سگالی وفد ہندوستان جائے گا۔ اس تقریر پر ہندوستان میں مخالفت کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن پارلیمنٹ کے خیر سگالی وفد کے آنے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ مسلم لیگ نے بھی اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

7 ر دسمبر کو کلکتہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں کانگریس نے اپنا مینی فیسٹو تیار کیا اور ایک ریزولوشن منظور کیا جس میں عدم تشدد کی پالیسی کو دوہرایا گیا اور عمل کرنے کی سفارش کی گئی لیکن پارلیمنٹ کے وفد کی آمد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس اثنا میں سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے الیکشن منعقد ہوئے، جن میں کانگریس کی پوزیشن

اتنی مضبوط تھی کہ اس کی کامیابی یقینی تھی لیکن مسلم لیگ کی آزمائش ہونی تھی۔ بلاشبہ مسلم لیگ عوام میں بہت مقبول تھی لیکن مسلم اکثریتی صوبوں کی حکومتوں کی حمایت اسے حاصل نہ تھی مثلاً پنجاب میں خضر حیات خاں مسلم لیگ پارٹی کے قیام کے لیے یونینسٹ پارٹی کو پنجاب میں ختم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بنگال میں اس کے چوٹی کے دو لیڈروں خواجہ ناظم الدین اور سہروردی میں دوستانہ تعلقات بالکل نہ تھے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے میں کانگریسی لیڈر خاں عبدالغفار خاں کی ہردلعزیزی اور مقبولیت کو لیگ سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ مسلم لیگ کو برطانوی حکومت اور مسلم افسروں کی پوری ہمدردی اور سرپرستی حاصل تھی۔ چودھری خلیق الزماں تسلیم کرتے تھے کہ عبدالرحمٰن اور حسن اختر دو صوبائی افسروں نے مسلم لیگ کی زبردست مدد کی۔

چودھری خلیق الزماں کے نزدیک گورنر مسلم لیگ کے مقصد اور عزائم کے پورے طور سے قائل اور حامی تھے۔ انھوں نے ہی مسلم لیگ کو نازک موقعہ آنے پر پاکستان کے لیے بچالیا۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے کے گورنر اولف کیرد بھی مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اس الیکشن میں کانگریس کو غیر مسلم انتخابی حلقوں میں 91.3 فیصدی ووٹ ملے۔ 1934ء کے اسمبلی الیکشن میں 44 سیٹوں کے مقابلے میں اس بار 57 سیٹوں پر کامیاب ہوئی۔

سینٹرل اسمبلی میں مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے مخصوص تمام 30 سیٹوں پر کامیاب ہوئی۔ صوبہ جاتی اسمبلی کے الیکشنوں میں دونوں پارٹیوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی جو مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتی ہے۔

1946ء الیکشن

	کانگریس	مسلم لیگ	غیر لیگی
آسام	58	31	3
بنگال	86	113	6
بہار	98	34	6
بمبئی	125	30	x
سی، پی، برار	92	13	1
مدراس	165	29	x
شمالی مغربی سرحدی صوبہ	30	17	19
اڑیسہ	47	4	x
پنجاب	51	73	13
سندھ	18	27	7
یوپی	153	54	12
	923	425	67

دونوں پارٹیوں نے 1946ء کے مقابلے میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط بنالی۔ کانگریس نے سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کی 102 منتخبہ سیٹوں کی اکثریت 57 سیٹیں حاصل کرلیں جب کی مسلم لیگ مسلم کو سیٹوں پر سو فیصدی کامیابی حاصل ہوئی۔

1937ء میں صوبوں میں کانگریس نے 845 جنرل نشستوں میں اور کانگریس کی 714 پر کامیابی حاصل کی تھی۔ 1946ء میں اس کا تناسب بڑھ کر 86 فیصدی ہوگیا یعنی کانگریس نے بڑے اچھے اور محکم طریقے سے چرچل اور ایمرے اینڈ کمپنی کے اس بالکل غلط اندازے کی تردید کی کہ کانگریس کا ہندوستانی عوام پر اثر نہیں ہے۔ اس

جماعت اور تنظیم کے بارے میں حکومت کا زبردست پروپیگنڈہ اور انتہائی جبر اور استبداد کی پالیسی دونوں بری طرح ناکام ہوئے بلکہ الٹے ان دونوں چیزوں سے کانگریس کو ہندوستانی عوام کی نظر میں عزت اور محبت بڑھانے میں مدد ملی۔ مسلم لیگ کی کامیابی خاص طور سے نمایاں اور قابل ذکر تھی۔ مسٹر جناح اور اس پارٹی کے سب سے بڑے اور سب سے نمایاں لیڈر تھے۔ لیکن یہ تضاد کہ مسلمان اکثریت میں یا اقلیت میں ہیں، مسئلہ لاینحل بنا رہا۔ امر واقعہ یہ ہے غیر منقسم ہندوستان کے نقطہ نظر سے مسلمان اقلیت میں تھے اور مسٹر جناح کے نقطہ نظر سے بلاشبہ شمال مغرب اور مشرقی منطقوں میں وہ اکثریت میں تھے۔ یہ دعویٰ جائز تھا کہ حق خود اختیاری رکھنے کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ باقی ماندہ ہندوستان میں ان کی حیثیت مذہبی اقلیت کی تھی لیکن وہ ہندوستان کا ایک جزو لاینفک تھے۔ الیکشن کے نتیجے ہندوستان کے اتحاد کے تصور کے لیے مضرت رساں تھے۔

1937ء کے الیکشن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین جو مخالفت پیدا کر دی تھی اسے 1946ء کے الیکشن نے اور زیادہ بڑھا دیا۔ ہر مجلس قانون ساز میں دونوں پارٹیاں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد 50 فیصدی کے بقدر تھی لیکن غیر مسلم صوبوں میں کانگریس کو غیر معمولی اکثریت حاصل تھی۔ اول الذکر صوبوں میں حکومت غیر لیگی ممبروں کے تعاون سے ہی بن سکتی تھی لیکن آخر الذکر صوبوں میں کانگریس دوسری پارٹیوں کی محتاج نہ تھی۔

اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں کی آپسی مخالفت نے انتہائی شدت اختیار کر لی تاہم اس اختلاف کی وجہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کی تھی۔

5- دستوری مسئلے کے بارے میں حکومت کی تجویزیں

الیکشن کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے دونوں حصوں میں جنھیں خود مختاری حاصل تھی اور جو آزادی کا مطالبہ کررہے تھے کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ یکم جنوری 1946ء کو لارڈ لارنس نے اپنے ذاتی پیغام براڈ کاسٹ میں برطانوی عوام اور برطانوی حکومت کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کو جلد سے جلد برطانوی دولت مشترکہ میں پورے اور مساوی طور سے شریک دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب مسئلہ ایک عملی مسئلہ ہے یعنی یہ کہ کوئی منطقی یا قابل قبول عملی منصوبہ تیار کیا جائے۔ منصوبہ ایسا ہو جس کے تحت اقتدار ہندوستان کو حکومت کی شکل میں منتقل کیا جائے اور ہندوستان اندرونی جھگڑوں کا شکار نہ ہو۔

اس اعلان سے دستور کے مرتب کرنے کے بعد کے اقدامات کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ جس وقت الیکشن ہورہے تھے برطانوی پارلیمنٹ کا خیر سگالی وفد ہندوستان میں تھا۔ انھیں آزادی کے بارے میں ہندوستانیوں کے احساسات اور جذبات کا اندازہ ہوا اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے کہ اس مطالبے پر ہندوستان میں پورا اتفاق تھا حالانکہ ہندوستانیوں میں حکومت کے طرز وشکل کے بارے میں گہرے اختلافات تھے۔

25/جنوری کو وائسرائے نے نئی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایکزیکیٹو کونسل کے ممبروں کو نامزد کرنے کا اعلان کیا جو سیاسی لیڈروں پر مشتمل ہوگی اور جس قدر جلد ممکن ہوگا دستور ساز جماعت کو بھی مقرر کیا جائے گا۔ کانگریس لیڈروں نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا لیکن مسٹر جناح نے اپنے اس موقف کو دہرایا کہ مسلم لیگ کسی عارضی انتظام میں اس وقت تک حصہ نہ لے گی جب تک کہ پاکستان کے مطالبے کو فوری طور سے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

19 ؍جنوری 1946ء کو لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں ان اقدامات کا اعلان کیا جو حکومت ہندوستانی رائے عامہ کے لیڈروں سے مشورہ کرنے کے بعد ہندوستان میں مکمل خود اختیاری حکومت قائم کرنے کے لیے اٹھائے گی۔ اقدامات یہ تھے:

(1) برٹش انڈیا کے منتخبہ نمائندوں اور ہندوستانی ریاستوں سے ابتدائی مشورے کرنا تاکہ دستور سازی کے طریقہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ رضامند حاصل کی جائے۔

(2) دستور ساز جماعت قائم کرنا۔

(3) ہندوستان میں حکومت خود اختیاری قائم کرنا۔

انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ کابینہ کا ایک اسپیشل مشن جو لارڈ پیتھک لارنس کے ایگزیکیٹو بورڈ کے صدر مسٹر اسٹیفر ڈ کرپس اور بحریہ کے فرسٹ لارڈ اے۔ وی۔ الیگزینڈر پر مشتمل ہوگا، ہندوستان جائے گا اور وائسرائے کے ساتھ مل کر اس مسئلہ پر کارروائی کرے گا۔

15 ؍مارچ کو وزیراعظم اٹیلی نے ایک مباحثے کے دوران یہ کہا کہ ان کے رفقاء کار ہندوستان اس ارادے کے ساتھ جا رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کو آزادی دلانے میں پوری کوشش کریں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر کو ان الفاظ میں ختم کیا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور یہ کہ اقلیتیں خوف وخدشات سے بے خوف ہو کر زندگی بسر کریں گی تاہم اقلیت کو اس کا حق نہیں دے سکتے کہ وہ اکثریت کی مرضی پر کسی قسم کا ویٹو یا حق تنسیخ لائے۔

ان کی تقریر پر کانگریس نے بڑی خوش دلی کا مظاہرہ کیا اور اسے بہت مشتہر کیا۔ گاندھی جی، آزاد اور نہرو نے اس تقریر کی بڑی تعریفیں کیں اور ان کی اس تقریر کا موازنہ

چرچل کی اس تقریر سے کیا جو انھوں نے کرپس مشن کے بارے میں 15 / مارچ کو کی تھی کہ اس کے دوررس نتائج ہوں گے۔ دوسری طرف حکومت نے اس تقریر پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے مسلم قوم کے بجائے اقلیت کے استعمال کیے جانے پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور انھوں نے پاکستان کے بارے میں اپنے موقف کو دہرایا۔

23 / مارچ 46 کو کابینی مشن ہندوستان آیا۔

لارڈ پیتھک لارنس نے 25 مارچ کو کراچی میں ایک پریس انٹرویو میں کہا: '' ہندوستان کی آزادی کے اسٹرکچر کی طرف سڑک ابھی صاف نہیں ہے لیکن مشن نے اپنی کوششوں کو کامیاب بنانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔'' انھوں نے اس کی وضاحت کی کہ اس کا ابتدائی مقصد ایک ایسی مشنری قائم کرنے کا کام ہے جس کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کے معاملے طے کرسکیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بارے میں عارضی انتظام کرسکیں۔ عملی تجویزوں اور دعووں کے بارے میں کرپس نے کہا: '' کہ اگر ملکہ وکٹوریہ کے عہد سے لے کر ان تک جو کچھ کیا گیا ہے اس طرف مڑیں گے تو ایک بڑی خطرناک اور ابتر صورتحال میں جا پڑیں گے۔''

مسلم لیگ کے شک وشبہات کو دور کرنے کے لیے پیتھک لارنس نے دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا: '' جہاں کانگریس ایک بہت بڑی نمائندہ جماعت ہے، دوسری طرف مسلم لیگ کو محض ایک اقلیتی پارٹی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ وہ اہم مسلم ملت کی اکثریت کی نمائندہ جماعت ہے۔''

مشن تقریباً پانچ چھ ہفتے گورنروں، دائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبروں، اقلیتوں اور مخصوص مفادات کے نمائندوں، صوبوں کے وزرائے اعلیٰ، ممتاز شخصیتوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں سے تبادلہ خیال اور گفتگو مصروف رہا۔

کانگریس کا ردعمل

کانگریس کا نقطۂ نظر مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا۔ اس کا اصل اور بنیادی مطالبہ آزادی کا تھا جسے دستور میں داخل کیا جاتا اور وہ سارے ملک کے لیے تھا لیکن عبوری دور کے لیے ضروری تھا کہ ایک عارضی حکومت قائم کی جائے جو اسمبلی کے قیام اور مختلف مرحلوں کے انتظام کے لیے ہو۔

مستقبل کے بارے میں اس کا منصوبہ یہ تھا کہ ایک فیڈرل حکومت ہو جس کے محدود اختیارات ہوں۔صوبوں کو سارے اختیارات بشمول باقی ماندہ اختیارات حاصل ہوں گے۔دستور سازی کا کام مکمل ہونے کے بعد انھیں ان متبادلوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا:

(1) دستور سے باہر رہیں۔

(2) فیڈریشن میں لازمی امور کے لیے شامل ہوں۔

(3) لازمی اور اختیاری امور کے لیے فیڈریشن میں شامل ہوں۔

عارضی حکومت کی تشکیل میں ہندو اور مسلمان ممبروں کی مساوات کے اصول سے کانگریس متفق نہ تھی۔ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ممبروں کے الیکشن کے لیے اس نے تجویز کیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابی کالج بنایا جائے۔ جہاں تک ریاستوں کا تعلق تھا اس کی رائے تھی کہ لوگوں کے نمائندوں کو نظر انداز نہ کیا جائے اور ان کو پرجا منڈل منتخب کریں۔

گاندھی جی نے اپنے انٹرویو میں مشن کی توجہ راجگوپال آچاریہ کے فارمولے کی طرف مبذول کرائی اور اس کی سفارش کی کہ اس کی بنیاد پر گفت وشنید کی جائے کیونکہ وہ دوقومی نظریہ کو بالکل غلط سمجھتے تھے اور اس کو ماننے کے لیے وہ کسی طرح تیار نہ تھے۔ عارضی حکومت کے بارے میں ان کی تجویز تھی کہ مسٹر جناح سے اپنی مرضی کے مطابق

حکومت بنانے کو کہا جائے اور اگر وہ انکار کر دیتے ہیں تو کانگریس کو موقعہ دیا جائے۔

مسٹر جناح نے مشن کے سامنے اپنا یہ نظریہ دوہرایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ صرف انگریزوں ہی نے ہندوستان پر اتحاد کو تھوپا تھا۔ لیکن یہ اتحاد تمام تر خارجی تھا ان کے خیال میں انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے یا ہٹ جانے کے بعد کوئی بھی طاقت اس اتحاد کو برقرار نہ رکھ سکے گی اس لیے ضروری تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے اور اقتدار کو دو با اقتدار آزاد مملکتوں کو منتقل کر دیا جائے۔

مسلم لیگ سے اتفاق کرتے ہوئے وزیر ہند نے ہندوستان کے بارے میں ایک اہم نکتہ اٹھایا کہ نہ تو اس کے پاس فضائیہ ہے اور نہ بحریہ اس لیے محض بری طاقت سے وہ کسی بیرونی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس خطرناک صورتحال کے مدنظر ہندوستان کو برطانیہ کی مدد پر انحصار کرنا ہوگا۔ لیکن جب تک ہندوستان مناسب شرطیں نہیں پیش کرتا اس وقت تک برطانیہ سے اسے مفید مدد نہیں حاصل ہو سکتی اور نہ اسے برطانوی تعاون حاصل ہو سکے گا۔ اس رائے سے مشترکہ دفاع کے میلان کا اظہار ہوتا ہے۔

سکھ لیڈر متحدہ ہندوستان کی موافقت میں تھے۔ ہندوستان میں مندرجہ ذاتوں کے دونوں گروپوں نے انسانی حقوق کی گارنٹی اور اپنے مفاد کے لیے تحفظات کا مطالبہ کیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں وہ مسلم لیگ کے مطالبے کے مخالف تھے۔ ہندو مہا سبھا نے اقتدار کی فوری منتقلی پر اصرار کیا اور ملک کی سالمیت اور اس کے ناقابل تقسیم ہونے پر زور دیا۔ لبرل لیڈر ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے لیکن عارضی حکومت، مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین مساوات کی حامی تھے۔

مسلم لیگ کا ردعمل

ہندوستان کے آئندہ دستور کے بارے میں کابینہ کے مشن کی متذبذب پالیسی کو دیکھ کر مسلم لیگ نے مسلم ممبران مجالس قانون ساز نے مرکز اور صوبوں دونوں کا ایک کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ پاکستان کے بارے میں اپنے اتفاق رائے اور عزم سے مشن کو متاثر کر سکے۔ 7، 8 اور 9 / اپریل کو پانچ سو ممبران مجالس قانون ساز نے دہلی میں منعقدہ اس کنونشن میں شرکت کی۔ یہ ان کے اختیار کردہ نصب العین کی مدافعت میں عدیم المثال مظاہرہ تھا۔ مسٹر جناح جنھوں نے اس کی صدارت کی تھی یہ اعلان کہ پاکستان کے بااقتدار مملکت ہونے کے مسئلے پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے اس لیے کہ ہمارا مقصد بالکل صحیح اور ہمارا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ اپنے مقصد کے لیے ہم لڑیں گے اور ضرورت پڑی تو ہم جانیں بھی دیدیں گے لیکن پاکستان لے کر دم لیں گے۔ انھوں نے بحث کا آغاز کیا۔ انھوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر وہ سو ملین مسلمانوں کو اور کئی ملین اقلیتوں کی توقعات اور ہندوستان کو بیچنا چاہتی ہے تو یہ برطانیہ کی تاریخ میں سب سے بڑی ٹریجڈی ہوگی مگر یہ کبھی بھی وقوع پذیر نہ ہونے پائے گی۔

فیروز خاں نون نے جو حکومت کے بڑے ذمہ دار عہدے پر فائز رہ چکے تھے، بڑی ہی شعلہ بار تقریر کی جس میں مسلمانوں کے برترین جذبات کو بھڑکایا۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

"اگر برطانیہ ہم پر حکومت مسلط کرے گی تو پھر جو تباہی اور بربادی مسلمانوں کے ذریعہ ہوگی اس کے آگے ہلاکو اور چنگیز خاں کی ہلاکت گردی بھی صفر ہو کر رہ جائے گی۔"

کنونشن نے ایک ریزولوشن پاس کیا جس میں پاکستان کا مطالبہ کیا اور اس کے ڈیلی گیٹوں نے اللہ کے نام پر ایک عہد کیا کہ وہ پاکستان کے حصول کے لیے ہر ممکن

خطرہ مول لیں گے اور ہر قسم کی قربانی دیں گے جس کا ان سے مطالبہ کیا جائے گا۔

6-کابینہ مشن کا منصوبہ

25 / جون سے 14 جولائی 1945ء تک ہونے والی کانفرنس سے اس کا صاف اندازہ ہو گیا کہ برطانیہ حکومت کی لیبر پارٹی نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے لیے حکومت حق خود اختیاری کو اب روکا نہیں جا سکتا۔ برطانوی حکمراں جواب اقتدار کی منتقلی کے حق میں تھے یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کس پارٹی یا کن پارٹیوں کو اقتدار منتقل کیا جائے۔ کانگریس سے اتفاق کیا جائے اور ہندوستان کے سیاسی اتحاد کو کچھ محدود مشترک مقاصد اور اغراض کے لیے برقرار رکھا جائے یا مسلم لیگ کے نقطہ نظر کو قبول کر لیا جائے۔ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور پورے طور پر کلیتًا دو آزاد مملکتوں کو قائم کیا جائے۔ کانگریس متبادل کی مدافعت کے اسباب بلاشبہ بڑے مفید اور ناقابل تردید تھے لیکن مسلم لیگ کے اعتراضات، خدشات نفرت اور حسد پر مبنی تھے۔

اس آویزش میں انجام کار جذبات عقل پر غالب آئے۔

کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے ایسا حل تلاش کرنے کی کوشش کی کہ جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہو یعنی بقیہ ہندوستان کے اتحاد کو ترک کر کے مسلم لیگ کے مطالبوں کو مان لیا جائے۔

16 / اپریل کو مشن نے مسٹر جناح سے دوبارہ انٹرویو کیا اور متبادل میں سے ایک کے بارے میں ان سے ترجیح پوچھی۔ ایک بااقتدار پاکستان جو صرف ان اضلاع پر مشتمل ہو جن میں مسلمان اکثریت میں ہوں یا خود مختار صوبوں پر جو کہ ہندوستان کی فیڈریشن کا حصہ ہوں۔ دوسرے دن مشن کی ملاقات مولانا آزاد سے ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کے فیڈرل یا مرکز کے اسٹرکچر کے بارے میں اپنے خیالات پیش

کرنے کو کہا۔ انھوں نے کہا کہ ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کیے بغیر اس بارے میں کانگریس کی رائے نہیں بتا سکتے۔طویل المیعاد منصوبے کے بارے میں ان کی ذاتی رائے یہ تھی کہ وہ مکمل آزادی کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ اس کے دستور کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی مرتب کرے۔عبوری دور کے لیے انھوں نے عارضی حکومت کے قیام کی وکالت کی اور یہ تجویز کیا کہ وہ 15 وزیروں پر مشتمل ہو جس میں 11 کا انتخاب صوبے کریں اور 4 کا انتخاب اقلیتیں کریں۔جن امور کا تعلق فیڈرل حکومت سے ہو ان کی دو قسمیں ہوں:

(1)لازمی (2)اختیاری

اور آخر الذکر کے (چننے) کا حق صوبوں کا ہونا چاہئے جن کو باقی ماندہ اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔لیکن وہ ہندوستان کی تقسیم سے بالکل اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس تجویز کے بارے میں کہ صوبوں کا ایک فیڈریشن ہو جو ان امور کا انتظام اور انصرام کرے جو اس کے اپنے صوبائی گروپ نے دئے ہوں، ان کا ردعمل یہ تھا کہ اس پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے بارے میں انھوں نے بڑے پرزور انداز میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ان کے نزدیک یہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل نہ تھا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے بالکل برعکس تھا۔انھوں نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ دو ملک ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ایک دوسرے کے مسئلے حل نہیں کرسکیں گے بلکہ باہمی یرغمالوں کا مسئلہ پیدا کر کے انتقام کی پالیسی کو جنم دیں گے۔

جب 12 / اپریل کو ورکنگ کمیٹی کے سامنے مولانا آزاد نے اپنی اسکیم پیش کی تو پہلا ردعمل شک وشبہہ کا تھا۔آخر کار کمیٹی اس کی معقولیت کی قائل ہوگئی۔گاندھی جی نے اس حل سے اپنا پورا اتفاق ظاہر کیا پھر ایک نئی اسکیم کانگریس اور مسلم لیگ کے سامنے رکھی گئی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک یکجہتی دستور تجویز کیا جائے جس میں صوبوں

کے گروپ اور مرکز ہوں۔ اس اسکیم پر غور کرنے کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس شملہ میں بلائی گئی۔ یہ کانفرنس صوبوں کی گروپ بندی اور فیڈرل یونین کی طرز پر دستور کو مرتب کرنے اور اس پر غور وخوض کے لیے شروع ہوئی۔

پہلے تین دنوں کے بحث ومباحثہ کے بعد وزیر ہند نے 8 رمئی کو کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس ایک نوٹ بھیجا جس پر 9 رمئی کو کانفرنس میں غور وخوض ہونا تھا۔ اس نوٹ میں کچھ ایسی تجویزیں پیش کی گئی تھیں جن کی رو سے پارٹیوں میں اتفاق اور اتحاد ہوسکتا تھا۔ اس میں ایک آل انڈیا فیڈرل یونین کے قیام کا ذکر تھا جو تین امور کا انتظام اور انصرام کرتی جس میں سب اختیارات صوبوں کو حاصل ہوتے۔ اور اس میں یہ بھی تجویز کا گیا تھا کہ یونین کی مجالس قانون ساز اور انتظامیہ ہندو اکثریتی اور مسلم اکثریتی صوبوں میں نمائندوں کی مساوی تعداد پر مشتمل ہوگی۔ اس میں یہ دفعہ بھی رکھی گئی تھی کوئی بھی صوبہ اس مجلس قانون ساز کی اکثریت سے دس سال کے بعد دستور کی نظر ثانی کا مطالبہ کرسکتا تھا اور دس سال کے وقفے کے بعد اس دستور ساز جماعت کی تشکیل نو، ممبران اور کارکردگی کے بارے میں بھی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔

مسلم لیگ کے صدر نے جواب دیا کہ اس نوٹ میں مندرج تجویزیں ان کو قابل قبول نہیں ہیں لیکن مسلم لیگ کے ممبر اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار ہیں۔ جواہر لال نہرو نے ان تجاویز کے بارے میں اعتراضات اٹھائے اور عارضی حکومت کے فوری قیام کو جو سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے منتخبہ ممبروں کے روبرو ذمہ دار اور جواب دہ ہو، کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے جماعتوں میں اختلافات دور کرنے کے لیے ایک امپائر مقرر کرنے کی بھی تجویز پیش کی۔ کانفرنس کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ نہرو اور جناح کسی سمجھوتے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ ملاقات بے سود اور بے نتیجہ رہی۔ اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کو اپنے مطالبوں پر مشتمل میمورنڈم دیے۔

اس لیے 12 رمئی کو کانفرنس سرکاری طور پر ختم کردی گئی۔

چار دن بعد 16 رمئی کو مشن نے ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے اپنی سفارشیں پیش کی تھیں۔ ان کی رو سے ہندوستان خود آئندہ دستور کے متعلق فیصلہ کرے اور اسی اثنا ملک کا انتظام چلانے کے لے ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔

اعلان میں پہلے پاکستان کے مطالبے پر غور کیا گیا۔ یہ اندازہ کہ شمال مغربی خطے میں چار صوبے ہیں جو پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ پر مشتمل ہیں اور ان کی کل آبادی میں 62 فیصدی مسلمان اور 38 فیصدی غیر مسلم تھے۔ مشرقی منطقی میں یہ تعداد اس طرح تھی: 36.45 ملین مسلمان تھے، 36.6 ملین غیر مسلم ان اعداد کی بنا پر مشن کا یہ فیصلہ تھا کہ مسلم لیگ کے دعووں کا ایک علیحدہ پاکستان اقلیتی مسئلوں کو حل نہ کر پائے گا۔ اس لیے علاوہ اس کے کوئی جواز نہ تھا کہ با اقتدار پاکستان کی مملکت میں پنجاب، بنگال اور آسام کے ان اضلاع کو شامل کیا جائے جن کی آبادی میں غیر مسلموں کا غلبہ نہ تھا۔

صوبوں پر مشتمل پاکستان کے دعووں کو مسترد کرنے کے بعد مشن نے کہا کہ چھوٹا پاکستان جس میں غیر مسلم اقلیتی علاقے نہ ہوں عملی طور سے بنایا جانا ممکن نہ تھا۔

اس منصوبۂ پاکستان پر یہ اعتراض بھی تھا کہ وہ مذکورہ صوبوں کے عوام کی بڑی تعداد کی مرضی کے خلاف ہوگا اور مغرب میں سکھوں کو دو حصوں میں تقسیم کردے گا۔ مشن نے پاکستان کے بارے میں انتظامی، معاشی اور فوجی نقطہ نظر سے عذر کیا مثلاً مواصلاتی نظام آل انڈیا بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس کو اب الگ کرنے سے ہندوستان کے دونوں حصوں میں لوگ بری طرح متاثر ہوں گے۔ مسلح فوجوں کی تقسیم اور زیادہ خطرناک ہوگی۔ ویول نے دراصل اس کو بتایا کہ ہندوستان منقسم ہوگیا تو پاکستان کو اپنے تحفظ کے لیے دوسروں کا محتاج ہونا پڑ سکتا ہے۔

مشن نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ پاکستان کے دونوں حصوں کی غیر محفوظ سرحدیں ہندوستان میں تھیں اوراس طرح پاکستان کا تحفظ بہت ناکافی اور غیر تسلی بخش رہے گا۔ تیسرے یہ کہ تقسیم کی وجہ سے ریاستوں کا معاملہ اور پیچیدہ ہوجائے گا۔ آخر میں جغرافیائی حالات پر سب سے زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کے دونوں بازو ایک دوسرے کو ہندوستانی علاقے کے سات سو میل تک علیحدہ کرتے ہیں۔ اس سے جنگ اور صلح دونوں زمانوں میں رسل ورسائل تمامتر ہندوستان کے خیر سگالی کے جذبے پر منحصر ہوگا۔

ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مشن اس قابل نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دے کہ وہ اقتدار کو مکمل طور سے الگ الگ دو آزاد ملکوں کے حوالے کرے۔

7-مشن کی خاص تجویزیں

(1) ایک انڈین یونین ہو جس کے ذمہ تین امور ہوں:

(1) امور خارجہ (2) ڈیفنس (3) مواصلاتی نظام۔ اس کے ساتھ ان سب کا انتظام کرنے کے لیے یہ ضروری مالیاتی وسائل فراہم کر سکے۔

(2) برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل یونین کا اپنا انتظامیہ اور مجلس قانون ساز ہوگی۔ کسی اہم فرقہ وارانہ مسئلے پر فیصلہ دونوں اہم ملتوں کے حاضر اور موجود نمائندوں اور ایوان میں موجود ووٹ دینے والے ممبروں کی اکثریت سے ہوگا۔

(3) یونین کے تفویض کردہ امور کے سوا سارے امور اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔

(4) ریاستوں کو یونین کو تفویض کردہ امور کے سوا سارے امور اور اختیارات

حاصل ہوں گے۔

(5) صوبوں کو گروپ بنانے کی آزادی حاصل ہوگی، جن کی انتظامیہ ہوگی اور ہر گروپ صوبوں کے مشترک امور کے بارے میں فیصلہ کرسکتا ہے۔

(6) ہر گروپ کی یونین کے دستور میں یہ دفعہ ہوگی کہ دستور پر ہر دس سال بعد نظر ثانی کی جائے۔

دستور ساز جماعت کے متعلق مشن نے یہ تجویز کیا کہ دستور ساز اسمبلی کی تشکیل حالیہ منتخبہ صوبہ جاتی اسمبلیوں کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ لیکن نقائص کو دور کرنے کے بعد ہر صوبے کو اتنی سیٹیں دی جائیں جو ایک معین آبادی پر ایک ممبر کے تناسب سے ہوں۔

صوبوں میں سیٹوں کی تقسیم دونوں اہم ملتوں کی آبادی کے تناسب سے ہو۔ اس تجویز میں سفارش کی گئی کہ صوبائی دستور ساز اسمبلی کے ممبران کا انتخاب فرقوں کے ممبروں میں سے کیا جائے۔

اپنے ابتدائی اجلاس میں اسمبلی اپنی کارروائی کی ترتیب کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ چیرمین اور دوسرے عہدے داروں کا انتخاب کرے گی اور ایک مشاورتی کمیٹی کو منتخب کرے گی جو شہریوں کے حقوق کے بارے میں فیصلہ کرے گی، اقلیتوں کے تحفظات طے کرے گی اور قبائلی اور مستثنیٰ علاقوں کے انتظام کے بارے میں طے کرے گی۔

ابتدائی اجلاس کے بعد اسمبلی اپنے کو 3 سیکشنوں میں جو اے، بی، سی کے گروپوں پر مشتمل ہونگے، تقسیم کرے گی۔ ہر سیکشن میں شامل نمائندے صوبوں کا دستور مرتب کریں گے اور یہ بھی طے کریں گے کہ ہر گروپ کے لیے کیا دستور بنایا جائے۔ صوبوں کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ دستور کے تحت الیکشن ہونے کے بعد اس گروپ سے علیحدہ ہو جائیں۔

اس کے بعد ان سیکشنوں کا متحدہ اجلاس ہوگا اور یہ ریاستوں کے نمائندوں کے ساتھ یونین کا آئین مرتب کریں گے اور اس اجلاس میں مشاورتی یا ایڈوائزری کمیٹی کی سفارشوں پر بھی غور کیا جائے گا۔

اقتدار کی منتقلی کے بعد پیدا شدہ امور کے بارے میں اسمبلی، یونین اور متحدہ سلطنت کے درمیان معاہدے کے بارے میں گفت وشنید کریں گی۔

کابینی مشن کی یہ تجویز تھی کہ ملک کا ایڈمنسٹریشن چلانے کے لیے جب کہ دستور سازی کا کام چل رہا ہو سیاسی پارٹیوں کی تائید اور حمایت سے ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔

16 رمئی کو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے وزیراعظم ایٹلی نے مذکورہ تجویزیں پیش کیں۔ اپوزیشن کے لیڈر چرچل ان تجاویز کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اقلیتوں کے بارے میں برطانیہ کے راگ کو پھر الاپا یعنی مسلمانوں اور فہرست میں مندرج اقوام اور ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں۔ اگر چہ انھوں نے اقرار کیا کہ برطانیہ ہتھیاروں کے بل پر ہندوستانی زندگی کے اہم عناصر کی مرضی کے خلاف کوئی دستور ہندوستان پر تھوپ نہیں سکتا۔ انھوں نے اپنی پارٹی کے آئندہ طریقہ کار کے بارے میں آزادی کا حق محفوظ رکھا۔

16 رمئی کے براڈ کاسٹ میں پیتھک لارنس نے وعدہ کیا کہ ان کی اسکیم کا خاص مقصد دونوں پارٹیوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے معاملوں میں ہم آہنگی یا مطابقت پیدا کرنا تھا یعنی ہندوستان اور پاکستان کا اتحاد۔ کرپس نے اپنی پریس کانفرنس میں یقین دلایا کہ مشن ہندوستان اس لیے آیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو اقتدار منتقل کرے۔ ویول نے پارٹیوں سے اپنی رائے دینے کو کہا تا کہ جلد ایک نئی حکومت قائم ہو جو ان [illegible] کا مقابلہ کر [illegible] (Auchinleck) کمانڈر

انچیف نے مسلح فوجوں کے بارے میں مشن کی تجویزوں کی وضاحت کی کہ جنگ کمیٹی کے ممبر ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کے سیاسی پہلوؤں کے ذمہ دار ہوں گے اور کمانڈر انچیف بری، بحری اور فضائی فوجوں کی کمانڈ کے ذمہ دار ہوں گے۔

8- کانگریس کا جواب

گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ گاندھی جی نے ان تجویزوں کا خیر مقدم کیا لیکن ان کا انتباہ یہ تھا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ایک با اقتدار اور با اختیار جماعت ہے اور وہ دستور کو کسی خارجی یا بیرونی اقتدار کے بغیر مرتب کرے گی۔ وہ مشن کی تجویزوں کو منظور بھی کر سکتی ہے، انھیں مسترد بھی کر سکتی ہے اور انھیں زیادہ بہتر بنا سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان امتیاز اور تفریق کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ وہ فیڈریشن کے تصور کو مسترد کر سکتی ہے اور اس منصوبے پر فوری عمل درآمد کر سکتی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس طرف توجہ دلائی کہ یہ اسکیم کانگریسی مطالبوں سے انحراف کے مترادف ہے۔ اس نے اسمبلی کی با اختیار حیثیت پر زور دیا۔ اسے عارضی حکومت کی حیثیت اور اختیارات پر بھی اعتراض تھا اور یوروپینوں کے دستور ساز جماعت میں حصہ لینے پر بھی اعتراض تھا۔ ہندوستان میں برطانوی فوجوں کے مصارف برداشت کرنے پر اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں ہندوستانی ریاستوں کی نمائندگی پر اسے اصرار تھا۔

مسلم لیگ کا جواب

اس اسکیم سے مسلم لیگ بہت زیادہ غیر مطمئن تھی۔ مسٹر جناح نے ایک طویل بیان بھیجا جس میں اس اسکیم کے خلاف مسلم لیگ کے اعتراضات شامل تھے۔ انھوں

نے اس کی زبردست مذمت کی کہ پاکستان کے مطالبے کو مسترد کر دیا گیا اور مسلمانوں کو دو منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یہ کہ دو کے بجائے ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی جس میں ہندوؤں کی زبردست اکثریت تھی تجویز کی گئی اور مسلم لیگ کے اصرار کو نظر انداز کر کے ایک یونین سارے ہندوستانیوں کے لیے تجویز کی گئی۔ اس کے ساتھ انتظامیہ اور مقننہ (مجلس قانون ساز) مساوات کے مطالبے کا ذکر نہیں کیا گیا اور فرقہ وارانہ مسئلے پر فیصلہ اسمبلی کے چیرمین کے اوپر چھوڑ دیا گیا اور یہ کہ بنیادی حقوق، اقلیتوں کے تحفظات مندرجہ اور استثناء علاقوں کا انتظام کرنے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اسمبلی کو دیا گیا ہے۔

مشن کا جواب

25رمئی کو مشن نے اپنے جواب میں اس اسکیم پر کانگریس اور مسلم لیگ کے اعتراضات اور نکتہ چینی کا جواب دیا۔ انھوں نے یہ یقین دلایا کہ اسمبلی اور اس کے فیصلوں میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی۔ جب دستور مرتب ہو جائے گا تو ملک معظم کی حکومت، پارلیمنٹ سے اس کی سفارش کرے گی کہ وہ ایسی ضروری کارروائی کرے کہ جس سے اقتدار ہندوستانی لوگوں کو منتقل ہو جائے۔

صوبوں کے اختیار کے بارے میں کہ صوبے اس گروپ، جس میں وہ شامل کیے گئے ہیں، سے باہر آسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ حق وہ دستور کے مکمل ہونے کے بعد ہی استعمال کر سکیں گے۔ مشن نے اس سے اتفاق کیا کہ عارضی حکومت اور اس کے سارے محکمے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔ ان کے ممبروں کو سیاسی پارٹیوں سے مشورے کے بعد مقرر کیا جائے گا۔ روزمرہ کے انتظام میں انھیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہوگی۔ نئی حکومت موجودہ ایکٹ کے تحت کام کرے گی۔ ان کو انفرادی

طور سے یا اپنے طور پر مستعفی ہونے پر کوئی روک نہ ہوگی اگر انھیں مقننہ کا اعتماد حاصل نہ رہے۔

مولانا آزاد نے وائسرائے سے یہ تحریری تصدیق چاہی کہ عارضی حکومت سینٹرل اسمبلی کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ ویول نے 30 /مئی کو مولانا آزاد کو جواب دیا کہ مسئلہ باہمی اعتماد کا تھا۔ ہم اس کے قائل ہو گئے کہ کس طرح تعاون کریں کہ ہندوستان میں بیرونی کنٹرول سے آزادی کا جذبہ پیدا ہو۔

ویول نے کانگریس اور مسلم لیگ کو تجویزوں کی منظوری کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ رسے پر چلنے سے زیادہ خطرناک تھا۔ انھوں نے اپنے 30 /مئی کے خط کے ذریعہ کانگریس کے کچھ شبہات کو دور کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی جب کہ انھیں جناح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

4 /جون کو لکھے ہوئے خط میں جس میں ذاتی اور خفیہ کے ریمارکس تھے، انھوں نے مندرجہ ذیل وعدے کئے کہ آپ کو کیبنٹ مشن کی طرف سے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ کسی پارٹی کے ساتھ کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی اس منصوبے کو جیسا کہ یقین دلایا گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ دونوں پارٹیاں منظور کرلیں گی۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے مشن کی تجویزوں کو 6 /جون کو منظور کرلیا۔ لیکن اس نے بے شمار نکتے اٹھائے جن پر غور کرنا ضروری تھا۔

وہ دستور سازی میں شرکت پر تیار تھی لیکن اسمبلی میں بحث مباحثے کے دوران اس کے ممبروں نے اپنے بولنے کے حق کو محفوظ رکھا۔ عارضی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں اس نے مسٹر جناح کو وائسرائے سے گفت وشنید کا حق دیا۔ مسٹر جناح نے وائسرائے کو یاد دلایا کہ انھوں نے اپنی گفتگو میں یہ کہا تھا کہ کونسل 12 ممبروں پر مشتمل ہوگی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے پانچ پانچ، سکھوں کا ایک اور ایک

ہندوستانی یا اینگلو انڈین ممبر ہوں گے۔ لیکن اہم محکمے کانگریس اور مسلم لیگ میں تقسیم ہوں گے۔ لیکن وائسرائے نے انکار کیا کہ انھوں نے اس قسم کی کوئی یقین دہانی کرائی تھی۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں تذبذب کا شکار تھیں یعنی 16 ر مئی کے منصوبے کو یک لخت مسترد کرنے میں انھیں پس وپیش تھا لیکن اس پر بھی وہ رضامند نہ تھیں کہ اس منصوبے کو اسی صورت میں منظور کرلیں جس صورت میں یہ پیش کیا گیا تھا۔ سکھ ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے اور اسکیم کی صوبوں کی گروپ بندی اور کمزور مرکز کے بھی مخالف تھے۔ فہرست میں مندرجہ اقوام کے لیڈر گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ امبیڈکر گروپ اس کا مخالف تھا کہ دستور با اقتدار اسمبلی بنائے اور دوسرا گروپ جس کی قیادت جگجیون رام اور دوسرے لوگ کر رہے تھے کانگریس کے نقطہ نظر سے متفق تھا۔

9- عارضی حکومت

مذاکرات سے یہ ظاہر ہوگیا کہ مستقل یا آئندہ حکومت کے بارے میں پارٹیوں میں اتنا زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں اتحاد ہونے کی کوئی امید نہیں۔ لیکن شاید عارضی حکومت کے قیام پر وہ رضامند ہوجائیں۔ اس لیے وائسرائے نے مختصر المیعاد مسئلے کو حل کرنا چاہا۔

ایک طرف وائسرائے کی خط وکتابت کانگریسی لیڈروں سے ہوئی اور دوسری طرف مسٹر جناح سے 12 ر جون کو عارضی حکومت کی جگہوں کو پر کرنے کے لیے گفتگو شروع ہوئی۔ چونکہ کوئی سمجھوتہ دونوں پارٹیوں میں اس مسئلہ پر نہ ہوا اس لئے 16 ر جون کو وائسرائے نے ایکزیکیٹو کونسل کے بارے میں خود اس تجویز کا اعلان کیا کہ یہ ایگزیکیٹو پندرہ (15) اشخاص پر مشتمل ہوگی جس میں 6 کانگریسی ہوں گے، ایک

شیڈول کاسٹ، 5 مسلم لیگ کے ممبر ہوں گے، ایک سکھ، ایک عیسائی اور ایک پارسی نمائندہ ہوگا انھوں نے ان ناموں کا بھی اعلان کیا جنھیں انھوں نے منتخب کیا تھا۔

اپنا اصل رویہ ظاہر کرنے سے پہلے مسٹر جناح نے 19 /جون کو بہت سے نکتوں پر وضاحت چاہی جس میں اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ آیا مسلم ممبروں کی مخالفت کے باوجود کونسل میں فرقہ وارانہ مسئلے پر بحث ومباحثہ ہوگا۔ وائسرائے نے ان تمام مسئلوں کے بارے میں اطمینان بخش جواب دیا اور یہ دہرایا کہ کسی اہم فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں اگر دونوں پارٹیاں اس کی مخالف ہوں تو عارضی حکومت فیصلہ نہیں کرے گی۔ انھوں نے مسٹر جناح کو اس کا اطمینان دلایا کہ نہ تو ان کے لیے اور نہ کیبنٹ مشن کے لیے ممکن ہوگا کہ کسی ایسی درخواست کو قبول کریں جو مسلم لیگ کو قبول نہ ہو۔ ان تمام جوابوں نے مسٹر جناح کو ایسی پوزیشن عطا کردی جس کی رو سے مسلم لیگ کے لیے تمام تر فائدے کے ساتھ وہ سودے بازی کر سکتے تھے۔

مسٹر جناح کے 19 /جون کے خط کے جواب میں وائسرائے کی تشریح 21 /جون کو کانگریس صدر کے پاس بھیجی گئی۔ 25 /جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا جس میں اس نے عزم مصمم کیا کہ کونسل میں کسی نیشلسٹ مسلمان کے نامزد کرنے کے وہ اپنے حق سے دستبردار نہ ہوگی اور نہ مساوات کے اصول کو منظور کرے گی۔

کمیٹی کے نزدیک فرقہ وارانہ مسئلوں کے بارے میں لیگ کی تجویز جسے وائسرائے نے منظوری دیدی تھی انتظامی لحاظ سے ناقابل عمل تھی۔ ان اعتراضات اور مسٹر جناح کو وائسرائے کی طرف سے دئے گئے جوابات کی وجہ سے وائسرائے نے 16 /جون کی تجویزوں کو نامنظور کردیا لیکن دستور بنانے والی جماعت کے قیام اور اس کے بارے میں 16 /مئی کے بیان میں جو خدشات اٹھے تھے ان پر اپنے تحفظات

اورتشریح پر قائم رہتے ہوئے ،وائسرائے نے اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ ورکنگ کمیٹی نے دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے 16 / جون کی تجویزوں اوران کی نامنظوری پر اظہار افسوس کیا۔25 / جون کو وائسرائے نے مسٹر جناح کو مطلع کیا کہ کانگریس نے 16 / مئی کے بیان کو منظور کرلیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے 16 / جون کی تجویز کے مطابق مجوزہ عارضی حکومت میں شامل ہونے سے انکار کردیا ہے اوراس انکار کی وجہ سے 16 / جون کی اسکیم پر عمل درآمد کرنے سے وہ قاصر ہیں لیکن وہ ایسی عارضی حکومت قائم کرنے کا اقدام کریں گے جو ان تمام پارٹیوں کی نمائندہ ہو جو 16 / مئی کے بیان کو منظور کرنے کے لیے تیار ہیں۔

مسٹر جناح نے وائسرائے کو 16 / جون کے بیان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لکھا اوران وعدوں کو پورا کرنے کے لیے کہا جو وائسرائے نے کیے تھے یعنی اگر کوئی پارٹی تعاون نہ کرے گی تو وائسرائے اس پارٹی کی مدد سے جس نے 16 / جون کی تجویزیں منظور کی ہیں حکومت بنائے گی۔ چونکہ کانگریس نے انکار کردیا ہے اور مسلم لیگ نے بیان کو منظور کرلیا ہے تو مسلم لیگ کو حکومت بنانے کا موقعہ دیا جائے۔

ویول نے کہا تھا کہ چونکہ 16 / جون کے بیان کو ضروری منظوری حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تھی اس لیے اب وہ اپنی مرضی سے حکومت بنانے میں بالکل آزاد ہیں۔اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سرکاری افسروں پر مشتمل کونسل کو نامزد کریں اوراس کے ساتھ انھوں نے کہا کہ 16 / مئی کی اسکیم کے مطابق کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے الیکشن کرائے جائیں اور اس کا اجلاس طلب کیا جائے ۔عارضی حکومت کے بارے میں گفت وشنید ناکام ہوئی۔ کیبنٹ مشن اوروائسرائے کی مسلسل اور پیہم کوشش بھی ناکام رہی۔ ان حالات میں ناکامی بالکل قدرتی تھی اور ذرا بھی خلاف توقع نہ تھی۔ وائسرائے کو بھی اس کا اندازہ تھا۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو 15 / جون کو لکھا:

''ایسا لگتا ہے کہ ہفتوں کی سودے بازی کے بعد کانگریس، حکومت کس قسم کی ہو، کے بارے میں بھی اٹل تھی۔ دوسری پیشکش کو نامنظور کرنے کے بعد کیا ہوگا، یہ بالکل غیر یقینی ہے لیکن جو کچھ ہوگا ناخوشگوار ہوگا۔''

کیبنٹ مشن کے ممبر بھی اپنی کوششوں کے بارے میں پر امید نہ تھے۔ ان میں باہمی اختلافات تھے۔ کرپس کانگریس کے نقطہ نظر کو ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت کی ترجمانی سمجھتے تھے اور اس لیے ان کا خیال تھا کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ ویول اور الیگزنڈر مسلم لیگ کے دعووں کی حمایت کرتے تھے۔

ہڈسن نے لکھا:

'' کرپس کے خیال میں مشن کو ہر صورت میں کانگریس سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ ان کے خیال میں مسلم لیگ کے بغیر معاملے طے کرنا چاہئے۔'' ویول اور الیکونڈر کے خیالات بالکل مختلف تھے۔

اسٹیفرڈ محسوس کرتے تھے کہ اگر کانگریس سے اختلاف کیا گیا تو ان کو کسی قسم کی رعایتیں دینے سے پہلے مستعفی ہوجانا چاہئے۔ وائسرائے کچھ بھی کہنے کو تیار نہ تھے۔

10- کیبنٹ مشن کی ناکامی

مشن نے دو اسٹولوں پر بیٹھنا چاہا اور وہ نہ تو وہ کانگریس کو مطمئن کر سکا اور نہ جناح کو۔ وہ حد درجہ مایوس ہوئے اور 29 رجون کو ہندوستان سے انگلستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ چالیس سال تک برطانوی حکمراں مسلمانوں کو کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے اکساتے رہے کہ حکومت خود اختیاری کے مطالبے کو روکا جائے۔ اس پالیسی کا منطقی نتیجہ مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبے کی صورت میں ظاہر ہوا جسے چرچل، ایمرے اور لن لتھ گو کی پوری تائید حاصل تھی۔

لیبر پارٹی کے لیڈروں میں ایٹلی اور گرین وڈ کی ہمدردی ہندوستان کے ساتھ تھی۔ عالمگیر جنگ نے برطانوی لیڈروں پر یہ حقیقت عیاں کردی تھی شہنشاہیت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش محض ایک بیکار کوشش ہے۔ اگر چہ اب وہ قائل ہو چکے تھے کہ اقتدار کی منتقلی کو نہیں روکا جاسکتا لیکن انھیں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں اختلاف تھا۔ یعنی اتحاد یا تقسیم۔ یہ اختلافات کیبنٹ مشن کے ممبروں کی رایوں میں بھی پائے جاتے تھے اور یہ ناکامی کے ذمہ دار ہوئے۔ ہندوستان میں برطانوی بیوروکریسی کے سربراہ وائسرائے تھے جن کے شرمناک کانگریس مخالف رویے نے سیاسی تعطل اور جمود کو حل ہونے سے روک دیا اور متحدہ آزاد ہندوستان کے حصول کے امکانات کو بالکل تباہ و برباد کردیا اور مکمل طور سے ناقابل عمل تجویز پاکستان کو مملکت کے روپ میں ابھرنے میں مدد کی۔

بدقسمتی سے پاکستان کے سراب نے مسلمانوں اور ان کے لیڈروں کو اس قدر مسحور کرلیا کہ ان کی ساری تنقیدی قوتیں سلب ہو کر رہ گئیں تھیں۔ ان کے لیے کسی دوسری متبادل اسکیم پر سنجیدگی سے غور کرنا ناممکن ہو گیا تھا اور اپنی منزل سے ذرا بھی انحراف وہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔

اگر انھوں نے کیبنٹ مشن کے 16 رمئی یا 16 رجون کے بیانات کو پس وپیش کے ساتھ منظور کیا تو اس کی دو وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے سرپرستوں اور ان کے حلیفوں کی خواہشات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ویول انہی خاص وجہوں کے پیش نظر چاہتے تھے کہ برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں میں کچھ کمزور قسم کا اتحاد برقرار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہندوستان تقسیم ہو گیا تو ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ آزاد ہندوستان کو اپنی فوجی کمزوری کی وجہ سے برطانوی امداد کی ضرورت ہوگی۔

دوسرے مسٹر جناح کو اس کا یقین تھا کہ 16 رمئی 1946ء کے بعد جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے، اس سے مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم یکجہتی برقرار نہ رہ پائے گی۔ اس لیے جب ویول اپنے کیے ہوئے وعدوں اور قول و بیان سے پھر گئے تو مسٹر جناح نے اطمینان کی سانس لی اور پھر پاکستان کے مطالبے پر واپس آ گئے۔ مسٹر جناح اور ویول اور ان کے برطانوی حامیوں نے اپنی خفت کو کانگریس خاص کر گاندھی جی اور نہرو کو مورد الزام ٹھہرا کر مٹائی۔

11- کانگریس اور لیگ

کیبنٹ مشن کی روانگی کے بعد صورتحال یہ تھی کہ کانگریس نے عارضی حکومت سے متعلق 16 رجون کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے دستور ساز اسمبلی کی تجویز کو چند شرطوں کے ساتھ منظور کر لیا تھا۔ مسلم لیگ نے 6 رجون کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہونے پر اظہار رضامندی کیا تھا اور 25 رجون کو عارضی حکومت کے متعلق 16 ر جون کے منصوبے کو منظور کر لیا۔

کانگریس نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں بعض شرطوں اور تشریحات کے ساتھ شرکت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 6 رجولائی کو اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے 26 رجون کی تجویز کی توثیق کی۔ لیکن اس کے نومنتخب صدر نہرو نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ان کا کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں داخلے کا فیصلے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم شریک ہونے پر راضی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ذرہ برابر بھی اس کے پابند نہیں ہیں کہ ہم نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک اخباری بیان میں انھوں نے زور دے کر کہا وہ اسمبلی کے تعلق سے کسی طرح کا

فیصلہ کرنے کے لیے مکمل طور سے آزاد ہیں۔ انھوں نے برطانوی مشن کی اقلیتوں کے لیے انتظامات اور برطانوی حکومت سے معاہدہ کرنے کے بارے میں تجویزوں کی تردید کی اور صوبوں کی گروپ بندی کی بھی شدید مخالفت کی۔

مجوزہ یونین حکومت کے لیے ان کی رائے تھی کہ کیبنٹ مشن کے اعلان میں مندرج امور کے علاوہ فوجی صنعتوں کے امور، خارجی، تجارت، کرنسی اور قرضے بھی شامل ہونے چاہئیں۔ یہ بھی لازمی ہے کہ مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے کا حق حاصل ہو اور اسے صوبوں کے مابین جھگڑوں کے طے کرنے کے اختیارات بھی حاصل ہوں۔ اور انتظامی اور اقتصادی گڑبڑ ہونے کی صورت میں بھی اسے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

نہرو کی غیر محتاط تقریر کی وجہ سے زبردست غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ مولانا آزاد نے کہا کہ کانگریس منصوبے کو جس طرح چاہے بدلنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔ ہم اس پر راضی تھے کہ مرکزی حکومت فیڈرل ہوگی اور مرکز کے لازمی امور کی فہرست ہوگی اور بقیہ امور صوبوں کے دائرہ اختیار میں ہوں گے۔

مزید براں ہم اس پر راضی ہو گئے تھے کہ 3 سیکشن اے۔ بی اور سی ہوں گے جن میں صوبوں کی گروپنگ ہوگی۔ دوسری پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر کانگریس امور کو نہیں بدل سکتی۔

18 / جولائی کو لارڈ پیتھک لارنس نے دارالامراء میں کانگریس کو متنبہ کیا کہ وہ 16 / مئی کے اعلان اور اس کے مطابق کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے انتخاب کو منظور کرنے کے بعد اب اس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اعلان شدہ امور سے روگردانی کرے۔ کرپس نے دارالعوام میں اسے واضح کیا کہ صوبوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ صوبوں اور گروپوں کے دستور اساسی مرتب کرنے کے لیے میٹنگوں میں شامل رہیں چاہے

دستور کی منظوری کے بعد وہ گروپ سے علیحدہ ہو جائیں۔

مسٹر جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کی 27/ جولائی کی میٹنگ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولوشن کے بارے میں ایک طویل تقریر کی۔ انھوں نے وزارتی مشن اور وائسرائے پر حملہ کیا اور ان پر کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلنے کا الزام لگایا اور یہ کہا کہ انھوں نے کانگریس کی مشروط منظوری کو واقعی منظوری سمجھا اور انھوں نے 16/ جون کے منصوبے کے مطابق عارضی حکومت کی تشکیل کو ملتوی کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس نے برطانوی مشن کے 16/مئی کے منصوبے کی اصل دفعات کی پوری طرح سے تردید کی ہے اور 16/ جون کی تجویزوں کو قطعی طور سے نامنظور کر دیا ہے۔ برعکس اس کے مسلم لیگ نے دونوں پیش کشوں کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عارضی حکومت کے بارے میں 16/ جون کے پیراگراف 8 کی بالکل ہی غیر معقول اور غیر دانشمندانہ تشریح لفظوں کے جادوگر کرپس نے کی ہے۔

انھوں نے وزارتی مشن کے ممبروں اور وائسرائے کی عزت اور کردار کے خلاف سنگین ترین الزامات عائد کیے اور انھوں نے وائسرائے سے ان مسئلوں کے بارے میں ذاتی جواب کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اس کی تصدیق کی کہ مسلمان ان برطانوی حکمرانوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور نہ وہ کانگریس کی متوقع حکومتوں کی غلامی میں رہنے کے لیے کسی طرح تیار ہیں۔

مسٹر جناح نے اس پر جوش اور سخت تقریر میں وزارتی مشن سے مذاکرات کی تاریخ بیان کرنے کے بعد بتایا کہ ان حالات میں مسلمانوں کا دستور ساز مشنری میں حصہ لینا کسی خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے کونسل نے وزارتی مشن کے اعلان کی منظوری جس کی اطلاع وزیر ہند مسلم لیگ نے 6/ جون 46ء کو دی تھی واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ ایک دوسری تجویز میں کونسل نے اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ اب وقت

آ گیا ہے کہ مسلمان اپنے مقصد کے حصول کے لیے ڈاریکٹ ایکشن شروع کریں۔ مسٹر جناح نے وضاحت کی کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی مرضی سے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں اور کانگریس کے پاس اپنی مرضی کو چلانے کے لیے شہری مزاحمت کی تحریک ہے۔ اس لیے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ انھیں دستوری طریقوں کو خیر باد کہنا چاہئے اور اپنے تحفظ اور اپنے وجود کی بقا کے لیے ڈاریکٹ ایکشن کے لیے تیاری کرنا چاہئے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے اعلان کیا کہ اگر کانگریس نے مرکز میں حکومت بنائی تو مسلمان ہر ممکن طریقے سے اس کی مزاحمت کریں گے اور حکومت کے چلنے کو ناممکن بنادیں گے۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ 30/ جولائی کو ہوا اور اس نے ہندوستان میں 16/ اگست کو ڈاریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے کانگریس کی اس مذمت سے کانگریسیوں میں شدید تلخی پیدا ہوئی۔

سردار پٹیل نے تلک کی برسی کے موقعہ پر اپنی تقریر میں مسٹر جناح کے نکتوں کی پرزور تردید کی اور اس پر زور دیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے بالکل مختلف اور متضاد اغراض ومقاصد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کہ کانگریس نے وزارتی مشن کی پیشکش کو تحفظات کے ساتھ منظور کیا تھا، پوری طرح مسلم لیگ کی منظوری پر منطبق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مسلم لیگ نے بھی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اسمبلی میں اس لیے شامل ہورہی ہے تاکہ وہ اسے اپنے مقصد یعنی پاکستان کے لیے استعمال کرسکے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر جناح وزارتی مشن سے اس لیے برافروختہ ہیں کہ اس نے پاکستان کے مطالبہ مسترد کردیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر جناح کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ عارضی حکومت اور اسمبلی میں شمولیت اختیار کریں۔ مسٹر جناح کو بعد میں

ناراضگی اس وجہ سے ہوئی کہ انھیں کانگریس کے ساتھ مساوات کا درجہ نہ ملا اور کانگریس کے اپنے قد اور کردار کو ترک کرانے پر ناکامی ہوئی۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان بڑھی ہوئی عداوت کی وجہ سے برطانیہ کے ہندوستان چھوڑنے اور ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کرنے کے بارے میں پرانے شبہات اور خدشات تازہ ہوگئے۔ تیسری پارٹی کے ختم ہونے سے امید کی جاتی تھی کہ فرقہ وارانہ اختلافات ختم ہوجائیں گے۔

اس کے بالکل برعکس ہوا یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہبی اور تمدنی اختلافات جو کہ بالکل پس منظر میں چلے گئے تھے، اب سیاسی واقعات کے سبب زیادہ نمایاں ہوگئے تھے۔ اس امر واقعہ کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں بخوبی سمجھتے تھے۔ مسلم لیگ مسلم قوم کے بارے میں بات کرنے کا دعویٰ کرتی تھی اور خود کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کہتی تھی، اس نے ان 30 ملین مسلمانوں کو بھی جو ہندوستان میں رہ جاتے، پاکستانی شمار کرلیا تھا اور اس طرح سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو مشکوک بنادیا تھا۔

مسٹر جناح ہمیشہ کانگریسی مسلمانوں کو کانگریس کا پچھ لگو اور شو بوائے اور بوٹ چاٹنے والوں سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ طرز عمل حد درجہ اشتعال انگیز تھا اور اس نے ہندوستان کے ساتھ ہندوستانی یکجہتی کے لیے ایک زبردست خطرہ پیدا کردیا تھا۔

تقسیم کے مطالبے نے بیرونی حملے کے خلاف جیسا کہ وزارتی مشن نے واضح کردیا تھا ہندوستان کے ڈیفنس کے مسئلے کو نظر انداز کردیا تھا۔ اس لیے کانگریس نے پاکستان کے مطالبے کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھا اور وہ اس کی قائل نہ ہوئی کہ مشرقی منطقے اور مغربی منطقے کے لوگ ایک قوم بن سکتے ہیں۔ کانگریس کی رائے کے برعکس یہ واقعہ تھا کہ مسلم لیگ کو سارے ملک کی قانون ساز مجالس میں مسلم نشستوں پر

کامیابی حاصل ہوئی تھی اور یہ اس کا ثبوت تھا کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے مطالبے پر متحد تھے۔ اس نظریے کی 1937ء اور 1946ء کے درمیان مقبولیت حیرت انگیز تھی۔ اس مطالبہ کی اتنی زیادہ مقبولیت بلاشبہ دنیا کا ساتواں عجوبہ تھا لیکن اس کے باوجود اس ہنگامی اور پر آشوب زمانے میں اسے مدلل دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

راجگوپال آچاریہ فارمولہ، گاندھی۔ جناح مذاکرات اور آل انڈیا کانگریس کمیٹیوں کے ریزولوشنوں میں مشرقی اور مغربی منطقوں میں مسلم اکثریتی علاقوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا صوبوں کی گروپنگ کی کانگریس کی طرف سے مخالفت قطعاً غیر معقول تھی۔ یہ بہتر ہوتا کہ کانگریس اس پر اصرار کرتی کہ صوبوں سے ہندو اکثریت والے علاقوں کو الگ کر دیا جائے۔ لیکن کانگریس کا موقف نہایت کمزور اور پھسپھسا تھا کہ صوبوں کی گروپ بندی غیر مسلم علاقوں میں کرنے کے بعد مخالفت کی جائے۔ سیکشن بی میں پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان کے تحت فیڈریشن کی مخالفت کرنے اور گروپ سی کے آسام اور بنگال کے تحت فیڈریشن کے منطقوں کے حق خود ارادیت کی مخالفت کرنے میں دانشمندی کو دخل نہ تھا۔

ملک کے دونوں طرف سے لچکدار رویہ ہندوستان کے اتحاد کو قائم رکھ سکتا تھا اور ختم ہونے والی تباہی جو وسط اگست میں کلکتہ کے بلوے سے شروع ہوئی، روک سکتا تھا۔ یہ دعویٰ کی ہندوستان کے مسلمان ایک قوم تھے اس لیے کہ وہ مذہبی اعتبار سے ہندوؤں سے بالکل علیحدہ تھے اور اس لیے ہندو مسلمان ایک مشترک سماجی اور سیاسی نظام کے اندر نہیں رہ سکتے تھے، نظریے اور عمل کے اعتبار سے غلط تھا۔

اس نظریہ کو قابل عمل بنانے کے لیے مسٹر جناح اور ان کے پیروؤں نے مبالغہ آمیز انداز میں ہندوؤں کے مذہبی نظریات کا اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے موازنہ کیا۔ لیکن مذہب کو سیاسی بحثوں میں استعمال کرنا اوہام اور غلط فہمی کو تقویت دینا ہے۔

مسٹر جناح کے تنازعے اختلاف پیدا کرنے کے لیے حددرجہ خطرناک تھے۔ ایمانداری، سچائی اور راست گوئی انہوں نے اپنے لیے محفوظ رکھی اور کانگریس کے لیڈروں پر بدترین بدنیتی اور عیاری کے الزام لگائے۔ ان کی فتح اور کامیابی ایک تماشہ تھی۔ وہ ہمیشہ مبہم دلیلیں دیتے رہے۔ انھوں نے کبھی مثبت اصلیت پر قائم رہنے کی کوشش نہیں کی۔ ان حالات میں یہ سب سے آسان تھا کہ غلط فہمیوں کو بڑھایا جائے تاکہ کسی سمجھوتے پر نہ پہنچا جاسکے۔

10 -نہرو وائسرائے کی دعوت قبول کرتے ہیں

جولائی کے آخر تک کانگریس اسمبلیوں کے الیکشن ہوگئے ۔ نتیجے بالکل متوقع تھے۔ برطانوی ہندوستان کی 296 نشستوں میں سے 4 نشستیں خالی رہیں کیونکہ سیٹوں کے نمائندوں میں سکھوں نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ 292 نشستیں اے۔ بی۔ سی سیکشنوں میں تقسیم کردی گئی۔

سیکشن اے (A): میں مدراس، اڑیسہ، یوپی، سی پی، برار کے گروپ تھے۔ جس میں کانگریس نے 162 جنرل سیٹیں جیتیں اور دو مسلم سیٹیں۔ مسلم لیگ نے 19 سیٹیں اور ایک سیٹ آزاد امیدوار نے۔

سیکشن بی (B): پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان میں کانگریس کو 7 جنرل سیٹیں اور دو مسلم سیٹیں ملیں ۔ مسلم لیگ کو 19 سیٹیں اور آزاد امیدوار کو ایک سیٹ حاصل ہوئی۔

سیکشن سی (C): بنگال اور آسام میں کانگریس کو 32، مسلم لیگ کو 35 ، شیڈول کاسٹ کو ایک، کرشک پرجا پارٹی کو ایک

کانگریسی ممبروں کی تعداد 201

مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد	73
آزاد ممبر	8
دوسری پارٹیوں کی ممبروں کی تعداد	6

وائسرائے نے ایک نگراں حکومت قائم کی۔ حلف برداری 4 جولائی کو ہوئی۔ بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر انھوں نے فوری طور پر سیاسی لیڈروں پر مشتمل ایک عوامی حکومت قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ انھوں نے نہرو اور جناح کو خط لکھے جن میں انھوں نے نئی حکومت کے بارے میں اس اسکیم سے مطلع کیا۔ انھوں نے 14 رممبروں پر مشتمل ایک عارضی حکومت کی تجویز پیش کی جسمیں 6 ممبروں کو بشمول فہرست مندرج اقوام کے ایک نمائندے کے کانگریس نامزد کرے، 5 کو مسلم لیگ اور اقلیتوں کے نمایندوں کو وائسرائے نامزد کریں۔ محکموں کی مساوی تقسیم ممبروں کی نامزدگی کے بعد ہوگی۔ عارضی حکومت کے اختیارات مولانا آزاد کے نام 30 رمئی کے خط کے مطابق ہوں گے۔ فرقہ وارانہ مسئلوں کو طے کرنے کے بارے میں کسی قانون کی ضرورت نہیں۔ اسے کنونشن کے مطابق طے کیا جائے گا۔ نہرو نے 23 ر جولائی کو اپنے جواب میں اس پر زور دیا کہ اس حکومت کو فیصلہ کرنے میں پوری آزادی ہونی چاہئے اور وائسرائے اس کے دستوری سربراہوں۔ ویول نے اس جواب کو نا قابل قبول ٹھہرایا لیکن انھوں نے اس جواب پر وزیر ہند سے مشورہ کیا۔ وزیر ہند نے نہرو سے ملنے اور اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کرنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر مسئلہ باہمی گفتگو سے حل نہ ہو تو کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر وزیر ہند سے ملنے انگلستان آئیں اور اس وقت لندن میں ویول کی موجودگی بھی ضروری ہوگی۔

نہرو وائسرائے سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی 18 راگست کی میٹنگ کے بعد ملے۔ اسی اثنا مسلم لیگ نے 27 ر جولائی کو 16 رمئی کے کابینی مشن کے اعلان کو

منظوری دینے کا اپنا سابقہ فیصلہ بدل دیا یعنی اس اعلان کو نامنظور کر دیا۔ 19 / جولائی کو مسٹر جناح نے ویول کے مسلم لیگ کی عارضی حکومت کے دعوت نامے کو ٹھکرا دیا۔

وزیر ہند اور وائسرائے دونوں نے اسے مناسب خیال کیا کہ کانگریس کو عارضی حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے اور اس حکومت میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو شمولیت کے مسئلہ کو آئندہ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ 6 / اگست کو وائسرائے نے نہرو سے عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں اور مسٹر جناح سے مخلوط حکومت کے بارے میں شرطوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی اپنی تجویزیں پیش کرنے کے لیے کہا۔

8 / اگست سے 10 / اگست تک کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولوشن پاس کیا جس میں وزارتی مشن کے 17 / مئی کے اعلان کی تفصیلات کو ناپسند کرتے ہوئے بھی اس کو منظور کر لیا اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی نے دستور اسمبلی کی با اقتدار اور بالا دست حیثیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اسے پورے ہندوستان کے دستور اساسی کے مرتب کرنے کا حق بغیر کسی بیرونی مداخلت کے حاصل ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اسے ان تمام اندرونی پابندیوں کا لحاظ رکھنا بہت ضروری تھا جو زیادہ سے زیادہ تعاون اور سب کے جائز مفادات اور وعدوں اور زیادہ سے زیادہ آزادی کی وجہ سے ضروری ہیں۔ کمیٹی نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شرکت کرنے اور اس میں حصہ لینے کے اپنے پچھلے فیصلے کو بدل دیا۔ اس نے مسلم لیگ سے تعاون کی اپیل کی اور نہرو کے اعلان سے پیدا شدہ غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

مسٹر جناح نے ورکنگ کمیٹی کے 10 / اگست کے ریزولوشن کے متعلق 12 /

اگست کو ایک بیان دیا جس میں انھوں نے کہا کہ اس سے صورتحال نہیں بدلی اس لیے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے 30/جولائی کے فیصلے کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔

نہرو نے وائسرائے کی 6/اگست کی دعوت قبول کر لی اور 13/اگست کو انھوں نے مسٹر جناح کو لکھا کہ وہ عارضی حکومت کے قیام میں تعاون کریں۔ 15/اگست کو بمبئی میں دونوں لیڈروں کی ملاقات ہوئی اور 16/اگست کو نہرو نے اعلان کیا کہ مسٹر جناح نے عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں کانگریس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اگرچہ انھوں نے مزید کہا کہ گفت وشنید کے دروازے کھلے رہیں گے۔ کانگریس عارضی حکومت کے بارے میں آگے بڑھے گی۔

مسٹر جناح نے اپنے جوابی بیان میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی پوزیشن اور اختیارات، عارضی حکومت کی تشکیل اور اس کے اختیارات، گورنر جنرل کی ذمہ داریوں اور اسمبلی کی منتقلی کے بارے میں نہرو کے خیالات سے اختلاف کیا اور کہا کہ نہرو کی شرطوں پر مسلم لیگ کانگریس سے تعاون نہیں کر سکتی۔

11- مسلم لیگ کا براہ راست اقدام

اسی اثنا 14/اگست کو مسٹر جناح نے ایک بیان میں 16/اگست کو ڈاریکٹ ایکشن ڈے منائے جانے کے بارے میں وضاحت کی کہ اس دن کو منانے کی غرض وغایت یہ ہے کہ مسلمان پوری طرح صورتحال کو سمجھ لیں اور ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی صدر جمعیۃ علماء اسلام نے کہا کہ وائسرائے اور وزارتی مشن لفظوں سے پھر گئے ہیں۔ کانگریس کے مغرور اور متکبرانہ رویے نے ہندوستان میں اسلام کے 100 ملین پیروؤں کو ہر قسم کی مصیبتوں اور دقتوں کو جھیلنے اور عمل کے میدان میں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس دنیا کو معلوم ہو کہ مسلمان مقصد کے لیے بڑی سے بڑی

قربان کر سکتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں سے ان لوگوں کو اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرنے پر سخت ترین مخالفت کر کے سبق سکھا سکتے ہیں۔

مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ 16 اگست کو منایا جانے والا ڈائریکٹ ایکشن ڈے احتجاج اور جلسوں کا دن ہے جس میں مسلمانوں کے مطالبے کو پیش کیا جائے گا اور وزارتی مشن کی پیش کش کے بارے میں مسلمانوں کی رائے کی وضاحت اور کانگریس کے طرز عمل کی مذمت کی جائے گی۔ ان سب باتوں نے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہوا اور کبھی امیدیں پیدا ہوئیں اور کبھی خدشات بگڑتی ہوتی فرقہ وارانہ صورت حال میں وائسرائے کا کانگریس کو عارضی حکومت قایم کرنے کی دعوت دنیا سہارے کا آخری تنکا ثابت ہوا۔

مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ جیسے حکومت نے ماضی کی تمام پالیسیوں کو بالکل ترک کر دیا ہے اور مسلمانوں کو جنھوں نے برٹش حکومت پر سول نافرمانی کی تحریکوں اور جنگ کے زمانے میں پورا اعتماد کیا تھا پوری طرح ذلیل کیا ہے۔ انھوں نے ان تمام یقین دہانیوں کو دیدہ دانستہ بالکل بھلا دیا تھا کہ کسی قسم کی کوئی دستوری یا سیاسی تبدیلی بغیر مسلم لیگ اور اس کے صدر کہ رضامندی کے نہ کی جائے گی۔ ان کا ردعمل بہت تیز اور متشدانہ تھا۔

مسٹر جناح زیادہ برافروختہ ہوئے اور انہوں نے نہرو کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا کہ وہ ان کی دعوت پر حکومت میں شامل ہو جائیں یعنی کانگریس کی سرپرستی میں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے کہا کہ دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کو نہیں کچل سکتی کیونکہ وہ غازی کی حیثیت سے زندہ رہیں گے اور شہید کی طرح مریں گے۔

باہمی اختلافات نے فرقہ وارانہ فسادات کو جنم دیا۔ کلکتہ میں فساد عام مظاہروں سے شروع ہوا۔ دوکانیں جلائی گئیں۔ ہڑتالیں ہوئیں۔ مسلم لیگ کے جھنڈے

لہرائے گئے۔ مزاحمت کی وجہ سے تصادم ہوئے اور سارے مشرقی علاقے میں بلوے پھوٹ پڑے۔ یہ تصادم اور ہنگامے عرصے تک ہوتے رہے اور شر پسند لوگوں کو بدترین کارروائیاں کرنے کا موقعہ مل گیا یعنی بم زنی اور لوگوں کو قتل کرنا، عورتوں کی عصمت دری کرنا۔ ایک ساتھ ایک بڑی تعداد انتقام اور بدلہ لینے میں لگ گئی۔ یہ عوامی جنوں اور پاگل پن چار دن تک جاری رہا۔

20 / اگست کو صبح سے شہر کی زندگی عام معمول پر آنا شروع ہوئی۔ عام قتل اور غارت گری کے دنوں میں امن وامان قائم رکھنے کی ایجنسیاں صورتحال پر قابو پانے میں مکمل طور سے ناکام رہیں۔ پولیس بالکل ناکام اور عضو معطل ہو کر رہ گئی۔ لوگ اس کو بالکل جانبدار بتانے لگے۔ تصادم کو روکنے، شہریوں کے جان و مال کا تحفظ کرنے اور امن وامان قائم رکھنے کے تمام طریقے ناکام ہو گئے۔ جانی نقصان کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ 16 / اگست کو عام تعطیل کا اعلان کر کے ہندوؤں نے اپنی دور اندیشی کی کمی کا ثبوت دیا۔ قصبے اور دفتروں میں کام کرنے والے ملازمین کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ مجمع کے ساتھ شامل ہو کر سڑکوں پر پھریں اور ہنگاموں میں حصہ لیں۔ فوج کو نہیں بھیجا گیا تا کہ صورتحال قابو سے باہر ہو جائے۔ حالانکہ فوج موجود تھی۔ اس نے حکومت پر صحیح طور سے الزام لگایا کہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں ناکام ہوئی۔

ہڈسن نے مقتولین کا اندازہ پانچ ہزار اور شدید طور سے زخمی ہونے والوں کی تعداد کا کلکتہ میں پندرہ ہزار کا لگایا۔ اس میں کتنے ہندو اور کتنے مسلمان ہوں گے اس کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے اس کے علاوہ کتنے اور تباہ و برباد ہوئے اور املاک کو کتنا نقصان پہونچا اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد باہمی الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر فریق نے دوسرے

فریق کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ بنگال اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے سہروردی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی۔ انھوں نے الزام لگایا کہ مسلم لیگ نے منظم طریقے سے ہندوؤں پر پوری تیاری سے حملے کئے اور حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے ان حملوں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ سہروردی نے ان الزامات کی ہر طرح تردید کی اور کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے مسلم لیگ کے مظاہروں میں رکاوٹ ڈالنے کی کوششیں کیں اور اس نے حکومت سے نہرو کی پیشکش کو تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے کانگریس کو دہشت پھیلانے کے لیے جس کی وجہ سے اتنی زبردست تباہی ہوئی ذمہ دار ٹھہرایا۔ تحریک نامنظور ہوگئی اور یوروپین ممبروں نے اس تحریک کے خلاف ووٹ دیا۔

جناح ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انھوں نے کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ وہ فسادات کرا رہی ہے اور تشدد کو ہوا دے رہی ہے۔ لیاقت علی خاں نے اس کی تصدیق کی کہ کلکتہ میں ہندوؤں نے قتل عام اور تشدد کو ہوا دی۔ یہ واقعات مسلم لیگ کو بدنام کرنے کے لیے کئے گئے اور یہ دکھانے کے لیے کہ ویول کو نہرو پیش کش کی وجہ سے ہندوستان اب ہندوؤں کے تسلط میں آچکا ہے۔

12-عارضی حکومت کا قیام

ویول جو بعد میں کلکتہ آئے، پر اس زبردست ٹریجڈی نے بڑا اثر ڈالا۔ ان کے خیال میں یہ محض جانی اور مالی نقصان نہ تھا۔ یہ باہمی عداوت اور چیلنج کا جذبہ تھا جو سارے ملک کو زبردست خانہ جنگی اور زبردست تباہی میں مبتلا کرسکتا تھا۔ یہ بڑا ہی زبردست خطرہ تھا۔ ویول کے نزدیک صورتحال سے نمٹنے کے صرف دو ہی طریقے تھے یا تو فوجی طریقے سے جس کے لیے انگلستان سے برطانوی فوجیں ہندوستان بلائی

جائیں یا مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کو مخلوط حکومت کے قائم کرنے پر آمادہ کریں۔

پہلا طریقہ بہت سی وجھوں کی وجہ سے نا قابل عمل تھا اس لیے دوسرے طریقہ کار کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ لیکن اقتدار کی منتقلی مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین ایک متفقہ لائحہ عمل کی حیثیت رکھتا تھا۔

ویول نے نہرو کو اس کی ترغیب دی کہ عارضی حکومت کے ممبروں کو نامزد کرتے ہوئے وہ مسلم لیگ کے 5 ممبروں کے کوٹے کو محفوظ رکھیں اور اسے مسلم لیگ کو قبول کرنے پر آمادہ کریں۔ جب وہ نہرو سے ملے اور ان سے عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں بات چیت کی تو انھوں نے ان سے مسٹر جناح سے ملنے کی اہمیت پر زور دیا اور اس کی بھی کوشش کی کہ وہ ان سے تعاون کی اپیل کریں۔

لیکن نہرو کا جناح سے ملنا بے سود رہا۔ مسٹر جناح نے حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ان کے مشورے یہ تھے:

(1) اس عارضی حکومت میں وائسرائے اپنے ویٹو کے اختیار کو استعمال نہیں کریں گے۔

(2) حکومت کی مجلس قانون ساز سینٹرل اسمبلی کے روبرو جواب دہ اور ذمہ دار ہوگی نہ کہ وائسرائے کے روبرو۔

(3) حکومت میں ایک نیشلسٹ مسلم شامل کیا جائے گا۔

نہرو کا اگلا قدم یہ تھا کہ انھوں نے 22 اگست کو وائسرائے کو خط لکھا جس میں انھوں نے یہ تحریر کیا کہ اگرچہ وہ اس کے بہت زیادہ خواہشمند تھے کہ وہ ایک مخلوط وزارت مسلم لیگ کے ساتھ قائم کریں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بات بالکل صاف کر دینا چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارت قائم کرنے یہ معنی نہیں کہ اس کے سارے مطالبات کو بے چوں چرا مان لیا جائے اور ان عجیب وغریب طریقوں کو

مان لیا جائے جو مسلم لیگ نے اختیار کئے ہیں۔ وہ ایک مضبوط حکومت چاہتے تھے جو مساوی پالیسیوں کے چلانے میں متحد ہو۔

اس کے بعد ہی حکومت کا اعلان ہوا۔ اس کے حسب ذیل ممبران تھے۔

(1) جواہر لال نہرو
(2) سردار لبھ بھائی پٹیل
(3) ڈاکٹر راجندر پرشاد
(4) مسٹر آصف علی
(5) مسٹر سی۔ راجگوپال آچاریہ
(6) سرت چندر بوس
(7) سردار بلدیو سنگھ
(8) ڈاکٹر شفاعت احمد خاں
(9) ڈاکٹر جان متھائی
(10) بابو جگجیون رام
(11) مسٹر علی ظہیر
(12) مسٹر سی۔ ایچ۔ بھابھا

کابینہ میں دو مسلم ممبر اور شامل کئے جانے تھے۔ 2/ستمبر عہدہ سنبھالنے کی تاریخ مقرر کی گئی۔

اس رات اپنے نشریہ میں وائسرائے نے اس حکومت کو ملک کا روزمرہ کا نظم ونسق چلانے میں زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا وعدہ کیا۔

انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کو سیٹیں دی گئی تھیں اور اسے یہ یقین دہانیاں دی جاچکی ہیں کہ عارضی حکومت دستور سازی کا کام ایسے طریقہ کار کے مطابق کرے گی جیسا کہ طے کیا جاچکا ہے، لیگ کے لیے مخلوط حکومت میں شامل ہونا ممکن نہ ہوسکا لیکن اس کے باوجود (5) ممبروں کی پیشکش اب بھی برقرار رہے گی۔

وائسرائے کے نشریہ کے جواب میں مسٹر جناح نے وائسرائے پر گمراہ کن بیان دینے اور وعدے سے پھر جانے کا الزام لگایا۔ 2/ستمبر کو عہدہ کا حلف لینے کے بعد نہرو نے ملک کے ہر ہندوستانی سے تعاون کی اپیل کی۔ 7/ستمبر کے نشریہ میں انھوں نے اعلان کیا: ''ہم پوری طرح سے تیار ہیں اور خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ مشترکہ

مشکلات کو حل کرنا چاہتے ہیں۔"

13-مسلم لیگ کا عارضی حکومت میں شامل ہونا

مسلم لیگ نے 2 ستمبر کو یوم ماتم منانے کا اعلان کیا اور مسٹر جناح نے مسلمانوں کو سیاہ جھنڈے لہرانے کا بھی مشورہ دیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ اگر چہ ہم خانہ جنگی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں لیکن ہم اس کے قریب پہونچ رہے ہیں۔ اس تحریک نے بمبئی، پنجاب بنگال اور بہار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نہرو کے 7 ستمبر کے نشریے کا مسٹر جناح کی طرف سے جواب، کانگریس اور برطانوی کابینہ پر بڑا سخت اور تلخ حملہ تھا۔ روز بروز صورتحال ابتر ہوتی جارہی تھی۔ گاندھی جی جناح کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔

انھوں نے نواب بھوپال کا فارمولہ جو انھوں نے صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے تیار کیا تھا، منظور کرلیا۔

اس فارمولہ کی رو سے کانگریس کو اپنے اس حق کو ترک کیے بغیر کہ جسے مناسب سمجھے عارضی حکومت اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں اپنا نمائندہ نامزد کرے، مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی سب سے زیادہ با اثر اور نمائندہ جماعت تسلیم کرنا تھا۔ جناح عارضی حکومت کی تشکیل اور کانگریس سے مسلم لیگ کے سے گفتگو کرنے کے لیے راضی ہوگئے۔ وہ نہرو سے 5/ اکتوبر کو ملے اور پھر ان دونوں کے مابین مراسلت شروع ہوئی۔ 8/ اکتوبر کو مسٹر جناح نے 9 نکات کا خط لکھا جن کی بنا پر وہ کانگریس سے سمجھوتہ نہ کر سکتے تھے۔

نہرو جناح کے بعض نکات پر متفق نہ ہوسکے اور اس وجہ سے گفت وشنید ناکام ہوگئی اور تعطل برقرار رہا۔ اسی اثنا میں ویول اپنی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ وہ اس کے بہت زیادہ خواہاں تھے کہ بغیر کسی تاخیر کے مسلم لیگ کو عارضی حکومت میں شامل

کیا جائے۔ ان کے خیال میں ایک پارٹی کی حکومت نامناسب بھی تھی اور بہت زیادہ خطرناک بھی۔ انھیں وزیر ہند کے اس مشورے سے اتفاق نہ تھا کہ کانگریس کو اقتدار میں رکھنے کے لیے مسلم لیگ سے معاملہ طے کیا جائے۔ برعکس اس کے ویول کا مضبوطی سے یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ سے یہ وعدہ کہ صوبوں کو اس کی آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اپنے گروپ کا نسٹی ٹیوشن کو اکثریت سے منظور کریں، پورا کیا جانا چاہیے اور وہ اس کے لئے پوری طرح آمادہ تھے۔ وہ مرکز اور صوبوں میں کانگریس کے تعاون سے ایک پارٹی کی بنیاد پر دستور سازی کا کام آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ جناح کے لیے بڑی ہی خوش آئندہ موقعہ تھا کیونکہ انھیں کانگریس کو جھڑکی دینے اور حکومت کو اپنے سے قریب لانے کا بہترین اور شاندار موقعہ ملا تھا۔

15 / ستمبر کو وائسرائے سے اپنے انٹرویو میں مسٹر جناح نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہونے کے خلاف اپنے نکات پر زور دیا اور عارضی حکومت کے بارے میں ایک کنونشن کا خیال ظاہر کیا جس کے ذریعے فرقہ وارانہ مسائل کی کونسل قائم کی جائے جس کی نائب صدارت باری باری دونوں پارٹیوں کو ملے۔

مسٹر جناح نے وائسرائے کو اپنے 9 نکات سے مطلع کیا جن کے بارے میں تشریح چاہی گئی تھی۔ وائسرائے اس پر تیار نہ ہوئے کہ ایک مسلمان کو جسے مسلم لیگ ناپسند کرے عارضی حکومت میں شامل نہ کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلوں کے بارے میں کنونشن ناقابل عمل ہے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ دونوں ملتوں سے باری باری نائب صدر ہوں گے۔ مسلم لیگ کے ممبر کو کابینہ کی رابطہ کمیٹی کا صدر مقرر کیا جائے گا۔ انھوں نے 16 / مئی کے اعلان کو منظور کرنے پر اصرار کیا۔ متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا بالآخر جناح نے 13 / اکتوبر کو ویول کو مطلع کیا کہ ''میری کمیٹی متعدد وجھوں سے اس نتیجے پر پہونچی ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے فرقوں

کے مفاد کے لیے مہلک ہوگا کہ ملک میں مرکزی حکومت کا انتظام صرف کانگریس کے ہاتھوں میں ہو۔ اس لیے آپ کے 24/اگست کے نشریے جس میں آپ نے یقین دہانیاں دی ہیں، کے پیش نظر مسلم لیگ کی طرف سے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) لیاقت علی خاں (2) آئی، آئی، چندریگر

(3) عبدالرب نشتر (4) غضنفر علی خاں

(5) جوگیندر ناتھ منڈل

مسٹر جناح نے ویول کی پیشکش منظور کر کے اپنے ممبروں کی فہرست انھیں روانہ کردی۔ وہ وائسرائے کی اس شرط پر بالکل خاموش رہے کہ مسلم لیگ کونسل کا ریزولوشن جس میں وزراتی مشن کے 16/مئی کے اعلان کو مسترد کیا گیا تھا واپس لیا جائے۔ ویول مسلم لیگ کو وزارت میں لانے کے لیے اس قدر تیار تھے کہ انھوں نے اپنی شرط پورا کرنے پر زور نہیں دیا۔

مسلم لیگ نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہوگی۔

23/اکتوبر کے خط میں نہرو نے ویول کو لکھا کہ حکومت میں اس شرط پر مسلم لیگ کے نمائندے لیے گئے تھے کہ مسلم لیگ 29/جولائی کا اپنا ریزولوشن منسوخ کردے گی اور 16/مئی کے ریزولوشن سے اپنا اتفاق ظاہر کرے گی۔ انھوں نے وائسرائے سے اس کی وضاحت ظاہر کرنے کو کہا کہ آیا مسلم لیگ کے حکومت میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹیم کی طرح کام کرے گی اور دوسرے یہ کہ مسلم لیگ نے 16/مئی کے اعلان کو منظور کرلیا ہے کہ نہیں۔

وائسرائے نے جواب دیا کہ مسٹر جناح نے انھیں یقین دلایا ہے کہ وہ حکومت اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں تعاون کریں گے اور انھوں نے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بھی طلب کیا ہے جس میں اس ریزولوشن کو جس میں وزارتی مشن کی پیشکش کو نامنظور کیا

تھا، منسوخ کیا جائے گا اور انتظامیہ کونسل قائم کی جائے گی جس کی نائب صدارت باری باری دونوں پارٹیوں کو ملے گی۔

جواہر لال نہرو نے اپنی کابینہ میں مسلم لیگ کے ممبروں کو جگہ دینے کے لیے اپنے تین قوم پرست ساتھیوں یعنی سرت چندر بوس، شجاعت احمد خاں اور علی ظہیر کو کابینہ سے ہٹا دیا۔ ان تین کے علاوہ دو جگہیں کابینہ میں پہلے سے خالی تھیں۔ ساری خط و کتابت اور تبادلہ خیال کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پارٹیاں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ اور حکومت ہند مختلف الخیال تھیں اور ان میں سے ہر ایک کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ کانگریس مشترکہ حکومت کی ذمہ داری استعمال کرنا چاہتی تھی اور مشترکہ مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر لیا تھا کہ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے بعد مسلم لیگ بڑے اہم کاموں کو کرنے کے لیے آمادہ کی جاسکے گی۔ برعکس اس کے مسلم لیگ نے غضنفر علی خاں کے ذریعہ اعلان کیا کہ ہم عارضی حکومت میں اس لیے شامل ہوئے ہیں کہ ہم اپنے مقصد پاکستان کے لیے کام کرسکیں گے۔ لیاقت علی خاں اس قدر صاف گو تھے کہ انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ملک کا مستقبل اس صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے جب اس کی دو اہم قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کو مکمل آزادی حاصل ہو۔ موجودہ دستور کے تحت قائم کی گئی عارضی حکومت میں اس کی مشترکہ یا مجموعی ذمہ داری کا وجود نہیں۔ انھوں نے نہرو کے سربراہ ہونے سے انکار کیا۔

مسٹر جناح نے دونوں رفقاء کار کے موقف کی پوری پوری تائید کی۔ انھوں نے کہا کہ عارضی حکومت کوئی اختیار انتظامی کسی کنونشن کی رو سے حاصل نہ ہونا چاہیے جو ہندوستان کے آئندہ دستور پر کسی طرح کا اثر ڈالے یا اس کے خلاف ہو یا اس کے خلاف کسی طرح اثر انداز ہوسکتا ہو۔ ہر اس کوشش کی ہم مزاحمت کریں گے جو ہمارے

مطالبہ پاکستان کے خلاف ہو۔ ویول کو اس کی امید تھی کہ دونوں پارٹیاں اس کو محسوس کرنے لگیں گی کہ برطانوی حکومت کی موجودگی ہندوستان میں ضروری ہے۔

14-فرقہ وارانہ جنگ

25/اکتوبر کو مخلوط حکومت سخت باہمی شک وشبہات، مختلف بنیادی مقاصد کے پیش نظر قائم ہوئی لیکن حکومت کا اندرونی اختلاف، زبردست جھگڑے جو سارے ملک میں ہو رہے تھے کا عملی اشارہ تھا۔ کلکتہ کی آگ ابھی پوری طرح بجھی نہ تھی کہ نواکھالی میں 15/اکتوبر کو بڑے شدید بلوے ہوئے۔ بڑے پیمانے پر لوٹ مار، سامان کی بربادی اور عورتوں کی عصمت دری کے واقعات ہوئے۔ یہ صورتحال بہت دنوں تک قائم رہی۔ حکومت اور اس کی ایجنسیاں خاموش رہیں اور فوج نے بہت کم مظلوموں کی مدد کی۔ کافی عرصے تک شرپسندوں کی شورش قایم رہی۔ پورے طور سے امن وامان کو درہم برہم کیا گیا اور جان ومال کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔ سرکاری اندازے کے مطابق (5) پانچ ہزار لوگوں کی جانیں گئیں۔ مالی نقصانات بہت زیادہ ہوئے۔ ان ہنگاموں میں بڑے افسوس ناک اور شرمناک واقعے ہوئے جو بدترین تھے۔

مشرقی بنگال میں قتل وغارت گری نے بہار میں بھی کشیدگی کو بڑھادیا جو پہلے سے موجود تھی۔ نہرو کے بیان کے مطابق 16/اگست سے ہونے والے واقعات میں بہاریوں کی کثیر تعداد ہلاک ہوئی اور جب وہ پناگزیں بہار کے دیہاتوں میں پہونچے اور انھوں نے کلکتہ کے دردناک داستان کے واقعات سنائے تو نواکھالی اور مشرقی بنگال کی خبروں نے خاص طور سے ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا اور عورتوں کے اغوا وعصمت دری کے واقعات نے لوگوں کو زیادہ مشتعل کردیا اور یہ جذبہ پھیل گیا

کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی کوئی مدد نہیں کر رہا ہے۔ 26/ اکتوبر کو چھپرا میں فساد شروع ہو گیا اور پٹنہ و مونگیر ضلعوں میں بری طرح پھیل گیا۔

یہ ایک عوامی بلوے کی شکل تھی۔ بڑی تعداد میں کسانوں نے مسلمانوں کے گھروں کو جلا دیا اور ان کا سارا مال اسباب لوٹ لیا۔ 3/ نومبر کو نہرو اور دوسرے وزیر پٹنہ پہونچے اور بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور بلوے کو روکنے کی اپیل کی۔ متاثرہ علاقوں میں کرفیو نافذ تھا لیکن فوج نے پیٹرولنگ شروع کی اور مقابلہ کرنے والی بھیڑ پر فائرنگ کی۔ پناہ گزینوں کی بڑی تعداد کو (Relief) ریلیف کیمپوں میں رکھا گیا اور صورتحال پر قابو پایا گیا۔

مشرقی بنگال اور بہار کی رپورٹوں سے گاندھی جی کو بہت سخت تکلیف پہونچی۔ انھوں نے بہاریوں سے انسان دشمن حرکتوں کا خمیازہ بھگتنے کا خوف دلایا اور مسلمانوں کو اس کا یقین دلایا کہ وہ ان کے بھائی ہیں۔ انھوں نے اس صوبے میں رونما ہونے والے شرمناک واقعات کے لئے کفارہ ادا کرنے کو کہا۔ گنگا کے کنارے گڑھ مکتیشور میں بھی تشدد کے واقعات ہوئے۔

8/ نومبر کو ایک معمولی واقعہ پر بڑا تصادم ہوا جس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہلاک ہوئی۔ گاندھی جی نے مشرقی بنگال جانے کا فیصلہ کیا اور وہ کلکتہ سے نواکھالی کے لیے روانہ ہوئے۔ مشرقی بنگال سے انھیں ایک اندرونی آواز آئی تھی کہ وہ بنگال کے مصیبت زدہ اور خوف زدہ ہندوؤں کی مدد کریں۔ اسی زمانے میں ان سے کہا گیا کہ وہ بہار کے مسلمانوں کو تسلی دیں جنھیں بہت سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کہاں جائیں۔ لیکن نواکھالی پہونچنے کے بعد اور مشرقی بنگال کے دیہاتوں میں جانے کا انتظام کر کے انھوں نے اپنا پروگرام نہ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ مشرقی بنگال میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد بہار جانے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے اس سرزمین پر جو تمام قدرتی نعمتوں سے مالا مال ہے اپنی بے پناہ محبت اور رحم کا اظہار کیا جو غلطی کرنے والوں اور غلطی کا شکار ہونے والوں، آفت زدہ اور ظلم ڈھانے والوں دونوں کے لیے تھا۔ ان کا یہ کارنامہ انسانی تاریخ میں زریں حرفوں میں لکھا جائے گا۔ ان خوفناک واقعات نے مسلم لیگ اور کانگریس میں تلخی بڑھادی۔ کانگریس کے صوبائی لیڈروں نے مسلم لیگ پر دیدہ دانستہ قانون شکنی اور افسران کی مجرمانہ غفلت اور لاپرواہی کا الزام لگایا۔ برعکس اس کے مسلم لیگ کے لیڈروں نے بلوے شروع کرنے کے لیے ہندوؤں کو موردالزام ٹھہرایا۔ مخالفت اور عداوت کی یہ لہر بڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے حکومت کا چلانا مشکل ہوتا گیا اور عارضی حکومت میں مسلم لیگ کے ممبروں نے رکاوٹ ڈالنے کی پالیسیوں پر عمل کرنا شروع کردیا۔ اس وجہ سے کانگریسی ممبر بہت زیادہ برافروختہ ہونے لگے جیسا کہ لوسی نے بیان کیا۔ مسلم لیگ کا بلاک حکومت میں اس مقصد سے داخل ہوا تھا کہ کانگریس کو ہر طرح سے روکے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرسکے جس سے طویل المیعاد مسئلوں پر کسی قسم کا غلط اثر پڑے۔ اس مہم میں ان کا خاص حربہ قانون تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وائسرائے اپنے اختیار خصوصی کانگریس اکثریت کے خلاف استعمال کرے۔ نہرو نے مسلم لیگ پر یہ الزام لگایا کہ وہ برطانوی حکومت سے مدد لے کر بادشاہ کی پارٹی بننا چاہتی ہے۔

15- لیگ کا کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے بارے میں غیر مصالحانہ رویہ

ویول نے مسلم لیگ کے عارضی حکومت میں داخل ہونے کے بعد سے یہ کوشش شروع کی تھی کہ وہ اسے یعنی مسلم لیگ کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل کریں۔ انھوں نے 5/نومبر کو مسٹر جناح کو لکھا کہ وہ " آل انڈیا مسلم لیگ کے 26/جولائی کے

ریزولوشن کو منسوخ کرادیں۔" ویول کے مطابق جناح نے ایسا کرنے کا وعدہ کرلیا تھا لیکن وہ اس پر عمل درآمد کرنے سے مکر گئے۔ انھوں نے ویول کو یہ لکھا کہ کانگریس نے 16/مئی کا اعلان منظور نہیں کیا ہے اور انھوں نے اسمبلی کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسری دقت پیدا ہوئی۔ آسام کے چیف منسٹر بردولائی نے آسام کے سیکشن (C) میں صوبوں کی گروپ بندی کے خلاف اعتراض کیا۔ گاندھی جی نے آسام کی اس اپیل کی تائید کی اور نہرو اس کی مدافعت میں آئے کہ صوبے کو اس کی آزادی حاصل ہو کہ وہ کسی گروپ میں شامل ہو یا نہ ہو۔

ویول نے 20/نومبر 1946ء کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شرکت کے لیے دعوت نامے جاری کیے۔ اس کے دوسرے ہی دن جناح نے 9/نومبر کو اسمبلی کا اجلاس زبردست غلطی ٹھہرایا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شریک نہ ہوگا۔

نہرو کا جواب یہ تھا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا اجلاس ہوگا خواہ مسلم لیگ شرکت کرے یا نہ کرے۔ انھوں نے اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کی مخالفت کی۔ ویول نے لیاقت علی خاں کو مطلع کیا کہ وہ (ویول) اس پر راضی نہ ہوں گے کہ مسلم لیگ کے نمائندے عارضی حکومت میں شامل ہوں جب تک کہ مسلم لیگ، طویل المیعاد منصوبے کو منظور نہ کرے۔

لیاقت علی خاں طویل المیعاد منصوبے کو صرف اپنی شرطوں پر منظور کرنا چاہتے تھے اور وہ حکومت سے مستعفی ہونے پر تیار تھے۔ اس طرح سے ایک نازک صورتحال پیدا ہوگئی ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے وزیر ہند نے کانگریس، مسلم لیگ اور سکھ لیڈروں کو ملک معظم کی حکومت سے گفتگو کرنے کے لیے لندن میں مدعو کیا تا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے مسئلے کو طے کیا جائے۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ انگلستان جاتے کانگریس کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں 23-24 نومبر کو منعقد ہوا۔ نہرو نے وائسرائے پر یہ الزام لگایا کہ وہ حکومت کو اس اسپرٹ میں چلانے میں ناکام رہی جس کے تحت انھوں نے اس کا آغاز کیا تھا اور یہ شکایت کی کہ مسلم لیگ اور برطانوی افسران میں مکمل اتحاد اور ساز باز تھی۔ انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت میں کام کر رہی ہے۔ اگر یہ حمایت جاری رہی تو ایک بڑے پیانے پر جدوجہد کو جاری رکھنا ناگزیر ہو جائے گا۔

کانگریسی لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ یا تو مسلم لیگ کانسٹی ٹیوشن کے منصوبے کو منظوری کر دے اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہو جائے یا پھر وہ عارضی حکومت چھوڑ دے یعنی اس کے ممبران حکومت سے مستعفی ہو جائیں۔

مسٹر جناح نے 25 رنومبر کو ایک پریس کانفرنس میں مسلم لیگ کے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں نہ شامل ہونے کے عزم مصمم کا اعلان کیا۔ انھوں نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا کہ عارضی حکومت ایک ٹیم کی طرح کام کرے۔

ان کے خیال میں عارضی حکومت ایک مخلوط حکومت تھی۔ انھوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ نہرو اسکے سربراہ تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ لیگ کے ممبران ہر اس تحریک کی مخالفت کریں گے جس کا تعلق موجودہ حکومت یا آئندہ کانسٹی ٹیوشن سے ہوگا۔ وہ نہ کانگریس کے احکام کی ایک ماتحت گروپ کی حیثیت سے تعمیل کریں گے، اور نہ صوبوں میں کانگریس کے منصوبوں کے مطابق کام کریں گے۔

وزیر اعظم اٹیلی کی تجویز پر ویول کے ہمراہ نہرو، جناح لیاقت علی خاں اور بلدیو سنگھ کراچی سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے لیکن چار دن کی گفتگو اور مذاکرات کے باوجود (یعنی یکم دسمبر سے 4 دسمبر تک) کسی سمجھوتے پر نہ پہونچ سکے۔

6 دسمبر کو شائع ہونے والے ایک بیان میں گفت و شنید کے ختم ہو جانے کے بعد

سب سے بڑی رکاوٹ 16 مئی کے اعلان کی تھی جس کے بموجب صوبوں کے گروپ کانسٹی ٹیوشن کے بارے میں طے کریں گے لیکن صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ نئے دستور کے نفاذ کے بعد اس گروپ سے علیحدہ ہو جائیں، اگر مجالس قانون ساز کی اکثریت اس گروپ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرے۔

ملک معظم کے حکومت کی تشریح یہ تھی کہ سیکشنوں کے قیام کے لیے اسمبلی کا اجلاس کرنا ضروری ہے۔ سیکشنوں کی گروپنگ کانسٹی ٹیوشن کے لیے شرط اولین تھی اور یہ کہ سیکشنوں میں متنازعہ معاملات اس سیکشن کے ممبروں کی اکثریت سے طے ہوئے تھے۔

کانگریس گروپوں کے بنانے پر راضی ہوگئی تھی۔ لیکن اسے اس باب میں برطانوی تشریح سے اختلاف تھا۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا کہ ہر صوبہ ایک خودمختار وحدت ہے۔

ہر صوبہ کو بحیثیت ایک خودمختار وحدت یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسمبلی کی اکثریت سے قطع نظر آزادانہ فیصلہ کرے، خود اپنے کانسٹی ٹیوشن کے بارے میں کہ وہ گروپ میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

اس بیان کا اہم ترین جزو یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی میں ہندوستان کی آبادی کے بڑے حصے کی نمائندگی دستور کو مرتب کرے۔ ملک معظم کی حکومت اس بارے میں سوچ نہیں سکتی۔ جیسا کہ کانگریس نے کہا تھا کہ وہ اپنے دستور کو زبردستی ملک کے کسی حصے پر مسلط کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کو دبانے کے لیے گاندھیائی طریقہ کو اختیار کرنا ایک حیرت انگیز فیصلہ تھا۔ ویسے بے حسی اور جمود کو ختم کرنے کے لیے دو ہی طریقے تھے:

ایک یہ کہ پرامن ذریعوں سے دل کے اندر سے بغض اور حسد کو دور کرنا اور ایک دوسرے سے محبت اور اخلاق سے پیش آنا اور غلط فہمی دور کرنا۔ دوسرے سختی سے برطانوی حکومت کے نزدیک قوت کا استعمال جائز تھا جب کہ کانگریس کی یہ رائے تھی

مسلمانوں کی شرطوں کے نامعقول ہونے کے باوجود قوت کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔
یہ وہی راستہ تھا جو فرقہ وارانہ رخ اختیار کر گیا کہ وہ خواہ فرقہ وارانہ حیثیت کا معاملہ ہو، خواہ بہت زیادہ طاقت کے نہ استعمال کرنے کا معاملہ ہو، خواہ صوبوں کی تشکیل کا مسئلہ ہو، یا ملک کی تقسیم کا مطالبہ ہو، عام سرکاری مقدموں کا مسئلہ ہو، یا صوبہ جاتی خود مختاری کا مسئلہ ہو۔

بدقسمتی سے اب تک برطانوی حکومت کی طاقت کا غلبہ تھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں قوت کا سارا سامان رکھا۔

یہ قوت مختلف فرقوں کے معاملات کو پر امن ذریعہ سے طے کرنے کے سلسلے میں استعمال کی گئی یا مختلف حریفوں کے روکنے کے لیے۔ مسلم لیگ کے نظریۂ تقسیم پر پہلے عمل درآمد ہونا چاہیے تھا کہ ملک معظم کی حکومت نے حق بجانب کام کیا تھا۔ لیکن یہ کانگریس کو قابل قبول نہ تھا۔ کوئی بھی پارٹی سمجھوتہ کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لیے ان کے مابین مسئلے طے نہ ہو سکے۔

آخر کار نہرو اور بلدیو سنگھ ہندوستان واپس آ گئے لیکن جناح اور لیاقت علی خاں انگلستان میں ہی پاکستان کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے لیے رک گئے۔ وائسرائے کے اعلان کے مطابق کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا اجلاس 9 ردسمبر 1946ء کو کونسل ہاؤس کی لائبریری میں شروع ہوا۔ اجلاس میں 205 ممبروں نے شرکت کی اور وہ صوبہ جاتی لحاظ سے الگ الگ بلاکوں میں بیٹھے۔

مسلم لیگ کے 73 نمائندوں نے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ ہندوستانی ریاستوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔

اسمبلی کی ابتدائی کارروائی میں پندرہ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر منتخب کیے گئے۔ اس کمیٹی کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے طریقہ کار کا تعین

کرنا تھا۔ ہندوستانیوں اور ان کے آئندہ نسلوں کے معاملات طے کرنے کے لیے اہم دستور مرتب کرنے کا زبردست کام شروع کیا گیا۔ مسلم لیگ کے نمائندوں کی اسمبلی میں عدم شرکت پر اسمبلی کے متعدد مقتدر ممبروں نے بہت افسوس کیا۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی جس کا اجلاس 24/ دسمبر کو ہوا، نے حکومت کے 6/ دسمبر 1946ء کے اعلان کی مذمت کی اور پارلیمنٹ میں 12-11 دسمبر کو حکومت کی جانب سے لارڈ پیتھک لارنس اسٹیفر ڈ کرپس کی تقرری کی مذمت کی گئی۔ اس نے کرپس مشن کے گروپ بندی کے بارے میں کانسٹی ٹیوشن کے اعلان کی وضاحت کے بارے میں اپنے اعتراض کو دوہرایا۔ اس طرح سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ مسلم لیگ اسمبلی میں داخلے کی مخالف ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے ریزولوشن میں تبدیلی کی اور جواہر لال نہرو کی تحریک پر 5/ جنوری 1947ء کو حسب ذیل ریزولوشن پاس کیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کی تشریح کے مطابق گروپ بندی کے سیکشنوں میں طریقہ کار پر عمل کیا جائے تاکہ پنجاب میں سکھوں کے مفادات کو کسی طرح کا نقصان نہ پہونچے۔ اگر کوئی کوشش اس قسم کی کی گئی کہ صوبہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ایسی کارروائی کرے جو اس کے متعلقہ لوگوں کے خواہشات کے مطابق ہو۔

اس ریزولوشن کی رو سے کانگریس اس امید پر کہ مسلم لیگ اس کا جواب دے گی اور آسام کے لوگوں کے خدشات کو دور کرنے کی کوشش کرے گی اور اسمبلی میں شرکت کرے گی۔

مسٹر جناح اپنے فیصلے پر اٹل تھے اور کسی قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے سیکشن (B) اور اس کی اقلیتوں کے بارے میں کسی قسم کے الفاظ استعمال

نہیں کیے۔

5/فروری 1947ء کو 9 غیر لیگی ممبروں نے حکومت میں مسلم لیگ کے ممبروں کے استعفے کا مطالبہ کیا۔ ویول نے اس معاملے کے سلسلہ میں لیاقت علی خاں سے معلوم کیا اور انھوں نے کہا کہ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ کانگریس نے بھی اصل میں کیبنٹ مشن کے فیصلے کو منظور نہیں کیا اور نہ سکھوں نے۔

اس طرح سے وائسرائے بڑے شش و پنج میں پڑ گئے۔ انھیں مسلم لیگ سے ہمدردی تھی اور اس کے ساتھ وہ کانگریس کے اس موقف کی تائید میں تھے کہ کسی فرقے کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ وائسرائے وزیر ہند سے مشورہ کر رہے تھے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ 13/فروری کو نہرو نے مسلم لیگ کے ممبروں سے استعفے کا مطالبہ کیا اور دو دن بعد پٹیل نے کہا کہ حکومت سے کانگریسی ممبر استعفیٰ دیدیں۔ برطانوی حکومت کے خیال میں کانگریسی ممبروں کو استعفےٰ دینا چاہئے تھا کیونکہ مسلم لیگ کی علیحدگی تباہ کن ہوگی۔ اس وقت سخت ترین ابتلا اور خرابی کے آثار نظر آرہے تھے۔ 14/ اگست کو کلکتہ میں بلوہ شروع ہو گیا تھا جو برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اکتوبر میں مشرقی بنگال میں اور نومبر میں بہار میں زبردست فساد ہوا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی اور حالات پریشان کن اور خطرناک تھے باہمی تفریق اور تناؤ کو بڑھاوا مل رہا تھا۔ سرکاری ملازمین بھی پارٹی بندی اور تعصب سے متاثر ہو گئے۔ اس سے اندیشہ ہو گیا تھا کہ اگر فوج بھی اس سے متاثر ہو گئی تو ملک میں لا اینڈ آرڈر بالکل ختم ہو جائے گا اور ملک میں بدترین قسم کی طوائف الملوکی اور فساد پھیل جائے گا۔

16- برطانیہ ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے

برطانیہ نے قرنوں سے اپنی شر پسند پالیسیوں سے ہندوستان کو تباہی اور بربادی

پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ بلاشبہ اٹھارہویں صدی سے اس نے ہندوستانی سیاست میں دخل اندازی کی۔ دوسری عالمی جنگ کے واقعات سے برطانوی حکومت نے اس اصلیت اور حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ جنگ سے تھکا ہوا اور اقتصادی اعتبار سے تباہ حال اور سماجی اعتبار سے منتشر انگلستان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ سامراجی پالیسیوں کو انگلستان کے باہر چلائے اور اس طرح سے اقتصادی تعمیر نو اور ملک میں سماجی ہم آہنگی قائم کرنے کے اہم ترین مسئلوں سے توجہ ہٹائے۔ اس کے ساتھ اس نے اس حیثیت کو بھی تسلیم کرلیا کہ اب عالمی طاقت کے توازن میں انقلاب آ گیا ہے اور یہ کہ برطانوی صنعتوں میں برطانوی بیرونی طاقت اور بیرونی سرمایہ کاری اور مالی اساس ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے کی وجہ سے بازار میں آ گئی ہے اور اس کی وجہ سے دنیا میں خاص طور سے مشرقی کرۂ ارض میں برطانوی اثر کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ خاص طور سے سوویٹ یونین کے سپر پاور کی حیثیت سے ابھرنے کی وجہ نے برطانیہ کو اسے حقیقت پسندی نے اس کا بھی احساس دلایا کہ اب بیسویں صدی کے نصف والے ہندوستان پر انیسویں صدی کے اصولوں سے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستان اب تک قرون وسطیٰ کا ذہن خاص رکھنے والا تھا مگر اب بدل رہا ہے۔ وہ اب باہمی اعتبار سے بالکل بے پرواہ مذہبی، سماجی اور نسلی گروپوں کا ملک نہ تھا۔ قوم پرستی کے جذبے نے ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اب اس سے عوام بھی متاثر ہو رہے تھے اور اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ مختلف مزاحمتوں سے کیا۔ یہ صحیح ہے کہ برطانوی حکمرانوں کی مکاری والی شاطرانہ اور عیارانہ پالیسیوں نے ہندوستان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی دونوں ملتیں یعنی ہندو اور مسلمان حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھیں اور مساوی طور سے حصول آزادی کے لیے بیقرار تھیں۔

مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے اپنے پٹھو کی حیثیت سے پیش کیا اور انھیں کانگریس کے خلاف صف آرا کیا گیا اور آزادی کی منزل کی طرف ان کے مارچ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔

لیکن تیسری دھائی کے اوائل سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی طرف سارے ہندوستانی رواں دواں تھے۔ اس احساس کا اظہار لن لتھ گو اور ہیلی فاکس جو قدامت پسند تھے کی تقریروں سے اور کرپس کی دارلعوام میں تقریر سے ہوتا ہے جس میں کرپس نے کہا کہ کم سے کم 20-15 برس تک ہندوستان پر برطانوی تسلط بڑی تعداد میں برطانوی ملازمین اور برطانوی فوجوں کی مدد سے رکھا جائے اور اس کا اعلان کر دیا جائے۔

سامراجی شان وشوکت کا تارعنکبوت جو چرچل اور ایمرے جیسے لوگوں کے ذہنوں میں تھا کو لیبر گورنمنٹ کے لیڈروں نے پاش پاش کر دیا۔ ہندوستانی سیاست میں جمود توڑنے کے لیے انھوں نے جرأت مندانہ پالیسی اختیار کی۔

20رفروری 1947ء کو اٹیلی نے دارالعوام میں حسب ذیل بیان دیا: ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو ان اختیارات رکھنے والی جماعتوں جنہیں اس دستور نے کرپس مشن کے منصوبے کے مطابق تمام ہندوستانی پارٹیوں نے منظور کیا ہے، حوالے کردے لیکن بدقسمتی سے کوئی صاف امید نظر نہیں آتی کہ اس قسم کا کوئی دستور یا اس قسم کی جماعتیں قائم ہوسکیں گی۔

موجودہ غیر یقینی صورت حال خطروں سے بھری ہے مگر اسے عرصہ تک قائم نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ملک معظم کی حکومت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ وہ ایسے ضروری اقدام کرے جس سے اقتدار ذمہ دار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں جون 1948ء تک منتقل کردے۔ ایک معینہ میعاد کے بعد برطانوی حکومت ہندوستان میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرے گی۔ اس نے پہلے متبادل کو نامنظور

کردیا اس لیے کہ یہ ہندوستانی عوام کی مرضی اور خواہشات کے سراسر خلاف تھا۔ دوسرے یہ کہ قومی اور بین الاقوامی نقطہ نظر سے غیر عملی تھا اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی مختلف پارٹیوں میں برطانیہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو جائے گی۔

یہ بیان چیلنج تھا اتحاد کے لیے۔ اگر کانگریس اور مسلم لیگ اس صورت حال کے بارے میں متفق ہو جائیں اور دو آزاد اور بااختیار مملکتوں میں تقسیم کے لیے اگر کانگریس اور مسلم لیگ متفق نہ ہوتیں تو حالات ہی دوسرے ہوتے۔ بدقسمتی سے فروری 1947ء میں دونوں کے مابین اختلاف بہت بڑھ گیا۔ آزاد پاکستان کے خواب نے باوجود مبہم اور دھندلے ہونے کے مسلمانوں کے دماغ کو مسحور کر رکھا تھا اور اس طرح آزاد ہندستان کے صاف اور واضح خطوط نے کانگریس کو بری طرح متاثر کر رکھا تھا۔

ویول کا پس وپیش، ان کی مسلم لیگ سے ہمدردی اور کانگریس کو مخالف بنا لینے کے احساس اور اس خیال نے کہ برطانوی حکومت کا خاتمہ قریب ہے، حکومت کے وقار کو پوری طرح مجروح کر دیا تھا۔ ارباب اقتدار کا اثر بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اور آئندہ ہونے والے واقعات کا ارباب اقتدار کو کوئی علم نہ تھا۔ ان وجوہ سے سرکاری ملازموں میں زبردست پست ہمتی پیدا ہوئی جس سے شر پسند عناصر کو بڑی تقویت پہونچی۔

وائسرائے کو اس کی بیوروکریسی، جو ہندوستان کی آزادی کے تصور سے سخت اور شدید بغض رکھتی تھی، نے گمراہ کیا تھا۔ برطانوی حکمرانوں نے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے جو تقسیم کو ضروری خیال کرتے تھے، صورتحال کو غیر یقینی بتایا تھا۔

وزیر اعظم کے اس اعلان نے اس پریشان کن صورت حال کو ختم کر دیا۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ وائسرائے کمیٹی کو ایک نئے ہاتھ میں دیا جائے۔

ویول کو کانگریس یا ملک کی یعنی ہندستان کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور سب سے زیادہ با اثر پارٹی سے اتحاد حاصل کرنے میں شدید ناکامی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے دوسری پارٹیوں کو بھی ان کی توقعات کو پورا کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ کو ویول کے منصوبے کی کہ بتدریج ہندوستانی فوجوں کو ہندوستان سے کم کیا جائے اور یہ مشن منصوبے کے مطابق ہو اور ہندو مسلم مفاہمت کرانے میں پیش رفت ہو، اس صورتحال میں یہ ناممکن اور ناقابل عمل تھا۔ اور اس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ فوری اقدامات کیے جائیں۔

ایٹلی نے ویول کے خیالات اور طرز عمل کو صورتحال سے نمٹنے کے لیے ناسازگار پایا اس لیے ان کی جگہ ایڈمرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا اعلان کیا کہ ہندوستانی ہاتھوں میں برطانوی حکومت کی ذمہ داری منتقل کریں اور اس طرح آئندہ کی خوشی اور خوشحالی کا تحفظ کریں۔

گاندھی جی کا ردعمل مدافعانہ تھا۔ انھوں نے کہا ماضی میں برطانوی حکومت کے تسلط کی جو تاریخ رہی ہو مگر اس میں شک اور شبہ کا کوئی شائبہ نہیں ہے کہ وہ اب ہندوستان کو چھوڑ رہے ہیں۔

اس اعلان نے کہ اب سارا بوجھ مختلف پارٹیوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ صورتحال کو بنانا اور بگاڑنا پوری طرح سے ان کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے بار بار دوہرانے والے مطالبے کو ''انگریزو ہندستان چھوڑو'' کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

نہرو نے گاندھی جی کو لکھا کہ ایٹلی کے بیان میں کچھ ابہام ہے اور اس سے الجھن پیدا ہو سکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے تشریح کے بعد یہ بڑا اجرأت مندانہ اعلان ہے اور یہ ہمارے ہندوستان چھوڑو کے دہرانے کے مطالبے کو تمام وکمال منظور کرنا ہے۔

ایٹلی نے ایک طرف تو اس کا خیر مقدم کیا کہ اقتدار کی منتقلی کے لیے ایک تاریخ

مقرر کردی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ اس نے اس پر زور دیا کہ اقتدار کی منتقلی کے بعد عارضی حکومت کو نوآبادیاتی حکومت کی طرح سرکاری ملازمتوں اور ایڈمنسٹریشن پر پورا کنٹرول ہو۔ کنٹرول ساتھ وائسرائے کو دستوری سربراہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس نے برطانوی حکومت کی پالیسی اور فیصلے کے فخر سے منظور کرلیا۔ اس نے کہا کہ یہ صاف کردیا گیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا دستور صرف ان علاقوں پر نافذ ہوگا جو اسے منظور کریں۔ اس نے دعویٰ کیا کسی صوبے یا کسی صوبے کے کسی حصے کو جس نے دستور کو منظور کرلیا ہو اور یونین میں شامل ہونا چاہتا ہے، اس سے نہیں روکا جاسکتا۔ اس کے ساتھ اس نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس نے مسلم لیگ کے نمائندوں کو کانگریسی نمائندوں سے ملنے کی دعوت دی تاکہ صورتحال پر غور وخوض کیا جائے اور اس سے نمٹنے کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

مسلم لیگ کو اس پر بڑی مسرت ہوئی کہ برطانوی حکومت نے اسے صاف کردیا کہ سارے ہندوستان کا اقتدار صرف ایک حکومت کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ اس اعلان سے مسلمانوں کو یہ امید بندھ گئی کہ برطانیہ کی رضامندی سے انھیں پاکستان حاصل ہوجائے گا۔ مسلم لیگ نے کانفرنس کے متعلق کانگریس کے دعوت نامے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جناح نے اس پر تبصرہ کرنے سے انکار کردیا۔

اس اعلان پر پارلیمنٹ میں مباحثے سے وہ گہرے اختلافات منظر عام پر آگئے جو پارلیمنٹ کے مختلف ممبروں میں پائے جاتے تھے۔

دارالامرا میں وزیر ہند ٹمپل وڈ نے اس اعلان کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے سے تعبیر کیا۔ سائمن نے کہا کہ برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس برطانیہ کے نام پر داغ لگے گا۔ لیکن ہیلی فاکس نے اس پر زور دیا کہ ”اگر ہندوستان کی تاریخ کے اس باب کو ختم کرنا ہے تو اس کے سوا

کوئی بہتر طریقہ نہیں کہ ہندوستان کو نئے نظام میں آنے کے لیے مدد دینے کی پیشکش کی جائے۔ میں چاہوں گا کہ آج رات یہ پیغام ہندوستان کو بھیجا جائے۔''

دارالعوام میں 20/فروری 1947ء کے اس اعلان کی مدافعت کرتے ہوئے کرپس نے ان وجھوں کو بیان کیا جن کی وجہ سے ہندوستان کا اقتدار منتقل کرنے کے لیے ایک تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ جان اینڈرسن نے اقتدار منتقل کرنے کی ایک خاص تاریخ مقرر کرنے کی مخالفت کی۔ انھوں نے حکومت پر تین وجھوں سے حملہ کیا۔ ایک تو یہ کہ ان کا یہ فعل بہت خطرناک تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ہندوستان میں آئندہ ایڈ منسٹریشن میں مستعدی اور چوکسی قائم رکھنے میں پہلوتہی کی اور تیسرے یہ کہ ایک خاص تاریخ مقرر کر کے ایک جوا کھیلا ہے۔

چرچل نے حکومت پر الزام لگایا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کو طلب کر کے اور عارضی حکومت کو ایک اعلیٰ ذات کے ہندو جواہرلال نہرو کے سپرد کر کے وہ ان اصولوں سے ہٹ گئی جو 1942ء میں کرپس کی پیشکش تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی کہ ''مجھے رنج اور صدمہ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت نے اپنی ان شاندار روایتوں کو جو اس نے ہندوستانیوں کے لیے انجام دی تھیں اس طرح ذلیل اور رسوا کیا ہے۔ ہمیں ان حالات میں سب کچھ کرنا چاہئے اور اس تباہی اور بربادی کو روکنا چاہئے جو برطانوی حکومت کے خاتمے پر پیدا ہوگی۔''

ایٹلی نے اس مباحثے کا جس کا آغاز کرپس نے کیا تھا جواب دیا۔ اینڈرسن نے اپوزیشن کی طرف سے جو ترمیم پیش کی وہ 377 کے مقابلے میں 135 سے نامنظور کر دی گئی اور حکومت کی تجویز منظور ہوگئی اور بالآخر ہندوستان کی آزادی کی لڑائی جیت لی گئی۔

بارھواں باب

تقسیم اور آزادی

1- پاکستان کے لیے مسلم لیگ کی ریشہ دوانیاں

اٹیلی کے 20/فروری کے اعلان نے متعین طور سے ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے ختم ہونے کی تاریخ مقرر کردی تھی لیکن برطانوی حکومت کی جانشینی کے بارے میں یہ اعلان مبہم تھا۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں دو متبادل صورتوں کا اس اعلان میں ذکر کیا گیا تھا جس کا مطلب کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو خوش کرنا تھا۔ ایک طرف اس نے کانگریس کے ہندوستان کے اتحاد کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا لیکن دوسری طرف اس میں خاص طور سے اس کا بھی ذکر کیا گیا کہ اگر جون 1948ء سے پہلے متحدہ ہندوستان کے لیے نمائندہ کانسٹی ٹیوئنٹ یا دستور تیار ساز اسمبلی نے دستور کیا تو حکومت اس پر غور کرے گی کہ برطانوی ہند کی مرکزی حکومت کے اختیارات کس کو منتقل کیے جائیں اور کس قسم کی مرکزی حکومت کو یا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جو مناسب معلوم ہو۔

مسلم لیگ نے سوچا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا جون 1948ء تک بائیکاٹ جاری رکھا تو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نمائندہ اسمبلی نہ رہے گی اور اس صورت میں برطانوی حکومت اس پر مجبور ہوگی کہ وہ اقتدار مسلم اکثریتی صوبوں کے حوالے کردے اور پاکستان کو عملاً تسلیم کرلے۔ اس اعلان نے مسلم لیگ کے اس موقف کی پوری طرح ہمت افزائی کی جو اس نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس نے کانگریس

ورکنگ کمیٹی کی جانب سے کانفرنس کی دعوت کو ٹھکرادیا۔ہڈسن بھی اس نتیجے پر پہونچے کہ 20 ر فروری کا اعلان ہندوستانی سیاست کے سیاق میں پاکستان کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔

لندن ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ اس قرطاس ابیض (White Paper) کی زبان اور متن سے مسلم علیحدگی پسندی کی پوری طرح حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اگرچہ مسلم لیگ نے عوام میں خود اعتمادی مظاہرہ کیا لیکن دراصل ویول اور بیورو کریٹس مسلمانوں سے زیادہ پاکستان کی ضرورت محسوس کرنے کے قائل تھے۔اس کی تصدیق اس وقت کے مسلمانوں کے معاملات سے ہوتی ہے۔ ایٹلی کے اعلان سے پہلے صورت حال مسلم لیگ کے لیے امید افزاء نہ تھی۔

سندھ اور بنگال پاکستان کی تائید میں تھے۔لیکن تین صوبے پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور آسام مسلم لیگ کے دائرہ اثر سے باہر تھے۔ پنجاب میں 175 ممبروں کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے 79 ممبر تھے۔یونینسٹ پارٹی کے لیڈر خضر حیات خاں ایک مخلوط غیر مسلم لیگی حکومت کے سربراہ تھے۔ اس لیے مسلم لیگ کے وقار اور بقا کے لیے ضروری تھا کہ وہ خضر حیات خاں کی وزارت کو ختم کردے اور اپنی حکومت قائم کرے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن یعنی عوامی مظاہرے اور ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے مسلم لیگ کی عسکری تنظیم مسلم نیشنل گارڈز کی صورت میں قائم کی گئی۔ مسلم لیگی لیڈروں نے گرفتاریاں دیں، مذہبی جنون کو برانگیختہ کیا۔اس کے بعد سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی۔ اس میں ہزاروں مسلم خواتین اور مردوں نے حصہ لیا۔قوانین کی خلاف ورزی کی گئی، پرجوش نعرے لگائے گئے اور سرکاری عمارتوں پر مسلم لیگی جھنڈے لہرائے گئے۔

پنجاب سے ہمدردی میں ہندوستان کے بہت سے شہروں میں مسلم لیگ کی طرف سے ہڑتالیں کی گئیں اور مظاہرے کیئے گئے۔

خضر حیات خاں نے تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلم نیشنل گارڈ ز اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو خلاف قانون قرار دیا اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا۔ لیکن اس کے بعد انھیں اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ نرم پڑ جائیں اور مسلم لیگ کے خلاف قوت کا استعمال نہ کریں۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کا مقصد مسلم لیگ کو کچلنے کا نہیں ہے۔ اس طرح انھوں نے ابلتے ہوئے پانی پر تیل چھڑ کا لیکن وہ دھمکیوں کے آگے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ انھوں نے اس کا عزم مصمم کرلیا تھا کہ پنجاب کو فرقہ وارانہ جھگڑوں اور ہنگاموں سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن برتاؤ کی اس تبدیلی کے باوجود تشدد کے واقعات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ 20رفروری 1947ء کو ایٹلی کا اعلان نشر کیا گیا جس میں مسلم مملکت کے قیام کے بارے میں مسلم لیگ کے مطالبے کو منظور کرلیا گیا تھا۔ 26رفروری 1947ء کو پنجاب کی حکومت اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو گیا اور والنٹیرز کی تنظیم پر پابندیاں ہٹالی گئیں۔ لیگ کے لیڈروں کو رہا کردیا گیا اور ایجی ٹیشن واپس لے لیا گیا۔ پھر اچانک سب کو حیرت زدہ کرتے ہوئے خضر حیات خاں مستعفی ہو گئے۔ اپنے اس اہم قدم کی تائید میں انھوں نے صفائی پیش کی مگر وہ کسی کو مطمئن نہ کر سکے۔ فروری کے آخر تک وہ اپنے اس عزم مصمم کا اعلان کرتے رہے کہ وہ لیگ کی متشددانہ سرگرمیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔ لیکن اس جرأت مندانہ اعلان کے بعد ایک ہی ہفتہ کے اندر ہی انھوں نے یہ محسوس کیا کہ صورت حال اتنی زیادہ بدل چکی ہے کہ ان کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ہٹ جائیں اور میدان مسلم لیگ کے لئے خالی کردیں۔

ایلن کیمبل جانسن (Alan Campbel Johnson) کے نزدیک پچھلے

پانچ مہینوں سے مخلوط حکومت کے وزیر اعلیٰ مسلم لیگ کے قاتلانہ حملوں سے بچنے کے لیے راتیں مختلف مکانوں میں گذارتے تھے۔ لیکن خضر حیات خاں کا استعفیٰ جان کے ڈر یا خطرے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ اس انقلاب کا نتیجہ تھا جو ہندوستانی سیاست میں ایٹلی کے 20 رفروری کے اعلان سے آیا تھا۔ اس سے انھیں لگا تھا کہ پنجاب پاکستان میں چلا جائے گا۔ لیکن ملک میں حکومت کی ممکنہ تبدیلی ان کے اس رویے کے لیے بڑی مضبوط دلیل تھی۔

1935ء میں پنجاب گورنمنٹ، صوبائی گورنر اور مرکزی حکومت کی حمایت پر بھروسہ کرتی تھی۔ نہ تو مسلم لیگ کی چکنی چپڑی باتوں اور نہ اس کی دھمکیوں نے خضر یات خاں کے پنجاب پر حکومت کرنے کے مسلمہ طریقوں کو تبدیل کیا تھا۔ فضل حسین جو یونینسٹ پارٹی کے بانی ممبروں میں تھے اور یہ پارٹی اعلیٰ طبقوں پر مبنی تھی، جس میں تینوں فرقوں کے زمیندار شامل تھے اور انھیں حکومت ہند اور پنجاب کے گورنر کی پوری پوری حمایت حاصل تھی۔ سکندر حیات خاں نے اس پالیسی پر عمل کیا اور اس کی حمایت اور تائید پر بھروسہ کیا۔

خضر حیات خاں کے زمانے میں حکومت ہند کی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ حکومت چاہتی تھی کہ پنجاب مسٹر جناح کے دائرہ اثر میں نہ رہے۔ جنگ کے دوران پنجاب فوج کی بھرتی کا مرکز تھا لیکن ملک کی عام سیاست میں حکومت نے کانگریس کے خلاف مسٹر جناح کو ایک بڑے مہرے کی حیثیت سے استعمال کیا اور ان کی پوری حمایت کی۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد پنجاب کو مسٹر جناح کے دائرہ اختیار سے دور رکھنے کی ضرورت ختم ہوگئی۔ ویول کی زبردست خواہش تھی کہ مسلم لیگ کو عارضی حکومت میں شامل کیا جائے۔ انھوں نے جناح کو ترغیب دی کہ وہ پانچ (5) وزارتیں قبول کرلیں اور ان سے متعدد وعدے کیے۔ اکتوبر 1946ء میں مسلم لیگ کے 5 ممبر

پاکستان کے قیام کو یقینی بنانے کے مقصد سے اس حکومت میں شامل ہو گئے۔

قدرتاً ان کا نشانہ پنجاب تھا یعنی پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرنے کا۔ مسلم لیگ نے دھمکیاں دینے کی کوشش کی لیکن خضر حیات خاں ان دھمکیوں میں نہ آئے اور ان سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہ ہوئے لیکن حکومت ہند کے ممبروں کی حیثیت سے مسلم لیگی ممبران نے بڑی قوت سے اثر ڈالا اور پنجاب سرکار کے افسروں کی اس باب میں حوصلہ افزائی کی کہ وہ حکومت کے راستہ میں مشکلات پیدا کریں۔ اس وجہ سے خضر حیات خاں نے اپنی پوزیشن کو بڑا کمزور پایا۔

قومی اور دوسرے سرکاری افسروں نے ان سے مستعفی ہونے پر زور دیا۔ اس طرح سے مسلم لیگ تنظیم کی ان سے زبردست مزاحمت، حکومت ہند کے مسلم لیگی ممبران سے مخالفت اور سرکاری افسروں کی حمایت سے محروم ہو جانے کے بعد اب ان کے پاس اور کوئی دوسرا متبادل نہ تھا کہ وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں۔ ان کا استعفیٰ تازہ اور مزید ہنگاموں کے آغاز کا اشارہ تھا۔ 5/ مارچ 1947ء کو پنجاب کے گورنر نے دفعہ 93 کے تحت صوبے کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

2- ہنگامے

مسلم لیگ کو خضر حیات خاں اور مسلم لیگ مخالف حکومت کو ہٹانے میں بلاشبہ کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن صوبہ پنجاب مسلم لیگ کی حکمرانی میں نہ آیا۔ اس پر مسلم لیگ آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے فرقہ وارانہ تلخی کو بہت زیادہ بڑھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے ہی وسیع پیمانے پر لاقانونیت پھیل گئی اور زبردست بلووں نے پنجاب اور شمالی مغربی صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نہرو نے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور انھوں نے بڑے ہی اندوہناک اور المناک مناظر دیکھے۔ ”میں نے انسانوں کو ایسے

سفاکانہ برتاؤ کے بارے میں سنا جو وحشیوں کو بھی شرمندہ کر دے گا۔'' لاہور تا امرتسر، ملتان ، راولپنڈی اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بلوائیوں کے ہاتھوں نے زبردست تباہی اور بربادی مچائی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں کانگریس وزارت مسلم لیگ کے لیے سخت اور زبردست پریشانی کا باعث تھی۔ اس نے اس کے یعنی کانگریس کے وزارت کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ شروع کیا۔ اس کے لیڈروں نے فسادات کی رپورٹوں اور بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کو پوری طرح استعمال کیا اور اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ بلند کیا۔ اس نے سرحدی صوبے کے قبیلوں اور سرحد پار کے قبیلوں میں جو ملاؤں کے زبردست اثر میں تھے، سے زبردست اپیل کی۔ پیر شریف ایک بااثر مذہبی رہنما نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور مسلم عوام کو کانگریس کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کی۔

اس وجہ سے پنجاب اور سرحدی علاقوں میں زبردست بلوے ہوئے اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں ، ہزارا اور جنوب کے اضلاع خاص طور سے ان فسادات سے متاثر ہوئے۔

27 / اپریل کو خان عبدالغفار خاں نے چارسدہ کے ایک جلسے کو خطاب کیا اور کہا کہ ملک کے موجودہ ہنگاموں کی وجہ سے مجھے شک ہو رہا ہے، کہ ان کے پیچھے ایک زبردست سازش کارفرما ہے۔ یہ نہ تو خدا کی محبت ہے اور نہ اسلام کی بلکہ ملک سے رخصت ہونے والے انگریز آقاؤں کی محبت ہے کیونکہ ان کے دوست یہ نہیں چاہتے کہ انگریز ملک سے چلے جائیں۔ کسی حد تک مسلم لیگ کے لیڈروں اور برطانوی سرکاری افسروں کا فرقہ وارانہ جنون کو بڑھاوا دینے میں کتنا زیادہ حصہ رہا کس حد تک ان میں اشتراک عمل رہا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔

اس بارے میں عارضی حکومت کے ایک ممبر عبدالرب نشتر کے بارے میں عام چرچا تھا۔ نہرو نے 21/نومبر 1946ء کو کانگریس کے میرٹھ کے اجلاس میں اس کی تصدیق یہ کہہ کر کی کہ لیگ اور برطانوی افسروں میں ذہنی سمجھوتہ ہے۔

مون لکھتے ہیں: متعدد سرکاری افسروں کے بارے میں یہ کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہ جب خوف زدہ اور دہشت زدہ ہندوؤں نے ان سے مدد اور حفاظت کی استدعا کی تو انھوں نے ان اپیل کرنے والوں کو ہدایت کی کہ وہ گاندھی، نہرو اور پٹیل کے پاس جائیں۔ مسلم لیگ کا آسام پر جس میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے ایک تہائی تھے، دعویٰ بالکل کمزور تھا لیکن اس کی کوشش کی گئی کہ وہ پاکستان میں شامل کر دیا جائے۔

آسام میں بنگالی مسلمان بطور تارکین وطن آ گئے تھے اور انھوں نے مشرقی سرحد پر حکومت کے محفوظ علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ وہاں آباد ہو گئے تھے۔ آسام سے ان کے نکالے جانے کے مسئلے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی۔ لیگ کا مقصد یہ تھا کہ آسام کی مسلمان آبادی کو بڑھایا جائے۔ بنگال کے دستوں کی تنظیم کی گئی اور انھیں اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ آسام حکومت کے Reserve ریزرو علاقوں میں زبردستی داخل ہو جائیں۔ اس وجہ سے آسام کی حکومت کو فوج کی مدد لینی پڑی۔

جس وقت ہندوستان کے نئے وائسرائے ہندوستان پہونچے تو ملک کی صورتحال انتہائی نازک تھی۔ سیاسی فضا بجلی کی طرح تھی۔ عام نظم ونسق فرقہ وارانہ جذبات سے بری طرح متاثر تھا اور اس کی غیر جانب داری بڑی تیزی سے متاثر ہو رہی تھی اور ہندوستانی معیشت تباہ ہو رہی تھی۔ ہندوستانی ریاستیں شش وپنج میں مبتلا تھیں۔ بالادست قوت ختم ہو رہی تھی اور آزاد ہندوستان سے ان کے رشتہ بڑے غیر فیصلہ کن تھے۔ ہندوستانی حکومت دو گروہوں میں منقسم تھی اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے تعاون نہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ البتہ دونوں اس بات پر ایک رائے تھے کہ یہ نظام

بہت عرصے تک ملک کو نقصان پہونچائے بغیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ عارضی حکومت کے ہوم ممبر ولبھ بھائی پٹیل نے ان دنوں کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہر شعبہ میں برطانوی بیوروکریٹس تھے جو اپنے روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مفاد کو رہن رکھ رہے تھے۔

حالات حد سے زیادہ ابتر ہو گئے تھے اور آئندہ اس سے زیادہ ابتر ہو سکتے تھے اور ایک زبردست ناگزیر تباہی افق پر رونما ہونے والی تھی۔

3- نئے وائسرائے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرتے ہیں

24/ مارچ کو ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے چارج لیا۔ وہ خاص طور سے اس کے لیے مقرر کئے گئے تھے کہ وہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کے خاتمے کا انتظام کریں۔

ان کا تقرر غیر معمولی تھا اور ان کو یہ اہم کام انجام دینے کے لیے غیر معمولی اختیارات دئے گئے تھے۔ وزیراعظم ایٹلی نے نئے وائسرائے کو اپنی ہدایتوں کے خط میں ان اہم نکات کی طرف توجہ دلائی جنھیں اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے انھیں اپنے ذہن میں رکھنا تھا۔

(1) برطانوی کابینہ مشن کے 14/ مئی کے اعلان کے مطابق ہندوستان میں ایک حکومت قائم کریں۔

(2) اگر یکم اکتوبر تک اس حکومت کا قیام ممکن نہ ہو تو وہ انگلستان کی حکومت کو مطلع کریں کہ وہ کون سے ضروری اقدام ہیں جنھیں اٹھائے جانے سے 15/ جون 1948ء تک برطانوی اقتدار ہندوستان کو منتقل کیا جا سکے۔

(3) بالادست قوت کی ذمہ داریاں اور اختیارات جانشین حکومت کو اقتدار کی منتقلی

سے پہلے نہ عطا کریں بلکہ ہر ریاست سے انفرادی طور پر تاج برطانیہ سے ان کے تعلقات کے بارے میں گفت وشنید کریں۔

(4) عارضی حکومت سے اس طرح سے صلاح ومشورہ کرنا جیسا کہ نوآبادیاتی کی حکومت سے کیا جاتا ہے اور اس کو ملک کے روزمرہ کے نظم ونسق میں زیادہ سے زیادہ آزادی دینا۔

(5) ہندوستانی لیڈروں سے زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنا اور رابطہ قائم رکھنا۔

(6) اس کی اہمیت پر زور دینا اور اسے یقینی بنانا کہ اقتدار کی منتقلی اس طرح ہو کہ ہندوستان کی دفاع کی ضرورتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ فوج کی تنظیم کسی طرح درہم برہم نہ ہو اور بحر ہند کے تحفظ کا پورا انتظام ہو۔

اپنی تقرری کی منظوری سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی بعض شرطوں کی منظوری پر اصرار کیا۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اقتدار کی منتقلی پر جس کا ہندوستانی لیڈر مطالبہ کر رہے تھے کے لیے ایک متعین میعاد مقرر کئے جانے پر زور دیا۔ ایٹلی کے 20/ فروری کے اعلان نے اسے منظور کرلیا۔ پھر انھوں نے اس کا مطالبہ کیا کہ انھیں اس پالیسی پر جس پر چلنے کی انھیں ہدایت کی گئی ہے عمل درآمد کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوں اور اس سلسلہ میں ملک معظم کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ ایٹلی اور ان کی کابینہ نے اس سے اتفاق کیا اور اس طرح انھیں اپنا مشن پورا کرنے کے لیے عدیم المثال اختیارات عطا کئے گئے اور برطانیہ کا مغل اعظم ماؤنٹ بیٹن کی صورت میں دہلی میں تخت نشین ہوا۔

اختیارات سے مسلح ہوکر اپنے پیش رووں، جنگی کابینہ، کرپس اور کابینہ مشن کی طرح انھوں نے گفت وشنید کے ذریعے ترغیب دلائی، فیصلہ کیا اور اس فیصلے کو مسلط کیا۔ اپنی

افتادِ طبع کی وجہ سے ماؤنٹ بیٹن اس کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور صورتحال کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھے کہ اس نازک اور مشکل مہم کو کامیابی سے سر کریں۔ ایٹلی نے اس مہم کو انجام دینے کے لیے انھیں صرف 40 فیصدی نمبر دئے تھے لیکن یہ مایوس کن اندازہ ماضی کی ناکامیوں کی وجہ سے تھا۔ ان اہم مسئلوں کا اندازہ نہیں تھا جو اس مدت میں ہندوستان پر اثر انداز ہوئے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے جب ذمہ داری کا چارج لیا تب وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تھے۔ وہ 46 سال کے تھے۔ ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں پورے عروج پر تھیں۔ وہ بے پناہ قوت اور لچکدار ذہن کے مالک تھے۔ وہ بڑی تیزی سے فیصلہ کرتے تھے لیکن وہ ضدی نہ تھے۔ وہ بڑے صاف گو اور انتہائی خوش اخلاق تھے۔ ان کی عادتیں اور طور طریقے دلوں کو موہ لینے والے تھے۔ نہ صرف نہرو بلکہ بہت سے دوسرے لیڈران کی دلکشی کے خطرناک جال میں پھنس گئے اور ان کے حد درجہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان میں رنگ، نسل و طبقہ کا تعصب بالکل نہ تھا۔ اگر چہ وہ بہت ہی شریف اور اونچے خاندان کے فرد تھے اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن نہ وہ رجعت پسند تھے اور نہ مغرور اور نہ کم آمیز۔ اس کے برعکس وہ لبرل اور جمہوریت پسند تھے۔ وہ ہر طبقے کے لوگوں سے گھل مل جاتے تھے اور مختلف صورتحال میں خود کو بخوبی ڈھال لیتے تھے۔

انھوں نے ایک مختصر مدت میں ایک بڑے ہی پیچیدہ مسئلے کو جسے اب تک حل کرنے کی تمام کوششیں کو ناکام ہو چکی تھیں، حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ قدرتاً اپنے فوری مشن کی تفصیلات کی گہرائیوں میں وہ اتنے زیادہ مشغول ہو گئے کہ انھوں نے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ انھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ پاکستان پاگل پن کا منصوبہ ہے اور یہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے اور اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آئندہ بڑا نقصان پہونچے گا اور بین الاقوامی معاملوں میں منقسم ہندوستان کا رول

بہت کمزور رہے گا۔ اس کی وجہ سے ملک کی ترقی رک جائے گی اور ان خرابیوں کو جن میں ملک مبتلا تھا دور کرنے میں رکاوٹ پڑے گی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے ہندوستان کے لکھوکھا اور بے شمار لوگوں کو مسلسل آفتوں اور سخت ترین تکلیفوں میں مبتلا کر دیا۔ ان کا عذر یہ تھا کہ عملی میدان میں انھیں 18 مہینے بعد لایا گیا جبکہ انھیں اس سے پہلے لایا جانا چاہیے تھا اور اس اثنا میں صورتحال اتنی ابتر ہوگئی تھی کہ اب اس کو بہتر بنانا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ عذر اس لیے معقول تھا کہ صرف کوئی معجزہ ہی اس انتہائی اشتعال انگیز فضا میں صورتحال کو بچا سکتا تھا جب کہ جذبات بہت زیادہ بھڑک چکے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن قدرتاً اپنے فرائض کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھیں پہلے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ متبادل منصوبوں میں کس کا انتخاب کریں۔ پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھا جائے اور خودمختار صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں اور ان کے سب فیڈریشنوں کی گروپ بندی کی جائے۔

دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کو دو بااختیار اور بااقتدار مملکتوں میں تقسیم کیا جائے اور وہ ان علاقوں پر مشتمل ہوں جن میں ایک فرقے کے اکثریت کے لوگ بستے ہوں۔

پہلے منصوبے کی بنیاد اس پر تھی کہ صوبوں کی موجودہ حکومتوں کو برقرار رکھا جائے اور پھر ان کے اتحاد کو ایک کمزور مرکز کے تحت رکھا جائے۔ دوسرے منصوبے کی بنیاد اس پر تھی کہ پنجاب، بنگال اور آسام کے صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے اور ہندو اکثریت والے اضلاع کو مسلم اکثریت والے اضلاع سے علیحدہ کر دیا جائے۔

پارٹیوں کے لیڈروں کی رائے جاننے کے لیے انھوں نے 24/ مارچ سے وسط اپریل تک ان لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد انھوں نے گورنروں کی کانفرنس طلب کی اور اسی اثنا انھوں نے واقعات کا جائزہ لیا اور اپنے رفقاء سے تبادلہ خیال کیا تاکہ صورتحال پر غور کریں اور اس بحث مباحثے کی روشنی میں اپنے ذہن کو

صاف رکھیں۔

وہ کانگریس کے جن لیڈروں سے ملے ان میں سے وہ نہرو سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ وہ پٹیل سے کئی بار ملے اور اس نتیجے پر پہونچے کہ یہی دو لیڈر کانگریس کے کلیدی لیڈر ہیں۔

وہ پہلی دفعہ گاندھی جی سے 31/مارچ کو ملے اور اس کے بعد وہ ان سے وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ اگرچہ گاندھی جی کانگریس کے ڈکٹیٹر نہ تھے پھر بھی وہ ایسے اہم لیڈر تھے کہ وہ کانگریس کی رائے کو تبدیل کرا سکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن سے گاندھی جی نے اپنے پہلے انٹرویو میں تجویز کیا کہ سیاسی تعطل اور جمود کو ختم کرنے کے لیے وائسرائے حکومت جناح کے حوالے کر دیں لیکن اس تجویز کو کانگریسی لیڈروں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔

مسٹر جناح نے 6/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ڈنر پر ملاقات کی۔ اس کے بعد وہ متعدد بار ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ انھیں کانگریس سے سخت شکایتیں تھیں۔ وہ بہت جلد فیصلہ چاہتے تھے یعنی تقسیم۔ انھوں نے گاندھی جی کی تجویز کو مسترد کر دیا کیونکہ اس میں اختیار بغیر ذمہ داری کے دیا جانا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن دوسرے کانگریسی لیڈروں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، کرشنا مینن، کرپلانی اور مسلم لیگ کے سکریٹری اور جناح کے دست راست مسٹر لیاقت علی خاں سے ملے۔ سکھوں کے جن نمائندوں سے وہ ملے ان میں بلدیو سنگھ، ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈر تھے۔ والیان ریاست کے مسئلوں پر بیکانیر اور بھوپال کے والیان ریاست سے ملے جو دو مختلف گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اور جنھوں نے ایک دوسرے کے طرز عمل کی سخت شکایت کی۔ دوسرے اشخاص جن سے وہ ملے ان میں جان متھائی، ڈاکٹر خان اور سر مرزا اسمٰعیل تھے۔

انھوں نے اپنی ملاقاتوں کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا انکا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ نہرو کی صاف گوئی اور ان کی انصاف پسندی سے بہت متاثر تھے۔

ان سے ان کے بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ نہرو بڑے اعلیٰ اصولوں اور آزادانہ خیالات کے مالک تھے لیکن وہ کسی کے بھی ذاتی اثر میں آجاتے تھے۔ ان میں یہ کمزوری تھی کہ وہ مضبوط اور خود اعتماد اور دوستانہ تعلقات رکھنے والے اعلیٰ کردار اور ایماندار لوگوں کے فیصلوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ مثلاً باوجود گاندھی جی سے شدید اختلافات رکھنے کے انھوں نے گاندھی جی کے فیصلوں پر ہمیشہ سر تسلیم ختم کیا اور انھیں وہ محبت سے باپو کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کے خیالات کو بھی اسی قسم کی عزت دی۔ ماؤنٹ بیٹن کے نزدیک پٹیل مضبوط، مستحکم، قابل اور باصلاحیت شخص تھے اور حقیقت پسندی میں وہ بڑھے ہوئے تھے

اس لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ پٹیل سے خاص تعلق قائم رکھیں۔ لیکن جناح کے بارے میں ان کا اندازہ دو طرح کا تھا ان کی رائے میں جناح بڑے اعلیٰ دماغ کے مالک تھے اور قانونی موشگافیوں کے ماہر تھے لیکن وہ کم آمیز اور مغرور تھے۔ جناح سے ملنے کے بعد ان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ ''اوخدا ! یہ سرد مہری کا مجسمہ ہے۔'' اسمے (Usmay) جو وائسرائے کے اسٹاف کے چیف تھے، کا خیال تھا کہ جناح اپنی پالیسی کے مضمرات کی اساسی سنجیدگیوں کے بارے میں بالکل بے خبر تھے۔

ان معزز لوگوں کے نزدیک انگریز اور ہندوستانیوں دونوں کی زندگی کی قدریں گاندھی جی سے بالکل مختلف تھیں۔ ہیلی لارڈ فاکس کو اس کا یقین نہ تھا کہ گاندھی جی درویش صفت تھے یا زیرک سیاست داں جبکہ ارون انھیں پاکباز اور عالی دماغ شخص مانتے تھے۔ گاندھی جی کی پالیسیاں اخلاقی اصولوں پر مبنی تھیں۔ ان کی اس تجویز کو کہ عارضی حکومت کانگریس کے وزیروں سے لے کر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے حوالے کر دی جائے ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ اسے احمقانہ قرار دیا گیا جبکہ وہ چاہتے تھے

کسی فرقہ یا ملت کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جائے اور ہندوستانی شہریوں کے ہندوستان میں حکومت کرنے کے بارے میں مذہب کی بنیاد پر اعتراض نہ کیا جائے۔

کانگریس نے حکومت میں مساوات کے اصول یعنی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلق سے اس بنا پر اعتراض کیا تھا لیکن اس نے مخلوط حکومت بنانے کو منظور کرلیا تھا۔ لیکن جب یہ مخلوط حکومت کامیابی سے نہیں چلی تو منطقی اعتبار سے یہ بالکل درست تھا کہ یہ مخلوط حکومت کسی دوسری پارٹی کے حوالے کردی جائے۔ لیکن اس وقت زبردست فرقہ وارانہ حالات سے متاثر ہوکر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کی تجویز کونا منظور کردیا۔ اس لیے وہ گفت وشنید سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔

پارٹی لیڈروں سے ملاقات کے بعد ماؤنٹ بیٹن اقتدار کی منتقلی کے بارے میں بعض نتیجوں پر پہونچے اور انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس بارے میں اپنی کونسل کے ممبروں اور صوبوں کے گورنروں سے مشورہ کریں۔ انھوں نے گورنروں کو دہلی طلب کیا اور 15 راپریل کو ان کی کانفرنس کی۔

پنجاب کے گورنر ایون جنکنس نے پنجاب کی بڑی ہی تاریک اور بھیانک تصویر پیش کی اور اس کو تقسیم کرنے کی بات کی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے کے گورنر اولف کیرو نے سیاسی بحرانی کی بات کی جس کو دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ الیکشن کرائے جائیں جس کی سرحدی صوبے کی کانگریسی حکومت شدید مخالف تھی لیکن مسلم لیگ جس کے لیڈر اس وقت جیل میں تھے، اس سے فائدہ ہوتا۔ بنگال میں مسلم لیگ کے وزیر اعلیٰ مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کے تعلقات شگفتہ نہ تھے اور بنگال کی تقسیم کے تصور کو پسند نہیں کیا گیا۔ آسام میں چائے کے باغات کے یوروپین مالکوں کی پوزیشن کی وجہ سے حالت تشویشناک تھی لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ آسام اس گروپ سے باہر نکل آئے جس میں اسے رکھا گیا تھا۔ بمبئی اور مدراس کے گورنروں کو کسی تشویش کا سامنا نہیں تھا۔ گورنروں

کے بیانات سے یہ بات صاف ہوگئی کہ اگر ہندوستان کے کچھ حصے مستقبل کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھے تو ملک کا بہت بڑا حصہ پرامن اور خاموش تھا اور وہ کسی بھی حل کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔

جیسے جیسے مارچ اور اپریل کے دن گذرتے گئے ملک کے مطلع پر سیاہ بادل چھانے لگے۔ عارضی حکومت کے اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ نظم ونسق کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔ مغربی صوبوں میں زبردست ہنگامے اور فساد ہونے لگے۔ بنگال کی صورتحال بھڑکنے والی تھی۔ مسلم لیگ کے لیڈر لیاقت علی خاں فوج کی تقسیم پر مصر تھے۔

دونوں فرقوں میں عداوت اور دشمنی خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے مشیر اسمے اور ایبل نے جو مارچ میں انگلستان سے آنے والے تھے اور جو، جون 1948ء تک اقتدار کی منتقلی کے لیے بڑی ہی مختصر مدت خیال کرتے تھے، نے اب اپنی رائے تبدیل کردی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ جو کررہے ہیں وہ ہندوستان کو اس کی آزادی دینے کے مترادف نہیں بلکہ یہ کہ وہ ہندوستان کے اقتدار سے دست بردار یا دست کش ہورہے ہیں اور جب ان پر مایوسی کا غلبہ طاری تھا تو وہ ان آوازوں اور مشوروں پر کان نہیں دھرتے تھے جو انھیں ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کا مشورہ دے رہے تھے۔

لہٰذا ماؤنٹ بیٹن کا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ اقتدار کی منتقلی کے لیے جون 1948ء تک کی تاخیر نہ کی جائے بلکہ اس سے پہلے دے دیا جائے یعنی دسمبر 1947ء تک بلکہ اس سے بھی پہلے۔ ماؤنٹ بیٹن پوری طرح اس کے قائل ہو چکے تھے کہ فوری کارروائی ضروری ہے اور یہ کارروائی سیاسی ہونی چاہئے۔ سیاسی لیڈروں سے گفتگو کرنے اور اپنی کارکردگی کا روزانہ جائزہ لینے کے بعد وہ بہت جلد بعض نتیجوں پر پہونچے۔ ایک تو یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہے لیکن یہ فیصلہ برطانوی حکومت کو نہیں

بلکہ خود ہندوستانی لیڈروں کو کرنا ہے۔

لیکن اس فیصلے کے معنی یہ تھے کہ برطانوی حکومت کی جانشینی میں مملکتوں کا کانسٹی ٹیوشن کس قسم کا ہوگا۔

برطانوی مفادات کا تقاضہ یہ تھا کہ جانشین حکومت کو نوآبادیاتی حکومتوں کا درجہ حاصل ہوتا کہ برطانوی سرمائے اور برطانوی معاشی مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ درجہ نوآبادیات دولت مشترکہ کی ممبری کو یقینی بنادے گا۔

ماؤنٹ بیٹن نے یہ بھی سوچا کہ دونوں حکومتیں ہندوستان کے لیے دفاع کا مشترک انتظام کریں اور فوج کی سالمیت کو برقرار رکھیں لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ مرکز میں کسی قسم کا کوئی دستوری آرگن ہوگا یا دونوں مملکتوں میں کسی قسم کا اتحاد ہوگا بلکہ یہ مقصد اس طرح حاصل ہوگا کہ دونوں مملکتوں کے نمائندوں کی عارضی مشاورتی کانفرنسیں منعقد ہوا کریں جن میں مشاورت کی بنیاد پر گفت وشنید ہوا کرے۔ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے بارے میں مشورے ہوا کریں۔

آخر میں مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان منظور کرتے ہوئے یہ ضروری ہوگیا کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے پنجاب بنگال اور آسام کے ہندو اکثریتی علاقوں کو کاٹ کر ہندوستان میں ملادیا جائے۔

مجوزہ طریقہ کار یہ تھا کہ اقتدار صوبوں اور ریاستوں کے گروپ کو منتقل کیا جائے اور پھر States (ریاستیں یا صوبے) مرکزی حکومت کے دستور کو طے کریں۔ ان تصورات پر مبنی منصوبے کی کامیابی کی کنجی کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ضروری تھا کہ ان کو ان اصولوں کے منظور کرنے کی ترغیب دی جائے۔ کانگریس کی طرف سے دو خاص شخص نہرو اور پٹیل تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح۔ کانگریس اس کی پابند تھی کہ آزاد اور بااختیار ہندوستان کی مملکت وجود میں

آئے۔ نہرو نے ہندوستان کی اس پوزیشن کے لیے بہت زیادہ زور دیا۔[1] جنھوں نے ہندوستان کی دولت مشترکہ میں شمولیت کو منظور کرلیا۔ دوسری طرف پٹیل اور وی۔ پی۔ مینن نے ان کو اس تصور پر راضی کرلیا تھا کہ مفہوم کے اعتبار سے اور علیحدہ ہوجانے کے حق کے ساتھ درجہ ''نوآبادیات آزادی کے مترادف تھا اور یہ کہ درجہ نوآبادیات قبول کرلینے سے فوری طور پر حکومت خود اختیاری حاصل ہوجائے گی اور پاکستان کا قیام ایک پریشان کن حالات سے نجات دلادے گا۔ اس لیے وہ درجہ نوآبادیات سے پوری طرح ممکن ہوگئے۔ نہرو اور پٹیل دونوں ہی خواہاں تھے کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو۔ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے وہ دونوں اس پر تیار تھے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات یہاں تک کہ یعنی باقی ماندہ اختیارات بھی دیدیے جائیں۔ اس طرح کانگریس نے جنوری 1947ء میں ایک ریزولوشن کی رو سے کابینی مشن کے منصوبے کو تمام وکمال منظور کرلیا اور اس کے ساتھ کابینہ کی 6/دسمبر 1946ء کی صوبوں کی گروپ بندی کے بارے میں تشریح اور اپریل 1947ء میں اس نے پاکستان کے قیام کو اس شرط کے ساتھ منظور کرلیا کہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو تقسیم کردیا جائے اور ملک کے ہندو اکثریتی اضلاع ہندوستان کے صوبے ہوں۔

آسام کے بارے میں کانگریس نے سلہٹ جہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی کے بارے میں استصواب Plebecite کو منظور کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ کانگریس کی یہ بھی خواہش تھی کہ شمالی مغربی سرحدی صوبے کو اس کا حق دیا جائے کہ وہ پاکستان سے الگ رہے اور اس کی رائے کو جمہوری طریقے سے معلوم کیا جائے۔ اس نے اس پر بھی اصرار کیا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی سارے ہندوستان کے لیے دستور مرتب کرے اور عارضی حکومت نظم ونسق مسلم لیگ کے ممبروں کو الگ کرکے چلائے۔

ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کیے جانے کے متنازعہ فیصلے کی گاندھی جی اور آزاد دونوں پورے طور سے مزاحمت کر رہے تھے۔ نہرو، ماؤنٹ بیٹن کی پرزور وکالت اور ان کی دلکش شخصیت اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی گرانقدر اعانت اور وی۔ پی۔ مینن کی دلیلوں اور مسلم لیگ کے پریشان کرنے والے رویہ کی وجہ سے اس پر تیار ہو گئے تھے کہ ہندوستان کا دستور فوری طور پر نو آبادیاتی حکومت کے ماڈل پر تیار کیا جائے۔

20/اپریل 1947ء کو انھوں نے اعلان کیا کہ اگر مسلم لیگ پاکستان چاہتی ہے تو اسے حاصل کر سکتی ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ ہندوستان کے اس حصے کو اس میں شامل نہ کرے جو اس میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے 25/اپریل کو اسمبلی میں زیادہ کھلے لفظوں میں واضح کیا اگرچہ ہم نے کابینہ مشن کے 16/مئی کے اعلان کو جس نے ملک کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کی یونین پر زور دیا ہے کو منظور کیا ہے مگر یہ یونین ملک کے سارے صوبوں پر مشتمل نہ ہو۔ اگر بدقسمتی سے ایسا ہوتا ہے تو ملک کے ایک حصے کے لیے دستور کے نہ ہونے پر ہم مطمئن ہوں گے۔ اس کا مطلب ہندوستان کی تقسیم سے نہیں بلکہ صوبوں کی تقسیم سے ہوگا اور اس کے لیے ہم کو تیار رہنا چاہیے اور اسمبلی کو اس تقسیم کے تصور میں دستور مرتب کرنا چاہیے۔

1940ء میں پاکستان کے بارے میں ریزولوشن پاس کرنے کے بعد مسلم لیگ کے مطالبے برابر بڑھتے رہے۔ اس وقت پاکستان کی یہ تعریف کی گئی ''یہ ان خطوں کا نام ہوگا جس میں مسلمان غالب اکثریت میں ہوں'' لیکن 1947ء میں یہ کہا گیا کہ پاکستان (5) پانچ مکمل صوبوں بشمول بلوچستان پر مشتمل ہوگا اور رابطے کے لیے ایک ہزار میل کا راستہ ہوگا جو ہندوستان سے ہو کر گزرے گا اور پاکستان کے مغربی بازو کو مشرقی بازو سے ملائے گا۔

دوسری طرف یہ بھی تصور تھا کہ پاکستان آزاد اور بااقتدار مملکت ہوگا۔ تیسرے یہ کہ کسی مشترک غرض ومقصد کے لیے کوئی دفعہ رکھی جائے گی اور نہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے کسی قسم کا کوئی آرگن ہوگا۔

اس سے یہ بیان ظاہر ہوتا تھا کہ دو الگ الگ دفاعی قوتیں ہوں گی اور دو بالکل علیحدہ سربراہ مملکت۔

تاہم مسلم لیگ درجہ نوآبادیات اور دولت مشترکہ کی ممبری قبول کرنے پر رضامند تھی لیکن اس نے پورے طور سے کابینی مشن کے منصوبے کو کلیتہً مسترد کر دیا۔

مسلم لیگ سے اسمے اور ایبل کے ذریعہ رابطہ قائم کیا گیا اور جناح سے خود ماؤنٹ بیٹن نے گفتگو کی۔ انھوں نے پنجاب کی تقسیم کے بارے میں مسٹر جناح کے اعتراضات کو اس طرح ختم کر دیا کہ انھوں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کا پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی منتقلی پر اصرار، پاکستان کے قیام کو خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ گفت وشنید متعدد اہم مسئلوں کے بارے میں ہوئی۔

(1) تقسیم صوبوں کی بنیاد پر یا صوبوں کے حصوں کی بنیاد پر مجالس قانون ساز کے ذریعہ ہوگی۔

(2) ہندوستان کے دفاع کے لیے مرکزی بااختیار جماعت قائم کی جائے گی۔

(3) اس مدت کے درمیان جب تک کہ دستور مرتب کیا جائے ایک عبوری حکومت قائم رہے گی۔ ماؤنٹ بیٹن اسمے، میول (Mieville) اور ایبل پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کی گئی جس نے سیاسی لیڈروں نہرو، پٹیل، جناح، لیاقت علی اور بلدیو سنگھ سے فرداً فرداً ان مسئلوں پر ان سے تبادلہ ٔ خیال کیا۔

اپریل کے وسط میں منصوبے کا خاکہ وائسرائے کے ذہن میں صاف تھا۔ انھوں نے اس کے لیے صوبوں کے گورنروں کی منظوری حاصل کر لی تھی اور اس کے بارے

میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے رویے میول کے ذریعہ معلوم کر لیے تھے۔

اس توقع پر کہ سیاسی پارٹیاں ان کا منصوبہ منظور کر لیں گی ماؤنٹ بیٹن نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے کا کام اپنے پرسنل اسٹاف کے سپرد کیا تھا۔ جنھیں ڈ کی چڑیاں، (Dickie Birds) کہا جاتا تھا اور وی۔ پی۔ مینن جو ریفارم کمشنر تھے ان کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ وائسرائے کے اسٹاف میں پاکستان نواز افسروں مثلاً اسمے اور ایبل کا غلبہ تھا اور ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کانگریس کے نقطہ نظر پر غور کرنے کے لیے زور دیتا۔

ان لوگوں نے اپنا کام ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی اور قابلیت سے شروع کیا اور اس منصوبے کا پہلا ڈرافٹ تیار کیا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ اس سلسلہ میں متعلقہ سیاسی پارٹیوں کی حمایت اور منظوری ضروری ہے۔ انھیں اپنی ترغیب دلانے اور پھسلانے کی قوت پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ انھوں نے اس ڈرافٹ کو منظوری دے دی۔

2 رمئی کو ماؤنٹ بیٹن کا یہ منصوبہ وزیر اعظم کی اطلاع اور ان کا مشورہ حاصل کرنے کے لیے لندن بھیجا گیا۔ جس وقت ان کے پیغام بر اسمے اور ایبل انگلستان جا رہے تھے تو ماؤنٹ بیٹن شمالی مغربی سرحدی صوبے کا دورہ کر رہے تھے جہاں اس وقت کانگریس حکومت کے خلاف مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کی وجہ سے زبردست کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر خان صاحب کو نئے الیکشن کرانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ اس صورت میں مسٹر جناح سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لیں گے۔ خان صاحب نے انھیں مطلع کیا کہ چونکہ ملاؤں نے مذہبی جذبات بہت زیادہ بھڑکا رکھے ہیں اس لیے وہ وائسرائے کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتے اور خاص طور سے اس لیے کہ ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے مسلم لیگ الیکشن

میں مقابلہ کر چکی ہے۔

تین دن کے دورے کے بعد وائسرائے دہلی واپس آئے اور انھوں نے صورتحال پر گاندھی جی اور مسٹر جناح دونوں سے گفتگو کی۔ انھوں نے دونوں سے استدعا کی کہ وہ ایک مشترکہ اپیل پر دستخط کردیں جس میں لوگوں سے کہیں کہ وہ امن وامان قائم رکھیں اور تشدد سے باز رہیں۔ لیکن یہ اپیل بالکل بے سود رہی۔ ماؤنٹ بیٹن اپنے پیغام بروں کا انتظار کررہے تھے پھر وہ شملہ روانہ ہو گئے۔

3-منصوبے کا پہلا مسودہ

منصوبے کا مسودہ خفیہ تھا لیکن لندن بھیجنے سے پہلے اسے نہرو کو دکھایا گیا تھا۔ اس پر شدید نکتہ چینی ہوئی۔ گاندھی جی اور جناح دونوں نے اپنے انٹرویوز میں اس پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس پر حیرت ہوئی۔ اسے کی لندن کو روانگی قبل از وقت تھی۔ نہرو نے انھیں صاف اور غیر مبہم لفظوں میں یہ لکھا کہ اگرچہ کانگریس نے خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کرلیا ہے لیکن وہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی تقسیم پر اصرار کرے گی۔ وہ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں الکشن کرائے جانے تجویز کی مخالفت کرے گی۔ یہ الکشن مسلم لیگ کی دہشت گردی کی وجہ سے کرائے جانے والے تھے۔ جناح نے صوبوں کی تقسیم کی شدید مخالفت کی۔

اپنے منصوبے کو لندن بھیجنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن ایک مختصر مدت کے لیے شملہ آئے اور یہاں اس منصوبے کے مسودے کے مختلف شقوں پر بحث ہوئی۔ اس بحث ومباحثہ میں وی پی مینن شروع ہی سے شامل تھے۔ وہ اس منصوبے کے جو لندن بھیجا گیا تھا بعض پہلوؤں کے شدید مخالف تھے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستان کا اتحاد نا قابل حصول ہے اور اسے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے اور

درجہ کو آبادیات یا ڈومینین اسٹیٹس کی بنیاد پر دو حکومتوں کے قیام کے حامی تھے۔ ان کے ان خیالات سے کانگریس کے، ایک مضبوط مرکزی حکومت اور ملک کے لیے جمہوری دستور میں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو، مقصد پورے ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو نہرو جو وائسرائے کے ساتھ شملہ میں ٹھیرنے، آئے تھے، کے سامنے پیش کیے اور انھوں نے محسوس کیا کہ نہرو کی رائے بحیثیت مجموعی ان کے خیالات کی تائید ہے۔

10 رمئی کو وائسرائے کو منصوبہ واپس ملا۔ اسے بعض تبدیلیوں کے ساتھ کابینہ نے منظور کرلیا اس کے بعد پریس میں اس کا اعلان کیا گیا کہ وائسرائے نے نہرو، جناح، پٹیل، لیاقت علی خاں اور بلدیو سنگھ کو 17 رمئی کو دہلی میں آئندہ دستور پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے مدعو کیا ہے۔

اس اثناء میں ماؤنٹ بیٹن کو یکبارگی یہ خیال آیا کہ انھیں کابینہ کے نظر ثانی کیے ہوئے منصوبے کو نہرو کو دکھانا چاہیے۔ اس نظر ثانی شدہ مسودے کے بارے میں نہرو کا ردعمل بڑا ہی شدید تھا۔ انھوں نے اس کی شدید مذمت کی اور ساری رات اس منصوبے کے بارے میں اپنے اعتراضات کو ایک خط کی صورت میں قلم بند کرنے میں صرف کی اور اسے 11 مئی کی صبح کو ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کیا۔

اس خط کا متن حسب ذیل تھا:

"منصوبے کی تجویزوں نے جو تصویر پیش کی ہے وہ بدشگونی کی تصویر ہے۔ ان تجویزوں سے نہ صرف ہندوستان کو خطرہ ہے بلکہ یہ ہندوستان اور برطانیہ کے آئندہ تعلقات کو بھی خطرے میں ڈالتی ہیں۔ بجائے یقینی صورت حال، استحکام اور سلامتی کے جذبوں کو پیدا کرنے کے یہ تجویزیں ہر جگہ انتشار پسند جذبوں، نراج اور کمزوری کو تقویت پہونچائیں گی۔ ان سے اہم جنگی ذرائع کو خطرہ لاحق ہوگا اور ان تجویزوں کی

وجہ سے ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان سے تصادم شروع ہو جائے گا۔ تشدد اور بدامنی میں اضافہ ہوگا ان سے مرکزی اقتدار جو بڑھتے ہوئے نراج اور طوائف الملوکی کو تنہا روک سکتا ہے زبردست دھکہ پہونچے گا۔ ان سے فوج، پولیس اور مرکزی ملازمتوں سب میں زبردست بددلی پیدا ہو جائے گی۔ چونکہ اس منصوبے کا کوئی صاف اور متعین پس منظر نہیں ہے اس لیے اس سے سوائے پریشانی اور ابتری کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا اور بجائے اس کے کہ انتظام میں کسی قسم کا خلل پڑنے کے بغیر اقتدار کی منتقلی ہو ان تجویزوں سے اقتدار کی منتقلی میں تشدد کی وجہ سے زبردست رکاوٹ اور مزاحمت پیدا ہوگی اور بے شمار اور بے حد پیچیدگیاں مرکزی حکومت اور اس کے آرگنوں کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو جائیں گی۔ مجھے اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں کہ کانگریس ان تجویزوں کو منظور نہیں کرے گی۔''

ماؤنٹ بیٹن بے حد سراسیمہ ہو گئے۔ ان کی گاڑی اچانک الٹ گئی لیکن خوش قسمتی سے وہ تباہ اور برباد ہونے سے محفوظ رہے۔ انھوں نے لنچ پر اپنے پرسنل اسٹاف کو بتایا کہ ڈکی ماؤنٹ بیٹن بالکل ختم ہو گیا ہوتا اور اس نے اپنا بوریا بستر باندھ لیا ہوتا۔ 17/ مئی کے پروگرام کو منسوخ کر دینا پڑا۔ وزیر ہند کو صورت حال سے مطلع کیا گیا اور اس کانفرنس کو جون تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ نئے منصوبے کو بڑی ہی عجلت میں تیار کیا گیا۔

اب مینن کو لایا گیا اور ان سے نیا تازہ منصوبہ تیار کرنے کو کہا گیا۔ نہرو کے خیال میں مینن کا نقطہ نظر بالکل صحیح تھا اور وہ کانگریس کے لیے ناقابل قبول نہ ہوگا۔ مینن دوسرے منصوبے کی تیاری میں بڑی تیزی سے لگ گئے اور انھوں نے اپنا کام اسی سہ پہر کو پورا کر ڈالا اور نہرو کی شملہ سے شام کو روانگی سے پہلے اس مسودے کو انھیں دکھا دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے وزیر ہند کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے بعد میں مینن کو بڑا ہی فیاضانہ خراج عقیدت ان لفظوں میں پیش کیا: ''یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ میرے اسٹاف میں ریفارم کمشنر تھے اور ہم بڑے ابتدائی مرحلے میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب آ گئے۔ جن اشخاص سے میں ملا ان میں آپ پہلے شخص تھے جس نے پورے طور سے درجہ نوآبادیات کے خیال سے پورا اتفاق ظاہر کیا اور ایسا حل نکالا جس کے بارے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ تاریخ کو اس فیصلے کو بہت اونچا مقام دینا چاہئے اور میں نے یہ فیصلہ تمام تر آپ کے مشورے کی بناء پر کیا۔'' صورت حال کے پیش نظر وزیر ہند کا وائسرائے سے ذاتی مشورہ کرنا بہت ضروری ہو گیا۔ اس نے 15 رمئی کو وزیراعظم کی طرف سے وائسرائے کو لندن آنے کا دعوت نامہ بھجوایا۔ لندن روانہ ہونے سے پہلے وائسرائے کانگریس کی جانب سے نہرو اور پٹیل، مسلم لیگ کی طرف سے جناح اور لیاقت علی خاں سے ملے اور سکھوں کی جانب سے بلدیو سنگھ سے مشورہ کیا۔ نہرو نے نئے منصوبے کی تحریری منظوری دے دی۔ جناح نے اسے زبانی منظوری دی لیکن تحریری منظوری نہیں دی۔ ان تیقنات کو حاصل کرنے کے بعد 18 رمئی کو ماؤنٹ بیٹن منصوبے کے مصنف وی پی مینن کی ہمراہ لندن روانہ ہو گئے۔

5- عارضی حکومت کی مشکلات

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وائسرائے کی ان عاجلانہ سرگرمیوں کی وجہ بیان کی جائے۔ واقعہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ تعلقات بڑی تیزی سے ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ سارا ملک ہنگاموں کا شکار تھا اور حکومت کا وجود یا عدم وجود برابر تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ نئی حکومت بہت زیادہ کمزور تھی۔ پٹیل نے بڑی ہی مایوسی کے عالم میں ماؤنٹ بیٹن سے کہا: ''نہ آپ حکومت کریں گے اور نہ کسی دوسری کو حکومت کرنے

دیں گے۔"

حکومت میں تصادم انتہائی عروج پر پہونچ گیا۔ دوسرے سال کا بجٹ تیار ہو چکا تھا۔ وزیر مالیات لیاقت علی خاں نے ایک تجویز پیش کی جس کی رو سے تجارتی منافع پر 25 فی صدی کا بھاری ٹیکس لگایا گیا یعنی سات ہزار پونڈ سالانہ اور اس کا اثر زیادہ تر ہندوؤں اور کانگریس کے حامیوں پر پڑتا۔ ایک بڑی شاطرانہ چال تھی جس کے ذریعے ایک پتھر سے دو چڑیاں ماری جارہی تھی۔ ایک تیر سے دو شکار کئے جارہے تھے یعنی امیر ہندوؤں کو مالی اعتبار سے تباہ اور اور برباد کرنا اور انھیں حکومت کا مخالف بنانا تھا۔ کانگریسی وزیر ناراض بھی تھے اور بہت زیادہ پریشان بھی۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے اپیل کی اور ان کی مداخلت کی وجہ سے یہ بحران دور ہوا۔

لیکن نفرت اور عداوت بدستور قائم رہی۔ پٹیل نے دھمکی دی کہ اگر لیگیوں کو ہٹایا نہ گیا تو کانگریس پارٹی (یعنی کانگریسی وزیر) مستعفی ہو جائے گی۔ پٹیل اور نہرو دونوں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اب اتحاد ناممکن ہے اور تقسیم ناگزیر ہے۔

لیگ کے وزیروں کا صاف اور صریح مقصد اس حکومت کو اندر سے تباہ کرنا تھا اور اس طرح سے وہ پاکستان کو سرجیکل آپریشن کے ذریعہ معرض وجود میں لانا چاہتے تھے۔

اقتدار کی منتقلی سے پہلے دنوں کے بارے میں پٹیل نے ایک تقریر میں ان لفظوں میں اشارہ کیا کہ وزارت کے ایک سال کے تجربے نے مجھے اس کا قائل کر دیا کہ جس انداز اور طریقے سے ہم کام کر رہے ہیں وہ ہمیں تباہی اور بربادی کی طرف لے جائے گا اور ہمیں ایک نہیں کئی پاکستانوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہر دفتر میں پاکستان کے اڈے ہیں۔

دوسری تقریر میں انھوں نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں اس کی وضاحت کی کہ کس

طرح سے برطانیہ نے کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے قومی اتحاد کو اقتدار کی منتقلی سے بدل لیں۔ برطانوی افسران نے ملازمتوں پر اپنے مخصوص اختیارات اور کنٹرول اور ہندوستانی ریاستوں پر اپنی بالادستی کے اختیار کو استعمال کیا۔ مخصوص اختیارات اور ان کے استعمال کی مثال پنجاب کے ان پانچ حلقوں کی زبردست تباہی اور بربادی سے ملتی ہے جو برطانوی افسروں کے کنٹرول میں تھے اور باوجود ہوم منسٹر ہونے کے پٹیل اپنی اس کوشش میں ناکام رہے کہ ان افسروں کا ان اضلاع سے تبادلہ کر سکیں۔

بالادستی کے اختیار کے بارے میں انھوں نے پولیٹکل محکمے جو ریاستوں کو پورے طور سے اپنے شکنجے میں رکھتا تھا کی ریشہ دوانیوں کی مثال دی کہ اس محکمے کے افسروں نے بے شمار قدرتی ذرائع کو طویل پٹے پر نظام کے پاس رہن رکھ دیا تھا اور اعلیٰ افسران کی مداخلت کی وجہ سے یہ ریاست اس سے بچ سکی۔

انھوں نے پاکستان کے قیام کی منظوری کے بارے میں اپنی وجہیں ان لفظوں میں بیان کیں۔

''میں نے پاکستان کا قیام آخری صورت میں اس لیے منظور کیا کہ ہم اس منزل پر پہونچ گئے تھے کہ ہم سب کچھ کھو بیٹھتے۔''

اس اندرونی تصادم کی وجہ سے حکومت بالکل ناکارہ، نکمی اور بے اثر ہو کر رہ گئی تھی اور لوگ فرقہ وارانہ جذبے کے تحت ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اگست 1946 میں کلکتہ کے جانی نقصانات نے مشرقی بنگال میں آگ بھڑکائی اور گاندھی جی کو اس پر ٹھنڈا پانی ڈالنے اور اس کے بجھانے میں پورے دو مہینے لگے۔ ان کا یہ انسانی ہمدردی کا کام شروع ہی ہوا تھا کہ بہار اس آگ کی لپیٹ میں آگیا اور اس کی وجہ سے 20/ فروری 1947ء کو ایٹلی کا اہم ترین اعلان اہم واقعہ ہے۔ 22/ مارچ کو دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کی آمد ہوئی مگر انھیں اہم مذاکرات کے مقام پر نہ لے جایا جا سکا۔

بہار کے الم ناک واقعات کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑا۔ پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبوں میں خوں ریز تصادم شروع ہوا۔ ان صوبوں میں مسلم لیگ کی سیاسی رسہ کشی چل رہی تھی کیونکہ وہ پورے طور سے مسلم لیگ کی سرکردگی میں نہیں تھے اور یہ معاملہ پاکستان کے لیے بہت اہم تھا۔ اس تصادم نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ نہرو نے شمالی سرحدی صوبے کا دورہ چیف منسٹر ڈاکٹر صاحب کی ہمراہی میں کیا۔ ان کے خلاف معاندانہ مظاہرے کیے گئے۔ کانگریس مخالف نعرے لگائے گئے سیاہ جھنڈے دکھائے گئے اور پتھر پھینکنے کے واقعات بھی ہوئے۔

4- دوسرا منصوبہ

وزیر اعظم کابینہ کی ہندوستانی کمیٹی سے ماؤنٹ بیٹن کے مذاکرات دو دن تک ہوتے رہے سرحدی صوبے میں مختلف قبیلوں نے جنونی ملاؤں کے بھڑکانے سے ہنگامہ آرائی کی۔ انھوں نے لندن میں اپنے مدت قیام کو اس کے لیے بھی استعمال کیا کہ وہ حزب مخالف کے لیڈروں سے ملیں اور منصوبے کے متعلق ان کے رویے کو کچھ نرم کرائیں۔

ماؤنٹ بیٹن 31 مئی کو ہندوستان واپس آئے اور انہوں نے کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے لیڈروں کو مذاکرات کے لیے مدعو کیا۔ یہ لیڈر نہرو پٹیل، کرپلانی، لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر اور بلدیو سنگھ تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس کا افتتاح یہ کہہ کر کیا کہ اگرچہ وہ بے شمار اہم میٹنگوں میں شرکت کر چکے ہیں لیکن یہ کانفرنس بہت اہم ہے۔ یاد رہے کہ دنیا کی تاریخ پر اتنا اہم اثر کسی دوسرے فیصلوں نے نہیں ڈالا جیسا کہ اس میٹنگ میں کیے گئے فیصلے ڈالیں گے۔

انھوں نے یقین دلایا کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف انھیں کوئی قدم اٹھانے پر مجبور

نہیں کر سکتے لیکن جن لوگوں سے انھوں نے بات کی ان کو مسئلہ کی اشد ضرورت پر فوری توجہ دلائی۔ وہ چاہتے تھے کہ موجودہ غیر یقینی صورت حال جلد سے جلد ختم ہو اور جس قدر جلد اقتدار منتقل ہو اتنا ہی سب کے لیے بہتر ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے منصوبے کی وضاحت کی اور یہ بتایا اس منصوبے میں سب سے زیادہ مشترک باتیں پائی جاتی ہیں جو ساری پارٹیاں منظور کر سکتی ہیں۔

اس منصوبے کی نقل سب لیڈروں کو دی گئی۔ اس اعلان نے کہ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے افسوس کا اظہار کیا گیا کہ 16 رمئی 1946ء کے کابینہ مشن کے اعلان کو بڑی پارٹیوں نے منظور نہیں کیا اور ہندوستان کے لیے ایک کانسٹی ٹیوشن تیار نہ ہو سکا۔ اس بیان میں یہ بھی حوالہ تھا کہ مسلم لیگ نے متفقہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایسا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے رو سے ہندوستان کے لوگوں کے مستقبل کے دستوری انتظامات کے بارے میں کسی کی مرضی کو معلوم کیا جا سکے۔ یہ منصوبہ مندرجہ ذیل تجویزوں پر مشتمل تھا۔

(1) صوبوں کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی کارروائی میں کسی قسم کی خلل اندازی نہیں کی جائے گی لیکن ان کا مرتب کیا ہوا دستور ہندوستان کے ان حصوں پر نافذ نہیں ہوگا جو اس کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(2) مختلف خطوں کی مرضی معلوم کرنے کے لیے دو طریقے تجویز کئے گئے:

(الف) موجودہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ذریعہ جس میں اختلاف رکھنے والے حصوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔

(ب) اختلاف رکھنے والے نمائندوں پر مشتمل کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلیوں کے ذریعہ۔

(3) صوبوں کے لیے یہ انتظامات ہوں گے:

(الف) پنجاب اور بنگال کی صوبہ جاتی اسمبلیاں دوسیکشنوں میں تقسیم کردی جائیں۔ایک سیکشن ان ممبروں کا ہوگا جو مسلم اضلاع اکثریتی کا ہوگا اور دوسرا سیکشن غیر مسلم اکثریتی اضلاع کا ہوگا۔

اگر یہ اسمبلیاں صوبوں کے تقسیم حق میں فیصلہ کریں گی تو ہر سیکشن اپنی پسند کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شرکت کرے گا۔

(ب) ہر صوبے کی لیجسلیٹو اسمبلی یہ فیصلہ کرے گی کہ صوبہ کس کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہوگا۔

(ج) شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں لیجسلیٹو اسمبلی کے ووٹروں کی رائے کے ذریعہ فیصلہ ہوگا۔

(س) آسام کا ضلع سہلٹ بھی ریفرنڈم کے ذریعہ اپنا فیصلہ کرے گا۔

(د) گورنر جنرل بلوچستان کے لوگوں کی مرضی معلوم کرنے کے لیے طریقہ مقرر کریں گے۔

(ش) پنجاب اور بنگال کے حصوں اور سلہٹ میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب ہوگا۔

(4) مندرجہ ذیل معاملوں کے بارے گفت وشنید ہوگی:

(الف) حکومتوں کے مابین امور کے بارے میں۔

(ب) اقتدار کی منتقلی کی وجہ سے پیدا شدہ مسئلوں کی رو سے معاہدوں کے بارے میں۔

(5) جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کابینہ مشن کی 12رمئی کے اعلان کردہ پالیسی کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔ ملک معظم کی حکومت کی اس پالیسی کا لب لباب یہ تھا کہ ملک معظم کی حکومت کے اختیارات کا

استعمال نہ ہوگا اور وہ حقوق اور مراعات ریاستوں کے ووٹ کے ذریعہ واپس مل جائیں گے۔ ریاستوں کو اختیار ہوگا کہ وہ جانشین حکومتوں کے ساتھ سیاسی تعلقات رکھیں یا نہ رکھیں۔

یہ اعلان برطانوی حکومت کی طرف سے اس رضامندی کے اظہار پر ختم ہوا کہ وہ جون 1948ء سے پہلے کسی تاریخ کو ہندوستان میں ایک آزاد مملکت قائم کر کے اقتدار کی منتقلی کر دے گی۔

منصوبے کی تشریح کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے اسکیم کا مشن لیڈروں کے حوالے کر دیا اور ان سے اس کے بارے میں آدھی رات تک رائے دینے کو کہا۔ نہرو نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ اگرچہ وہ اس اسکیم سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں لیکن وہ عام طور سے قابل قبول ہے۔ کانگریس کی تحریری منظوری اسی شام کو بھیج دی گئی۔

جناح کو خود سے اس پلان کو منظور کرنے میں پس و پیش تھا۔ وہ نہ صرف مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے آدھی رات کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور انھیں ماؤنٹ بیٹن نے چرچل کے اس پیغام کا خط دیا کہ اگر جناح نے اس پلان کو منظور نہ کیا تو ان کے پاکستان کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اس پر جناح نے پلان کی منظوری سر ہلا کر دی۔

3/جون کی رات کو ماؤنٹ بیٹن، نہرو، جناح اور بلدیو سنگھ نے مئی پلان کے بارے میں اپنے بیانات نشر کیے۔ نہرو نے اس پلان کی منظوری کا اعلان کیا۔ بلدیو سنگھ نے اسے قابل قدر قرار دیا کہ اس پلان سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور ہندوستان سیاسی آزادی کی وراثت کا حامل ہو گیا۔ جناح کی تقریر غیر جانب دارانہ تھی۔ وہ کسی طرح مسلم لیگ کے اس فیصلہ کو کہ آیا اس منصوبے کو سمجھوتے کے طور پر منظور کیا جائے یا اسے ایک مسئلہ قرار دیا جائے نظر انداز نہ کر سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ

وہ اس بارے میں وائسرائے کی مدد کریں کہ ہندوستان کے لوگوں کو آئینی طریقے
سے اقتدار منتقل کرنے کے مشن کو وہ پرامن طرح سے باقاعدگی سے پورا کرسکیں۔
گاندھی جی ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور انھوں نے تقسیم پر رضامندی ظاہر کی۔ 4/جون
کو پرارتھنا سبھا میں انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر افسوس ظاہر کیا لیکن اس کے لیے
انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو موردالزام نہیں ٹھہرایا اور کہا کہ" اس کے لیے کانگریس اور
مسلم لیگ ذمہ دار ہیں یعنی ان دونوں کی وجہ سے تقسیم ہوئی۔ اگر ہم دونوں یعنی
ہندو/مسلمان کسی چیز پر متفق نہیں ہوتے تو پھر وائسرائے کے لیے اور دوسرا کوئی چارہ
کار نہیں رہ جاتا۔

9/جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا۔ اس نے ایک ریزولوشن کے
ذریعہ پلان کو مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ منظور کیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اپنے صدر قائد اعظم محمد علی جناح کو اس کا پورا اختیار
دیتی ہے کہ وہ اس پلان کے بنیادی اصولوں کو بہ طور سمجھوتے کے منظور کرلیں اور انھیں
اس کا بھی اختیار دیتی ہے کہ وہ اس پلان کی مدد سے مکمل تقسیم کو ملک معظم کی حکومت کی
اسکیموں کے مطابق بشمول دفاع، مالیات اور مواصلات عملی جامہ پہنائیں۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 15-14 جون نے کانگریس ورکنگ
کمیٹی کے 2/جون کے ریزولوشن سے اتفاق ظاہر کیا اور اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ
کانگریس ان تجاویز کو منظور کرتی ہے جو 3/جون کے پلان میں پیش کی گئی تھیں۔

5- دوسرے پلان کے بارے میں ردعمل

دونوں پارٹیوں کی طرف سے پلان کی منظوری نے ہندوستان کے اتحاد کی تلخ وتند
بحث کو ختم کردیا۔ جناح کو فتح حاصل ہوئی اس لیے کہ کانگریس نے تقسیم کو چاہے پس

وپیش اور تامل کے ساتھ سہی مگر منظور کرلیا۔ آزادی ہندوستان کے دروازے پر آ گئی لیکن ہندوستان کے اتحاد کا پسندیدہ خواب بالکل چکنا چور ہو گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے اور خون میں ڈوبے ہوئے ہندوستان نے بدقسمتی کے ان دیکھے واقعات کا مشاہدہ کیا۔ پارٹیوں کی صفوں میں ناگزیر طور پر دلوں کے ٹوٹنے کا جذبہ پیدا ہوا اور مستقبل کے بارے میں شک وشبہ اور شدید اختلافات پیدا ہوئے۔

گاندھی جی نے اپنے کو شکست خوردہ تسلیم کیا اور وہ بالکل ہل کر رہ گئے۔ اختلافات اور مصلحت پسندی کی جنگ میں مصلحت پسندی فتحیاب ہوئی۔ سیکولرزم اور ہندوستانی یکجہتی کے علمبرداروں نے فرقہ پرستی اور انتشار کی قوتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ گاندھی جی جنھوں نے کابینی مشن کو منظور کرلیا تھا صوبوں کی تقسیم اور ملک کی تقسیم کی شدید مخالفت پر قائم رہے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ طوائف الملوکی، تقسیم کے مقابلے میں جو برطانوی فوجوں کی سنگینوں کی مدد سے عمل میں آئی، بہتر ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے دونوں پڑوسی نوآبادیات ایک دوسرے کی شدید دشمن ہوئیں۔ دونوں کے مفادات ایک دسرے سے بالکل متضاد تھے۔ پاگل پن کے واقعات رونما ہونے سے گاندھی جی کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ وہ حالات سے اتنا زیادہ مایوس تھے کہ جب ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے ان سے یہ کہا کہ لوگوں کو پہلے سے زیادہ اب آپ کی خدمات کی ضرورت ہے تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا: ''اس سے کیا فائدہ! نہ عوام اور نہ ارباب اختیار مجھ سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں کرو یا مرو میرے لیے زیادہ ضروری ہے اور میں آخری دم تک خدا کا نام لیتے ہوئے سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔''

اپنے ایک رفیق کار سے انھوں نے بڑے افسوس اور رنج کے ساتھ کہا کہ ''ہر شخص میری تصویروں اور مجسموں پر پھول چڑھانا چاہتا ہے۔ لیکن کوئی شخص میرے مشورے پر

عمل نہیں کرنا چاہتا۔'' پرارتھنا سبھا میں انھوں نے کہا'' ایسا لگتا ہے کہ اب میری زندگی کا کام ختم ہوگیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ خدا مجھے مزید ذلتوں سے بچائے گا۔''

جب 2/جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ماؤنٹ بیٹن کے پلان پر مہر تصدیق ثبت کردی تو گاندھی جی نے بڑے درد اور رنج سے کہا کہ'' اگرچہ میں اس سلسلہ میں بالکل اکیلا ہوں لیکن اسے میں پھر دوہراتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم ملک کے مستقبل کو انتہائی نقصان پہونچائے گی۔ یہ خیال کر کے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے کہ مجھے تقسیم میں برائی کے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خدا نے میری بصیرت کو ختم کردیا ہو اور میں نے عدم تشدد کو کمزوری سمجھا ہو اور آج میں لفظوں کے تضاد میں پھنس گیا ہوں اور اسے سچے اور صحیح عدم تشدد کے بالکل متضاد سمجھتا ہوں گویا میں بصارت کھو بیٹھا ہوں۔''

جلد ہی وہ دہلی سے کلکتہ لوٹ گئے لیکن کانگریس کے لیڈروں نے ان سے 14/جون کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں حصہ لینے پر اصرار کیا اور وہ کلکتہ سے دہلی واپس آگئے۔ ان کی بڑائی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ باوجود صاف اور غیر مبہم انداز میں پاکستان کی تقسیم کی مخالفت کرنے اور اسے نامنظور کرنے انھوں نے کانگریس کے لیڈروں کے وقار کو بچانے کے لیے جنھوں نے تقسیم کو منظور کرلیا تھا، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پاس کئے ہوئے ریزولوشن کی پوری تائید کی۔ اس طرح سے انھوں نے کانگریس کی صفوں میں اختلاف پیدا نہیں ہونے دیا اور اپنے عزیز ترین لیفٹیننٹوں یعنی نہرو اور سردار پٹیل کو روسیاہ ہونے سے بچالیا۔

اکیلے گاندھی جی ہی تقسیم کے مخالف نہ تھے بلکہ کانگریس کے لیڈروں نے بھی تقسیم کو بڑی تلخی اور غصے کے ساتھ قبول کیا تھا۔

دوسری طرف مسلم اکثریتی علاقوں کی صورتحال گوناگوں مسئلے پیدا کررہی تھی۔ بنگال میں

شہید سہروردی، جناح صاحب کا اعتماد کھو چکے تھے اور وہ بنگال کے ہندوؤں کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے تھے۔ بنگال مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ابوالہاشم، وزیر مالیات محمد علی، چیف منسٹر سہروردی متحدہ اور خود مختار بنگال کے متعلق گاندھی جی سے گفتگو کرنے آئے۔ سرت چندر بوس نے اس تحریک کی پوری تائید کی۔ انھوں نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں سہروردی، فضل الرحمٰن (وزیر) محمد علی وزیر مالیات، ابوالہاشم سکریٹری بنگال مسلم لیگ، عبدالملک ایم۔ ایل۔ اے، کرن شنکر رائے اور ستیہ رنجن منشی نے شرکت کی۔ وہ عارضی طور پر متحدہ بنگال پر متفق ہو گئے اور اس کے بارے میں گاندھی جی کی اعانت اور مشورے کے طلب گار ہوئے۔

گاندھی جی نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ صوبہ جاتی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اس سے متفق ہوں لیکن یہ شرطیں پوری نہ ہوئیں اور اس طرح یہ تحریک ترک کر دی گئی۔ بعد میں سہروردی کو ہٹا کر محمد علی کو چیف منسٹر بنایا گیا اور ان کی حکومت نے مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا۔ بنگال آسمبلی کے دو سیکشنوں کا 20/ جون کو اجلاس ہوا جس میں غیر مسلم سیکشن نے بنگال کی تقسیم کی حمایت میں ریزولوشن پاس کیا۔

صوبہ پنجاب، جسے مسلم لیگ پاکستان کی بنیاد سمجھتی تھی، میں صورتحال حد درجہ خطرناک تھی۔ 20/فروری 1947ء کے بعد مسلم لیگیوں کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں اور فرقہ وارانہ کشیدگی زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ 5/ مارچ 1947ء کو گورنر پنجاب نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ 93 کے تحت پنجاب کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس پر مسلم لیگ بہت زیادہ ناراض ہوئی اور اسے بہت زیادہ مایوسی ہوئی۔ دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں میں مسلمانوں کی طرف سے جدوجہد کا زبردست خدشہ پیدا ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں کو گورنر، جنھوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، کی غیر جانبداری پر مطلق اعتماد نہ تھا۔

ان تمام باتوں کا مل جل کر یہ اثر ہوا کہ تشدد کی آگ نے خطرناک طور سے لاہور، امرتسر، ملتان، راولپنڈی اور دوسری جگہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ روم جل رہا ہو تھا اور نیرو ونگ رلیاں منا رہا تھا۔ یعنی ایون جنکنس اپنے اعصاب بالکل کھو بیٹھے تھے اور انھوں نے جان بوجھ کر فرقہ پرست دشمنوں کو لڑنے کا پورا پورا موقعہ دے دیا تھا۔

14 ر جون کو نہرو نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں تقریر کی اور کہا کہ جہاں جہاں کانگریس وزارتیں تھیں وہاں ہنگاموں اور فساد پر قابو پالیا گیا لیکن جہاں برطانوی افسروں نے اختیار استعمال کئے وہاں بدامنی مستقل ہی رہی۔ وہ پنجاب اور بنگال اور دوسری جگہوں کے فسادات سے حد درجہ خوف زدہ، حیران، پریشان اور عاجز تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اکادکا واقعات نہ تھے بلکہ یہ سازش کا نتیجہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب میں سو فیصدی برطانوی راج تھا، پھر بھی افسروں کی کوششوں کے باوجود قتل و غارت گری اور لوٹ مار بدستور جاری رہی۔ یہ ہنگامے اور فساد وہیں زیادہ ہوئے جہاں برطانوی افسر ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ جو علاقے ہندو یا مسلمان افسروں کے چارج میں تھے وہاں نسبتاً ہنگامے اور فسادات کم ہوئے۔

23 ر جون 1947ء کو پنجاب مجلس قانون ساز کا اجلاس ہوا۔ مشرقی پنجاب سیکشن نے فیصلہ پنجاب کی تقسیم کے حق میں دیا جبکہ برعکس اس کے مغربی پنجاب کا فیصلہ پنجاب تقسیم کے خلاف ہوا۔ پہلے نے موجودہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شریک ہوکر کا فیصلہ کیا جبکہ دوسرے نے نئی اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ بنگال اور پنجاب اسمبلیوں کے فیصلوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے اس طویل تنازعے کو ختم کر دیا اور ان صوبوں کے مستقبل کے بارے میں تعطل کیا۔ اس سے قتل عام کے واقعات یا لوٹ مار اور دوسرے جرائم میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مشرق سے مغرب اور

مغرب سے مشرق کو بھاگنے والے خوفزدہ پناہ گزینوں کی داستانیں ہندوستان کی آزادی کے آغاز پر شرمناک داغ تھیں۔شمالی مغربی سرحدی صوبے میں پنجاب کے واقعات کا زبردست ردعمل ہوا۔ مارچ کے مہینے میں بدامنی اور فساد پھوٹ پڑے۔

مسلم لیگ نے کانگریس کے خلاف زبردست مظاہرے کیے ۔بگڑی ہوئی صورتحال کی وجہ سے بے چینی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی ۔20 رفروری 1947ء کے اعلان ۔نے جذبات کواور زیادہ برانگیختہ کر دیا۔مسلم لیگ سول نافرمانی کی تحریک چلا رہی تھی جو نام کے لیے بھی سول نہ تھی۔

وائسرائے کے پرسنل اسٹاف کے چیف اسمے کے نزدیک سرحدی صوبہ بہت بڑی مسلم اکثریت والا صوبہ تھا جس میں کانگریس کی حکومت تھی اور یہ صوبہ زیادہ خطرناک حالت پیش کررہا تھا۔صورتحال گورنراوران کے افسروں کے دوغلے پن کی وجہ سے بڑی عجیب وغریب تھی ۔ایک طرف تو وہ دستور کی رو سے وزیر کی ماتحتی میں تھے اور دوسری طرف وہ قبائل سے تعلقات رکھتے تھے اور وزیروں سے آزاد رہ کر اور پولیٹکل ایجنٹ کی ماتحتی میں رہ کر اپنے اختیارات استعمال کرتے تھے۔

گورنراور وزراء کے درمیان تعلقات خوشگوار نہ تھے اور اس کا امن عامہ پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔گورنراولف کیرو مسلم لیگ کی موافقت میں تھے۔خاں عبدالغفار خاں کے قول کے مطابق وہ وزیروں کو کانگریس چھوڑنے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے کی ترغیب دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ان کی آخری دھمکی یہ تھی یا تو صوبے میں مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ وزارت میں رہو یا پھر الیکشن ہوگا۔ یہ بڑا ہی انوکھا مطالبہ تھا اس لیے کہ ایک سال پہلے پاکستان کے مطالبے پر الیکشن ہو چکا تھا اور وزارت نے اسمبلی کا اعتماد نہیں کھویا تھا لیکن اس کے باوجود کیرو اور ماؤنٹ بیٹن نئے الیکشن کرانے پر زور دیتے رہے مگر عمل کی نوبت نہ آئی ۔ایجی ٹیشن کرنے والوں نے متشددانہ کارروائی

شروع کردی۔ بازاروں میں آگ لگانا اور انھیں لوٹنا شروع کر دیا۔ بہت سے پولیس افسروں نے دیدہ دانستہ چشم پوشی کی اور فوج نے مداخلت نہیں کی۔ گورنر نے مسلم لیگ کے لیڈروں سے ہمدردی ظاہر کی۔

کانگریس ہائی کمانڈ نے اب اس معاملے میں مداخلت کی اور یہ نوٹس دیا کہ اگر شمالی مغربی سرحدی صوبے کی وزارت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کی گئی تو کانگریس مئی پلان کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دے گی۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگ کو اپنے فیصلہ سے مطلع کیا کہ وہ نہ تو وزارت کو برخاست کریں گے اور نہ تازہ الیکشن کرائیں گے۔

اعلان کے مطابق رائے طلبی ہوئی لیکن اس کے ہونے سے پہلے کیرو کو ہٹا دیا گیا اور برطانوی فوجی افسروں پر مشتمل ایک کمیٹی رائے طلبی کے لیے مقرر کی گئی۔ خان عبدالغفار خاں چاہتے تھے کہ آزاد پختونستان پر ووٹنگ ہو مگر نادانی سے رائے طلبی کرانے کے فیصلہ کو بائی کاٹ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ پختونستان کے بارے میں ان کی تجویز منظور نہیں کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں 49 فیصدی کے مقابلے میں 50 فیصدی سے پاکستان کے موافقت میں فیصلہ کیا گیا۔ سندھ اور بلوچستان کی صورتحال بالکل صاف تھی۔ ان دونوں صوبوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ آسام نے پاکستانی بنگال میں شامل ہونے سے انکار کر دیا لیکن سلہٹ نے رائے طلبی کے ذریعہ پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جن صوبوں کے بارے میں مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ مسلم لیگ کا جزو ہیں ان کا رخ آخر تک پاکستان کے حق میں مبہم تھا۔ ہڈسن لکھتے ہیں کہ ''اس میں شبہ ہے کہ مسٹر جناح کے اس پاکستان کی بنیاد اس پنجاب پر ہو جس میں مسلمانوں کی ہندوؤں اور سکھوں سے سخت تصادم اور رسہ کشی ہو یا جس کی پشت پر سرحدی صوبہ ہو جو کانگریس کا حامی ہو یا جس کے سرحد پار ابن الوقت اور ناقابل اعتماد قبائل ہوں۔''

اس صورتحال کی سب سے معقول وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک بیرونی طاقت مسلمانوں کو بڑی استقامت سے اس منزل کی طرف ڈھکیل رہی تھی۔ بلا شبہ وہ یہی فرقہ وارانہ علیحدگی کی پالیسی تھی جو دراصل شہنشاہیت کو برقرار رکھنے اور مضبوط کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

1942ء سے حکومت نے مسلمانوں میں پاکستان کے تصور کو واضح کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد کابینہ مشن نے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں تین گروہ تجویز کر کے اس کو تقویت دی اور اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو اقتدار کی منتقلی کو مثبت شرط قرار دیا۔

برطانوی حکمراں مسلمانوں سے زیادہ پاکستان نواز تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مسٹر جناح کی گود میں ڈال دیا۔ ان کے اندیشوں اور خدشوں کو استعمال کر کے کانگریس کو پاکستان کے مطالبہ کو منظور کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تباہ کن اور متاثر کرنے والی ڈپلومیسی سے کانگریس کو اس کی ترغیب دلائی کہ وہ مسلم لیگ کی آزاد اور با اختیار مملکت کے مطالبہ کو تسلیم کرے اور اس کے بدلے میں نو آبادیاتی طرز کی فوری خود اختیاری حاصل کر لے اور اپنے اصل مطالبے یعنی مکمل آزادی سے دست بردار ہو۔ اس کے ساتھ انھوں نے مسلم لیگ کو کٹے پھٹے پاکستان کو قبول کرنے پر آمادہ کیا لیکن اس کے ساتھ کہ وہ پورے طور سے آزاد اور پورے طور سے با اختیار پاکستان تھا۔ انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کو اس پر بھی آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی حکومتوں کو دولت مشترکہ کے حلقے میں رکھیں۔ ہر معاملے میں یہ حکومتیں پورے طور سے آزاد ہوں گی لیکن وہ تسلیم کر لیں کہ سیاسی نظام کا سربراہ انگلستان رہے۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن پلان یکطرفہ معاملہ نہ تھا۔ اگر ایک طرف اس سے فائدے پہونچے تو دوسری طرف اس کی وجہ سے نقصانات بھی ہوئے۔ اس نے ایک طرف ہندوستان

کو آزادی دی تو دوسری طرف سیاسی اعتبار سے متحد اور معاشی اعتبار سے بہت زیادہ قدرتی ذرائع رکھنے والی قوم کو دو مخالف مملکتوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کو ہمیشہ نیچا دکھلاتی اور کمزور کرتی رہیں اور ان کی باہمی مخالفتیں انھیں اس پر مجبور کر دیں کہ وہ بیرونی ملکوں کی اعانت کی طلب گار ہوں۔ طاقتور ملکوں پر بھروسہ کریں خاص طور سے برطانیہ پر جس سے ان کے بہت پرانے رابطے قائم تھے۔ مسلمان چونکہ خاص طور سے برطانیہ کے منظور نظر تھے اور مستقلاً برطانیہ سے تعاون کرتے رہے اس لیے کہ انھیں اس کی پوری توقع تھی کہ برطانوی حکومت کی طرف سے مراعات برابر ملتی رہیں گی۔ ان کے تعلقات کا ہندوستان کی پالیسی پر اثر پڑنا لازمی اور قدرتی تھا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا، برطانیہ کے اس ملک سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ برطانیہ کا سرمایہ بہت بڑی مقدار میں بڑے پیانے پر ہندوستانی صنعتوں میں، پلانٹوں میں، کانوں میں اور وسائل نقل وحمل میں لگا ہوا تھا۔ جہاز رانی، کافی، ربر اور جوٹ پر برطانوی فرموں اور کمپنیوں کی اجارہ داری تھی۔ اس طرح اس کا نصف سے زیادہ سرمایہ روئی اور ملوں کی صنعتوں میں لگا ہوا تھا۔ لگے ہوئے سرمایہ کی میزان 1700 ملین ڈالر کی خطیر رقم تھی۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے ہندوستان کے ذمہ زبردست واجب الادا قرض تھا اور یہ برطانوی تیارشدہ مصنوعات کے لیے بڑی وسعت پذیر مارکیٹ فراہم کرتا تھا۔

ہندوستان سے برطانیہ نے بڑے ہی ٹھوس فائدے جن میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کی خوشدلی اور خیر سگالی شامل تھی حاصل کیے۔ برطانیہ، ماؤنٹ بیٹن جو ہندوستان میں اس کے آخری پروکونسل (Pro-Council) تھے، کی خدمات کے لیے ہمیشہ احسان مند رہے گا۔

7-3/جون کے اعلان کے بعد ہنگامے

ماؤنٹ بیٹن اقتدار کے منتقلی کے خاص مقصد سے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ 23/مارچ اور 3/جون کے مختصر وقفے کے درمیان ہندوستان کے دستور کے بنیادی اصول اور اقتدار کی منتقلی کے طریقہ کار مرتب کئے جا چکے تھے۔

متعلقہ اہم پارٹیوں نے اصولوں اور طریقہ کار دونوں کو منظور کرلیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن خود اس پلان کو لے کر لندن گئے اور روزیر اعظم اور کابینہ نے منٹوں میں اس سے اتفاق ظاہر کیا۔ وائسرائے نے اسے پارٹی لیڈروں کے سامنے بھی پیش کیا اور انھوں نے 2/جون کی آدھی رات سے پہلے اپنی منظوری سے انھیں مطلع کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے 9/جون کو جناح کو اختیار دیا کہ اس کے بارے میں پارٹی کی طرف سے فیصلہ کریں اور اس سے وائسرائے کو مطلع کریں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 15/جون کو اس پلان کی منظوری دے دی۔

ان رکاوٹوں پر جو پچھلی متعدد کوششوں میں بظاہر دور ہوتی معلوم نہیں ہوتی تھیں بالآخر قابو پالیا گیا۔ برطانوی حکومت دو شرطوں کے بغیر اقتدار دینے پر رضامند نہ ہوئی۔ پہلی شرط یہ تھی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی رضامندی حاصل ہو اور دوسری شرط یہ کی دونوں درجہ نو آبادیاتی نظام کو منظور کرلیں۔ 3/جون کو جس پلان کا اعلان کیا گیا اس نے یہ دونوں شرطیں پوری کردیں اور اس نے برطانوی اعتراضات کو دور کردیا۔

کانگریس نے بعض مخصوص علاقوں کے لوگوں کے لیے خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کرلیا تھا۔ عارضی حکومت میں اس کے ممبروں کا تجربہ اتنا زیادہ جھنجھلاہٹ پیدا کرنے والا تھا کہ انھیں اتنی زیادہ مایوسی اور تلخی محسوس ہوئی کہ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ ملک کا نظم ونسق چلانے کے واسطے ان کے لیے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا ناممکن تھا۔

ہوم منسٹر پٹیل علیحدگی کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے فوری ہٹ جانے کا مطالبہ کیا اور وہ اس کے لیے تیار ہو گئے کہ مکمل آزادی اور ہندوستان کے اتحاد کا مطالبہ مسترد کر دیں اور درجہ نوآبادیات کے قیام کا خیر مقدم کریں۔ نہرو بھی اتنے ہی ناراض تھے اور وہ بھی مسلم لیگ کے وزیروں کی چالوں سے عاجز آ چکے تھے اور وہ اس ناقابل برداشت الجھن کے خاتمے کے زبردست خواہاں تھے۔ لیگ کی مزاحمت سے چھٹکارا پانے، اس مخالفت کے ختم ہو جانے کے امید اور ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام کی توقع نے مکمل آزادی کے اس پر جوش، غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں وکالت کرنے والے اور درجہ نوآبادیات کے سب سے بڑے مخالف پٹیل کو اس درجہ کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔

دوسری طرف مسٹر جناح نے جن کے مطالبے رعایت کی منظوری کے بعد بڑھتے جا رہے تھے، بڑے محتاط طریقے سے ان نئی تجویزوں کو منظور کر لیا مگر مکمل صوبوں کا مطالبہ دوہراتے رہے۔ ایک حیرت اور اچمبھے میں ڈالنے والا مطالبہ یہ کیا کہ پنجاب کو بنگال سے ملانے والا ایک ہزار میل والا راستہ دیا جائے۔ یہ دونوں مطالبے نامنظور کر دیے گئے۔ لیکن بالآخر انھوں نے پاکستان حاصل کر لیا گو یہ پاکستان کٹا پھٹا اور کرم خوردہ تھا۔ انھیں اس پر بڑی ہی خوشی ہوئی کہ کانگریس کو اپنے دونوں تصورات یعنی آزادی اور اتحاد کے بارے میں ذلت اٹھانی پڑی۔ پلان کے بنیادی اصولوں پر سب پارٹیوں کے اتفاق نے اس کو بروئے کار لانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے اقدامات کے لیے راستے کو صاف کر دیا۔ مختلف وجہوں کی بناء پر جو عام بھی تھیں اور پرائیویٹ بھی، ماؤنٹ بیٹن اس کے لیے بیقرار تھے کہ اس کام کو وہ جلد سے جلد پورا کر دیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے موجودہ عہدے اور ان کی دیرینہ خواہش کی کہ وہ برطانوی بحریہ کے ایڈمرل ہو جائیں میں بڑا المبار رخنہ ہو۔ انھوں نے کھلے طور سے

ہندوستان کی فرقہ وارانہ صورتحال کا بڑا ہی خطرناک اندازہ کیا۔ انھیں یقین نہ تھا کہ انگلستان میں حالات کیا صورت اختیار کریں گے۔ اس لئے انھوں نے اس کا فیصلہ کیا کہ اقتدار کی منتقلی کی تاریخ جون 48ء سے پہلے کردی جائے یعنی 15 / اگست 1947ء کو۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کے بہت سے حصوں میں صورتحال بہت زیادہ خطرناک تھی۔ کلکتہ کے قتل عام کے بعد سے ملک کے متعدد حصوں میں فسادات اور گڑ بڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ بلاشبہ پنجاب اور بنگال اس طوفان کے سب سے بڑے مرکز تھے۔ ان دونوں صوبوں کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے تصور کے مطابق پاکستان کے وفادار یا طرفدار ہوں گے۔ اس غیر یقینی صورتحال نے مسلم لیگ کی بے صبری اور برداشت نہ کرنے کے جذبات کو بڑھادیا اور اس کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ڈاریکٹ ایکشن شروع کردے خواہ مسٹر جناح جو گاندھی جی کی طرح عدم تشدد کے پجاری نہ تھے، کے ارادے کچھ اور ہوں۔ اس ایکشن کی وجہ سے بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری اور لوٹ مار کے واقعات ہوئے۔ مغربی اور مشرقی منطقوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے لیکن ان کو بجھایا نہیں گیا۔ اس لیے جب 3 جون کو ملک کی تقسیم کا اعلان کیا گیا تو باوجود اس کے کہ پٹیل جنھیں ہندوؤں کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا اور بلدیو سنگھ جو سکھوں کے نمائندے تھے، نے اس سمجھوتے پر دستخط کردئے۔ پنجاب اور بنگال کے ہندو اور پنجاب کے سکھ انتہائی غیر مطمئن تھے۔

پنجاب میں سکھوں نے مطالبہ کیا کہ دریائے چناب پاکستان اور ہندوستان کی سرحد ہو تاکہ سکھوں کی بڑی تعداد ایک جگہ رہے۔

بنگال میں ڈاکٹر شیاما مکر جی کی قیادت میں ہندو مہاسبھا نے متحدہ بنگال کی مخالفت کی اور صوبائی کی تقسیم کا فیصلہ مجلس قانون کے غیر مسلم حصہ سے حاصل کرلیا۔ ان فیصلوں نے مسلمانوں کی جنھوں نے پاکستان کے لیے غیر منقسم پنجاب اور بنگال کا مطالبہ کیا

تھا کی ناراضگی کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔

اوائل 1946ء میں خضر حیات خاں کی وزارت کے قیام کے بعد پنجاب میں ناراضگی کے عام مظاہرے شروع ہو گئے۔ اس کے بعد مارچ 1947ء میں شدید ہنگامے ہوئے۔ مسلم لیگ کے ڈرائریکٹ ایکشن کی وجہ سے صوبے میں زبردست تباہی و بربادی ہوئی۔ عام طور سے ہندو اور خاص طور سے سکھ لاہور، امرتسر، ملتان اور راولپنڈی میں وحشیانہ اور متشددانہ حملوں کا نشانہ بنے۔ یہ تشدد دیہاتوں میں بھی پھیل گیا اور متعدد اضلاع کے قصبوں اور چھوٹے شہروں میں بھی فساد پھوٹ پڑے۔ پڑوس کے شمالی مغربی سرحدی صوبے میں مسلم گروہوں نے قتل کیے اور لوٹ مار کی۔ سکھوں کی داڑھیوں کو جلایا گیا اور مسلم پولیس خاموش دیکھتی رہی۔ یہ ذرا بھی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ اس طرح سے ذلیل ہو کر اور مظالم کا نشانہ بن کر اگر سکھوں میں انتقام لینے کا زبردست ردعمل ہوا۔

3/جون کے اعلان کے بعد مسلم لیگ نے یہ کوشش شروع کی کہ سکھوں میں اعتماد بحال کیا جائے اور انھیں پاکستان میں ٹھہرنے کی ترغیب دی جائے اور پنجاب کی تقسیم کو روکا جائے۔ بعض سکھ لیڈر اس کے لیے تیار تھے کہ سکھ پاکستان میں شامل ہو جائیں بشرطیکہ مشرقی پنجاب کے چار ہندو اکثریتی اضلاع چھوڑ کر باقی مشرقی پنجاب کو سکھوں کا وطن قرار دیا جائے اور اسے بعض تحفظات کے ساتھ خود مختار ریاست کا درجہ دیدیا جائے۔ اس کے ساتھ اس کو پاکستان سے علیحدہ ہونے کا حق دیا جائے اور مرکزی حکومت کے اختیارات محدود ہوں۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ سکھوں میں اس کے لیے کوئی جذبہ یا جوش وخروش نہ تھا اور مسلمانوں کا اس بارے میں سرد مہری کا رویہ رہا۔

ان حالات میں تباہی اور بربادی ناگزیر تھی۔ دہلی کے سپریٹنڈنٹ آف پولیس

نے یہ پیشین گوئی کی کہ اگر ایک دفعہ پنجاب میں تقسیم کی لائن کھینچ دی گئی تو مغربی پنجاب کے سارے سکھ اور مشرقی پنجاب کے سارے مسلمان ختم کردیے جائیں گے۔

جب مولانا آزاد نے ماؤنٹ بیٹن کی توجہ اس طرف دلائی کہ اگر اس طرح اور ان حالات میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو ملک کے مختلف صوبوں میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی اور برطانوی حکمران اس ساری تباہی اور بربادی کے ذمہ دار ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بڑی خوداعتمادی سے جواب دیا کہ ''کم سے کم اس کے بارے میں اس کی پوری یقین دہانی کراتا ہوں اور اطمینان دلاتا ہوں اور اس کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ کسی قسم کا کشت وخون اور فساد نہ ہوگا۔ میں ایک سپاہی ہوں، ایک سویلین نہیں ہوں۔ تقسیم کا اصول اگر تسلیم کرلیا گیا تو میں حکم دوں گا کہ ملک میں کہیں بھی فرقہ وارانہ فساد نہ ہوں۔ اور اگر کہیں ذرا بھی ایجی ٹیشن ہوا تو میں اس کو ختم کرنے کے لیے سخت ترین اقدامات کروں گا اور انھیں شروع ہونے سے پہلے ختم کردوں گا۔ میں اس کے لیے مسلح پولیس ہی کو استعمال نہیں کروں گا بلکہ جو بھی بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں ان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ٹینک اور ہوائی جہاز استعمال کروں گا۔''

یہ الفاظ بڑے جرأت مندانہ تھے لیکن یہ تھے محض الفاظ جوان کی شیخی تھی جس کے وہ عادی تھے اور جس کا حقیقت سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ جب عملی آزمائش کا موقعہ آیا تو ماؤنٹ بیٹن کی یہ شیخی دھری کی دھری رہ گئی اور وہ وحشیانہ اور سفاکانہ واقعات کو روکنے میں قطعاً ناکام ثابت ہوئے۔ انھیں اس کا مطلق اندازہ نہ تھا کہ امن اور قانون نافذ کرنے والی قوتیں بھی فرقہ پرستی سے پوری طرح متاثر تھیں۔ پنجاب پولیس میں مسلمان 75 فیصدی کے تناسب میں تھے۔ ان سے اس کی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے کسی زیادتی کو روکنے میں کامیاب ہوں گے۔ افسر بھی تعصب سے پاک اور مبرانہ تھے۔ مسلم

افسر مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور غیر مسلم افسران ہندو اور سکھ سیاسی لیڈروں کے زیر اثر تھے۔

6- حکومت کی عدم تیاری

فوج کے حالات غیر معمولی تھے اور اس وجہ سے اس کی افادیت بہت کم ہوگئی تھی ۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سطحوں پر وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ موسلے کا کہنا ہے کہ جب تقسیم کا فیصلہ ہوا اس وقت آچنلیک اور ماؤنٹ بیٹن دوست نہ تھے اس لیے ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے تھے۔ آچنلیک (Auchinleek) دو معاملوں میں وہموں کا شکار تھے۔ پہلا وہم تو یہ کہ تقسیم کے خلاف انھوں نے زبردست ردعمل کا اظہار کیا اس لیے کہ ان کے خیال میں اس سے ہندوستانی فوج کی وہ صلاحیت تباہ ہوجائے گی جو اس نے پچھلے سو سالوں میں حاصل کی تھی اور دوسرے اس وجہ سے کہ انھیں ہندوستانی افسروں پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ وہ جنرل آرتھر اسمتھ کے اس خیال سے جو انھوں نے درگا داس کے سامنے پیش کیا تھا، متفق تھے۔ کہ میں آپ کی ہندوستانی فوج کو چھ مہینے بھی نہیں دیتا، وہ اس سے پہلے ہی ریزہ ریزہ ہوجائے گی ، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جوان اینٹیں ہیں اور ان کو جوڑتے ہیں۔ افسر، ان کی وجہ سے ہی وہ متحد رہتے ہیں۔ ہندوستانی افسر گارا فراہم نہیں کرسکتے اس لیے جوانوں کو جوڑ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ عام جوانوں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت نہیں ہے ۔ ان کا دوسرا وہم یہ کہ برطانوی فوجوں کا کام ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا تھا اور ان کے خیال میں اس عبوری دور میں ان کی جان و مال کو زیادہ خطرہ تھا، وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ اب امن وامان

قائم رکھنے کی ان پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان کے ان وہموں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ممکن ہے آچنلیک کی سربراہی میں وہ ہندوستان کے دفاع کے لیے ایک بالکل غیر جانب دار فوج ہو۔ ان کے ذہن میں ہندوستان کی نام نہاد آزادی کا یہ تصور تھا کہ وہ برطانوی فوج کی حفاظت میں قائم کی جائے۔

آچنلیک کے پس وپیش اور ماؤنٹ بیٹن اور جنکنس کی آئندہ ہونے والی تباہی اور بربادی کا صحیح اندازہ کرنے والی ناکامی کی وجہ سے صورتحال سے نمٹنے کے لیے کسی قسم کا بھی کوئی منصوبہ تیار نہ کیا جاسکا تھا۔ یہ بڑے ہی حیرت کی بات ہے کہ ایسٹرن کمانڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل فرانسس ٹیوکر کے انتباہ پر جنرل آچنلیک نے کوئی توجہ نہ کی۔ انھوں نے موسلے کو بتایا کہ انھوں نے 1945ء میں اس کا اندازہ کرلیا تھا ہندوستان تقسیم ہوکر رہے گا اس لیے ہندوستانی فوج پوری بدلی جائے اور ایک غیر جانب دار فوج رکھی جائے تاکہ ملک کی تقسیم کے وقت دونوں ملکوں کی سرحدوں پر کسی قسم کی متشددانہ سرگرمیاں اور قتل عام نہ ہو سکے۔ پھر 1946ء میں جنرل آرمی ہیڈکوارٹر نے ٹیوکر کو ہدایت کی کہ ہندوستان کے تقسیم ہونے کی صورت میں کس قسم کی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ اس کے بارے میں انھوں نے ایک تحریری رپورٹ بھیجی لیکن اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ ٹیوکر اس بارے میں بڑے پچھتاوے کے ساتھ کہتے ہیں:

''فرض کیجئے اگر اس وقت انھوں نے کچھ کیا ہوتا۔ حکومت اور آرمی ہیڈکوارٹر کے پاس 18 مہینے کی مدت تھی جس میں وہ ہر چیز کا پورا انتظام کر سکتے تھے۔ فوج کی نئی تنظیم کی جاسکتی تھی۔ ایک غیر جانب دار سول سروس سرحدی علاقوں میں متعین کی جاسکتی تھی۔ اس کی کاغذی تیاریاں کی جاسکتی تھیں۔ یہ تو محض ایک رومال کے گر جانے پر یہ تیاریاں کی جاسکتی تھیں۔ جب تقسیم کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ لیکن انھوں نے میری رپورٹ

کو بالکل الگ رکھ دیا۔ انھیں مہلک نتیجوں کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔“

مئی 1947ء کے آخر تک کسی قسم کی کوئی بھی انتظام نہیں کیا گیا اور جب 2/ جون کو ٹیوکر نے اسمے کے ساتھ ایک ایسی فوج جو امن و امان قائم رکھنے کے لیے غیر جانب دار برٹش اور گور رکھا بٹالینوں پر مشتمل ہو، کی تشکیل کی تجویز پیش کی تو اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ سیاسی لیڈروں اور آرمی کے خدشات بد قسمتی سے بالکل صحیح ثابت ہوئے۔

پنجاب کو ایک بڑی خطرناک ٹریجڈی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں تاریخ کی عدیم المثال سفاکی اور بربریت کے بڑے اندوہناک واقعات پیش آئے۔ بڑے وسیع پیمانے پر آتش زنی اور بڑی بے دردی سے لوٹ مار ہوئی۔ مردوں عورتوں اور بچوں کو بڑے بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ زنا بالجبر کے لاتعداد واقعات ہوئے اور بڑے ہی سفاکانہ عزم کے ساتھ یہ کوشش کی گئی کہ دوسرے فرقہ کے لوگوں کو ہلاک کر دیا جائے انہیں جلاوطن کرنے یا کلیتہً ختم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ مغربی منطقے میں گاؤں، شہر اور قصبے ہندوؤں اور سکھوں سے اور مشرقی منطقے میں مسلمانوں سے پورے گاؤں، شہر اور قصبے جبراً خالی کرالئے گئے۔

اپنی جان بچانے کے لیے حد درجہ خائف اور دہشت زدہ لوگ سڑکوں پر، ریل پر یا جو سواری بھی مل سکے اس پر سوار ہو کر بھاگے لیکن سڑکیں، ٹرینیں اور اسٹیشن قتل کرنے والے فسادیوں کے گروہوں سے بھرے ہوئے تھے اور انھوں نے لوگوں کو قتل کیا اور لوٹا۔ بھاگنے والے لوگوں کی حالت قابل رحم تھی جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

نئی قائم شدہ دونوں مملکتوں کے لیے پناہ گزینوں کا مسئلہ بڑا ہی سخت اور نہ حل ہونے والا مسئلہ تھا۔ یہ اخلاق اور وسائل کی بڑی ہی کڑی آزمائش کا باعث ہوا۔

یہ صورتحال ختم کی جا سکتی تھی ایسے ہی جیسا کہ اس کے برعکس مشرقی منطقے میں ہوا جہاں پر فوج نے بڑی مستعدی سے بلووں کو سختی سے فرو کر دیا۔ ٹیوکر نے ہنگامی

صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے خود انتظام کیے۔ گاندھی جی کی سرگرمیوں نے اس سلسلے میں بیش بہا مدد کی۔

اگر یہ منطقہ پنجاب جیسے ہولناک واقعات سے بچا تو یہ صرف فوج اور یا گاندھی جی کی وجہ سے۔ ہر شخص کے خیال میں کلکتہ بارود کا ڈھیر تھا جس میں ہر قسم کا آتش گیر مادہ ابل رہا تھا۔ 1946ء میں اس نے عدیم النظیر بربریت کے منظر دیکھے تھے لیکن اس کے بعد سے یہ بالکل خاموش رہا۔ لیکن وہ کسی وقت بھی بھڑک سکتا تھا۔ ٹیوکر جو اس علاقے کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے اور امن وامان قائم کرنے کی ذمہ داری ان پر تھی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت تھے کہ انھیں غیر معمولی ایک نفری سرحدی فوج سے امن وامان قایم رکھنے میں بڑی مدد ملی جو اہلیت، کارگذاری اور مستعدی میں پنجاب کے پچاس ہزار سپاہیوں جو مسلح گاڑیوں میں مشین گنوں سے لیس امن قائم رکھنے اور قتل غارت گری روکنے میں ناکام رہے، سے بہتر تھی۔

گاندھی جی جو ایک نفری فوج کا مجسمہ تھے۔ نواکھالی جا رہے تھے جب کلکتہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان سے کلکتہ میں ٹھہرنے کی درخواست کی۔ سہروردی بھی استدعا کرنے والوں میں شامل تھے۔ گاندھی جی سہروردی کی اس دعوت پر کہ وہ ان کے ساتھ کام کریں گے کلکتہ میں ٹھہر گئے۔ سہروردی نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ بیلی گھاٹ گئے جو ایک مسلم ضلع تھا اور ہندو غریبوں کی بستی سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں گندگی اور غلاظت بھرپور مختلف قسم کے جرائم کی جگہ تھی۔ دونوں وہ ٹھہرے۔

سردار پٹیل نے گاندھی جی کو 12 راگست کو لکھا کیا آپ نے اپنے کو کلکتہ میں نظر بند کرلیا ہے اور ایسے علاقے میں ہیں جو اسم بامسمےٰ بوچڑ خانہ ہے۔ جرائم پیشہ افراد اور ہنگامہ آرائی کرنے والوں کا مسکن اور مرکز ہے۔ وہاں آپ کس شخص کے ساتھ ہیں۔

گاندھی جی اور سہروردی دونوں نے مل کر موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور ہر ہجوم اور جلسوں کو مخاطب کیا اور پرارتھنا سبھائیں کیں۔ ان سب کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز گاندھی جی کی شخصیت کا جادو تھا۔ اس کے ساتھ ان کی زیرکی نے بڑا کام کیا۔ ان کے آنے کے 24 گھنٹے کے اندر بیلی گھاٹ کے 5 ہزار ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترک جلوس نکالا اور ایسے نعرے لگائے جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ '' ہندو مسلم ایک ہیں، ہندو مسلم بھائی بھائی۔'' قتل وغارت اور مارکاٹ کی فضا ختم ہوگئی اور امن کا ماحول رفتہ رفتہ قائم ہونے لگا۔ لیفٹیننٹ جنرل ٹیوکر برٹش اور گورکھا فوج کی مدد دینے کے لیے بالکل تیار کھڑے تھے مگر اس کی مطلق ضرورت نہ پڑی۔ امن کا جادو ہر طرف پھیل رہا تھا۔ نواکھالی میں بربریت کے واقعات ختم ہو رہے تھے۔

برطانوی عہد کے آخری زمانے کا یہ بڑا ہی المناک واقعہ ہے کہ برٹش وائسرائے فوجوں کے سپریم کمانڈر تھے۔ صوبوں میں برٹش گورنر تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت اپنے اختیارات کا پورے طور پر استعمال کررہے تھے۔ پنجاب بھی مطلق العنان گورنر کی سربراہی میں تھا اور جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ایکٹ کے تحت پورے اختیارات کا حامل تھا اور صوبے کا نظم ونسق بغیر کسی مداخلت کے چلا رہا تھا۔ فوج کی تقسیم نہیں ہوئی تھی اور وہ پورے طور سے برطانوی کمانڈر انچیف کے کنٹرول میں تھی اعلیٰ۔ عہدوں پر سارے افسر برٹش تھے لیکن ارباب اختیار اتنے زیادہ بدحواس ہوگئے تھے کہ انھوں نے غیر مسلح اور کسی قسم کا ڈسپلن نہ رکھنے والے فسادیوں کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ پورے طور سے امن وامان کو درہم برہم کریں اور قانون کی خلاف ورزی کریں اور اپنے ناپاک منصوبوں اور عزائم کو عملی جامع پہنائیں۔ اس کوتاہی کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی تسلی بخش تشریح نہیں پیش کی جاسکتی۔ حتیٰ کہ پنڈرل مون کی تشریح

بھی غیر تسلی بخش ثابت ہوئی۔ اس صورتحال کے دو نفسیاتی عوامل (Factors) تھے۔ برطانوی اقتدار کے ختم ہونے کے قرب نے افسروں کے فیصلے کرنے کی قوت کو بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ انگریزوں کی یہ برہمی تھی کہ ملک معظم کی حکومت نے شہنشاہیت کو ختم کر دیا جس کی تاریخ ان کے پرکھوں (Generations) کے شاندار کارناموں سے بھرپور تھی۔

7- پلان کو بروئے کار لانے کے اقدامات

ان حد درجہ سنگین حالات میں 3/جون کی تجویز پر سمجھوتے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو قسم کے اقدامات کرنے ضروری تھے۔ پہلی ضروری بات یہ تھی کہ دستور کو پارلیمنٹ کے ذریعے قانونی بنیاد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ تقسیم کے انتظامی نتیجوں کا سامنا کرنا تھا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق تھا ہندوستان کی آزادی کا بل بڑی عجلت سے 12 دن کی مختصر مدت یعنی 4/جولائی سے 16/جولائی کے درمیان پاس کیا گیا اور 18/جولائی کو اسے شاہی منظوری حاصل ہوئی۔

اس ایکٹ (Act) نے 15 اگست 1947ء دونوں آبادیوں کی قیام کی تاریخ مقرر کی تھی۔ اس نے ہندوستان کی علاقائی تقسیم کو ہندوستان اور پاکستان کی صورت میں ظاہر کیا اور ہر ڈومینن (Dominion) یا نوآبادیات کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل مقرر کرنے کی دفعہ رکھی اور برٹش پارلیمنٹ سے ملک معظم کی ہندوستانی حکومت کی ذمہ داری ختم کر دی گئی اور 15/اگست 1947ء کو ہندوستانی ریاستوں کی بالادستی کو بھی ختم کر دیا گیا۔

اس ایکٹ نے دو ڈومینن کی عارضی تجویزیں رکھیں اور دونوں کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلیوں کو پارلیمنٹ کا درجہ دیا اور مجلس قانون ساز کے پورے پورے اختیارات عطا

کئے اوران کے گورنر جنرلوں کواس کا پورااختیار دیا کہ وہ عارضی احکام کے ذریعہ جو وہ ضروری سمجھیں اس آئین کو نافذ کریں۔

آخر میں اس نے وزیر ہند کی خدمات کی درجہ بندی کی اور ہندوستانی وزیروں کے تعلق سے شرطیں مقرر کیں اور برطانوی بری، بحری اور فضائی فوج کے بارے میں ملک معظم کی حکومت کے دائرہ اختیار کو بیان کیا۔

قبل اس سے کہ یہ قانون پارلیمنٹ سے پاس کیا جاتا، ضروری تھا کہ دونوں نوآبادیات کے لیے ایک یا دو گورنر جنرل ہوں۔ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ وہ دونوں نوآبادیوں کے پہلے گورنر جنرل ہوں۔ جب نہرو نے انھیں ہندوستان کے گورنر جنرل کی پیش کش کی تو خیال کیا جاتا تھا کہ مسٹر جناح اس تحریک کی تائید کریں گےلیکن حسب معمول جناح نے کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے انھیں ترغیب دی کہ یہ پاکستان کے بہترین مفاد میں ہوگا کہ وہ اس تجویز کو منظور کرلیں کہ وہ (ماؤنٹ بیٹن) دونوں ڈومینن کے مشترک سربراہ (گورنر جنرل) ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا جھگڑوں کے لیے جو دونوں میں ہوں گے، مشترک گورنر جنرل کے لیے ایسا حل پیش کرنا ممکن ہوگا جو دونوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ لیکن جناح اس دلیل سے متاثر نہ ہوئے۔ ماؤنٹ بیٹن کی آخری دلیل یہ تھی کہ ایک جمہوری ڈھانچہ میں وزیراعظم اختیارات کا مالک ہوتا ہے جب کہ گورنر جنرل کی حیثیت محض دستوری سربراہ کی ہوتی ہے اور اس کے کوئی اختیارات نہیں ہوتے۔ وہ اس کا پابند ہوتا ہے کہ وزیراعظم کے مشوروں پر کاربند ہو۔ جناح کا جواب بہت زیادہ قابل غور ہے: ''میری پوزیشن یہ ہے کہ میں مشورہ دوں گا اور دوسرے اس مشوروں پر کاربند ہوں گے۔'' ان لفظوں میں مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن کی دلی خواہش کو ٹھکرادیا اور اس طرح جناح نے اپنے غرور اور خود پسندی کی ایک اور مثال

پیش کی۔ ان کے اس مختصر بیان کا سب سے برا پہلو یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان کے حالات کے لئے جمہوری طریقوں کی مذمت کی تھی جبکہ ان کا یہ قدم پاکستان کی سیاست کی طرف تھا۔ پاکستان بنانے والے نے مسلم مملکت کی پیدائش کے وقت ہی اس کی جمہوریت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا جب انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا کہ وہ صرف ہندوستان کے گورنر جنرل بننے پر اکتفا کریں۔

تقسیم نے ایڈمنسٹریشن میں بہت سے مسئلے پیدا کر دیئے جن کے بارے میں دونوں نوآبادیوں کو بات چیت کر کے فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے لیے ایک تقسیم کمیٹی جو بعد میں تقسیم کونسل کے نام سے موسوم ہوئی مقرر کی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن اس کونسل کے چیئرمین تھے۔ اور اس میں ہر ڈومینین (Dominion) یا نوآبادی کے دو دو ممبر شامل تھے۔ اس کے کاموں میں آسانی پیدا کرنے کے لیے دو دو ممبروں پر مشتمل ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مقرر کی گئی جو مخصوص مسئلوں کے بارے میں تھی اور ایڈمنسٹریشن کے سارے شعبوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ثالثی کونسل بھی مقرر کی گئی جو ان مسئلوں کا فیصلہ کرتی جن پر کونسل میں غور وخوض ہونے کے بعد اتفاق نہیں ہوتا تھا۔

مشنری کو مقرر کرنے کے بعد ہر مسئلہ کو حل کر لیا گیا۔ سب سے اہم یہ مسئلہ تھا کہ دونوں نوآبادیوں کی سرحدوں کا تعین کیا جائے۔ دونوں فریقوں نے اس پر اتفاق کیا۔ ایک مشترکہ چیرمین سائرل اڈیکس کی سربراہی میں مغربی اور مشرقی دونوں منطقوں کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے دو کمیٹیاں مقرر کی گئیں اور ان کمیٹیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ 15 راگست سے پہلے اپنی رپورٹ پیش کریں۔ یہ رپورٹیں متعینہ تاریخ سے پہلے تیار تھیں لیکن انھیں چند روز کے بعد شائع کیا گیا تا کہ حکومتوں کو پریشانی سے بچایا جائے، اس لیے کہ دونوں کمیٹیوں کی سفارشوں نے دونوں فریقوں کے دعووں کو منظور نہیں کیا تھا۔ اڈیکس کے فیصلے نے مغربی بنگال کو بنگال کے علاقے کا 34 فی صدی

اور آبادی کا 35 فیصدی اور مشرقی پنجاب کو پنجاب کا 38 فیصدی علاقہ اور آبادی کا 42 فیصدی دیا تھا۔

دوسرا اہم مسئلہ حقوق، واجبات اور ملکیت کے بارے میں تھا۔ قومی قرضے میں ساجھے داری اور اثاثوی بچت کی دونوں ڈومینیوں میں تقسیم بڑے ہی پیچیدہ مسئلے تھے اور دونوں فریقوں کے خیالات بالکل مخالف تھے۔ ان مسئلوں کو وزیر ہند کے حوالے کیا گیا جن کے فیصلوں نے حالات کو بگڑنے سے بچایا۔

فوج کی نئی تنظیم دونوں مملکتوں کے ضرورتوں کے مطابق ہو، بڑا ہی مشکل مسئلہ تھا۔ ہندوستانی فوج کی تنظیم اور تشکیل ایک وحدت کی بنا پر ہوئی تھی اور اس کے فرائض اور اغراض بہت صاف اور متعین تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے حالات، ہندوستانی بحریہ اور فضائیہ میں اسٹرائک اور جنگ کے بعد کی تلخیوں نے فوج کے ڈسپلن کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ برما اور شمالی مشرقی سرحد پر فوج کے کارناموں اور ان کے افسروں کے خلاف مقدموں نے ان کے حق میں بڑی غیرتمندی اور پرجوش ہم دردی پیدا کردی اور حالات کو اور زیادہ بگاڑ دیا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اور ہونے والی تقسیم کے مسئلوں نے مشکلات میں اور اضافہ کردیا۔ لیکن فوج کے اعلیٰ افسروں کا رویہ ایسا تھا جن سے ان مسئلوں کا آسانی سے حل نکل آتا۔ فوج کی ازسرنو تنظیم کے بارے میں مختلف رائیں تھیں۔ کچھ کے خیال میں پورے ہندوستان کے لیے ایک ہی فوج رہے بعض اس کی حمایت میں تھے کہ تین فوجیں رہیں۔ دونوں Dominions کی ایک ایک فوج ہو جو متعلقہ نوآبادی کے علاقوں میں رہنے والے سپاہیوں پر مشتمل ہو اور تیسری فوج برٹش فوجیوں اور گورکھا بٹالینوں پر مشتمل ہو۔ دونوں مملکتوں کی حکومتوں نے ان تجویزوں کو مسترد کردیا اور مطالبہ کیا کہ فوجیں ان ملکوں کے مکمل کنٹرول میں رہیں۔

کمانڈر رنچیف آچنلیک، جن کا خاص کام یہ آپریشن تھا، کو اس بارے میں بڑا اپس

وپیش تھا۔ اس لیے کہ انھیں اس پر بہت زیادہ افسوس تھا کہ وہ اس تنظیم کے ٹکڑے ٹکڑے کریں جس کو انھوں نے پروان چڑھایا تھا اور اس کی خبر گیری رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا تھا۔ یہ کام بہت زیادہ پیچیدہ اور مشکل تھا۔ باوجود اس کے کہ جنگ کے دوران ہندوستانی افسروں کی تقرری اور ترقی ہوئی لیکن فوجی افسروں کی اکثریت خاص طور سے جنرل اسٹاف میں برطانوی افسروں کی ہی تھی۔ تاہم آچنلیک اس مسئلے سے بے خبر تھے جو کابینہ مشن نے جو مارچ 46ء میں ہندوستان آیا تھا نے اٹھایا تھا جب ٹیوکر نے ایک رپورٹ اسے دی تھی جس میں انھوں نے یہ بتایا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے معنی یہ ہونگے کہ فوج کو فرقہ وارانہ لائنوں پر تقسیم کیا جائے لیکن آچنلیک نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اسمے نے ان سے ایک منصوبہ تیار کرنے کو کہا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہندوستانی فوج ایسے حربہ کو تسلیم جو اسے تباہ کرنے کے مترادف ہو۔ اس کے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔

بالآخر کلاڈ آچنلیک کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کی وجہ سے وہ بہت ناراض ہوئے۔ انھوں نے تلخی اور نکتہ چینی کے بعد احکام جاری کیے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بخوبی محسوس کیا کہ فوج کی تقسیم میں کسی قسم کی دلچسپی نہ لینے سے بڑے سخت قسم کے سنگین نتیجے ہوں گے اور اس قسم کی کوئی تجویز کہ برطانوی فوج کو طویل مدت تک ہندوستان میں رہنے دیا جائے، ہندوستان کو قابل قبول نہ ہوگی۔ ان کا اصرار آچنلیک کے پس وپیش پر غالب آیا اور آچنلیک کو 15/ اگست سے سپریم کمانڈر کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ انھوں نے مشترکہ ڈیفنس کونسل کی ہدایتوں کے مطابق کام کیا اور فوج کو دوبارہ کلاسوں میں تقسیم کیا اور دونوں نوآبادیوں کے لیے فوجوں کی از سر نو تشکیل کی۔ برطانوی فوجوں نے ہندوستان سے 15/ اگست 1947ء سے واپس جانا شروع کردیا جو 25/ فروری 1948ء تک مکمل ہوگیا۔ اسی اثناء میں 20/ نومبر 47ء کو آچنلیک ریٹائر ہوگئے اور

مشترکہ ڈیفنس کونسل 31 ر دسمبر 47ء کو ختم کر دی گئی۔

جہاں تک سول سروسز کا تعلق تھا ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ وزیر ہند کی سروسز کے ممبر نئی حکومتوں اور صوبوں کی حکومتوں کی ملازمت میں رہیں گے۔ ان کی تنخواہوں کی موجودہ شرح، رخصت اور پینشن کے حقوق قائم رہیں گے لیکن اس باب میں یوروپین اور ہندوستانی ممبروں میں امتیاز برتا گیا۔ اول الذکر اپنے ملک کی پارلیمنٹ کی ماتحتی میں نہ رہیں گے اور ان کا تعلق نئی صورتحال کے پیش نظر ہوگا اور ان کو معاوضہ ملنے کا حق بھی حاصل ہوگا۔ لیکن آخر الذکر اپنے ملک کی ملازمت میں رہیں گے اس لیے انھیں کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ یہی اصول ڈیفنس سروسز اور انڈین میڈیکل سروسز کے یوروپین افسروں کے ساتھ برتا گیا اور ان ضابطوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سول سروسز کے یوروپین ممبروں نے معاوضہ لے لیا اور ریٹائر ہو گئے لیکن ڈیفنس سروسز کی بڑی تعداد نے ہندوستان میں رہنا منظور کیا۔

8- بالادستی کا مسئلہ

پہلی بار گول میز کانفرنس میں اس مسئلے پر کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں ریاستوں کا کیا رول رہے گا سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا۔ اس بحث مباحثے سے ایک ایسے ذاتی دستور کا تصور سامنے آیا جس میں برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستیں دونوں شامل ہوں۔ لیکن متعدد اسباب کی بنا پر دستور کے وفاقی حصہ پر عمل درآمد نہ ہوسکا اور وہ التوا میں پڑا لیکن فیڈریشن کا تصور برقرار رہا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جنگی کابینہ نے ہندوستانی دستور میں اصلاحات کرنا چاہیں اور اپنے ڈرافٹ کی تجویز پر مارچ 42ء میں کرپس کو ہندوستان بات کرنے کے لیے بھیجا اس میں وفاقی حکومت میں جس میں ہندوستانی ریاستیں شامل ہوں، کا تصور پیش کیا گیا۔

16 ر مئی 1946ء کو کابینی مشن نے وعدہ کیا کہ ہندوستان میں حکومت خود

اختیاری برطانوی نوآبادیوں کے طریقے پر قائم کی جائے گی اور ہندوستانی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ خود کانسٹی ٹیوشن مرتب کریں گے۔اس نے اسمبلی قائم کرنے کا طریقہ تجویز کیا۔ ان کے ممبروں کی تعداد مقرر کی اور انھیں صوبوں اور ریاستوں میں تقسیم کیا۔لیکن اعلان میں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ دستور ساز اسمبلی میں ریاستوں کا کیا حصہ رہے گا۔

کابینی مشن نے ہندوستان کو مکمل طور سے اقتدار کی منتقلی کی پیش کش کی اور ہندوستان کو آزادی کے دروازے تک لے آئی اور اس کی وجہ سے ریاستوں میں زبردست انقلاب آیا۔ ہندوستان میں 562 ریاستیں تھیں اور وہ ہندوستان کے 2/8 رقبے پر مشتمل تھیں اور ہندوستان کی آبادی کا 25 فیصدی حصہ ان میں رہتا تھا۔بعض ریاستوں کے علاقے برطانوی ہندوستان سے ملے ہوئے تھے۔ریاستوں کے لوگ ان کے پڑوس میں رہنے والے لوگ تھے جو نسلی ، مذہبی، تمدنی اور لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی حد بالکل مختلف تھی۔ سیاسی نظاموں میں تقسیم محض اتفاق تھا اور برطانیہ کے ہندوستان فتح کر لینے کا نتیجہ تھا۔ان میں بعض ریاستیں پرانی تھیں مثلاً راجپوتانہ کی ریاستیں اور ہندوستان بھر میں پھیلی دوسری متعدد ریاستیں جو اٹھارہویں صدی کی مغلیہ سلطنت کی کمزوری اور زوال کی وجہ سے وجود میں آئی تھیں مثلاً حیدرآباد۔مرہٹہ ریاستوں وغیرہ کا وجود برطانوی حکومت کی وجہ سے ہوا۔

آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے یہ ریاستیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔مثلاً کشمیر کا رقبہ 82 ہزار مربع میل ہے اور اس لحاظ سے یہ انگلستان کے مساوی تھی۔ آبادی کے لحاظ سے حیدرآباد کی ریاست سب سے بڑی تھی۔اس کی آبادی 16 ملین تھی۔اس کے بعد میسور کی ریاست تھی جس کی آبادی 7 ملین تھی۔اس کے بعد ٹراونکور کی ریاست تھی جس کی آبادی 6 ملین تھی۔ کشمیر اور گوالیار میں سے ہر ایک کی

آبادی 4 ملین تھی اور بہت سی ریاستیں آبادی کے لحاظ سے چھوٹی تھیں اور ان میں کسی کسی کی آبادی تو ایک لاکھ سے بھی کم تھی۔ ریاستوں کی مجموعی آبادی کا رقبہ 20427 ہزار مربع میل تھا اور ان کی آبادی تقریباً 93 ملین تھی۔

آبادی کے لحاظ سے یہ ریاستیں بہت زیادہ غیر مساوی تھیں۔ ان کی دو تہائی آبادی یعنی 62 ملین 20 (بیس) ریاستوں میں رہتی تھی۔ بقیہ ایک تہائی 31 ملین 545 ریاستوں میں۔ پوزیشن اور اعزاز کے لحاظ سے ریاستوں میں زبردست اختلاف پایا جاتا تھا۔ نظام حیدرآباد کو برطانوی حکومت کا حلیف ہونے کا دعویٰ تھا۔ لیکن تاج برطانیہ سے ان کے تعلقات کی وضاحت بالا دستی کی اصطلاح سے کی جاتی تھی جس کا مطلب دونوں یعنی تاج برطانیہ اور ریاستوں کے حقوق اور فرائض میں حکمرانوں اور ان کے خاندانوں کی، شورشوں، جھگڑوں اور بیرونی حملوں سے حفاظت کرنا اور ہر ریاست کے خارجہ تعلقات کو چلانا اور ان کا دفاع کرنا تھا۔ ان کے وراثت کے جھگڑوں کو طے کرنا اور حکمراں کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا انتظام چلانا اور شدید بدانتظامی کی صورت میں مداخلت کرنا تھا۔ تعلقات یا تو دستور اور رواج کی وجہ سے تھے یا کچھ دوسری بنیادوں پر قائم تھے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی کی وجہ سے ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات برطانوی ہندوستان سے بڑھے۔ کسٹم، اکسائز، بینک یا کرنسی، ریلوے، ڈاک اور تار کے معاملوں میں مشترک اغراض بڑھے اور ان کی وجہ سے دونوں منطقوں کے لوگوں میں رابطے اور بڑھے۔ ریاستوں کے رہنے والے برطانوی ہندوستانی خیالات اور واقعات سے متاثر ہونے لگے۔

بالادستی کے فرائض تاج برطانیہ کی طرف سے وائسرائے ذاتی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ پچھلے سو سالوں سے یعنی 1857ء کی ہندوستانی بغاوت کے بعد

سے ریاستیں برطانوی حکومت کے لاڈلے اور چہیتے بچے سمجھی جاتی تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے 1858ء کے اعلان میں ان کے متعلق عہد کیا کہ برطانوی حکمراں دیسی ریاستوں کے حقوق، عزت اور احترام کا اپنے حقوق اور عزت کی طرح احترام کریں گے۔ جب کانگریس کی سربراہی میں تحریکیں شروع ہوئیں تو برطانوی حکمرانوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی کئی متبادل قوتوں کی تلاش شروع کی۔ مسلمانوں اور والیان ریاست نے بڑی خوشی سے اس بارے میں اپنی خدمات حکومت کو پیش کیں اور جیسے جیسے آزادی کی جدوجہد تیز ہوتی گئی حکومت کی نظر میں ریاستوں کی اہمیت بڑھنے لگی۔

ہندوستان کے حکمرانوں نے جو ایک وقت میں ریاستوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھے، اپنی پالیسی بدلی اور زور دیا کہ ریاستیں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔

1921ء میں برطانوی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے والیان ریاست کی مشترک پالیسیوں پر غور وخوض کرنے کے لیے ایک انجمن چیمبر آف پرنسز قائم کی گئی۔ اگرچہ یہ امید کی جاتی تھی کہ اگر سب نہیں تو بہت سی ریاستیں اس انجمن میں شامل ہو جائیں گی۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی بعض بڑی ریاتیں مثلاً حیدرآباد نے اس میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔ بہت سی چھوٹی ریاستوں کی گروپ بندی کی گئی اور ان گروپوں کو چیمبر میں نمائندگی دی گئی عملاً یہ تنظیم متوسط سائز کی ریاستوں کی رائے کا اظہار کرتی تھی۔

زیادہ تر ریاستوں میں مطلق العنان حکومت تھی اور والئی ریاست سارے اختیارات کا اصل منبع ہوتا تھا۔ لیکن بعض حکمراں خاصے ترقی پسند تھے۔ وہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ اپنے رعایا کی سماجی اور معاشی حالات کو بہتر بنائیں۔ ٹراونکور

میں خواندگی کی شرح بڑھ کر 40 فیصدی ہوگئی تھی اور کوچین میں یہ شرح 35.4 فیصدی تھی ۔ یہ شرحیں برطانوی ہندوستان کے کسی بھی صوبے سے بڑھ کر تھیں۔ بعض ریاستوں میں عوامی ادارے قائم کردئے گئے تا کہ رعایا کی مدد کی جاسکے۔

ریاستوں کے لوگ برطانوی ہندوستان کی ذمہ دار حکومت سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے مرکزی جمہوری اداروں کے قیام کے لیے رفتہ رفتہ پرجا منڈل قائم کیئے۔

1919ء سے ان کی تحریک تیزی سے بڑھنے لگی۔ 1937ء سے صوبہ جاتی خود مختاری کے قیام سے ہندوستانی ریاستوں کے لوگوں کے احساسات کو اور تقویت پہونچی اور ان کے لیڈر انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت اور اعانت کے طالب ہوگئے۔ ابتدائی دور میں کانگریس گاندھی جی کی اس پالیسی پر گامزن ہوئی کہ والیان ریاست اور ان کی رعایا کے مابین جدوجہد میں کسی قسم کی مدافعت نہ کی جائے۔ فروری 1938ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنی پالیسی کو اس طرح آگے بڑھایا کہ اگرچہ کانگریس اس قسم کی تحریکوں میں خود بہ حیثیت جماعت سرگرم حصہ لینے سے احتراز کرے گی لیکن برطانوی ہندوستان کے کانگریسی کارکن اس میں انفرادی حیثیت سے حصہ لینے کے لیے آزاد تھے۔ اسی طرح نہرو نے ہندوستان میں فریدکوٹ کے ریاست کے والی کے جلسوں پر پابندی کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ پھر انھوں نے کشمیر میں کشمیری حکومت کے اس حکم کی کہ شیخ عبداللہ اپنے خلاف بغاوت کے مقدمے کی سماعت کے لیے کشمیر میں داخل نہ ہوں، کی خلاورزی کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کے ساتھ کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

حکمرانوں کی اپنے رعایا کے خلاف زبردست مخالفت کی وجہ سے کانگریس کو جواہرلال نہرو کی متحرک لیڈرشپ میں اپنی یہ پالیسی ترک کردینی پڑی۔ انھوں نے

والیان ریاست کے نظام کو قرون وسطیٰ کا نظام کہا اور اس کی دوٹوک مذمت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک فرسودہ نظام ہے جس کی موجودہ سوسائٹی میں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے حکمرانوں کو سب سے زیادہ خوفزدہ کردیا، اس لیے ان کے نمائندوں نے جنھوں نے بڑے پرجوش انداز سے گول میز کانفرنس میں ہندستان کی فیڈرل یونین کا خیر مقدم کیا تھا اپنے ان اقدامات کو واپس لے لیا اور حکومت کے مذبذب رویّہ سے کانگریس کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس وجہ سے انھوں نے اور رکاوٹ ڈالنے والی کارروائیاں کیں جن کا ایک مقصد یہ تھا کہ فیڈریشن کا قیام ہی قوت بن جائے۔

چڑھاؤ برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ حکومت ہند کا نیند میں ڈوبا محکمہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ بھی بیدار ہوا۔ اس محکمے کے افسر بھی اس نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جو ان کے سفلی جذبات کو پورا کرنے کے لیے مدد کرتا تھا اور ان کے لیے عیش وآرام وشان وشوکت کے لیے موقع فراہم کرتا تھا۔ اس محکمہ میں ان کے اختیارات زیادہ تھے اور محنت کم کرنی پڑتی تھی۔ وہ بھی بدلتے وقت کا نوٹس لینے پر مجبور ہوئے۔

1937ء سے حکومت نے والیان ریاست کو اپنے محکوموں کے لیے ان کے فرائض کے بارے میں مشورے دینا شروع کیے کہ وہ اپنے نظم ونسق کو اور بہتر بنائیں اور عوامی مطالبوں کو منظور کریں لیکن اس مشورہ پر والیان ریاست نے کان نہ دھرا کیونکہ انھیں حکومت کے سنجیدہ ہونے کے بارے میں شک تھا۔

اگست 1940ء کے اعلان نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔ اس دوہرایا گیا تھا کہ ریاستوں سے معاہدے تاج برطانیہ کی مخصوص ذمہ داری تھی جنھیں وہ پورے طور سے نبھا رہا تھا۔

1942ء میں کرپس نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ نئے دستور کے بعد والیان

ریاست کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ معاہدوں پر نظر ثانی کے لیے گفت وشنید کریں۔ لیکن وزیر ہند ایمرے نے کہا کہ یہ معاہدے پورے طور سے درست اور صحیح نہیں ہیں۔

ریاستوں نے انڈین فیڈریشن کے متبادل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا کہ ساری ریاستوں کے لیے ایک علیحدہ با اختیار اور آزاد مملکت ہو۔ اس کا امکان کرپس مشن کی پیشکش میں تھا۔ چونکہ اس بارے میں والیان ریاست میں اختلاف تھا اس لیے ہندوستانی ریاستوں کی علیحدہ یونین کا موقعہ ختم ہو گیا۔

اگر چہ رجواڑوں کی چیمبر آف پرنسز نے اس بارے میں کرپس سے یقین دہانی چاہی اور دوسرا متبادل پیش کیا تا کہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کی منتقلی کے بعد بالادستی قائم رہے لیکن اس کو مسترد کر دیا گیا اس لیے کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کے بعد بالادستی کے اختیارات کو دستور کے لحاظ سے استعمال کرنا برطانیہ کے لیے ناممکن تھا۔

کرپس کی روانگی کے بعد کانگریس اور والیان ریاست کو بالکل ہی مخالف اور متضاد نظریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک کا مطالبہ یہ تھا کہ ساری ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کیا جائے اور دستور مرتب کرنے والی جماعت میں ان کی نمائندگی ریاستی لوگوں کے نمائندوں کے ذریعہ ہو۔ اس کے برعکس والیان ریاست یہ چاہتے تھے کہ یونین اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں انھیں آزادی ہو اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ریاستوں کی نمائندگی بذریعہ نامزدگی سے ہو۔

حکومت نے دونوں کو مطمئن کرنا چاہا۔ کانگریس کو اس طرح سے کہ اس نے والیان ریاست پر زور دیا کہ وہ اپنے ایڈمنسٹریشن کو زیادہ جدید بنائیں اور عوامی حکومت قائم کریں۔ دوسری طرف اس نے والیان ریاست کو یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ اس کے اختیارات جانشینی حکومت ہند کو منتقل نہیں کیے جائیں گے۔

1945ء میں بعض ریاستوں نے اس قسم کے اقدامات اٹھائے کہ لوگوں کو حکومت میں شامل کریں۔ مارچ 1946ء میں برطانوی کابینہ مشن ہندوستان آیا اور 12رمئی کو اس نے چیمبر آف پرنسز کو معاہدوں اور بالادستی کے بارے میں میمورنڈم پیش کیا۔اس میں ریاستوں کے بارے میں برطانوی حکومت کی پوزیشن کو بیان کیا کہ عبوری دور میں یعنی اس وقت تک کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان کی مملکتوں کا قیام عمل میں نہیں آتا ان کی بالادستی قائم رہے گی اور یہ ریاستیں نئی حکومتوں کو منتقل نہیں کی جائیں گی۔ برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے بارے میں یہ امید ظاہر کی گئی کہ ریاستیں دستور مرتب کرنے میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی سے تعاون کریں گی اور حکومت میں جگہ پائیں گی۔

کابینی مشن نے والیان ریاست کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے ایڈمنسٹریشن کو بہتر بنائیں اور چھوٹی ریاستیں اپنے گروپ بنائیں اور مشترک انتظامی آرگن قائم کریں اور اپنی حکومت میں عوامی عناصر کو جگہ دیں اور مشترک اغراض ومقاصد کے لیے برطانوی ہند کے ساتھ انتظامات کریں۔اس نے ریاستوں کو مشورہ دیا کہ بالادستی کے خاتمے کے بعد وہ اس خلا کو کہ وہ چاہیں تو ہندوستانی فیڈریشن میں شامل نہ ہوں مگر مخصوص سیاسی معاہدے کرکے پورا کریں۔

مشن کے 16رمئی کے اعلان میں بالادستی کے خاتمے کا ذکر کیا گیا کہ گفت وشنید کے ذریعے ریاستیں تعاون کریں اور تجویز کیا کہ فیڈریشن صرف امور: دفاع (ڈیفنس) امور خارجہ اور یہ کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں ریاستوں کی نمائندگی جو دس لاکھ لوگوں پر ایک ممبر کے حساب سے ہو، کے لیے ہوگی۔ اس طرح سے اسمبلی میں ممبروں کی تعداد 93 ہوگی۔ جہاں تک ممبروں کی تعداد کا تعلق تھا اسے والیان ریاست کی خواہشات پر چھوڑ دیا گیا۔

چیمبر آف پرنسز نے 10 رجون 1946ء کو جواب دیا اور حکومت سے دستوری اور دوسرے امور کے بارے میں گفت وشنید کے لیے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مقرر کی۔ دشواری یہ تھی کہ والیان ریاست اختیارات اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی پوزیشن اور وراثت کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔

برعکس اس کے کانگریس، فیڈرل یونین کے باہر ریاستوں کی آزادی کے دعوؤں کی مخالف تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ والیان ریاست کی مطلق العنان حکومت کی جگہ ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔ کانگریس کو مسلم لیگ کے بارے میں بڑا خدشہ تھا۔ اس لیے پاکستان کے حدود میں بھی چند ریاستیں تھیں۔ لیگ ان ریاستوں کو کانگریس کیخلاف صف آرا کرنا چاہتی تھی اور اس بارے میں ان کو ہر قسم کی ترغیب دلا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے بعض ریاستوں نے مسٹر جناح سے گفت وشنید کی لیکن آخر میں سوائے تین کے باقی نے ترغیبات کو نامنظور کر دیا اور وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ ہندوستان میں شامل ہوں۔

20 رجنوری 1947ء کو والیان ریاست کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ان شرطوں پر غور کیا گیا جن کی بنیاد پر اس اعلان کو منظور کیا جائے۔ یہ شرطیں حسب ذیل تھیں:

(1) یونین میں شامل ہونے کا آخری فیصلہ گفت وشنید کے ذریعہ ہوگا اور یونین کو مسلط نہیں کیا جائے گا۔

(2) یونین گورنمنٹ صرف انھیں اختیارات کا استعمال کرے گی جو ان ریاستوں نے دیے ہوں گے۔

(3) ہر ریاست کی پوزیشن ایک آزاد اور با اقتدار طاقت کی ہوگی اور وراثت کے حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی۔

(4) ریاستوں کو اندرونی خودمختاری حاصل رہے گی اور اختیارات کے استعمال کرنے میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی، نہ کسی قسم کی پابندی عائد کی جائے گی۔

کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی، جس کی نشستیں 9/دسمبر 1946ء سے شروع ہوئیں، کے لیے ضروری ہوا کہ ریاستوں سے گفت وشنید کرنے کے لیے ایک ریاستی کمیٹی مقرر کرے اور حکومت ہند کا پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ ختم کردیا جائے۔ نہرو کی صدارت میں اسٹیٹ کمیٹی نے چیمبر آف پرنسز کی گفت وشنید کرنے والی کمیٹی سے 8، 9 فروری کو بات چیت کی۔ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے دستوری مشیر بی۔ ایس۔ راؤ نے اسمبلی میں ریاستوں کے نمائندوں کے تقرر کے بارے میں ایک عارضی اسکیم تیار کی اور اس اسکیم کے تحت انھیں اے۔ بی اور سی سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا۔

سیکشن اے ان ریاستوں پر مشتمل تھا جو انفرادی طور سے اپنے نمائندوں کو مقرر کرتی تھیں۔ ان ریاستوں کی تعداد 20 تھی اور ان کی آبادی تقریباً 62 ملین تھی۔ ان کو 60 سیٹیں دی گئیں۔ سیکشن بی (B) سرحدی گروپ کی ریاستیں تھیں اور ان میں شمال مغرب اور شمال مشرق کی ریاستیں شامل تھیں۔ ان کی تعداد 14 تھی۔ ان کے چار (4) گروپ تھے۔ ان کی آبادی (3) ملین تھی۔ ان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے چار (4) سیٹیں دی گئیں۔ سیکشن سی (C) میں باقی ماندہ ریاستیں تھیں۔ ان کو 9 گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ انھیں 29 سیٹیں دی گئیں۔ اس طرح 93 سیٹوں کو 3 گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔

ان ممبروں کے تقرر کے بارے میں یہ سمجھوتہ کیا گیا کہ 50 فیصدی ممبروں کو والیان ریاست نامزد کریں گے اور باقی 50 فیصدی کو مختلف انتخابی حلقوں سے منتخب کیا جائے گا۔ اس عارضی فیصلے کی تصدیق اور توثیق اسٹیٹ کمیٹی اور چیمبر آف پرنسز کی گفت وشنید کرنے والی کمیٹی کے 2/مارچ کے جلسوں میں کی گئی۔ اس موقعہ پر

والیان کے اندرونی اختلاف نے ایک متعین اور واضح صورت اختیار کرلی۔ اس میں دو مختلف بلاک پیدا ہوگئے۔ ایک کی قیادت نواب بھوپال کررہے تھے اور دوسرے میں پٹیالہ، بڑودا اور بیکانیر شامل تھے۔ پہلے بلاک کی رائے تھی کہ ریاستوں کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں بالکل آخری مرحلے میں شریک ہونا چاہیے جب کہ یونین کے کانسٹی ٹیوشن پر غور وخوض ہورہا ہو۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ فیڈریشن میں شمولیت کے فیصلے کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کردینا چاہیے جب تک کی کوئی کانسٹی ٹیوشن پورے طور سے مرتب نہ ہوجائے۔

دوسرا بلاک اس پر زور دے رہا تھا کہ اسمبلی میں شروع کے ہی مرحلوں میں ان کی موجودگی ضروری ہے تاکہ ابتدائی بحث مباحثوں میں شرکت رہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہند یونین سے الگ نہ رہیں گے۔ اس روش کو اختیار کرنے والے سب سے پہلے والی ریاست مہاراجہ بڑودہ تھے۔ 28/ اپریل کو (8) آٹھ دوسرے والیان ریاست نے ان کی پیروی کی۔ جولائی میں مزید 37 والیان ریاست نے اسمبلی میں شرکت کی۔ ان میں زیادہ نمایاں میسور اور گوالیار کی ریاستیں تھیں۔ اس کے جواب میں ان کی مخالفت میں نواب بھوپال نے مدھیہ پردیش میں ایک آزاد مملکت قائم کرنی چاہی لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں ملی۔ جب 3/ جون کو وائسرائے نے ملک معظم کی حکومت کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ 15/ اگست کو اقتدار حوالے کردیا جائے گا تو کابینی مشن کے 16/ مئی کے اعلان کو دہرایا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ وہ ریاستوں کو دولت مشترکہ کا ممبر نہیں بنانا چاہتے۔

اس اعلان نے ریاستوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں جس کا مسئلہ ان کے سامنے اچانک آگیا تھا، سنجیدگی سے غور کریں۔ حیدرآباد نے ایک چھوٹی انجمن اتحاد المسلمین کے اثر میں آکر اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ ایک آزاد بادشاہی

قائم کرے گا۔ ٹراونکور نے سر سی پی راماسوامی کی سربراہی میں یہی لائن اختیار کی۔

بھوپال چیمبر آف پرنسز کی چانسلر شپ سے مستعفی ہو گیا اور انھوں نے مسٹر جناح سے اپنا رابطہ قائم کیا اور ایسے خواب دیکھنے شروع کیے جو پرفریب تھے۔ اس سے کانگریس کے لیڈروں اور وائسرائے کو گونا گوں تشویش ہوئی۔

ماؤنٹ بیٹن تو بھوپال کو ہندوستان میں اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا اور نواب بھوپال نے سمجھداری سے کام لیا اور ہند یونین میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس کا احساس کر کے بڑی خطرناک صورتحال پیدا ہوسکتی ہے ماؤنٹ بیٹن نے ایک سو اہم والیان ریاست کو ملاقات کے لیے مدعو کیا۔ انھوں نے ان کو ہندوستان کے بارے میں مشکلات سے آگاہ کیا جو ہندوستانی لیڈروں کو پیش آرہی تھیں۔ انھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ریاست اور ہندوستان کے مفادات کی وجہ سے تعاون کریں۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کرلیں۔ لیکن یہ فیصلہ صرف جغرافیائی نقطۂ نظر سے کرنا ہوگا نہ کی کسی اور جذبہ کے تحت۔ ان کی خودمختاری اور اقتدار کی انھوں نے گارنٹی لی۔ کانفرنس نے والیان ریاست اور ان کے وزیروں کی ایک وثیقہ شمولیت پر جس کا مسودہ وائسرائے نے تیار کیا تھا اور انتظامات جاریہ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ ان دستاویزوں پر دستخط کرنے سے پہلے بعض والیان ریاست نے غیر دانشمندانہ کوششیں کیں کہ وہ مسٹر جناح سے گفت وشنید کریں۔ ان کو امید تھی کہ وہ ان سے بہتر شرطیں اور مراعات حاصل کرلیں گے اور ہند یونین سے باہر رہیں گے۔ ان میں جودھپور تھا جس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ رن کچھ کا بندرگاہ ان کی ملکیت میں دے دیا جائے گا اور ایک ریلوے لائن کراچی سے جودھپور تک رہے گی۔ جیسلمیر کو بھی جودھپور نے اس منصوبے میں شامل ہونے کی

ترغیب دی۔ٹراونکور نے آزاد ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور راما سوامی نے مسٹر جناح سے خط وکتابت کی لیکن ان کی سازش ناکام ہوگئی۔ اندور اور دھولپور کے والیان ریاست نے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ان پر قابو پالیا۔

وہ ریاستیں جو 15 /اگست 1947ء تک خود ارادیت پر ہی قائم رہیں اور جنھوں نے ہندوستان میں شامل ہونے سے انکار کیا، وہ جوناگڑھ، کشمیر اور حیدر آباد تھیں لیکن ہندوستان سے ان کے تعلقات ضمنی تھے۔ آزادی کی جدوجہد کے حوالے سے ان کا تذکرہ اس تاریخ سے باہر ہے۔

9- تقسیم مکمل ہوگئی

جولائی 1947ء میں اقتدار چھوڑنے کے بارے میں ابتدائی کارروائی برطانوی پارلیمنٹ کے آزاد ہند کے قانون کے پاس ہونے سے پوری ہوگئی اور تقسیم کے بعد کے انتظامات بہت حد تک مکمل کر لئے گئے۔ ہندوستانی ریاستوں نے ہند یونین میں اپنی شمولیت کے بارے میں سوائے تین کے، وثیقہ شمولیت پر سب نے دستخط کر دئے۔ ہندوستانی کانسٹی ٹیوشن تیاری کے آخری مرحلوں میں تھا۔ جیسے جیسے آزادی کا دن قریب آتا گیا تینوں پارٹیاں اس اہم موقعے کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں۔ ان تینوں پارٹیوں میں مسلم لیگ سب سے زیادہ خوش تھی۔ اگرچہ اس کو سب ہندوؤں کو بطور یرغمال حاصل کرنے میں جیسا کہ اس کی خواہش تھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور اسے بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر راضی ہونا پڑا اور ان صوبوں کے ہندو اکثریتی ضلعوں پر اپنا دعویٰ ترک کرنا پڑا مگر اس کو اپنے بنیادی اور خاص مقصد یعنی آزاد اور بااقتدار پاکستان کو حاصل کرکے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ پاکستان حاصل ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کو دوہری خوشی اس وجہ سے تھی کہ اس نے اپنا مقصد کانگریس

کی شدید مخالفت اور برطانوی حکمرانوں کے بڑے پس وپیش کے بعد حاصل کیا تھا اور اس وجہ سے بھی کہ اس کی کامیابی آخر تک مشکوک رہی۔ کراچی پہونچنے پر جناح نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو بتایا کہ میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ یہ واقعہ ہوگا یعنی پاکستان بنے گا یا مجھے اپنی زندگی میں پاکستان کو دیکھنے کا موقعہ ملے گا۔ یہ کامیابی صرف ایک شخص محمد علی جناح کے ذہن اور استدلال سے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ انھوں نے 1937ء میں یہ تہیہ کرلیا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل اس میں ہے کہ مسلمان اپنے اکثریتی علاقے میں ہندوستان سے الگ ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی ہی قابلیت سے کارڈ کھیلے اور چالیں چلتے رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے ملنے والے فائدوں سے آگاہ کیا۔

انہوں نے ہمیشہ کانگریسی لیڈروں کو قیاس آرائیاں کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے انہیں ذلت کے ساتھ مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ان سے ملیں۔ انہوں نے کانگریسی لیڈروں سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بیرونی حکمرانوں سے کسی قسم کی معاملت کرنے سے بیزار تھے اور اپنے ہم وطنوں سے سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سمجھوتے کے لئے کانگریس کے سامنے ایسی شرطیں رکھیں جن کے منظور کرنے کا ان کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا اور ان کو نامنظور کرنے کا الزام کانگریس پر عائد کیا۔ انہوں نے اپنے خاص مطالبوں پر نہ تو کوئی سمجھوتہ کیا اور نہ اُنھیں ترک کیا۔ جب عارضی حکومت میں ویول نے مسلم لیگی لیڈروں کو کابینہ میں ٹھونسا تو مسٹر جناح نے پیچھے سے ڈوری ہلائی اور اس طرح سے کانگریس وزراء کو ہمیشہ ناراض کیا۔ بالآخر وہ (کانگریس) بہت زیادہ مایوس ہوگئے ہندوستان سے مسلم اکثریتی علاقوں کی علیحدگی کو منظور کرنے پر تیار ہوگئے تاکہ وہ لیگ کے آدمیوں سے نجات حاصل کرلیں۔ حکومت کے بارے میں ان کا رویہ ہمیشہ مبہم رہا۔ انھوں نے برطانیہ کی کا ؟ لیس دشمنی

کا بڑے شاطرانہ انداز سے استحصال کیا اور ساری دستوری ترقیوں اور انتظامی اصلاحات کو مسترد کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ انھوں نے برطانوی سیاست دانوں کے اس منصوبے کو کہ ہندو مسلم جذبات، احساسات، مذہب اور کلچر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں اتحاد یا اتفاق ہونا ناممکن تھا کو منظور کر کے انھیں خوش کر دیا۔ ان کا دو قومی نظریے پر غیر معمولی زور برطانوی حکمرانوں کے لیے بڑا ہی خوش کن تھا اس لیے کہ اس سے ان کی پوری تائید ہوتی تھی اور ان کی سماجی پالیسی کا جواز نکلتا تھا۔ جناح کو پوری طرح استعمال کرنے کے لئے انھوں نے ان کے تکبر، انانیت اور وقار کو بہت زیادہ بڑھایا اور ان کی کانگریس دشمنی کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے وہ جاہل مسلم عوام کے ہیرو بن گئے اور ان کے اسلام خطرے میں ہے کے نعروں کا زبردست خیر مقدم کرنے لگے۔ اس وجہ سے ان کی یہ شیخی بالکل جائز تھی کہ پاکستان انھیں کی وجہ سے وجود میں آیا۔

انھوں نے اپنا مقصد بغیر دوسرے مسلمان لیڈروں کے جوان کے نایب اور جی حضوری والے تھے اور مسلم اکثریتی صوبوں کے لیڈروں: شمالی مشرقی صوبے کے خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان (خان برادران)، پنجاب کے سکندر حیات خاں، خضر حیات خاں، بنگال کے فضل الحق اور سہروردی اور سندھ کے ناقابل اعتماد لیڈروں کی مخالفت کے باوجود حاصل کرلیا۔

ایک بہت ہی عجیب وغریب خود فراموشی کے عالم میں سکھوں کے ساتھ ہونے والے برے برتاؤ پر اچانک انھیں خیال آیا کہ اقلیتوں کو یقین دہانی اور تسکین کی ضرورت ہے۔ اس سے انہیں غیر معمولی صفائی کا موقعہ ملا جو ان جذبات کے برعکس تھا جن کا اظہار انھوں نے پچھلے دس برسوں میں کیا تھا۔ 11/اگست 1949ء کو انھوں نے پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کہا: ''نئی مملکت کے قیام نے

پاکستان کے شہریوں کو یہ موقعہ دیا کہ وہ ساری دنیا کو یہ دکھائیں کہ ایسی ایک قوم جو متعدد عناصر پر مشتمل ہوا امن اور اتحاد سے رہ سکتی ہے اور تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے بلاامتیاز مذہب وملت، ذات پات وغیرہ کے کام کرسکتی ہے ان کا مقصد تھا کہ امن اندرون ملک میں ہو اور باہر بھی۔ انھوں نے اقلیتوں کو یقین دلایا کہ ''جب تک وہ پاکستان کے وفادار شہریوں کی طرح حقوق وفرائض بجالاتے رہیں گے انھیں کسی قسم کا کوئی خوف وخدشہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارا کوئی دوسرا ارادہ یا خواہش بجز اس کے نہیں کہ ہم باعزت طریقے سے رہیں اور دوسروں کو بھی باعزت طریقے سے رہنے دیں۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مساوی حقوق کے بارے میں انھوں نے اعلان کیا کہ آپ دیکھیں گے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔ اس لیے کہ عقیدہ ہر فرد کا ذاتی فعل ہے اور وہ سیاسی لحاظ سے پاکستانی شہری ہوں گے۔

سندھ کے ایک مسلم لیڈر نے کہا کہ یہ تقریر تابانہ عالم کی تقریر ہے اور ان تمام بنیادی اصولوں، جن کی بنا پر مسٹر جناح نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی کے ترک کردینے کے مترادف ہے۔ دراصل ایسا نہ تھا کہ اس تقریر کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہ تھی۔ وہ اس تقریر کے ذریعہ اپنے سامعین کے سامنے شاہی انداز سے ہندو مملکت کی تباہی و بربادی کا ذکر کررہے تھے اور اس طرح سے وہ ہندوستان کی ممبر ریاستوں کے حکمرانوں یعنی بھوپال، حیدرآباد اور جوناگڑھ کو اس پر اکسا رہے تھے کہ وہ ہندوستان میں آزاد مملکتیں قائم کریں۔ اسی طرح سے وہ کشمیری حکمراں پر جس کی رعایا کی اکثریت مسلمان تھی یہ زور دے رہے تھے کہ وہ پاکستان میں شامل ہوجائیں ورنہ ان کی ریاست ضروری اختیارات سے محروم کردی جائے گی۔ انھوں نے جودھپور

اور جیسلمیر کے حکمرانوں سے متعدد دفعہ ملاقات کی تھی اور سازش کی تھی۔ انہوں نے ان دونوں حکمرانوں سے بڑے شاندار وعدے کئے تھے۔ دراصل ان کی خواہشوں کو پورا کرنے کی آڑ میں وہ انہیں ہندوستان سے دور کرنا چاہتے تھے۔

وہ کانگریس کے شدید ترین مخالف تھے۔ وہ ٹراونکور کے دیوان سی۔پی۔ راما سوامی کی پوری ہمت افزائی کر رہے تھے کہ وہ کانگریس کے کنٹرول کی مخالفت کریں۔ ان کے دوست اور مشیر نواب بھوپال، مہاراجہ اندور کو اس کی ترغیب دے رہے تھے کہ وہ وثیقہ شمولیت پر دستخط نہ کریں اور آزادی کا علم بلند کریں۔ مسٹر جناح جو فرقہ وارانہ اتحاد اور باعزت وجود کے زبردست وکیل تھے وہ ہر قسم کی امکانی کوشش کر رہے تھے کہ ہندو ہندوستان میں زبردست گڑبڑ اور تشدد پھیلے جس سے کانگریس کی شبیہہ مجروح ہو۔ وہ بھول گئے کہ وہ پاکستانی شہریوں کو ہندو مسلمان کے تصور سے اوپر اٹھا چکے ہیں تو ہند یونین میں رہنا فرقہ وارانہ کمزوری کیسے ہوسکتی ہے اور وہ اس ملک کے شہری کیوں نہیں ہوسکتے۔

جناح کے ایڈریس کے موقعے پر پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی دوہرے فرائض انجام دے رہی تھی یعنی پاکستان کے دستور کو تیار کرنا اور دوسری طرف عارضی طور سے پاکستان کی مرکزی مجلس قانون ساز کی حیثیت سے ان اختیارات کا استعمال جو 1935ء کے ایکٹ دفعہ 47 کی رو سے گورنروں کو حاصل تھے۔ گورنروں کو نہ صرف وزیروں کو چننے (Selection) اور مقرر کرنے کا حق حاصل تھا بلکہ وہ اپنے عہدے پر اس وقت تک رہ سکتے تھے جب تک کہ گورنر چاہیں۔ گورنران میں محکمے اور قلمدان تقسیم کرتے تھے اور ان کے اختیار میں کوئی بھی ایسی دفعہ نہ تھی جس کی رو سے گورنر جنرل وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کرنے کا پابند ہو جبکہ گورنر کسی بھی وزارت کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے سکتا تھا، ہنگامی حالات کا اعلان کرسکتا تھا

اور کسی بھی صوبے اور اس کے کسی بھی علاقے کے لیے قانون بنا سکتا تھا۔ صوبوں کے بارے میں اور ان کی حکومتوں کے بارے میں، ان کے ایڈمنسٹریشن، گورنروں کے تقرر، وزیروں کی برخاستگی، قانون سازی اور اصلاحی معاملات میں گورنر جنرل کے اختیارات کی تشریح اچھی طرح نہیں کی گئی لیکن انھیں گورنر جنرل نے پوری طرح استعمال کیا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا۔

ان اختیارات کے استعمال کے ساتھ مسٹر جناح کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں صدر بھی منتخب کیا گیا۔ اگر چہ ہندوستان کی آزادی کے ایک نمبر سیکشن (الف) کے تحت صدر کے لیے ضروری تھا کہ اسمبلی کے پاس کیے ہوئے کسی بھی قانون پر شاہ انگلستان کی طرف سے منظوری دے۔ مسٹر جناح نے اس پر عمل نہیں کیا۔

ایسے حالات میں ان کے بڑے مخلص عقیدت مندوں نے 12 / اگست 1947ء کو کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی سے انھیں قائداعظم کا خطاب دلوایا۔ دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جمعہ 22 / اگست 47ء کو کراچی میں پاکستان کی ایک کالونی کی مسجد کے ممبر سے مسٹر جناح کا نام خطبے میں لیا گیا۔ اس کے جواز میں سندھ کے وزیر تعلیم نے بیان کیا کہ ''مسلمانوں میں اس کا رواج ہے کہ ملک میں خلیفہ یا بادشاہ کا نام جمعہ اور عید کی نمازوں کے موقعہ پر خطبے میں لیا جاتا ہے۔ چونکہ پاکستان ایک آزاد مسلم مملکت ہے اس لیے یہ بالکل درست ہے کہ اس ملک کے سربراہ کا نام سارے پاکستان میں خطبوں میں لیا جائے۔'' کمپل جانسن نے مسٹر جناح کی اس اعلیٰ پوزیشن کے بارے میں یہ کہا کہ جناح اس کی بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے کو دستوری گورنر کے روپ میں پوشیدہ رکھیں۔ گورنر جنرل قطعی لاعلم تھے۔ بلاشبہ وہ پاکستان کے شہنشاہ، کینٹ بری کے آرچ بشپ، اسمبلی کے اسپیکر ملک کے وزیر اعظم ہیں گویا سارے عہدے ایک زبردست لیڈر کی شخصیت میں مرکوز ہیں۔ بڑے ہی ناز، فخر اور وجاہت سے بھرپور جناح نے

اولوالعزم اور خواہشمند وائسرائے کو جھڑک دیا۔ اس نئی آبادی میں ان کے پاس بے پناہ اور زبردست اختیارات تھے جن کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں تھا اور جو اپنے شکر گزار مقلدوں کی چاپلوسی اور خوشامد کو دیکھ کر اس اہم تعریف کا انتظار کرتے رہتے تھے کہ آزاد اور بااقتدار پاکستان کو وجود میں لانے والا وہی تھا۔

جناح نے وہ سب حاصل کرلیا جو وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اقتدار حاصل کرلیا لیکن اس کے حاصل کرنے میں وہ اتنے زیادہ مستغرق تھے کہ انھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے مقاصد کیا ہیں۔ جب انھیں اقتدار حاصل ہوگیا تو ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس کا کیا کریں۔ انھوں نے پاکستان کے کانسٹی ٹیوشن کے لیے کوئی اسکیم مرتب نہیں کی۔ اس طرح انھوں نے پاکستان کی ترقی اور اس کی سماجی وثقافتی ترقی کے لیے کسی قسم کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ ان کے نظم ونسق (یعنی پاکستان کے ایڈمنسٹریشن) کا ڈھانچہ برطانوی افسروں کا مرہون منت تھا کیونکہ اس میں اعلیٰ جگہوں کے تقرر کے لیے قابلیت اور صلاحیت رکھنے والے موزوں مسلمان بالکل ناکافی تھے۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ پاکستان کی موجودہ مملکت کے لیے یہ تھا کہ اس میں کسی بھی ایسی قوت کا فقدان تھا جو مختلف منطقوں کے لفظوں، ثقافتوں، تمدنوں یا روایتوں اور رواجوں میں یکجہتی پیدا کر کے انھیں ایک قوم بنا دے۔ ان سب کو جوڑنے والی قوت، جس کے مسٹر جناح اور مسلم لیگ راگ الاپتے تھے، مذہب تھا لیکن تاریخ میں مذہب سے متحد کرنے کا کم اور مرکز سے گریز کرنے کا کام زیادہ لیا گیا ہے۔

14 / اگست 1947ء کو جب ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان نامی مملکت کو شاہ انگلستان کی طرف سے تہنیت، خیر سگالی اور ترقی کا پیغام دیا تو برطانوی اقتدار کے وارثوں کے دماغ اس قسم کے خیالات سے خالی تھے۔ اس وقت ان کی نگاہوں میں چکا چوند ہوئی ہوگی جب یونین جیک (انگریزی اقتدار کا جھنڈا) اتار لیا گیا اور اس کی

جگہ پاکستان کا سبز پرچم لہرایا گیا تو وہ ان خوابوں اور ان دنوں کی بحالی میں کھو گئے جب خلفاء راشدین مدینہ کے مقدس شہر میں اپنا دربار کرتے تھے۔ مستقبل نے نہیں بلکہ ماضی نے انھیں پوری طرح مسحور کر رکھا تھا۔ مسٹر جناح نے مسلم عوام کی تائید حاصل کرلی۔ اس میں زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے قدرتی اور روایتی لیڈران یعنی مولوی اور علماء کا بڑا طبقہ ان کا مخالف تھا۔ اس وجہ سے ان کے راستہ میں ہمیشہ بڑی رکاوٹ پیش آئی۔ مسلم لیگ اصلاً وہ تنظیم تھی جس کی علیگڑھ اسکول کے تعلیم یافتہ جو عام مسلمانوں سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے حمایت کرتے تھے۔

یہ بات متعدد طریقوں سے ظاہر ہوئی۔ مثلاً مسلم لیگ کے پاس مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ مسلم عوام یا تو چھوٹے موٹے کاشتکار تھے یا پیشہ ور ہنر منداور کاریگر جو شہروں یا دیہاتوں میں کام کرتے تھے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ان طبقوں کی معاشی حالت درست کرنے کے لیے روئی کی کتائی بنائی کو منظّم کرے اور کھادی کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرے۔ مسلم لیگ نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا بلکہ اس نے گاندھی جی کی ان اسکیموں میں حصہ لینے کی حوصلہ شکنی کی۔

مسلم لیگ کا خاص مقصد مسلمانوں کو اوپر لے جانا، خاص طور سے مسلم دانشوروں کی حالت کو درست کرنا اور بہتر بنانا تھا۔ جناح کی دلچسپی اس سے تھی کہ اس طبقے کے نوجوانوں کو ملازمتیں ملیں اور اسے سیاسی اقتدار میں حصہ ملے۔ مسلم لیڈروں کا جو اسلامی مساوات اور جمہوریت کی بڑ ہانکتے تھے ان اصولوں میں عقیدہ نہ تھا۔ ان کی بعض نمایاں اور مقتدر ہستیوں کے اقوال سے پتہ چلتا ہے اور سید احمد خاں کے لیے تو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے بانی تھے یا کم سے کم دوقومی نظریہ کے بانی تھے جو پاکستان کی بنیاد ہے۔ انھوں نے 1881ء کے اوائل میں لکھنؤ میں ایک تقریر میں

انڈین نیشنل کانگریس کے قانون ساز اسمبلی کے مطالبہ کی شدید مخالفت اور مذمت کی اور کہا کہ نہ ہمارے ملک کے شریف قانون داں اسے پسند کریں گے نہ نچلے طبقے کے افراد اسے پسند کریں گے۔ حکومت میں کونسلر کی بہت اہمیت اور وقعت ہے لیکن یہ پوزیشن سماج کے اعلیٰ طبقوں کے افراد کے علاوہ اور کسی کو نہیں دی جاتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی جو اعلیٰ پیمانے کے عالم تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شیخ سید انصاری اور علوی سب برابر کی حیثیت کے حامل ہیں۔ مغل پٹھان سب ایک ہی نسل اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ شیخ اور سید کے برابر نہیں سمجھے جاسکتے۔ جلاہے، نائی، دھوبی اور درزی برابر ہیں۔ یہ درجہ بندی کس وجہ سے ہے کیا ان کے باپ دادا نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

جب جواہرلال نہرو نے مسلم لیگ پر الزام لگایا کہ وہ جاگیردارانہ طبقوں کی نمائندہ ہے تو اس پر مسلم لیگ کے نمائندوں نے شدید ناراضگی ظاہر کی لیکن پروفیسر مجیب نے اس کے بارے میں یہ لکھا کہ جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے، یہ صوبہ مسلم لیگ کا خاص گڑھ تھا۔ 1935ء کے ایکٹ تحت ہونے والے الیکشن نے نہرو کے دعوے کی تصدیق کی اور 1937ء کے الیکشن میں منتخب ہونے والے ممبروں کا مندرجہ ذیل تجزیہ ہے:

نواب، راجہ اور زمیندار	21
خان بہادر اور حکومت کے خطاب یافتہ	12
وکلاء جو زیادہ تر زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے	23

مسلم لیگ پر مجیب صاحب کا تبصرہ یہ ہے کہ اگر خلیق الزماں کو وزیر بنا دیا گیا ہوتا تو اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اتر پردیش میں مسلم لیگ ختم ہو جاتی۔ نہرو اور آزاد دونوں نے زخم خوردہ ملت کے بہادر اور جری لیڈر کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا۔

دو وجهوں نے مسٹر جناح کی دشواریوں کو دور کرنے اور مسلم عوام کی تائید حاصل کرنے میں ان کی بڑی مدد کی۔ ایک آزاد با اقتدار مملکت کے قیام کی دلفریبی اور دل کشی کے ساتھ مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کا قیام جو مسلمانوں کی خواہشوں اور امنگوں کا ترجمان تھا اور دوسرے یہ غلط پروپیگنڈہ کہ ''اسلام خطرے میں ہے'' جب کہ مجیب صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کبھی بھی غیر مسلموں اور خاص کر ہندوؤں سے عداوت یا دشمنی کا جارحانہ رویہ یا طرز عمل اختیار کرنے کو نہیں کہتا۔ اس کے دشمن تمام تر اس کے اندر تھے یعنی بعض فرقہ وارانہ لڑائیاں یا جھگڑے شیعوں اور سنیوں کے درمیان وہابیوں اور احمدیوں کے درمیان تھیں جو مذہبی معاملوں میں صرف حدیث کو مسلمانوں کی زندگی کے لیے مستند قرار دیتے تھے۔

اہل قرآن جو صرف قرآن کو مستند سمجھتے تھے نہ کہ حدیث کو وہ معتزلہ اور عشری وغیرہ تھے۔ موجودہ زمانے میں جماعت اسلامی اور تجدید پسند ہیں جو روایتوں کے سخت مخالف ہیں اور سیاست کو مذہب سے علیحدہ کرنے کے حامی ہیں۔

جرمنی کے نازی پروپیگنڈہ کی طرح مسلم لیگ کے پروپیگنڈہ کی بنیاد مبالغہ آرائی، ڈینگوں اور جھوٹ پر تھی۔ یہ پروپیگنڈہ بڑے جوش وخروش سے کرنے میں بڑی مہارت دکھائی جاتی تھی کہ اس وجہ سے عوام اسے سچ سمجھنے لگے۔ دوسرے جو اصلیت سے دور ہونا چاہتے تھے انھوں نے اسے تمام وکمال قبول کرلیا اس لیے کہ اس سے ان کا مقصد پورا ہوتا تھا۔ اگر جرمنی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہٹلر اور گوئبلز کے پروپیگنڈے سے پوری دنیا کے لوگ متاثر ہوئے تو کوئی تعجب نہ تھا کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ لیگ کے پروپیگنڈے کو بالکل صحیح سمجھ کر یقین کرلیتے تھے۔ پیر پور کمیٹی رپورٹ اس شرمناک پروپیگنڈے کی سب سے زیادہ ڈھٹائی کی مثال ہے کہ اس نے کس طرح مسلمانوں کے ذہن کی کایا پلٹ کردی۔ پشاور کے عبدالقیوم خاں جو کانگریس کے بڑے نمایاں

ممبروں میں تھے، 1945ء تک خاں عبدالغفار خاں کے ساتھیوں میں تھے لیکن جب وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو 1947ء میں شمالی مغربی سرحدی صوبے کے چیف منسٹر (وزیر اعلیٰ) ہو گئے۔ یہ ضروری نہیں ان الزامات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ یہ ایسے مبالغہ آمیز اور نہ ثابت ہونے والے بیانات مثلاً یہ کہ کانگریس اور ہندو مہا سبھا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کانگریس کی تنظیم میں جو لوگ اعلیٰ درجوں پر فائز ہیں وہ دل اور خیالات کے لحاظ سے پکے مہا سبھائی ہیں اور یہ کہ طالب علموں کو گاندھی جی کی تصویر کی پرستش کرنے پر مجبور کیا گیا اور یہ کہ مسلمانوں کی دوکانوں کا بائیکاٹ کیا گیا یا یہ کہ مسلمانوں پر مختلف قسم کے اور طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ ہندو اور سکھوں کو یہ بتلایا گیا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کو دوبارہ پڑھیں اور یہ بتایا گیا کہ اسلام نے ان کے ذات پات کے نظام کو تباہ و برباد کیا اور لاکھوں ہندوؤں کو اپنے دائرے میں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ مسلمان طالب علموں سے زبردستی "بندے ماترم" گوانے کی بھی شکایت تھی۔ اس گیت میں ہندوستان کو ایسی مادر وطن کی صورت میں پیش کیا گیا جس کی پرستش دیوی کی طرح کرنا چاہیے۔ کانگریس کے جھنڈے کو قومی جھنڈا قرار دیا گیا۔ اس کی سلامی دی جائے اور گائے کی قربانی پر پابندی لگائی گئی اور کھدر پہننے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ یہ الزام بھی کہ کانگریس وزارتوں نے شدھی اور سنگٹھن کی حمایت کی، بالکل غلط تھا اور اس طرح یہ دعویٰ بھی بالکل غلط تھا کہ ایک ایسی تعلیمی اسکیم نافذ کی گئی جس کا مقصد ہندوستان کے ویدک کلچر کا احیاء کرنا تھا۔ اس طرح اردو پڑھنے میں تعصب برتنے کو مسلم شکایت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ زبان کو مسلم، سکھ، عیسائی، ہندو یا بدھسٹ قرار دینا غلط اور گمراہ کن ہے کیونکہ عربی بہت سے ایسے لوگوں کی بھی زبان ہے جو اسلام کے پیرو نہیں ہیں مثلاً لبنان، مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں عیسائی شہری ہیں اور اسلام کے آغاز سے پہلے بھی عربی ان تمام

باشندوں کی زبان تھی ۔ بے شمار ہندو ،عیسائی اور دوسری قوموں کے لوگ اردو بولتے ہیں اردو پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان اردو کی بھی بجائے بنگالی بولتے ہیں اگر اردو کے لیے وہ توجہ نہیں کی جاتی جس کی اردوزبان مستحق ہے تو اس شکایت کو مسلم شکایت نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ تصور ہی سراسر لغواور غلط ہے کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ تو بلا امتیاز مذہب وملت سارے اردو بولنے والے لوگوں کی زبان ہے خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اگر اردو کی حق تلفی کی شکایت آتی ہے تو اسے عوام کی شکایت سمجھنا چاہیئے ۔فسطائی پروپیگنڈہ کی طرح مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوا۔ جناح اور مولانا آزاد میں سے ہندوستان کے مسلمانوں نے مسٹر جناح کو منتخب کیا۔ یہ صرف مستقبل بتائے گا کہ یہ انتخاب کہاں تک صحیح تھا۔

10-بالآخر آزادی

ہندوستان کی صورتحال بہت زیادہ مختلف تھی۔ دہلی جس نے برطانوی راج کے خاتمے کا غیر معمولی منظر ہندوستان کی آزادی کے پہلے دن دیکھا، ان تمام کارروائیوں اور سرگرمیوں سے بڑی دلچسپی تھی جن کے ذریعہ برٹش حکومت ختم کیا گیا جس کے لیے لوگوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ جدوجہد کی تھی اور زبردست قربانیاں دی تھیں ہندوستان کے لیے یہ ایک طویل اور اندھیری رات کا خاتمہ تھا اور ایک نئے عہد کے طلوع کا آغاز تھا۔کراچی پاکستان کا پہلا دارالسلطنت تھا جبکہ کراچی ایک دور افتادہ اور الگ مملکت کا شہر تھا اور سیاسی اعتبار سے ایک بے حس وجامد صوبہ جو پس ماندہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

لیکن جہاں ایک طرف لوگ مسرت اور خوشی سے سرشار تھے، ان کے لیڈر اس

ان بڑے سنجیدہ موڈ میں تھے اور وہ اپنے نہ پورے ہونے والے اغراض ومقاصد سے
بے ہوئے تھے اور وطن سے اجاڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ جو خون چکاں واقعات
پیش آئے تھے ان سے وہ حد درجہ متاثر تھے۔ آزادی تو مل گئی لیکن اس کے ساتھ تمام
پرانے رشتہ منقطع ہو گئے۔ قدرتی طور پر متحد ملک کے حصے ہوئے جس سے نئے اور
پیچیدہ مسئلے سامنے آ گئے اور اس طرح اتحاد جو صدیوں کا طرۂ امتیاز تھا پارہ پارہ ہو گیا۔
کانگریسی لیڈروں نے جنھوں نے درجہ نو آبادیات کی تجویز کو جو مکمل صوبہ جاتی
خود مختاری اور بڑے کمزور مرکز کی بنیاد پر تھی، جسے 1942ء میں جنگی کابینہ نے پیش
کیا تھا، مسترد کر دیا تھا، اب ماؤنٹ بیٹن کے 1947ء کے منصوبے کو منظور کر لیا اس
لیے کہ فوری طور سے اس میں اقتدار کی منتقلی اور ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام
کی یقین دہانی تھی۔ انھوں نے پس وپیش کے بعد ان فائدوں کی قیمت ادا کی اور
ہندوستان کی تقسیم اور دو آزاد مملکتوں کے قیام پر راضی ہو گئے، یہ جانتے ہوئے کہ
بجائے ہندو مسلم اختلافات کو حل ہونے کے ان جھگڑوں کو بین الاقوامی حیثیت
حاصل ہو جائے گی۔ آخر ان معاملات میں بین الاقوامی کشمکش کا دخل ہو گیا۔
کانگریس کے لیڈر اقتدار حاصل کرنے کے لیے بیقرار اور بے تاب تھے جیسا کہ
گاندھی جی نے بڑے رنج کے ساتھ کہا۔ نہرو اعتراف کیا: ''تقسیم حالات کی مجبوری
تھی اور یہ احساس تھا کہ ہم اس جمود اور تعطل سے نہ نکل سکے۔ ہم نے جو طریقے
اختیار کیے اس سے یہ تعطل اور زیادہ ابتر ہو گیا۔ اس کے ساتھ یہ جذبہ اور احساس بھی
تھا کہ اگر ہم اس پس منظر کے ساتھ ہندوستان کی آزادی حاصل کر لیں تو یہ بڑا ہی
کمزور ہندوستان ہو گا اور ایسا وفاقی ہندوستان ہو گا جس میں اس کی وحدتوں کو زیادہ
سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ مگر ایک بڑے ہندوستان کو ہمیشہ دشواریوں
کا سامنا کرنا ہو گا اور وہ ہمیشہ انتشار پسندی کا شکار رہے گا۔ اس کے ساتھ یہ بات

بھی قابل غور ہے کہ مستقبل قریب میں آزادی حاصل کرنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اس لیے ہم نے اسے یعنی تقسیم کو منظور کرلیا۔ ہمیں ایک مضبوط ہندوستان کی تعمیر کرنا چاہئے اگر دوسرے اس میں نہیں رہنا چاہتے تو انھیں اس میں رہنے پر کیوں مجبور کریں۔''

نہرو نے لیونارڈ موسلے سے ایک انٹرویو میں ماؤنٹ بیٹن پلان کی منظوری کے بارے میں اپنی رائے زیادہ وضاحت سے ظاہر کی: ''سچائی یہ ہے کہ ہم لوگ تھک چکے تھے اور برسوں سے ہم اس تھکن کا شکار تھے۔ ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جو پھر جیل جانے کو تیار تھے۔ اگر ہم متحدہ ہندوستان کے لیے جیسا کہ ہماری خواہش تھی کے موقف پر قائم رہتے تو ہمیں پھر جیل جانا پڑتا۔ ہم نے پنجاب میں آگ لگتی ہوئی دیکھی اور روزانہ قتل عام کی خبریں سنیں۔ اس پلان نے اس سے نکلنے کا راستہ بتایا اور ہم نے اسے منظور کرلیا۔''

لیکن کانگریس لیڈر بہت دنوں سے بیقرار اور بے تاب تھے اس لیے کہ انھوں نے ملک میں عرصہ دراز تک بدیشی حکومت کی خرابیاں اور مصیبتیں سہی تھیں۔ اخلاقی و مادی دونوں لحاظ سے ان کے پاس اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اس سماجی نظام کو جو صدیوں سے منجمد ہو چکا تھا پھر تعمیر کریں۔ وہ اس کے خواہاں تھے کہ ملک میں بڑی تیزی سے صنعت کاری کریں اور ہندوستانی معیشت کو اس کساد بازاری سے جو سامراجی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی نجات دلائیں۔ عام مفلسی کے انحطاط پذیر اثر سے فوری طور سے ریلیف دیا جائے، تعلیم کو پھیلایا جائے اور قرون وسطی کے سماج کو جدید بنایا جائے تاکہ یہ دنیا کے معاملوں میں باعزت طور سے حصہ دے اور وہ اس اچھے راستے پر چلے جس پر موہن داس کرم چند گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور چل رہے تھے۔ جواہر لال نہرو انتہا پسند خیالات کے آدمی تھے اور ان کے خیالات

بہت اعلیٰ تھے۔ وہ زبردست قوت متخیلہ کے مالک تھے اور بڑے ہی جذباتی تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل جو بڑی سوجھ بوجھ کے مالک تھے، جن کی قوت فیصلہ بہت متوازن اور جن کا انتظامی تجربہ بہت وسیع تھا، وہ بھی اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے بیتاب تھے اور یہ فرائض پیچیدگی کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ وہ مخلوط حکومت کے تلخ تجربہ سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ شک وشبہ نہیں کہ مسٹر جناح ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند تھے لیکن اب اس سے زیادہ پاکستان، جو ایسا مقصد تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی، کے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ شروع میں کانگریسی لیڈروں کل خیال تھا کہ پاکستان محض سودے بازی ہے۔ جناح نے برطانوی حکمرانوں سے اس کی یقین دہانی حاصل کر لی تھی اور اس کی مدد سے پاکستان کا حصول یقینی بن گیا۔ لیکن جنگی کابینہ کی غیر مبہم تجویز جس کی رو سے ہندوستان کو تین سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور جس کے تحت ایک کمزور مرکز تھا، نے کانگریس لیڈروں کے متحدہ ہندوستان کے تصور میں کسی قسم کی لچک پیدا نہیں کی اور نہ بعد میں ویول اور کابینہ کے تین وزیروں کے منصوبوں نے انھیں ان کے موقف سے ہٹایا۔ اس طرح سے انکا یہ غلط تصور قائم رہا یہاں تک کہ اس تصور کو 47ء میں بالکل تباہ کر دیا گیا لیکن یہ تاخیر بڑی مہلک ثابت ہوئی اور اس نے ملک میں باہمی عداوت اور منافرت کو اتنا زیادہ بڑھا دیا کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

آخر کار 15 راگست کا تاریخی دن آ گیا۔ یہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ڈیڑھ سو برسوں کی حکومت کا آخری دن تھا۔ اس دن مرد اور عورت خوشی سے بھرے ہوئے تھے۔ دہلی کی سڑکوں پر زبردست ہجوم اکٹھا ہو گیا اور اس نے تمام پابندیوں اور رکاوٹوں کو توڑ دیا اور وائسرائے اور وزیروں کے جلوس میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اسمبلی کے

گردگھیرا ڈال دیا اور ہندوستان اور اس کے لیڈروں کی فتح کے نعرے بلند کیے اور
پرشور اور ہنگامہ خیز رنگ رلیاں منائیں۔ رات ہوئی یعنی 12 بجے کا گھنٹہ بجا تو
ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے اسمبلی ہال میں شاہ برطانیہ جو اس وقت
ہندوستان کے شہنشاہ نہیں رہے تھے، کی طرف سے مبارکباد اور تہنیت کا پیغام دینے
کے لیے داخل ہوئے تب گاندھی جی کے وارث نہرو اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر
اعظم جذبات سے بھرپور فضا میں ہندوستان کی نئی نوآبادی کے لیے عہد لینے کے لیے
کھڑے ہوئے۔ اس تاریخی موقع کے لحاظ سے انھوں نے بڑے ہی پرخلوص اور سنجیدہ
الفاظ استعمال کیے جو خطابت کے لحاظ سے بھی بہت مناسب تھے۔ انھوں نے کہا:
''بہت سال گزرے کہ ہم نے تقدیر کے ساتھ عہد کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنا
عہد پورا کریں۔ جب نصف رات کا گھنٹہ بجے گا اور ساری دنیا سو رہی ہوگی،
ہندوستان اپنی زندگی اور آزادی کے لیے جاگے گا اور یہ لمحہ وہ ہے جو تاریخ میں شاذ
ونادر ہی آتا ہے۔ جب ہم نئے عہد میں پرانے عہد کے خاتمے کے بعد قدم رکھتے
ہیں، جب ایک قوم کی روح جو مدتوں کچلی جاتی رہی ہے، اپنا اظہار کرسکتی ہے۔ یہ
ہرلحاظ سے برمحل ہے کہ ہم اس موقع پر ہندوستان اور اس کے لوگوں کی خدمت کے
لیے اور اس سے بڑھ کر انسانیت کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کرنے کا عہد کریں
اور تاریخ کے آغاز پر ہندوستان میں اپنی ناختم ہونے والی تلاش کا آغاز کریں۔ بے
سراغ اور نامعلوم صدیاں اس کی عظمت کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی
ہیں۔ خوش قسمتی اور بدقسمتی دونوں موقعوں پر اس نے اپنے نصب العین اور اعلیٰ
تصورات کو جس کی وجہ سے اسے ہمیشہ طاقت ملی ترک نہیں کیا۔ آج ہم ایک بدقسمتی کا
دور ختم کررہے ہیں اور ہندوستان اپنی شناخت دوبارہ کررہا ہے۔ اس عظیم مقصد کے
حصول پر ہم جشن منارہے ہیں۔ لیکن یہ ایک قدم ہے جو ہمیں اس کا موقع فراہم کررہا

ہے کہ ہم زیادہ بڑی فتح حاصل کریں اور زیادہ بڑے کارنامے انجام دیں جن کا ہمیں انتظار ہے۔ کیا ہم اتنے بہادر اور سمجھدار ہیں کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں اور مستقبل کے چیلنج کو قبول کرلیں۔ مستقبل آسان نہیں ہے اور نہ آرام کرنے کے لیے ہے۔ ہمیں مسلسل کوشش کرنا ہے کہ ہم اس عہد کو پورا کریں جسے ہم کرتے رہیں اور جسے آج ہم نے کیا ہے۔ ہندوستان کی خدمت کرنے کے معنی ہیں ہم ان لاکھوں انسانوں کی خدمت کریں جو مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں محنت کرنی ہے اور سخت محنت کرنی ہے تا کہ ہم ان خوابوں کو سچ کر دکھائیں۔

''یہ خواب صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ہیں۔ امن کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ نا قابل تقسیم ہے۔ اسی طرح سے آزادی اور خوش حالی بھی ہے اور تباہی بھی۔ اس ایک دنیا کو الگ ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے لوگوں سے، جن کے ہم نمائندہ ہیں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ اس اہم موقع پر ہمارا ساتھ دیں۔ یہ وقت چھوٹی چھوٹی اور تباہ کن نکتہ چینی کا نہیں اور نہ کسی سے نفرت کرنے کا اور نہ دوسروں پر الزام تراشی کا۔ ہمیں آزاد ہندوستان کا شاندار قصر تعمیر کرنا ہے جس میں اس کے سب بچے رہ سکیں۔''

اسمبلی نے طے کیا کہ اس کے سب ممبر حسب ذیل عہد لیں: ''اس موقع پر کہ جب ہندوستان کے لوگوں نے تکلیفیں اٹھا کر اور قربانیاں دے کر آزادی حاصل کر لی ہے، میں ہندوستان کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا ایک ممبر پورے عجز وانکسار کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ہندوستان اور اس کے لوگوں کی خدمت کرنے کا عہد کرتا ہوں تا کہ یہ قدیم ملک دنیا میں اپنی جائز جگہ حاصل کر لے، دنیا کے امن کو ترقی دے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کرے۔''

یہ عہد لینے کے بعد اسمبلی میں ایک دوسرے ریزولوشن کے رو سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا گیا اور ماؤنٹ بیٹن کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان کے پہلے دستوری گورنر جنرل، جنھیں آزاد ہندوستان نے مقرر کیا ہے، ہونے کو منظور کر لیں۔

اسی رات کو اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو دونوں ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور انھیں اسمبلی کے دعوت نامہ سے رسمی طور پر مطلع کیا۔ جیسے ہی یہ رات جو ناقابل فراموش یادوں اور ترسانے والی امیدوں سے بھری ہوئی تھی ختم ہوئی اور آزادی کا پہلا دن طلوع ہوا تو ہندوستان نے اس دن کا خیر مقدم والہانہ جوش وخروش سے کیا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے عنابی اور سنہرے لباس میں ملبوس گورنر جنرل اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن جو چاندی اور سونے کے دھاگوں سے بنے ہوئے لباس میں ملبوس تھیں کے آنے کا اعلان کیا گیا۔ وہ سونے کے تخت پر خوبصورت عنابی قنات کے نیچے بیٹھے۔ اس وقت تیز برقی روشنی سے دربار ہال منور تھا اور ہال میں بڑے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے یہ سونے سے بنے کپڑوں کا ایک میدان ہے۔

تقریب کا آغاز گورنر جنرل کی حلف برداری سے ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر راجندر پرساد نے تہنیتی پیغامات جو ساری دنیا سے موصول ہوئے تھے پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد اسمبلی کو ماؤنٹ بیٹن نے خطاب کیا۔ انھوں نے مختصراً ان واقعات کو جو اس تاریخی دن کے آنے تک پیش آئے تھے بیان کیا۔ اپنے ایڈرس کے آخر میں انھوں نے کہا: ''آج سے میں آپ کا دستوری گورنر جنرل ہوں اور میں آپ سے کہوں گا کہ آپ مجھے اپنے میں سے سمجھیں۔ میں نے ہندوستان کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے کو پوری طرح وقف کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر راجندر پرساد نے ماؤنٹ بیٹن کے ایڈرس کا جواب ہندی میں دیا اور بعد

میں انگریزی میں۔ انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی: '' آج سے ہندوستان پر سے برطانوی تسلط کا عہد ختم ہوتا ہے اور اب ہمارے برطانیہ سے تعلقات باہمی خیر سگالی اور فائدوں پر مبنی ہوں گے۔'' تقریر کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس پر قومی جھنڈا لہرایا گیا اور اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔

اس دن کی آخری تقریب پرنسز پارک میں وار میموریل پر قومی جھنڈے کی سلامی تھی۔ کیمپل جانسن جو اس تقریب کے عینی شاہد تھے، اس تقریب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

'' پوری تقریب کی منصوبہ بندی اس انداز سے کی گئی تھی کہ اس میں تقریباً تیس ہزار لوگ شریک ہوں گے لیکن منصوبہ بندوں کے لیے بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ یہ تعداد بڑھ کر 3 لاکھ ہوگئی۔ ہم مسرت اور خوشی سے سرشار انسانوں میں گھر گئے۔ ہجوم نے ساری کرسیوں پر قبضہ کرلیا اور وہ بنچوں اور کندھوں پر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ایک ایک کرسی پر چھ چھ ہندوستانی تھے۔

ایسا دیکھا گیا کہ اس عہد، نسل، ذات کے انسان ہم آہنگی میں کھو گئے تھے۔ اس انسانی ہجوم کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سینٹرل ڈائس یعنی جھنڈے کی چوٹی تک پہونچ جائے۔ یہ ہجوم بحر اعظم کی طرح ہوگیا تھا جو اس جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف قہقہے بلند ہو رہے تھے اور مذاق ہو رہا تھا۔ اچانک تالیاں زبردست شور میں بدل گئیں۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہاں میں نے عجیب دلکش منظر دیکھا۔

جس وقت جھنڈا لہرایا جا رہا تھا پانی برسنا شروع ہوگیا اور آسمان پر قوس قزح نمودار ہوئی جیسے وہ جھنڈے کے زعفرانی، سفید اور سبز رنگ سے مقابلہ کر رہی تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کوئی اس شگون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انھوں نے تسلیم کیا کہ مجھے اس میں شک نہیں کہ مجھے کبھی اس سے زیادہ بڑا اور اس سے زیادہ یادگار دن دیکھنے کو ملے گا۔ ماؤنٹ بیٹن کا اس دن کے واقعات کا ذکر اس کی تصدیق کرتا ہے کہ 15 / اگست 1947ء کا دن سب سے زیادہ یادگار اور متاثر کرنے والا دن تھا۔ انھوں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ جھنڈا بڑے جوش اور عجیب وغریب خوشی کے عالم میں لہرایا گیا۔ اور جب جھنڈا لہرایا گیا تو آسمان پر بڑی ہی دلکش قوس قزح طلوع ہوئی اور اسے سارے مجمع نے بڑے اچھے شگون سے تعبیر کیا۔ کسی بھی برطانوی یا ہندوستانی نے جس سے میں ملا ہوں اس نے بتایا کہ ایسا مجمع اور ایسے مناظر انھوں نے کبھی نہیں دیکھے جو انھوں نے کل دیکھے۔ جس نے بھی اس ہجوم کو بڑھتے ہوئے دیکھا وہ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا اس عدیم المثال جوش وخروش کے اظہار کے درمیان گورنر جنرل کی گاڑی ان کے اے ڈی سیز اور محافظوں سے گھری ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ماؤنٹ بیٹن گاڑی میں کھڑے ہوگئے ہیں اور ہجوم کی طرف ہاتھ ہلا رہے ہیں اور عوام بھی اسی طرح ان کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ ہر شخص نے اس شخص کی کمی محسوس کی جو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس موقعہ کو پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا اور جس نے ہندوستان کی تاریخ کو ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ آزادی کے دن گاندھی جی دہلی میں موجود نہیں تھے حالانکہ انھیں آزادی سے بے پناہ محبت تھی۔

وہ سچائی، رحم، صداقت شعاری، عدم تشدد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک آزادی اور حکومت خود اختیاری اقتدار کے مترادف نہ تھے بلکہ وہ اقتدار کو اخلاق اور سچائی کے کنٹرول میں رکھنا چاہتے تھے۔ آزادی جسے ہندوستان نے 15 / اگست 47ء کو حاصل کیا اس نے ایک بڑا خلا پیدا کر دیا اور زبردست مصیبتیں پیدا کر دیں۔ یہ قومی اتحاد کو فرقہ وارانہ جذبات پر قربان کر کے آزادی حاصل ہوئی تھی اور

یہ خوف اور منافرت کے سامنے سپر انداز ہو گئی محض اقتدار کی خاطر بغیر مقصد کا لحاظ کئے ہوئے۔

انھوں نے محسوس کیا تھا کہ گورنر جنرل کو اس پر فخر تھا کہ انھوں نے بڑا ہی مشکل اور دشوار کام جو ملک معظم کی حکومت نے ان کے سپرد کیا تھا پورا کر لیا تھا اور ہندوستان کی قسمت بدل دی تھی۔ یہ آزادی عالی مرتبت ہندوستانیوں، شہزادوں، اعلیٰ افسروں اور ممتاز عہدے داروں کے لیے ہی نہ تھی جو دہلی میں اکٹھا تھے بلکہ غریبوں اور مظلوموں اور ان فوجیوں کے لیے بھی تھی جو آخر دم تک لڑتے ہیں۔ اس آزادی میں موسیقی تھی، رنگ تھا، شان تھی، عظمت تھی، سونا تھا، ہیرے تھے، مٹی تھی اور وہ عام لوگ تھے جو بارش اور سردی میں پھنس گئے تھے۔

11 - ہندوستانی قوم پرستی کو ناکام بنانے کی برٹش حکمت عملی

ان تمام قابل ذکر کارروائیوں میں تیسری پارٹی برطانیہ تھی۔ دراصل برطانیہ غالب عنصر کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اس نے ہندوستان کے لیے جدوجہد کرنے والے عناصر کو سو سال سے زیادہ کی مدت تک دبائے رکھا۔ ان عناصر نے بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں جارحانہ رویہ اختیار کیا۔

یہ غالب قوت سامراجی اغراض ومقاصد: سیاسی اور اقتصادی دونوں کے لیے استحصال کو ترقی دینے کے لیے استعمال کی گئی۔ سیاسی میدان میں برطانوی حکومت کو کوئی بھی باک نہ تھا کہ وہ اپنے اختیارات کے چیلنج کا فوجی اور سول طاقتوں سے مقابلہ کرے۔ امرواقعہ یہ ہے کہ یہ چیلنج قوم پرستوں کی طرف سے تھا اور انڈین نیشنل کانگریس قوم پرستوں کی نمائندگی کرتی تھی اور اس نے عوام کو حکومت سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کر کے اسے سچ کر دکھایا۔ حکومت کو اس بارے میں ذرا بھی پس وپیش نہ تھا کہ وہ کانگریس سے دشمن کی طرح پیش آئے اور اس کے خلاف حکومت کے سارے حربے

استعمال کرے۔

1905ء میں بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن، 1918ء سے لے کر 1922ء تک عدم تعاون اور خلافت کی تحریک، 1930ء میں ستیہ گرہ، 1932ء میں سول نافرمانی کی تحریک اور 1942ء میں انگریز و ہندوستان خالی کرو، ساری تحریکوں کے خلاف ایک ہی قسم کا برتاؤ کیا گیا۔ حکومت خود اختیاری کے سارے مطالبوں کو حکومت کے خلاف جنگ تصور کیا گیا۔ لیکن دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے ان کو قومی نہیں بلکہ ہندو قرار دیا گیا اور ان کو کچلنے کے تمام طریقوں کے استعمال کو جائز ٹھہرایا گیا۔ اس سے بڑھ کر مؤثر طریقہ یہ تھا کہ ہندوستانی سماج کے بعض عناصر کی ان چیلنجوں کی مخالفت کرنے کے لیے ہر طرح سے ہمت افزائی کی جائے اور اس کے لیے حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ مسلمانوں کو استعمال کیا جائے۔

1906ء میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ وہ برطانوی حکمرانوں کی طرح ہندوستان کے فاتحین اور سلاطین کے وارث اور جانشین تھے۔ مسلمان اس کھلی ہوئی لفاظی میں آ گئے اور انھوں نے خصوصی مراعات اور رعایتوں کا مطالبہ اسی بنیاد پر کیا کہ جیسے کہ نوے فی صدی اسلام قبول کرنے والوں کو جن کا تعلق ہندوستانی سماج کے نچلے طبقوں سے تھا، تورانی، ایرانی، پٹھان اور عرب سپاہیوں اور حاشیہ برداروں کا خون ورثہ میں ملا ہو۔ مسلمان کاشت کار، مزدور، جلاہے، قصائی، مہتر، کاریگر، ہنرمندوں کو جو اکثریت میں تھے، اونچا کر دیا گیا کہ ایک ایسے مذہب کے پیرو تھے جس پر وہ فخر کرتے تھے جو ہندوازم کے برعکس اونچے اور نیچے یا اعلیٰ اور ادنیٰ میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتا تھا اور جو توہمات سے بالکل دور تھا۔ یہ سب تاریخ کے واقعات اور مسلمانوں کی زندگی کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا۔ یہ تمام تر جھوٹا غرور تھا اور فرقہ وارانہ اختلافات کے بارے میں مبالغہ آرائی تھی۔

پھر مسلمان خواہ وہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ہوں یا باقی ماندہ ہندوستان میں منتشر ہوں قصبوں، شہروں، سڑکوں، گلی کوچوں اور دیہاتوں کے چھپروں میں پڑوسیوں کی طرح رہتے تھے، مقامی زبان بولتے تھے، وہ ایک جیسے پیشے کرتے تھے اور ایک جیسی معیشت میں حصہ لیتے تھے یعنی زراعت اور دوسرے کاروباروں میں۔ وہ ایک ہی موسیقی کو سنتے اور سناتے تھے اور اس طرح دوسری تفریحوں میں مل جل کر حصہ لیتے تھے۔ انھیں اس فریب میں مبتلا کر دیا گیا کہ وہ ایک مختلف قوم سے تعلق رکھتے ہیں باوجود اس کے کہ جغرافیائی اعتبار سے ان کا تعلق ایک ہی علاقے سے تھا اور وہ ایک ہی سی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستانی مسلمان نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اعتبار سے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے اور اس بات کا اعتراف ساری اسلامی دنیا کرتی تھی۔ سولہویں صدی کے اوائل میں بابر جو وسطیٰ ایشیا سے تعلق رکھتے تھے مسلم ملک افغانستان کو فتح کر کے اس کے حکمراں ہو گئے اور انھیں ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے کردار کا اندازہ ہوا۔ ہندوستان کے باہر کے مسلمان اب بھی ہندوستانی مسلمان کو ہندو کہتے ہیں۔ لیکن برطانوی حکمرانوں نے جو بابری خاندان کے جانشین ہونے پر فخر کرتے تھے، ہندوستانیوں کے مشترکہ کردار کے بارے میں اپنی آنکھیں اور دل دماغ بند کر لیا اور اس سے زیادہ برا یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ زہر بھر دیا کہ وہ مغلوں کے وارث ہیں۔ لیکن یہ بھول گئے کہ مغلوں نے اس کی کوشش کی تھی کہ سارے ملک میں ایک سیاسی نظام کے ذریعہ مشترک تمدن کو فروغ دیں اور کشمیر سے لے کر دکن تک سارے ہندوستان میں یک جہتی قائم کر دیں۔ وہ دوسری مسلم مملکتوں مثلاً سلطنتِ عثمانیہ، صفوی ایران اور وسطیٰ ایشیا کی ازبکوں سے بالکل الگ رہے اور عثمانی سلطان کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ صفویوں سے اپنی مغربی

سرحدوں کی حفاظت کر کے اور ہندوکش کے اس پار کے حملوں کو پسپا کر کے اپنے کو بالکل الگ رکھا۔

اٹھارویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے اوندھے تذکرہ کو مقبول بنایا گیا۔ یہ الزام لگایا گیا کہ یہ سلطنت اس لیے تباہ و برباد ہوئی کہ ہندوؤں نے اس کے خلاف بغاوت کی تھی اور ان میں خاص طور سے مراٹھا تھے اور ان کے معاً بعد سکھ اور جاٹ تھے۔ یہ بالکل بے سروپا داستان تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ سلطنت مغلیہ کو الوالعزم اور مقتدر مسلم سرداروں خاص کر حوصلہ مند نظام حیدر آباد، مغربی اتر پردیش کے روہیلہ نوابوں، اودھ کے نواب وزیروں، مشرقی منطقوں کے نوابوں، بہار، بنگال اڑیسہ، کابل اور لاہور کے گورنروں نے تباہ و برباد کیا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کو فتوحات حاصل کرنے کا موقع اس وقت ملا جب مختلف کوتاہ بین، خودغرض اور غیر وفادار مسلم سرداروں کے گروہوں کی آویزش اور ہنگامہ آرائیوں نے شہنشاہیت کو کمزور کر دیا۔ مسلم مغل اور ہندو مراٹھا تصادم کو جھوٹی شکل دے کر اس کے نشیب و فراز کو غلط صورت میں اس لیے پیش کیا گیا کہ فرقہ وارانہ منافرت کو لفظی جنگ میں مسالہ اور مواد ملے۔ اس بحث کا مطلب مذہب اور عقیدے کے اختلاف، ذاتی زندگیوں اور روایتوں کے وجود سے انکار کرنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ان اختلافات کے بارے میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے اور سیاسی اغراض اور مقاصد کی خاطر مشترک خصوصیتوں کو کم کیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں ہے جہاں نسل، زبان، مذہب اور طبقوں کے اختلافات نہ پائے جاتے ہوں لیکن ان اختلافات کو اسٹیٹ کی پالیسیوں کے ذریعہ دور کر کے اتحاد پیدا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو آپس میں ملایا جاتا ہے۔

یہودیوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ اس کی مثال ہے۔ انگلستان نے انھیں مساوی

حقوق دیے اور اس وجہ سے انھوں نے معاشی ترقی کی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ راتھس چائلڈ (Rothschild) ڈسرائلی (Desraeli) ریڈنگ (Reading) مانٹیگو (Montigo) ہربرٹ سیمول (Herbert samuel) سب ہی یہودی تھے لیکن ان سب کا برطانوی تاریخ بنانے میں بحیثیت محب الوطن انگریزوں کے بہت بڑا ہاتھ رہا۔ برعکس اس کے نازی جرمنی نے انھیں غیر انسانی یا انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا جس سے یہ قوم اپنے بڑے ہی لائق وقابل سائنسدانوں، فاضلوں اور صنعتی لیڈروں سے محروم ہوگئی۔ اس طرح سے پوری تاریخ مظالم اور ناروا داری کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

برطانوی پالیسی یہ تھی کہ اختلافات کو بڑھایا جائے زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس سے شہنشاہیت کے وجود کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملے گی اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کو یقین تھا کہ یہ ممکن ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر مشترکہ قومیت کا شعور پیدا کرلیں۔ اِن کے اس یقین نے ایک عقیدہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ دستوری اصلاحات کے بارے میں تینوں پارٹیاں یعنی کنزرویٹو، لبرل اور لیبر اسی انداز سے سوچتی تھیں۔

مارلے، مانٹیگو، لائڈ جارج جیسے لبرل ہندوستان سے اتنا ہی متاثر تھے جتنا میکڈونل، اولیور، ایٹلی۔ گریس اور پےتھک لارنس جیسے لیبر رہنما اور برکن ہیڈ (Birkenhead)، ٹیمپل وڈ، ایمرے، چیمبرلین اور چرچل جیسے کنزرویٹو۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلافات کے تعلق سے ان پارٹیوں میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ہندوستانیوں کو ذمہ داریوں اور حکومت اختیاری کے حوالے کرنے کے بارے میں اختلاف تھا۔ یہ بات کیسی ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہو مگر سچ ہے کہ یہ تمام پارٹیاں ہندوستان کے اتحاد کے بارے میں متحد تھیں لیکن اس کے باوجود ایسا راستہ اختیار کیا گیا کہ ہندوستان تقسیم

ہو گیا۔

مارلے اور مان ٹیگو نے نظری اعتبار سے جداگانہ انتخاب کی مذمت کی لیکن انھوں نے اسے 1909ء اور 1919ء کے ایکٹوں میں داخل کیا۔ سائمن اور ایٹلی نے اس پر نکتہ چینی کی اور اسے قوم کی تعمیر کے لیے مضرت رساں ٹھہرایا لیکن اسے 1935ء کے ایکٹ میں داخل کرنے کی سفارش کی۔ گول میز کانفرنس میں ووتج وڈ بین نے اس کی زبردست مخالفت کی لیکن میکڈانلڈ نے اپنے اوارڈ میں اسے نہ صرف مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا بلکہ انھوں نے اسے پست اقوام اور دوسرے گروہوں کے مفاد کے لیے بھی جائز ٹھہرایا۔ 1935ء کے ایکٹ میں اسے جگہ دی گئی۔

زیٹ لینڈ، ایمرے اور لن لتھ گو نے مسلم علیحدگی پسندی پر مسلم لیگ کو دستوری ترقی اور انتظامی اصلاحات میں ویٹو کا حق دے کر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ جنگی کابینہ نے چرچل کی قیادت اور ایٹلی اور کرپس کی رضامندی سے فرقہ وارانہ بنیادوں پر نئے دستور میں صوبوں کی تقسیم کی پیش کش کی۔ تین لیبر وزیروں پر مشتمل کابینی مشن نے بھی جنگی کابینہ کی تجویزوں کی تائید کی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی مشنری عطا کی۔ اس پورے طریقہ عمل کو لیبر پارٹی کے ایجنٹ ماؤنٹ بیٹن نے مکمل کر دیا۔ برطانوی حمایت کا مقصد لامتناہی منصوبہ فرقہ وارانہ تقسیم کو بڑھاوا دینا تھا، اس کے لیے حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات کی حمایت میں برطانوی مؤرخین، مشنریوں اور افسروں کے ناختم ہونے والے پروپیگنڈے نے ہندو اور مسلمانوں کے دماغوں میں یہ بھر دیا کہ ان کے اختلاف بڑے ہی گہرے اور ناقابل حل ہیں اور یہ کہ قومی اتحاد کا تصور قطعاً بیکار ہے۔ اس پر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ عام لوگوں کا اپنی آزادی حاصل کرنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حکمرانوں پر اتنا زیادہ انحصار تھا کہ وہ اس کے آگے جھک گئے۔ ایسی بری تجویزوں کے سامنے جھک جانے کا الزام لگانا بہت آسان ہے

لیکن اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ پوری انیسویں صدی میں جب ہندوستانی دماغ جدید خیالات کے لیے کھل رہا تھا اور جب اختلافات، جنگیں اور انتشار ان کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا تو ہندوستانی برطانیہ کو خدا کی طرف سے امن وامان اور نظم قائم کرنے والی جماعت تصور کر رہے تھے۔ حکومت اور نظم ونسق کے فن میں جدید علوم وسائنس میں اسے اپنا استاد سمجھ رہے تھے۔ یہ سمجھنا اتنا دشوار نہیں ہے کہ یہ پروپیگنڈہ اتنا زیادہ کامیاب کیوں ہوا۔

بلاشبہ کسی بھی خیال کے مقبول یا عام پسند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ فضا اور ماحول اس کے موافق ہوں۔ قوم پرستی اور سیکولرازم جو سماجی اور سیاسی نظام کے جدید اصول ہیں اس کے مقتضی ہیں کہ اقتصادی اور سماجی زندگی کے لیے جدید حالات موجود ہوں۔ جہاں تک ان حالات کا تعلق ہے ہندوستان میں ان کے فروغ میں بلاشبہ ترقی ہوئی۔ لیکن یہ ترقی نام کی تھی اس لیے کہ بیرونی حکومت کے ماتحت ہندوستانی ان حالات کو مکمل طور سے منظّم نہیں کر سکے چونکہ حکومت کی پالیسیاں سامراجی اغراض ومقاصد کے ماتحت تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر بعض سمتوں میں ترقی ہوئی تو بعض سمتوں میں مکمل جمود تھا۔ جن سمتوں میں ترقی ہوئی وہاں بیرونی حملوں یا فوج کشی کے خلاف دفاعی معاملے تھے اور نوآبادیاتی معیشت کو برقرار رکھنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ ملک میں انتشار اور گڑبڑ نہ ہو بلکہ اندرونی آزادی ہو اور سارے ملک میں نقل وحمل اور مواصلات کا جدید نظام ہو اور باقاعدہ پلاننگ کے تحت نظم ونسق چلانے والی مشینری ہو۔

جمود کا خاص طور سے زراعت اور صنعت کے بڑے سیکٹروں پر اثر پڑا۔ عوام کی تعلیم میں کمی اور ان کی سماجی فلاح پس ماندگی کی وجہ سے تھی۔ ان عجیب وغریب حالات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ جہاں ایک طرف قومیت کا شعور پیدا ہوا تو دوسری طرف

سماجی زندگی کے قرون وسطیٰ کے اثرات اور ماحول نے اس کے قالب کو ڈھالا اس لیے کوئی بھی فرقہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وجہ سے سب ملتوں کا انضمام ایک واحد قومیت میں نہ ہو سکا۔ سب ملتوں اور فرقوں نے اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا اور پوری بیسوی صدی میں اس کے حصول کے لیے بے شمار کوششیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ جب 1946ء میں باہمی شک وشبہ اور ضد نے سلگتی ہوئی آگ کی صورت اختیار کر لی تھی یہ غیر یقینی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کسی قسم کا سیاسی یا دستوری اتحاد قائم ہو سکے گا۔

اس سال تک جناح کو یقین نہ تھا کہ وہ تقسیم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے دستوری مشیر بی۔ این۔ راؤ سے فیڈریشن کے مضمرات کے بارے میں الگ الگ استفسار کرتے رہتے تھے۔ ان کی عارضی حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت پر منظوری قابل ذکر ہے۔

اس معاملے یعنی اتحاد کے حصول کو ماؤنٹ بیٹن کے عاجلانہ فیصلے نے ختم کر دیا حالانکہ ان کو ایٹلی نے یہ ہدایت کی تھی کہ اسے یقینی بنائیں۔ انھوں نے انھیں صاف لفظوں میں بتایا تھا کہ ملک معظم کی حکومت کا خاص منشاء یہ ہے کہ برطانوی دولت مشترکہ میں برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں کے لیے ایک وحدانی حکومت قائم کی جائے۔

موسلے کے نزدیک ہندوستان میں اپنے تین ہفتوں میں وائسرائے یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ایک وحدانی یا متحد ہندوستان کا قیام ممکن ہے یا ناممکن لیکن وہ اس نتیجے پر ضرور پہونچے تھے کہ اس کا حصول بڑا طویل اور بہت ہی مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور یہ خطروں اور غیر یقینی صورتحال سے بھرا ہوا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ ناکامی کا خطرہ مول لیں بلکہ وہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی

بہت جلد۔

وی، پی، مینن اس کی تصدیق کرتے ہیں:

پارٹی لیڈروں خاص کر جناح اور ان کے رفقاء سے مذاکرات کے بعد وہ اس کے پوری طرح قائل ہو گئے کہ اس بنیاد پر کسی متفقہ حل کی کوئی امید نہیں۔ انھوں نے اپنی ڈکی چڑیوں یعنی خالص انگریزوں پر مشتمل مشاورتی کمیٹی سے تقسیم کے متبادل منصوبے کی بنیاد پر دستور مرتب کرنے کو کہا۔ اس منصوبے کے بنیادی اصول یہ تھے:

(1) اگر تقسیم عمل میں آتی ہے تو اس کی ذمہ داری خود ہندوستانیوں پر عائد ہو گی۔

(2) عام طور پر صوبوں کو اپنے مستقبل کے لیے فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

(3) پنجاب اور بنگال کو نظریات کی بنیاد پر ووٹنگ کے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

(4) آسام کے مسلم اکثریتی ضلع سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں شامل ہونے کا حق حاصل ہو گا۔

(5) شمالی مغربی سرحدی صوبے میں الیکشن ہوں گے۔

2 رمئی تک یہ منصوبہ جو بڑی عجلت اور بڑے راز دارانہ طریقے سے تیار کیا گیا تھا، ملک معظم کی حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ بعد میں نہرو کی زبردست اور شدید مخالفت کی وجہ سے اسے منسوخ کر دینا پڑا۔ پھر دوسرا ڈرافٹ وی پی مینن نے تیار کیا اور یہ اس سے بھی زیادہ عجلت میں یعنی وہ 16 رمئی کو صرف چار گھنٹوں میں تیار کیا گیا۔

مینن کے ڈرافٹ میں تقسیم کو دستور سازی کی بنیاد بنایا گیا لیکن اس نے صوبوں کو اپنا مستقبل طے کرنے کا حق دیا۔

وی پی مینن کے نزدیک یہ کام مکمل کرنے پر دیوتاؤں کو ان پر رشک آ گیا۔ ہڈسن

کے خیال میں بلاشبہ کسی بھی معیار سے اس کام کو کرنا بہت بڑا کام تھا اور جس رفتار اور قوت فیصلہ سے انھوں نے یہ انجام دیا وہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ مائیکل ایڈورڈ کے نزدیک انھوں نے غلطیاں کیں۔ انھوں نے تاریخ کے پہیئے کو زور سے چلایا۔ لیکن کم ہی لوگ اس کام کو بہتر طریقے سے کر سکتے تھے اور زیادہ تر لوگ اس کام کو بڑے ہی برے طریقے سے انجام دیتے۔ اس مسئلے کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے ستمبر 48ء میں ملک معظم کی حکومت کے آخری وائسرائے کے طور پر اپنی رپورٹ میں نتائج بطور ضمیمہ شامل کیے اور ہندوستان کو جلد سیاسی اقتدار کی منتقلی کا جواز ان لائنوں پر پیش کیا۔

حکومت نے 20/فروری 47ء کو یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ جون 48ء تک اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس تاریخ کو ماؤنٹ بیٹن کے 16/مئی کے منصوبے کی وجہ سے ختم کر دیا گیا اور اس سے کانگریس اور مسلم لیگ لیڈروں کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس منصوبے کا اعلان 3/جون 47ء کو کیا گیا۔ یہ تاریخ اس لیے پہلے کر دی گئی تاکہ اس منصوبے کے اعلان اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا وقفہ کم کر دیا جائے۔ انتظار کی طویل میعاد حالات کو اور خراب کر دیتی اور دوسرے صوبوں میں بھی سیکشن 93 کا نفاذ کرنا پڑتا۔ آخر کار لا اینڈ آڈر کو قائم اور برقرار رکھنے کا کام فوج کو دیا گیا اور اس کو بحیثیت حکومت کی ایجنسی، امن وامان قائم رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس نے بہت سی دقتیں اور دشواریاں پیدا کیں۔ اس مقصد کے لیے فوج کی غیر طبقہ وارانہ تقسیم کی گئی۔ اس سے ہندوستانی فوجیوں میں بددلی پیدا ہوئی اس لیے کہ برطانوی افسر جا رہے تھے اور ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے ہم قوم افسروں پر اعتماد نہ تھا اور وہ ان کے سہارے پر نہ رہنا چاہتے تھے۔

سول ہنگاموں اور فرقہ وارانہ فسادات کو فرو کرنے کے لیے برطانوی فوجیوں

سے کسی قسم کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ بہرصورت وائسرائے ایسے موقعوں پر فوج کا استعمال ان اغراض کے لیے نہ مناسب سمجھتے تھے اور نہ سودمند۔ اس وقت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ برطانوی دور کے آخری دنوں میں برطانوی فوجیوں کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا ہندوستان میں رہنے والے برطانوی افراد کے جان و مال کی حفاظت کرنا۔ اس طرح پچاس ہزار سے زائد فوجیوں پر مشتمل سرحدی فوج اس بارے میں بالکل بیکار ثابت ہوئی اس لیے کہ دونوں نوآبادیوں کے لیڈر اس سے مطمئن نہ تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کے فعل کو جائز ٹھہراتے ہوئے کیمپل جانسن نے لکھا کہ 46ء میں مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے خونریز بلوے ہوئے۔ پھر ان بلووں کا انتقام لیا گیا۔ اس نے اور آگ لگا دی اور بنگال اور بہار میں بڑے وسیع پیمانے پر بلوے ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبوں میں شدید بلوے اور ہنگامے ہوئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی پہلی گفتگو میں زبردست وارننگ دی تھی کہ اگر ایک قابل قبول سیاسی حل بہت جلد نہ نکالا گیا تو وہ صورت حال کو کنٹرول کرنے کی گارنٹی اپنی طرف سے نہیں دے سکتے۔ اسی قسم کی وارننگ کانگریسی لیڈروں نے بھی دی تھی۔ مون کا بیان ہے کہ اس قسم کی صاف وارننگ جنکنس کو سکھ لیڈروں نے دی تھی۔

12- پنجاب میں شدید خونریزی

یہ وجہیں بڑی وزنی تھیں لیکن کیا یہ فیصلہ کن تھیں؟ ماؤنٹ بیٹن کے نتیجوں کو تین عنوانوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو یہ کہ کیا ہندوستان کی تقسیم اور دو آزاد مملکتوں کا قیام ضروری تھا۔ دوسرا یہ کہ اس رفتار کا جس سے تقسیم عمل میں لائی گئی کوئی جواز تھا اور تیسرا یہ کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ تیز رفتاری کی ضرورت تھی تو کیا تشدد کی شدت کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔

آخری سوال کو پہلے لیتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ماؤنٹ بیٹن اور ان کے مداحوں کی تاویلات اور بیانات کو لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم میں کسی قسم کی گڑبڑی کا ہونا ناگزیر تھا۔ اس قسم کی ہولناک تباہی و بربادی جس وسیع پیمانے پر وقوع پذیر ہوئی کا کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا لیکن کیا واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

اگست 1946ء کے وسط میں جب مسٹر جناح نے 16/ اگست کو ڈاریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ کیا تو دونوں فرقوں میں جنگی پیمانے پر کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا پہلے اظہار کلکتہ کے قتل عام میں ہوا، اس کے بعد مشرقی بنگال اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اسی زمانے میں بہار میں بھی نامعلوم کتنے بے گناہ لوگ قتل عام، لوٹ مار اور غارت گری کا نشانہ بنے۔ لیکن بدترین پہلو یہ تھا کہ اگرچہ یہ تصادم کسی ظاہری علامت کے لیے عارضی طور پر ترک کر دیا گیا تھا لیکن دشمنی اور عداوت کے جذبات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ معمولی سے معمولی اشتعال پر بھڑک سکتے تھے اور سابقہ متشددانہ واقعات کا اعادہ ہوسکتا تھا۔

جانسن کا یہ کہنا کہ مشرقی منطقے میں بلوے اور فساد ہونے کی وجہ سے مغرب میں بھی بلوے اور فساد ہوئے صحیح نہیں اس لیے کہ پنجاب سے بنگال کے واقعات بالکل الگ ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بنگال میں ہوا وہ پنجاب میں ہونے والے واقعات سے بالکل مختلف تھا۔

اس فرقہ وارانہ جنگ کے دوران امکانی اور خاص محاذ بنگال اور پنجاب تھے۔ بطور وائسرائے اپنے تقرر کے شروع کے دنوں میں ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ پنجاب میں نہیں بلکہ بنگال میں ہنگامے ہوں گے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ بدقسمتی سے پنجاب اس ہولناک آفت کا شکار بنا اور بنگال اس سے بچ گیا۔ یہ

بڑے تعجب کی بات ہے کہ جولائی کے وسط تک ماؤنٹ بیٹن کو اس کا اندازہ نہ ہو سکا کہ پنجاب میں اس زبردست ٹریجڈی کے ہونے کا امکان تھا جب کہ اس قسم کے صاف اشارے انھیں برابر مل رہے تھے لیکن مصروفیات نے فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دی۔

1945-46ء کے الیکشن کے زمانے میں ہی پنجاب بڑے ہی ہیجانی موڈ میں تھا۔ تینوں فرقے یعنی مسلمان، ہندو اور سکھ تقریباً برابر تھے۔ مسلمانوں کی آبادی تقریباً 16 ملین تھی اور عددی اعتبار سے وہ ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی آبادی 12 ملین سے تھوڑا بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن دوسرے معاملوں یعنی دولت، تعلیم، سرکاری ملازمتوں اور پیشوں میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ قدرتاً ہندو اور سکھ پنجاب کی پبلک لائف میں زیادہ نمایاں تھے اور پنجاب کی اقتصادی ترقی میں مسلمانوں سے زیادہ ان کا حصہ رہا۔ وہ اپنے اس رول سے باخبر تھے اور اس پر انھیں بڑا فخر تھا۔

فضل حسین، سکندر حیات اور خضر حیات کو سیاسی طاقت کی بنیاد کی اصلیت کا پورا احساس تھا اور وہ پنجاب کے مسئلوں کے خالص فرقہ وارانہ حل کی موافقت میں نہ تھے۔ انھیں جناح سے شدید اختلاف تھا اور وہ انھیں پنجاب کے معاملوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ فضل حسین اور سکندر حیات کو جناح کی اس کوشش میں کہ وہ پنجاب کو مسلم لیگ کے کنٹرول میں لے آئیں کی مزاحمت کرنے میں کامیابی ہوئی کیونکہ ان کی تائید برطانوی حکومت نے کی لیکن جب 45ء میں خضر حیات، سکندر حیات کے جانشین ہوئے تو صورت حال بالکل بدل چکی تھی۔ جناح کو آل انڈیا مسئلوں پر حکومت کی پوری تائید حاصل ہو چکی تھی اس لیے خضر حیات جناح کا مقابلہ نہیں کر سکے۔

46ء کے الیکشن میں ان کی پارٹی یعنی یونینسٹ (Unionist) پارٹی کو مسلم لیگ سے جس نے 79 سیٹیں حاصل کی تھیں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ لیگی ممبر عارضی حکومت میں شامل ہو گئے اور انھوں نے خضر حیات کے خلاف پنجاب میں مسلم لیگیوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور اس بارے میں مرکزی حکومت کی حمایت فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

جنوری 46ء میں ان مخالف حالات میں خضر حیات نے کانگریس پارٹی اور اکالیوں کے اشتراک سے مخلوط حکومت بنائی۔ اس سے مسلم لیگ میں شدید ناراضگی پیدا ہوئی اور اس نے اس حکومت کے خلاف ایک خوفناک مہم شروع کر دی جو اس وقت تک جاری رہی جب تک خضر حیات مستعفی ہونے پر مجبور نہ ہو گئے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 35ء کے سیکشن 93 کے تحت پنجاب گورنر کی حکومت میں آ گیا لیکن حکومت کی ناک کے نیچے خانہ جنگی کی پوری تیاری جاری رہی۔ مارچ 47ء میں شمالی مغربی پنجاب کے متعدد حصوں میں خونریز بلوے ہوئے۔ راولپنڈی، ملتان، لاہور اور امرتسر کے اضلاع سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور سب سے زیادہ نقصان سکھوں نے اٹھایا۔ اتلاف جان کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن یہ ہزاروں کی تعداد میں تھا۔ اسی کے ساتھ سفاکانہ مظالم ہوئے اور بے رحمی اور عیاشی کے ایسے واقعات پیش آئے کہ جس پر حیوانوں کو بھی شرم آئے۔ ہندو اور سکھوں کے زخموں پر نمک چھڑکا گیا جب لیگیوں نے انھیں طعنے دیے۔ خلیق الزماں نے ان کی ذلت پر خوشی اور مسرت کے ساتھ لکھا۔ سرکاری افسروں نے دولت مند سکھوں کی اخلاقی پستی کا ذکر کیا۔ جب سرکاری افسروں سے ہندوؤں نے اپنی جان کی حفاظت کی درخواست کی تو انھوں نے طنزیہ گاندھی جی کا حوالہ دیا۔ پنجاب میں مارچ کے واقعات سے مرکزی حکومت کی آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں۔ مون کے نزدیک جانی نقصان دو ہزار

انتیس کا اور گیارہ سوتین افراد شدید طور سے زخمی ہوئے تھے۔ ہجرت. کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا گو یہ چھوٹے پیانہ پر تھا۔ پنجاب کی حکومت جو سیکشن 93 کے تحت قائم ہوئی تھی صورت حال سے نمٹنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ مون لکھتے ہیں کہ دھماکے کا شروع ہی سے اندیشہ تھا لیکن متعدد مقامات پر مستعدی اور موثر طریقے سے اسے روکنے میں جو ناکامی ہوئی اس سے بڑا شدید صدمہ ہوا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ متعدد مقامات پر صورت حال کا بڑی بے دلی سے سامنا کیا گیا اور بعض جگہ تو قابل مذمت حد تک۔ امرتسر کا سا اہم مرکز اس لحاظ سے بدترین ثابت ہوا۔ ان نتیجوں کے بارے میں پیشین گوئی کی جاسکتی تھی۔ سکھ غضبناک تھے اور اپنے پر ہوئے مظالم اور ذلت کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے اور ان کی قیادت اعتدال پسند بلدیو سنگھ کے ہاتھوں سے نکل کر انتہا پسند لیڈروں تارا سنگھ اور کرتار سنگھ کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔

امرتسر میں برطانوی افسروں کی سکھوں کو بچانے میں ناکامی نے وہی صورت حال پیدا کردی جو تیس سال پہلے اسی شہر میں برطانوی افسروں کی طرف سے اس قسم کے برتاؤ سے پیدا ہوئی تھی جب جنرل ڈائر نے چند انگریز مردوں اور عورتوں کے قتل کا بدلہ جلیان والا باغ میں اکٹھے ہجوم سے لیا تھا۔ سکھوں نے انتقام لینے کے منصوبے تیار کرنے شروع کردیے۔ کونسی چیز سکھوں کو بھڑکا رہی تھی یا ان کے دماغوں میں فتنہ وفساد پیدا کررہی تھی اس کا مون یہ جواب دیتے ہیں کہ مختلف فرقوں میں سمجھوتے کے سوا جو اس مرحلہ پر قطعاً غیر ممکن تھا کوئی چیز بھی ان خوفناک اور مہیب خطروں سے پنجاب کو نہیں بچا سکتی تھی۔ تباہی یا بربادی کی پیشین گوئی کرنا آسان تھا لیکن یہ کس صورت اور شکل میں وقوع پذیر ہوگی اسے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

اس بارے میں سب سے پہلے پیشین گوئی جس کی تصدیق واقعات نے کی مارچ کے آخر میں دہلی کے سینیر سپرنٹنڈنٹ نے کی تھی۔

آنے والی بدقسمتی نے واقعہ کی صورت اختیار کر لی۔ اپریل مئی اور جون میں دہلی اور پنجاب کی سرحدوں پر واقع الور کی ریاست میں میو مسلمان اس انتقام کے شکار ہوئے۔ ان کے گاؤں کو جلا دیا گیا۔ گھروں کو لوٹا گیا۔ مردوں کو قتل کیا گیا اور بچ جانے والوں کو ان کے گھروں سے بھگا دیا گیا۔ مولانا آزاد نے ماؤنٹ بیٹن کو بتایا تھا کہ ان حالات کے پیش نظر ملک کی تقسیم کی وجہ سے بڑے وسیع پیمانے پر کشت وخون ہوگا۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے یہ حیرت انگیز یقین دہانی دی تھی کہ ''میں اسے دیکھوں گا کہ نہ تو کشت وخون ہو اور نہ کوئی بلوا۔ میں فوج اور فضائیہ کو نظم ونسق قایم رکھنے کا حکم دوں گا۔ جو لوگ گڑبڑ پھیلائیں گے ان کے خلاف ٹینک اور ہوائی جہاز استعمال کروں گا۔''

ماؤنٹ بیٹن کے نیک ارادے حقیقت سے بالکل بعید اور دور تھے لیکن ان کا ذرہ برابر اثر بھی اس وقت کے زہریلے اور غیر انسانی واقعات پر نہ پڑا۔ وہ وعدہ جو انھوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے کیا بالکل ہی بیکار اور غیر سودمند ثابت ہوا۔

وہ جناح کی دھونس کے آگے سپر انداختہ ہوگئے۔ جو باتیں انھیں جناح اور کانگریسی لیڈروں نے بتائیں تھیں اور جو تیاریاں سکھ کر رہے تھے، وہ انھیں سب معلوم تھیں۔ اس طرح سے انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ فرقہ پرست ذہنیت کے مالک پنجاب کے سرکاری افسر اگر برطانوی افسروں کی شمولیت سے نہیں مگر ان کی رضامندی سے اس صوبے کو جہنم میں ڈھکیل رہے تھے۔ اس کے باوجود کسی قسم کی احتیاطی تدبیریں نہیں کی گئیں اور کسی ٹیوکر (Tuker) کو ہنگامہ آرائی کرنے والوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا اور نہ ایک فرد یا دو افراد یعنی نہرو اور جناح نے متاثرہ اضلاع کا

دورہ کیا۔ کہیں جا کر پہلی اگست کو حد بندی باؤنڈری کمیشن مقرر کیا گیا۔ مغربی پنجاب کے گورنر فرانسس موڈی کا طرز عمل کسی طرح بھی فرقہ وارانہ اتحاد کو قائم کرنے کا نہ تھا جس کا اظہار ان کے حسب ذیل فقروں سے ہوتا ہے جو انھوں نے 5 ر ستمبر 47ء کو جناح کے سامنے کہے تھے: ''میں ہر شخص کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اس کی مطلق پروا نہیں کہ سرحد کے اس پار سکھوں پر کیا گزر رہی ہے۔ بڑی اچھی بات یہ ہے کہ ہمیں ان سے چھٹکارا مل جائے گا۔''

3 ر جون کے اعلان میں پاکستان کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا گیا اور اس نے جلتے ہوئے شعلوں کو اور بھڑکایا۔ اگر چہ ہندوستان کی تقسیم کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 14 ر جون کو مولانا آزاد اور بعض دوسرے کانگریسی لیڈروں کی مخالفت کے باوجود منظور کر لیا تھا لیکن اس سے نہ تو ہندو متفق ہوئے اور نہ سکھ اور نہ بہت سے مسلمان جیسا کہ مولانا آزاد نے کہا کہ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے کانگریس کمیٹی کے جذبات کے خلاف اسے ماتم کا موقع قرار دیا۔

بہت سے بنگالی ہندوؤں اور مسلمانوں نے بنگال کے اتحاد کی کوشش کی لیکن انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ پٹیل اور نہرو کی طرح کانگریسی لیڈر جو تقسیم کے پرزور حامی تھے، وہ تقسیم کی اچھائی یا معقولیت کی بنا پر نہیں بلکہ مایوسی اور غم وغصہ کی بنا پر اسے منظور کیا تھا۔ گاندھی جی جنھوں نے ایک دفعہ قسم کھائی تھی کہ ملک کی تقسیم ان کی لاش پر ہوگی اپنی چوٹی کے چیلوں کے اصرار پر مایوسی، بیچارگی اور بے بسی کی وجہ سے جھک گئے۔ کانگریسی ہندوؤں اور سکھوں کو ہندوستان کے اتحاد کو برقرار اور قائم رکھنے میں ناکامی کی وجہ سے اپنی سبکی اور اہانت محسوس ہوئی۔ انھیں مسلم لیگ کے اس رویہ سے بڑی شدید تکلیف پہونچی جس کا اظہار اس نے اپنے 12 ر جون کے ریزولوشن میں کیا تھا۔ یہ ریزولوشن کانگریس کو مشتعل کرنے والے الفاظ پر مشتمل تھا۔

اگر ایک فریق ناخوش تھا تو دوسرا باوجود اپنی ظاہری خوشی کے غیر مطمئن تھا۔ جناح اس لیے ناراض تھے کہ وہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو نہ روک پائے اور اس وجہ سے بھی کہ بالکل آخر وقت ان کا یہ مطالبہ کہ پاکستان کے مغربی بازو کو مشرقی بازو سے ملانے کے لیے ایک ہزار میل کا رابطے کا راستہ دیا جائے یک لخت مسترد کر دیا گیا تھا۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ جناح نے انھیں منجھدار میں چھوڑ دیا ہے۔ آزادی مل گئی لیکن ہندوستان کی مسلم آبادی کی ایک تہائی تعداد ہندوؤں کے غلبہ میں آ گئی۔

وائسرائے کو بخوبی علم تھا کہ نہ صرف پورے ملک میں بلکہ خود حکومت کے اندر جنگ جاری ہے اور اس کے اثرات باہر کی لگی ہوئی آگ کے لئے ایندھن فراہم کر رہے تھے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اہمیت سے وہ چنداں واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ انھیں اندیشوں اور خدشوں کے اشارے نہیں مل رہے تھے مثلاً 14 رجون کو جب وہ شملہ میں تھے تو کیمپل جانسن نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ ہم یہاں عین سکھ علاقے کے قلب میں ہیں۔ موجودہ صورت حال انتہائی کشیدہ ہے اور پیش آنے والی بدقسمتی کو دکھا رہی ہے۔ پنجاب میں ہر گھنٹہ سکھوں کی بے چینی بڑھ رہی ہے۔ ہمارے سامنے بڑا ہی خراب موسم ہے باوجود اس کے کہ بہت کچھ حاصل ہو چکا ہے نقطہ نگاہ طوفانی اور غیر یقینی ہے۔

ہندوؤں کے شدید غم وغصہ اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کی دل شکنی، دوسروں کی مایوسی اور سکھوں کی سراسیمگی اس لیے تھی کہ ان کا اتحاد بالکل ختم کر دیا گیا تھا اور ان کی سکھ مملکت کا مطالبہ نامنظور کیا جا چکا تھا۔ اپنے مقدس مقامات جن سے انھیں دلی عقیدت تھی پاکستان میں چلے جانے کی وجہ سے ان میں احساس محرومی پیدا ہو گیا تھا۔ ان سب وجوہ سے ان میں بھڑک جانے والا آتش گیر مادہ کافی پیدا ہو گیا تھا جس کی

بنا پر لا اینڈ آڈر کے رکھوالوں کو خطرے کا پوری طرح احساس کرنا تھا۔

مون کو آنے والی ٹریجڈی کے بارے میں جون کے آخر میں اطلاعیں ملنے لگیں اور انھوں نے ان اطلاعات کو دہلی میں وائسرائے کے اسٹاف کو پہونچایا۔ مون نے بعد میں لکھا: ''لیکن میری چیخ و پکار بے کار گئی۔ ویسے بھی سدھارنے کے لیے میرے ذہن میں کوئی تدبیر نہ تھی اور میں اس کا بالکل قائل ہو گیا تھا کہ اب اس تباہی کو نہیں روکا جا سکتا۔''

تاہم اشارے اتنے واضح تھے کہ وہ توجہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ جناح نے 3/ جون کو وائسرائے کو لکھا کہ ہنگاموں کو روکنے کے لیے سخت ترین قدم اٹھائے جائیں۔ نہرو نے بھی انھیں ایسا ہی کرنے پر زور دیا اور یہ کہ وہ فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والی پولس کو ہٹالیں اور مارشل لاء نافذ کر دیں۔ 10/ جون کو کرتار سنگھ نے جنکنس کو صاف صاف متنبہ کیا کہ اگر سکھ باؤنڈری کمیشن سے مطمئن نہ ہوئے تو پھر وہ زبردست متشددانہ کارروائی کریں گے۔ 15/ جولائی کو ماؤنٹ بیٹن پنجاب کی صورت حال کے ابتر ہونے کے قائل ہو گئے اور انھوں نے اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لیے اپنے مشیروں کی میٹنگ کی۔ 20/ جولائی کو وہ جنکنس سے گفتگو کرنے لاہور گئے۔ دہلی واپس آنے پر پنجاب کے حالات کی سنگینی کی وجہ سے انھوں نے تقسیم کونسل کی ایک میٹنگ 22/ جولائی کو طلب کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی سرحد کے مابین واقع اضلاع میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے پنجاب باؤنڈری فورس میجر جنرل ریس کی انتظامی کمانڈ میں اور جنرل آچنلیک اور جوائنٹ ڈیفنس کاؤنسل کی سپریم کمانڈ میں قائم کی جائے۔ اس فورس نے یکم اگست سے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ 55000 سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل تھی لیکن صوبے کے متاثرہ اضلاع کے لیے یہ بالکل ناکافی ثابت ہوئی۔ بارش میں اس کی پہیے دار

گاڑیاں میدانوں میں چلنے کے نا قابل پائی گئیں۔ اس فوج کی بد قسمتی یہ تھی کہ کسی بھی فرقے کو اس پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ اس لیے ایک ہی مہینہ میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ مو سلے کا فیصلہ تھا کہ اگر اعتماد کسی غلط جگہ کیا گیا تھا تو یہ اس کا موقع تھا بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی فوجی تنظیم نے اتنی محنت، جاں فشانی اور دلیری سے کام کیا لیکن نتیجہ کے لحاظ سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

تقسیم کونسل کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے اس کا اعلان کیا جائے کہ (1) اقلیتوں کے ساتھ اچھا اور مناسب برتاؤ اور سلوک کیا جائے گا اور ان کے جائز حقوق کا پوری طرح لحاظ رکھا جائے گا۔ (2) کسی صورت میں بھی تشدد کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ (3) باؤنڈری کمیشن کے فیصلہ کو منظور کرلیا جائے گا۔

ماؤنٹ بیٹن نے اسے سب فرقوں کے لیے آزادی کا چارٹر قرار دیا لیکن بدقسمتی سے اسے اس کاغذ کے برابر بھی نہیں سمجھا گیا جس پر یہ لکھا ہوا تھا۔ 27/ جولائی کو حکومت ہند کو پنجاب کی صورت حال کی ابتری کی اطلاعیں ملیں اور اس کی بھی کہ ذمہ داران حکومت کے اختیار کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ کرتار سنگھ کو گرفتار کرلیا گیا لیکن تارا سنگھ کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔

4/ اگست کو جنکنس نے ماؤنٹ بیٹن کو پنجاب کی صورت حال کے بارے میں لکھا: ''فرقہ وارانہ تشدد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے فرقوں کے درمیان اقتدار کے لیے جس سے ہم عنقریب دست کش ہونے والے ہیں زبردست جدوجہد ہو رہی ہے اور اقتدار کی جانشینی کے لیے اس فرقہ وارانہ جنگ نے آبادی کے سبھی حصوں کو عدیم المثال دباؤ میں لے رکھا ہے۔ پرانی وفاداریوں کو ختم کر دیا ہے اور نئی وفاداریوں کو جنم دیا ہے لہٰذا اب عام معیار کو نہیں استعمال کیا جا سکتا۔''

اس بدقسمت باؤنڈری فوج کے کمانڈر ریس نے یہ رپورٹ دی کہ جہاں تک قتل اور جان لینے کا تعلق ہے اس میں قرون وسطیٰ کی بربریت اور سفا کی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس میں نہ عمر کا کوئی لحاظ کیا گیا اور نہ جنس کا۔ ماؤں کو جو اپنے بچوں کو گودوں میں لیے ہوئے تھیں کاٹ ڈالا گیا۔ بعضوں کو برچھوں سے قتل کیا گیا اور بعضوں کو گولی ماردی گئی۔ جب سکھ حملہ کرتے تھے تو وہ راولپنڈی کا نعرہ لگاتے تھے۔ طرفین نے بڑی بے رحمی اور سفا کی کا مظاہرہ کیا۔

5 اگست کو جنکنس نے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ (محکمہ خفیہ) کے ایک افسر کو وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے اس کی رپورٹ سنی اور اسے جناح، لیاقت علی اور پٹیل کے پاس بھیجا۔ اس رپورٹ میں تارا سنگھ اور کرتار سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈروں پر نہروں کے ہیڈ ورکس تباہ کرنے، ٹرینوں کو الٹنے اور جناح کو قتل کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔ جناح اور لیاقت علی نے سکھ لیڈروں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا لیکن پٹیل، پنجاب کے گورنر ایون جنکنس، چندولال ترویدی اور فرانسس موڈی مشرقی اور مغربی پنجاب کے ہونے والے گورنر نے اس کی مخالفت کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے آخر الذکر لوگوں کے مشوروں کو قبول کر لیا۔ کیا جنگجو سکھ لیڈروں کی گرفتاری سے پنجاب کی صورت حال بہتر ہو سکتی تھی جبکہ جنکنس کے خیال میں لیاقت علی خاں، غضنفر علی خاں، پٹیل اور بلدیو سنگھ کے پنجاب کے دورے سے فرقہ وارانہ تلخی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔

جنکنس نے یہ بھی کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سارے ہنگامے ایسے اشخاص اور پارٹیوں کی طرف سے کیے گئے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلم لیگ، کانگریس اور اکالی دل کے کنٹرول میں تھیں اور یہ کہ ہنگامہ آرائی کرنے والوں کو روپیہ دیا گیا تھا۔

بلاشبہ اب پس وپیش کے ساتھ اقدام کرنے یا سخت اقدامات کرنے کا کوئی موقع

نہ تھا۔ موسلے کی مذمت مبالغہ آمیز ہوسکتی ہے اور متعصبانہ بھی لیکن وہ اس کا صاف صاف اظہار کرتی ہے کہ متضاد مشوروں کے تصادم کی وجہ سے حکومت کی فیصلہ کرنے کی قوت مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس وقت سے ہندوستان کو سیاسی اقتدار کی منتقلی کی تاریخ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی، ادھورے جوش، زبردست غلطیوں، حماقتوں، بے پروائی اور غلطیوں سے بھری ہوئی ملتی ہے۔''

اس پس منظر میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بنگال جو فرقہ واریت میں پنجاب سے کہیں زیادہ متاثر تھا قرون وسطیٰ سے پہلے کی سی سفاکی اور بربریت سے ارباب اختیار کی دور اندیشی اور عزم مصمم کی وجہ سے اور سب سے بڑھ کر جنرل ٹیوکر کی کمانڈ میں فوج کی وجہ سے بچا رہا۔

دوسرے اسے بھی نوٹ کرنا چاہئے کہ اس آخری مرحلہ پر مون جنھیں مسلمانوں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور جنھیں ان کا اعتماد حاصل تھا اور جن کا وہ بڑا احترام کرتے تھے اور میجر اسکاٹ جو سکھوں کے دوست تھے، نے کچھ حل پیش کئے تھے۔ اگر حکومت ان پر عمل درآمد کرتی تو صورت حال بدل سکتی تھی۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ کے ارباب اختیار کے ذہن اس بارے میں صاف نہ تھے کہ ہندوستانی مسئلہ کا کیا حل ہو۔ ان کے خیالات کابینی مشن کی تجویز کے مطابق کئی قسم کے اتحاد یا دو با اختیار آزاد مملکتوں کے تقسیم کے درمیان منڈلا رہے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ اگر وہ شروع ہی سے ان میں سے پہلے یا دوسرے متبادل کو عملی جامہ پہناتے اور اپنے کو ذمہ داری سے بچانے کے لیے ان متبادلوں کو پسند کرنے کی ذمہ داری کانگریس اور مسلم لیگ پر نہ رکھتے تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔

15 راگست کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن دونوں مملکتوں کے درمیان کسی قسم کا تال میل یا رابطہ رکھنے والی جماعت کے قیام کے بارے میں سوچتے تھے۔ وہ جوائنٹ ڈیفنس کاؤنسل جس کے جلسے علی الترتیب دہلی یا پاکستان میں ہوتے رہتے تھے اور جن کی صدارت وہ خود کرتے تھے، کو مستقل بنانا چاہتے تھے تاکہ سامراجی تسلط کے خاتمے کے بعد دونوں مملکتوں میں یہ ایک سپر اسٹیٹ ہندوستانی اتحاد اور مشترک ڈیفنس کے آرگن کے طور پر قائم رہے۔ لیکن یہ محض عبث توقع تھی۔

باوجود اس کے کہ پاکستان کی بنیاد بھونڈے اور پھسپھسے دلائل پر تھی اور یہ بنیاد بہت زیادہ جذباتی تھی اور یہ کہ اس کے محرک جناح کو آخر تک اس کے حصول میں شک وشبہ رہا، اسے برطانیہ نے تسلیم کرلیا اس لیے کہ برطانیہ مسلمانوں سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہتی تھی۔

بنیادی تصور کہ مسلمان ایک قوم ہے بالکل غلط تھا۔ خود جناح نے 11 راگست کو پاکستان کی کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے اس کی تردید کی۔ پاکستان کے مغربی ومشرقی منطقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے درمیان یہ سب سے کمزور رشتہ تھا اور مغربی منطقے کے صوبوں میں کسی قسم کا اتحاد نہ تھا۔

بہت سے انگریز پاکستان کو غیر عملی سمجھتے تھے۔ خود ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے منصوبے کو پاگل پن کا منصوبہ قرار دیتے تھے۔ بہت سے لوگ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ساری برطانوی پارٹیاں جنگ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچیں کہ ہندوستان کو آزادی دینے میں اب دیر نہیں کی جاسکتی لیکن آزادی کی شکل اور طرز کے بارے میں یہ دودلی ہورہی تھی کہ متحدہ ہندوستان بغیر اقتدار کے ہو یا منقسم ہندوستان توازن طاقت کے ساتھ۔ دونوں صورتوں میں درجہ نوآبادیات کو قبول کیا گیا اور برطانوی مفادات کا تحفظ ہوگیا۔

ماؤنٹ بیٹن جب مارچ 47ء میں برطانوی کابینہ کی ہدایتوں کے ساتھ ہندوستان پہونچے تو انھوں نے محسوس کیا کہ آزادی کو منظور کر کے حکومت نے اسے فوری منزل قرار دیا ہے اور اس وجہ سے آزادی کی جدوجہد کا طرز بدل گیا ہے۔ اب آزادی کے طرز کے بارے میں دونوں پارٹیوں میں مستقل تصادم تھا اور اب یہ جدوجہد ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان نہ تھی۔ برٹش اس کے بہت زیادہ خواہش مند تھے کہ انھیں جلد سے جلد اقتدار کے آرزومند دونوں فریقوں کے جھگڑوں سے نجات ملے۔ وہ حکومت کو باقاعدگی سے اور پرامن طریقے سے منتقل کرنا چاہتے تھے۔

اس اقتدار کو دس مہینے پہلے ختم کر دینے اور بڑے ہی پیچیدہ معاملات بڑی ہی سرعت سے طے کرنے سے بعض فیصلوں کے صحیح ہونے پر اثر پڑا اور بعض اہم مسئلوں کے بارے میں غفلت برتی گئی اور اس وجہ سے بحیثیت مجموعی اشتعال پیدا ہوا۔

پنجاب کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارچ کے واقعات کے بعد تشدد اور بدامنی کو روکا جا سکتا تھا اگر صورت حال سے سختی کے ساتھ نپٹا جاتا۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اقتدار کی منتقلی کی تاریخ کو مقدم کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

اصل یا پہلی تاریخ کو قائم رکھنے پر غور کرنا کسی واقعہ کے ہو جانے کے بعد عقلمند ہو جانے کی بات نہیں ہے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جناح ایک مہلک اور جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں۔ جون 48ء کے تین مہینے بعد وہ زندہ نہیں رہے اور ان تین مہینوں میں بھی وہ صاحب فراش رہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قدم زیادہ تیز نہ کئے جاتے اور اقتدار کی منتقلی کے بارے میں جلدی نہ کی جاتی اور جناح کی قسمت کا انتظار کر لیا جاتا تو کیا کوئی فرق نہ پڑتا؟ کیا اس سے برطانوی حکومت کو اس کا موقع نہ ملتا کہ وہ ہندوستان میں فوج کے

برطانوی حصے کو زیادہ مدت تک رکھتی یا ٹیوکر کی تجویز کے مطابق فوج کی نئی تنظیم کیجاتی جو پنجاب میں امن قائم رکھتی جیسا کہ بنگال میں کیا گیا تھا۔

کیا اس وقفہ میں باؤنڈری کمیشن کو زیادہ وقت نہ ملتا کہ وہ دوسرے عوامل پر بھی غور کرتا یعنی جنگی حکمت عملی کے نقطہ نگاہ سے، معاشی اور فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے۔ متجانس اور غیر متجانس مسلم اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں کو یقینی بنایا جاتا تاکہ کمیشن زیادہ متوازن اور اطمینان بخش نتیجوں پر پہونچتا۔

یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ تقسیم کی ذمہ داری کسی ایک پارٹی پر ڈالی جائے لیکن واقعات، پالیسیوں اور اقدامات کا تذکرہ آزادی کی جدوجہد میں افراد کے کردار اور نتیجوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

نتیجہ نکالنے سے پہلے اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ تاریخ سائنس کی طرح نہیں ہے اس لیے معقول اسباب اور تعلقات کے بارے میں معلوم کرنا خاصہ خطرناک کام ہے کیونکہ سارے عوامل کا پتہ نہیں چلتا اور اس لیے کہ اہم ترین عامل یعنی انسان بڑا ہی پراسرار ہے۔

13-اختتامیہ

تاریخ ایک ایسا طریقہ عمل ہے جو حال کو ماضی میں ناقابل شمار حد تک لے جاتا ہے۔ یہ ان ساری سماجی تبدیلیوں کا طریقہ عمل ہے جواب تک معلوم اور نہ معلوم دباؤ والی قوتوں کے تحت معرض وجود میں آتی ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اس زبردست عظیم تاریخی واقعے کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی جائے جن کی وجہ سے 350 ملین سے زیادہ افراد بیرونی تسلط سے آزاد ہوئے اور وہ ایک بیرونی حکومت سے حکومت خود اختیاری تک پہنچے۔ یہ بڑا ہی زبردست اور قابل ذکر سیاسی انقلاب

تھا۔

یہ داستان اٹھارویں صدی میں شروع ہوئی کہ جب یورپ میں جدید، منظم اور باشعور سوسائٹیاں قرون وسطیٰ کی انتشار پسند اور جمود پسند بے ربط اور غیر متعین تنظیموں کی جگہ لے رہی تھیں۔ برعکس اس کے ایشیا میں ڈھیلے ڈھالے بادشاہوں کی جگہ جاگیر دارانہ طوائف الملوکی، قبائلی اور خاندانی رقابتیں مسلسل جنگوں میں اپنی ساری قوتیں صرف کر رہی تھیں۔ مغرب کی آگے طرف دیکھنے والی اقتصادی وحدتوں کا تصادم مشرق کے ساکن اور غیر متحرک کلچر سے ہوا اور اس کا نتیجہ بالکل کھلا ہوا تھا۔

یورپین ملکوں میں موافق حالات نے برطانیہ کے ہاتھوں میں رہنمائی دی۔ سماجی اتحاد، اقتصادی ترقی، سیاسی ترقی اور بحری طاقت نے اسے دوسری یورپین طاقتوں پر تفوق اور برتری عطا کی۔ یورپین مہم جو اشخاص، مہم پسندی سے متاثر ہو کر دولت کی لالچ میں سمندروں کو عبور کر کے 'سونے کی چڑیا' ہندوستان کے ساحلوں تک پہونچنے لگے۔ اس رقابت کی جنگ میں برطانیہ نے اپنے دوسرے یورپین حریفوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے ہندوستان میں انتشار پسندی کا سامنا کیا اور اس میں پھیلے ہوئے تفرقوں اور اختلاف کا فائدہ اٹھا کر اپنا تسلط قائم کر لیا اور طوائف الملوکی کی جگہ امن وامان قائم کیا۔ قرون وسطیٰ کی ہندوستانی سوسائٹیوں کو ان کی جاگیردارانہ لیڈرشپ سے محروم کر دیا گیا اور قرون وسطیٰ کی ہندوستانی معیشت پورے طور سے سامراجی استحصال کے ماتحت کر دی گئی۔ بعض محکموں مثلاً انتظامیہ، تعلیم اور مواصلات جدیدیت کے اثر میں تھے۔ لیکن زراعت اور ایک حد تک صنعتوں نے معاشی جمود میں ایک غیر معمولی صورت حال پیدا کر دی تھی۔

سولہویں اور سترہویں صدی کے عبوری دور سے یورپ ریفارمیشن یعنی مذہبی انقلاب کی منزل سے جدیدیت کی طرف بڑھا۔ ہندوستان نے انیسویں صدی کے

چھٹ پٹے میں اپنی قوتیں مذہبی احیاء پسندی میں صرف کیں۔ ریفارمیشن کی طرح ہندوستان کی مذہبی احیاء پسندی ایک نئے سماجی شعور یعنی قوم پرستی کی نقیب بنی لیکن یورپ کے برعکس کہ جہاں ریفارمیشن کا اثر صرف ایک مذہب پر پڑا۔ ہندوستان میں مذہبی احیاء پسندی دو مذہبوں پر اثر انداز ہوئی اور اس کا مکمل اثر دو راستوں پر پڑا اور اس کی وجہ سے دو فرقہ وارانہ شعور پیدا ہوئے۔ یورپ کو ریفارمیشن کے مذہبی اثر سے غیر مذہبی سیاست تک آنے میں ڈیڑھ صدی لگی اور اس اہم تبدیلی میں اسے خوش قسمتی سے اسٹیٹ کی حمایت حاصل رہی۔ انگلستان میں ٹیوڈر سے، فرانس میں ہنری چہارم اور اس کے جانشینوں سے اور جرمنی میں ہوہن زولرن (Hohenzollems) سے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں یک جہتی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی گئیں اور فرقہ وارانہ دوہرے پن کا استعمال بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے لیا گیا۔

سیاسیات کے نامور پروفیسر اور تھیوری اینڈ پریکٹس آف موڈرن گورنمنٹ کے ممتاز مصنف ہرمن فینر (Herman Finer) کہتے ہیں:

'' تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی سوسائٹی جس کا مقصد دولت حاصل کرنا ہو تو دولت کے حصول کے لیے طاقت ضروری ہوتی ہے مگر دولت کی تقسیم کو سیاسی اصول کنٹرول نہیں کرتے بلکہ وہ سیاسی طریقہ کار اور حکومت سے کنٹرول ہوتے ہیں۔'' لیکن ہندوستان میں یہ سب برطانوی حکومت نے کیا۔

انیس ویں صدی میں ہندوستان میں مذہبی احیاء پسندی کے ساتھ ساتھ قوم پرستی بھی بڑھی۔ اعلیٰ طبقوں کی جگہ متوسط طبقے کے جائداد رکھنے والوں اور دانشوروں نے لے لی۔ لیکن سماجی اور نظریاتی فضا جس میں انھوں نے اپنی زندگی گزاری تھی وہ تضاد کا مجموعہ تھی۔ سماجی طور سے روایت پسند عوام کی بہت بڑی تعداد مغربی تعلیم یافتہ اور مغرب پسند دانشوروں کی سخت ترین مخالف تھی اور نظریاتی اعتبار سے ماضی کی طرف

دیکھنے والے احیاء پسندوں نے انیسویں صدی کے مقلدوں کا مقابلہ کیا۔

جب احیاء پسندوں کا دور چل رہا تھا تو سیاسی شعور نے زور باندھا اور جلد ہی اس کا مقابلہ اپنے مخالف برطانوی سامراج سے شروع ہوا۔ ابتداء میں یہ مخالفت، اقتصادی مفادات کے تصادم کی وجہ سے شروع ہوئی اور ملک کی اندوہ ناک مفلسی کے اسباب کی تشریح اور اس کو دور کرنے کے طریقے ہمیشہ ہندوستانی مفکروں اور پبلک امور سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہن میں زیرِ غور رہے۔

زراعت اور صنعت دونوں میدانوں میں آگے بڑھنے کے لیے اس پر بہت زیادہ زور تھا کہ ان میدانوں میں ٹکنالوجی کا استعمال ہو، وسعت ہو اور پیداوار میں ویرائٹی لائی جائے اور سرمایہ کاری میں آگے بڑھا جائے۔ انیسویں صدی کی برطانوی سیاسی فکر اور سیاسی عمل اس دباؤ کو برطانوی مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سیاسی غلبہ کے دباؤ کے راستے میں معاشی رکاوٹیں ڈالیں اور اپنی سیاسی قوت کو اس دباؤ کے پیچھے چلنے والی طاقتوں کو کمزور کرنے میں لگایا۔ ہندو معاشی معاملوں اور دوسرے مسئلوں میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے اس لیے انھیں سامراجی اغراض و مقاصد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور برطانوی مفاد کے لیے بڑا مضرت رساں سمجھا جاتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس، جو نوزائیدہ سیاسی شعور کی ترجمان تھی، کا قیام 1885ء میں عمل میں آیا۔ یہ شک وشبہ کا نشانہ بن گئی۔ اس کے قومی کردار کو تباہ کرنے کے لیے سرکاری حلقوں میں اسے ہندو تنظیم کہا گیا اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی جائے کہ کانگریس ان کے مفاد کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہے۔

فرقہ وارانہ شعور زیادہ مضبوط اور پختہ ہو گیا جب منتشر مسلم عناصر کو یکجا کیا گیا اور

انھیں متحد کیا گیا۔ 1909 تا 1919 اور 1935 کی دستوری اصلاحات میں جداگانہ انتخابات کی مانگ کو نمایاں کیا گیا۔ مسلم آبادی کی تقسیم نے انھیں اور زیادہ مضبوط کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ شعور نے قومیت کے شعور اور سیاسی اتحاد کے تصور نے فیڈرل یونین کی شکل اختیار کر لی۔

قومیت اور فیڈلرزم کے تصورات کو 1937 اور 1939 کے درمیان صوبے جاتی خود مختار حکومتوں کے حسد اور جلن کی وجہ سے بڑا دھکا لگا اور جنگ کے دوران یہ تصورات پارہ پارہ ہو گئے۔ اس لیے کہ کانگریس کے جنگ کے بارے میں رویہ کی وجہ سے برطانوی حکومت نے کانگریس دشمنی کی پالیسی اختیار کی اور کھلم کھلا مسلم لیگ کی جانب داری اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کی۔

42ء میں جنگی کابینہ نے اس طریقہ کار کو اور آگے بڑھایا۔ مسلم قومیت، جو برطانوی حمایت کے تحت پروان چڑھی، نے مسلم قوم کی شکل اختیار کر لی اور اس کے اظہار نے مکمل آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا مطالبہ کیا جسے کابینی مشن نے منظور کر لیا اور لیبر حکومت اور اس کے ایجنٹ ہندوستان کے وائسرائے نے اسے درجہ تکمیل تک پہونچا دیا۔

لیکن جب مسلم لیگ کو اپنے ماہر ڈکٹیٹر کی وجہ سے مہمیز لگ رہی تھی اور وہ آگے بڑھ رہی تھی اور ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک اپنی پسندیدہ منزل کی طرف گامزن تھی، یہ یقینی نہیں تھا کہ مسلمانوں نے پورے طور سے اپنے مجوزہ مقصد کے مضرات کو سمجھ لیا تھا۔ جس مقصد کو مسلم لیگ نے اپنایا تھا کیا وہ سارے ہندوستان کے لیے سود مند تھا؟

15/اگست 47ء کے واقعات نے بڑے محکم انداز سے یہ ثابت کیا ہے کہ تقسیم سے ہندوستان کو کوئی بھلائی حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس سے سارے ہندوستانی

مسلمانوں کی بھلائی ہوئی۔ جہاں تک آخر الذکر کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی مثبت رائے دینی مشکل ہے۔ تاریخ امتداد زمانے کے ساتھ اس کا فیصلہ کرے گی۔

1906ء سے ہر مرحلے پر مسلمانوں کی خصوصی حیثیت کے بارے میں قوم پرور مسلمانوں نے سوال اٹھایا اور اس بارے میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے شک وشبہ کا اظہار کیا۔ برطانوی حکومت کے آخری دس برسوں میں مسلم لیگ نے جائز اور ناجائز طریقوں سے بڑی محنت سے اس کا پروپیگنڈہ کیا لیکن 42ء میں پنجاب نے اس لائن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے اور سندھ نے بھی مسلم لیگ کی تردید کی۔ بنگال بھی غیر یقینی تھا۔ 46ء تک جب کابینی مشن نے پاکستان کو ایک طشتری میں رکھ کر پیش کیا تو پنجاب نے مضبوط اور طاقتور مسلم لیگ کو اپنے سے دور رکھا اور اسی طرح شمالی مغربی سرحدی صوبے میں بھی اور بنگال میں بھی ایک متحدہ صوبے کی تجویز پر غور ہونے لگا۔

43ء سے پنجاب کے سرکاری افسر مسلم لیگ کے دباؤ میں رہے۔ پہلے پنجاب مضبوطی سے ڈٹا رہا، 47-46ء میں جھک گیا اس لیے کہ مرکزی عارضی حکومت کے مسلم لیگی بازو نے چیف منسٹر کو آزادانہ طریقہ سے کام کرنے نہیں دیا۔ اس طرح کے مخالف حالات کا شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی شکار رہا اور مقامی سرکاری افسر لیگ کی انتہا پسندی کے آگے جھک گئے۔ 46ء کے الیکشن میں اس صوبے میں کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی باوجود اس کے کہ مسلم لیگ کی مرضی کے مطابق استصواب ہوا تھا جو اس وقت بظاہر مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ بنگال کی اتحاد کی اپیل کو نہیں سنا گیا۔

مسلم لیگ کی کامیابی زیادہ تر برطانوی حکومت کی حمایت سے ہوئی نہ کہ خود اس کی کوشش سے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی مسلم لیگ اور اس کے لیڈر پاکستان چاہتے تھے۔ بہتوں کو اس بارے میں شک ہے اور انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ آخر تک خود جناح کو اس کا یقین نہ تھا۔ ایک طویل عرصہ تک اس مطالبہ کو سودے بازی کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

3/ جون 47ء کو جب برطانوی حکومت نے اس کی حمایت میں فیصلہ کیا تو پھر سودے بازی کے حربے کے طور پر اس کا استعمال ختم ہوگیا۔ اس خیال نے ان کوششوں کو جو 1914ء سے 1946ء تک فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے کی گئی تھیں تاریخ میں رنگ بھرا کیونکہ پچھلی ناکامیاں قطعی طور سے فیصلہ کن نہ تھیں۔ ہر ناکامی کے بعد دونوں فرقوں نے اپنے اختلافات کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کوششوں میں کامیابی کیوں نہیں ہوئی اس کا بیان پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ اس ساری مدت میں اتحاد پر زور دیا جاتا رہا اگر چہ یہ اتنا مضبوط نہ تھا کہ مخالف رجحان کو روک سکتا۔

سہ فریقی معاملہ میں سب سے مضبوط پارٹی نے مسلسل اپنی پوری طاقت ایک ہی سمت میں لگائی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پارٹیاں متحد ہونے میں اور تیسری پارٹی کو بے اثر بنانے میں ناکام رہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس کو اس وجہ سے ناکامی ہوئی کہ اس نے فرض کرلیا تھا کہ ہندوستان کے تمام افراد اور تمام فرقے قوم پرستی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ سید احمد خاں نے اس کی مخالفت کی لیکن کانگریس نے ان کے خیالات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اور اقلیتی مسئلے کے وجود پر کوئی توجہ نہ کی۔ جو لوگ اس مسئلہ کے بارے میں بات کرتے انھیں اس نے حکومت پٹھو قرار دیا اور انہیں یہ کہہ کر الگ کردیا کہ وہ تنگ نظر فرقہ پرست ہیں جو چھوٹے چھوٹے مسئلوں مثلاً گؤکشی، مسجد کے سامنے باجا بجانے اور

اردو زبان کے تعلق سے جوش میں آجاتے ہیں اور اہم مسئلوں مثلاً غریبی، سیاسی آزادی اور خواندگی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

مارلے منٹو اصلاحات سے کانگریس کو بڑا صدمہ پہونچا۔ اس وجہ سے انھوں نے 1914ء میں ایک بڑی سنجیدہ کوشش کی کہ اقلیتوں کی شکایت کو دور کیا جائے لیکن اگلے بارہ برسوں میں اس کے بارے میں بہت کم کیا گیا جب مسلم لیگ خوابیدہ حالت میں تھی اور مسلمان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

موتی لال نہرو کمیٹی جسے آل پارٹی کانفرنس نے وزیر ہند کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے اور ہندوستان کا کانسٹی ٹیوشن مرتب کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، نے ایک رپورٹ تیار کی جس پر دسمبر 25 کے آخری ہفتہ میں کلکتہ میں غور وخوض ہوا۔ جناح نے کچھ اعتراضات کیے اور پھر ترمیمیں پیش کیں۔ لیکن ان کی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور ان کو ختم کرنے کی کوشش نے بغاوت پیدا کی۔ بدقسمتی سے کانگریسی لیڈروں نے یہ کہہ کر کہ جناح کے پیرو بہت کم ہیں، نظر انداز کیا۔ ان کے نزدیک یہ کوئی بات نہ تھی جب کہ جناح مسلم اقلیت خواہ وہ کتنی ہی غیر منظم اور گروہوں میں بٹی ہوئی تھی کی شکایتوں اور امنگوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ 35ء سے پہلے سیاسی افق سے اوجھل رہے مگر 35ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلی کے الیکشن ہوئے تو انھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی پہلی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس سے اتحاد کر کے الیکشن کرائیں لیکن ایسا نہیں ہوا اس لیے کہ کانگریسی لیڈروں نے ان کے بارے میں اندازہ غلط لگایا اور ان کو کوئی اہمیت نہ دی اور مسلم لیگ کے التفات کو ٹھکرادیا۔ کانگریس کے اس رویہّ سے جناح کی انا کو زبردست ٹھیس پہونچی اور اس وجہ سے وہ ایک عافیت پسند کرسی نشین وکیل سے شعبدے باز اور بھیڑ جمع کرنے والے ڈکٹیٹر بن گئے۔

ان کے جذبات لی شدت نے ان سے پاکستان کا نعرہ بلند کرایا۔ کانگریس ان سے بے انتہا خوفزدہ ہوئی اور اب اس نے انھیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اس وجہ سے کہ ان کا حکمرانوں سے اتحاد ہوگیا تھا۔ جہاں تک جناح کا تعلق تھا وہ بڑے ہی متکبرانہ اور نخوت پسندانہ انداز سے پیش آنے لگے۔ اب ان کی نظر ایک دوسرے افق پر تھی لیکن انھیں اس کا یقین نہ تھا کہ وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرلیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے ستمبر 44ء میں گاندھی جی سے ملاقات کا استعمال کیا تاکہ وہ اس بارے میں ان کی تائید حاصل کرلیں۔ اگرچہ گاندھی جی نے انھیں راضی کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ سمجھوتے کا دوسرا موقع اس وقت ہاتھ سے نکل گیا جب دونوں پارٹیوں کے سامنے کابینہ مشن کی تجویزیں رکھی گئیں۔ دونوں نے دستور ساز اسمبلی کی اسکیم کو کچھ تحفظات کے ساتھ منظور کیا لیکن کانگریس نے اسمبلی کو ایک مقتدر و بااختیار جماعت مانا جس کے فیصلوں کو نہ کوئی بیرونی طاقت بدل سکتی تھی اور نہ ان میں کسی قسم کی کوئی ترمیم ہوسکتی تھی۔ جناح نے اس تعبیر کی سخت تردید کی۔ برطانوی کابینہ نے ان کے اس خیال کی تائید کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ نے اسمبلی میں شرکت کرنے سے انکار کردیا اور اس طرح باہمی تعاون سے دستور مرتب کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

یہ اقلیتی مسئلہ تھا جس کے گرد حکومت کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست گھومتی رہی۔ کانگریسی لیڈروں کو اس کے حل کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ ان کا ذہنی افق انگلستان کی سیاسی فکر سے متاثر تھا۔ ان کے سارے تجربے برطانوی سیاسی اور دستوری کارروائیوں اور سرگرمیوں پر مبنی تھے۔ برطانوی فکر اور برطانوی عملی سیاست، اقلیتی مسئلہ سے بالکل ناآشنا تھی۔ اس لیے برطانوی فلسفہ اور سیاست کے ہندوستانی طالب علم اقلیتی مسئلہ کے مضمرات سے قطعاً ناواقف تھے۔ انھیں اقلیتی فرقے کے

خدشات سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہ تھی اور نہ وہ اقلیتی مسئلہ کو سمجھتے تھے۔

دوسری طرف مسلم اقلیت نے اپنے خدشات اور خطرات کو مضحکہ خیز حد تک بڑھا دیا۔ انھوں نے ہندوؤں کو ظالم عفریتوں سے، جو مسلمانوں کے کلچر، مذہب اور ان کی زبان کو تباہ اور برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے، تعبیر کیا۔ انھوں نے ہندوؤں کے ایک چھوٹے سے انتہا پسند گروہ کے جارحانہ اعلانات کو ہندو ذہن کا ترجمان قرار دیا اور اس کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ہندوؤں پر اس انتہا پسند طبقہ کا اتنا کم اثر تھا کہ وہ بیسویں صدی میں مرکزی اور صوبائی الیکشن میں کانگریس کو کامیابی سے چیلنج نہ دے سکے۔ اس کے باوجود مسلمان اس پر یقین کرنے لگے کہ نہ صرف ان کے تمدنی اور مذہبی طور طریقے ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں بلکہ ان کے سیاسی مفادات بھی ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں اور اس باب میں ان کی ہمت افزائی حکمرانوں کے ممبروں کی تحریروں اور تقریروں اور حکومت کی تقسیم کرنے والی پالیسیوں سے ہوئی۔ جہاں تک برطانوی حکمرانوں کا تعلق تھا ان کا طرز عمل تمام تر اپنے تحفظات کے لیے تھا۔ ہندوستان کی کروڑوں کی آبادی پر ان کی شہنشاہیت صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی تھی کہ جب وہ ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد کو آپس میں مقابلہ کرنے والے گروہوں میں تقسیم کر دیں اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے خلاف رکھ کر توازن برقرار رکھا جائے۔ اس پالیسی کو جواز کی بڑی ضرورت تھی جو دو باتوں سے حاصل ہوا:

(1) ہندوستان کے فرقے نہ متحد ہونے والی ایسی سماجی وحدتیں ہیں جو کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔

(2) ایسی سوسائٹیاں اور فرقے ہیں جو نسلی، لسانی، مذہبی، ذات پات، رسم و رواج کے اعتبار سے اس طرح منقسم ہیں کہ وہ فرقے ایسی مرکزی بنیاد نہیں بن سکتے جو ایک قوم کے وجود کا اظہار کرے۔

دوسری طرف برطانوی خود داری اور دیانتداری کے جذبے کی تائید اس سے ہوئی کہ اس نے اپنی حکومت کے ذریعہ ایک تحتی براعظم میں جس میں 350 ملین انسان رہتے تھے امن امان قائم کیا، جدید ایڈمنسٹریشن کا نظام قائم کیا، قانون اور انصاف، مواصلات اور نقل وحمل، ریلوے لائن، سڑکیں ڈاک تار اور ملک کی دفاع کے لیے ایک بڑی طاقتور فوج کی تنظیم کی اور سماجی بہبود کے لیے تعلیم اور صفائی اور سب سے بڑھ کر جدیدیت کی روح قوم پرستی، سیکولرزم اور سائنس کے ذریعہ پیدا کی۔

ایک اچھے مویشی خانہ کے لیے ضروری ہے کہ پوری نشو ونما کے لیے بھرپور غذا ہو، پانی ہو، صاف ستھرے شیڈ ہوں، نالیاں ہوں، اچھے بنے ہوئے راستے ہوں اور جہاں مویشی اپنے دشمنوں سے محفوظ رہیں یعنی زہریلے کیڑوں اور درندوں سے اور ان سب کا مقصد یہ ہو کہ وافر مقدار میں دودھ ملے، اچھا گوشت ملے اور ضرورت کی چیزوں کی افراط ہو۔ یہ سب تھا بلکہ زیادہ تر تھا لیکن جو چیز مویشی خانے سے انسانی رہائش گاہ کو ممتاز کرتی ہے وہ ہے خودشناسی کا شعور جو موجود نہیں تھا۔

بالآخر جو پشتے سامراجی انجینئرنگ نے آزادی کے سمندر کو باہر رکھنے کے لیے بنائے تھے، زبردست مد کی وجہ سے مسمار ہوگئے اور غیر معروف قوتیں جنھیں انسانیت کے سمندر نے نگل لیا تھا گہرائیوں سے نکلیں اور انھوں نے حد بندی کے جانے پہچانے نشانوں کو مٹادیا۔

☆..................☆..................☆